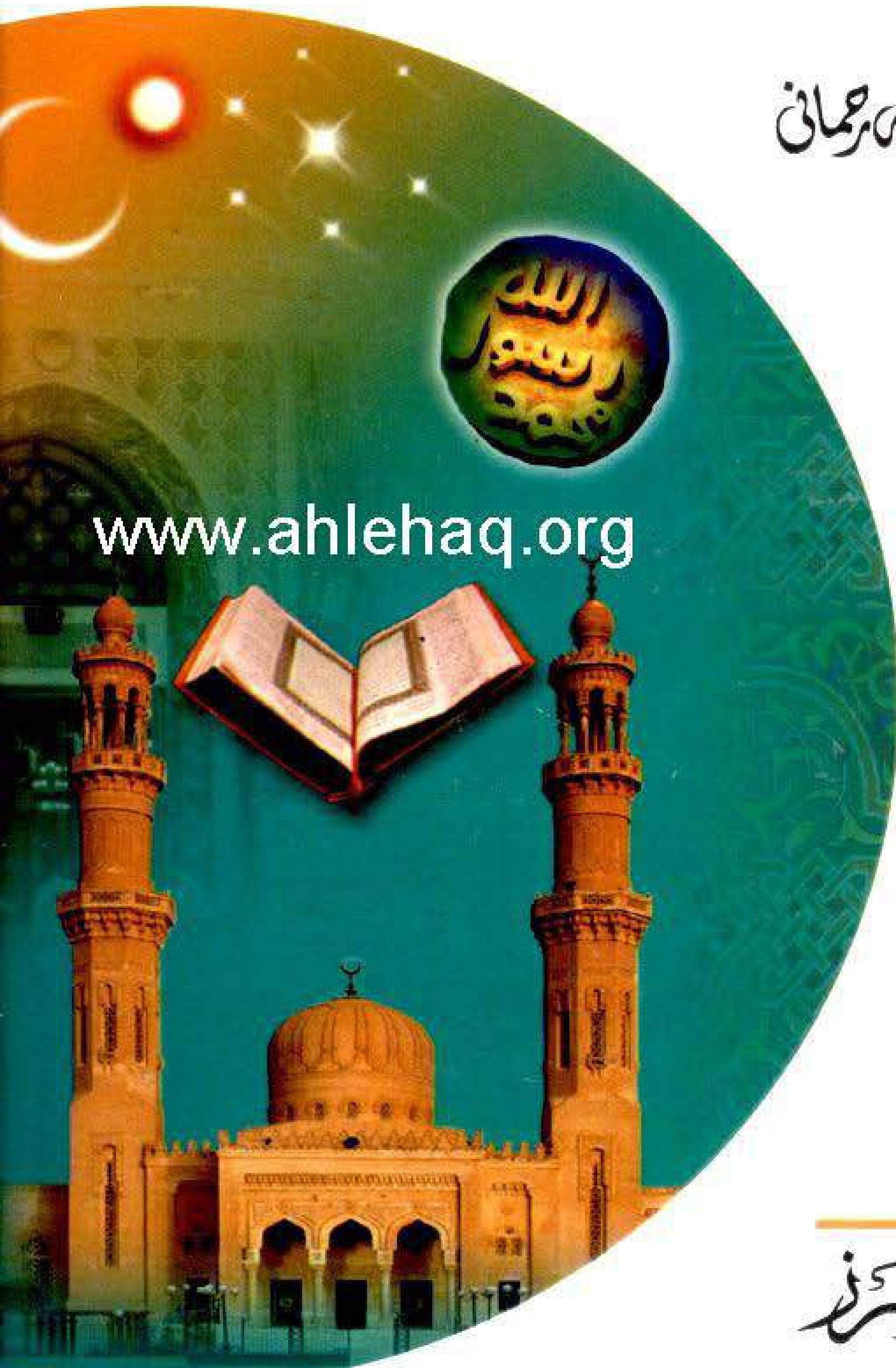
راہِ عمل

١- نقوشِ موعظت
٢- حقائق اور غلط فہمیاں
٣- نئے مسائل، اسلامی نقطۂ نظر

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

جلد اول
حصہ اول، دوم، سوم



زمزم پبلشرز

راہِ عمل ۱

نقوشِ موعظت

جس میں موجودہ حالات میں بین الاقوامی اور ملکی مسائل و حالات اور خود مسلمانوں کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف حادثات اور تاریخی واقعات کے پس منظر میں عبرت و موعظت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد، اردو بازار، کراچی

کتاب کا نام ——— راہِ عمل نقوشِ موعظت

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دار الہدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دار الاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
BI1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

دنیا مسلسل تغیر پذیر ہے اور واقعات و حادثات کی آماجگاہ ہے، شاید کوئی دن گذرتا ہو کہ کوئی خوش کن یا غم انگیز اور مذہبی یا سماجی واقعہ پیش نہ آتا ہو، بعض واقعات ایمان وعقیدہ کا حصہ ہیں، بعض وہ ہیں جن کو تاریخ کے واسطہ سے کانوں نے سنا ہے، اور بعض وہ ہیں، جنھیں سر کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے، عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ان واقعات میں عبرت وموعظت کے نقوش تلاش کئے جائیں، اور اپنی عملی زندگی میں رہنمائی حاصل کی جائے۔

چنانچہ راقم الحروف روزنامہ منصف کے کالم ''شمع فروزاں'' میں بعض اوقات اس پہلو سے بھی قلم اُٹھاتا رہا ہے، ایسے ہی مضامین کا مجموعہ ''نقوشِ موعظت'' کے عنوان سے پیش کیا جارہا ہے، یہ مضامین متنوع موضوعات پر ہیں، اور ان میں قدرِ مشترک یہی ہے کہ ہر واقعہ کو عبرت آمیز اور موعظت خیز نظر سے دیکھا جائے۔

اس سے پہلے ۱۹۹۸ء میں شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کا ایک مجموعہ ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، جس میں تمام مضامین ایک ساتھ شریک اشاعت ہیں، اب کئی سال کے مضامین جمع ہوگئے تھے، اور ان کی ضخامت بھی اچھی خاصی ہوگئی، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اسے ایک مشترک نام دیا جائے، کیوں کہ اس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ عمل کی دعوت دی جائے اور اپنی عملی زندگی کا احتساب کیا جائے، اس کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت سے ان میں مختلف مجموعوں کی مستقل حیثیت بھی ہے، --- اس پہلے مجموعہ کی ترتیب عزیز گرامی مولانا شاہد علی قاسمی (استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) نے انجام دی ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو لوگوں کے لئے نافع بنائے، نیز اس حقیر کے لئے ذخیرۂ آخرت فرمائے، واللہ ہو المستعان۔

۱۳/ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۹/ ستمبر ۲۰۰۴ء

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرضِ مرتب

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو وجود بخشنے کے بعد جب حضرت انسان کو اس میں آباد کیا تو جہاں اس خاکی پیکر کی راحت وآرام اور اس کی جملہ ضروریات کا سامان فراہم کیا اور اس کے واسطے دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں رکھیں، وہیں ان کی ہدایت ورہنمائی کے ذرائع بھی پیدا فرمائے، تاکہ انسان اپنے خالق ومالک کی مرضیات کے مطابق زندگی گذارے۔

ان ہی ہدایات اور عبرت وموعظت کی چیزوں میں ایک کائنات کا وسیع نظام، اس میں کارفرما قانونِ فطرت اور تکوینی اصول کے تحت پیش آنے والے واقعات وحوادث بھی ہیں، یہ وسیع کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات یقیناً ایک نظام کے تابع ہیں اور محض اتفاقی نہیں، غور کریں تو ان امور میں بھی بڑی حکمتیں اور انسان کے لئے ہدایتیں پوشیدہ ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنے خالق کی بندگی کرنے کی دعوت دیتا اور قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے، گویا زمین کے سینے پر اگنے والے برگ وبار اور غنچہ وگل سراپا پیغام اور خاموش ہادی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر کائناتی نظام کے ذکر کے بعد اس سے سبق حاصل کرنے کا حکم دیا ہے: "فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

یہی حال دنیا میں رونما ہونے والے معمولی وغیر معمولی حوادث وواقعات کا ہے، یہ واقعات تکوینی نظام کے تحت پیش آتے ہیں، لیکن ان کے اندر بھی ہمارے لئے بڑا پیغام ہوتا ہے، یہ ہماری کوتاہیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں، آئندہ ان سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور بعض واقعات تو اسی لئے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ خدا کی نافرمانیوں میں مشغول بندہ جاگے اور اپنے خالق کو یاد کرے، پس ایک مسلمان کا

شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ واقعات وحوادث کے ظاہری اسباب کے ساتھ ساتھ اس کے اصل عوامل کو دیکھے، آئندہ اس سے سبق حاصل کرے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہو۔

استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (اللہ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے) کئی سال سے اردو کے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے منارۂ نور ایڈیشن میں ''شمع فروزاں'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھ رہے ہیں، آپ کا یہ کالم بڑے شوق وذوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، اس کی شہرت ومقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس دن کا اخبار دیگر ایام کے مقابلہ کئی ہزار زیادہ شائع ہوتا ہے اور قارئین کی بڑی تعداد ان مضامین کی فائل بنا کر محفوظ رکھتی ہے۔ یہ مضامین اصلاحی ہوتے ہیں، ان میں مسلمانوں کی رہنمائی بھی ہوتی ہے اور ان کے مسائل کا تجزیہ بھی، معاشرتی مسائل پر اظہار خیال بھی اور نئے مسائل کا حل بھی، مسلمانوں کی پستی کے اسباب بھی بیان کئے جاتے ہیں اور آگے بڑھنے کا راستہ بھی دکھایا جاتا ہے۔

یہ گلہائے رنگارنگ اور بیش قیمت صدف ریزے روزنامہ ''منصف'' کی فائلوں میں منتشر تھے، راقم نے انہی فائلوں سے کچھ جواہر پاروں کو جمع کیا ہے جو ''نقوش موعظت'' کے عنوان سے قارئین کی خدمت میں پیش ہیں، اس مجموعہ میں وہ مضامین شامل ہیں جو حالات و واقعات سے متعلق ہیں اور جنہیں استاذ محترم نے درس عبرت کی شکل میں پیش کیا ہے اور ان میں موجود درس وموعظت کے پہلو کو نمایاں کیا ہے، اسی طرح چند مضامین دعوت سے متعلق بھی ہیں جن میں غیر مسلموں میں دعوتی کام کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور اس اہم فریضہ کی ضرورت واہمیت بتاتے ہوئے اس کی طرف سے بے توجہی کے نقصانات کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ مضامین بہت اہم اور قیمتی ہیں، شستہ اور ادبی چاشنی سے بھرپور زبان کے ساتھ استاذ محترم کا سوز دروں اور اندرونی تڑپ بھی بین السطور سے جھلکتا نظر آتا ہے، امید ہے کہ قارئین اسے شوق کے ہاتھوں لیں گے اور حضرت الاستاذ مدظلہ کی دیگر کتابوں کی طرح یہ مجموعہ بھی مقبول عام وخاص ہوگا۔

۱۵/شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

شاہد علی قاسمی

یکم/اکتوبر ۲۰۰۴ء

(استاذ المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

دو کردار

قرآن مجید ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے۔ اس کے ہر لفظ کی تہہ میں ہدایت کا نور موجود ہے، اس نے دو اہم کردار پیش کئے ہیں، انسانیت کے باپ اور اللہ کے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام کا اور شیاطین کے سردار ابلیس کا!

ابلیس بھی ''جن'' نامی مخلوق ہی سے تعلق رکھتا ہے، اللہ نے جب یہ حسین وجمیل اور آراستہ و پیراستہ دنیا بنائی تو پہلے اس کو جنوں سے بسایا، مگر انہوں نے خدا کے سامنے جھکنے کے بجائے سرکشی کا ثبوت دیا اور تکبر کی راہ اختیار کی، اس لئے خدا کے حکم سے جنوں کو از راہِ سرزنش پہاڑوں اور جنگلوں میں قیام کا حکم دیا گیا، انہیں میں ابلیس تھا، یہ بظاہر اپنی قوم سے جداگانہ مزاج رکھتا تھا، مطیع وفرمانبردار اور عبادت گزار، اللہ تعالیٰ گو اس کی باطنی کیفیت سے واقف تھے، لیکن ظاہری حالات کی رعایت سے اس کا درجہ بلند کیا گیا اور اسے عالم بالا میں جگہ دی گئی، اب یہ فرشتوں کا مصاحب تھا اور مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ رہتا تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آب وخاک کی اس دنیا میں نئی بستی بسانے کی غرض سے حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا، جہاں مٹی کو آپ کا مادہ تخلیق بنایا، وہیں علم وتحقیق کی صلاحیت حضرت انسان کی سرشت میں داخل فرمائی، پھر خالق کائنات کی طرف سے انسان کی عظمت اس طور ظاہر کی گئی کہ قدسیانِ عالم بالا کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ ریز ہونے کا حکم فرمایا گیا، یہ حکم فرشتوں کو بھی ہوا اور شیطان کو بھی، فرشتے تو فوراً ہی سر بہ سجود ہو گئے، لیکن ابلیس کی ''انا'' (جو اب تک بہ تکلف دبی ہوئی تھی) نے اب انگڑائی لی، اس نے آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کبر پر اتر آیا، پھر جب اللہ کی طرف سے

دھتکارا گیا اور زمین پر اس کا اخراج عمل میں آیا، جب بھی اسے کوئی پشیمانی نہیں ہوئی اور کبر و علم کے احساس سے وہ اپنے آپ کو فارغ نہیں کر پایا؛ بلکہ ایک حد تک اس نے باری تعالیٰ کو قصوروار قرار دینے کی جسارت کی کہ آدم تخلیقی اعتبار سے اس سے کم تر ہے، اس لئے اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز کرنا، اس کی تحقیر و اہانت اور گویا اس کے ساتھ ناانصافی ہے، اس نے یہ نہ سمجھا کہ رب کائنات ہی تمام مخلوقات کا مالک ہے اور وہ جس کے لئے جو درجہ و مقام متعین کرے، وہی اس کا صحیح اور اصل مقام ہے۔ یہ ایک کردار ہے جس میں کبر ہے، اپنے ''انا'' کی پرستاری ہے، اعترافِ حقیقت سے پہلوتہی اور خسران و محرومی کے اسباب کو اپنے بجائے دوسروں میں تلاش کرنے کی کوشش ہے۔

دوسرا کردار حضرت آدم علیہ السلام کا ہے، حضرت آدم علیہ السلام اس اعزاز و اکرام کے بعد جنت میں رکھے گئے، جنت صرف راحتوں اور نعمتوں کی جگہ ہے، جہاں نہ غمِ امروز ہے اور نہ فکرِ فردا، لیکن انسان ''انس'' سے ماخوذ ہے، اس لئے وہ کسی ''انیس'' کے بغیر ہمیشہ بے سکون ہی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک ''انیس'' بھی عطا فرمایا اور آپ علیہ السلام ہی سے آپ کے جوڑے حضرت حوا کی تخلیق فرمائی، اب اس وسیع و عریض جنت میں اس جوڑے کو سب کچھ میسر تھا، وہ بھی جو سوچا جائے اور وہ بھی جو تصور سے بالاتر ہو، البتہ ایک پھل کھانے کی ممانعت تھی، شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہو چکا تھا، وہ گو آسمان سے نکالا گیا تھا، مگر دامِ وسوسہ اب بھی آسمان بلکہ جنت تک پھینک سکتا تھا، آخر اس بھولے بھالے انسانی جوڑے نے بھول کی اور وسوسہ شیطانی کا شکار ہو کر اس شجرِ ممنوعہ سے کھالیا، پھر کیا تھا؟ پہلے لباسِ جنت اُترا اور پھر ''بڑے بے آبرو ہو کر تیری جنت سے ہم نکلے!'' کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام زمین پر اُتارے گئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا نزول ہندوستان ہی کے جنوبی علاقہ یا سری لنکا میں ہوا تھا۔ حدیث میں آیا کہ حضرت آدم تو اتنا روئے، لجائے، گڑگڑائے، خدا کے سامنے جھکے اور بچھے، ہاتھ پھیلایا اور دستِ عفوخواہی دراز کیا کہ شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ یہ بھی عرض کر سکتے تھے کہ اس میں میرا کیا قصور، یہ تو سب شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے، لیکن

حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے پیغمبر بھی، پیغمبر سے بڑھ کر نہ کوئی خدا شناس ہوسکتا ہے اور نہ خدا کا مرتبہ شناس، حضرت آدم علیہ السلام نے دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں اللہ تعالیٰ کی ناخوشنودی کی وجہ کو تلاش کیا اور نہایت فروتنی سے عرض گزار ہوئے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر خود ہی بڑا ظلم کیا ہے، اگر آپ ہمیں معاف نہ فرمادیں اور رحم وکرم کا معاملہ نہ فرمائیں تو ہم بے شک سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔'' (الاعراف: ۲۳) غور کیجئے! اس دُعاء میں کس قدر عجز وانکسار اور اقرار واعتراف ہے! سراپا اعتراف واقرار، نہ ایک حرفِ کبر، نہ کوئی کلمۂ پندار!!

یہ دونوں کردار صرف حضرت علیہ السلام آدم اور ابلیس کے ساتھ مخصوص نہیں، دنیا میں ہر انسان ان دو میں سے ایک کردار ادا کرتا ہے۔ جس شخص میں حقیقی آدمیت جتنی زیادہ ہوگی وہ حقیقتوں کے اعتراف میں اسی قدر وسیع الظرف ہوگا، عجز وفروتنی اس کے ایک ایک عمل سے نمایاں ہوگی، اس کے بول بھی انکسار کا مظہر ہوں گے، اس کی چال بھی شرافت اور بندگی کی شہادت دے گی، وہ دوسروں کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا عادی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل وتوجیہ کے بجائے اپنے آپ میں غلطی کو تلاش کرنے کا داعی ہوگا، وہ اپنی غلطیوں کی تاویل وتوجیہ کے بجائے سیدھے سادے طریقہ پر اعتراف کا مزاج رکھے گا، وہ اپنی خطاؤں پر نادم اور پشیماں ہوتا جائے گا، خطائیں اور لغزشیں اس کو فوراً جھکا دیں گی، خدا کے سامنے بھی اور خلق خدا کے سامنے بھی، جس شخص میں آدمیت کا عنصر جتنا کم ہوگا اور وہ شیطان کے مزاج سے جس قدر قریب ہوگا، اس میں ''انا'' کا جذبہ اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسے اپنی غلطیوں کے اعتراف اور زیادتیوں کے اقرار کا حوصلہ نہ ہوگا، وہ ہمیشہ کسی واقعہ میں ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دے گا، اسے لوگوں کے سامنے جھکنے میں اور حق اور حقیقت کا اعتراف کرنے میں عار ہوگی، اُصولوں کا پابند رہنے میں اسے ہتک محسوس ہوگی، اس کی رفتار وگفتار سے ظاہر ہوگا کہ وہ اپنے تئیں بڑے ہونا کا احساس رکھتا ہے اور دوسروں کو حقیر جانتا ہے۔

اعتراف اور تواضع سے آدمی کی اصلاح بھی ہوتی ہے اور وہ خدا اور خلق خدا دونوں

کی نگاہ میں محبوب بن جاتا ہے، اور انکار و کبر کی وجہ سے کبھی اس کی شخصیت کی اصلاح نہیں ہوتی، خدا بھی اس سے ناراض ہوتا ہے، اور گو خلق خدا وقتی طور پر کسی مجبوری کی وجہ سے زبان نہ کھولے، لیکن وہ اس کی نگاہ میں مغضوب ہی ہوتا ہے، ہر شخص ان دو کردار میں سے ایک سے قریب ہے۔ آیئے! ہم اپنا محاسبہ کریں کہ ہمارا رویہ حضرت آدم سے کتنی مطابقت رکھتا ہے اور اگر ہم اپنے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے اُسوہ سے دور ہیں تو کیا ہم اپنی اصلاح کے لئے تیار ہیں؟؟

(۲۳/جنوری ۱۹۹۸ء)

☆☆☆

قرآن مجید اور ہماری ذمہ داریاں

امام عبد اللہ بن مبارک اعلیٰ درجے کے فقیہ اور محدث ہیں، امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں ہیں، اور کتنے ہی محدثین وفقہاء کی چشم عقیدت کا سرمہ ہیں، انہوں نے اپنے آپ پر گذرا ہوا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جس کو بہاء الدین (م:۸۵۰) نے اپنی معروف کتاب ''المستطرف'' (۱/۶۷-۷۴) میں ذکر کیا ہے، یہ ایک بار حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، واپسی میں راستہ میں ایک جگہ دور سے کوئی چیز نظر آئی، قریب پہنچے، اور پہچانا، تو دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون ہیں جو ادنیٰ کرتے اور ادنی دوپٹے میں ملبوس ہیں، امام عبداللہ بن مبارک نے سلام کیا، خاتون نے سلام کا جواب ایک قرآنی فقرہ سے دیا ''**سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ** (یٰس:۵۸) سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے ارشاد ہے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا: یہاں آپ کیا کر رہی ہیں؟ کہنے لگیں: **مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ** (الاعراف:۱۸۶) جسے اللہ راستہ نہ دکھائے، اسے کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔'' یعنی یہ راستہ بھٹک گئی ہیں، ابن مبارکؒ نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے'' کہنے لگیں: **سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی** (الاسراء:۱) ''یعنی یہ حج کر چکی ہیں اور بیت المقدس کا ارادہ ہے، ابن مبارکؒ نے استفسار کیا کہ کتنے دِنوں سے آپ اس مقام پر پڑی ہوئی ہیں؟ خاتون نے کہا: **فَثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا** (مریم:۱۰) یعنی مسلسل تین راتوں سے، ابن مبارکؒ نے کہا: آپ کے پاس کھانے کا کچھ سامان نہیں ہے؟ خاتون نے جواب دیا: **هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَ يَسْقِيْنِ** (الشعراء:۷۹) یعنی اللہ مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ وضو کس طرح کرتی ہیں ب کہ پانی بھی ساتھ نہیں ہے؟ فرمایا: **فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا** (النساء:۴۳) یعنی قرآن کا حکم ہے کہ پانی نہ

ملے تو تیمم کرو، اس پر عمل کرتی ہوں، امام ابن مبارکؒ نے کھانے کی پیش کش کی، تو کہنے لگیں: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ (البقرۃ:۱۸۷) یعنی میں روزہ کی حالت میں ہوں، ابن مبارکؒ نے کہا کہ یہ رمضان کا مہینہ تو ہے نہیں؟ فرمایا: وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۱۵۸) یعنی جو یہ بطورِ نفل مزید عمل کرے تو اللہ تعالیٰ قدر داں ہے اور واقف ہے، ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ سفر میں تو ویسے بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:۱۸۴) یعنی روزہ رکھ لینا بہر حال بہتر ہے۔

امام عبد اللہ بن مبارکؒ کے حیرت و استعجاب میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جاتا تھا، آپ نے دریافت کیا کہ جس طرح میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں آپ بھی اس طرح کیوں نہیں کرتیں؟ جواب ملا: ما يلفظ من قول الا لدبه رقيب عتيد (ق:۵۸) یعنی جب بھی انسان کوئی بات کرتا ہے تو نگراں فرشتہ اس پر موجود ہوتے ہیں، گویا بات خوب احتیاط اور تول کر کرنی چاہئے، ابن مبارکؒ نے دریافت کیا کہ آپ کا تعلق کس قبیلہ سے ہے؟ فرمایا: و لا تقف ماليس لك به علم (الاسراء:۳۶) کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو، گویا ابن مبارکؒ کے اس سوال پر بوڑھی خاتون نے ناگواری ظاہری کی، امام عبد اللہ نے معذرت کی، اور کہا کہ مجھے معاف کر دیجئے، جواب ملا: لا تثريب عليكم اليوم، يغفر الله لكم (یوسف:۹۳) کہ آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تم کو معاف کر دے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں: میں نے دریافت کیا کہ کیا میں آپ کو اپنی اونٹنی پر سوار کر دوں تا کہ آپ اپنے قافلہ سے جا ملیں، کہنے لگیں: وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (البقرۃ:۱۹۷) جو بہتر کام کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔ ابن مبارکؒ نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا تا کہ وہ سوار ہوں، کہنے لگیں: قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (النور:۳۰) یعنی ابن مبارکؒ کو نگاہ پست کرنے کے بارے میں اشارہ فرمایا، چنانچہ آپ نے نگاہ پست کر لی اور کہا کہ سوار ہو جائیں، سوار ہونے لگیں تو اونٹنی بدک گئی، اور اس خاتون کا کچھ کپڑا پھٹ گیا تو قرآن کی آیت پڑھی: وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ:۳۰) یعنی جو

بھی مصیبت انسان کو پہنچتی ہے وہ اپنی شامت اعمال کی وجہ سے، امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جائیں، میں پہلے اونٹنی کو باندھ دوں، خاتون نے کہا: ففھمناھا سلیمان (الانبیاء:......) امام ابن مبارکؒ فرماتے ہیں: میں نے اونٹنی کو باندھ دیا اور ان سے کہا کہ سوار ہو جائیں، جب سوار ہوئیں تو سواری کی دعاء پڑھی جو قرآن مجید کی آیت ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَ اِنَا اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ

(الزخرف: ۱۳،۱۴)

اب سفر شروع ہوا، امام ابن مبارکؒ نے اونٹنی کی لگام تھامی، اور اونٹنی کو تیز ہنکانے کے لئے کسی قدر بلند آواز نکالتے ہوئے آگے بڑھے، خاتون نے کہا: وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَ اغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ (لقمان: ۱۹) یعنی رفتار معتدل رکھو اور آواز پست، ابن مبارکؒ نے آہستہ آہستہ مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل: ۲۰) پڑھا کہ آپ کو بڑا خیر عطا کیا گیا ہے، کہنے لگیں: وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (البقرۃ: ۲۶۹) کہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں، امام ابن مبارکؒ نے کچھ آگے بڑھنے کے بعد دریافت کیا کہ کیا آپ کے شوہر ہیں؟ بوڑھی خاتون نے جواب دیا: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدۃ: ۱۰۱) اے ایمان والو! ایسی چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو تم پر ظاہر کیا جائے تو تمہیں ناگوار ہو۔ یعنی اپنے بیوہ ہونے کی طرف اشارہ کی۔

امام ابن مبارکؒ نے پھر کوئی گفتگو نہیں کی، یہاں تک کہ قافلہ تک پہنچ گئے، پہنچنے کے بعد خاتون سے دریافت کیا کہ یہاں آپ کے کون لوگ ہیں؟ کہنے لگیں: اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (الکہف: ۴۶) یعنی اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ ان کے بچے اور سامان اس قافلہ میں ہیں، میں نے دریافت کیا، حج میں ان کے بچے کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگیں: وَ عَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ ھُمْ یَھْتَدُوْنَ (النحل: ۱۶) یعنی ان کے بچے حجاج کے قافلہ میں راستہ بتانے اور منزل کی رہنمائی کا کام کرنے پر مامور تھے، ابن مبارکؒ سواری خیموں تک لائے، اور استفسار کیا کہ یہ خیمے ہیں، آپ کے متعلقین کون ہیں؟ خاتون نے کہا: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا (النساء: ۱۲۵) وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَكْلِیْمًا

(النساء:۱۶۴) یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ (مریم:۱۲) یعنی ابراہیم موسیٰ اور یحیٰ میرے بچوں کے نام ہیں، ابن مبارکؒ نے ان ہی ناموں سے ندا لگائی، کہ تین نوجوان چاند کی طرح روشن دوڑے آئے، اور جب بیٹھنے لگے تو ماں نے کہا فَابْعَثُوْٓا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ ھٰذِہٖٓ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ فَلْیَنْظُرْ اَیُّھَآ اَزْکٰی طَعَامًا فَلْیَاْتِکُمْ بِرِزْقٍ مِّنْہُ، (الکہف:۱۹) ''اپنے میں سے کسی کو یہ پیسے لے کر شہر بھیجو کہ وہ دیکھے کہ کون پاک وصاف کھانا فروخت کرنے والا ہے، پھر وہ تم لوگوں کے پاس کھانے کی چیز لے کر آئے، چنانچہ بچوں میں سے ایک بازار گیا، کھانے کی کچھ چیز خرید کر لایا اور میرے سامنے رکھ دیا کہنے لگیں: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ (الحاقۃ:۲۴) خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے جو تم نے پچھلے دنوں میں کئے ہیں۔

امام عبداللہ ابن مبارکؒ نے ان خاتون کے صاحبزادوں سے کہا کہ جب تک تم ان خاتون کے بارے میں مجھے نہ بتاؤ میں کھانا نہیں کھا سکتا، لڑکوں نے کہا: یہ ہماری والدہ ہیں، چالیس سال کے عرصہ سے انہوں نے سوائے قرآن کے کوئی اور کلام اپنی زبان سے نہیں نکالا کہ کہیں اپنی طرف سے بولنے میں کچھ زیادتی ہو جائے اور اللہ ناراض ہو جائے، ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے، اللہ جسے چاہیں عطا فرمائیں، اور اللہ یقیناً بڑے فضل والے ہیں، ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (الجمعۃ:۴) یہ واقعہ نشانِ عبرت اور حرفِ موعظت ہے کہ معمولی خاتون کو بھی قرآن سے کیسی مناسبت ہوتی تھی، اور قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے فہم کا کیسا اعلیٰ درجے کا ذوق حاصل ہوتا تھا، کاش ہم یہ اور اس طرح کے عبرت خیز واقعات کو اپنے لئے آئینہ بنائیں، اور اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھیں کہ قرآن مجید سے ہمارا کیا تعلق ہے؟

(۲۹/۱۱/۲۰۰۲ء)

انٹرنیٹ کے ذریعہ تحریفِ قرآن کی سازش

اللہ تعالیٰ نے جب اس وسیع کائنات میں انسانوں کی بستی بسائی، تو جیسے ان کی مادری غذا کا سروسامان کیا ویسے ہی اس کی روحانی غذا اور نشوونما کا بھی انتظام کیا، اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لئے انسان ہی میں سے اپنے رسول بھیجے، حضرت آدم علیہ السلام جیسے پہلے انسان تھے، ویسے ہی پہلے نبی بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنی کتابیں بھی اتاریں، لیکن انسان کی گنہ گار طبیعت نے ہمیشہ اپنی آمیزشوں اور ملاوٹوں کے ذریعہ ان کتابوں کو گویا گم کر دیا، نبوت اور نزولِ کتاب کا یہ مبارک سلسلہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر اختتام کو پہونچا اور کتابِ ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن قرآن مجید کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوا، چونکہ یہ خدا کی آخری کتاب ہے، اور انسان کو قیامت تک ہدایت کے لئے اس کتاب کی ضرورت ہے، اس لئے خالقِ کائنات نے خود ہی اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اور ارشاد ہوا، اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر: ۹) کہ ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، یہ خدائی وعدہ آج تک اتنے عظیم الشان طریقہ پر پورا ہو رہا ہے کہ کوئی بھی حقیقت پسند شخص اگر صرف حفاظت قرآن کے اس الٰہی نظام پر غور کرے تو شاید یہی اس کے ایمان کے لئے کافی ہو جائے۔

قرآن مجید اس دور میں نازل ہوا جو کاغذ اور پریس کا دور نہیں تھا، اور خاص کر عرب کا علاقہ تو اتنا غیر متمدن تھا کہ تحریر و کتابت کے ذوق سے قریب قریب بالکل ہی ناآشنا تھا، چند گنے چُنے لوگ تحریر سے واقف تھے، عربی تحریر کا فن بھی بالکل ابتدائی حالت میں تھا، بہت سے حروف ایسے تھے کہ ان کے درمیان باہم کوئی امتیاز نہیں تھا، حروف کی حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کی کوئی علامت نہیں تھی، عربی زبان کے قواعد بھی مرتب نہیں ہوئے تھے، قرآن مجید نہ صرف خدا کی آخری کتاب ہے، بلکہ یہ عربی زبان کی پہلی کتاب بھی ہے، قرآن سے پہلے

عربی زبان میں شعراء کے دیوان اور خطباء کے زریں اقوال سینہ بہ سینہ نقل ہوتے آرہے تھے، لیکن کسی باضابطہ کتاب کا کوئی وجود نہیں تھا۔

قرآن کے نازل ہونے کا سلسلہ جب شروع ہوا تو تحریر کا ذوق بڑھا، اور ایسا بڑھا کہ تین درجن سے زیادہ تو صرف کاتبین وحی کا نام ملتا ہے، پھر جب قرآن عرب کی حدود سے نکل کر عجم کے علاقوں تک پہونچا تو حروف کی شناخت کے لئے نقطے ایجاد ہوئے، حرکات اور صوتی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لئے زَبر، زِیر، پیش، سکون اور تشدید کی علامتیں قائم ہوئیں، اور جو اہلِ زبان نہیں تھے، ان کی آسانی کے لئے عربی گرامر کی ترتیب عمل میں آئی، یہ سب کچھ پیغمبر اسلام کی وفات کے کم وبیش نصف صدی کے اندر ہی ایجاد پذیر ہوا، اور عربی خط کو ایسا ارتقاء حاصل ہوا، کہ جو آرٹ آج عربی تحریر میں ہے، اور جو تنوع اس کے خطوط میں ہے، کسی اور زبان میں شاید اس کا پچیس فیصد بھی نہ ہو، یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

پھر قرآن کی حفاظت بھی کس شان سے ہوئی، اگر ذرا تدبر سے کام لیجئے تو بے اختیار قدرتِ خداوندی پر حمد وستائش کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں، حافظوں نے اس کے الفاظ کی حفاظت کی، آج آپ دنیا کے کسی بھی کونہ میں چلے جائیں، کتنے ہی حافظِ قرآن آپ کو مل جائیں گے، ان میں بہت سے کم عمر بچے بھی ہوں گے، جو ڈھنگ کی گفتگو بھی نہیں کرسکتے، لیکن قرآن کا ایک ایک حرف ان کے سینے میں محفوظ ہے، اگر کسی نماز میں حافظ نے قرآن پڑھنے میں غلطی کی تو کتنے ہی زبانیں لقمہ دینے کے لئے آگے بڑھتی ہیں، اور کسی بڑے مجمع میں قرآن پڑھنے میں غلطی ہوئی تو سینکڑوں آوازیں اصلاح وتصحیح کے لئے بول پڑتی ہیں، اگر کسی مطبع نے ایک لفظ کے چھاپنے میں غلطی کی تو خطوط اور اعتراضات کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ معذرت چاہے بغیر چارہ نہیں۔

جیسے قرآن کے الفاظ کی حفاظت کا سروسامان حفاظ کے ذریعہ ہوا، اسی طرح قرآن کے لب ولہجہ اور اس کے اسلوب تلاوت کی حفاظت مجودین اور قاریوں کے ذریعہ عمل میں آئی، تجوید کیا ہے؟ اس طرز ادا کی نقل وحکایت، جو مہبط وحی جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا، پھر قرآن کا خط بھی ایسا نہیں کہ جس میں ہم آزاد ہوں، بلکہ اس کا رسم الخط بھی توقیفی

ہے،اوراس خط کی بھی ابتدائی دور سے آج تک حفاظت ہوتی رہی ہے، محدثین اور مفسرین نے قرآن کے معنی کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لیا،اور کسی رعایت کے بغیر ہر دور میں گمراہ اور آوارہ فکر اہلِ قلم پر گہری نظر رکھی ، اور معنوی اعتبار سے باطل کی آمیزش سے معانی قرآن کو محفوظ رکھا، عربی زبان اور عربی زبان کے اس لب ولہجہ کا آج تک محفوظ رہنا جس میں قرآن مجید نازل ہوا، بجائے خود ایک بڑا معجزہ ہے۔

دنیا میں کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں کہ خود اس مذہب کے ماننے والے بھی اپنی مذہبی کتاب کو محفوظ قرار دیں، ہندو بھائیوں کے یہاں سب سے معتبر کتابیں ویدیں ہیں، لیکن ویدوں کی تعداد اور جن ویدوں کو آج کل معتبر مانا جاتا ہے، ان کے اشلوکوں کی تعداد میں بھی سخت اختلاف ہے، پھر یہ بھی متعین نہیں کہ یہ کتابیں ان کے عقیدہ کے مطابق کن شخصیتوں پر اُتاری گئیں، پھر جن شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے، وہ نہ صرف تاریخ کے اعتبار سے تاریکی میں ہیں، بلکہ خاص ان کی کتابوں میں بھی اس اہمیت کے ساتھ ان کا ذکر نہیں ملتا، مسلمانوں کے سوا دنیا میں دو آسمانی مذاہب ہیں، ایک یہودی، دوسرے عیسائی، مجموعی طور پر یہ قومیں بائبل کو الہامی کتاب قرار دیتی ہیں، لیکن خود اہلِ مذہب کے نزدیک ان کتابوں کا تحریف شدہ ہونا قریب قریب ایک مسلم امر ہے، اور اس سلسلہ میں اتنی ساری خارجی اور داخلی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، نیز یہ خود بھی معترف ہیں کہ یہ کتابیں جس زبان میں نازل ہوئیں، اب اس زبان میں ناپید ہیں۔ اور ان کا ترجمہ در ترجمہ نئی اصلاحات و ترمیمات کے ساتھ تھوڑے دِنوں پر شائع ہو رہا ہے۔

دنیا میں قرآن ہی ایک ایسی الہامی کتاب ہے، جو بالکل بے آمیز اور محفوظ ہے، قرآن مجید کا وہ نسخہ جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھایا تھا اور شہادت کے وقت آپ اسے تلاوت کر رہے تھے، توپ قاپی سرائے میوزیم استنبول (ترکی) میں ابھی تک محفوظ ہے، جو ہرن کی جھلیوں پر ہے۔ اور اس میں سورۂ بقرہ کی آیت ''فسيكفيكم الله'' پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خونِ شہادت کی چھینٹیں موجود ہیں، اس نسخہ میں اور آج کے مروجہ نسخہ میں کہیں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، اس چیز نے اسلام سے عناد رکھنے والی قوموں کو ہمیشہ حسد میں مبتلا رکھا ہے، انہوں نے

کبھی قرآن کی صحت کو مشکوک کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی معنی میں تغیر وتبدیلی کی، اور کبھی الفاظ میں ملاوٹ وتحریف کی، شاید اہلِ دانش ابھی اس واقعہ کو نہ بھولے ہوں کہ جب مصر میں جمال عبدالناصر حکمراں تھے تو اسرائیل نے بڑی تعداد میں تحریف شدہ قرآن مجید طبع کیا، اور اسے پھیلانے کی کوشش کی، اور غالباً ان کا یہ عمل قابلِ تعجب نہیں، کیونکہ انبیاء کی اہانت اور آسمانی کتابوں میں تحریف وملاوٹ ان کے آباء واجداد کا قدیم شیوہ رہا ہے، اس موقع پر جمال عبد الناصر نے قرآن مجید کے درست نسخے بڑی تعداد میں چھاپ کر عالمِ اسلام اور عالمِ اسلام سے باہر بڑی مقدار میں شائع کیا، غالباً حجاج ثانی جمال عبدالناصر کے نامۂ اعمال میں یہی ایک عمل خیر کا ہوگا، اور اگر کوئی عمل اس کے لئے وسیلہ مغفرت ہوسکتا ہے، تو شاید وہ یہی عمل ہو۔

اب یہودی اور نصرانی قوموں کا بغض ایک نئی صورت میں سامنے آرہا ہے، اور یہ کام نہ نظر آنے والے ہاتھوں سے کرایا جارہا ہے، اور یہ ہیں ''انٹرنیٹ کے ہاتھ'' انٹرنیٹ کی ویب سائٹ WWW.DIASPACE.DIAL.PIPES.COM/TOWN/PARK/GEQ96/ORIGINAL پر قرآن کی سورتوں کے عنوان سے مختلف من گھڑت، بے معنی، زبان وبیان کے اعتبار سے رکیک اور فکر ونظر کے اعتبار سے گمراہ کن عبارتیں آرہی ہیں، اس وقت ایک دردمند بھائی کے بھیجے ہوئے فوٹو اسٹیٹ صفحات میرے سامنے ہیں، جن میں سورۃ الایمان، سورۃ المسلمون، سورۃ الوصایا، اور سورۃ التجسد کے عنوان سے عبارتیں ہیں، ان کو قرآنی اصطلاح ''سورۃ'' کہتے ہوئے دل خون ہوتا ہے، لیکن محض حکایت واقعہ کے طور پر یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے، الایمان میں دس، المسلمون میں گیارہ، الوصایا میں سولہ، اور التجسد میں پندرہ فقرے ہیں، یہ قافیہ بند فقرے ہیں، اور قرآن کے اسلوب پر سجع کی رعایت کے ساتھ انہیں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور بکثرت قرآنی کلمات کا استعمال کیا گیا ہے، ان عبارتوں میں بار بار نعوذ باللہ حضرت عیسی علیہ السلام کے فرزند الٰہ ہونے، ان کے بقول بہ طورِ کفارہ پھانسی پر چڑھائے جانے، رسول اللہ ﷺ کے نعوذ باللہ تالیف قرآن میں ورقہ بن نوفل سے مدد لینے وغیرہ کا ذکر ہے، غرض ان تمام بے ہودہ اور باطل افکار وخیالات کی ترجمانی ہے جو آج تحریف شدہ عیسائیت کا حصہ ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے، اس لئے

حاسدین کا حسد اور معاندین کا عناد خدا کے غیبی نظام کو سر مو نقصان نہیں پہونچا سکتا، لیکن ایک تو اپنی اس نوجوان نسل کا مسئلہ قابلِ فکر ہے جس نے نہ اسلام کو پڑھا ہے، اور نہ اسے برت رہی ہے، اور تھوڑا بہت پڑھا بھی ہے، تو مغرب کے اس غیر معیاری اور تنگ نظری پر مبنی لٹریچر کو جو کوتاہ علموں کو پانی نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں سراب ہی سراب ہے، کہ قرآن کے نام پر ایسے بے ہودہ خیالات، اس کے انگریزی تراجم، اور ترجمہ وتشریح کے ساتھ بخاری وغیرہ کے مغالطہ انگیز حوالہ جات کہیں اس بے خبر نسل کو گمراہ نہ کر دے، دوسرے اگر ایسی ناشائستہ اور ناروا تحریروں کو روکنے کا کوئی ذریعہ اختیار نہ کیا جائے تو خطرہ ہے کہ یہ آوارہ فکر اور آوارہ خیال لوگوں کے لئے مذہبی کتابوں پر مشق ناز کرنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

اس لئے مسلمانوں کا ایسے فتنوں سے باخبر اور ایسی سازشوں کے بارے میں چوکنا رہنا نہایت ضروری ہے، حکومت سے بھی نمائندگی کی ضرورت ہے، کہ اس دل آزار اور گمراہ کن ویب سائٹ کو بند کیا جائے، اگر بروقت ایسے فتنوں کی خبر نہ لی جائے، تو اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہے۔ قرآن یقیناً قیامت تک محفوظ رہے گا، اور وہ اپنی حفاظت میں ہمارا محتاج نہیں، لیکن ہم اپنی کوتاہ علمی اور کوتاہ فکری کی وجہ سے اس کے محتاج ہیں، کہ ایسی معاندانہ سازشوں کے بارے میں باشعور رہیں اور ان کے خلاف جد و جہد کر کے حفاظت قرآن کے غیبی نظام کا ایک حصہ بنیں، اور خدا کے دربار میں ہمارا شمار بھی ان بندوں میں ہو جنھوں نے اس کتاب کی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ کاوش کی ہے۔

(۲/مارچ ۲۰۰۱ء)

شب قدر ــــــ انسانیت کی شبِ نجات

تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی بات ہے، دنیا ظلم و جور کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ کوئی برائی نہ تھی جس سے انسانی سماج محفوظ ہو، پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور سیاروں، چاند، سورج اور ستاروں، یہاں تک کہ انسان کے اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے بتوں اور مورتیوں بلکہ کیڑے مکوڑوں کے سامنے بھی انسان اپنی جبینِ احترام خاک آلود کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتا تھا، ہمارے ملک میں ہر طبقہ نے اپنے لئے خداؤں کی ایک فوج تیار کی ہوئی تھی، اسی شرک و بت پرستی نے لوگوں کو توہم پرست بنا دیا تھا اور ہر چیز میں ''نحس'' کے تصور نے ان کو ارادہ وعمل کی قوت اور تحقیق و اکتشاف کے حوصلہ سے محروم کر دیا تھا، لیکن ظاہر ہے جو انسان کائنات کی ہر چیز کو مقدس خیال کرنے لگے، بلکہ اس کی عبادت و بندگی کرنے لگے وہ تحقیق و تفتیش کا عمل کس طرح جاری رکھ سکتا ہے؟

باہمی ظلم و جور اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ درندے بھی شرما جائیں، کمزور طاقتور کے لئے لقمۂ تر تھے، مسافروں کی نہ جان محفوظ تھی، نہ مال محفوظ تھا اور نہ عزت و آبرو، بڑے بڑے قافلوں کی رفاقت کے بغیر کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں جا سکتا تھا، لوگوں نے بطورِ خود انسانیت کو مختلف طبقات میں بانٹ رکھا تھا، پیدائشی طور پر کچھ لوگ باعزت تصور کئے جاتے تھے اور کچھ لوگ ذلیل و محروم، اس فرقہ بندی نے سب سے زیادہ جہاں اپنا رنگ جمایا وہ ہمارا ملک ہندوستان ہے، یہاں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، برہمن سب سے اونچے خیال کئے جاتے تھے، ان کے بارے میں تصور تھا کہ وہ خدا کے سر سے پیدا کئے گئے ہیں۔ دوسرا طبقہ چھتری کا تھا، جن کے ذمہ ملک کے دفاع کا کام تھا، تیسرا طبقہ ویش جو ملک میں تجارت، بیوپار اور صنعتیں سنبھالے ہوا تھا۔

سب سے محروم وہ لوگ تھے جو ''شودر'' کہلاتے تھے۔ ان پر تعلیم کا دروازہ بند تھا، ان

کے لئے حکم تھا کہ اگر وید کی عبارت بھی سن لیں تو ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جائے، یہ اونچی ذات کے لوگوں کے سامنے بود و باش اختیار نہیں کر سکتے تھے، جس جرم پر اونچی ذات کے لوگوں کو معمولی سزائیں دی جائیں، اسی جرم پر شودر قتل کے حقدار سمجھے جاتے، ایران میں شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کیا جاتا تھا، بادشاہ اور امراء ہیرے اور موتیوں کے تاج سے اپنے سر کو زینت دیتے اور ایران کے کسان اور مزدور سرکاری ٹیکسوں کے بوجھ سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لیتے، عرب میں عربی اور عجمی نسل کی تقسیم تھی، غیر عرب کو حقارت اور ذلت سے دیکھا جاتا تھا، غلام اور عورتیں دنیا میں سب سے زیدہ حقیر انسانی طبقات تھے، عرب کا یہ حال تھا کہ غلام کو باندھ کر ان پر نشانہ کرتے، یوروپ میں بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں درندوں کا غلاموں سے مقابلہ کرایا جاتا اور ان کی ہلاکت کا تماشہ دیکھا جاتا، یہ کھیل ''سیافی'' کہلاتا اور بڑی دلچسپی سے دیکھا جاتا تھا، عورتوں کا حال یہ تھا کہ ایوان کے حکماء اور فلاسفرز کے یہاں یہ بحث جاری تھی کہ کیا عورت میں وہی روح ہے جو مردوں میں ہے؟ بائبل میں عورتوں کو گناہ کا دروازہ قرار دیا گیا تھا، ہندوستان میں بیوی شوہر کی ملکیت تھی اور وہ شوہر کے ساتھ نذرِ آتش کر دی جاتی تھی، وہ کسی جائیداد کی مالک نہیں بن سکتی تھی اور نہ میراث کی حقدار تھی، پوری دنیا میں عورتوں کا حال اس سے مختلف نہیں تھا۔

جب انسانی تمدن پوری طرح خزاں رسیدہ ہو چکا اور جہالت کی گھٹا دنیا کے افق پر ہر سو چھا چکی تو رمضان المبارک کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور غالباً ستائیس تاریخ، کہ کائنات پر رحمت کی گھٹا چھائی اور ابرِ کرم ''حرا'' کی سمت اُترا، پیغمبر اسلام محمد ﷺ پر پہلی وحی اُتری۔ یہ خدا کا آخری پیغام تھا اور قیامت تک کے لئے تھا، اس کتاب نے سب سے پہلے انسانیت کو جس بات کی دعوت دی، وہ تھی پڑھنے کی، علم کی، سیکھنے کی، قلم پکڑنے کی، کہ جب علم کی شمع روشن ہوگی اور فکر و نظر کا چراغ جلے گا تو خود بخود تاریکیاں چھٹیں گی اور جہالت کے تمام پردے چاک ہوں گے، ظلم و ناانصافی کا دروازہ بھی بند ہوگا، شرک و اوہام پرستی کا بھی خاتمہ ہوگا اور انسانیت کو امن و آشتی، سکونِ قلب، سلامتی فکر و نظر، اُخوت و بھائی چارگی، محبت و احترام آدمیت کی متاعِ گراں مایہ ہاتھ آئے گی۔

چنانچہ قرآن مجید نے ایسا بہار آفریں انقلاب دنیا کو عطا کیا کہ یا تو اسلام سے پہلے پورے مکہ میں صرف تین یا اس سے کچھ زیادہ افراد تھے جو لکھنا جانتے تھے، یا وقت آیا کہ محض کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس سے متجاوز تھی، تحقیقِ کائنات اور سائنسی انداز سے غور وفکر کا ایک نیا دور شروع ہوا، اسلام کے اس تصور سے کہ پوری کائنات انسان کی خادم ہے، کائنات کی ہر شئے کے بارے میں تحقیق وتفتیش کا حوصلہ پیدا ہوا، انسانی مساوات و برابری کے عقیدہ نے اتنا اثر و رسوخ حاصل کیا کہ طبقاتی تقسیم اور تفریق کے تصور نے پوری دنیا میں منہ چھپانا شروع کر دیا، عورتوں کو اسلام کی تاریخ میں پہلی بار عزت واحترام کا مقام حاصل ہوا اور سماجی زندگی میں ایسا متوازن قانون عطا ہوا کہ قوانین عالم اس کی خوشہ چینی سے چارہ نہیں پاتے، غلاموں کو انسانوں کا درجہ عطا کیا گیا اور چند صدیوں میں بتدریج غلاموں کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا، یہاں تک کہ جانوروں اور چرند و پرند کے بھی حقوق متعین ہوئے اور ان کے بارے میں بھی انسان کو بے قید نہیں رکھا گیا۔

یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ بنیادی طور پر اس کتاب نے دو باتوں کی دعوت دی: وحدت الٰہ اور وحدتِ انسان، یعنی اللہ ایک ہے، اللہ کے سوا کوئی نہیں جو عبادت کے لائق ہو، اور انسانیت بھی ایک ہے، نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، حکمراں ہو یا رعایا، دولت مند ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، گورا ہو یا کالا، عربی ہو یا عجمی، خالق کائنات کی نگاہ میں یہ سب برابر ہیں، البتہ ہر انسان کے عمل اور اس کی نیکیوں کے اعتبار سے خدا کے یہاں اس کا درجہ متعین ہوگا، شب قدر در اصل اسی عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور شب قدر کی عبادت اسی انعامِ خداوندی پر اللہ کا شکر بجالانا ہے، اس لئے یہ صرف دُعا کی قبولیت ہی کی رات نہیں، بلکہ تمام انسانیت کے لئے شب نجات ہے، اوہام سے نجات کی رات، انسانی غلامی سے نجات کی رات، طبقاتی ظلم و جور سے نجات کی رات اور جہل و گمراہی سے نجات کی رات!

(۲۶/جنوری ۱۹۹۸ء)

ہمدردی وغم گساری کا مہینہ

ایک بار ایک صاحب خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، وہ بھوکے تھے، آپ ﷺ سے فاقہ مستی کا ذکر کیا اور کھانے کے خواستگار ہوئے، آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے یہاں خبر بھیجی، قاصد ایک ایک کے یہاں گیا، اور واپس آیا کہ حرمِ نبوت میں کسی کے یہاں سوائے پانی کے کھانے کی کوئی اور چیز نہیں، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے خواہش کی کہ کوئی ان کی مہمان نوازی کرے، ایک صحابیؓ اپنے ساتھ لے گئے، گھر جا کر احوال معلوم کئے، بیوی نے بتایا کہ گھر میں صرف بچوں کی ضرورت کے مطابق کھانے کا سامان ہے، اتنا بھی نہیں کہ ہم لوگوں کے لئے گنجائش نکل پائے، فرمایا: کچھ حرج نہیں، بچوں کو سلا دو، جب بچے سو جائیں تو کھانا تیار کرو، کھانا لا کر رکھو اور چراغ درست کرنے کے بہانہ چراغ بجھادو، مہمان خیال کریں کہ ہم لوگ بھی کھانے میں شریک ہیں، حالاں کہ ہم لوگ کھانے میں شریک نہ ہوں، چنانچہ خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی کی خواستگار اور شوہر کی اطاعت گزار بیوی نے ایسا ہی کیا، مہمان رسول ﷺ نے سیر ہو کر کھایا، میزبان خود بھی بھوکے رہے، اور ان کے بچے بھی، اور مہمان پر بارِ خاطر بھی نہ ہونے دیا کہ وہ دوسروں کو بھوکے رکھ کر خود آسودہ ہو رہے ہیں: صبح کو جب میزبان صحابیؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آج شب تم پر ہنسے، تم سے خوش ہوئے اور یہ آیت نازل فرمائی کہ کچھ لوگ ہیں جو باوجود خود فاقہ مستی سے دوچار ہونے کے اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اور جو شخص بخل سے بچالیا جائے وہی کامیاب ہے۔ (بخاری: ۱/۵۳۵)

یہ کوئی معمولی کردار نہیں، لیکن اسلام کے عہد اوّل میں ہر جگہ ایسے تابندہ نقوش ملتے ہیں، محبت وغم گساری کے ایثار، ہمدردی اور انسانیت کی غم خواری کے، اور خود سہہ

کر دوسروں کو سکھ پہونچانے کے، اس کی وجہ یہ تھی کہ توحید اور خدا کی بندگی کے بعد آپ ﷺ سب سے زیادہ جس بات پر زور دیتے تھے، وہ یہی انسانی ہمدردی اور غم گساری ہے، آپ ﷺ کوئی موقع اس کا ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے خاص طور پر غم گساری اور مساوات کا مہینہ قرار دیا، اس مہینہ میں انفاق اور اللہ کے بندوں کی اعانت و مدد کی خاص کر تاکید فرمائی، خود آپ ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ اس ماہ مبارک میں انفاق اس قدر بڑھ جاتا کہ گویا تیز ہوا ہو، رمضان المبارک میں اپنے غریب بھائیوں کی مدد اور اعانت کی خصوصی تاکید و اہتمام کی وجہ ظاہر ہے، مسلمان غریب ہو یا مالدار، روزہ ہر ایک کو رکھنا ہے، اور اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے بھوک و پیاس سہنی ہے، یہ بھوک و پیاس اپنے غریب بھائیوں کی فاقہ مستی کی تلخ کامیوں کا احساس دلاتی ہے، جب انسان خود اس راہ سے گزرتا ہے تو ان سے لوگوں کی مشقتیں اس کے لئے ایک ''ذاتی تجربہ'' بن جاتی ہیں، جن کو بار بار اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اور آپ بیتی انسان پر جگ بیتی سے زیادہ اثر ڈالتی ہے، اسی کو کلیم عاجز نے کہا ہے:

پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے
پریشانی ہماری کاکُلِ محبوب جانے ہے

مواسات وغم گساری کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور ہر شخص کے لئے اس کی حیثیت کے لحاظ سے ہے، تاجر ہو تو گاہک کا خیر خواہ ہو، اسے دھوکہ نہ دے، مناسب سے زیادہ قیمت نہ لے، ڈاکٹر اور معالج ہو تو مریض کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے، علاج کرتے ہوئے خدمتِ خلق کے جذبات کو بھی دل کا رفیق بنائے رہے، غریب مریضوں کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے، اور تند خو بیماروں کو سہے، پڑوسی ہو تو دیکھے کہ اس کے پڑوس پر کیا گذرتی ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص جو خود آسودہ ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا، اس طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، جس کا پڑوسی اس

کے شر سے اپنے آپ کو محفوظ نہ پاتا ہو، یتیموں کی خبر گیری، اور ان کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنا، بیواؤں اور بے کسوں کی مدد کے لئے آگے بڑھنا، بوڑھوں کو سہارا دینا، اور مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار، یہ سب ''مواسات'' میں داخل ہے، غرض انسان کی خدمت کو خدا کی عبادت کا سا درجہ دیا ہے، غور فرمایئے! اگر کوئی شخص روزہ نہیں رکھ سکتا تو ہر روزہ کے بدلہ ایک محتاج کو دن اور رات کا کھانا کھلانا ہے، اگر جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ایک روزہ کا کفارہ ساٹھ روزہ رکھنا ہے، اور روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ محتاج شخص کو دو وقت کا کھانا کھلانا ہے، گویا روزہ جیسی عبادت کو ایک غریب شخص کی مدد کے ہم پلہ رکھا گیا۔

اللہ کی محبت سے اللہ کی مخلوق کی محبت بڑھتی ہے، اور انسان کو غریبوں کی جھونپڑیوں اور بے کسوں کے غربت کدوں میں اللہ کو ''پانے'' کا یقین پیدا ہوتا ہے، وہ دوسروں کی ضرورتوں کے مقابلہ اپنی ضرورت کو بھول جاتا ہے، اسے لگتا ہے کہ اپنے دوسرے بھائی کی مدد کی راہ میں کھودینا پانے سے زیادہ لذیز ہے، مکہ سے جب اہلِ ایمان کا لٹا پٹا قافلہ مدینہ پہونچا تو ان کے پاس کچھ نہ تھا، نہ گھر، نہ در، نہ مال و متاع، نہ سامان و اسباب، اہل مدینہ بھی کچھ بہت اہل ثروت نہیں تھے، کچھ باغات اور معمولی سی کھیتیاں، بہتوں کا گزراوقات مزدوری پر تھا، لیکن آپ ﷺ کی مبارک تعلیمات اور مسعود صحبتوں سے تنگ دستی کے باوجود دل کشادہ رکھتے تھے، اور مواسات و ایثار گویا ان کی طبیعتوں میں داخل ہوگیا تھا، اس لئے ''غریب ہٹاؤ'' مہم چلانے کی حاجت نہ پڑی اور مدینہ کے حوصلہ مندوں نے اپنی پوری کائنات آپ ﷺ کے قدموں میں رکھ دی، اس لئے ''انصار'' کے لقب سے نوازے گئے، اور نصرت و اعانت کا ایسا نقشہ پیش کیا کہ شاید ہی اس زمین کے سینہ اور آسمان کے سایہ میں اس کی کوئی اور مثال مل سکے۔

''روزہ'' اگر سحر و افطار کا اہتمام پیدا کردے، چند دنوں کسی قدر نماز کی رغبت بھی

ہو جائے، عید کے نئے کپڑے سلائے اور پہنے جائیں، لیکن مواسات وغم خواری کا جزبہ پیدا نہ ہو، بھوکوں، پیاسوں کے دکھ سے دل میں کوئی ٹھیس نہ اٹھے، غریبوں اور محتاجوں کی محبت کی کوئی لہر موجزن نہ ہونے پائے اور پریشان حال بھائیوں اور سماج کے دبے، کچلے لوگوں کے لئے دل دکھی اور آنکھیں اشکبار ہونا نہ سیکھیں، تو شاید روزہ خدا کی ترازو میں ناتمام ہی سمجھے جائیں!!

(۸/نومبر ۲۰۰۲ء)

نیکیوں کی فصلِ بہار

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، جو نیکیوں کی فصلِ بہار ہے اور تہی دامانِ عمل کو بقدرِ توفیق اس فصل گل سے استفادہ کا موقع فراہم کرتی ہے، رسول اللہ ﷺ کو اس ماہِ مبارک کا اس قدر اہتمام تھا کہ اس کی آمد سے پہلے ہی آپ ﷺ لوگوں کو اس ماہ کی برکتوں اور سعادتوں کے بارے میں خبر دار فرماتے اور عبادت کی طرف خاص طور پر انہیں متوجہ کرتے۔ اس ماہ کا اصل اور بنیادی عمل روزہ ہے، یعنی صبح طلوع ہونے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کھانے، پینے اور دوسرے نفسانی تقاضوں سے اپنے آپ کو باز رکھنا، یہ کوئی معمولی عمل نہیں ہے، انسان کے لئے گھنٹے دو گھنٹے بھی بھوکا رہنا دشوار ہو جاتا ہے، بیمار ہو تو پرہیز مشکل ہو جاتا ہے، دنیا کی ساری لذتیں انہی خواہشات سے متعلق ہیں، آدمی بطورِ خود اپنے آپ کو ان سے روک لے، حالاں کہ اس کو روکنے کے لئے نہ کوئی چوکیدار ہو، نہ کوئی قانونی پہرہ دار اور نہ جسمانی مضرت ونقصان کا اندیشہ۔

یہ انسان کی تربیت کا نہایت مؤثر اور بے مثال طریقہ ہے، جس سے محض روحانی مقاصد کے تحت اپنے آپ پر قابو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور انسان کے لئے یہ بات ممکن ہوتی ہے کہ وہ نفس کے گھوڑے کے لگام کو اپنے ہاتھ میں رکھے، جو شخص نفس کی آواز کو دبانے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت حاصل کر لے اس کے لئے کسی بھی گناہ سے بچنا چنداں دشوار نہیں، اسی لئے روزہ کو تقویٰ کا باعث قرار دیا گیا اور رمضان کے مہینہ کو صبر کا مہینہ فرمایا گیا۔

لیکن دنیا کی ہر چیز میں صورت اور حقیقت کا ایک فرق پایا جاتا ہے، شیر کی تصویر میں شیر کی طاقت اور آگ کی تصویر میں آگ کی حرارت نہیں آسکتی، شیر کی خوفناک اور بھیانک اسٹیچوں سے دن رات بچے کھیلتے ہیں اور آگ کی تصویر سے لوگ اپنے گھر

سجاتے ہیں، لیکن اگر جاں بہ لب زندہ شیر بھی ہو تو اچھے اچھے بہادر بھی قریب جانے کی ہمت نہیں پاتے اور آگ کی ایک چنگاری بھی ہو تو پورے مکان کو سلگانے کے لئے کافی ہے۔

ہاں عبادات میں بھی صورت اور حقیقت کا فرق ہے، محض بھوکا پیاسا رہنا روزہ کی صورت ہے نہ کہ حقیقت، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو جھوٹ بولے اس کا روزہ نہیں، جو غیبت کرے اس کا روزہ نہیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے روزہ داروں کو روزہ سے بھوک و پیاس کے سوا کوئی چیز حاصل نہیں، یہ روزہ کی صورتیں ہیں، ایسی صورت جو روح اور زندگی سے خالی ہیں، روزہ تو اس لئے ہے کہ انسان کا سینہ خدا کی محبت سے معمور ہو جائے، اس کا دل سب کچھ کھو کر خدا کو پانے کے جذبہ سے لبریز ہو اور گناہوں کی نفرت اس کے دل میں سما جائے، اس کی نگاہ ایک پاک دامن نگاہ ہو، اس کی زبان قند و نبات کی مٹھاس سے ہم کنار اور ہر طرح کی بدگوئی سے محفوظ ہو، اس کے اعضاء و جوارح کو نیکی سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا ایک عاشق ہے جو اپنے محبوب کو خوش کرنے کے لئے بھوکا، پیاسا اور دنیا کی لذتوں سے بیگانہ بنا ہوا ہے، اگر روزہ اس کیفیت کے ساتھ رکھا جائے تو یقیناً اس سے نفس کی تربیت ہوگی، انسان کے اندر برائی سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور انسان اپنے نفس کی غلامی سے آزاد ہو سکے گا، یہ تربیتی نظام اسے آئندہ گیارہ مہینوں میں بھی خدا کی مرضیات پر قائم رکھے گا، اس لئے روزہ کو حقیقت کی سطح پر رکھنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ خدا کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنے کا ایک عنوان ہے!

اس ماہِ مبارک میں رسول اللہ ﷺ پر نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، ہر سال حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید کے ایک ختم کا آپ ﷺ سے مذاکرہ فرماتے، جس سال وفات ہوئی اس سال آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا دو دور فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس ماہ کو قرآن مجید سے ایک خاص مناسبت ہے، اسی لئے اس مہینہ میں خاص طور پر تراویح کی نماز رکھی گئی، کہ اس

میں پورا قرآن مجید ختم کیا جائے، تہجد میں بھی زیادہ طویل قیام اور اسی نسبت سے قراءت کا معمول مبارک تھا، اسی لئے سلف صالحین کے یہاں اس ماہ میں قرآن مجید کی تلاوت کا بھی خاص اہتمام رہا ہے۔ اس لئے جہاں رمضان کے دن روزہ کے نور سے منور ہوں، وہیں رمضان کی راتیں تلاوتِ قرآن سے آباد ہونی چاہئے، یہ ہماری کم نصیبی ہے کہ خدا کی آخری اور کائنات میں موجودہ واحد سچی کتاب اس امت کے پاس ہے، جس کا حق یہ تھا کہ مسلمان کا کوئی دن اس کی تلاوت سے خالی نہ ہو، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ پورا سال گذر جاتا ہے اور بہت سے بے توفیقوں کو قرآن مجید کے ایک ختم کی توفیق بھی میسر نہیں آتی، اس لئے یوں تو پورے سال تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرنا چاہئے، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم رمضان کو تو ضائع نہ ہونے دیا جائے، عام طور پر بیس منٹ میں ایک پارہ مکمل ہو جاتا ہے، اگر روزانہ صرف ایک گھنٹہ تلاوت کا وقت رکھا جائے تو با آسانی ہر دس دن میں ایک ختم ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی وقت ایک گھنٹہ قرآن کے ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کے لئے بھی رکھ لیا جائے تو یہ کیا کہنا ہے، ہونا تو یہ چاہئے کہ سال بھر ترجمہ وتفسیر کے مطالعہ کا اہتمام ہو، لیکن اگر یہ نہ ہو سکے، تو کم سے کم رمضان میں کسی ایک بڑی سورت، یا منتخب سورتوں ہی کا مطالعہ کر لیا جائے، تاکہ بندہ یہ جان سکے کہ اس کا خدا اس سے کیا کہہ رہا ہے، یہ کیسی محرومی ہے کہ ہمارا خدا ہم سے مخاطب ہو اور ہم اس کی طرف متوجہ نہ ہوں؟ وہ ہم سے بات کرے اور ہم اپنے کان بند کر لیں، اس کا کلام اپنی جلوہ فرمائیوں کے ساتھ ہم پر آشکار ہو اور ہم اپنی آنکھیں موند لیں، کیا اس سے زیادہ حق ناشناسی کی بھی کوئی اور مثال مل سکتی ہے؟

رمضان المبارک کا تیسرا اہم عمل دعاء ہے، یہ دعا کی قبولیت کا مہینہ ہے، رمضان کی راتوں میں اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے، کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے بخش دوں، کوئی ہے رزق کا خواستگار کہ میں اسے روزی دوں، ہے کوئی ضرورت مند کہ میں اس کی حاجت روائی کروں؟ اس سے زیادہ کم نصیبی کیا

ہوگی، کہ داتا خود سائل کو طلب کرے اور سائل اپنا دستِ سوال نہ پھیلائے، تہجد کا وقت دعا کی قبولیت کا ہے، افطار کے وقت دعا قبول ہوتی ہے، رمضان المبارک کا آخری عشرہ جس میں شبِ قدر کا امکان ہے، دعا کی قبولیت کی خاص ساعتوں پر مشتمل ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ پوری ملتِ اسلامیہ زخم سے چور ہے اور پورا عالمِ اسلام یہود و نصاریٰ کے پنجہ استبداد سے کراہ رہا ہے، خود ہندوستان میں مسلمانوں کے گرد فرقہ پرست تنظیمیں گھیرا تنگ کرتی جارہی ہیں، ان حالات میں دعا مؤمن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے، مگر بدقسمتی سے افطار کے لئے ایک سے ایک کھانے کا انتخاب اور دسترخوان کو خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن یہ وقت دعا کی قبولیت اور اللہ سے مانگنے اور اپنے خالق کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا ہے، اسی کو فراموش کردیا جاتا ہے، اس لئے ہم اس ماہ کو دعا کا مہینہ بنالیں، خدا سے مانگنے اور خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا مہینہ۔

رسول اللہ ﷺ نے اس ماہ کو غم گساری کا مہینہ (شہر المواساۃ) بھی فرمایا ہے، یعنی جیسے یہ خدا کو راضی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے کا مہینہ ہے، اسی طرح یہ خدا کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور بہتر برتاؤ کا مہینہ بھی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سخاوت اس ماہ میں تیز ہوا سے بھی بڑھ جاتی تھی، اسی لئے بعض صحابہؓ اس ماہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے اور آج کل بھی لوگ خاص طور پر اسی مہینہ میں زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن زکوٰۃ تو ایک لازمی فریضہ ہے اور انفاق کا وہ کم سے کم درجہ ہے جس سے انسان جوابدہی سے بچ سکتا ہے، لیکن جیسے رمضان میں فرائض کے ساتھ نوافل کا اہتمام کیا جاتا ہے اسی طرح زکوٰۃ کے ساتھ عمومی انفاق پر بھی توجہ ہونی چاہئے بہت سے لوگ محتاج وضرورت مند ہوتے ہیں، لیکن زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوتے، بہت سے دینی کام ایسے ہیں جن میں زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جاسکتی، ایسے مواقع پر عمومی انفاق امت کے لئے ایک ضرورت ہے اور اصحابِ ثروت کو محسوس کرنا چاہئے کہ یہ بھی ان پر ایک حق ہے،

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مال میں زکوۃ کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں، ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ۔

آیئے ہم عہد کریں کہ ایمان و عمل کی اس فصل بہار سے ہم اس کے تقاضہ کے مطابق فائدہ اٹھائیں گے اور اپنی عملی زندگی کو اس کی خوشبو سے عطر بار کریں گے!

(۱۶/نومبر ۲۰۰۱ء)

صبر کی تربیت

''صبر'' کے اصل معنی عربی زبان میں ''رکنا'' اور ''روکنے'' ہیں، (القاموس المحیط: ۵۴۱/۱) اسی مناسبت سے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنے کو بھی ''صبر'' کہا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں اکثر یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں کسی فرد، جماعت یا قوم کے لئے قوت برداشت، تحمل اور صبر کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے ۱۰۷ مواقع پر مختلف انداز سے صبر کی تلقین یا تعریف کی ہے، یا کم سے کم اس کا ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید نے ایک موقع پر اللہ سے مدد لینے کا دونکاتی طریقہ بتایا ہے، ان میں ایک نماز ہے، جو اللہ کی طرف رجوع کرنے کا عنوان ہے اور دوسرا ''صبر'' ہے، پھر صبر کی مزید تاکید اور اہمیت کے اظہار کے لئے آگے ارشاد ہوا کہ ''اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔''

''صبر'' کا ایک سادہ سادہ مفہوم ہے، جو سماج میں سمجھا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کی شخصی زندگی میں بعض اوقات دل دکھانے والے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ کسی عزیز کی موت، کسی کی بیماری، مالی نقصان۔ ایسے واقعات پر آہ وزاری کرنے کے بجائے فیصلہ خداوندی سمجھ کر اس پر خاموشی اختیار کرنا یقیناً یہ بھی صبر ہے، لیکن صبر صرف اس کا نام نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ خدا کا حکم بجالانے میں اگر کوئی بات خلافِ طبع ہے تو اس کو خوشی سے برداشت کیا جائے۔ جو لوگ نماز کے عادی نہ ہوں، ان کے لئے پنج وقتہ نماز کا اہتمام بھی دشوار ہوتا ہے، گرما میں تپش سے گذر کر ظہر کی نماز میں مسجد پہنچنا اور ٹھنڈک میں خشک ہواؤں کو برداشت کرتے ہوئے نمازِ فجر کا اہتمام کرنا خدا کی محبت کے بغیر آسان نہیں، صبر یہ بھی ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنا طبیعت پر گراں گذرتا ہو اور اپنی خو سے باز آنے کو دل تیار نہ ہو، لیکن انسان اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھنا

سیکھ لے اور رضاءِ خداوندی کی قربان گاہ پر اپنی چاہتوں کو بھینٹ چڑھادے، کوئی شخص شراب کا عادی ہے، اس بری عادت کو چھوڑنا، طبیعت نہیں مانتی، ایسے مواقع پر اپنی طبیعت پر قابو پانا اور شریعت کے حکم کو نفس کے حکم پر غالب رکھنا صبر میں داخل ہے، اسلام نے نکاح کو سادہ اور آسان رکھا ہے، نہ گانا بجانا، نہ رقص و سرور، تکلفات اور تعیشات سے خالی و عاری، لیکن دوستوں کی، بزرگوں کی، عورتوں کی، بچوں کی اور کسی قدر خود اپنی خواہش گدگدا رہی ہے کہ آج بھی نغمہ و رقص کی مجلس نہ سجائی گئی، قہقہوں اور روشنیوں کا دریا نہ بہایا گیا، پٹاخوں سے فضا گرمائی نہ گئی اور کچھ اپنی دولت و ثروت کے نقوش دل و ذہن پر قائم نہ ہوئے تو یہ بھی کچھ شادی ہوئی؟؟ ایسے موقع پر دل خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جائے کہ تیری خواہش ہر خواہش سے بالا ہے اور تیری رضا جوئی پر ساری آرزوئیں قربان ہیں، یہ بھی صبر کے امتحان کا ایک کٹھن موقع ہے اور کم پاک نفوس ہیں جو اس امتحان میں پورے اتر جائیں!

''صبر'' اس وقت بڑا صبر آزما ہو جاتا ہے جب اس کا رشتہ بندوں کے حقوق سے ہو، کسی بھائی سے زیادتی ہوگئی، انتقام کی آگ رگ و پے میں سلگ رہی ہے، انتقام پر قدرت بھی ہے، خدا جو قادر مطلق ہے اور جو ہر وقت اپنے گنہگار بندوں کی خطاؤں سے درگذر کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ صبر و حلم کی شبنم سے اس شعلۂ غضب کو بجھادے، تاکہ تم بھی بارگاہِ خداوندی میں اسی سلوک کے مستحق ٹھہرائے جاؤ، اس وقت غصہ کو پی جانا اور عفو و درگذر کی راہ اختیار کرنا ''صبر'' ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص طاقتور ہے اثر و رسوخ رکھتا ہے، زبردستی کسی کا حق دبائے ہوئے ہے، مظلوم کو نہ طاقت و قوت حاصل ہے، نہ عدالت تک رسائی ہے، اس کے باوجود انسان یہ سمجھے کہ اسے اپنے ظلم کا حساب دینا ہوگا اور آج وہ جتنا طاقتور ہے خدا کے سامنے کل وہ اتنا ہی کمزور ہوگا، یہ تصور اسے لرزادے، اس کا دل کانپ اٹھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوسرے کا حق اس کے حوالہ کردے، یہ بھی ''صبر'' میں داخل ہے، کیوں کہ اس نے اپنے جذبات و خواہشات پر روک لگائی ہے اور اپنے مفادات سے محرومی کو گوارا کیا ہے۔

’’صبر‘‘ کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی مسائل سے بھی ہے۔ بعض واقعات جذبات کو بھڑکانے والے ہوتے ہیں، مخالفین چاہتے ہیں کہ آپ مشتعل ہوں، کیوں کہ جو قوم بات بات پر مشتعل ہوتی رہتی ہے، وہ کوئی ٹھوس اور تعمیری کام نہیں کرسکتی اور ہمیشہ طویل المدت منصوبہ بندی سے محروم رہتی ہے، وہ اپنی پوری قوت لایعنی مسائل میں صرف کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کو اہل مکہ نے مشتعل کرنے کی کم کوشش نہ کی، مدینہ میں یہودیوں نے براہِ راست بھی اور منافقین کے واسطہ سے بھی اشتعال پیدا کرنے اور الجھانے کا کم سامان نہیں کیا، لیکن آپ ﷺ نے کبھی ایسی حرکتوں کو ’’مسئلہ‘‘ نہیں بنایا اور اپنی اور مسلمانوں کی بہترین صلاحیت کو وقتی مسائل میں صرف نہیں ہونے دیا، بلکہ خاموشی سے اسلام کی دعوت کو دور دور تک پہنچانے، مسلمانوں کی فکری اور عملی تربیت کرنے اور طویل المدت اور دور رس منصوبہ بندی کے ذریعہ اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا سدِ باب کرنے میں مشغول رہے، جس نے بالآخر مسلمانوں کو فتح مندی سے سرفراز کیا۔ سیرت نبوی ﷺ میں اس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں اور سب سے بڑی مثال خود ’’صلح حدیبیہ‘‘ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی سطح پر بھی آج مسلمانوں میں ’’صبر‘‘ کی صلاحیت پیدا کرنا بہت بڑی ضرورت ہے اور یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بزدلی اور فرار دوسری چیز ہے اور خوش تدبیری اور وقتی اعراض ایک دوسری چیز، صبر بزدلی نہیں بلکہ خوش تدبیری سے عبارت ہے!

رمضان المبارک کو آپ ﷺ نے صبر کا مہینہ قرار دیا (بیہقی عن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ) یعنی یہ مہینہ اس لئے ہے کہ آدمی صبر کرنا سیکھے۔ دن بھر کھانے پینے اور دوسری انسانی ضرورتوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنے میں صبر کی تربیت ہے۔ روزہ سے انسان میں صبر کی جو کیفیت مطلوب ہے، اس کو آپ ﷺ نے اس طرح واضح فرمایا کہ روزہ دار فحش کلامی نہ کرے، بری بات نہ بولے، شور نہ کرے، اگر کوئی دوسرا شخص اسے برا کہے، گالی دے یا اس پر ہاتھ اٹھائے تو کہہ دے کہ میں برائی کا جواب برائی سے نہیں دے سکتا، کیوں کہ میں

روزہ سے ہوں''فان سابہ احد او قاتلہ فلیقل انی صائم ''(بخاری عن ابی ہریرۃ) یعنی میں صبر کی تربیت پا رہا ہوں اور برائی کا جواب بھلائی سے دینے اور جاہلانہ رویہ کو برداشت کرنے کی مشق کر رہا ہوں، اس لئے اس وقت کسی ردعمل کا اظہار ہمارے اس کاز کے خلاف ہے جس میں ہم مصروف ہیں۔

(۱۷/ دسمبر ۱۹۹۹ء)

رمضان المبارک کا پیغام

رمضان المبارک اپنی تمام رعنائیوں اور بہاروں کے ساتھ گذرنے کو ہے، آیئے! پھر ایک بار ہم رمضان کا سبق تازہ کریں، ماہ مبارک سے ہمیں کیا کیا سبق ملتا ہے؟ اس ماہ کے تقاضے کیا تھے؟ اور ہماری زندگی میں ان کا کیا اثر ہونا چاہئے؟ آیئے ہم اپنا احتساب کریں، اور اپنی عملی زندگی کو اس آئینہ میں دیکھ کر اسے سنوارنے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں مجاہدہ کی تربیت دیتا ہے، مجاہدہ سے مراد مشقتوں اور خلاف طبیعت باتوں کو برداشت کرنا ہے، بھوک، پیاس، دوسری خواہشات سے اجتناب، زبان کی حفاظت، رات میں عام معمول سے زیادہ تراویح کی بیس رکعتوں کی ادائیگی، وہ بھی طویل قیام وقراءت کے ساتھ، دن بھر کی فاقہ مستی کے بعد کھانا، کھانے کے بعد نماز، نماز کے بعد کچھ دیر سو کر پھر اٹھ جانا، اللہ توفیق دے تو چند رکعات تہجد ورنہ کم سے کم سحری، موقع بہ موقع قرآن مجید کی تلاوت، یہ معمولات کا ایسا سلسلہ ہے جو یقیناً انسان کو تھکا دینے والا اور اس کے عام مزاج و مذاق کے خلاف ہے، اس سے ہماری تربیت ہوتی ہے، کہ ہم اپنے اندر خلاف طبیعت باتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں، ہم بلند مقاصد کے لئے آبلہ پائی کر سکیں، طوفان ہمارے حوصلے پست نہ کریں، آندھیاں ہمارے قدموں کو کم ہمت نہ بنادیں، نامساعد حالات ہمارے لئے زنجیر پا نہ بن جائیں، بلکہ اگر ہمارے سفر کی سمت صحیح ہو تو ہم اس کے لئے ہر طرح کی مشکلات اور ابتلاؤں کو سہنے کے لئے تیار ہوں، یہ حوصلہ مندی اور آبلہ پائی ہماری شخصی زندگی کے لئے بھی ضروری ہے اور قومی زندگی کے لئے بھی، افراد و اشخاص کے لئے بھی ضروری ہے، اور جماعتوں اور تنظیموں کے لئے بھی، کامیابی کسی مادی مقصد کو حاصل کر لینے کا نام نہیں، بلکہ خدا کی خوشنودی کی راہ پر چلنے کا نام ہے، اس راہ میں کھونا بھی

پانا اور اس راہ میں مرنا بھی جینا ہے۔

رمضان المبارک ہمیں قرآن مجید سے وابستگی کا سبق دیتا ہے، اس ماہ میں قرآن نازل ہوا، تراویح نزول قرآن ہی کی یادگار ہے، شب قدر اور اعتکاف کا مقصد بھی نزول قرآن کی مبارک شب کو پانا ہے، عید الفطر اسی نزول قرآن کا جشن عام ہے، پس یہ مہینہ قدم قدم پر ہمیں قرآن مجید سے مربوط کرتا ہے، قرآن محض ایصال ثواب اور مردوں کے لئے بخشش ومغفرت کی کتاب نہیں، بلکہ یہ آئینہ حیات ہے، جس میں ہم اپنی عملی زندگی کی صورت گری کریں، اور اس کے خط وخال درست کریں، ہم اپنا جائزہ لیں کہ قرآن سے ہمارا تعلق کس قدر کمزور ہو چکا ہے، ہم تلاوتِ قرآن کے ذوق سے محروم، قرآن ہم سے کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے، اس کے جاننے کی خواہش سے عاری، عملی زندگی میں قرآن کی پیروی کرنے کے بجائے، ہماری خواہشات اور مفادات ہماری رہبر ہیں، قرآن پوری انسانیت کے لئے امانت خداوندی ہے، اس کا حق تھا کہ ایک ایک بندۂ خدا تک اس کتاب کو پہونچایا جاتا، لیکن ہم نے صدیوں اس ملک میں رہنے کے باوجود اپنے برادرانِ وطن تک ان کی اس امانت کو پہونچانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، غرض کہ ہم گو حاملانِ قرآن ہیں، لیکن نہ قاریِ قرآن اور نہ عاملِ قرآن، نہ عالم قرآن اور نہ مبلغ قرآن، اس سے بڑھ کر اس کتاب کے ساتھ کیا ناانصافی ہوگی!

ہمیں چاہئے کہ ہم یہ عہد کریں کہ خود قرآن مجید کی تلاوت کا معمول رکھیں گے، اپنے بچوں اور متعلقین کو تلاوتِ قرآن کا پابند کریں گے، کوشش کریں گے کہ خاندان میں کوئی نہ کوئی شخص حفظ قرآن مجید کی سعادت حاصل کرے، ہم اپنی عملی زندگی کو قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر استوار کریں گے، اور اپنی خواہشات اور وقتی مفاد پر اللہ کی خوشنودی کو غالب رکھیں گے، قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں گے، اگر ہم عربی زبان سے واقف نہیں ہوں تو قرآن کے تراجم اور تفسیروں کے ذریعہ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس کتاب میں ہم سے کیا فرماتا ہے، پھر ہم اس بات کا بھی عزم کریں کہ اپنے اہلِ تعلق غیر مسلم بھائیوں تک قرآن مجید کے تراجم پہونچائیں، تاکہ ہم دعوت کی

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکیں، جو اللہ تعالیٰ نے خیر امت ہونے کی حیثیت سے ہم سے متعلق فرمائی ہے،

رمضان المبارک سے ہمیں مواسات اور غم خواری کا سبق ملتا ہے، جب انسان خود بھوکا رہے، تو وہ بھوک کی تکلیف کو محسوس کر سکتا ہے، اور اپنے ان بھائیوں کے دکھ کو سمجھ سکتا ہے، فاقہ مستی جن کے لئے معمولات کے درجہ میں ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس مہینہ کو "شھر المواساۃ" یعنی غم خواری کا مہینہ قرار دیا ہے، اور اس مہینہ کے ختم پر صدقۃ الفطر واجب قرار دیا گیا ہے، تاکہ اہلِ ثروت مسلمان اپنے غریب بھائیوں کو اپنی مسرت وشادمانی میں شریک کرسکیں، یہ سبق سال بھر یاد رکھنے اور یہ عمل ہر دن دہرانے کا ہے، کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے کام آئے، وہ اس کی مصیبت و پریشانی کو اپنی مصیبت و پریشانی سمجھے، وہ اس وقت تک اپنی خوشی کو نامکمل سمجھے جب تک کہ اس کا بھائی بھی اس خوشی میں شریک نہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری عملی زندگی، اسلامی اخوت کے اس تصور سے دور ہوتی چلی جارہی ہے، اہل دولت اپنی دولت کے نشہ میں سرشار ہیں، امت کے محتاج اور ضرورت مند لوگوں کا انہیں کوئی خیال نہیں، بلکہ ان کی عیش پرستی، غریب مسلمانوں کے لئے پریشانیوں کا موجب ہے، شادی بیاہ کی فضول رسمیں، اور اس میں ہونے والی فضول خرچیاں اصل میں ہمارے مالدار طبقے ہی کی دین ہیں، بیچارے کم آمدنی والے لوگ ان شاہ خرچیوں کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں، غریب خاندانوں میں پیدا ہونے والے بہت سے ذہین بچے مجبوراً تعلیم کو چھوڑ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ بڑھتی ہوئی رشوت ستانیوں کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے، یہ رشوت کا بازار قوم کے دولت مند طبقہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو کچھ معاشی فراغت دی ہو وہ اپنے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں اور انہیں اونچا اٹھانے کی کوشش کریں۔

رمضان ہمیں اوقات کی پابندی اور اسکے انضباط کا بھی سبق دیتا ہے، یوں تو اسلام

میں تمام عبادتیں وقت سے مربوط ہیں، لیکن روزہ میں تو بہت زیادہ انضباط وقت کی ضرورت پڑتی ہے، رات کے آخری پہر میں بیدار ہونا، اور صبح صادق سے عین پہلے سحری کھانا، اگر اس میں ذرا بھی تاخیر ہوا اور صبح طلوع ہونے کے بعد ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا، پھر غروب آفتاب کے فوراً بعد روزہ افطار کرنا ہے، اگر پہلے افطار کرلیں، تو روزہ درست نہ ہو، اور دیر سے افطار کریں تو کراہت ہے، روزہ افطار کرنے اور مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد کھانا کھا کر فارغ ہوئے کہ عشاء کا وقت شروع ہوا، اب نماز عشاء پڑھنا، پھر اس کے بعد تراویح پڑھنی ہے، اگر اللہ توفیق دے تو پھر سو کر اٹھنے کے بعد نماز تہجد ادا کرنی ہے، یہ پورا نظام العمل اس قدر مشغول اور مربوط ہے کہ انضباط وقت کے بغیر ان کو انجام نہیں دیا جا سکتا۔

یہ وقت کی حفاظت کا بہت بڑا سبق ہے، وقت ایسی قیمتی چیز ہے کہ اس کا کوئی بدل نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، وقت کی قدر دانی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے، اور وقت کی ناقدری میں دونوں کا نقصان، اب مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہماری تقریبات نہ وقت پر شروع ہوتی ہیں، نہ وقت پر ختم، یہاں تک کہ ہماری مذہبی تقریبات اور جلسے وغیرہ بھی وقت پر شروع نہیں ہوتے، نہ معینہ وقت پر ان کو ختم کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، بعض دفعہ رات کے دو ڈھائی بجے تک ہماری تقریروں کا جوار بھاٹا ابلتا رہتا ہے، ایسی صورت میں کیسے امید رکھی جا سکتی ہے کہ ہمارے بھولے بھالے سامعین فجر کی نماز ادا کر سکیں گے؟ یہ وقت کے معاملہ میں فضول خرچی اور اسراف ہے، اور یہ مال و دولت کے اسراف سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے۔

روزہ ہمیں اس بات کا عادی بناتا ہے کہ ہم اپنی خواہش پر اللہ کی خوشنودی کو غالب کرنا سیکھیں، بھوک و پیاس انسان کی ایسی خواہش ہے کہ ان کو چند گھنٹے بھی روکنا دشوار ہے، چہ جائے کہ صبح سے شام تک، بظاہر کوئی طاقت روکنے والی نہیں، کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں، اس کے باوجود انسان کھانے پینے سے رکا رہے، اس سے بڑھ کر اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے تابع کرنے کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ یہ ایک رسمی عمل نہیں بلکہ تربیتی عمل

ہے، یہ عمل گوایک ماہ میں فرض ہے لیکن یہ اپنی روح اور مقصد کے اعتبار سے ایک ماہ میں محدود نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ یہ کیفیت ہر مسلمان کی زندگی میں سال بھر قائم رہے، ورنہ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ روزہ دار نے صرف روزہ کی صورت کو پایا ہے، نہ کہ روزہ کی حقیقت کو، اس نے روزہ کے قالب کو حاصل کیا ہے نہ کہ اس روح کو، اور رسول اللہ ﷺ کی زبان حق ترجمان کے مطابق اس نے بھوک و پیاس برداشت کی ہے، حقیقی معنوں میں روزہ نہیں رکھا ہے۔

ہم اپنی عملی زندگی میں بار بار اس امتحان سے گذرتے ہیں، کہ ہمیں خدا کی فرماں برداری عزیز ہے یا نفس کی تابع داری، اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی مطلوب ہے، یا سماجی شہرت و ناموری، نکاح کی تقریبات میں کتنی ہی خلاف شرع باتوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے، فوٹو گرافی، ویڈیو گرافی، بے پردگی، مرد وعورت کا اختلاط فضول خرچی، لڑکے اور اس کے خاندان کی طرف سے مختلف مطالبات، ولیمہ میں بے جا اسراف، عام طور پر یہ سارے گناہ سماجی عزت، جھوٹی شہرت، اور متعلقین کی خوشنودی کے لئے کئے جاتے ہیں، گویا خدا کی ناراضگی کی قیمت پر خلق خدا کی خوشنودی خریدی جاتی ہے، ایسے مواقع پر روزہ ہمیں یاددلاتا ہے کہ مومن نے خدا کی خوشنودی کے بدلے اپنی خوشنودی کا سودا کرلیا ہے، اس لئے اس کو یہ بات قطعاً زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے جیسے انسانوں کی مرضی پر چل کر خدا کو ناراض کرے۔

قرآن نے سود کے حرام ہونے کا اعلان کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے نہایت سختی کے ساتھ نہ صرف شراب پینے بلکہ شراب سے متعلق ہر طرح کے تعاون کو منع فرمایا ہے، لیکن آج مسلمان اہل ثروت بے تکلف اپنی رقم بینکوں میں رکھتے اور اس کا سود حاصل کرتے ہیں، بعض لوگ تو وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی آخری زندگی اس سود پر گذارتے ہیں، کس قدر افسوسناک بات ہے، کہ بڑھاپے میں گناہ کرنے والے بھی، گناہ سے باز آجاتے ہیں، اور توبہ کی راہ اختیار کرتے ہیں، لیکن یہ ایسے محروم القسمت ہیں کہ زندگی بھر محنت کی حلال کمائی کھا کر آخری وقت سود خواری میں گذارتے ہیں، جس شخص کا یقین اللہ

کی رزاقیت پر ہو اور نفس کی خوشنودی پر خدا کی خوشنودی کو غالب رکھنے کی لذت اور حلاوت سے آشنا ہو وہ بھلا آخر عمر میں اس سود خواری کو کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ یہی مواقع ہیں جن میں انسان کی ضبط نفس کی قوت کا امتحان ہوتا ہے، کہ روزہ نے صرف اسے بھوکا، پیاسا رکھا ہے، یا اس میں روحانی اور اخلاقی انقلاب بھی پیدا کیا ہے؟

(۱۴/ دسمبر ۲۰۰۱ء)

تقویٰ ـــــ روزہ کا اصل مقصود

اسلام نے جتنی عبادتیں فرض کی ہیں ان میں انسان کی تربیت اور اصلاح کا پہلو بھی ملحوظ ہے، روزہ بھی ان ہی عبادتوں میں سے ایک ہے، جس میں نفس کی تربیت اور تزکیہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم پر روزہ اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ:۱۸۳)

''تقویٰ'' کا لفظ عربی زبان میں ''وقایہ'' سے ماخوذ ہے، وقایہ کے معنی انتہائی درجہ حفاظت کے ہیں، الوقاية فرط الصيانة (تفسیر کبیر:۱/۳۸۱) تقوی کے معنی جہاں بچنے کے ہیں وہیں خوف اور خشیت کے بھی ہیں، اور قرآن مجید میں مختلف مواقع پر یہ لفظ اسی معنی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: النساء:۱، الشوریٰ:۱۰۶، آل عمران:۱۰۲) گویا محض اللہ تعالیٰ کے خوف سے آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

اسی کو سلف صالحین نے مختلف الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، خود حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جب تک بندہ گناہ کی باتوں سے بچنے کے لئے ازراہ احتیاط بعض جائز باتوں سے بھی اجتناب نہ کرے متقیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ (تفسیر کبیر:۱/۳۸۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے تقوی کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے ایک مثال کے ذریعہ تقویٰ کو سمجھایا، حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا آپ رضی اللہ عنہ کبھی کسی خاردار راستہ سے گذرے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ اس موقعہ سے آپ رضی اللہ عنہ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے پائینچے اٹھا لئے اور احتیاط سے کام لیا۔ ''تشمرت و حذرت'' حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسی کا نام تقویٰ ہے، (تفسیر قرطبی:۱/۱۶۲) گویا دنیا ایک رہگذر ہے جو خاردار جھاڑیوں سے گھری

ہوئی ہے، یہ جھاڑیاں خواہشات اور گناہوں کی ہیں، جو انسان کے دامن عمل سے لپٹ جانا چاہتی ہیں، متقی شخص وہ ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے دامن کو خدا کی نافرمانیوں اور عصیان شعاریوں سے بچا کر دنیا کا یہ سفر طے کرلے۔

اس طرح تقویٰ ایک جامع لفظ ہے۔ جو خیر کی تمام باتوں کو شامل ہے۔ (قرطبی: ۲۶۲/۱) چنانچہ مشہور بزرگ شیخ ابو یزید بسطامی نے فرمایا کہ متقی وہ ہے کہ جو کچھ کہے اللہ کے لئے کہے، اور جو کچھ کرے اللہ تعالیٰ کے لئے کرے، **من اذا قال قال للّٰہ و من اذا عمل عمل للّٰہ** (حوالہ سابق: ۱۶۱/۱)۔ تقویٰ کے اسی وسیع مفہوم کو قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان فرمادیا ہے کہ:

> متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے عطا کیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل فرمائی گئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ (البقرۃ: ۴،۳)

اس سے معلوم ہوا کہ تین باتوں کو تقویٰ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، ان میں پہلی چیز عقیدۂ و ایمان کی اصلاح ہے۔ یہ اسلام کی خشت اوّل ہے، اور اسی پر دین کی پوری عمارت کھڑی ہے، ایمان کا حاصل یہ ہے کہ خدا اور رسول کی بتائی ہوئی ان دیکھی باتوں پر اس کا یقین ایسا ہو جیسا انسان کو دیکھی ہوئی باتوں کا یقین ہوتا ہے، ''یقین'' بہ ظاہر ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن در حقیقت کسی بات کا یقین انسان کی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا داعی ہوتا ہے، اگر لوگوں کے مجمع میں پلاسٹک کا مصنوعی سانپ بنا کر رکھ دیا جائے یا کسی عجائب خانہ میں شیر کا بھیانک مجسمہ بنا ہوا ہو تو کتنے ہی بڑے اور چھوٹے، بچے اور جوان، مرد اور عورت اس کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس سے کھیلتے ہیں اور بعض منچلے تو اس کی سواری کرنے سے بھی نہیں چوکتے، لیکن اگر لوگوں کے مجمع میں اس سے بہت چھوٹا حقیقی اور زندہ شیر آجائے یا سانپ نکل آئے تو ہر شخص کا خوف سے بُرا حال ہوگا، اچھے اچھے

بہادروں کو بھی راہِ فرار مطلوب ہوگی۔ نہ کھیل ہوگا نہ تماشہ ہوگا، نہ تبصرہ کی ہمت ہوگی، یہ ''یقین'' کا فرق ہے۔ حالانکہ شکل وصورت کے اعتبار سے دونوں شیر اور سانپ ہیں لیکن آدمی جس چیز کے بارے میں شیر اور سانپ ہونے کا یقین نہ رکھتا ہو تو خواہ بہ ظاہر وہ کتنا ہی بھیانک نظر آئے اس سے کوئی خوف اور ڈر نہیں ہوتا ہے اور جب شیر ہونے کا یقین ہو جائے تو سوچ کے انداز ہی بدل جاتے ہیں۔

''ایمان'' ایسے ہی انقلاب انگیز یقین کا نام ہے، جو دلوں کی دنیا میں ہلچل پیدا کردے، اور فکر ونظر کی کائنات میں انقلاب کا پیغمبر ثابت ہو، خدا پر ایمان انسان میں ایسی کیفیت پیدا کردے کہ گویا وہ اپنے خالق کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے دامن کو تھامے ہوا ہے۔ خدا کی محبت اس کے دلوں سے امنڈنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی پر چل کر وہ اتنا خوش ہو کہ گویا اس نے سب سے بڑی نعمت پالی ہے۔ خدا کے عذاب کا خوف اس کو لرزا دے اور اس کی آنکھوں کو اشکبار کئے بغیر نہ رہے۔ اسے ایسا لگے کہ جیسے جنت اور دوزخ اس کے سامنے رکھی ہوئی ہے۔ خدا کی کتاب پر اس کو اس درجہ کا یقین حاصل ہو کہ آنکھوں دیکھی باتوں پر بھی آدمی کو اس درجہ اطمینان نہیں ہوتا، اسے یوں لگے کہ جیسے یہ کتاب اسی کو مخاطب کر رہی اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام اور سرگوش ہے۔ اس کیفیت کے بغیر ہمارا ایمان ناقص اور ناتمام ہے۔ ایک بے روح ایمان جو نہ گناہوں سے ہمارے قدموں کو روک سکے اور نہ نیکیوں کی طرف ہمیں لے جاسکے، تقویٰ کے لئے یہ پہلا زینہ ہے!

دوسری چیز جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: ''**اقامت صلاۃ**'' یعنی نمازوں کا قائم کرنا ہے۔ نماز کیا ہے؟ اپنے آپ کو خدا کے آگے بچھا دینا، اور سر سے پاؤں تک اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سانچہ میں ڈھال لینا! زبان خدا کے ذکر سے تر ہے، ہاتھ نیازمندانہ خدا کے سامنے بندھے ہوئے ہیں، آنکھیں ایک غلام کی طرح جھکی ہیں، جسم بے حرکت کھڑا ہے، پھر جب نمازی رکوع میں جاتا ہے تو فروتنی اور بڑھ جاتی ہے، پشت خمیدہ، سرافگندہ، زبان پر تسبیح۔ اب سجدہ کی منزل ہے جو عجز وانکسار اور بے بسی کا نقطۂ عروج ہے۔ سر، پیشانی اور ناک انسان کے عزت ووقار کا سب سے بڑا مظہر ہیں، لیکن خدا کے سامنے یہ

سب زمین پر خاک آلود ہیں۔ ہاتھ بچھے ہوئے ہیں، جسم کے ایک ایک انگ سے خود سپردگی اور غلامی و بندگی ظاہر ہے، قدم قدم پر خدا کی کبریائی کا نعرہ ہے، اس کی حمد و ثناء کا زمزمہ ہے، الحاح والتجا ہے، تضرع و دعاء ہے، اپنی گنہ گاری کا اقرار واعتراف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نماز خدا کی بندگی کا ایسا فطری اور اثر انگیز طریقہ ہے کہ اس کی ایک ایک کیفیت سے روح وجد میں آئے اور انسان کو خدا سے اپنی قربت کا احساس ہونے لگے۔ اس کو یوں محسوس ہونے لگے جیسے وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

پس یہ نماز ایک عنوان ہے، اور اس کے ذریعہ انسان کو ان تمام اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرنا ہے کہ خدا کا کوئی حکم مسلمان سے ٹوٹنے نہ پائے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان اپنی خواہشات اور چاہتوں کا ایسا دیوانہ ہو جائے کہ اللہ کی مرضیات اور اس کی چاہتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، وہ خدا کے حکم کو ہر حکم پر مقدم رکھے۔ اور جہاں نفس کو گراں گذرے وہاں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلہ کو اپنے آپ پر نافذ کرے۔

متقیوں کی تیسری صفت ''انفاق'' ہے۔ انفاق کے معنی خرچ کرنے کے ہیں قرآن کے بیان کے مطابق تقویٰ والوں کی ایک اہم صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی کم وبیش عطا ہوتا ہے وہ اس کا ایک حصہ اپنے غریب بھائیوں پر خرچ کرتا ہے، دراصل دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے وہ مال ودولت ہے۔ اس کی حرص اولاً خدا سے بے توجہ کرتی ہے۔ پھر دولت وثروت کا نشہ دل ودماغ پر چڑھتا ہے اور کبر وغرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی کبر دین واخلاق کے لئے سم قاتل ہے۔ اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، اور وہ لوگوں کے حقوق کو ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے، ''انفاق'' اسی کا علاج ہے۔ گویا انفاق سے صرف دوسرے انسانوں کی مالی اعانت ہی مراد نہیں ہے بلکہ یہ ''**حقوق العباد**'' کے لئے ایک عنوان کے درجہ میں ہے کہ جیسے انسان خدا کے حقوق ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔ اس لئے کہ خدا کا حق اپنی ضرورت سمجھ کر ادا کرے اسی طرح خدا کی مخلوق

کے حقوق کی بھی رعایت کرے۔اس لئے کہ اپنی ضرورت سمجھ کرادا کرنا ہے، خداانسان کی عبادت اور بندگی کا محتاج نہیں۔اورلوگوں کے حقوق کاادا کرنالوگوں کی ضرورت کے پیش نظر ہے کہ انسان محتاج اورضرورت مند ہے۔ اسی لئے بعض وجوہ سے حقوق الناس کی اہمیت حقوق اللہ سے بھی زیادہ ہے۔

اس طرح تقویٰ تین باتوں کوشامل ہے، دل میں ایمان ویقین کی حقیقی کیفیت کو پیدا کرنا،ایسا یقین جودل کی دنیا کو بدل دے،اور خدا کی مرضیات کو بجالانے میں اسے لطف آنے لگے، دوسرے وہ اللہ کے حقوق کوادا کرنے والا ہو، فرائض وواجبات کو پورا کرتا ہواور گناہوں سے بچتا ہو، تیسرے وہ لوگوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، مال کے ذریعہ بھی غریب بھائیوں کا تعاون کرتا ہو۔اوراپنی زبان سے بھی لوگوں کی عزت وآبرو کو محفوظ رکھتا ہو، اس طرح تقویٰ پوری انسانی زندگی کوشامل ہے،اورزندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔

انسان کو چاہئے کہ جیسے وہ اپنی جسمانی بیماریوں کوتلاش کرتا ہے، اسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کوبھی تلاش کرےاوران کے علاج کی طرف متوجہ ہو، کسی کی بیماری ایمان وعقیدہ میں چھپی ہوئی ہے وہ نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، لیکن توہمات کا شکار ہےاور خدا سے نفع ونقصان کے بجائے دنیا کی چیزوں سے نفع ونقصان کا یقین اپنے دل میں بٹھائے ہوئے رہے، خدا کے خزانۂ غیبی سے زیادہ دنیا کے اسباب پراس کا یقین ہے، تو اس کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی اصلاح کرے۔اگرایک شخص نیکیوں کے تمام کام کرتا ہولیکن نماز کی توفیق سے محروم ہوتو نماز کا اہتمام ہی اس کے لئے تقویٰ کی کسوٹی ہے، عبادت کا اہتمام کرتا ہولیکن لوگوں کے حقوق میں غافل ہو، غریب بھائیوں پرخرچ کرنا اس کی ڈکشنری میں نہ ہوتو اس کے لئے تقویٰ کا معیار ''انفاق'' ہے، اگرنماز وروزہ کی بھی توفیق ہو، اللہ کے راستہ میں خرچ بھی کرتا ہو، لیکن اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں، اس کی زبان لوگوں کی عزت ریزی پر کمربستہ رہتی ہو، اس کا سینہ کینوں اور کدورتوں سے معمور ہو، لوگ اس کی ترش روئی سے گھبراتے اوراس کی تندکلامی سے خوف کھاتے ہوں تو اخلاق

میں اس کا تقویٰ چھپا ہوا ہے، اگر وہ اس کی اصلاح کر لے تو ''متقی'' ہے۔

غرض تقویٰ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے، اور تقویٰ کی منزل تک پہنچنا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان اپنی روحانی بیماری کی شناخت کرے، اور جہاں گناہ کا پیپ ہے وہیں اصلاح کا نشتر لگائے، اگر اللہ تعالیٰ نے کچھ نیکیوں کی توفیق فرمائی تو اس سے دھوکہ نہ کھائے کہ کسی مریض کے لئے اس سے زیادہ نقصان دہ کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے آپ کو صحت مند تصور کرنے لگے۔ روزہ کا مقصد ایک مسلمان کو تقویٰ کی منزل تک پہونچانا ہے، اب کہ رمضان المبارک کے آخری ایام ہیں، ہم اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور احتساب کا آئینہ اپنے رخِ زندگی کے سامنے کر دیں اور دیکھیں کہ کیا ہم نے تقویٰ کی طرف سفر شروع کر دیا ہے اور اگر شروع نہیں کیا تو کیا اب بھی اس کا وقت نہیں آیا؟؟

(جنوری ر ۱۹۹۹ء)

عید کا پیغام امت مسلمہ کے نام

آج عید کا دن ہے، خوشیوں اور مسرّتوں کا دن ، نئے خوبصورت رنگا رنگ کپڑوں نے ایک سماں باندھ دیا ہے، بڑے چھوٹے ، جوان بوڑھے، معصوم بچے، مرد اور عورت ہر ایک چہرے کھلے ہوئے ایک دوسرے کو مسکراہٹوں کی سوغات پیش کرتے ہوئے ، سیوئی اور شیر خورما کی تو گویا برسات آگئی ، بڑے ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں اور ننھے منھے بچے گلی کوچوں میں کوئل کی طرح چہچہارہے ہیں اور رنگین و خوب صورت تتلیوں کی طرح اُڑتے پھر رہے ہیں، لیکن عید کا حاصل کیا صرف یہی ہے؟ کیا عید محض ایک ساعت مسرّت ہے جو آئے اور گذر جائے ؟ شاید ایسا نہیں ! اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہر عمل سے پیغام دیتا ہے، عبرت و موعظت کے پہلوؤں کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور زندگی کے ہر واقعہ کو مشعلِ راہ بنا دیتا ہے، جس کی روشنی سے اندھے بھی دیکھنے لگیں اور لنگڑے بھی چلنے لگیں، عبادت و بندگی ہو یا لوگوں کے باہمی معاملات، اسلام کا ہر طریقہ ایک ''بولتا ہوا'' عمل ہے کہ بہرہ بھی اس کو سننے سے محروم نہ رہیں۔

عید بھی سراپا ''پیغام'' ہے، دعوت ہے، عید سب سے پہلے ہمیں اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ مسلمانوں کو خوشی اور مسرّت کے لمحات کس طرح گذارنے چاہئیں۔غور کیجئے کہ مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی دن نہیں، لیکن نہ رقص و سرور ہے، نہ نغمہ و رباب ہے اور نہ مستی شراب ، نہ پٹاخوں کی ادھم ، نہ نعروں کا شور غوغا، نہ آتش بازیاں کا سیلاب ، بلکہ ہر مسلمان صبح دم اٹھتا ہے، نمازِ فجر ادا کرتا ہے، پھر نہاتا ہے، صاف ستھرے اور میسر ہوں تو نئے کپڑے بدلتا ہے اور شانہ بشانہ نمازِ عید کے لئے رواں ہے، آنکھیں جھکی ہوئیں اور زبان پر اللہ کی کبریائی اور حمد و ثنا کے کلمات، عید گاہ پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کرتا ہے

اور اپنی پیشانی خدا کے سامنے مٹی پر رکھ کر اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے، خوشی کے مواقع پر آدمی میں کسی قدر کبر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے بار بار اپنی بڑائی کی نفی اور خدا کی بڑائی کا اقرار واعتراف کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اصل صاحبِ ایمان وہ ہے جو خوشی و مسرّت کے وقت اترانے نہ لگے، اس کی گردن مارے کبر کے اونچی نہ ہو، اس کی زبان پر اپنی بڑائی کا کلمہ نہ ہو، بلکہ وہ خدا کے سامنے جھکتا ہوا ہو، خوشی نے اس کے تواضع وانکسار کو بڑھایا اور اپنی بڑائی کے احساس کو گھٹایا ہو اور اس وقت بھی اس کا دل خدا کی طرف متوجہ ہو اور اس کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم، شادی بیاہ ہو، بچہ کی پیدائش ہو، نیا مکان خدا نے دیا ہو، دکان اور روزگار کا سامان میسّر آیا ہو، کوئی بات خوشی کی پیش آئی ہو تو مسرّت کے اظہار کا وہی طریقہ اللہ کو پسند ہے کہ مؤمن کا سر شکر کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کی زبان اللہ کے ذکر اور حمد و ثنا سے تر ہو۔ عید مسلمانوں کے لئے اجتماعیت اور وحدت کا بھی پیغام ہے، مالدار ہو یا غریب، آقا ہو یا غلام، فرمانروا ہو یا رعایا، سماج کا معزز اور مصروف شخص ہو یا کوئی معمولی اور غیر معروف آدمی، گورا ہو یا کالا اور عربی ہو یا عجمی، ایک ساتھ شانہ بہ شانہ خدا کے حضور کھڑے ہیں اور اس کے کرم کے سوالی ہیں، یہاں کوئی امتیاز نہیں، خدا کے دربار میں سب برابر ہیں، علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے وحدت کا اور کیا پیغام ہوگا؟؟ یہ سب مسلمان ہیں، کلمۂ توحید پڑھنے والے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ نبوت سے وابستہ، آخرت پر سب کا یقین، قرآن مجید پر ایمان رکھنے والے جیتے اور مرتے ایک قبیلے کے حامل، فکر و نظر کا کچھ اختلاف ضرور ہے، لیکن اس کے باوجود آج یہ شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم کھڑے ہیں، کاش دوسرے دِنوں میں بھی اس وحدتِ ملی کو محسوس کریں اور سوچیں کہ کس

قدر دین کی بنیادی باتوں میں ان کے درمیان اشتراک و اتفاق ہے اور اگر کچھ اختلاف ہے تو اس لائق ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جائے اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کے ساتھ ان کو برداشت کیا جائے۔

''عید'' ہمیں اس بات کی یاد دلاتی ہے کہ وہ خوشی، خوشی نہیں جس میں پورے سماج کو شامل نہ کیا جائے، آپ کے گھر میں مسرّت کا چراغ جلے بلکہ چراغاں ہو اور آپ کا پڑوسی غم کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہو، اس سے زیادہ نامبارک کوئی مسرّت نہیں ہوسکتی۔ اسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید الفطر کے ساتھ ساتھ ''صدقۃ الفطر'' کا بھی حکم دیا ہے کہ ہر صاحبِ گنجائش مسلمان اپنی اور اپنے زیر پرورش لوگوں کی طرف سے گیہوں کی ایک خاص مقدار یا اس کی قیمت اپنے غریب بھائی کو پہنچائے اور عید سے پہلے پہلے پہنچا دینے کی کوشش کرے، تاکہ سماج کے غریب اور پریشان حال لوگ بھی عید کی خوشی میں شامل ہوسکیں۔ ''صدقۃ الفطر'' ایک علامتی عمل ہے، یہ صرف عید ہی کے دن کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ اس بات کی تسلیم ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ہر خوشی میں سماج کے غریب بھائیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ وہ خوشی ادھوری اور ناکام ہے جو اپنے گھر تک محدود ہے اور جس میں اپنے ان پڑوسیوں کو شامل نہ کیا گیا ہو جن کو خدا نے آپ کی نگاہِ لطف کا محتاج بنایا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچہ کی پیدائش کے ساتھ ''عقیقہ'' اور شادی کے موقع سے ''ولیمہ'' رکھا گیا ہے اور پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے جس میں سماج کے غریب لوگوں کو شریک نہ رکھا جائے۔ مسلمان وہ ہے کہ جسے دوسروں کی فکر تڑپاتی ہو جس کو دوسروں کی پریشانی بے قرار کر دیتی ہو جس کے لئے دوسروں کا غم اپنا غم بن جاتا ہے، جو دوسرے بھائیوں کے درد کی کسک اپنے دل میں پاتا ہو، اسے اپنی لڑکیوں کے ساتھ دوسرے غریب بھائیوں کی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بھی متفکر رکھتا ہو، اسے اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قوم کے دوسرے بچوں کی تعلیم کی فکر بھی بے چین رکھتی ہو، جو ان

بیواؤں، یتیموں اور بیماروں کے لئے بھی اپنے دل کو بے سکون پاتا ہو جن کے یہاں فاقوں سے گذرتی ہے اور جو اپنی بنیادی غذا اور دوا کے لئے بھی کسی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں۔ عید اپنی ''زبان بے زبانی'' سے ہر شخص کو یہ پیغام دیتی ہے۔ کاش! ہم اسے دل کے کانوں سے سن سکیں!

(..................)

اسلامی تہوار ـــــ تہذیب و شائستگی کا نمونہ

۲۴ ر ستمبر کو ہمارے ہندو بھائیوں کی گنیش پوجا کا اختتامی پروگرام تھا، جو حسب روایت بہت بڑے جلوس کی صورت میں انجام پذیر ہوا، یہ اس عظیم الشان جلوس کا انیس واں سال تھا، جہاں یہ جلوس اپنے شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے غالباً ملک بھر میں مثالی جلوس ہے۔ وہیں نقض امن، شور شرابہ اور لوٹ مار بھی اس کی روایات میں داخل ہے، جس کا مظاہرہ اس سال بھی ہوا، اور خوب ہوا، ہر سال کی طرح اس سال بھی معظم جاہی مارکٹ پر گنیش جلوس کا استقبال کیا گیا۔ اور آر، ایس، ایس سیوا پر مکھ سریش راؤ جوشی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس جلوس سے خطاب کیا۔ آر، ایس، ایس قائدین میں حقائق کو قبول کرنے اور واقعات کا اعتراف کرنے کی صلاحیت بہت کم ہے۔ کیوں کہ جو جماعت سلبی مقاصد اور منفی اغراض کے لئے قائم ہوتی ہے، اور کام کرتی ہے۔ وہ مثبت حقائق کو قبول نہیں کرسکتی، لیکن بعض اوقات غیر شعوری طور پر سچائی زبان تک آجاتی ہے، اور انسان ''ان کہی'' کو بھی کہہ جاتا ہے۔

اس کی مثال جوشی صاحب کا وہ خطاب ہے جو انہوں نے اس موقعہ سے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ'' ہندو سماج میں ڈسپلن کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ خواتین اور کم عمر بچے ہماری مذہبی تقاریب میں شرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں''۔ یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے، اولاً تو گنیش تہوار کی حقیقت پر غور کیجئے تو یہ خود کس قدر مضحکہ خیز ہے، بدن انسان کا اور سر کا حصہ ہاتھی کا، یہ لطافت اور پاکیزگی خیال سے خالی افسانوی کہانی تو ہوسکتی ہے، عقل و دانش کبھی ایسے وجود کو باور نہیں کرسکتی، ایک نہایت ہی غیر سائنٹفک دیو مالائی کہانی پر اس تہوار کی بنیاد ہے۔ پھر اس کو منانے کا طور و طریق بھی کتنا عجیب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ تہوار قومی وحدت کی برقراری اور مذہبی وابستگی کے اظہار کا ایک

بہترین موقعہ ہے۔انسان اپنی انفرادی شخصیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی وابستگی کو بھی چاہتا ہے،اور یہ ایک طرح سے انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے،اسی لئے دنیا کی کوئی قوم نہیں،جو تہواروں،میلوں،بازاروں اور قومی دنوں کی صورت میں اجتماعی تقریبات منعقد نہ کرتی ہو، یہ تقریبات جہاں اجتماعیت کا مظہر اور اپنے مذہب سے وابستگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں ہیں اس مذہب کے مزاج و مذاق اور اس کے افکار و تصورات کی عکاس بھی ہوتی ہیں،اسلام سے پہلے بھی عربوں میں بعض تہوار ہوا کرتے تھے،ایران میں موسمِ بہار کی آمد اور واپسی کے وقت،بہت گرم جوش تقریبات منعقد ہوتی تھیں،بعض اہلِ مدینہ نے بھی آپ ﷺ سے ان ایرانی تقریبات نیروز اور مہرجان کے منانے کی اجازت چاہی،لیکن آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی اور اس کے بجائے مسلمانوں کے لئے دو عیدیں مقرر فرمائیں ،ایک عید الفطر اور دوسرے عید الاضحیٰ،اسلام میں یہی دو تہوار ہیں،

اسلامی تہوار کی کچھ خصوصیات ہیں جو اس کو دوسرے مذاہب کی تقریبات سے ممتاز کرتی ہیں،ان میں پہلی چیز معقول بنیاد و اساس پر اس کو منانا ہے،رمضان المبارک کے تیس روزے اللہ کی اطاعت و فرماں برداری میں رکھے جاتے ہیں،اس ماہ میں پیغمبر اسلام ﷺ پر نزول قرآن کا آغاز ہوا،عید الفطر کا مقصد کتابِ الٰہی کے حاصل ہونے اور خدا کا ایک حکم بجالانے کی توفیق میسر ہونے پر اظہارِ تشکر ہے۔اسی طرح بقرعید اللہ کے ایک پیغمبر کی طرف سے رضاء الٰہی کی قربان گاہ پر اپنے بیٹے کو بھینٹ چڑھا دینے کی کوشش کی یادگار ہے،اور اللہ تعالیٰ سے عہد وفا کی تجدید ہے کہ وہ اس کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے،غرض ان دو تہواروں کی بنیاد پاکیزہ اور عقل و دانش سے ہم آہنگ واقعات پر ہے۔نہ کہ نا قابلِ فہم اور خلافِ عقل افسانوں پر۔

دوسری خصوصیت اسلامی تہواروں کی فضول خرچی سے اجتناب اور ان اخراجات کو اپنے غریب بھائیوں کی مدد میں استعمال کرنا ہے۔عید الفطر کے موقعہ سے ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر صدقۃ الفطر واجب ہے۔جس کا مقصد اپنی خوشی میں اپنے غریب بھائیوں کو شریک کرنا ہے اس کے علاوہ ہر صاحبِ حیثیت مسلمان پر اس کی دولت میں ڈھائی فیصد

زکوٰۃ واجب ہے۔ جو عام طور پر رمضان المبارک ہی میں نکالی جاتی ہے۔ اسی لئے عیدالفطر میں غریب سے غریب گھرانا بھی نئے کپڑے سلاتا ہے۔ اور چند شام سہی، آسودہ ہوکر کھاتا پیتا ہے، بقرعید سے قربانی متعلق کی گئی ہے۔ قربانی بھی خوش حال مسلمانوں پر واجب ہے۔ قربانی کے گوشت کا ایک حصہ غرباء پر اور ایک حصہ اپنے اقرباء اور رشتہ داروں پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر جانور کی کھال فروخت کر کے اس کی قیمت بھی غریب لوگوں ہی پر صرف کی جاتی ہے۔ صحیح اسلامی طریقہ پر اگر عیدین کو منایا جائے تو اس میں فضول خرچی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ البتہ غریبوں کی اعانت خوشی کے ہر موقعہ پر ملحوظ ہے، غور فرمایئے کہ لاکھوں کی تعداد میں مورتیاں بنانے پر کتنے اخراجات آتے ہوں گے؟ پھر زیبائش و آرائش، روشنی اور گانے بجانے پر کس قدر خرچ ہوتا ہے؟ پوجا کے منتظمین اس کے لئے دکانداروں سے جبراً بھاری رقوم وصول کرتے ہیں، جگہ جگہ راہ گیروں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے۔ غریب مزدوروں تک کو نہیں بخشا جاتا، اس کے لئے جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ اس جھگڑے نے قتل و قتال کی صورت اختیار کر لی۔ پھر یہ کروڑوں روپے چند دنوں کے بعد پانی کی نذر کر دیئے جاتے ہیں، نہ خود پیسہ دینے والوں کو اس سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے، اور نہ سماج کے غریب لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ پہونچتا ہے۔ حالانکہ ان بھاری رقوم سے لاکھوں غریب انسانوں کو کئی دنوں بھوک سے بچایا جا سکتا تھا، اور ان کی روزی روٹی کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔

اسلامی تہواروں کا سب سے بڑا امتیاز نظم و ڈسپلن اور تہذیب و شائستگی ہے، نہ جلوس ہے، نہ ریلی، نہ تلوار کی نمائش ہے نہ لاٹھی کی، نہ پٹاخے ہیں نہ آتش بازی، نہ دلوں کو دہلا دینے والا شور و ہنگامہ اور نہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو گھبرا دینے والا اشتعال انگیز نعرہ، بلکہ ہر مسلمان صبح سویرے نہا دھوکر، سفید کپڑے پہن کر، خوشبو لگا کر، گھر سے عیدگاہ کی طرف نکلتا ہے، زبان پر ہلکے ہلکے بول ہیں، اس میں بھی نہ اپنی بڑائی، نہ کسی کو للکار، بلکہ خدا کی کبریائی اور حمد و ثناء، عیدگاہ پہونچے، دو رکعت نماز ادا کی، پہلے گردن جھکائی، پھر پیشانی زمین پر رکھی۔ دوگانۂ شکر ادا کر کے دعائیں اور خطبہ سنا، ایک دوسرے کو مبارک باد

دی، کیا امیر کیا غریب، کیا بڑے اور کیا چھوٹے، سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا، اور خوشی کا چراغ ایسا جلایا کہ اس کی لو غریب پڑوسیوں کے گھر بھی پہونچی، نہ کسی کے خلاف نعرہ بازی، اور نہ کسی سے معرکہ آرائی، بوڑھے، جوان، بچے، صحت منداور معذور سب اس تقریب میں شریک ہیں، بے خوف اور مامون، بے خطر اور محفوظ، کتنی شائستگی ہے ان تہواروں میں! اور کتنی شرافت کی مظہر ہیں یہ تقریبات!! گویا نور کا ایک سمندر ہے، جو فرحاں اور شاداں خدا کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے، اپنی ''انا'' کا انکار کرتا ہے، جھکتا ہے، خوب جھکتا ہے، اور اپنی جبین بندگی کو خاک آلود کرتا ہے۔ اخوت و بھائی چارگی اور وحدت واجتماعیت اس کے ایک ایک منظر سے نمایاں ہے۔

ہمارے برادرانِ وطن نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا ہے، قومی اخوت، اتحاد، ذات پات کے تصور کی مخالفت۔ اپنی مذہبی وابستگی کا احساس، تہذیب وثقافت، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا سلیقہ، اور نہ جانے کیا کیا؟ کاش وہ مسلمانوں سے مذہبی تقریبات کا سبق بھی سیکھتے! تو نہ ہندو تہوار دنگے فساد کا ذریعہ بنتا، اور نہ دیوالی میں آتش بازیوں کی صورت لوگوں کی گاڑھی کمائی جل کر خاکستر ہوتی، اور نہ تہواروں کے نام پر بے حیائی اور بے شرمی کے مناظر وجود میں آتے۔ لیکن دوسروں سے کیا شکوہ، اور غیروں سے کیا گلہ! کیا یہ حقیقت نہیں کہ خود مسلمانوں نے اپنے مہذب اور شائستہ طور وطریق کو خیرآباد کہہ کر غیر مہذب اور ناشائستہ طریقے اختیار کر لئے ہیں؟ کیا ہم شب براءت میں پٹاخے اور آتش بازیاں دیوالی سے کم کرتے ہیں؟ کیا بے مقصد جلوس اور ریلی ہم نہیں نکالتے؟ کیا شور شرابے کے ساتھ ہم نے بھی بعض تقریبات ایجاد نہیں کر لی ہیں؟ مقام فکر ہے کہ دوسری قومیں اپنے ناشائستہ طور وطریق پر شرمائیں اور ہم ان ہی طریقوں کو سیکھ کر اپنے لئے وجہ افتخار تصور کریں!!

(۲۶ر مارچ ۱۹۹۹ء)

غم کے زیرِ سایہ عید

کیوں کر کہوں کہ آج عیدِ سعید کا دن ہے؟ عید دامن مراد کو بھرتی ہے، عید خوشیوں کی سوغات ساتھ لاتی ہے، عید سے مسرت کے غنچے کھلتے اور غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، عید تو قصر شاہی سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ہر جگہ خوشیاں بانٹتی ہے اور پروانۂ شادمانی بن کر کاشانوں سے آشیانوں تک ہر جا پہنچتی ہے، مگر کیا ہے کہ آج کی اس عید پر غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، آج آنکھیں خوشی کے آنسوؤں کے بجائے، اشک ہائے غم کا پیالہ بنی ہوئی ہیں، زبان پر نغمۂ مسرت کے بجائے نالۂ غم آیا چاہتا ہے، دل میں خوشی ومسرت کی خنکی نہیں، بلکہ صدمہ وافسوس کے انگارے سلگ رہے ہیں، حکم خداوندی کی تعمیل وتکمیل میں گو جسم پر نئے اور خوبصورت کپڑے زیب تن ہیں، لیکن یہی لباس جس پر نگاہیں تو ریجھ جاتی تھیں، آج منہ چڑا رہی ہیں اور محرومانِ قسمت کا مذاق اڑا رہی ہیں۔

آہ! کہ یہی سرزمین ہے جہاں عرب کے بادیہ نشیں اسلام کا پیامِ محبت لے کر آئے، کوئی قافلہ مالابار کے ساحل پر اترا اور کوئی سندھ کے صحراؤں میں خیمہ زن ہوا، اس نے اس ملک کو انسانی وحدت کا پیغام سنایا، انسانوں اور انسانوں کے درمیان جس تفریق کو روا رکھا گیا تھا، اسے مٹایا، دَبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھایا، عورتوں کو حیاء کی چادر عطا کی اور عزت واحترام دیا، ستی کی رسم ختم کی، اونچ نیچ کے خلاف آواز بلند کی، وحدتِ خداوندی کی صدا لگائی، انسانوں کو مخلوق کے سامنے جبین بندگی خم کرنے کی ذلت سے آزاد کرنے کی سعی کی، وہ جہاں گئے، محبت کے سوداگر بن کر گئے، ظلم کو روکا، جور وستم کے ہاتھ تھام لیے، مذہبی آزادی دی، کسی کو اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے سجدوں سے آباد کیا اور اخلاق ومحبت کے چراغ ہر جگہ جلائے، اپنے عدل وانصاف کے ذریعہ دشمنوں کو دوست بنایا اور جن تلواروں میں انتقام وخوں آشامی کے جذبات تڑپ

رہے تھے وہی ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کم و بیش آٹھ سو سال اس ملک پر اس طرح گذرے کہ ہر صبح سورج ان کی ظفر مندی و اولوالعزمی کا پیام سنانے کو طلوع ہوتا تھا۔ اگر یہ قوم دشمن کو تہہ تیغ کرنے کا مزاج رکھتی تو مسلمانوں کے سوا کسی کا وجود اس تاریخ کو لکھنے کے لیے بھی شاید باقی نہیں رہتا، اگر مسلمان جبر وقہر کے ساتھ دوسری قوموں کو مسلمان بنانے کے قائل ہوتے، تو چند نسلیں ہی اس ملک کی قسمت بدلنے کے لیے کافی ہوتیں اور اتنے طویل عرصہ کے بعد بھی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا باقی نہیں رہتا، مسلمانوں نے سیاست و جنگ کے میدان میں جتنی طالع آزمائی کی، اگر انہوں نے اس کی ایک چوتھائی، بلکہ اس سے بھی کم محنت دعوتِ اسلام کے لیے صرف کی ہوتی، تو یقیناً یہ ملک گلشنِ اسلام بن کر پوری دنیا کو عطر بار کرنے کے موقف میں ہوتا، لیکن مسلمانوں نے نہ جور وظلم اور جبر واکراہ کی وہ راہ اختیار کی جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے اور جو یقیناً مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں اور نہ دعوتِ دین کے اس فریضہ کی طرف توجہ دی جو اس کا منصبی فریضہ اور اس کی اساسی ذمہ داری ہے۔

اس طویل عرصۂ حکمرانی میں انہوں نے وسیع تر متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، عربوں کی فراخدلی وسادگی دی، عجم کی نزاکت اور لطافت عطا کی، ثقافت وتہذیب کے سبق دیے، معاشی استحکام بخشا اور اسے سونے کی چڑیا بنایا، پھر اس چڑیے کے بال و پر نوچنے کے بجائے اسے سنوارتے اور نکھارتے رہے، اس ملک کے چپہ چپہ کو حسین وجمیل عمارتوں، پرشکوہ قلعوں، فلک بوس میناروں اور سبزہ زار باغیچوں کے گہنوں سے سجایا اور اس کی عزت و شہرت کو دوچند کیا، لیکن چوں کہ اس بارآور سرزمین پر ایمان کی تخم ریزی نہیں کی گئی اور اس گلشن کو گلہائے ہدایت سے سنوارنے کی کوشش نہیں ہوئی، اس لیے بالآخر بلندافروزی و ظفر مندی کے سورج نے اپنا منہ پھیر لیا اور غلامی کی زنجیر نے پورے ملک کو پابہ جولاں کر کے رکھ دیا۔

اس عہدِ نامراد میں بدیشی دشمنوں نے اس ملک کے اصل باشندوں کے درمیان نفرت کی کھیتی لگائی اور ایک ایسی تاریخ رقم کرنی شروع کی جو بے دلیل وثبوت تھی اور جن کا

مقصد افواہوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دور کرنا تھا۔ اس جھوٹی تاریخ کا ایک حصہ بابری مسجد کا مسئلہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کیا تھا، لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابلِ یقین ہے، کیوں کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا بھی ہو، بابر نے خود ترکی زبان میں ''بابر نامہ'' تحریر کیا ہے، نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ بابر نامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور مقیم ہوا تھا، چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں۔ (بابر: ۹۳) پروفیسر آرناتھ (یونیورسٹی آف راجستھان جے پور) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا۔ (بابر: ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہے اس کی صداقت کو پرکھنے کا ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے۔ اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ بابر شدید مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رَواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا، منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ راجہ شیو پرساد نے اپنی کتاب ''آئینۂ تاریخ نما'' کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دَور میں نظمِ حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا تھا۔ پروفیسر آرناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جاسکے، پروفیسر شری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم رَوا رکھا ہو۔ پروفیسر آرسی رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رَواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا۔ (بابر: ۸۰)

مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی

رَواداری'' میں بابر کی عالی ظرفی اور حسن سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر بنر جی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مندر اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے۔ اور پروفیسر سری واستونے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے۔ (بابر: ۸۲) یہاں تک کہ بابر نے اپنے وصیت نامہ میں گاؤکشی سے منع کیا ہے، تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

''میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں...... رام چرت مانس یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔''

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی ہے کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنائی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرایا تھا، اکبر کو چوں کہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا، اس لیے اس نے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بنوادی، ۱۹۴۶ء سے پہلے غالباً بابری مسجد کے محل وقوع کے سلسلہ میں کوئی جھگڑا نہیں تھا، بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۸۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ عدالت میں گیا، اس وقت مہنت رگھو پر داس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو سردی، گرمی اور برسات سے بچانے کے لیے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے، لیکن ۲۴/ دسمبر ۱۸۸۵ء کو عدالت نے یہ عرضی رد کر دی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود

ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے سے نہیں پایا جاتا تھا۔

ان سب کے باوجود سنگھ پریوار نے اس مسئلہ کو لے کر نفرت کی آگ سلگائی اور اس کے شعلے خوب بھڑکائے، یہاں تک کہ ۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد ظلماً شہید کردی گئی اور اس کے بعد جو فسادات پھوٹ پڑے ان میں ہزاروں مسلمان شہادت سے سرخرو ہوئے۔ آج بھی یہ حادثہ ہندوستان کے سیکولرزم کے لیے ایک امتحان بنا ہوا ہے۔ ایسے موقع پر ایک طرف ہمیں ظاہری تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، دوسری طرف اللہ سے رجوع کرنا چاہیے کہ مؤمن کی کامیابی وسرخروئی کا اصل راستہ خدا کی مدد ہے، اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اے ایمان والو! صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ. (بقرۃ:۱۵۳) صلوٰۃ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے رجوع اور انابت کا جلی عنوان! بے قراروں کے قرار کا سامان کرتے ہوئے قرآن نے کیا خوب کہا ہے:

''اَمْ مَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ.'' (نمل:۶۲)

''کون ہے جو بے قرار کی التجا سنتا ہے، جب کہ وہ اس سے دعا کرتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے، نیز کون ہے جو تم کو زمین میں اگلوں کا جانشین بناتا ہے؟؟''

پس، آیئے! کہ آج قبولیت اور استجابت کی اس گھڑی میں اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائیں، اس سے اپنی عجز و درماندگی کا دکھڑا روئیں، اسی کے دربار میں آنسوؤں سے وضو کریں، اس کی چوکھٹ پر سر رکھ کر ملتجی ہوں کہ الٰہی! ہمارے گناہ بہت ہیں، ہماری کوتاہیاں بے شمار ہیں، لیکن آپ کے عفو و درگذر کا دامن اس سے بھی وسیع ہے، ہماری کوتاہیاں اپنی جگہ، لیکن ہم آپ ہی کی طرف منسوب ہیں اور اسی نسبت سے مارے جاتے ہیں، لوٹے جاتے ہیں، بے آبرو کیے جاتے ہیں اور جرمِ بے گناہی کی پاداش میں بدنام کیے جاتے ہیں، خداوند! اس نسبت کا خیال فرما! اور مخالفتوں کے بھنور میں گرفتار اس امت کے

سفینہ کو ساحل مراد تک پہنچا! الٰہا! عید کے دن جو انعام (جائزہ) کا دن ہے، اس سوگوار امت کو خوشیوں سے ہم کنار فرما! جو امت ذلت ورسوائی کے دن دیکھتے دیکھتے اور اپنی بے توقیری کی خبریں سنتے سنتے مایوسی و ناامیدی کے دَور سے گذر رہی ہے، اسے صبح امید سے سرفراز فرما! اور اس نئے سال کو اس کے لیے برکت وسعادت، قبول واستجابت اور عزت و وقار کا سال بنادے! رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. آمین یارب العالمین!

(۶/دسمبر/۲۰۰۲ء)

اسوۂ ابراہیمی

اسلام کے اصل معنی افگندگی اور تسلیم و رضا کے ہیں، انسان اپنے آپ کو خالق کے حکم کے سامنے بچھا دے، اپنی خواہشات کو خدا کی رضا جوئی کی چوکھٹ پر قربان کردے اور یہ عقیدہ و ایمان سے لے کر جان و مال اور اس سے بڑھ کر اولاد و عیال تک ہو جائے تو یہ بندگی کا کمال اور عبدیت کی معراج ہے۔ عبدیت و بندگی کا یہ درجہ و مقام انسان کے جس گروہ کو سب سے بڑھ کر حاصل ہے، وہ حضرات انبیاء کرام ہیں جو اللہ کے سب سے محبوب بندے اور انسان کے لئے اسوۂ کامل ہیں، ان کا ایک ایک عمل زمین پر اللہ کی مرضیات کی زندہ شہادت ہے، یہ انبیاء زمین پر ہدایت کی روشنی اور مشعل راہ کا درجہ رکھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت انبیاء کرام میں بھی کسی قدر مرتبہ و مقام کا فرق رکھا ہے۔ نبوت کے سلسلۃ الذہب میں ایک نہایت عظیم اور برگزیدہ شخصیت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ اللہ کی رضا و خوشنودی کے لئے قربانی کی کوئی قسم نہیں جو ان سے چھوٹی ہو اور امتحان و آزمائش کی کوئی بھٹی نہیں جس میں ان کو تپایا نہ گیا۔ انہوں نے اپنے خالق کے ساتھ وفا شعاری، عبدیت و بندگی، خدا کی محبت میں خلائق دنیا سے بے نیازی، خود سپردگی، شرک سے نفرت، دعوتِ حق اور بیت الٰہی کی تعمیر و تجدید کے ایسے زندہ و تابندہ نقوش خدا کی زمین پر چھوڑے کہ خود خدا کو بھی اپنے اس وفا شعار بندے کی ادائیں محبوب و مرغوب ہو گئیں اور امتِ محمدیہ کے لئے سنن ابراہیمی کو تازہ رکھنے کا سامان کیا گیا۔ حج دراصل اللہ کے اسی نیک بندے کی یادگار اور خدا کے سامنے تسلیم و رضا کا شعار ہے۔ کعبہ جس کی نبیادیں تک مٹ چکی تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تجدید فرمائی۔ آج بھی مقام ابراہیم کعبہ کے سامنے موجود ہے، زم زم کا چشمۂ حیوان حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے نصرتِ الٰہی کی یاد دلاتا ہے، صفا اور مروہ کی سعی سے ایک بندیٔ صالحہ حضرت ہاجرہؓ کی بے چینی اور بے تابی

کی یاد تازہ ہوتی ہے، پھر منیٰ کی قربانی اس ذبحِ عظیم کی یادگار ہے، جس میں ایک پیغمبر نے اپنے لختِ دل کو اپنے تئیں خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا تھا، جمرات کی کنکریاں عزمِ ابراہیمی اور وسوسۂ شیطانی سے پنجہ آزمائی کا اظہار ہے۔

یہی اسوۂ ابراہیمی ہے کہ سب کچھ خدا کی خوشنودی کی چوکھٹ پر قربان ہو جائے، اپنی اور اپنوں کی خواہش، دوستوں اور قرابت داروں کی خوشی، انسانی زندگی میں قدم قدم پر ایسے مواقع آتے ہیں کہ اللہ کا حکم اور ہوتا ہے، انسان کی خواہش کچھ اور، نفس چاہتا ہے کہ یہ حلال ہو مگر شریعت اسے حرام قرار دیتی ہیں، یہی وقت ہے انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے، شادی بیاہ کا موقع دیکھئے، نوشہ کی طرف سے خطیر رقم کا مطالبہ ہے، نوشہ کے والد کی خواہش ہے کہ کھانا کا خوب سے خوب تر اور اچھا سے اچھا انتظام رہے، نوشہ کی والدہ کی طرف سے زیورات کی طلب ہے، بھائی بہنوں کا شوق ہے کہ اچھی قسم کی گاڑی ضرور ملے، دوست احباب کہتے ہیں کہ اگر اس موقع سے بھی رقص و سرور نہ ہو تو تقریب میں کیا لطف آئے گا؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی ان سب کے خلاف ہے، شریعت اس لین دین کو رشوت قرار دیتی ہے، گانے بجانے کو منع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ موقع خدا کا شکر بجالانے کا ہے، اس کے سامنے سر جھکانے کا ہے، خدا کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کا ہے، یہی وقت ہے کہ انسان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کردار کو یاد کرے کہ کیا وہ اپنے جذبات کو خدا کی مرضی پر قربان کرنے اور اپنے متعلقین کی خواہش کو خدا کے رسول کی خواہش کے سامنے بھینٹ چڑھانے تیار ہے؟

انسان کے لئے بڑے امتحان کا موقع کسبِ معاش کے ذرائع ہیں، ان میں حلال وحرام کا امتیاز، حرص وہوس کے اس دور میں تقویٰ کی اصل کسوٹی ہے، امام محمدؒ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، زہد و تقویٰ کے موضوع پر آپ نے قلم نہیں اٹھایا؟ امام محمدؒ نے اپنی اس کتاب کا حوالہ دیا جس میں معاملات اور کسبِ معاش کے احکام ہیں اور فرمایا کہ وہی زہد و تقویٰ کی کتاب ہے، یعنی معاش کے معاملہ میں اپنے آپ کو حلال کی حدود میں قائم رکھنا اور حرام سے بچائے رکھنا ہی انسان کی دکھتی رگ

ہے اور اس میں اپنے آپ کو حکم شریعت کا پابند بنا لینا اصل تقویٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات انسان کے لئے نماز روزہ کا اہتمام آسان ہوتا ہے، آدمی حسبِ توفیق کچھ ذکر و تسبیح بھی کر لیتا ہے، لیکن اپنے آپ کو اس نفع سے دست کش رکھنا دشوار ہوتا ہے جس کو شریعت جائز نہ رکھتی ہو اور جس کو آج کا سودی نظام حلال کئے ہوئے ہے۔ یہ مواقع ہیں کہ جہاں اسوۂ ابراہیمی ایک صاحبِ ایمان کے سامنے آئینہ بن کر آجاتا ہے، وہ اس میں اپنے ایمان، حکم خداوندی کے سامنے تسلیم و رضا اور شریعتِ الٰہی کے سامنے سرافگندگی کی تصویر دیکھے اور خود اپنے آپ کو تولے کہ اس نے جانور کی قربانی کر کے علامتی طور پر خدا سے خود سپردگی کا جو وعدہ کیا تھا، کیا وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس وعدہ کو وفا کر رہا ہے؟؟

(۱۷ مارچ ۲۰۰۰ء)

ہجری کیلنڈر

لیجئے! کیلنڈر نے ایک اور صفحہ الٹ دیا، اب ۱۴۱۸ھ کے بجائے ۱۴۱۹ھ ہے۔ اسلامی کیلنڈر ''ہجری کیلنڈر'' کہلاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعہ ہجرت کی طرف اس کی نسبت ہے، عربی زبان میں ''ہجر'' کے معنی چھوڑنے کے ہیں، اسی سے ہجرت کا لفظ ماخوذ ہے، ہجرت ایک اسلامی اصطلاح ہے، ایمان کی حفاظت یا دین کی اشاعت کی غرض سے ترکِ وطن کرنے کو ''ہجرت'' کہتے ہیں۔ ''تارکین وطن'' آج کل ایک بین قومی اصطلاح ہے، ہر ملک میں تارکین وطن موجود ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں ان کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے، یہ وہ تارکین وطن ہیں، جنہوں نے معاشی اور سیاسی مقاصد کے تحت اپنا وطن چھوڑا ہے، ان کو مہاجرین کہنا ''ہجرت'' کے مقدس لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے۔

ہجرت دراصل پیغمبروں کی سنت ہے۔ شاید ہی کوئی پیغمبر ہو جس کو ہجرت نہ کرنی پڑی ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام وغیرہ کی ہجرت کے واقعات تو خود قرآن مجید میں مذکور ہیں، لیکن تاریخ میں ہجرت کے نام سے جو شہرہ آپ ﷺ کی ہجرت کو ہوا، کسی اور پیغمبر کی ہجرت کو وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی، آپ ﷺ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے اور ٹھیک ۴۰ رسال کی عمر یعنی ۶۱۱ء میں آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، آپ ﷺ کی صداقت و دیانت اور اخلاقی خوبیوں کا پورے مکہ میں چرچا تھا، آپ ﷺ نے اپنا بچپن اور جوانی اسی مکہ میں گزارا، نبوت کے بعد آپ ﷺ کے خلاف لوگوں نے ہر طرح کی ایذاء رسانی کا راستہ اختیار کیا، لیکن کوئی انگلی نہ تھی جو آپ ﷺ کے کردار پر اٹھے اور کوئی زبان نہ تھی جو آپ ﷺ کی دیانت و پاکیزگی پر کھلے۔

۱۳ سال آپ ﷺ نے مکہ میں دعوتِ دین کی جد و جہد فرمائی۔ یہ ۱۳ سال ایسے گزرے کہ شب و روز آپ ﷺ بے قرار رہتے کہ کسی طرح اللہ کے بندے اللہ کو پالیں اور

صحیح راستہ کی طرف آجائیں، پورا دن آپ ﷺ گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں گھوم گھوم کر دعوت دینے میں گزارتے، ایک ایک دروازہ پر پہنچتے اور دروازۂ دل کو دستک دیتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور اس کی خوشامد فرماتے، لیکن بہت کم لوگ تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا، اکثریت ان لوگوں کی تھی کہ حق کی روشنی ان کے سامنے دوپہر کی دھوپ کی طرح کھل کر آگئی، مگر بت پرستی اور بے دینی کو چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں تھے، کیوں کہ یہی ان کے آباء واجداد کا مذہب تھا، اس درمیان کوئی تکلیف نہ تھی جو آپ ﷺ کو پہنچائی نہ گئی ہو، آپ ﷺ کا پورے خاندان سمیت بائیکاٹ کیا گیا، مسلمان لقمہ لقمہ کو ترستے تھے اور آپ ﷺ اپنے اہل خاندان کے ساتھ درخت کے پتے اور چھال تک کھانے پر مجبور تھے، جسم اقدس پر اونٹ کی اوجھ اور غلاظت ڈال دی گئی، گلے میں پھندہ ڈال کر جان لینے کی کوشش کی گئی، راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، جملے کسے گئے اور تالیاں پیٹی گئیں، آپ ﷺ کو فاتر العقل اور جادوگر مشہور کیا گیا۔

نبوت کے سال آپ ﷺ نے طائف کا رخ کیا، شاید ان کو قبولِ اسلام کی توفیق ہو، لیکن طائف کی زمین مکہ سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوئی، انہوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ آپ ﷺ کے پیچھے اوباش لڑکوں کو بھی لگا دیا، یہ آپ ﷺ پر پتھر پھینکتے، خاک اُڑاتے، ہنستے اور تمسخر کرتے، جسم لہولہان ہو گیا، نعلین مبارکین میں خون جم گئے، گھٹنے زخمی ہو گئے، آپ ﷺ بیٹھ جاتے، تو یہ آپ ﷺ کو کھڑا کر دیتے، حضرت زید بن حارثہ ساتھ تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو کاندھوں پر اٹھالیا اور ایک باغ کی پناہ لی، ٹوٹے ہوئے دل اور اشکبار آنکھوں سے آپ ﷺ خدا کی طرف متوجہ ہوئے، جب مطمئن ہو گئے تو بڑی پُر درد دُعاء فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا:

"الٰہا! اپنے ضعف و بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کی فریاد آپ ہی سے کرتا ہوں، آپ رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں، درماندہ بے کسوں کے پروردگار آپ ہی ہیں، آپ ہی میرے مالک ہیں، آخر آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے

ہیں؟ کیا اس حریف بے گانہ کے جو مجھ سے ترش روئی روا رکھتا ہے، یا ایسے دشمن کے جو میرے معاملہ پر قابو رکھتا ہے؟؟ لیکن اگر مجھ پر آپ کا غضب نہیں ہے تو پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں، بس آپ کی عافیت میرے لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے، میں اس بات کے مقابلہ میں کہ آپ کا غضب مجھ پر پڑے یا آپ کا عذاب مجھ پر نازل ہو، آپ ہی کے نور جمال کی پناہ مانگتا ہوں، جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں، اور جس کے ذریعہ دین و دنیا کے تمام معاملات سنور جاتے ہیں، مجھے تو آپ کی رضامندی اور خوشنودی مطلوب ہے، آپ کے سوا کہیں سے کوئی قوت وطاقت نہیں مل سکتی۔''

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایمان اور اسلام کی جو تخم آپ ﷺ نے مکہ اور طائف کی سرزمین میں بوئی تھی، اللہ اس سے اہل مدینہ کے دلوں کو بار آور فرما رہا تھا، بارش کہیں اور ہو رہی تھی اور ایمان کا آب حیات کہیں اور جمع ہو رہا تھا، حج کے موقع سے مدینہ کے لوگ مکہ آئے، ان کے کان آپ ﷺ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوئے، وہ مخلص اور حق کے متلاشی تھے، ضد اور اکڑ نہ تھی، اس لئے فوراً ہی کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ طے ہوا، ایمان لائے اور اہل ایمان کو پناہ دینے کا عہد بھی کیا، مکہ کی زمین بتدریج اہل ایمان پر تنگ سے تنگ تر ہوتی جاتی تھی، بعض مسلمانوں کو گلے میں پھندا ڈال کر گرم ریتوں پر گھسیٹا جاتا، بعضوں کو سلگتے ہوئے شعلوں پر لٹایا جاتا اور ان کے جسم سے رسنے والے لہو سے آگ بجھائی جاتی، کسی کو دھوئیں کی دھونی دی جاتی، بعضے تو بے رحمی سے شہید ہی کر دیئے گئے۔

لیکن مجال نہ تھی کہ دامنِ صبر مسلمانوں سے چھوٹ جائے اور حکم خداوندی کے بغیر وہ اپنے طور سے فیصلہ کریں، آخر خود خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آجائیں، مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ آنے لگے اور صرف وہی مکہ میں رہ گئے، جو یہاں سے جا نہیں سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ ابھی تک مکہ ہی میں مقیم تھے اور اپنے بارے میں حکم خداوندی کے منتظر، اسلام کے دشمنوں نے آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا، ہر قبیلہ سے ایک

ایک نمائندہ لے کر درِ دولت کا محاصرہ کرلیا، ادھر خدا کی طرف سے صورتِ حال سے آپ ﷺ کو آگاہ فرمایا گیا، آپ ﷺ پورے اطمینان کے ساتھ کچھ آیتیں پڑھتے ہوئے اور ایک مشتِ غبار محاصرین پر پھینکتے ہوئے باہر نکل آئے اور چھپتے چھپاتے کچھ دنوں میں مدینہ تشریف لائے، آپ ﷺ کے سر دھڑ پر انعام مقرر ہوا، پیچھا کرنے والوں نے پیچھا کی اور اپنے تئیں آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے رفیقِ خاص حضرت ابوبکر کی جان لینے کی کوشش میں کوئی کسر نہ رکھی، مگر خدا کی تدبیر کے سامنے ساری تدبیریں اکارت گئیں اور نبوت کا جو آفتاب مکہ میں طلوع ہوا تھا، مدینہ میں مہر نیم روز بن کر روشن ہوا۔

آپ ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو جشن کا منظر تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت، آقا اور غلام، بڑے اور چھوٹے، دل اور آنکھیں بچھائے پروانہ وار کھڑے تھے، زبان پر استقبالیہ نغمے، نگاہانِ شوق بے تاب، یا تو مکہ کی سرزمین مسلمانوں پر تنگ تھی یا پھر مدینہ نے دل وجگر راہوں میں بچھا رکھے تھے۔ مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کو اہل مدینہ نے اپنے یہاں جگہ دی، گھر دیا، دَر دیا، کھیت اور باغات نثار کئے اور سب سے بڑھ کر اتھاہ محبت اور پیار کی سوغات دی۔ اہل مدینہ نے جو ایثار کیا، شاید ہی انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال مل سکے۔ اہلِ مکہ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہ تھیں، گھر چھوڑا، وطن چھوڑا، وطن کی فضاؤں کو خیر باد کہا، اعزہ واقرباء کی محبت قربان کی اور اپنی پوری دنیا سے منھ موڑ کر ایک ایسی منزل کو چل پڑے جہاں اجنبیت سے سابقہ تھا اور مستقبل موہوم تھا، اس لئے آپ آپ ﷺ نے مکہ سے ترکِ وطن کرکے آنے والوں کو ''مہاجرین'' اور مدینہ کے رہنے والوں کو ''انصار'' کا نام دیا، مہاجرین کے معنی ہیں ''دین کے لئے ترکِ وطن کرنے والا'' اور ''انصاری'' کے معنی ہیں اہل ایمان کی مدد ونصرت کرنے والا۔ مسلمانوں میں ان دو طبقوں کے سوا کسی تیسرے طبقہ کا تصور نہیں، نہ ذات پات کا، نہ قبیلہ اور برادری کا، نہ ملک اور صوبہ کا، نہ زبان کا، کوئی اور تقسیم نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مسلمانوں کی گوارا ہو۔

ہجرت کا یہ واقعہ ایک طرف مسلمانوں کی قربانی اور دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ اوران کے رفقاء عالی مقام کے ایثار و فدا کاری کی یادگار ہے اور دوسری طرف آئندہ اسلام کو جو فتوحات اور کامیابیاں حاصل ہوئیں، ان کا مقدمہ۔ یہ محض مکہ سے مدینہ کی طرف سفر نہیں تھا، بلکہ مغلوبیت سے غلبہ وظہور کی طرف اور مقہوریت سے طاقت و شوکت کی طرف سفر تھا، بظاہر مسلمانوں پر زمین تنگ ہو رہی تھی، لیکن خدا نے اسی تنگی میں آفاق کی وسعت کو سمو رکھا تھا، یہ واقعہ نا اُمیدیوں میں اُمید کی کرن سے روشناس کرتا ہے اور حوصلہ شکن حالات میں اُمید وحوصلہ کا چراغ جلاتا ہے اوراس بات کو بھی یاد دلاتا ہے کہ کیسی کیسی قربانیوں اور جانثاریوں سے خدا کے اس دین کو سربلند کیا گیا ہے اور کس قدر خون و لہو کے ذریعہ حق وصداقت کے اس شجرۂ طوبیٰ کی آبیاری فرمائی گئی ہے؟

حضرت عمر ؓ کے سامنے بحیثیت خلیفہ ایک فائل آئی، جس میں تاریخ درج تھی، سال درج نہ تھا، آپ ؓ کو خیال ہوا کہ مسلمانوں کا اپنا کیلنڈر ہونا چاہئے۔ آپ ؓ نے مجلس شوریٰ میں یہ تجویز رکھی اور غالباً حضرت علی ؓ کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ اسلامی کیلنڈر واقعۂ ہجرت پر مبنی ہونا چاہئے، چنانچہ مہینوں کی ترتیب وہی قائم رہی جو اسلام سے پہلے عربوں میں مروج تھی، محرم سے آغاز اور ذوالحجہ پر اختتام، اور سال کا آغاز واقعۂ ہجرت کے سال سے مانا گیا۔ اس طرح ۱۴۱۹ھ کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے واقعۂ ہجرت کو اتنے سال گزر چکے۔

کیلنڈر بھی کسی قوم کی اپنی شناخت ہوتی ہے، اس سے قوم وملت کی تاریخ وابستہ ہوتی ہے، ہجری کیلنڈر پر غور کر جایئے، اس میں اکثر مہینوں کے نام وہ ہیں جو اسلامی عبادات اور مسلمانوں کی مذہبی روایات کی نشان دہی کرتے ہیں اور نام ہی سے ان مہینوں سے متعلق عبادات اور واقعات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، دوسری قوموں کے جو کیلنڈر مروج ہیں، وہ بھی ان کے مذہبی افکار و روایات کا مظہر ہیں، یہی حال مہینوں اور ہفتوں کے نام کا ہے، مثلاً sunday اور Monday کے الفاظ ہی پر غور کیجئے، ان کے معنی ہیں

سورج کے دن اور چاند کے دن، چوں کہ اہل یونان کے یہاں ایک دن سورج کی پرستش کے لئے مقرر تھا اور ایک دن چاند کی پرستش کے لئے، اسی لئے مختلف دیوتاؤں کے نام سے دنوں کے نام ہوا کرتے تھے، کچھ اسی طرح کا معنی مہینوں کے نام کے پیچھے بھی کارفرما ہے، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کیلنڈروں کو قبول نہیں فرمایا، جو اس زمانہ میں مروج تھے۔

پس اسلامی کیلنڈر مسلمانوں کی اپنی ایک پہچان ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اس کیلنڈر کو رواج دیں اور آنے والی نسلوں کو اس کے پس منظر اور اس کی دینی وملی حیثیت سے واقف کرائیں، علماء نے لکھا ہے کہ ہجری کیلنڈر کے چلن کو باقی رکھنا اور اس کی ترویج کی سعی کرنا فرض کفایہ یعنی امت کا اجتماعی فریضہ ہے ـــــ یہ کیلنڈر ہمیں ہمارا تشخص یاد دلاتا ہے اور ہجرت کے عبرت آمیز اور موعظت انگیز واقعہ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔

(یکم رمئی ۱۹۹۸ء)

اسوۂ حسنین رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ اللہ کی جانب سے مصطفیٰ اور مجتبیٰ یعنی چنے ہوئے تھے، اللہ نے نبوت کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا تھا، جیسے اللہ نے آپ کو نبوت جیسی عظیم ذمہ داری کے لئے منتخب فرمایا، اسی طرح آپ ﷺ کی رفاقت اور صحبت کے لئے بھی انسانیت کے منتخب اور برگزیدہ اشخاص کا انتخاب ہوا، اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کی صحابیت کے لئے منتخب فرمایا ہے،'' اختارهم الله لصحبة نبيه، اسی طرح اللہ کی جانب سے آپ ﷺ کے اہل بیت اور پاک بیویاں بھی سرد و گرم کی رفاقت اور امت کے لئے خانگی اور نجی زندگی کا نمونہ پیش کرنے کے لئے اللہ کی جانب سے منتخب تھے۔ ان ہی اہلِ بیت میں آپ ﷺ کی صاحبزادیاں تھی، اور ان صاحبزادیوں میں آپ کی چہیتی اور چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے خواتین جنت کی سردار قرار دیا، اور جن کے بارے میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی گواہی ہے کہ آپ ﷺ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبت حضرت فاطمہؓ سے تھی۔ حضرت فاطمہؓ اپنے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں حضور سے بہت زیادہ مشابہ تھیں اور آپ پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا کہ عہدِ صحابہ میں بھی شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے۔

حصرت فاطمہؓ کے شوہر چوتھے خلیفہ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ جو حضور ﷺ سے نسبی اعتبار سے قریب ترین تعلق رکھنے کے علاوہ اسلام میں سبقت سے مشرف تھے، اور حضور ﷺ کی نگاہ میں ان کے مقام و مرتبہ کا حال یہ تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں جس کا دوست ہوں، علی اس کے دوست ہیں، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تعلق اور محبت کو آپ نے اپنی محبت کا معیار بنایا، اہل سنت والجماعت کے معتبر علماء کا اس

بات پر اجماع ہے کہ حضرت عثمان ﷜ اور حضرت علی ﷜ کے عہد میں کچھ یہودیوں کی سازش سے جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا، اس میں حضرت علی ﷜ حق پر تھے، چنانچہ حضرت علی ﷜ کے مخالفین کو حدیث میں ''فئة باغية'' (باغی گروہ) قرار دیا گیا، حضرت فاطمہؓ کے بطن سے دو صاحبزادے حضرت حسن ﷜ اور حضرت حسین ﷜ پیدا ہوئے، جو باحیات رہے، اور ان ہی دونوں حضرات سے رسول اللہ ﷺ کی مبارک نسل کا سلسلہ آگے بڑھا۔

حضرت حسن ﷜ اور حضرت حسین ﷜ کو رسول اللہ نے نوجوانانِ جنت کا سردار قرار دیا، یہ روایت اہل سنت کے یہاں کثرت سے منقول ہے رسول اللہ ﷺ ان دونوں کو پکڑتے، اور کہتے: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان دونوں سے محبت کیجئے (بخاری: حدیث نمبر، ۳۷۴۷) ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو مجھ سے محبت ہوگی، وہ ان دونوں سے محبت رکھے گا۔ (مجمع الزوائد، عن ابی ہریرۃ: ۹/۱۸۰) عجیب بات ہے کہ حضرت حسن ﷜ اور حضرت حسین ﷜ کو جسمانی طور سے بھی رسول پاک ﷺ سے بڑی مماثلت تھی، چنانچہ جب حضرت حسین ﷜ کی شہادت ہوئی تو صحابہؓ اور صالحین کو ناقابل بیان صدمہ پہونچا، حضرت ام سلمہؓ کو جب اس روح فرسا حادثہ کی اطلاع پہونچی، تو اہل عراق پر لعنت بھیجی، اور ان کے لئے ہلاکت کی دعاء فرمائی، (مجمع الزوائد: ۹/۱۹۴) امام ابراہیم نخعی نے خوب فرمایا کہ اگر خدانخواستہ میں قاتلان حسین میں سے ہوتا اور میری مغفرت کر دی جاتی، نیز میں جنت میں داخل کیا جاتا تب بھی مجھے حضور ﷺ کا سامنا کرنے سے شرم محسوس ہوتی۔ (حوالہ سابق: ۹/۱۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ بیت سے محبت کے بغیر کوئی ایسا شخص رہ ہی نہیں سکتا، جو واقعی مسلمان ہو۔ اور جس کو رسول اللہ ﷺ سے محبت کا کوئی درجہ حاصل ہو، صحابہؓ چوں کہ سب سے زیادہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے اور آپ کی نسبت پر وارفتہ تھے، اس لئے اہلِ بیت سے ان کو خاص تعلق تھا، بنی امیہ کا حکمراں مروان ایک بار

حضرت ابو ہریرہ ﷜ سے کہنے لگا کہ جب سے ہمیں آپ کی رفاقت حاصل ہوئی ہے، مجھے آپ کی کسی بات سے ناگواری نہیں، سوائے اس سے کہ آپ حسن وحسین؄ سے محبت رکھتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ ﷜ سمٹ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم لوگ حضور کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، ایک جگہ حضور نے حضرات حسنین ﷠ کے رونے کی آواز سنی، حضرت فاطمہ؅ بھی ساتھ تھیں، آپ تیز تیز چل کر وہاں پہونچے، اور فرمایا کہ ہمارے بیٹوں کو کیا ہوا ہے؟ حضرت فاطمہ؅ نے عرض کیا کہ یہ پیاسے ہیں، آپ ﷺ نے اپنے مشکیزے میں دیکھا تو پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا، پھر آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سفر سے پانی کے بارے میں فرمایا تمام ہی لوگ پانی کے برتن کی طرف لپکے، لیکن اتفاق کہ کسی کے پاس پانی موجود نہیں، تو آپ ﷺ نے باری باری حضرت حسن ﷜ اور حضرت حسین ﷜ کو اپنی زبان مبارک کو چسایا، جب انہیں سکون ہوا، تو آپ ﷺ کو اطمینان ہوا، حضرت ابو ہریرہ ﷜ نے فرمایا کہ اسی لئے میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، (طبرانی بسند صحیح، مجمع الزوائد: ۹/ ۱۸۰) اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ گلشن محمدی ﷺ کے ان غنچہ ہائے سدا بہار اور گل ہائے مشک بار سے کیسی محبت رکھتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کا خوف بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہوتا تھا۔

لیکن کیا حضرات حسنین سے امت کی یہ محبت اور دربار رسالت مآب میں ان کا یہ درجہ ومقام صرف اسی وجہ سے تھا کہ یہ حضور ﷺ کے نواسے تھے؟____ یقیناً یہ نسبت بھی اس محبت میں کارفرما ہے، لیکن اس سے بڑھ کر حضرات حسنین کا اسوہ اور ان کا کردار ہے، جو قیامت تک کے لئے نقش لافانی ہے، حضرت ابو بکر ﷜ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ منبر اقدس پر تھے، اور آپ ﷺ کے پہلو میں حضرت حسن ﷜ تھے، آپ ایک دفعہ لوگوں کی طرف دیکھتے، اور ایک دفعہ حضرت حسن ﷜ کی طرف، اور ارشاد فرماتے، میرا یہ بیٹا سید (سردارِ امت) ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائیں گے۔

(بخاری: حدیث نمبر:۳۷۴۶)

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اہلِ شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں آگے بڑھے، اور ادھر اہلِ حجاز اور اہلِ عراق حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں، عام طور پر صحابہؓ اور اکابر تابعین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کے موقف کے مؤید تھے، اور بقول حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ پہاڑوں کی طرح لشکرِ جرار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رکاب میں تھا، اور یہ ایسے جان نثار لوگ تھے، کہ بہ ظاہر ان کا پشت دکھا کر بھاگنا ہرگز متوقع نہیں تھا، بہ ظاہر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے غالب آنے کی توقع زیادہ تھی، لیکن جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے صلح کی پیشکش ہوئی، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بہت سے رفقاء کی مخالفت بلکہ ایک گونہ طعن و تشنیع کے باوجود اس پر لبیک کہا، اور اپنا ہاتھ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا، تاکہ مسلمانوں کی خونریزی نہ ہو، اور اسلامی دنیا ایک جھنڈے کے نیچے آجائے، اس طرح وہ پیشین گوئی شرمندۂ تعبیر ہوئی جسے رسول اللہ ﷺ نے آپ کے سلسلہ میں فرمائی تھی، یہ کچھ معمولی قربانی نہیں تھی، اور اس قربانی نے اسلام کی تاریخ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ایسی عظمت عطاء کی، کہ اگر وہ پورے عالم اسلام کے متفق علیہ تاج ور بن جاتے، تب بھی شاید ان کو یہ مقام حاصل نہ ہوا ہوتا، اور لوگوں کے قلوب پر ان کی حکمرانی قائم نہ ہوئی ہوتی۔

چنانچہ ایک بار پھر پورا عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے آگیا، اور ایشیاء افریقہ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں مسلمان فاتحانہ پیش قدمی کرنے لگے، اس سے کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کرسکتا کہ اس میں بنوامیہ رضی اللہ عنہ کے تدبر سے زیادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ایثار کا حصہ ہے!

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یزید بن معاویہ کے مقابلہ کھڑا ہونا اس لئے نہیں تھا کہ آپ حکومت کی حرص وطمع رکھتے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خانوادۂ نبوی سے نسبت کا

جو شرف حاصل تھا، اس پر ہزار حکومتیں قربان اور نچھاور تھیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ اسلام جس دور میں آیا، وہ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کا دور تھا، اس وقت کی معلوم دنیا میں جہاں بھی چھوٹی بڑی حکومت تھی، ان کی اساس خاندانی بادشاہت پر تھی، اسلام نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں کی اصلاح کی، وہیں نظام سیاست کی بھی اصلاح کی، اور خلافت کا تصور دیا۔

خلافت میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ اس منصب کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے، جو اخلاق و کردار کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل ہو، دوسرے مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے اس کا انتخاب کیا ہو، اسی اصول پر حضرت ابوبکر ؓ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابوبکر ؓ نے اکابر صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر ؓ کو نامزد فرمایا۔ حضرت عمر ؓ نے چھ رکنی کمیٹی بنادی، اور ان حضرات نے عام مسلمانوں سے مشورہ اور باہمی تبادلۂ خیال کے ذریعہ حضرت عثمان ؓ کا انتخاب کیا، پھر حضرت عثمان ؓ کی مظلومانہ شہادت کے بعد اہل مدینہ اور اکابر صحابہؓ نے بہ اصرار حضرت علی ؓ کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت علی ؓ سے جن صحابہ کو اختلاف تھا، وہ حضرت عثمان ؓ کے قصاص کے بارے میں تھا، ورنہ ان کی لیاقت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں تھا، اور اس لئے علماء اہلِ سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ حضرت علی ؓ کی شہادت تک وہی خلیفۂ برحق تھے، حضرت حسن ؓ نے بھی آپ اپنی خلافت کا اعلان نہیں فرمایا، بلکہ اس عہد کے اکابر صحابہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جس تیس سالہ خلافت راشدہ کی پیشین گوئی فرمائی تھی، وہ حضرت حسن ؓ کے چھ ماہی عہدِ خلافت پر مکمل ہو جاتی ہے۔

یزید کی حکمرانی سے ایک نئے طریقہ کا آغاز ہوا، کہ بعض ایسے لوگ جو اس سلسلہ میں اسلام کے مزاج سے پوری طرح واقف نہیں تھے، اور ان کو براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی صحبت حاصل نہیں تھی، انہوں نے حضرت معاویہ ؓ کو باور کرایا کہ آئندہ کے لئے یزید کو خلیفہ نامزد کر دیا جائے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر ؓ،

حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ اور اکابر صحابہؓ جو اس وقت موجود تھے، ان کو حکمرانی کے اس نئے طریقہ سے اس قدر اختلاف تھا، جتنا حضرت حسین ؓ کو، لیکن بعض صحابہؓ نے فتنہ کے اندیشہ سے خاموشی اختیار کی، اور بعض نے امت کو اختلاف سے بچانے کے لئے بہ کراہت خاطر اس تجویز کو قبول کر لیا۔ اب اگر تمام صحابہؓ اس صورت حال پر یہی رویہ اختیار کرتے اور کسی کی طرف سے مزاحمت پیش نہ آتی، تو آئندہ یہ بات سمجھی جاتی کہ اسلام میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ ساتھ عہدِ جاہلیت کی مروجہ ملوکیت کی بھی گنجائش ہے، چنانچہ حضرت حسین ؓ نے اس کی مزاحمت کو ضروری سمجھا، یہاں تک کہ اپنے رفقاء اور اہلِ خاندان کے ساتھ نہایت ہی بے دردی سے شہید کر دیئے گئے، اور قاتلان حسین نے جہاں آخرت میں اپنے لئے اللہ کے عذاب اور ابدی خسران کو محفوظ کر لیا وہیں دنیا میں بھی قیامت تک کے لئے اہلِ ایمان کی نگاہ میں ملعون و مغضوب قرار پائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت حسین ؓ کی یہ مہم بہ ظاہر کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی، لیکن حضرت حسین ؓ کو معنوی فتح حاصل ہوئی، چنانچہ امت کے علماء و فقہاء اور اربابِ نظر آج اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام جس نظام حکمرانی کا داعی ہے، وہ خلافت ہے نہ کہ خاندانی بادشاہت، حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا حصہ اسی بادشاہت کا ہے، لیکن اس کے باوجود آج اسے اسلامی فکر کے خلاف کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور کیوں اس رویہ کو قبول نہیں کیا گیا؟ یقیناً اس میں بڑا حصہ حضرت حسین ؓ اور آپ کے بعد حضرت عبد اللہ بن زبیر ؓ کی مزاحمت اور اسی راہ میں شہادت کا ہے۔ ورنہ بعد کے لوگ سمجھتے کہ اس مدت پر مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہو چکا ہے۔

پس حضرت حسن ؓ کا اسوہ یہ ہے کہ امت کو اختلاف و انتشار سے بچانے کے لئے اپنے اقتدار کی قربانی گوارا کیا جائے، اور ایثار سے کام لیا جائے، اور حضرت حسین ؓ کا اسوہ یہ ہے کہ جب دین میں کوئی طاقت کمی بیشی کرنا چاہے اور

اسلام کی صحیح تصویر کو مسخ کرنے کے در پے ہو تو چاہے اس کے لئے اپنی رگِ گلو کٹانی پڑے لیکن بہتر قیمت اللہ کے دین اور شریعت کی فکری سرحدوں کی حفاظت کی جائے، آج کے حالات میں یہ دونوں نمونے امت کے لئے مشعل راہ ہیں، امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے عہدۂ و جاہ کا ایثار، اور دین کی حفاظت و صیانت کے لئے اپنی جان عزیز تک کی قربانی!!

(۶/اپریل/۲۰۰۱ء)

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

انسانی معاشرے میں کچھ لوگوں کا دولت منداور کچھ کا غریب ضرورت مند ہونا نظامِ قدرت اور تقاضۂ فطرت ہے، اس لئے ہر سماج کی ضرورت ہے کہ اس کے خوش حال اور اصحاب کشائش اپنے ضرورت منداور غریب بھائیوں کی مدد اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اپنی دولت کا کچھ حصہ اسی مقصد کے لئے نکالیں، اسی لئے پہلے آسمانی مذاہب میں بھی زکوٰۃ وصدقات کا حکم فرمایا گیا، قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے اہل وعیال کوزکوٰۃ دینے کا حکم فرمایا کرتے تھے، **كَانَ يَامُرُ اَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ** (مریم:۵۵) بنی اسرائیل سے خدانے جن باتوں کا عہد لیا تھا ان میں نماز کا قائم کرنا اور زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی تھا، (بقرہ:۳) حضرت مسیح نے بھی اعلان فرمایا کہ مجھے زندگی بھر اقامتِ صلوٰۃ اور اداءِ زکوٰۃ کی ہدایت کی گئی ہے **وَاَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا** (مریم:۳۱)

ہر چند کہ بائبل میں انسانی ہاتھوں اور دماغوں نے بہت کچھ تحریف کی ہے، لیکن اب بھی اس میں کہیں مبہم اور کہیں واضح ہدایت صدقہ وانفاق کی ملتی ہے، تورات غلہ اور جانور دونوں میں دسواں حصہ واجب قرار دیتا ہے :

> اور زمین کی پیداوار کی مساوی دہ یکی (دسویں حصہ) خواہ وہ زمین کے بیج کی یا درخت کے پھل کی ہو، خداوند کی ہے، اور خداوند کے لئے پاک ہے، اور گائے ، بیل اور بھیڑ، بکری یا جو جانور چرواہے کی لاٹھی کے نیچے سے گذرتا ہو، ان کی دہ یکی یعنی دس پیچھے ایک ایک جانور خداوند کے لئے پاک ٹھہرے ۔(احبار: ۲۷، ۳۰x۳)

فی کس آدھا مثقال اس کے علاوہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو ہدایات دی گئیں

ان میں ایک یہ بھی تھی کہ :

دولت مند نیم مثقال سے زیادہ نہ دے اور نہ غریب اس سے کم دے (خروج ۱۵/۳۰) دوسرے مذاہب میں بھی نذر، قربانی اور دان کا تصور موجود ہے، غرض انسانی خدمت غریبوں کی مدد اور حاجت مندوں کی حاجت برآئی مذاہب عالم اور انسانی فطرت سلیمہ کا ایک مشترک ورثہ ہے، جسے اسلام نے نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اس کو خدا کی بندگی کا ہم درجہ بنا دیا اور اس کی اہمیت میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت کو اس کا ایک مرتب نظام عطا فرمایا۔

اسلامی تعلیمات کا اولین اور مستند ترین سرچشمہ قرآن مجید ہے، قرآن مجید نے زکوٰۃ کو جو اہمیت دی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے بیس مقامات پر زکوٰۃ کو اسلام کے رُکن اوّل نماز کے دوش بدوش ذکر کیا ہے، بتیس مقامات پر صریحاً زکوٰۃ کا اور پندرہ مقامات پر صدقہ کا ذکر آیا ہے، مختلف سیاق میں رحمتِ خداوندی کا حق دار ہونے کے لئے ایمان وتقویٰ کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کو بھی شرط قرار دیا گیا (اعراف :۱۶۵) اور فرمایا گیا کہ زکوٰۃ تمہارے مال میں کمی کا سبب نہیں بلکہ برکت و اضافہ کا باعث ہے، وَمَا اٰتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: ۳۹) آخرت میں اس کا جو ثواب ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے :

> اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی مثال اس بوئے گئے دانے کی ہے، جس میں سات بالیاں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں، اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں، دو چند کر دیتے ہیں، اور وہ وسعت والے اور علم والے ہیں (البقرہ:۲۶۱)

جو لوگ زکوٰۃ ادا نہ کریں اور غریبوں کے اس حق سے پہلو تہی برتیں، ان کے لئے اسی درجہ عبرتناک سزا ہے۔

جس دن سونا چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر

اس سے پیشانیاں، پہلو اور پشت داغے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ
یہی مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، اب اس مال کا مزا چکھو۔

(توبہ:۳۵)

کہیں فرمایا گیا کہ اس مال کا طوق عذاب بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا (آل عمران:۱۸) واقعہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں نماز کے بعد جس تاکید واہتمام اور کثرت و تکرار کے ساتھ قرآن مجید نے زکوٰۃ وصدقات، انفاق، انسان کی مدد، یتیموں اور حاجت مندی کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر کیا ہے، کسی اور عمل پر اس اہمیت کے ساتھ زور نہیں دیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ کو ارکان اسلام میں نماز کے بعد درجہ دیا ہے اور بعض اوقات آپ ﷺ نے جن باتوں پر بیعت لی ان میں زکوٰۃ کا بھی ذکر فرما دیا (بخاری، کتاب الزکوٰۃ، ۱/۱۸۸) آخرت میں زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر آپ ﷺ کی جو وعیدیں ہیں، وہ نہایت لرزا دینے والی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہوگی وہ زہریلے سانپ کی صورت اختیار کر کے گلے کا طوق بن جائے گا اور ڈستا رہے گا (بخاری: باب اثم مانع الزکوٰۃ) —— جن جانوروں کی زکوٰۃ نہ دی گئی ہوگی وہ اس کے جسم کو روندیں گے (حوالہ سابق)، دو خواتین خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، جن کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی زکوٰۃ ادا کر دی ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم کو یہ پسند ہے کہ آگ کے کنگن تم کو پہنائے جائیں؟ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی (ترمذی:۱/۱۳۸، باب ماجاء فی زکوٰۃ الحلی)

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے دنیا میں بھی زکوٰۃ ادا کرنے پر خوش خبری اور نہ ادا کرنے پر اللہ کی پکڑ کا ذکر فرمایا ہے، فرمایا کہ صدقہ سوء خاتمہ سے بچاتا ہے، (ترمذی:۱/۱۴۴) عمر میں اضافہ کرتا ہے (الترغیب والترہیب/۱۶۱) ستر مصیبتوں کے دروازے بند کرتا ہے (حوالہ سابق) بلائیں صدقہ کی وجہ سے نہیں آتی ہیں **فان البلاء لا یتخطاها** (مشکوٰۃ المصابیح:۱/۱۶۷) جس مال کی زکوٰۃ ادا کی جائے، تو مال زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اصل مال بھی

ہلاک وضائع ہو جاتا ہے (مشکوۃ: کتاب الزکوۃ) جو قوم زکوۃ ادا نہیں کرتی، اس پر اللہ کی طرف سے قحط کا عذاب آتا ہے (الترغیب والترہیب) دنیا میں انسان کی بداعمالیوں کا اس پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟، حضرت ابن عمرؓ نے اس سلسلہ میں حضور ﷺ کی اثر انگیز روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے جماعت مہاجرین! پانچ گناہ ہیں کہ جب تم ان میں مبتلاء ہو جاؤ گے، (مصیبتوں میں پڑو گے) اور میں اس بات سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، کہ تم ان گناہوں میں مبتلا ہو، جس قوم میں کھلے عام بدکاریاں ہونے لگیں، ان میں طاعون اور ایسی تکلیف دہ بیماریاں پیدا ہوں گی، جو پہلے کے لوگوں میں نہیں ہوئی، ناپ تول میں کمی کریں گے تو قحط، تنگ حالی اور حکمرانوں کا جور و ظلم ان پر ہوگا، جو زکوۃ ادا نہ کریں گے بارش سے محروم کر دیئے جائیں گے، اور (اس بستی میں) جانور نہ ہوں تو شاید ان پر بالکل ہی بارش نہ ہو، خدا اور رسول کے پیمان کو توڑیں گے، تو دشمنوں کو جو کفار ہوں گے ان پر مسلط کر دے گا، اور وہ ان کے قبضہ سے بعض چیزیں چھین لیں گے، اور مسلمانوں کے جو حکمراں قرآن مجید کے مطابق فیصلہ نہ کریں گے، اور احکامِ الٰہی کو ترجیح نہ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی قوت کو باہم ہی ٹکرا دے گا۔

(ابن ماجہ عن ابن عمر، ۲/۲۹۰، باب العقوبات)

غور کیا جائے تو آج اس حدیث کی تصدیق چشم سر سے دیکھی جاسکتی ہے، اقوام مغرب میں بدکاریاں، ایسے امراض کا وجود کہ جن سے کان و دل یکسر نا آشنا تھے، حکمرانوں کا ظلم و جور، قحط وخشک سالی، مسلمانوں پر ان کے دشمنوں کا غلبہ وتسلط اور باہم آویزشیں، یہ ساری حقیقتیں دوپہر کی دھوپ کی طرح سامنے ہیں!۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگ حالی اور درماندگی کا ایک اہم سبب اس امت کا فریضۂ زکوۃ سے غفلت و

بے اعتنائی ہے۔

غور کیجئے تو مذاہب کی تعلیم کا خلاصہ اللہ سے تعلق اور محبت ہے، راہبوں کی رہبانیت اور گھٹنوں کے بل قیام، مندروں میں بتوں کے سامنے سجود و نیاز، آتش کدوں میں آتش اعتقاد کو سلگانا اور مسلسل روشن رکھنا، ان سب کا اپنے اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق خدا سے تعلق کے اظہار کے سوا اور کیا ہے؟ اسلام نے اس مقصد کے لئے نماز کا نہایت پاکیزہ اور اثر انگیز عمل رکھا، جس میں زبان اور آنکھیں ہاتھ اور پاؤں اور جسم کا ایک ایک حصہ خدا کی بارگاہ میں حاضر اور متوجہ رہتا ہے، عجز وفروتنی کی انتہا یہ ہے کہ انسان اپنی پیشانی تک خاک پر رکھ دیتا ہے۔

لیکن تعلق مع اللہ اسی وقت اوج کمال کو پہونچ سکتا ہے، جب کہ غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو، دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ دامن نفس کو کھینچتی اور اپنا فریفتہ کرتی ہے، وہ مال ودولت ہے، اس کی حرص اوّل خدا سے بے توجہ کرتی ہے، پھر دولت وثروت کا نشہ دل ودماغ پر چڑھتا ہے، اور کبر وغرور انگڑائیاں لینے لگتا ہے، یہی ''کبر'' دین واخلاق کے لئے سم قاتل ہے، اس سے خود غرضی پیدا ہوتی ہے، ایثار کا جذبہ مفقود ہوتا ہے، لوگوں کے حقوق کو وہ ڈھکوسلہ سمجھنے لگتا ہے، اپنی دولت کے لئے خود اپنے قوت بازو کا ثمر ہونے کا خیال جڑ پکڑتا ہے۔

''زکوۃ'' اسی مال کی محبت کو کم کرتا ہے، ''نماز'' خدا سے تعلق کا سامان تھا، اور ''زکوٰۃ'' غیر اللہ سے بے تعلقی کا عنوان ہے، اسی کو ''تزکیہ'' کہا جاتا ہے، اس سے تواضع کا اظہار ہوتا ہے، ایثار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، زکوٰۃ کا عمل بندہ کے اس یقین کو ظاہر کرتا ہے، کہ جو کچھ ہے، خدا کا عطیہ ہے، اس میں خود اس کی قوت وقدرت کو دخل نہیں، یہ اس بات کا اقرار ہے کہ خدا کی خوشنودی کی قربان گاہ پر وہ دولت دنیا کو قربان کرنے کے لئے تیار ہے، یہ ایمان کی تازگی ہے، دولت ودنیا کی تطہیر ہے عقیدہ اور باطن کی صفائی ہے اور اعمال کی پاکی ہے، اس لئے اس کا نام ہی ''زکوٰۃ'' رکھا گیا، جس کے معنی ہی پاکی کے ہیں، قرآن نے زکوۃ میں پائے جانے والی تربیت اخلاق اور تزکیہ باطن کی خاص

صلاحیت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ (توبہ: ۱۰۳) ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے، اس کے ذریعہ آپ انہیں پاک وصاف کردیں گے۔

یہ تو زکوٰۃ کا اخلاقی اور روحانی پہلو ہے، اس کے مادی اور معاشی فوائد ظاہر ہیں، کوئی بھی سماج دولت منداور غریب طبقہ سے خالی نہیں ہوسکتا، زکوٰۃ سماج کے غریب طبقہ کو تحفظ وضمانت عطا کرتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر تمام لوگ زکوٰۃ ادا کریں تو کسی کو غذااور لباس سے محروم ہونا نہ پڑے۔

> اللہ نے اہلِ دولت پر جو زکوٰۃ فرض کی ہے، وہ اتنی مقدار ہے کہ فقراء کے لئے کافی ہو جائے، اگر یہ بھوکے، بے لباس اور پریشان رہیں تو یہ اغنیاء کے فریضۂ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کو حق ہے کہ وہ قیامت کے دن ان کا محاسبہ کریں اور ان کو اس پر عذاب دیں۔

یقین ہے کہ اگر دولت کے اعتبار سے تین درجات کئے جائیں، ایک وہ لوگ جن پر زکوٰۃ واجب ہے، دوسرے وہ جو زکوٰۃ کے حقدار ہیں، پھر ان لوگوں کی دولت اور اس کی شرح زکوٰۃ کا حساب کیا جائے جن پر زکوٰۃ واجب ہے، اور ان لوگوں کی غربت کو ملحوظ رکھ کر ان کی ضروریات کا حساب لگایا جائے، تو ضرور زکوٰۃ تمام غرباء کی ضرورت پوری کردے گی، کاش اعداد وشمار کی مدد سے اس کی تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی ایمان وعقیدہ کی آنکھوں سے نہیں بلکہ سر کی آنکھوں سے دیکھی جاسکے گی۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کا خود اہلِ ثروت کو یہ فائدہ ہوگا کہ غرباء طبقہ۔ جس کی محبت اور جفا کشی ہی ہر چراغ عیش میں شعلہ زن ہے اور جن کے دم سے ہی عشرت کدۂ حیات کی ساری بہار قائم ہے۔ میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوں گے اور وہ ان کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھیں گے، مغربی سرمایہ داری میں زکوٰۃ کے لئے تو کیا جگہ ہوتی؟ سود

نے غرباء اور مزدوروں کی کمر توڑ رکھی ہے، یہ سود اس محتاج و محنت کش طبقہ میں اہلِ دولت کے خلاف مخالف جذبات کو جنم دیتا ہے، اور بھڑکاتا ہے، کمیونسٹ تحریک اسی ردِ عمل میں پیدا ہوئی، اسلام نے زکوٰۃ کے ذریعہ اس کا علاج کیا ہے، اور دولت میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲۲/ نومبر ۲۰۰۲)

اِدھر دیا کہ اُدھر داخل خزانہ ہوا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف خلیفہ اور فرماں رواہی نہ تھے، بلکہ ایک مشفق، مربی اور مزاج شناس مصلح بھی تھے اور اسی نسبت سے وقتاً فوقتاً اپنے رفقاء کا امتحان بھی لیتے رہتے تھے۔ چنانچہ مالک الدارمی سے مروی ہے کہ ایک بار چار سو دینار لیا، اسے ایک تھیلی میں رکھا اور ایک لڑکے سے کہا کہ اسے ابوعبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ کو لے جا کر دے دو، دینار حوالہ کرنے کے بعد تھوڑی دیر گھر میں ٹھہرنا اور دیکھنا کے وہ کیا کرتے ہیں، لڑکا گیا اور اس نے کہا کہ امیر المومنین کہتے ہیں کہ اسے اپنی بعض ضروریات میں خرچ کر لیجئے، چار سو دینار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی، بیس دینار سونا ساڑھے سات تولے کے برابر ہوتا ہے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ دعائیہ کلمات کہے، پھر باندی کو آواز دی اور فرمایا کہ یہ سات دینار فلاں کو پہونچادو، یہ پانچ فلاں کو اور یہ پانچ فلاں کو، اس طرح اسی مجلس میں پائی پائی تقسیم کر دیا، وہ لڑکا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا اور پورا واقعہ ان سے نقل کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار کی ایک اور تھیلی تیار کی اور کہا کہ اسے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاؤ، وہاں بھی تھوڑی دیر رک کر دیکھنا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کیا کرتے ہیں؟ چنانچہ لڑکے نے ان کے پاس بھی تھیلی پہنچائی اور کہا کہ امیر المومنین نے فرمایا ہے کہ اسے اپنی ضروریات میں خرچ کریں، انہوں نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے دعا کے کلمات کہے، پھر ایک لڑکی کو بلایا اور تقسیم شروع کی، فلاں کے گھر اتنا پہنچادو اور فلاں کے گھر اتنا، جب دینار ختم ہونے کے قریب آئے تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے جھانک کر دیکھا اور عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم لوگ بھی مسکین ومحتاج ہیں، کچھ تو ہمیں بھی عطا فرمایئے، نحن واللہ مساکین فاعطنا، تھیلی میں صرف دو دینار رہ گئے تھے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف پھینک دیا، قاصد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس واپس آیا اور آنکھوں

دیکھا حال سنایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ سب بھائی ہیں اور ایک دوسرے کے مزاج پر ہیں۔'' انهم اخوة بعضهم من بعض '' (مجمع الزوائد: ۱۲۵/۳)

اسی طرح کا ایک امتحان حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک اور معتمد رفیق حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ وہ اپنے گھر میں کچھ جمع کر کے نہیں رکھتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لئے دس ہزار بھیجے، سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس جوں ہی رقم پہنچی اس رقم کی مختلف تھیلیاں بنا کر مختلف لوگوں کے پاس پہنچانے لگے، شریکۂ حیات نے پوچھا کہ یہ کہاں لے جا رہے ہو؟ فرمایا: اس کے پاس جو ہمیں اس کا نفع دے، چنانچہ اس طرح پورے پیسے تقسیم کر دیئے، تھوڑی سی رقم بیوی بچوں کے لئے بچا دی، جب یہ معمولی رقم گھر کے خرچ میں کام آ گئی تو بیوی نے عرض کیا کہ جن لوگوں کے پاس نفع کے لئے رقم رکھی ہے ان کے پاس جائیں اور کچھ نفع اس کا وصول کر کے لائیں کہ گھر چلے، وہ ٹال مٹول سے کام لیتے رہے، یہاں تک کہ جب زیادہ عرصہ بیت گیا اور بیوی کا مطالبہ جاری رہا، تب جا کر حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا کہ نفع دینے والے سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات تھی، جو آخرت میں بے پناہ نفع کے ساتھ اصل واپس فرمائے گا۔ (حوالۂ سابق)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور رفقاء میں انفاق کا کیسا بھرپور جذبہ تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں لٹا کر کس قدر خوش ہوتے تھے؟ اور یہ نتیجہ تھا پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا، خود آپ کو اس سے زیادہ کوئی چیز گراں نہ ہوتی تھی کہ آپ کے پاس پیسے جمع ہوں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم رفقاء کے درمیان تشریف لائے، ہاتھ میں سونے کا ایک ٹکڑا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہو جائے اور اس کے پاس یہ موجود ہو تو وہ اپنے رب سے کیا کہے گا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مجلس سے کھڑے ہونے سے پہلے اسے تقسیم فرما دیا اور اُحد پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے اس بات سے خوشی نہیں ہوگی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ کو اس پہاڑ کے برابر سونا اور چاندی ہوں، وہ اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کریں اور اس میں سے ایک دینار بھی نہ بچا رکھیں۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ نے ایک دینار یا درہم یا غلام اور باندی کچھ بھی نہیں چھوڑا، بلکہ آپ ﷺ کی زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس تمیں صاع (ایک کوئنٹل سے اوپر) جو کے بدلہ میں رہن تھی، اسی جو سے آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے اہل وعیال کے کھانے کی ضرورت پوری ہورہی تھی۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی: ۱۲۳/۳)

جب وفات کا وقت آیا تو سات دینار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھے، آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ یہ سونا علی کے پاس بھیج دو، آپ ﷺ کی بے ہوشی کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مشغول ہوگئیں، یہی بات بار بار پیش آتی رہی، آپ ﷺ کو ہوش آتا، آپ ﷺ دینار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا حکم دیتے، پھر بے ہوشی طاری ہوجاتی، حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی دیکھ بھال میں لگ جاتیں، آخر حضرت عائشہؓ نے دینار بھیجوا دیئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے صدقہ کردیا۔ جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی اس دن چراغ میں تیل تک میسر نہیں تھا، حضرت عائشہؓ نے اپنے قرابت مندوں میں سے ایک خاتون کے پاس چراغ بھیجا کہ وہ اپنے برتن سے چراغ جلانے کا سامان مہیا کردیں۔ (مجمع الزوائد بحوالہ طبرانی: ۱۲۴/۳) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے یہاں کیسا انفاق تھا، کائنات آپ کے قدموں میں تھی، لیکن آپ ﷺ ہمیشہ کوشاں رہتے کہ پائے مبارک متاعِ دنیا سے آلودہ نہ ہونے پائے ﷺ۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور غریب انسان کی مدد کرنے کی جو ترغیب دی ہے، کم نیکیاں ہیں جن کی اس قدر آپ ﷺ نے ترغیب دی ہو۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرمائیے اور دوسرا کہتا ہے کہ روک رکھنے والے کو نقصان پہنچائیے۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ خود فرماتے ہیں: اے بنی آدم! خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ) ایک بار دریافت کیا گیا کہ کون سا صدقہ اجر میں بڑھا ہوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ تو اس وقت صدقہ کرے جب صحت مند ہو، یعنی موت کے قریب نہ ہو اور فقر کا اندیشہ باقی ہو، ایسا نہ ہو کہ جب جان حلق تک پہنچ

جائے تو کہو: فلاں کو یہ اور فلاں کو یہ دے دیا جائے۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ) ایک روایت میں ہے کہ جاہل سخی اللہ کے نزدیک بخیل عبادت گذار سے بہتر ہے۔ (ترمذی عن ابی ہریرۃ ﷺ) ایک بار آپ نے ارشاد فرمایا کہ: کیا میں تم کو سب سے بدترین آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: جس سے اللہ کا واسطہ دے کر مانگا جائے اور وہ پھر بھی نہ دے۔ (مسند احمد عن ابن عباس ﷺ)

صدقہ پر نہ صرف آخرت میں ثواب ہے، بلکہ دنیا میں بھی صدقہ کے بڑے فوائد ہیں۔ حضرت علی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: صدقہ کرنے میں عجلت کرو، کیوں کہ بلاء صدقہ کو پھلانگ نہیں پاتی۔ (مشکوٰۃ: حدیث نمبر ۱۸۸۷) یعنی صدقہ انسان کو ابتلاء و آزمائش سے بچاتا ہے۔ حضرت انس ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کی آتشِ غضب کو بجھاتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔ (ترمذی: باب ماجاء فی فضل الصدقۃ) حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کپڑا پہنائے تو جب تک اس پر کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی رہے وہ اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ (ترمذی: عن ابن عباس، مشکوٰۃ: حدیث نمبر ۱۱۹۰)

یہ تو صدقہ کا عمومی اجر و ثواب ہے، لیکن رمضان المبارک میں صدقہ اور انفاق کا ثواب کئی چند ہو جاتا ہے۔ رمضان جہاں صبر اور ضبط نفس کا مہینہ ہے وہیں انسان کے ساتھ غم خواری اور حسن سلوک کا بھی مہینہ ہے اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ یوں تو ہمیشہ صدقہ فرماتے تھے، لیکن رمضان المبارک کے مہینہ میں اس میں نمایاں طور پر اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے وقت کی نیکیوں کے اس موسم بہار سے فائدہ اٹھایا جائے اور آخرت کے خزانہ کو بھرا جائے۔ بقول مولانا حسام الدین فاضل ؎

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کو بھر لینا
ادھر دیا کہ اُدھر داخل خزانہ ہوا

(۲۱ر نومبر ۲۰۰۲ء)

بادشاہی میں فقیری

''حمص'' شام کا ایک شہر ہے، ایک زمانہ میں یہی شام کا پایۂ تخت تھا، عہدِ فاروقی میں گورنر شام یہیں قیام کرتے تھے۔ حمص سے ایک وفد خدمتِ فاروقی میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی مملکت کے غرباء اور حاجت مندوں کا بڑا پاس تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے واردین سے فرمایا کہ وہاں کے زیادہ محتاج اور ضرورت مند لوگوں کی ایک فہرست بنائیں کہ میں ان کی کچھ مدد کر سکوں، فہرست بنی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نگاہ ڈالی تو دیکھا اس میں ایک نام ''سعید بن عامر'' بھی ہے۔ حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ صحابی رسول ہیں، جن کو آپ رضی اللہ عنہ نے شام کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اس نام پر پہنچے تو اچنبھا ہوا، خیال ہوا کہ شاید کوئی اور سعید ہوں۔ دریافت فرمایا یہ سعید بن عامر کون ہیں؟ عرض کیا گیا: ہمارے امیر و گورنر! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تو تمہارے گورنر فقیر و محتاج ہیں؟ کہا گیا: بیشک، ایسے محتاج کہ مدتوں گھر میں چولھا سلگنے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر سلطانی میں اس درویشی کو دیکھ کر گریہ طاری ہو گیا، آنسوؤں نے آنکھوں ہی کو نہیں، داڑھیوں کو بھی تر کر دیا۔

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے تھیلی میں ایک ہزار دینار رکھے (جو ایک بہت بڑی رقم تھی) وفد کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو میرا سلام کہنا اور یہ تھیلی دے دینا اور بتا دینا کہ یہ آپ کی ضرورت کے لئے بھیجے ہیں۔ تھیلی جب حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی، تو آپ اسے قریب سے ہٹانے لگے اور بے ساختہ زبان سے نکلا ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' گویا کوئی مصیبت آ پڑی ہو یا کوئی تکلیف دہ خبر آئی ہو۔ اہلیہ گھبرائی ہوئی آئیں: کیا امیر المومنین کا انتقال ہو گیا؟ فرمایا: اس سے بھی بڑھ کر۔ کہنے لگیں: کیا مسلمان کسی آفت اور ابتلاء میں

پڑ گئے ہیں؟ ارشاد ہوا: اس سے بھی بڑی بات پیش آئی ہے۔ اہلیہ نے بے قراری سے پوچھا: آخر کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ فرمایا: میرے پاس دنیا آ پہنچی ہے کہ میری آخرت کو خراب کر دے اور فتنہ نے میرے گھر میں قدم رکھ دیا ہے۔ اہلیہ اب تک صحیح صورتِ حال سے واقف نہیں تھی، کہنے لگیں، پھر تو اس سے نجات پانے کی کوشش کریں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے گفتگو کے اس مرحلہ کو غنیمت جانا اور دریافت فرمایا کہ کیا تم اس میں میرا تعاون کروگی؟ بیوی نے تعاون کا یقین دلایا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے اسی وقت یہ پورے دینار مختلف تھیلیوں میں رکھے اور ضرورت مندوں کو روانہ کر دیا۔

اس واقعہ پر بہت عرصہ نہ گذرا تھا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لائے۔ دارالخلافہ حمص کے لوگ کسی قدر گلہ شکوہ کے عادی تھی، اسی لئے لوگ اس کو ''چھوٹا کوفہ'' کہا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حمص میں فروکش ہوئے تو لوگوں سے حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی استفسار فرمایا۔ اہلِ شہر حسب عادت شکایت سے باز نہ رہے اور چار باتوں کی شکایت کی۔ صبح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجلاس منعقد کیا۔ پہلے لوگوں سے شکایات دریافت کیں۔ لوگوں نے کہا کہ سویرے گھر سے نہیں نکلتے، سورج چڑھتے نکلتے ہیں۔ آپ نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے جواب طلب کیا۔ فرمایا: میں ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا، درحقیقت میرے یہاں کوئی خادم نہیں ہے، صبح میں گھر کے کام کاج خود ہی کرتا ہوں، آٹا گوندھتا ہوں، روٹی پکاتا ہوں، پھر وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

لوگوں نے عرض کیا کہ گورنر صاحب رات کو کسی سے ملاقات کے روادار نہیں ہوتے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے کسی قدر تامل سے جواب دیا: افسوس کہ میں جس بات کے اظہار سے بچنا چاہتا تھا، اسی کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے، پھر فرمایا کہ میں نے دن اور رات کی تقسیم کر رکھی ہے، دن لوگوں کی ضروریات کے لئے، رات اللہ کی عبادت کے لئے۔ کہا گیا کہ مہینہ میں ایک دن تو ایسا گذرتا ہے کہ گھر سے باہر ہی تشریف نہیں لاتے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے کہ امیر المومنین! میرے پاس کوئی خادم نہیں اور کپڑا بھی صرف یہی ایک ہے جو جسم پر ہے، اس لئے ماہ میں ایک دن اسی کو دھوتا ہوں، کپڑے خشک ہونے تک

انتظار کرتا ہوں، یہاں تک کہ دن کے آخری حصہ میں باہر آتا ہوں۔

ایک شکایت یہ بھی کی گئی کہ بعض اوقات درمیانِ مجلس بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور آپ حاضرین سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمایا کہ ایک لرزہ خیر منظر میری آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے: میں اس وقت ایمان سے محروم تھا اور مکہ میں اس غول میں شامل تھا جو خبیب رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کا گویا ''تماشہ'' دیکھ رہے تھے، دشمن ان کے جسم کا ایک ایک انگ کاٹتے جاتے اور پوچھتے جاتے کہ کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے؟ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اس کرب و تکلیف کی حالت میں بھی کہتے جاتے کہ مجھے اتنا بھی گوارا نہیں کہ میں اس سے بچ جاؤں اور اس کے بدلہ آپ ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے، جب بھی میری آنکھوں میں یہ منظر آتا ہے، میں بے قرار ہو جاتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ میں نے جو اس دن اس جاں نثار رسول ﷺ کی مدد نہیں کی، شاید اس کی وجہ سے اللہ مجھے معاف نہ کرے اور یہی احساس مجھے ہوش و حواس سے محروم کر دیتا ہے!!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کا گمان اور انتخاب غلط ثابت نہ ہوا۔ واپس جا کر پھر حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے لئے ایک ہزار دینار بھیجے۔ بیوی نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اب آپ کی خدمت کی حاجت نہ رہی، اسی سے کوئی خادم خرید کر دیں۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے استفسار فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتاؤں؟ بیوی نے وضاحت چاہی۔ فرمایا: کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دیں جو انتہائی ضرورت کے وقت ہمیں واپس کرے۔ اہلیہ نے پوچھا: اس کی کیا صورت ہوگی؟ فرمایا: ہم اللہ کو قرض حسنہ دیدیں!! بیوی بھی آخر حضرت سعید رضی اللہ عنہ ہی کی تھیں، شوہر کی تجویز کو بہ خوشی قبول کیا۔ مجلس ختم بھی نہ ہوئی، کہ جلدی جلدی حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں دینار بھرے، یہ فلاں خاتون کے لئے، یہ فلاں مرحوم کے یتیم بچوں کے لئے، وہ فلاں فلاں غرباء کے لئے اور وہ چند لمحوں میں تھیلی بھی خالی ہوگئی اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کے قناعت پسند دل کو بھی قرار آ گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کا ایک بدقسمت محسن ہے۔ محسن اس لئے کہ اسی نے

متحدہ ہندوستان کا تصور دیا اور ہندوستان کو ایسی وسعت عطا کی جو نہ اس سے پہلے اسے حاصل تھی اور نہ اس کے بعد پھر حاصل ہو سکی اور ''بدقسمت'' اس لئے کہ چند منصف مزاج مؤرخین کو چھوڑ کر تاریخ نے اس کے ساتھ ناانصافی اور احسان ناشناسی ہی کو روا رکھا۔ اس محب وطن درویش صفت بادشاہ کا حال یہ تھا کہ اس نے اپنی آخری وصیت میں ہدایت کی تھی کہ اس کی سلی ہوئی ٹوپیوں کی قیمت میں سے چار روپے دو آنے لے لیے جائیں اور اس کے کفن پر خرچ کئے جائیں اور کتابت قرآن میں اس نے جو اجرت حاصل کی تھی، اس میں تین سو پانچ روپے بچ رہے ہیں، جو اس کے ذاتی اخراجات کے بٹوے میں ہیں، یہ اس کی موت کے دن فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔

یہ واقعات نہ فرشتوں کی دنیا کے ہیں، نہ عالم بالا کی کسی مخلوق کے، یہ اسی دنیا کے واقعات ہیں اور اسی زمین پر پیش آئے ہیں۔ جب دل کی دنیا بدلتی ہے اور فکر میں انقلاب آتا ہے، تو کردار کی بلندی کے نمونے سامنے آتے ہیں۔ جو آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو اور خدا کے خوف سے خالی ہو، وہ کردار کی پستی کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا، اس سماج میں جو شخص جس قدر اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوگا، اسی قدر خیانت، خود غرض اور اپنے تئیں کوتاہی میں بھی وہ ''ممتاز'' ہوگا، وہ اسکامس اور اسکینڈلس کا جنم داتا ہوگا اور خدا ترسی اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے جس کو حصہ ملا ہوگا، وہ یقیناً اپنی بادشاہی کو بھی فقر و درویش کے تاج سے آراستہ رکھے گا اور اس اختیاری فقیری کی لذّت وحلاوت پر متاعِ دنیا کی ساری لذتوں کو قربان کرنا اس کے لئے آسان ہوگا!!

(۷/اپریل/۲۰۰۰ء)

بہترین خطا کار

انسان خیر وشر کا مجموعہ ہے، یہ نیکیوں پر قادر ہے، لیکن برائیوں سے عاجز نہیں، نہ فرشتہ ہے کہ برائی کا خیال تک دل میں نہ آئے اور نہ شیطان ہے کہ ضلالت و گمراہی سے کبھی دل خالی ہی نہ ہو، اس لئے اسے اس ''امتحان گاہ'' میں رکھا گیا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کی نیکیاں برائیوں پر فتح پاتی ہیں یا برائیاں نیکیوں پر غالب آتی ہیں، انبیاء کے سوا کوئی انسان نہیں جو غلطی اور خطا سے یکسر محفوظ ہو، گویا غلطی انسان کی سرشت میں ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو انسان فرشتہ بن جائے۔ انبیاء کے بعد سب سے کامل انسان وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو انبیاء کی رفاقت اور نصرت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، لیکن اس مقام ومرتبہ کے باوجود بعض اوقات پیغمبروں کے اصحاب سے بھی غلطیاں صادر ہوئی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان کو فوراً ہی اپنے گناہ پر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اور اس طرح یہی نہیں کہ ان کی یہ ندامت اس گناہ کی تلافی کا سامان بن جاتی ہے، بلکہ ان کا اس طرح گناہ کرنا اور پھر گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے مطابق پشیمان ہونا بجائے خود امت کے لئے اسوہ قرار پاتا ہے۔

آپ ﷺ نے اسی حقیقت کو اس طرح ارشاد فرمایا کہ ہر ابنِ آدم ضرور ہی خطا کرتا ہے، لیکن بہترین خطا کار وہ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے دروازۂ مغفرت پر اپنی ندامت کی پیشانی رکھ دیں اور توبہ کرلیں، **خیر الخطائین التوابون** مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ وہ انتقام لے کر خوش ہوتی ہے، اس سے اس کے جذبہ انا کی تسکین ہوتی ہے اور کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات پر رحمت کا غلبہ اور وہ رحمان ورحیم اور غفور وکریم ہے، اسی لئے اسے گنہ گاروں اور کوتاہ کاروں کو معاف کر کے

خوشی ہوتی ہے، انسان انتقام کے لئے بہانے ڈھونڈتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہانوں سے مغفرت کے فیصلے فرماتے ہیں، کسی نے حج کرلیا تو پچھلی پوری زندگی کا گناہ معاف کردیا، عمرہ کرلیا تو ایک عمرہ سے دوسرا عمرہ کے درمیان کے گناہ معاف ہوگئے، بعض روزے ہیں کہ پورے صغیرہ گناہوں کے کفارہ ہیں، نمازیں بھی جسم سے گناہوں کے میل کو صاف کرتی ہیں، صدقاتِ بھی گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ چھوٹے چھوٹے عمل کی بنیاد پر انسان کے گناہ معاف ہوتے جائیں۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو ''عفو'' یعنی بہت معاف کرنے والا قرار دیا ہے، عربی زبان میں ''عفو'' کے اصل معنی مٹانے کے ہیں (القاموس المحیط :۱۱۸۱) پس ''عفو'' کے معنی مٹا دینے والے کے ہوئے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن گناہوں کو معاف کرتے ہیں ان کو بالکل ہی مٹا دیتے ہیں اور شاید نامۂ اعمال سے بھی محو فرما دیتے ہیں۔ یہ کتنی بڑی شانِ کریمی ہے! انسان کسی کو معاف بھی کردے تو وہ غلطی کو لوحِ قلب سے مٹانے کو تیار نہیں ہوتا، وہ وقتی طور پر جذبۂ انتقام کو دبا لیتا اور جب کبھی تعلقات میں ناہمواری آئی تو پھر اس کو اس کا نامۂ اعمال دکھانے اور چھپے ہوئے واقعات کو منظر عام پر لانے کے لئے کمر کس لیتا ہے، سیاست کی دنیا میں تو اکثر اسکینڈل اسی طرح ظہور میں آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں درگذر کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جب اللہ کسی بات کو معاف فرماتے ہیں تو اس کو ریکارڈ سے ہی حذف کردیتے ہیں۔

توبہ کا تصور جہاں آخرت میں انسان کے لئے نافع ہے، وہیں دنیا میں بھی کچھ کم نافع نہیں۔ اگر ایک کے اندر ناامیدی اور مایوسی پیدا ہوگی، جرم کا حوصلہ بڑھے گا اور جرم پیشہ اذہان سوچنے لگیں گے کہ جب دوزخ مقرر ہی ہو چکی ہے تو دنیا ہی کی لذت اٹھالی جائے اور جہاں ایک دفعہ جرم کا ارتکاب ہوا دس اور سہی، اس سے جرم کو بڑھاوا ملے گا اور سماج میں زندگی اجیرن ہو جائے گی، اس لئے توبہ کا تصور دنیا میں بھی ایک بڑی رحمت ہے اور اس سے سماج کا امن وآشتی متعلق ہے۔

توبہ کے لئے اصل محرک اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس ہے، انسان اپنے

گناہ پر ندامت اور پشیمانی محسوس کرے، اپنے گناہوں کو یاد کر کے اس کا دل لرزنے لگے، خدا کے سامنے اس کے ہونٹ کپکپانے لگیں، آنکھوں کے آنسو دل کی بے چینی اور اضطراب کی گواہی دیں اور اس کا ضمیر گناہوں کے بوجھ تلے اپنے آپ کو دبا ہوا محسوس کرے، اس پشیمانی اور سچی ندامت کے بغیر محض زبان سے توبہ کے الفاظ کہہ دینا کافی نہیں۔ انسان پر اپنی قلبی کیفیت کے لحاظ سے گناہ کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اس کو آپ ﷺ نے ایک مثال سے واضح فرمایا کہ نیک اور سچا مسلمان جب کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس کے سر پر پہاڑ جیسا بوجھ ہے اور جو شخص گناہوں کا عادی ہو جاتا ہے اسے گناہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مکھی ہے جو ناک پر بیٹھی ہوئی ہے، ذرا ہاتھ ہلایا اور اڑ گئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے، اگر توبہ کر لے تو دھل جاتا ہے اور توبہ نہ کرے تو جوں جوں گناہ کرتا جاتا ہے قلب پر دھبے بڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے، اب انسان گناہ کرتا ہے اور اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے بے توفیقی سے بڑھ کر کوئی محرومی نہیں۔ جیسے دنیا میں بہت سے امراض ہیں جس سے آدمی دو چار ہوتا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو شاید ''جنون'' سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں، اس لئے نہیں کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس میں مریض کو اپنے مریض ہونے کا احساس نہیں رہتا، وہ بیمار ہوتا ہے، لیکن اپنے آپ کو صحت مند تصور کرتا ہے، اس کو علاج کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو علاج کی ضرورت سے بری سمجھتا ہے، اسی طرح توبہ سے بے توفیقی ایک ''روحانی جنون'' ہے کہ انسان گناہ میں مبتلا ہے، سر سے پاؤں تک گناہ میں ڈوبا ہوا ہے، لیکن اپنے گناہگار ہونے کا کوئی احساس نہیں کرتا اور کبھی یہ خیال نہیں کرتا کہ خدا کی چوکھٹ پر ندامت اور شرمندگی کی پیشانی رکھے اور التجا کی زبان کھولے۔ اللہ نہ کرے کہ کوئی مسلمان ایسی محرومی اور بدبختی سے دوچار ہو۔

توبہ کے لئے پچھلے کئے پر ندامت کے ساتھ مستقبل کا عزمِ مصمم بھی ضروری ہے،

آدمی اپنے دل میں یہ ارادہ رکھے کہ وہ آئندہ کبھی بھی اس غلطی کا اعادہ نہ کرے گا، اس بات کا نام توبہ نہیں کہ ابھی غلطی کئے دیتے ہیں پھر کبھی گناہ ہوگیا تو پھر توبہ کرلی جائے گی کہ بقولِ شاعر''کم بخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی''، کیوں کہ اس طرح کی سوچ اس بات کی علامت ہے کہ وہ زبان اور دل کی رفاقت کے ساتھ پشیمانی کا اظہار نہیں کر رہا ہے اور اپنی توبہ میں صادق القول نہیں ہے۔

ہر گناہ سے توبہ کا ایک ہی طریقہ نہیں، بلکہ اس کے لئے بھی شریعت نے کچھ اصول مقرر کردیئے ہیں۔ جن گناہوں کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی کفارہ مقرر کردیا گیا ہو تو ان کی توبہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کیا جائے، مثلاً کسی شخص نے جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا تو ساٹھ روزے رکھنا اور اس پر قدرت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا اس کا کفارہ ہے (ردمختار: ۲/۱۰۹) قسم کھائی، لیکن اسے پورا نہ کر پایا تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنانا ہے۔ (مائدہ: ۸۹) ان گناہوں سے توبہ یہی ہے کہ ان کا کفارہ ادا کردیا جائے۔

بعض کوتاہیوں پر شریعت نے قضا واجب قرار دی ہے، جیسے کسی شخص سے عذر کی بنا پر روزہ فوت ہوگیا تو اس پر ان روزوں کی قضا واجب ہے، ہوش وحواس کی حالت میں نمازیں قضا ہوگئیں تو ان کی بھی قضا واجب ہے، یہ گویا بندوں پر اللہ تعالیٰ کا دَین ہے، جس کی ادائیگی واجب ہے، ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے کہ فوت شدہ نمازوں کی قضا کی جائے، اسی طرح بعض عبادتوں کے فوت ہونے پر فدیہ واجب قرار دیا ہے، جیسے کوئی شخص بہت ضعیف یا مریض ہو، روزہ رکھنے پر قادر نہیں اور بظاہر مستقبل قریب میں صحت یاب ہونے کی بھی توقع نہیں، تو ایسے شخص کے لئے یہ سہولت ہے کہ ہر روزہ کے عوض ایک فدیہ ادا کردے، یعنی ایک غریب محتاج شخص کو دوپہر اور رات کا کھانا کھلائے، یا صدقۂ فطر کے بقدر غلہ دے دے۔ اصل میں تو یہ حکم روزہ کے سلسلہ میں آیا ہے (البقرہ: ۱۸۴) لیکن فقہاء نے روزوں پر قیاس کرتے ہوئے نماز میں بھی اس کی اجازت دی ہے کہ جن لوگوں کی نماز فوت ہوگئی اور وہ اب نماز ادا کرنے کے لائق نہ رہے یا ان کا انتقال ہوگیا تو ان کی فوت

شدہ نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ (درمختار: ۲/۱۱۹) ان کوتاہیوں کی توبہ یہی ہے، خاص کر جب کسی شخص کا انتقال ہو جائے تو بجائے اس کے کہ لہو ولعب میں پیسے خرچ کیے جائیں ''کفارہ'' اور ''فدیہ'' ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ ان سے متوفی کو راحت حاصل ہوگی۔

کچھ گناہ اور کوتاہیاں بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، یہ حقوق دو طرح کے ہیں: مالی اور غیر مالی۔ انسان سے متعلق مالی حقوق میں کوتاہیوں کی توبہ یہ ہے کہ صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دیا جائے یا اس سے معاف کرا لیا جائے، کسی کا دین باقی ہو، بلا اجازت کسی کی چیز استعمال کر لی ہو، کسی کو اس کے حق سے محروم کر دیا ہو، میراث میں اپنے حق سے زیادہ لے لیا ہو، یہ تمام صورتیں مالی حق تلفی کی ہیں، ان کا ادا کرنا ضروری ہے اور اگر ادا کرنے کے لائق نہ ہو تو ضروری ہے کہ اس سے معذرت کرے اور اس کو راضی کر کے اپنا گناہ معاف کرالے، بعض حقوق غیر مالی ہوتے ہیں، جیسے کسی کو گالی دی، کسی کا تمسخر کیا اور برا بھلا کہا، کسی کی غیبت کی، بہتان لگایا، یہ تمام باتیں حق تلفی اور گناہ کے دائرہ میں آتی ہیں، ان گناہوں کی توبہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ زیادتی کی ہے، اس سے اپنی غلطی کی معافی مانگی جائے، یہ ضروری نہیں کہ اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ اس نے اس کے بارے میں کیا کیا کہا ہے اور کیا کچھ زیادتی کی ہے؟ بلکہ آ کر مبہم طور پر معاف کرنے والا یوں کہہ دے کہ تم سے جو کچھ بھی غلطی ہوئی ہو میں اسے معاف کرتا ہوں، تو یہ بھی کافی ہے، ایک ایک غلطی کا شمار کرانا ضروری نہیں۔ اگر اللہ کے کسی بندہ کے حق میں زیادتی ہوگئی ہو تو وہ بڑا ہو یا چھوٹا، زیادہ باعزت ہو یا کم معزز، عذر خواہی اور عفو خواہی میں تکلف نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ حقوق العباد میں ہونے والی کوتاہیاں اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کریں گے، جب تک کہ خود صاحبِ معاملہ معاف نہ کر دے، یہاں تک کہ شہادت اور اللہ کے راستہ میں جان کی سپردگی جیسا عظیم عمل بھی انسان کو انسان کے حق میں ہونے والی کوتاہیوں سے بچا نہیں سکتا، اس لئے اس میں شرم و عار کو رکاوٹ نہ بنانا چاہئے۔

ان گناہوں کے علاوہ جو گناہ ہیں، جیسے جھوٹ بولنا، یا ایسا ملک جہاں شرعی حدود

نافذ نہ ہوتی ہوں، میں ایسے کسی جرم کا مرتکب ہونا جس پر خود اللہ کی طرف سے شرعی سزائیں مقرر ہیں، جیسے زنا، چوری، کسی مسلمان پاک دامن شخص پر تہمت اندازی، شراب نوشی وغیرہ، ان کے لئے بھی خوب گڑگڑا کر توبہ کرنا چاہیے اور یوں بھی استغفار کی کثرت رکھنی چاہئے، تاکہ یہ اس کے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کا کفارہ بن جائے، کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات ایک ہی مجلس میں ستر ستر بار استغفار فرمایا کرتے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ جہاں نفل عبادت، قرآن مجید کی تلاوت، انفاق اور دعاؤں کا مہینہ ہے، وہیں توبہ و استغفار کے لئے بھی اس سے بہتر کوئی موسم نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کا دروازۂ رحمت کھلا رہتا ہے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

(۲۴ر نومبر ۲۰۰۰)

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے

انسان کس قدر عاجز ہے کہ ہر لمحہ اور صبح و شام جس چیز کا ضرورت مند ہے، اسے بھی وجود میں نہیں لاسکتا، نہ وہ چاول اور گیہوں کا ایک دانہ پیدا کر سکتا ہے، نہ اپنے لئے پانی کا کوئی قطرہ وجود میں لاسکتا ہے، نہ وہ ہوا اور آکسیجن کی تخلیق کر سکتا ہے، جس کے بغیر چند منٹ بھی اس کی زندگی باقی نہیں رہ سکتی، !اور خدا کس قدر قادر اور عظیم ہے جس نے اتنی بڑی کائنات ہمارے لئے بچھائی ہے، اور ہر لمحہ لاکھوں پھل پھول ہیں، جن کو وہ پیدا کرتا ہے، پھر وہ مہربان اور رحم دل بھی کس قدر ہے، کہ اس نے سورج کا ایسا چراغ جلا رکھا ہے، جس کی روشنی ہر آنگن میں پہونچتی ہے، اور جس کے حکم سے گھٹائیں رحمت بہ اماں ہو کر ہر کھیت کی پیاس بجھاتی ہیں، یہ آنگن کسی مسلمان کا ہو یا کسی کافر کا، اور یہ کھیت اللہ کے فرمانبرداروں کے ہوں یا نافرمانوں کے!

جو خدا اس قدر قادر مطلق ہے، جس کے خزانۂ قدرت میں نعمتوں کی کوئی کمی نہیں، پھر جو اتنا سخی اور داتا ہے کہ دنیا میں اچھے بُرے کا فرق کئے بغیر سب کو دیتا ہے، خوب دیتا ہے اور دامن بھر بھر دیتا ہے، اس سے بڑھ کر کون اس لائق ہو سکتا ہے کہ عاجز و کمزور اور ضرورت و حاجتمندی کا پتلا انسان اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور اپنی ضرورتوں کے کشکول اس کے سامنے کھولے، کہ اللہ! اپنے ایک فقیر بے نوا اور گدائے بے آسرا پر نگاہ کرم فرما اور اپنے جود و سخا اور داد و دہش کے دربار سے اس کے عاجز ہاتھوں کو واپس نہ کر — اسی ادائے بندگی کا نام ''دعاء'' ہے۔

دعاء کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اہلِ ایمان سے فرمایا ہے کہ وہ اللہ سے مانگے اور اس سے دعاء کرے، (غافر: ۶۵،۱۴) اللہ تعالیٰ نے یہ

بھی فرمایا کہ تم مجھ سے مانگو تو میں تمہاری دعاء قبول کروں گا" ادعونی استجب لکم (غافر:٦٠) اپنے نیک بندوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا کہ ان کے پہلو بستر سے الگ ہوتے ہیں، اور خوف وطمع کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں (السجدۃ:١٦) ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ سے اس کے فضل کے طلب گار رہو واسالوا اللہ من فضلہ (النساء:٣٢) رسول اللہ ﷺ نے جو عبدیت اور بندگی کا نمونہ تھے دعاء کرنے کی خوب ترغیب دی ہے، آپ نے فرمایا کہ دعاء دراصل عبادت ہے: الدعاء ھو العبادۃ (ترمذی عن نعمان بن بشیر) ایک اور روایت میں آپ ﷺ نے دعاء کو عبادت کی روح اور اس کا مغز قرار دیا (ترمذی: ۳۳۷۱) مخلوق کا مزاج یہ ہے کہ اس سے کچھ مانگو تو ناگواری ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو دعاء سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں (ترمذی عن ابی ہریرۃ) اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں (ترمذی) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مصیبتیں آچکی ہیں، دعاء ان میں بھی نافع ہے اور جو آنے والی ہیں دعاء ان سے بھی بچاتی ہے، اس لئے اللہ کے بندو! تم پر دعاء کا اہتمام ضروری ہے (مشکوٰۃ: ۲۲۳۴) حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کے لئے دعاء کا دروازہ کھل گیا، اس کے لئے رحمت کے دروازے وا ہو گئے، اور انسان اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگتا ہے، اس میں عافیت سے بہتر کچھ اور نہیں (مشکوٰۃ: ۲۲۳۹)

عام طور پر لوگ مصیبت کے وقت ہی دعا کرتے ہیں، یہ بندہ کی خود غرضی کی بات ہے، حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو چاہتا ہو کہ مشکل وقتوں میں اس کی دعا قبول کی جائے اسے چاہئے کہ بہتر وقت میں خوب دعا کیا کرے، (ترمذی عن ابی ہریرہ) دعا چوں کہ خود عبادت ہے، اس لئے وہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی، آپ نے فرمایا: یا تو اس کی دعا اسی طرح قبول کر لی جاتی ہے، یا آخرت کے اجر کی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے، یا اسی مطلوب کے بقدر مصیبت اس سے دور کر دی جاتی ہے، (مشکوٰۃ عن ابی سعید خدری: ۲۲۵۹) چنانچہ حضرت سلمان فارسی ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

تمہارے پروردگار بہت حیاء والے اور کریم ہیں، جب بندہ ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس سے حیاء کرتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں کو خالی واپس کردیں (مشکوۃ: ۲۲۴۴) البتہ دعاء کے معاملہ میں عجلت اور بے صبری نہیں ہونی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان گناہ یا قطع رحمی کی دعاء نہ کرے تو اس کی دعاء قبول ہوتی ہے، بشرطیکہ جلد بازی سے کام نہ لے، دریافت کیا گیا، کہ جلد بازی سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یوں کہے میں نے بہت دعاء کی، لیکن لگتا ہے میری دعا قبول نہیں ہوئی، چنانچہ نا اُمید ہوکر دعا کرنا چھوڑ دے، (مشکوۃ عن ابی ہریرۃ: ۲۲۲۷) اس لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ خوشحالی اور کشادگی کا انتظار بھی افضل ترین عبادت ہے، **وافضل العبادة انتظار الفرج** (مشکوۃ: ۲۲۲۷)

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو دیکھئے تو صبح سے شام تک دعاؤں کا معمول ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح دعا کرو کہ دل میں یقین ہو کہ اللہ اسے ضرور ہی قبول فرمائیں گے،

فاسئلوه و انتم مؤمنون بالاجابة (مجمع الزوائد ۱۰/۱۴۸) کیوں کہ جب تک دعا کے قبول ہونے کا یقین نہ ہو وہ کیفیت وانابت پیدا نہیں ہوسکتی، جو دعا کے لئے مطلوب ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ دعا کے وقت قلب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو، دل غافل اور لاپرواہ ہو اور زبان پر دعا کے کلمات ہوں، تو یہ دعا مقبول نہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ غافل اور بے توجہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتے ہیں (مشکوۃ: ۲۲۴۱) خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ دعا کرنے والے پر فروتنی کی کیفیت ہونی چاہئے، **ادعوا ربكم تضرعا و خفيه** (الاعراف: ۵۵)

قلب کے ساتھ ساتھ جسمانی اعتبار سے بھی دعاء کرنے والے کو بندگی اور عجز و نیاز کا مظہر ہونا چاہئے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو ہتھیلیوں کی طرف سے نہ کہ پشت کی جانب سے یعنی ہتھیلیاں پھیلا کر رکھو نہ کہ پشت، اور پھر اپنی ہتھیلیوں کو اپنے چہرہ پر پھیر لو (مشکوۃ عن ابن عباس: ۲۲۴۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ دعا کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ مونڈھوں کے مقابل یا ان کے قریب ہو (ابوداؤد: عن عکرمہ) گویا ایک

بھکاری ہے جو اپنا ہاتھ پھیلایا ہوا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کا معمولِ مبارک بھی یہی تھا، (مشکوۃ: ۲۲۵۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہاتھ سینوں کے مقابلہ ہونا چاہئے، حضور ﷺ اس سے زیادہ ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔ (مشکوۃ: ۲۲۵۷)

آپ ﷺ نے دعا کے کلمات کے بارے میں بھی آداب بتائے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنی چاہئے اور آپ ﷺ پر درود، پھر دعا کرنی چاہئے (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۵) حضرت فضالہ بن عبید سے مروی ہے کہ ہم لوگ حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آئے، نماز پڑھی، پھر دعا کرنے لگے! کہ اللہ! مجھے معاف فرما، آپ ﷺ نے فرمایا: اے نماز پڑھنے والے تم نے جلد بازی کی، جب نماز پڑھو تو بیٹھو، پھر اللہ کی حمد کرو، پھر مجھ پر درود بھیجو، اس کے بعد دعا کرو، چنانچہ اس نے اسی طرح دعا کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دعا کرو قبول کی جائے گی، **سل تعطه** (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۶) دعا کرتے ہوئے آواز پست اور آہستہ ہونا چاہئے، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ دعا کے آداب میں یہ بات فرمائی ہے کہ دعا میں آواز پست ہونی چاہئے (اعراف: ۵۵) کیوں کہ پست آواز میں ریا اور دکھاوے کا اندیشہ کم ہے، آدمی اپنی ضرورت کے مطابق دعا کرسکتا ہے، اس سے رقت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، آج کل اجتماعی طور پر دعاء کا رواج بڑھ گیا ہے، اس میں بعض اوقات دعا "رسم دعا" بن جاتی ہے، رقت اور خشیت کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اور چوں کہ ہر شخص کی ضرورتیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے انسان اپنی ضرورت کے مطابق خدا سے سوال نہیں کر پاتا، دعا کے آداب میں یہ بھی ہے کہ دعا خواہ کسی کے لئے کرنی ہو، دعا کا آغاز اپنی ذات سے کرے (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۲، باب دعاء المراء لنفسہ) کیوں کہ اس سے عجز اور اللہ کے سامنے احتیاج کا اظہار ہوتا ہے، اور دراصل یہی کیفیت دعاء کرنے والے میں مطلوب ہے۔

کچھ خاص اوقات ہیں جن میں دعاء مقبول ہوتی ہے، رات کے آخری اور تہائی حصہ میں یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے (مسند احمد عن ابن مسعود) جہاد میں صفوں کے آراستہ ہونے کے وقت، بارش ہونے کے وقت، نماز کی اقامت کے وقت (ترمذی عن ابی ہریرہ)

اس کے علاوہ فرض نمازوں کے بعد، شب قدر اور بعض خاص راتیں دعاء کی قبولیت کے خاص مواقع ہیں، اسی طرح کچھ لوگ ہیں، جن کی دعاؤں کو آپ ﷺ نے خاص طور پر مقبول قرار دیا ہے، ان ہی میں مظلوم ہے گو وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے بُرا ہی کیوں نہ ہو، روزہ دار تا آنکہ افطار کر لے، اور مسافر تا آنکہ واپس آ جائے (مجمع الزوائد: ۱۰/۱۵۲)، امام عادل کی دعاء اور باپ کی دعاء اپنی اولاد کے حق میں مقبول ہے، (مشکوٰۃ عن ابی ہریرۃ: ۲۲۴۸، ۲۲۲۹) کسی شخص کی غیر موجود مسلمان بھائی کے بارے میں دعاء بھی مقبول ہوتی ہے اور متعدد روایتوں میں اس کا ذکر ہے، (ترمذی عن عبداللہ بن عمر) حاجی کی دعاء گھر واپسی تک، اور مجاہد کی دعاء جہاد سے فارغ ہونے تک بھی مستجاب دعاؤں میں ہے، (مشکوٰۃ: ۲۲۶۰) جیسے ان لوگوں کی دعاء مقبول ہوتی ہے اور اس میں شامل ہونے کی کوشش کرنی چاہئے، ویسے ہی ان کی بددعاء اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے، اسی طرح حضور ﷺ نے فرمایا کہ اولاد اور مال پر بددعاء نہ کرو، کہ کہیں وہ وقت دعاء کی مقبولیت کا ہو اور یہی دعاء عند اللہ مقبول ہو جائے۔ (مسلم عن جابر)۔

بعض لوگ خود اپنے لئے دعاء کا اہتمام نہیں کرتے، اور لوگوں سے خواہش کرتے ہیں کہ میرے لئے دعاء کیجئے یہ صحیح نہیں، اپنے لئے خود بھی دعاء کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان خود اپنے لئے جس رقت اور سوز کے ساتھ دعاء کر سکتا ہے، ظاہر ہے کوئی اور نہیں کر سکتا، کیوں کہ انسان کی اپنی دعاء میں اس کا غم چوں کہ جگر کی طرح شامل ہوتا ہے، اور اللہ کے یہاں اسی جذبۂ دروں کی قدر و قیمت ہے، لیکن اگر کسی سے دعاء کی درخواست کی جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عمرہ کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے اجازت دی اور فرمایا اے میرے چھوٹے بھائی! مجھے بھی اپنی دعاء میں شریک رکھنا، اور بھول نہ جانا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کا ایسا کلمہ ہے کہ اگر اس کے بجائے پوری دنیا بھی حاصل ہو جاتی تو اس سے بڑھ کر خوشی نہ ہوتی (ترمذی عن عمر رضی اللہ عنہ) بعض لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ جو اہم چیز ہو اس کی دعاء کی جائے، معمولی چیز کیا اللہ سے مانگی جائے، یہ نا سمجھی کی بات ہے، اصل میں انسان چھوٹی سے چھوٹی

اور بڑی سے بڑی تمام ضرورتوں میں اللہ ہی کا محتاج ہے، اس لئے ہر چھوٹی، بڑی ضرورت خدا ہی سے مانگنی چاہئے، نہ کہ کسی اور سے، کیوں کہ جیسے اللہ قادر مطلق ہے، ویسے ہی انسان محتاج مطلق، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر ضرورت اللہ ہی سے مانگنی چاہئے، یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ ہی سے مانگے، اور ایک روایت میں ہے کہ نمک کے لئے بھی اللہ ہی سے طلب گار ہو، (ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) اور کیوں نہ ہو کہ انسان ان میں سے کسی چیز کا خالق نہیں، وہ محض اللہ کی تخلیق سے نفع اٹھاتا ہے، اس لئے قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ میں خدا کا محتاج ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ گذر رہا ہے، نیکیوں کا موسم بہار خدا کی رحمتوں اور عنایتوں کا مہینہ عفو و درگذر اور دوزخ سے نجات کا مہینہ، محرومیوں کے علاج اور بگڑی بنانے کا مہینہ، وہ مہینہ جس میں خود خدا بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور کمال شفقت کے ساتھ عاجز اور گناہ گار بندوں سے دریافت کرتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت کا طلب گار کہ میں اسے معاف کردوں، کوئی ہے روزی کا خواستگار کہ اسے روزی عطا فرماؤں، اور کوئی ہے کسی مصیبت اور ضرورت سے دو چار کہ اس کی حاجت پوری کردوں ____ پھر کیا داتا کی اس آواز پر بھی فقراء اپنی ضرورت کا ہاتھ نہیں پھیلائیں گے، اور زبان سوال اس کے سامنے نہیں کھولیں گے، کہ جس کے خزانہ قدرت میں سب کچھ ہے، جو دے کر خوش ہوتا ہے، اور نہ مانگنے والوں سے ناخوش؟؟ شاعر حقیقت شناس نے کیا خوب کہا ہے :

مانگئے، پھر مانگئے، پھر مانگئے
مانگ میں شرمندگی اچھی نہیں

(۱۵/نومبر ۲۰۰۳ء)

خشک سالی ـــــ شامتِ اعمالِ ما!

موسم کا معتدل اور متوازن ہونا بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، عام حالات میں زمین پر پھیلے ہوئے سبزہ زاروں اور فضاء میں شوخی سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی خنک ہواؤں کی قدر و قیمت معلوم نہیں ہوتی، لیکن جب موسم گرما میں سورج آگ برساتا ہے، گرم و خشک ہوائیں درختوں کو بے روح کر دیتی ہیں، لو کے جھونکے انسانوں کے لئے پیامِ موت ثابت ہونے لگتے ہیں اور زمین اور ماحول کی تپش سے کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں، اس وقت خوشگوار موسم کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے!

اس وقت پورا ملک گرمی کی لپیٹ میں ہے، اور بہت سے علاقے ہیں جہاں خشک سالی نے زندگی کو دوبھر کر دیا ہے، راجستھان اور گجرات کے ایک علاقہ کا تو بہت ہی بُرا حال ہے، پینے کے پانی کے لئے لوگوں کو تپتے ہوئے ریگزاروں سے گذر کر میلوں دور جانا پڑتا ہے، جانوروں کو چارہ میسر نہیں۔ اور ان کی تصویریں دیکھ کر رحم آتا ہے، پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ ان حالات میں لوگ گندے پانی بھی استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اور اس کی وجہ سے بیماریوں کا پھیلنا فطری بات ہے، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہاں تک کہ نہایت سرد علاقوں میں بھی خشک سالی اپنے قدم بڑھا رہی ہے، آسٹریلیا جیسا ہرا بھرا اور درختوں اور جنگلات کی کرامات سے پہچانا جانے والا ملک بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں۔

قحط سالی کی کچھ طبعی وجوہ ہو سکتی ہیں، طبعی وجوہ کا تعلق بھی انسان کے اپنے افعال ہی سے ہے، زمین پر جنگلات اور درختوں کا وجود قدرت کا بہت ہی خوبصورت اور انوکھا تحفہ ہے، اگر قدرت کا ہاتھ ان درختوں کی تخلیق نہ کرے اور زمین کو ان گھنوں سے آراستہ

کرنا چھوڑ دے تو کوئی طاقت نہیں جوان کو وجود میں لا سکے، اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ زراعت اصل میں ہم کرتے ہیں یا تم کرتے ہو؟ أ انتم تذرعونه ام نحن الزارعون (الواقعہ:٦٤) ان درختوں سے جہاں انسان کو غذائی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور سوکھی لکڑیوں سے وہ اعلیٰ فرنیچر بناتے ہیں اور نوع بہ نوع فائدے اٹھاتے ہیں، وہی زمین کے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے اور بارش کے نظام کو متوازن بنانے میں بھی یہ بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، تیزی سے جنگلات کی کٹائی نے موسم پر نہایت ہی بُرا اثر ڈالا ہے، دہلی میں درجۂ حرارت معمول سے ۷ تا ۸ ڈگری سلسیس بڑھ گیا ہے، اور بہ حیثیت مجموعی ۱۹۷۰ء سے اب تک تین دہوں میں زمین کھلے درجۂ حرارت میں ایک ڈگری فارن ہیٹ کا اضافہ ہوگیا ہے، سائنس دانوں کا خیال ہے کہ درختوں کی کٹائی اور جنگلات کا خاتمہ اس کا بڑا سبب ہے، اسی لئے اسلام نے شجر کاری اور کاشت کاری کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان جب کوئی درخت لگاتا ہے، تو اس درخت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا اجر لکھتے ہیں، (مسند احمد عن ابی ایوب انصاری، مجمع الزوائد:۶۷/۴) حضرت ابودرداء سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے درخت لگایا اس میں سے کوئی آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق کھائے تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ (حوالہ سابق:۶۸/۴) درخت کو آپ ﷺ نے درخت والوں کے لئے اور ان کے بعد کی نسل کے لئے برکت کا باعث قرار دیا۔ (مجمع الزوائد:۶۸/۴) برکت میں عافیت امور حفاظت اور ہر طرح کا نفع شامل ہے۔

احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا ہے، عرب میں عام طور پر بیری اور ببول کے درخت ہوتے تھے، اس لئے خاص طور سے حدیث میں بیری کے درخت کا ذکر آیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کردیں کہ بیری کا درخت کاٹنے والے پر اللہ کی لعنت ہو، (مجمع الزوائد:۱۱۵/۸، باب، فیمن قطع السدر) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ بیری کا درخت کاٹتے ہیں وہ اوندھے منہ جہنم میں

ڈالے جائیں گے۔ (حوالہ سابق بحوالہ طبرانی) اسی مضمون کی روایت عبداللہ بن حبشی سے بھی مروی ہے عمرو بن اوس ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے بیری کا درخت کاٹا سوائے اس کے کہ کھیتی کے لئے کاٹے، اللہ تعالیٰ دوزخ میں اس کا گھر بنائیں گے (مجمع الزوائد، ۶۹/۴ باب فیمن قطع السدر) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگلات کی حفاظت کو اسلام میں کتنی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ جدید صنعتوں میں گیس اور کیمیکلس کا بے دریغ استعمال اور اس کے مضر اثرات سے حفاظت کی طرف سے بے توجہی نیز زمین کے اندر موجود قدرتی وسائل کوئلے وغیرہ کا مسلسل اخراج اور فضاء میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی آلودگی، یہ سب وہ اسباب ہیں جو خود انسانوں کے ہاتھوں پیدا ہورہے ہیں، اور انسان خود اپنی تباہی کا سامان بہم پہنچا رہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دنیا کو اجتماعی ضرر پہونچانے کا باعث ہے اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اور فقہ اسلامی کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ نہ ابتداءً ضرر پہونچانے کی اجازت ہے اور نہ ردِ عمل میں، **لاضرر ولاضرار**، لہٰذا اسلامی نقطۂ نظر سے ان امور میں غیر محتاط رویہ اختیار کرنا قطعاً درست نہیں۔

یہ بھی انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ انسان اپنی تباہی کے اسباب پر ہی پوری صلاحیت خرچ کررہا ہے، ایک سے ایک مہلک نیوکلیر ہتھیار، میزائل، ٹینک اور تباہی پھیلانے والے طیارے ہیں جو وجود میں آرہے ہیں، لیکن ماحولیاتی عدم توازن جیسے سنگین اور مہیب مسئلہ سے نمٹنے کے لئے سائنس داں ایسی مخلصانہ کوشش نہیں کررہے ہیں جو ان کا انسانی فریضہ ہے، حکومتیں بھی مہلک ہتھیاروں کی ایجاد کے معاملہ میں ان کی جس قدر حوصلہ افزائی کرتی ہے، تعمیری مقاصد کے لے غالباً اس کا عشر عشیر بھی نہیں کرتیں، اس سے بڑھ کر افسوس کی بات کیا ہوگی؟

یہ تو خشک سالی کے طبعی اسباب ہیں، اور ان میں بھی انسان ہی کی شامت اعمال کو دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات میں جو بھی واقعات پیش آئیں وہ اتفاقی نہیں ہیں، بلکہ انسان کے اعمال

اور احوال کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر مبنی ہیں، انسان کی اطاعت وفرماں برداری اور معصیت و نافرمانی سے بارش کا غیبی نظام متعلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں رات میں ان پر بارش برساؤں اور دن میں ان پر دھوپ نکلا کرے، (مسند احمد، مجمع الزوائد: ۲/۲۱۱) اسی لئے رسول اللہ ﷺ سے جب جمعہ کے دن بارش کی دعا کرنے کی خواہش کی گئی تو بعض روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے اور صحابہ سے فرمایا کہ اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو کہ وہ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، **استغفروا ربکم انه کان غفارا** (مجمع الزوائد: ۲/۲۱۶)۔ غرض، خشک سالی، قحط سامانی اور موسم کی غیر معمولی تمازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے کہ انسان اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرے، خدا فراموشی سے باز آئے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے کہ اس میں نہ صرف ان کی آخرت کی بھلائی ہے، بلکہ ان کی دنیوی فلاح بھی اس سے متعلق ہے، کم سے کم مسلمانوں کے لئے تو یہ حقیقت جزءِ ایمان ہے، اگر مصیبتیں اور آفتیں بھی انسان کو خدا کی طرف متوجہ کرنے سے قاصر رہیں تو اس سے زیادہ بدبختی اور کم نصیبی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟؟

بارش کی کمی اور عبرت وموعظت کے کچھ پہلو

جولائی ختم ہونے کے قریب ہے اور صورت حال یہ ہے کہ گھٹائیں مستانہ وار آئی ہیں، ان کی کالی کالی زلفیں دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ آج تو چپہ چپہ کو آبیار وشاد کام کرکے ہی چھوڑیں گی، لیکن کسی روٹھے ہوئے محبوب کی طرح اٹھکھیلیاں کر کے گذر جاتی ہیں، دیہات وقریہ جات میں کسان پریشان ہیں کہ ان کی کھیت کیوں کر لہلہائیں گے اور کیسے ان کی امیدوں کے غنچے کھلیں گے؟ اور شہر میں بسنے والے بے چین ہیں کہ وہ پہلے ہی سے پانی کی کمی سے دوچار ہیں، ان کے حلق کیوں کر تر ہوں گے؟؟

اس صورتِ حال نے اس وقت ہم سب کو پریشان کر دیا ہے، یہاں تک کہ وہ حکومت بھی اب اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے، جو گذشتہ ۲۰ رسالوں سے حیدرآباد کو پانی لانے کے لئے صرف منصوبے بنا رہی ہے، اور اپنے خوش کن منصوبوں اور دل آویز تجویزوں سے نہ جانے کتنی بار اخبارات کی سیاہی اور اپنی وقتی سرخروئی کا سروسامان کر چکی ہے۔

دنیا کے لوگ کائنات میں پیش آنے والے واقعات کو طبعی اسباب کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ایسی ہی تدابیر کے ذریعہ اس کے علاج کی سوچتے ہیں۔ بارش کیوں نہیں ہوتی، اس لئے کہ ہوا کا دباؤ موافق نہیں ہے، جنگلات کٹتی جا رہی ہیں اور ماحولیاتی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے، ان اسباب کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن بحیثیت مسلمان ہمارے لئے یہ کافی نہیں، ہماری غور وفکر کی سرحدیں اس سے بہت پرے ہیں، ہم اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی راحت وآرام اور زحمت ومشقت کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کے فیصلے زمین پر نہیں، آسمان پر ہوتے ہیں، ان فیصلوں کو کوئی مخلوق اپنے قلم سے نہیں لکھ سکتی، بلکہ یہ کائنات کے خالق ومالک کے حکم کے تابع ہیں، دنیا میں جو کچھ

پیش آتا ہے، اس کے کچھ ظاہری اسباب ہیں جنہیں ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، لیکن اس کے کچھ غیبی اسباب بھی ہیں، جنہیں آج ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور ہم اپنے ظاہری حواس سے ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، لیکن انبیاء کے ذریعہ خالقِ کائنات نے جزاء وسزا کا جو نظام ہمیں سمجھایا اور پہونچایا ہے وہ ہمیں اس غیبی نظام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔

پانی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیبی نظام کو رسول اللہ ﷺ نے بھی بیان فرمایا کہ جب لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو وہ بارش سے روک دیئے جاتے ہیں اور ان پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے، بلکہ اگر بے زبان جانور نہ ہوں تو وہ بارش سے بالکل ہی محروم کر دیئے جائیں،: ولم یمنعوا زکوٰۃ اموالھم الا منعوا القطر من السماء و لولا البھائم لم یمطروا (ابن ماجہ عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر: ۴۰۶۸)۔ نیز حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خشکی اور سمندر میں جو مال تلف ہوتا ہے وہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی وجہ سے: یا تلف مال فی بر و لا بحر الا بحبس الزکوٰۃ (جمع الفوائد حدیث نمبر: ۲۶۸۴، بسند ضعیف)۔ اس لئے بارش کی جو موجودہ صورت حال ہے، اس میں ہمیں چاہئے کہ اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں اللہ کی طرف سے یہ پکڑ تو نہیں ہے، خاص کر زکوٰۃ کے بارے میں اپنا محاسبہ کریں کہ جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے کیا ہم ان سب کی زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور پھر زکوٰۃ کی ادائے گی کا باضابطہ حساب رکھتے ہیں، اس فریضہ میں کوتاہی خدا کے غیبی نظام کے مطابق اجتماعی عذاب کو دعوت دینا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کی طرف رجوع ہوں اور اپنی ضرورت کا ہاتھ پھیلائیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقع کے لئے مستقل طور پر استسقاء کی نماز رکھی ہے، آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں کم سے کم دو بار استسقاء فرمایا ہے، ایک بار تو باضابطہ نماز ادا فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ اس موقع سے آپ بہت ہی معمولی کپڑے میں، کمالِ تواضع اور فروتنی کے ساتھ درِ دولت سے نکلے اور عیدگاہ تشریف

لائے، خوب دعاء کی، گریہ وزاری فرماتے رہے، اور پھر دو رکعت نماز ادا فرمائی (ترمذی حدیث نمبر:۵۵۸)۔ حضرت عائشہؓ کی روایت اور مختلف روایات میں اس موقع کی دعاء مذکور ہے، اور یہ بھی ہے کہ آپ کے نماز پڑھتے ہی بجلی کی کڑک اور چمک شروع ہوئی اور ایسی بارش ہوئی کہ آپ کے عیدگاہ سے مسجد نبوی پہونچنے تک نالے بہہ پڑے، صحابہ نے بھاگ بھاگ کر ایسی جگہوں کی پناہ لی جہاں بارش سے بچ سکیں، آپ ﷺ کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور ارشاد فرمایا: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہیں، اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، (ابوداؤد عن عائشہ حدیث نمبر:۱۱۷۳)

دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے دعاء پر اکتفاء فرمایا، حضرت انس ؓ روای ہیں کہ جمعہ کا دن تھا، آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ بارش نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے، ایک دیہاتی کھڑے ہوئے اور عرض کیا؟ جانور ہلاک ہو رہے ہیں اور بال بچے بھوکوں مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعاء فرمائیے کہ ہمیں بارش سے سیراب فرما دے، رسول اللہ ﷺ نے دستِ مبارک اٹھا دیا، راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ ﷺ نے دعاء شروع کی آسمان پر کہیں بادل کا ٹکڑا نہیں تھا، آپ کے دعاء کرتے ہی گھٹائیں چھا گئیں، اور بارش شروع ہوگئی، یہاں تک کہ جب آپ منبر سے نیچے اترے تو ریش مبارک سے پانی کے قطرات گر رہے تھے، یہ بارش ایک ہفتہ جاری رہی، اسی بارش کے درمیان آئندہ جمعہ آپ جمعہ کے خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، اسی دیہاتی نے یا کسی اور شخص نے اپنی عرض پیش کی کہ مکانات گر رہے ہیں اور مال واسباب ڈوب رہے ہیں، دعاء فرما دیجئے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی: **حوالینا و لا علینا**، ہم پر یعنی مدینہ میں بارش نہ ہو اور مدینے کے گرد وپیش میں بارش ہو، آپ کی دعاء کا اثر یہ ہوا کہ مدینہ شہر سے بادل چھٹ گیا، لیکن مدینہ کے مضافات میں واقع وادیاں ایک ماہ تک بہتی رہیں (بخاری حدیث نمبر:۱۰۳۳)۔ غرض کہ اس قحط سامانی میں اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے، جس کی حکومت پورے عالم آب وگل میں ہے، اور جس کے ہاتھوں میں پانی اور تمام نعمتوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک بار مدینہ اور حجاز کے علاقہ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ لوگ سوکھے چمڑے کھانے پر مجبور ہوئے، فاقہ کش رعایا کی کیفیت دیکھ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دردمند دل گھٹتا تھا، اور آپ لوگوں کی مدد کے لئے شبانہ روز تدبیروں میں مشغول رہتے تھے، آپ نے مصر وشام کے علاقہ سے کثیر مقدار میں غذائی اشیاء منگوائیں اور اہل مدینہ کو راحت پہونچانے کی پوری کوشش فرمائی، لیکن قحط تھا کہ کسی طور دور نہیں ہوتا تھا، انہی دِنوں ایک صحابیؓ نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی، حضور ﷺ نے فرمایا، میں تو سمجھتا تھا کہ عمر سمجھدار آدمی ہے! یہ صاحب گھر آئے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، دستک دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ کون صاحب آئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں، اس جواب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بے قرار کردیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھولا اور ان صاحب نے اپنا خواب سنایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت متفکر ہوئے اور نمازِ فجر کے بعد صحابہؓ سے دریافت کیا، کہ کیا تم لوگوں نے میرے اندر حضور ﷺ کے بعد کوئی تبدیلی محسوس کی ہے، صحابہؓ نے کہا نہیں، اور کچھ تحسینی کلمات کہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان صاحب سے کہا کہ وہ اپنا خواب بیان کریں، خواب سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المؤمنین! رسول اللہ ﷺ اس جانب متوجہ فرمارہے ہیں کہ قحط کے حالات سے نمٹنے کے لئے آپ دنیا کے ظاہری اسباب تو اختیار فرمارہے ہیں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ سے رجوع نہیں کیا، یعنی نماز استسقاء نہیں پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حق کو قبول کرنے کا ایسا مزاج رکھتے تھے کہ انبیاء کے بعد روحانی تاریخ میں شاذ ونادر اس کی مثال مل سکی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز استسقاء ادا فرمائی اور ایسی بارش ہوئی کہ مدینہ کا طویل قحط دور ہوا۔ غرض کہ اس طرح کے صبر آزما حالات لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دیتے ہیں، کہ انسان خدا کے سامنے گڑ گڑائے، بارگاہ ربانی میں آنسوؤں سے وضوء کرے، عجز و بندگی کے ہاتھ پھیلائے، اور جبین نیاز خدا کی چوکھٹ پر بچھائے، اگر یہ حالات بھی انسان کو اللہ کی طرف متوجہ نہ کریں تو اس سے زیادہ بدبختی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس لئے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو

نماز استسقاء کا اور تمام نمازوں میں عموماً اور نماز جمعہ میں خصوصاً دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ایسا کوئی بھی کام جو لوگوں کے لئے اجتماعی نقصان کا باعث ہو، کے کرنے سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ سایہ دار درخت کے نیچے گندگی پھیلانے، اور پانی کو آلودہ کرنے کو حضور ﷺ نے منع فرمایا، بلا وجہ درختوں کو کاٹنے کی ممانعت کی گئی، اس لئے ایسے اسباب کا اختیار کرنا، درست نہ ہوگا، جو طبعی نظام کے تحت بارش کو متأثر کرتا ہو، جیسے غیر مجاز طریقے پر جنگلات کو کاٹنا، زرعی اراضی کو خواہ مخواہ آبادی والے علاقے میں تبدیل کر دینا، کہ ان سے قدرتی ماحول متأثر ہوتا ہے، اور اس کا اثر بارش پر بھی پڑتا ہے، یہ انسانی سماج کے لئے ضرر ونقصان کا باعث ہے، ضرر ونقصان کو دور کرنا شریعت اسلامی کا اہم ترین مقصد ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ افراد واشخاص کے مفاد کے مقابلہ اجتماعی مفاد کی اہمیت زیادہ ہے، اسی طرح انفرادی نقصان کی بہ نسبت اجتماعی نقصان زیادہ قابل توجہ اور مقدم ہے، اس لئے اگر حکومت ایسے قوانین بناتی ہے، جن کا مقصود ماحول کا تحفظ ہو تو ہمیں اس کا پورا تعاون کرنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ یہ بات اسلامی مزاج اور فکر کے عین مطابق ہے!!

زلزلہ ـــــ خدا کی تنبیہ

پچھلے چند دنوں پہلے شہر کے کچھ حصے میں ساڑھے تین سکنڈ زلزلہ کا جھٹکا محسوس کیا گیا۔ یہ جھٹکے بہت ہی کم وقت کے لئے تھے، اسی لئے اللہ کا شکر ہے کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ لیکن انسان اتنا عاجز اور کمزور ہے کہ اس لمحاتی حادثہ نے بھی اسے ایسی دہشت اور گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا کہ دوسرے دن بہت سے لوگوں نے گھر سے باہر سرراہ آنکھوں میں رات کاٹی، زلزلہ یوں تو کائنات کا ایک طبعی واقعہ ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان واقعات کے پیچھے اصل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کا فیصلہ کارفرما ہے۔ اور خدا کا ایک غیبی نظام ہے، جو کائنات میں پیش آنے والے ہر واقعہ کے پیچھے ہے، جیسے دنیا میں انسان کے افعال سے بعض حالات متعلق ہوتے ہیں، دست آور چیز کے کھانے سے معدہ خراب ہوتا ہے، چکنی چیزیں جگر کو خراب کرتی ہیں، انسان دھاردار لوہا اپنے ہاتھ پر مارے تو یقیناً ہاتھ کٹے گا اور خون بہے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام میں انسان کے نیک و بد اعمال پر احوال مرتب ہوتے ہیں، زلزلہ، طوفان، سیلاب، قحط، غیر معتدل بارش، وبائی امراض یہ سب اوپر سے اترنے والے احوال ہیں، اللہ کی بندگی، خلق اللہ کے ساتھ حسنِ سلوک، صدق وصفا، عدل وانصاف، اور ان کے مقابلہ میں اللہ کی نافرمانی، خلق اللہ کے ساتھ ظلم و جور، جھوٹ، دھوکہ، وعدہ خلافی اور ایذا رسانی وہ اعمال ہیں جو زمین سے آسمان کی طرف جاتے ہیں، جیسے اعمال نیچے سے جائیں گے ان ہی کے مطابق اللہ کی طرف سے احوال و واقعات ظاہر ہوں گے، اس لئے ایک مومن کی نگاہ میں طبعی اسباب کسی واقعہ کے لئے ظاہری سبب کے درجہ میں ہیں، اچھے اور بُرے واقعات کا اصل سبب خدا کا راضی یا ناراض ہونا اور انسان کے اعمال کے اعتبار سے اس کی رحمت یا غضب کا زمین والوں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

اس طرح کے واقعات دراصل خالقِ کائنات کی طرف سے ''الارم'' ہیں، تاکہ خلق خدا اپنے اعمال کا محاسبہ کرے، اور آپ اپنے احتساب کا فریضہ انجام دے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں گناہوں کی کثرت ہوگی اور زلزلہ کے واقعات بھی بڑھیں گے، یہاں تک کہ کائنات پر زلزلۂ قیامت برپا ہوگا، جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ ''زلزال'' میں ہے، یہ زلزلہ پورے روئے ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، اور قرآن کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ طویل اور شدید زلزلہ ہوگا، جو زمین کو جھٹکے پر جھٹکے دیتا جائے گا، اور پوری کائنات زیر وزَبر ہوکر رہ جائے گی، سکنڈوں اور منٹوں کے زلزلے کتنے آفت بداماں ہوتے ہیں؟ یہ ہر شخص جانتا ہے، اسی سے اس شدید اور طویل زلزلہ کی ہولناکیوں اور قہر سامانیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کائناتی احوال میں معمولی تغیر پیش آنے سے بھی بے قرار ہوجاتے، اللہ سے رجوع ہوتے، اور خوف وخشیت کی کیفیت آپ ﷺ کے چہرہ سے عیاں ہوتی، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کسی شب تیز ہوا چلتی تو آپ ﷺ بے قرار ہوکر مسجد میں تشریف لے جاتے، اور جب تک ہوا تھم نہ جاتی، خدا کے حضور سجدہ ریز رہتے، سورج گہن یا چاند گہن لگتا تو جب تک گہن ختم نہ ہو جائے، نماز میں مشغول ہوتے، (جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۲۰۶۹) حضرت انس رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بار سخت تاریکی چھا گئی، ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا کبھی حضور ﷺ کے زمانہ میں ایسی باتیں پیش آتی تھیں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معاذ اللہ! اس وقت تو ہوا بھی تیز چلتی تو ہم لوگ قیامت کے خوف سے مسجد کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ (مجمع الزوائد: بحوالہ ابوداؤد؟ حدیث نمبر: ۲۰۶۸)

لیکن ہمارے ضعف ایمان کا حال یہ ہے کہ زلزلہ سے ہمیں بھی خوف ہوتا ہے، لیکن نہ اللہ کا اور نہ قیامت کا، صرف یہ ڈر ہوتا ہے کہ گھر گر جائیں گے، جانیں جاسکتی ہیں، مال ضائع ہوسکتا ہے، یعنی اصل میں مومن کو جس بات کا خوف ہونا چاہئے، اس کا تو دل میں خیال بھی نہیں گذرتا، لیکن ان آنی جانی اور زائل وفانی چیزوں کا خوف مسلط رہتا ہے، جن سے مومن کے دل کو آزاد رہنا چاہئے، اسی لئے زلزلہ کے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ تنہا تنہا دو دو یا چار چار

رکعت نماز پڑھی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں پر خوب گڑگڑایا جائے، علامہ شرنبلالی بڑے پایہ کے فقیہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

وکالصلاۃ فرادی لحصول ؟ والفزع بالزلازل والصواعق و انتشار الکواکب و الضوء الھائل لیلا والثلج والامطار الدائمۃ و عموم الامراض والخوف الغالب من العدو و نحو ذلک من الافزاع والاھوال ، لانھا آیات مخوفۃ للعباد لیترکوا المعاصی و یرجعو الی طاعۃ اللہ تعالیٰ التی بھا فوزھم و صلاحھم واقرب احوال العبد فی الرجوع الی ربہ الصلاۃ ،

(مراقی الفلاح مع الطحطاوی:۲۹۹)

اور تنہا تنہا نماز پڑھی جائے گھبراہٹ کے موقع پر، گھبرا دینے والی باتوں سے مراد زلزلے، بجلیوں کی مسلسل کڑک، تاروں کا ٹوٹنا، رات میں تیز روشنی کا نمودار ہونا، ژالہ باری، مسلسل بارش، امراض کا پھیلنا اور دشمن کا سخت خوف وغیرہ ہیں، جو بندوں کو ڈرانے کے لئے ہیں، تاکہ وہ گناہ چھوڑ دیں، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کا راستہ اختیار کریں، جس میں ان کی کامیابی اور صلاح ہے، اور بندہ کے لئے اپنے رب سے رجوع کرنے کی سب سے قریبی حالت نماز ہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی زلزلہ کے موقع پر جماعت کے بغیر تنہا تنہا نماز پڑھنا ثابت ہے، چنانچہ حنفیہ کے علاوہ شوافع اور حنابلہ بھی اس موقع پر نماز پڑھنے کے قائل ہیں، (دیکھئے: الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/ ۳۹۷) ___ اس لئے اول تو دعاء کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ایسی آزمائشوں سے حفاظت فرمائے، لیکن اگر کبھی خدانخواستہ ایسی نوبت آجائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ خدا کی طرف سے آنے والی آفتوں کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

ادھر زلزلہ کے واقعات کا تناسب بڑھتا جارہا ہے، جاپان، ترکی، ایران اور امریکہ وغیرہ میں چار پانچ سال کے وقفہ سے ایسے تہلکہ خیز اور چشم ہائے بصیرت کے لئے عبرت انگیز زلزلہ کے واقعات سامنے آتے ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ان کے تصور سے بھی

کلیجہ منہ کو آتا ہے، ماضی میں عالمِ اسلام میں اس طرح کے جو بھیانک واقعات پیش آئے ہیں، ۱۳۵۲ھ کے زلزلۂ بہار کے موقع سے مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے اس پر ایک نہایت ہی وقیع مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا، جس میں تاریخ الخلفاء (تالیف: علامہ سیوطی) اور بعض دوسری کتابوں کے حوالہ سے ان واقعات کو یکجا کیا گیا ہے، اس میں زلزلہ کے علاوہ دوسرے سماوی اور کائناتی حوادث کا بھی ذکر ہے، یہاں خاص زلزلہ کے متعلق واقعات کا ذکر مناسب ہوگا۔

- ۱۳۰ اور ۱۳۱ھ میں دمشق میں نہایت تباہ کن زلزلہ آیا۔
- ۱۸۰ھ میں مصر میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ اسکندریہ کا مستحکم مینارہ بھی منہدم ہوگیا۔
- ۲۰۳ھ میں خراسان اور بلخ میں ایسا زلزلہ آیا کہ ان شہروں کی ایک چوتھائی آبادی نیست و نابود ہوگئی۔
- ۲۳۳ھ کے ہولناک زلزلہ میں انطاکیہ کا شہر تباہ ہوگیا، اور موصل میں پچاس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۲۴۵ھ میں ایک عالمگیر زلزلہ آیا، جس سے بڑے بڑے قلعے اور پل تباہ ہوگئے، انطاکیہ کا ایک پہاڑ سمندر میں جا گرا، اور مکہ معظمہ کی نہروں کا پانی خشک ہوگیا۔
- ۲۸۰ھ میں شام کے شہر دیبل میں ایسا زلزلہ آیا کہ صرف شکستہ مکانوں کے ملبہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار لاشیں برآمد ہوئیں۔
- ۳۴۴ھ میں مصر میں ایک خوفناک زلزلہ آیا، جس کا اثر تین گھنٹے تک جاری رہا۔
- ۳۴۶ھ کو ایشائے کوچک کے علاقہ میں زلزلہ نے بڑی تباہی مچائی، علاقۂ رے کے ڈیڑھ سو گاؤں زمین میں دھنس گئے، طالقان کی آبادی لاکھوں میں تھی، صرف تیس آدمی بچے، زمینیں ایسی پھٹیں کہ مردوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں۔
- ۴۸۰ھ کو رملہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ کنووں کے منڈیروں سے پانی ابل آیا، اور پچیس ہزار آدمی ہلاک ہوگئے۔
- ۵۲۹ھ کو بغداد اور اسکے مضافات میں تقریباً بیس دن طوفان، بجلی اور زلزلوں

کا سلسلہ رہا۔

O ۵۳۳ھ میں بختر نامی شہر زلزلہ میں زمین کے اندر دفن ہوگیا، اور اس کی جگہ پانی کی ایک جھیل نمودار ہوگئی۔

O ۵۴۴ھ میں بغداد میں ایسا زلزلہ آیا کہ حلوان نامی جگہ کا ایک پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔

O ۱۰۰۴ھ کو جزیرۂ صقیلہ میں ایسا زلزلہ آیا کہ زمین پھٹی اور کئی نہریں نکل آئیں، نیز تقریباً ساٹھ ہزار افراد ہلاک ہوئے۔

O ۱۵۰۹ھ میں ۱۴/اپریل کو قسطنطنیہ میں ایسا زلزلہ آیا جس کا اثر پینتالیس دنوں تک محسوس کیا گیا، اس میں ایک سو نو مسجدیں بھی شہید ہوگئیں۔

O ۱۱۱۱ھ کو جاوا میں ایسا زلزلہ آیا کہ پندرہ پہاڑ غرقاب ہوگئے۔

O ۱۲۴۹ھ میں بہار اور نیپال کے علاقہ میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ نیپال کے پہاڑ پر ایک مندر تھا، وہ پہاڑ مندر سمیت زمین میں دھنس گیا اور اس جگہ پانی کا تالاب بن گیا (ملخص از: مقالات سجاد: ۵۷۔۱۳۹) ___ خدا کی طرف سے یہ تنبیہ کے یہ چند نمونے ہیں، جن کے نقوش تاریخ کی پیشانی پر محفوظ ہیں، لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح کے کتنے واقعات اس کائنات میں پیش آتے ہوں گے، چند سال پہلے لاتور اور عمرگہ کے علاقہ میں جو ہولناک اور دل کو دہلا دینے والا حادثہ پیش آیا وہ تو گویا کل کی بات ہے، لیکن کیا قدرت کی ان تنبیہات کا ہمارے دل ودماغ نے بھی کوئی اثر لیا ہے؟ اور ہماری عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے کوئی تبدیلی آئی ہے؟

(۲۲/ستمبر/۲۰۰۰ء)

گجرات کا زلزلہ اور ہمارا فریضہ

گجرات کا زلزلہ ایک طرف ہمیں اپنے احتساب کی دعوت دیتا ہے، تو دوسری طرف ہمیں مصیبت زدہ انسانوں کی مدد اور خدمت کی طرف متوجہ کرتا ہے، احتساب کی طرف اس لئے کہ یہ اور اس طرح کی قدرتی آفتیں اللہ کے غضب کی مظہر ہوتی ہیں، قرآن مجید نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر بہ طور عذاب زلزلہ آنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> کیا بستیوں والے اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آپہونچے، جب وہ سوتے ہوئے ہوں؟ یا کیا وہ اس بات کا ڈر نہیں رکھتے کہ ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے آپہونچے، جب وہ لہو و لعب میں مشغول ہوں، (الاعراف: ۹۷،۹۸)

اس آیت میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ عذاب الٰہی کے نازل ہونے کے عام اوقات یہی دو ہیں، رات، اور دن چڑھتے، رات کا وقت غفلت کا ہوتا ہے، اور دن چڑھتا وقت غافلوں کے لئے لہو ولعب اور عیش وعشرت کا، پھر قرآن ہی کے بیان پر غور کیجئے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کے جادوگروں نے استفسار کیا کہ کون سا وقت ہوگا جس میں ہم اپنی سحر طرازیوں کا نمونہ اور آپ اپنے خیال کے مطابق خدا کی نشانی پیش کریں گے؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: **موعدکم یوم الزینة** (طٰہٰ:۵۹) یعنی یہ وقت وہ دن ہوگا جو دن تمہارے جشن وسرور کا ہے، جس دن تم جشن مناتے ہو، اسی دن خدا کی نشانی ظاہر ہوگی، گویا بعض دفعہ انسان کی توجہ کو بڑھانے اور نقوش عبرت کو نمایاں کرنے کی غرض سے ایسے وقت کا انتخاب کیا جاتا ہے جو اس قوم کے لئے یوم جشن ہو۔

اب دیکھئے کہ چند سال پہلے لاتور اور عثمان آباد میں عین گنپتی کے دن رات کے وقت تباہ کن زلزلہ آیا، اور معلوم ہے کہ اس علاقہ میں گنپتی برادرانِ وطن کا سب سے بڑا تہوار اور اجتماع کا موقع ہوتا ہے، دوسری طرف گجرات میں صبح چڑھتے عین یوم جمہوریہ کو زلزلہ نے آدبوچا، اور ۱۵/اگست ۱۹۵۰ء کے زلزلہ کی یاد تازہ کردی، نگاہ عبرت وا کیجئے اور قرآن کے پس منظر میں اس واقعہ کو دیکھئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ایک پکڑ اور تنبیہ ہے، جیسے استاذ ایک طالب کی سرزنش کرتا ہے، تاکہ وہ دوسروں کے لئے سبق حاصل کرنے کا ذریعہ بنے، اور عدالت ایک مجرم کو سزا دیتی ہے، کہ وہ دوسرے مجرم کے لئے مایۂ عبرت ہوجائے، اسی طرح رب کائنات کسی قوم کے کچھ لوگوں کو اپنے غضب سے دوچار کرتا ہے، تاکہ دوسرے لوگ اپنی زندگی کا محاسبہ کریں اور غفلت شعاری سے باز آئیں، اگر ایسے واقعات کو لوگ محض ایک اتفاقی اور طبعی واقعہ کہہ کر گذر جائیں تو اس سے زیادہ کوئی بات افسوس ناک نہ ہوگی، اس سے بڑھ کر کون شخص محروم ہوگا کہ چراغ جلے اور وہ اپنی آنکھیں بند کرلے، خطرہ کی گھنٹی بجے اور وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ لے؟ اور کوئی تنبیہ بھی اس کے غفلت شعار دل کو جنبش دینے میں کامیاب نہ ہو؟؟

یہ اس حادثہ کا ایک پہلو ہے، —— دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق بناکر پیدا کیا ہے کہ دوسرے انسانوں کی شرکت کے بغیر اس کی مسرت میں بھی کوئی لطف نہیں، اور جیسے وہ خوشی میں دوسرے کا محتاج ہے، مصیبت میں اس سے زیادہ دوسرے کا محتاج ہوتا ہے، زلزلہ آئے، سیلاب آئے، تباہ کن طوفان آجائے، وبائی امراض پھیل جائیں، ایسے موقع پر بیک وقت ہزاروں افراد مصیبت اور پریشانی سے دوچار رہتے ہیں، اس لئے ان مواقع پر تعاون کی زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

اسلام نے ایسے حالات میں مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ قوم کے لئے ابرِ رحمت ثابت ہوں، اور مصیبت زدہ انسانوں کو اپنے دامن محبت میں جگہ دے، اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اس خصوصی وصف کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں: وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد: ۱۷) اس ارشادِ ربانی

میں اس بات کی طرف بلیغ اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو جن لوگوں سے ایذا پہونچتی ہو، امن کے مقابلہ میں بھی صبر کی راہ اختیار کرے، اور ان کے ساتھ بھی ان کا رویہ رحم دلی اور مہربانی کا ہو، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، بلکہ چوں کہ غیر مسلموں سے اذیت پہونچنے کا امکان زیادہ تھا، اس لئے عجیب نہیں کہ اس آیت میں ان ہی حضرات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو، کیوں کہ صبر کی ضرورت ایسے ہی حق ناشناس بھائیوں کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔

قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم کا فرق کئے بغیر اس بات کی تلقین کی ہے کہ فاقہ کے دنوں میں بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، قرابت دار یتیموں کا خیال رکھا جائے، اور خاکسار مسکین کی رعایت کی جائے (البلد: ۱۴۔۱۶) قدرتی آفات کے نتیجہ میں کتنے ہی لوگ فاقوں سے دو چار ہوتے ہیں، بچے یتیمی کا داغ سہتے ہیں، اور کل کے دولت مند آج کے مسکین ٹھہرتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہ مصیبت زدہ لوگ بھی شامل ہیں، قرآن ہی میں قیدیوں کو کھانا کھلانے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا بھی حکم آیا ہے، (الدہر: ۸) اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے قید میں مشرکین ہوا کرتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "اسیر" سے مراد وہ مشرکین ہیں، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں، (قرطبی: ۱۹/۱۲۹) اس سے معلوم ہوا کہ جو غیر مسلم بھائی مشکل حالات میں ہوں، ان کی ضرورت پوری کرنا بھی اجر وثواب کا باعث ہے، چنانچہ اس نصیحت کا صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ اثر ہوا کہ غزوۂ بدر کے موقع سے رسول ﷺ نے جن قیدیوں کو مسلمانوں کے حوالہ کیا، ان کا بیان تھا کہ مسلمان خود تو محض کھجور کھا کر رہ جاتے، اور ہمیں صبح وشام روٹی کھلاتے، اور روٹی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، ان کے اس ایثار کی وجہ سے ہمیں حیاء محسوس ہوتی تھی، (سیرت ابن ہشام: ۲/۲۵۷۔۲۵۶) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور اس میں مسلمان اور غیر مسلموں کی کوئی تفریق نہیں کی، مفسرین بھی یہی لکھتے ہیں کہ اس میں مسلمان اور کافر سب شامل ہیں، اور ہر پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک مستحب ہے (قرطبی: ۵/۱۸۴) قتادہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے

بعض صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا کافروں پر بھی انفاق کیا جا سکتا ہے؟ اسی کے جواب میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر: ۲۷۲ نازل ہوئی، اور مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ ان کی ہدایت تمہارے ذمہ نہیں ہے، رہ گیا خرچ کرنا تو تم جو بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا بدلہ ملے گا، اور تمہارے ساتھ کوئی حق تلفی نہیں ہوگی (تفسیر: ۵/۵۸۸)

چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے یہودی قرابت دار کے لئے متروکہ کے کچھ حصہ کی وصیت کی تھی، (سنن دارمی، باب الوصیۃ لاھل الذمۃ)

خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک ریشمی حلّہ عطا فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض گذار ہوئے کہ آپ ﷺ نے تو ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے پہننے کے لئے نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ اس سے کسی اور طرح فائدہ اٹھاؤ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جوڑا اپنے ایک بھائی کو جو مشرک تھے اور مکہ میں مقیم تھے، تحفۃً بھیج دیا، (بخاری، باب الھدیۃ للمشرکین)

اگر غیر مسلموں پر کوئی مصیبت آتی تو خاص طور پر ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے، چنانچہ جب مکہ کے لوگ قحط میں مبتلا ہوئے، تو حالاں کہ اس وقت اہلِ مکہ کی مسلمانوں سے عداوت اپنے شباب پر تھی، لیکن آپ نے سردارانِ کفار ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو پانچ پانچ سو درہم بھیجے، کہ وہ اسے مکہ کے ضرورت مند اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دیں، رسول اللہ ﷺ کے اسی عمل سے استدلال کرتے ہوئے امام محمد کہتے ہیں کہ کافر خواہ حربی ہو یا ذمی، یعنی مسلمانوں کے ساتھ اس کی صلح ہو یا نہ ہو، اس کا مالی تعاون کرنے میں حرج نہیں، **لا باس للمسلم ان یعطی کافرا حربیا او ذمیا۔** (ردالمحتار: ۳/۳۰۲)

اس لئے مصیبت کی اس گھڑی میں مذہب وملت کی تفریق کے بغیر تمام انسانوں کی مدد کے لئے آگے آنا، ہر مسلمان کا فریضہ ہے، اس سے جہاں انسانی خدمت اور انسانی ہمدردی کا فریضہ ادا ہوگا وہیں برادرانِ وطن سے تعلقات استوار ہوں گے، غلط فہمیاں دور ہوں گی، نفرت اور شکوک وشبہات کی جو کھیتی فرقہ پرستوں نے برادران وطن کے دلوں میں

بوئی ہے، اس کی بیخ کنی ہوگی، محبت اور اعتماد کے پھول کھلیں گے، ارتباط بڑھے گا، اور دعوت کے مواقع پیدا ہوں گے، گجرات وہ جگہ ہے جو اس وقت پورے ملک میں فرقہ پرستی کا مرکز ہے، اقلیتوں کے خلاف جو بھی منصوبے بنتے ہیں پہلے گجرات اور اتر پردیش میں ان کا تجربہ کیا جاتا ہے، اڈوانی جی کی رتھ یاترا یہیں سے شروع ہوئی، اور اس وقت اس صوبہ میں کتنی ہی مسجدیں ہیں، جو نمازیوں کو ترس رہی ہیں، اور برادران وطن کا ان پر غاصبانہ قبضہ ہے، لیکن زلزلہ کے موقع سے مسلمان نوجوانوں نے جس ایثار اور جذبۂ خدمت کا ثبوت دیا اس نے پتھر کو پگھلایا، اور ایک حد تک نفرت کی آگ کو بجھایا ہے، یہاں تک کہ احمد آباد میں ایک مسجد جو حساس غیر مسلم آبادی کے درمیان تھی اور مسلمان وہاں جا کر نماز پڑھنے سے قاصر تھے، خود غیر مسلم بھائیوں نے اسے دھویا، صاف ستھرا کیا، اور مسلمانوں کو مسجد آباد کرنے کی دعوت دی، یہ معمولی اور وقتی اخلاق کا کرشمہ ہے، اگر ہم ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے اور خدمت خلق کا کام کرتے ہوئے اپنے غیر مسلم بھائیوں سے تعلقات استوار کریں، اور انسانی اخوت کے رشتہ کو ان پر واضح کریں تو ہندوستان جیسے ملک میں دعوت دین کے وسیع مواقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اور نفرت کا جو آتش فشاں یہاں سلگایا جا رہا ہے، ہم محبت کی شبنم سے اسے بجھا بھی سکتے ہیں؟؟

اپنی عیال کو آگ سے بچایئے!

انسان پر جیسے دوسروں کے حقوق ہیں، اسی طرح اس پر خود اپنی ذات کا، اپنے بال بچوں اور اپنے عزیزوں کا بھی حق ہے، بلکہ یہ حق نسبتاً زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے اور آخرت میں اس کے بارے میں جواب دہی بھی زیادہ ہے۔ انسان پر اس کی ذات کے اور اس کے اہل وعیال کے کیا حقوق ہیں اور اپنے زیر پرورش لوگوں کے تئیں اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ قرآن و حدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے۔ یہ حقوق انسان کی مادّی ضروریات سے متعلق بھی ہیں اور اس کی دینی اور اخروی حاجات سے متعلق بھی اور یقیناً اس کی دینی حاجات سے متعلق حقوق زیادہ اہم ہیں، کیوں کہ مادی ضرورتوں کا تعلق تو ایسے مستقبل سے ہے جو چند سالہ ہے اور جس کی انتہاء قبر کی منزل پر ہو جاتی ہے، لیکن دینی اور اخروی ضرورتیں ایسے مستقبل سے متعلق ہیں، جن کی کوئی نہایت نہیں، اس لئے ایک صاحبِ ایمان جو آخرت میں جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اور جو اس دنیا پر یقین کرتا ہو، یقیناً اس وسیع اور نہ ختم ہونے والے مستقبل سے بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن مجید نے انسان کو اسی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے متنبہ کیا ہے، کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ ''قُوا اَنفُسَكُمْ وَ اَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم:٦) یہ آگ سے بچانا کیونکر ہوگا؟ ایمان اور عملِ صالح کے ذریعہ، ایمان کیا ہے؟ قرآن وحدیث میں جن جن باتوں کا ذکر آیا ہے، ان سب کو ماننا اور بے کم وکاست ان کا یقین کرنا۔ ایمان صرف کلمہ پڑھ لینے کا نام نہیں، اگر ایک شخص اپنی زبان سے توحید کا اقرار کرتا ہو اور قرآن کے کسی حکم کا انکار بھی، رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتا ہو، لیکن آپ ﷺ کی کسی سنت کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہ کرتا ہو، آپ کو نبی مانتا ہو لیکن آپ ﷺ کے بعد

کسی اور نبی کے آنے کا قائل ہو، تو بظاہر وہ صاحبِ ایمان محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کفر کی راہ پر ہے۔ ایمان کا مسئلہ بہت نازک ہے، بعض اوقات انسان ہنسی مذاق میں، غیظ وغضب اور ضد وعناد میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جو اسے دولتِ ایمان سے محروم کر دیتی ہیں اور اسے خبر تک نہیں ہوتی، ظاہر ہے اس نادانستہ خسران ومحرومی سے بچنے کے لئے ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے علم کے زیور سے آراستہ اور احکامِ دین سے واقف ہونا، بے علمی اور ناآگہی و جہالت ونادانی انسان کو راہِ حق سے دور لے جاتی ہے اور گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

آگ سے بچنے کے لئے دوسری ضروری چیز عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے معنی اچھے کام کے ہیں۔ کوئی کام اس وقت اسلام کی نگاہ میں عملِ صالح بنتا ہے جب اس میں تین باتیں پائی جائیں، اوّل وہ حکم خداوندی کے مطابق ہو، دوسرے اس عمل کو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر انجام دیا جائے، تیسرے: اس کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور رضا کا حاصل کرنا ہو، شہرت ونا موری، عہدہ وجاہ اور دنیا طلبی مقصود نہ ہو، اگر یہ تینوں باتیں جمع ہوں تو وہ عمل صالح ہے اور ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہ پائی جائے تو وہ عمل صالح نہیں۔ ظاہر ہے کہ عمل صالح کو جاننے اور اس کو اختیار کرنے کے لئے قدم قدم پر علم کی ضرورت ہے، ایک وضو اور نماز ہی کو دیکھ لیجئے کہ اس سے متعلق کتنے مسائل واحکام ہیں؟ انسان بوڑھا ہو جائے اور اپنی پوری عمر طے کر لے پھر بھی ان مسائل کا احاطہ نہیں کر پاتا، ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے، اہلِ علم سے استفسار کرنا پڑتا ہے، بلکہ خود اصحابِ علم بھی ایک دوسرے سے رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، فقہ کا ایک سمندر بیکراں ہے جو انہی اعمال صالحہ کی تشریح وتوضیح سے عبارت ہے۔

غرض انسان کے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو آخرت کی آگ سے بچانے اور جہنم کی بھٹی سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ ایمان اور عملِ صالح ہے اور ایمان ہو یا عملِ صالح، جب تک دین کا علم نہ ہو، احکامِ شریعت سے آگہی نہ ہو، کتاب وسنت سے واقفیت اور دین کا فہم نہ ہو، حاصل نہیں ہوسکتا اور ایمان وعمل کا حق جہل ونا آگہی کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

اس لئے ہر مسلمان کے لئے اپنی ضروریات کے مطابق علم دین کا حصول فرائض میں سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے بہ وضاحت ارشاد فرمایا کہ: علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، طلب العلم فریضة علی کل مسلم ، شاید ہی دنیا کے کسی مذہب میں علم کی یہ اہمیت ظاہر کی گئی ہو۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں اور کوئی علم داخل ہو یا نہ ہو، علمِ دین تو ضرور ہی داخل ہے، کیوں کہ یہ ایسا فریضہ ہے کہ جس کے بغیر دین کا کوئی فرض ادا ہو ہی نہیں سکتا، وضو اس لئے فرض ہے کہ اس سے نماز ادا کی جائے، حرمین شریفین کا سفر اس لئے فرض ہے کہ حج کی ادائے گی ہو سکے، تو علم سے تو تمام ہی فرائض متعلق ہیں، نماز و روزہ حج و زکوٰۃ، نکاح و طلاق، حلال و حرام، خلوت و جلوت اور رزم و بزم، کون سی جگہ ہے اور کون سا موقع ہے جہاں انسان علم کا محتاج نہ ہو، اس لئے علم دین اہم ترین فریضہ ہے، ایسا فریضہ کہ جس پر تمام فرائض کی ادائے گی منحصر ہے۔

اس لئے یقیناً قرآن مجید نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانے کا حکم دے کر بالواسطہ علم کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، ہمارے سرکاری نظام تعلیم میں آزادی کے بعد ہی سے ہندو تہذیب کی چھاپ ڈالنے کی کوشش رہی ہے، لیکن اب یہ کوشش بے لباس اور تیز رفتار ہے، مسلمان بچوں کو مشرکانہ فکر سے مانوس کیا جا رہا ہے، دیویوں اور دیوتاؤں کا تقدس ان کے ذہنوں میں بٹھایا جاتا ہے، ہندو بزرگوں کی عظمت ان کے قلوب میں راسخ کی جاتی ہے، مسلمانوں کی تاریخ کو ڈاکوؤں اور لٹیروں کی تاریخ کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں، یہاں تک کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرتِ مبارکہ اور اسلام کے قرنِ اوّل کی تاریخ کو بھی مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء کی عظمت نئی نسل کے دل سے نکل جائے۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے دینی تعلیم کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ گئی ہے۔

دینی تعلیم کا ایک درجہ تو ضروریاتِ دین کی تعلیم کا ہے۔ یہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، ہمارے جو بچے عصری درسگاہوں میں زیرِ تعلیم ہیں، ان کے لئے بھی قرآن مجید کا

باتجوید ناظرہ، کچھ سورتوں کا حفظ، رسول اللہ ﷺ کی سیرت، ضروری فقہی مسائل اور شب و روز کے مختلف احوال سے متعلق جو ادعیہ واذ کار منقول ہیں، ان کا یاد کرانا تو ہر مسلمان بچے کے لئے ضروری ہے، اب اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ضروری ہوگئی ہے کہ ان کو اسلام کی اور مسلمانوں کی تاریخ بھی پڑھائی جائے، تاکہ وہ احساسِ کمتری سے بچ سکیں اور اسلام پر مغربی مصنفین اور ان سے متاثر ہو کر مشرق کے اہلِ علم جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے جواب میں بھی رہنمائی کی جائے، تاکہ غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کے دامِ ہم رنگِ زمین سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

علمِ دین حاصل کرنے کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ امت میں کچھ لوگ قرآن وحدیث کا تفصیلی علم حاصل کریں، کتاب وسنت پر ان کی گہری نگاہ ہو، فقہِ اسلامی پر ان کی وسیع نظر ہو۔

ایمانیات اور عقائد کی گہرائیوں تک ان کی رسائی ہو، ہر عہد میں اسلام کے خلاف جو فتنے کھڑے ہوں، وہ ان کے مقابلہ کی صلاحیت کے اہل ہوں، وہ اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں اور اپنے عہد کے پیدا ہونے والے مسائل کو فراستِ ایمانی کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں حل کریں۔ یہ امت پر فرضِ کفایہ ہے، جیسے کسی ملک کی سرحد پر فوج کا دستہ کھڑا رہتا ہے، بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس پر مفت میں کثیر اخراجات ہو رہے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ ملک کے سب سے بڑے محسن اور اس کی سلامتی کے ضامن ہیں، یہی مقام فکری اعتبار سے کسی بھی سماج میں علماءِ دین کا ہے، یہ ہمارے معنوی وجود، ہمارے فکری تشخص اور ہمارے تہذیبی امتیازات کے محافظ ہیں، کسی سماج میں اگر کوئی عالم نہ ہو تو کافرانہ طاقتیں علانیہ یا نادانستہ ان کو اُچک سکتی ہیں، عالم ممکن ہے عمل کے اعتبار سے کوتاہ ہو، لیکن انشاء اللہ وہ کسی گمراہی کے بارے میں غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا اور پروپیگنڈہ سے متاثر نہیں ہو سکتا، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا کوئی خاندان ایسا نہ ہو جو عالمِ دین سے خالی ہو، یہ انشاء اللہ اس پورے خاندان کے لئے حفاظتِ دین کی ضمانت ہے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے ایسا سوچ لیا ہے کہ یہ عظیم الشان علم صرف غریب اور

پسماندہ مسلمانوں کے لیے ہے، مسلمانوں میں مرفہ الحال اور اصحاب ثروت کا طبقہ علمِ دین کی طرف سے بالکل ہی بے توجہ ہے، بلکہ وہ اسے حقارت اور کمتری کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ نہایت ہی افسوس ناک بات ہے۔ یہ سمجھنا تو درست نہیں کہ یہ غریب طلبہ، کند ذہن اور فکری اعتبار سے مفلس ہوتے ہیں، کیوں کہ ذہانت کا دولت وغربت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ تجربہ یہ ہے کہ غریب ماحول کے بچے علم کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں، چنانچہ اس وقت آئی اے ایس اور اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں زیادہ تر اسی طبقہ سے طلبہ کامیابی حاصل کر رہے ہیں، لیکن اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ جو طالبِ علم معاشی اعتبار سے پست ماحول سے اٹھتا ہے، وہ بہر حال نفسیاتی اعتبار سے احساسِ کمتری کا شکار رہتا ہے اور سماج میں جو مرفہ الحال طبقہ ہے، اس سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتا، اس سے سماج میں کچھ لوگ دینی رہنمائی اور اپنی کوتاہیوں کی اصلاح سے محروم رہتے ہیں۔ اگر سماج کے معزز سمجھے جانے والے لوگ علمِ دین حاصل کریں تو وہ اپنے طبقہ کے لوگوں سے آنکھیں ملا کر باتیں کر سکیں گے اور بے جھجک اسلامی تعلیمات کو ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج کے معزز اور مرفہ الحال لوگ علمِ دین کی طرف متوجہ ہوں اور اس علم کو حاصل کرنے میں آگے آئیں۔

قابلِ فکر امر یہ ہے کہ آخر علمِ دین کی طرف سماج کے اونچے طبقے کی توجہ کیوں نہیں ہے؟ حالاں کہ ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ جو بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں تہذیب وشائستگی اور بڑوں کی توقیر، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، اپنے پرائے کے ساتھ حسنِ سلوک، نگاہ اور زبان کی حفاظت اور اپنے فرائض کے تئیں جواب دہی کے احساس کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، لیکن کیا بات ہے کہ اس کے باوجود علم کا یہ شعبہ لوگوں کے التفات سے محروم ہے؟؟۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو لوگ دین اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کے پاس مادی وسائل کم ہیں، ان کو کم تنخواہوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے، یہی ایک بات ہے جس نے مادہ پرست اذہان اور حریصانہ فکر و ذہن کے حاملین کو علم دین کی طرف آنے سے روکا ہوا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ان کے بچوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ وہ کیا کھائیں گے؟

اور کیوں کر زندگی گذاریں گے؟

اس سلسلہ میں مسلمان سماج کے لئے دو باتیں قابل توجہ ہیں: اوّل یہ کہ کیا مسلمانوں کا معاشرہ اپنے دینی تحفظ کے لئے ایک ایسے طبقہ کی صحیح طریقہ پر کفالت نہیں کر سکتا جن کی تعداد بہ مشکل ایک فی ہزار ہوگی؟ اگر مسلمان اپنی دوسری ضروریات کی طرح دینی خدمت گذاروں کو بھی اپنے لئے ایک ضرورت باور کریں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کے تعاون کے لیے ہاتھ بڑھائیں اور خادمین دین کو کم سے کم معاشی اعتبار سے اس لائق بنائیں کہ وہ متوسط طریقہ پر سماج میں اپنی زندگی بسر کرسکیں، تو یقیناً اس علم سے بے اعتنائی اور بے رغبتی کی یہ کیفیت باقی نہیں رہے گی۔ اور یہ کچھ مشکل نہیں ہے، بعض وہ قومیں جو باطل فکر ونظر کی حامل ہیں، اپنے مذہب اور مذہبی شخصیتوں کے لئے کل آمدنی کا دس فیصد وقف کی ہوئی ہیں، مسلمان اتنی بڑی قوم ہے کہ اگر وہ آمدنی میں دین کے خدمت گذاروں کے لیے ایک فی صد بلکہ نصف فی صد بھی حصہ مقرر کرلیں تو ان کے ائمہ، مؤذنین، علماء اور دینی کام کرنے والے بہتر حالات میں اپنی زندگی گذار سکتے ہیں اور بعض اوقات غربت و احتیاج کی وجہ سے اس طبقہ میں جو دناءت اور پستی کی بعض باتیں پیش آتی ہیں، ان کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ کاش! مسلمان اس پہلو سے غور کریں، کہ خادمینِ دین کے وقار کو بلند کرنا دراصل خود دین کے وقار کو بلند کرنا ہے۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں معیشت کا علم سے کچھ زیادہ ربط نہیں ہے، ہمارے اسی شہر میں کتنے لوگ ہیں جو نشانِ ابہام سے کام چلاتے ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان کے ملازم ہیں اور دولت ان کے قدموں میں نثار ہے، کتنے انجینئر بیکار ہیں، اور کتنے ڈاکٹر بے روزگار ہیں اور کتنے قانون داں مؤکل کی تلاش میں خاک چھانتے نظر آتے ہیں، اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اگر ایک شخص علم دین حاصل کرے گا تو بھوکا مرے گا اور دوسرے علوم حاصل کرے گا تو اس کے گھر میں ''ہن'' برسنے لگیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رزاق اور روزی رساں ہیں، چاہیں تو پڑھے لکھے لوگوں کو محروم رکھیں اور چاہیں تو جاہلوں کو سرفراز فرمادیں، پھر یہ ایک نظریہ نہیں، بلکہ تجربہ اور آزمودہ حقیقت ہے

کہ جولوگ اللہ کے دین کے کام میں مشغول ہیں، اللہ ان کو ضائع نہیں کرتا اور غیب سے ان کی کفالت کا سروسامان کرتا ہے۔ آخر اسی معاشرہ میں وہ دینی تعلیم یافتہ لوگ بھی موجود ہیں جو خوش پوش بھی ہیں، باعزت طریقہ پر اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے امت کے دل میں ان کی محبت اس طرح ڈال دی ہے کہ مشکل مواقع پر بلا کہے سنے اور بلا طمع و اشراف وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں، اس لیے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے۔ اگر ایک مسلمان میں اللہ کی رزاقیت کا یقین بھی نہ پیدا ہو، تو یہ کیسا کھوکھلا اور بے روح ایمان ہے؟

پس ہندوستان کے موجودہ حالات میں اور عالمی حالات کے پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ مسلمان دینی تعلیم کی اہمیت کی طرف متوجہ ہوں۔ آج ہمارے ملک میں مدارس اسلامیہ کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی ہیں، عالمی سطح پر بھی ان کو بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا مرکز قرار دیا جارہا ہے، یہ سب ان لوگوں کی زبان ہے کہ اسلام سے جن کی عداوت ظاہر و باہر ہے۔ اعداءِ اسلام کا یہ رویہ سرمایہ عبرت ہے، جو لوگ حق و راستی کے دشمن ہوں، وہ تو مدارس کی اہمیت کو سمجھ لیں کہ جو لوگ صاحبِ ایمان اور اسلام کے نام لیوا ہیں، وہی اسلام کی حفاظت اور اس کی بقا میں مدارس کی کردار کی اہمیت کو نہیں سمجھیں، اس سے زیادہ قابلِ افسوس اور کیا بات ہوگی؟

اولاد کی فکر کیجئے!

انبیاء و رسل میں ایک اہم ترین ہستی سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی گویا دنیا کی آبادی کا قریب قریب تین چوتھائی حصہ آپ کی عظمت پر متفق ہے، اور آپ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ صرف خود نبی تھے، بلکہ ابوالانبیاء تھے، آپ کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام بھی نبی تھے، پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کے صاحبزادے حضرت یعقوب علیہ السلام نبی ہوئے، حضرت یوسف علیہ السلام بھی نبی بنائے گئے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزند تھے، یہی حضرت یعقوب جن کے آباء و اجداد تین پشت سے پیغمبر تھے، اور آئندہ بھی بنی اسرائیل کے تمام انبیاء آپ ہی کی نسل میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید نے ان کی وفات کا واقعہ ذکر کیا ہے، جو اس طرح ہے:

> ''کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب پر موت آئی؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے دریافت کیا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم آپ کے رب اور آپ کے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کے رب کی — جو ایک ہی معبود ہے — کی عبادت کریں گے، اور اسی کے فرماں بردار ہو کر رہیں گے، یہ کچھ لوگ تھے جو گذر چکے، ان کے لئے ان کے اعمال ہیں، اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں کوئی پوچھ نہیں ہوگی۔ (البقرۃ:۱۳۴)

یہ آیت بہ ظاہر حیرت میں ڈالتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام جیسی شخصیت جن

کے یہاں چار پشتوں سے نبوت چلی آرہی تھی، جن کی اولاد میں بھی نبی تھے، اور آئندہ سلسلۂ اولاد میں نبی اسرائیل کے بہت سے انبیاء کو پیدا ہونا تھا، ایسا شخص اپنی موت کے وقت اس بارے میں فکرمند ہے کہ خانوادۂ نبوت کے چشم و چراغ کس کی پرستش کریں گے؟ جب ان کے بچے اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ توحید، تعلق مع اللہ اور خدا کی اطاعت وفرماں برداری کے رویہ پر قائم رہیں گے، تو اب ان کو اطمینان ہوتا ہے، یہ معمولی بات نہیں ہے، اس میں امتِ مسلمہ کے لئے حیرت وموعظت کا سامان ہے، کہ ایک صاحب ایمان کو کبھی بھی اپنے بچوں کی دینی کیفیت کے بارے میں غافل نہ ہونا چاہئے۔ جیسے ایک تاجر چاہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ تجارت چھوڑ کر جائے، جیسے ایک کارخانہ دار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے صنعت کے میدان میں ترقی کریں، جیسے ایک ملازم کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے بچے اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہوں، بلکہ انسان کا بس چلے تو وہ آئندہ کے لئے سات پشتوں کی معیشت کا انتظام کر جائے، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے بہت بڑھ کر ایک مسلمان کو اپنی اولاد کے بارے میں فکرمند ہونا چاہئے کہ ایمان اور عملِ صالح کے اعتبار سے اس کی اولاد صحیح راہ پر گامزن ہو۔ اور وہ خدا کی پرستار اور اس کی فرماں بردار ہو۔

اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ کتنا بھی دین دار خاندان ہو، خاندان میں علماء اور حفاظ ہوں، دین کی دعوت واشاعت کا کام کرنے والے لوگ ہوں، اسلامی شعور رکھتے ہوں، لیکن اپنی اولاد کی طرف سے مطمئن نہ رہیں، اور یہ نہ سمجھیں کہ یہ بہرحال دین پر قائم رہیں گے، کیوں کہ انبیاء سے بڑھ کر خداترس خانوادہ اور کون ہوسکتا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انبیاء اپنے خاندان اور اہل وعیال کے بارے میں کبھی بے فکر نہیں رہے، خود پیغمبر اسلام ﷺ اپنی پھوپھی اور اپنی صاحبزادی کو خطاب کرکے فرماتے کہ آخرت سے پہلے کچھ کرلو، ورنہ مجھ سے قرابت بھی تم کو کام نہیں آئے گی۔ اسی لئے قرآن مجید نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد متنبہ فرمایا ہے کہ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے، اور تم بھی گو انہیں کی نسل سے ہو، لیکن تمہارے بارے میں فیصلہ

تمہارے اعمال کے مطابق ہوگا۔

جولوگ خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، جن کا یقین اس بات پر ہے کہ یہی دنیا آخری دنیا ہے، وہ اگر اپنے بال بچوں کے لئے صرف مال ومتاع اور سیم وزر کی فکر کریں، تو مقام تعجب نہیں کہ ان کے نزدیک تو اس مادی دنیا کے آگے کوئی منزل ہی نہیں، لیکن اگر مسلمان ہمیشہ بھی اسی راہ پر چلیں، تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے کوئی مسافر راستہ کو اپنی منزل سمجھنے لگے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس وقت ہم لوگوں کا حال کچھ ایسا ہی ہے، ہمارے بچے بہت ہی نوعمری میں مشنری اسکول یا ان کے طرز پر چلنے والے دوسرے اسکولوں کے حوالے کردئے جاتے ہیں، یا جو عام طور سے دین سے بالکل بے بہرہ اور اپنی تاریخ سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں، مزید بدقسمتی یہ ہے کہ یہ مادری زبان سے بھی کٹ جاتے ہیں، اسلامی علوم کا بہت بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے، اس پورے سرمایہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ گھر میں دین کا ماحول پہلے سے نہیں، ٹی، وی نے صورتِ حال اتنی خراب کردی ہے کہ الفاظ ان کو بیان کرنے سے قاصر ہیں، ان حالات میں آپ کیوں کر اطمینان کرسکتے ہیں کہ آپ کی نسل آپ کے بعد کچھ اس دینی امانت کو تھامے رہے گی، جس کے آپ حامل ہیں، اور گمراہ کن نظریات ان کو اپنا اسیر نہ بنا سکیں گے!

اس لئے موجودہ حالات میں یہ بات ضروری ہوگئی ہے کہ مسلمان بنیادی دینی تعلیم کا اپنا آزادانہ نظام قائم کریں، اور اس نظم کو خود کفیل بنائیں، اس سلسلہ میں گجرات کا علاقہ ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں بہت ہی مستحکم بنیادوں پر دینی مکاتب کا نظم قائم ہے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ مکتب کے جال بچھے ہوئے ہیں، مکاتب کے اوقات تعلیم ایسے ہوتے ہیں کہ سرکاری اسکولوں میں جانے والے بچے یا تو اسکول جانے سے پہلے مکتب میں وقت لگائیں، یا اسکول سے واپسی کے بعد، مکتب کی تعلیم سماج میں ایک لازمی تعلیم سمجھی جاتی ہے، یہی نظام پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو کرنا ہوگا، تاکہ ہمارا کوئی بچہ بنیادی دینی تعلیم سے ناآشنا نہ رہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کی

صورت میں ہمیں ایسا مرکز دیا ہے جس سے بہتر کوئی اور مرکز نہیں ہوسکتا، یہی مسجد مدرسہ ہے وہاں جو ائمہ، موذنین اور مسجد کے خدام ہیں، جو مدرس و معلم ہیں، اگر ہر مسجد میں صباحی اور مسائی تعلیم کا ایک مستحکم نظام قائم کریں، بچوں کے لئے ایک ایسا کورس مرتب کریں جس میں ناظرۂ قرآن اوراذ کار وادعیہ کے علاوہ اردو زبان، سیرت نبوی، اوراسلامی تاریخ کی بھی مناسب تعلیم ہو جائے اور بچوں کی فکری تربیت بھی ہواور وہ شعوری طور پر اسلام کو سمجھ سکیں، تو یہ بہت بڑا کام ہوگا، اوراس طرح ہم آنے والی نسل کی حفاظت کرسکیں گے۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ گرمائی تعطیلات کا ہے، جس میں ڈیڑھ ماہ یا اس سے زیادہ طلبہ کوفرصت ملتی ہے، ۴۵/۵۰ دن کا عرصہ کم نہیں ہے، اگر ہم ان اوقات کا صحیح استعمال کریں تو اس تعطیل سے بھی بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔اس میں مڈل اسکول، ہائی اسکول اور کالج کی سطح کے طلباء کے لئے اسلامیات کا علاحدہ علاحدہ مختصر کورس ترتیب دینا چاہئے، جس میں ناظرہ، قرآن مجید، کچھ سورتوں کا حفظ، سیرت نبوی، اسلامی تاریخ، فقہ اسلامی وغیرہ موضوعات پر اسباق دیئے جائیں، تعارف اسلام خطبات کا نظم کیا جائے، اوران کو اخلاقی تعلیمات سے بھی مزین کیا جائے، ایسی گرمائی درس گاہ کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، کچھ ادارے اس سلسلہ میں کوشش کررہے ہیں، لیکن ضرورت اس سے بہت زیادہ کی ہے، اور جہاں کہیں گرمائی کلاس قائم کئے جارہے ہیں، گو لوگوں کا رجوع حوصلہ افزا ہے، لیکن اتنا نہیں، جتنا ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ نوجوانوں کو اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تبلیغی جماعت کے ساتھ وقت لگانا چاہئے، اور سرپرستوں کو اس سلسلہ میں اپنے بچوں کو بھیجنا چاہئے، کیوں کہ جب انسان اپنے ماحول سے باہر نکلتا ہے اور کسی چیز کو حاصل کرنے میں یکسو ہو جاتا ہے تو کم وقت میں بھی زیادہ کچھ حاصل کرسکتا ہے۔نوجوان طلبہ کو اسلام سے قریب کرنے اور موجودہ مسموم ماحول سے بچانے کے لئے اور بھی وسائل اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان کے موجودہ حالات میں مخالف اسلام طاقتیں پوری طرح اس بات کے لئے سرگرم ہیں کہ وہ مسلمانوں کی اگلی نسل کو اپنی فکر اور اپنی تہذیب کے ساتھ جذب کرلیں، اور ان کو ان کی فکری میراث سے محروم کردیں، ان حالات میں اگر ہم نے غفلت، بے شعوری، خدا فراموشی اور خود فراموشی سے کام لیا تو اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ ہماری فکری اور ملی وجود ایک قصۂ پارینہ بن جائے، انشاء اللہ کفر کے پھونکوں سے نورِ حق بجھایا نہ جاسکے گا، لیکن ضرور ہے کہ ہم اس کے لئے فانوس بن کر زندہ رہیں، اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ جو نعمتِ ایمان ہمیں حاصل ہے وہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے، اور ہمیں اس امانت کو اپنی اگلی نسلوں تک پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ پہونچانا ہے!!

(۱۹/۵/۲۰۰۰ء)

ماضی کو یاد کیجئے

اگر دنیا کے انصاف ور اور دانشمند ترین حکمرانوں کی فہرست بنائی جائے اور اس میں پہلا نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہئے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کو آزاد ہونے کے بعد وہی طریقۂ حکمرانی اختیار کرنا چاہئے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ کا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت مختلف پہلوؤں سے نہایت مکمل اور جامع تھی، آپ کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ تھا کہ اقتدار نے کبھی آپ کو غیر متوازن نہ ہونے دیا، یہ آسان نہیں کہ آدمی کرسیٔ اقتدار پر متمکن ہو، ملک وقوم کی قسمت کا فیصلہ اس کے قلم سے لکھا جاتا ہو، کوئی زبان اس کو چیلنج کرنے والی اور کوئی پنجہ اس کے دست استبداد کو تھامنے والا نہ ہو، لیکن پھر بھی اقتدار کی ''انا'' اس کو بدمست ہونے نہ دے اور جاہ واقتدار کا نشہ اس کے دل ودماغ تک رسائی نہ پاسکے، یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اپنے ماضی کو یاد رکھے اور اپنی پرانی سطح کو فراموش نہ کرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں پوری طرح یہ وصف موجود تھا، وہ خلیفہ ہونے کے بعد اُمت کے ایک عام فرد کی طرح رہتے تھے، لباس وپوشاک ہو، کھانا پینا ہو، لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور عمومی سلوک ہو، معیارِ زندگی کے اعتبار سے انہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں کی سطح پر رکھا تھا، اس کا اثر تھا کہ وہ غریبوں کا دکھ جانتے تھے اور ان کے لئے غریبوں کے مسائل ''جگ بیتی'' نہیں بلکہ ''آپ بیتی'' تھے؛ اس لئے ہمیں ان کی زندگی میں عدل وانصاف، مساوات وبرابری، غریب پروری اور کمزوروں اور زیردستوں کی دستگیری کے جو نمونے ملتے ہیں، کہیں اور مشکل ہی سے ملیں گے۔

عتبہ بن فرقد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے آذربانیجان کی مہم پر مامور تھے، فتح آذر

بائیجان کے موقع پر انہوں نے کھجور اور گھی سے مرکب ایک خوش ذائقہ کھانا تیار کیا، جسے ''خبیص'' کہا جاتا ہے اور اسے اپنے غلام حکیم کے ساتھ چمڑے اور کپڑے سے چھپا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا۔ حکیم آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: کیا لائے ہو، سونا یا چاندی؟ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے غلاف ہٹایا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے چکھا اور فرمایا کہ عمدہ اور خصوصی طور پر بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے ''ان ھذا لطیب اثر'' پھر دریافت فرمایا کہ تمام ہی مہاجرین نے اس سے آسودہ ہو کر کھایا ہے؟ حکیم نے عرض کیا: نہیں، یہ تو عتبہ نے خاص طور پر آپ کے لئے بنوایا ہے۔ عام طور پر ایسی خوشامدانہ باتیں اربابِ اقتدار اور اصحابِ اختیار کو باغ باغ کر دیتی ہیں اور ان کے دل میں ایسے کارکنوں کی عزت بڑھ جاتی ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی، آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً عتبہ کو ایک غصہ بھرا خط لکھا کہ یہ جو بیت المال کا مال ہے، یہ نہ تری محنت کا ہے اور نہ تری ماں اور ترے باپ کی محنت کا ہے،'' لیس من کدك ولا من کدامك ولا من کدأبيك '' پھر تحریر فرمایا کہ میں وہی کھاؤں گا جس کو عام مسلمان آسودہ ہو کر کھائیں۔ (فتوح البلدان: ۴۰۲)

آج ان لوگوں کا تو خیر کیا ذکر، جو صبح سے شام تک مادیت میں ڈوبے ہوئے ہیں، جو خواب بھی روپیوں پیسوں کا دیکھتے ہیں اور جن کی بیداری کا ایک ایک نفس سیم و زر کی فکر میں گزرتا ہے، اہل دین بھی کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کو اسوہ بنانے تیار ہیں؟ دینی مجلسوں اور محفلوں میں بھی من و تو اور ما و شما کا امتیاز موجود ہے، بڑوں چھوٹوں کا فرق ہے، اکابر و اصاغر کی تفریق ہے، اور تقویٰ کی بنیاد پر نہیں بلکہ دولت و غربت اور شہرت و گمنامی کی نسبت سے دائرے قائم کر دیئے گئے ہیں، جب معمولی سا اقتدار آدمی کو توازن سے محروم کر دیتا ہے تو ان لوگوں سے کیا گلہ جو اقتدار کی اونچی چوٹیوں پر پہنچنے کے بعد نیچے رہنے والوں کو دیکھ نہیں پاتے یا ان کو اپنے مقابلہ کم قامت خیال کرتے ہیں۔

انسان دوسرے انسان کو انسان سمجھنا چھوڑ دے اور کوئی ادنیٰ مخلوق تصور کرنے لگے یا خود اپنے آپ کو انسان سے بڑھ کر کوئی اور مخلوق خیال کرنے لگے تو دوسرے انسانوں کے غم کی چوٹ اپنے کلیجہ پر محسوس نہیں کر سکتا، یہی چیز انسان کے مزاج کو غیر متوازن اور

طریقۂ فکر کو نا منصفانہ بنا دیتی ہے، پھر انسان اپنے ماضی کو بھولتا چلا جاتا ہے اور جوں جوں وہ اپنے ماضی سے دور ہوتا جاتا ہے، کبر و تعلّی بڑھتی جاتی ہے، اس لئے جب انسان دولت و ثروت، حکومت و اقتدار اور شہرت و ناموری کے بام پر چڑھنے لگے تو ہر زینہ پر قدم رکھتے ہوئے پچھلا زینہ اور اس زینہ کے نیچے بچھی ہوئی زمین کو دیکھتا جائے اور یاد رکھے کہ اس نے یہیں سے اپنا سفر شروع کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے ہم نام فرمانروا حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا نانہالی سلسلہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے ملتا ہے۔ رجاء بن حیوہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کے قدر شناسوں میں تھے، انہیں کے مشورہ سے باگِ خلافت آپ کو سونپی گئی تھی، زمانہ خلافت میں رجاء ایک شب آپ کے پاس مقیم ہوئے، ایک معمولی سا چراغ تھا جو روشن تھا، چراغ بجھنے لگا تو رجاء اٹھے کہ چراغ درست کر دیں، حضرت عمر بن عبدلعزیز رضی اللہ عنہ نے قسم دی کہ رجاء ہرگز نہ اٹھیں، ناچار بیٹھ گئے، خلیفۃ المسلمین خود اٹھے اور چراغ درست فرمایا، بنو اُمیہ کے ابتدائی دور ہی سے بادشاہانِ مملکت کی شوکت و سطوت جس طرح روز بروز بڑھتی جاتی تھی، اس کے تحت حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا یہ عمل نہایت باعث حیرت تھا، رجاء نے عرض کیا: آپ امیر المؤمنین ہونے کے باوجود چراغ درست کرنے کا کام کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں جب اٹھا تب بھی عمر بن عبد العزیز تھا اور جب واپس آیا تب بھی عمر بن عبد العزیز ہی تھا!!!

حضرت عمر بن عبد العزیز نے امیر المؤمنین ہونے کے بعد بھی اس کو یاد رکھا کہ وہ "امیر المؤمنین" بعد میں ہیں، "عمر بن عبد العزیز" پہلے۔ اگر انہوں نے عمر بن عبد العزیز ہونے کی حیثیت کو بھلا دی ہوتا تو ان کے لئے چراغ بجھانے کے لئے اٹھنا اور خود اپنی ضرورت پوری کرنا دشوار ہوتا، لیکن ماضی کو یاد رکھنے نے ان کی زندگی کو ایک سادہ، بے تکلف اور تصنع سے خالی مومن کی زندگی بنا دیا تھا، یہ ایک ضروری وصف ہے جس کی قدم قدم پر ضرورت ہے، رشتہ داروں سے رشتہ باقی رکھنے کے لئے، دوستوں سے محبت کی فضاء قائم رکھنے کے لئے، اپنے ماتحت کام کرنے والے مزدوروں اور ملازمین کا دل جیتنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ خدا کے یہاں اس کا شمار کبر کرنے والوں میں نہ ہو! (۱۰ را پریل ۱۹۹۸ء)

سالِ نو ساعتِ سرمستی یا وقتِ احتساب؟

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو بہت سی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں ایک اہم ترین نعمت ''وقت'' ہے۔ وقت کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں وقت کی قسم کھائی ہے، اور ایک مستقل سورت '' والعصر'' کے نام سے نازل ہوئی ہے۔ ''عصر'' کے معنی ہی زمانہ و وقت کے ہیں۔ پھر دن و رات کے مختلف مواقع ہیں، جن کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، جیسے: دن، رات، صبح، سورج نکلنے کا وقت، وغیرہ، چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے رات کی (اللیل:۱)، دن کی (النہار:۲)، صبح کی (التکویر:۱۸)، اور سورج چڑھتے ہوئے دن کے وقت کی (الضحیٰ:۱) قسمیں کھائی ہیں، قرآن میں جب کسی چیز کی قسم کھائی جائے تو اس سے اس چیز کی اہمیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، اس طرح قرآن مجید نے بار بار وقت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پھر غور کیجئے کہ اکثر عبادتیں وقت ہی سے متعلق ہیں، نماز پنجگانہ جو افضل ترین عبادت ہے، اس کا اداء و قضاء ہونا، درست و نادرست ہونا اور مستحب و مکروہ ہونا، وقت کے ساتھ مربوط ہے، روزہ کی ابتداء و انتہاء، وقت سے اس درجہ متعلق ہے کہ اس میں دو چار منٹ کی بھی کمی زیادتی نہیں ہو سکتی، یہی حال دوسری عبادتوں کا بھی ہے۔

وقت کی اہمیت کیوں نہ ہو، کیوں کہ انسان کی نیکیاں اور برائیاں اور ثواب و عذاب سب کا تعلق وقت کے صحیح اور غلط استعمال سے ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن جب تک لوگ پانچ باتوں کا جواب نہیں دے دیں گے ان کو آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں ہوگی، ایک یہ کہ انہوں نے اپنی عمر کسی کام میں بسر کی: عن عمرہ

فیما افناہ، دوسرے اپنی جوانی کس کام میں صرف کی: عن شبابه فیما ابلاہ، تیسرے مال کس ذریعہ سے کمایا اور چوتھے کس راہ میں خرچ کیا اور پانچویں یہ کہ اس نے جو کچھ سیکھا اس پر کتنا عمل کیا؟ (ترمذی: ۶۷/۲) اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کا سودا اصل میں وقت ہی کے حساب و کتاب سے متعلق ہے، اور دنیا میں تو ہر شخص دن و رات اس کا تجربہ کرتا رہتا ہے، کہ وقت کی ناقدری انسان کو کس قدر نقصان پہنچاتی ہے، اور وقت کی قدر دانی اسے کس قدر نیک نام و بامرام کرتی ہے، اسی لئے اردو کے ایک شاعر نے خوب کہا ہے:

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

اب چند دنوں میں ۲۰۰۳ء کا آغاز ہونے والا ہے، ۳۱ر دسمبر کے بعد آنے والی رات کو جوں ہی گھڑی کا کانٹا بارہ بجے کو پہنچے گا، تو یہ صرف A.M اور P.M ہی کی تبدیلی نہیں ہوگی، بلکہ یہ ایک سال کی تبدیلی ہوگی، اور ایک نئے کیلنڈر کو وجود میں لائے گی، نیا سال در اصل ہمیں دو باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، ماضی کا احتساب، اور آئندہ کا پروگرام، انسان کے لئے اپنے آپ کا محاسبہ ضروری ہے، یہ محاسبہ ہمہ پہلو ہونا چاہئے، محاسبہ دنیوی امور میں بھی ضروری ہے، اگر آپ تاجر ہیں تو اپنی تجارت کا جائزہ لیں، کہ اس میں آپ نے کیا کچھ ترقی کی ہے؟ اگر نہیں کی ہے یا پیچھے ہٹے ہیں، تو اس کے کیا اسباب ہیں؟ کہیں اس میں آپ کی کوتاہی کو تو دخل نہیں ہے؟ اگر آپ کسی سرکاری یا غیر سرکاری اداروں میں ملازم ہوں تو غور کریں کہ آپ اس میں جو بہتر پوزیشن حاصل کر سکتے تھے یا اپنی ایمانداری اور بہتر کارکردگی کے ذریعہ جو اعتماد آپ کا پیدا ہوسکتا تھا، آپ نے کس حد تک اسے حاصل کیا ہے؟ اسی طرح ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں اپنی کامیابی و ناکامی اور پیش قدمی و پست رفتاری کا جائزہ لینا چاہئے۔

انسان کا کسی چیز میں پیچھے ہو جانا بری بات نہیں، بُری بات یہ ہے کہ انسان بے حسی میں مبتلا ہو جائے، وہ ناکام ہو اور اپنی ناکامی کے اسباب پر غور نہ کرے۔ اس کے قدم پیچھے ہٹیں، اور فکر مندی کی کوئی چنگاری اس کے دل و دماغ میں سلگنے نہ پائے، وہ ٹھوکر کھائے لیکن ٹھوکر اس کے لئے مہمیز نہ بنے، جو شخص اپنے نقصان کا جائزہ لیتا ہے، اپنی

کتابِ زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو محسوس کرتا ہے، وہی گر کر اٹھتا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے، جس میں اپنے احتساب اور اپنی کمزوریوں کے اعتراف کی صلاحیت ہی نہ ہو، وہ کبھی اپنی منزل کو نہیں پا سکتا۔

جیسے دنیوی اعتبار سے اپنا احتساب ضروری ہے، اسی طرح دین و اخلاق اور اعمال و کردار کے اعتبار سے بھی احتساب ضروری ہے، اپنی عبادات پر نگاہ دوڑائیں، کہ بہ مقابلہ گذشتہ سال کے اس سال اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اپنے معاملات کو دیکھیں کہ حلال و حرام اور مستحبات و مکروہات کے جو احکام شریعت میں ہیں، ان میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے، خاص کر اپنے اخلاق و سلوک کا جائزہ لینا چاہئے، والدین کے ساتھ، شوہر و بیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، رشتہ داروں اور خاص کر غریب رشتہ داروں کے ساتھ، خاندان کی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ، مسلمان اور غیر مسلم پڑوسیوں اور کاروبار و دفاتر کے رفقاء کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے؟ ہم ان کے لئے پھول ہیں یا کانٹے؟ وہ ہم سے راحت و سکون محسوس کرتے ہیں یا خوف و دہشت؟ ہم نے انہیں محبت کی سوغات دی ہے یا نفرت و عداوت کا تحفہ؟ غرض ہمیں اپنی زندگی کے ایک ایک عمل کا جائزہ لینا چاہئے، اور خود اپنا حساب کرنا چاہئے کیوں کہ انسان دوسرے انسانوں کی نگاہ سے اپنی کوتاہیوں کو چھپا سکتا ہے، لیکن اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے، خود اپنا حساب کرو: **حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا**۔

(کنز العمال، حدیث نمبر: ۴۴۲۰۳)

پھر اس احتساب، آپ اپنے جائزہ اور خود حسابی کی روشنی میں آئندہ سال کا نظام بنانا چاہئے، کیا بہتر کام اس نے کئے ہیں، جسے برقرار رکھے ہیں؟ ان بہتر کاموں میں معیار یا مقدار کے لحاظ سے کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ اور اسے اس میں فلاں حد تک اضافہ کرنا ہے، کیا کوتاہیاں اور کمزوریاں ہیں، جنہیں وہ اس سال دور کرے گا، اور اگر وہ مکمل طور پر انہیں دور نہیں کر سکتا، تو اسے کم کرے گا، دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا، تعلیم کا

معاملہ ہو یا ہنر مندی کا، تجارت میں ہو، ملازمت میں، سماجی تعلقات کی بات ہو یا معاشی معاملات کی، ہر جگہ یہ پلاننگ اور پروگرام سازی ضروری ہے، اور اسی سے اس کی ترقی و کامیابی متعلق ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
دن بہ دن، لحہ بہ لحہ، دم بہ دم

لوگ سالِ نو کی خوشیاں مناتے ہیں، لیکن غور کیجئے تو یہ موقع خوشی سے زیادہ غم کا ہے، یہ ساعتِ جشن و مسرت نہیں، بلکہ لحہ عبرت و موعظت ہے، کیوں کہ سال کے گذرنے سے عمر بڑھتی نہیں ہے، بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہوتا جاتا ہے، اور مقررہ عمر میں کمی ہوتی جاتی ہے، اس لئے سالِ نو کی آمد غفلت شعار طبیعتوں کے لئے صورِ انتباہ اور سونے والوں کے لئے بیداری کا الارم ہے، نہ کہ سرمستی و عیش کوشی کا پیغام، یہ وقت ہے کہ ایک مومن کی پیشانی خدا کی چوکھٹ پر خم ہو کہ تو نے میرے بہت سے ہم عمروں کو اٹھالیا، اور مجھے اپنی مہلت سے سرفراز کیا ہے، اس لئے تیرے دربار میں شکر و امتنان کے جذبات پیش کرتا ہوں، یہ وقت ہے کہ خدا کے حضور التجاء و الحاح کے ہاتھ اٹھیں، کہ خدایا میرے مستقبل کو میری ماضی سے بہتر فرما، میری نامرادیوں کو کامیابیوں سے اور میری پستیوں کو بلندیوں سے بدل دے، خاص کر مسلمان اس وقت پورے عالم میں خدا سے غفلت شعاری اور دنیا اور متاعِ دنیا کی محبت کی جو سزا پا رہے ہیں، اس پس منظر میں پوری امت کو عالمِ اسلام اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کی دعاء کرنی چاہئے۔

لیکن افسوس اور ہزار بار افسوس! کہ عبرت پذیری اور موعظت انگیزی کی اس ساعت کو بھی ہم نے عیش کوشی، خود فراموشی اور خدا فراموشی کی ساعت بنالیا ہے، اس موقع سے رقص و سرور کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، تفریح گاہوں اور پارکوں میں کھلے عام بے حیائی کے مناظر دیکھے جاتے ہیں، اور جن بے ہودہ حرکات و سکنات کے لئے کبھی اہلِ مشرق اہلِ مغرب کو شرم و عار دلاتے تھے اب خود مشرق اس بے حیائی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کو مضطرب ہے، کیا کسی شریف انسان کے لئے اس طرح کھلے عام بادہ و ساقی

سے ہم دہن و ہمکنار ہونا زیبا ہے؟ اور کیا مسلمانوں کے لئے اس خود فراموشی اور غفلت کوشی کا کوئی موقع ہے؟ جس قوم کا قبلۂ اوّل اس کے ہاتھوں سے نکل چکا ہو، عالمِ اسلام کے قلب وجگر تک دشمن کی رسائی ہوچکی ہو، جس کی عبادت گاہ بلا کسی دلیل اور جواز کے زمین بوس کردی گئی ہو، جس کا لہو گجرات کے چپہ چپہ سے ایسا ٹپک رہا ہے جیسے موسم سرما میں کہر، ایسی مظلوم اور ستم رسیدہ اور ذلت ونکبت کی سرحدوں پر کھڑی امت کے لئے خوشی کے شادیانے بجانے اور عیش ونشاط کے کاشانے سجانے کا بھی کوئی موقع ہے؟؟ **فاعتبروا یا اولی الابصار !**

لمحہ گذر گیا تو سمجھئے صدی گئی

دسمبر ۲۰۰۰ء گذرنے کو ہے، اور اکیسویں صدی اب وقت کے دروازہ پر دستک دے رہی ہے، یہ سال اس اعتبار سے اہم ہے، کہ ۳۱ ر دسمبر کو سال بھی مکمل ہو رہا ہے، بیسویں صدی بھی، اور دوسرا ہزار سالہ بھی پایۂ تکمیل کو پہونچ رہا ہے، آنے والی یکم جنوری کی تاریخ نہ صرف نئے سال کی مژدہ لائے گی، بلکہ نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا نقطۂ آغاز بھی ہوگی، یہ وقت افراد و اشخاص کے لئے بھی اداروں اور تنظیموں کے لئے بھی اور جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی اپنے احتساب کا وقت ہے، کہ انہوں نے اس عرصہ میں کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اور وقت کی صورت میں جو عظیم نعمت اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے، اس کا کس طور استعمال کیا ہے؟ جو قوم خود اپنا محاسبہ نہیں کر سکتی، اور جو جماعت اپنا گریباں آپ تھامنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، دوسرے ان کے گریبان تھامتے ہیں، اور خیر و شر کا حساب کر کے اس کا بدلہ چکاتے ہیں، لمحوں کی ناقدری سے بعض اوقات صدیوں کا نقصان ہوتا ہے اور قومیں زوال و انحطاط کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بہت سی نعمتیں اس کائنات میں دی ہیں، ان میں ایک بہت بڑی نعمت وقت ہے، انسان سمجھتا ہے کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے، اس کے اوقات بڑھ رہے ہیں، لیکن درحقیقت عمر گھٹتی جاتی ہے اور ہر لمحہ وقت کی متاع گراں مایہ اس کے ہاتھوں سے نکلتی جاتی ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے ، لمحہ لمحہ ، دم بہ دم

وقت کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں

کتنے ہی مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے، کبھی رات اور صبح کی قسم کھائی گئی، (اللیل: ۱، ۲، مدثر: ۳۳، ۳۴، تکویر: ۱۷، ۱۸) کبھی رات کے ساتھ شفق کی قسم کھائی گئی، (انشقاق: ۱۶، ۱۷) کبھی فجر اور اس کے ساتھ دس راتوں کی (الفجر: ۱، ۲) کبھی دن کی روشنی اور رات کے چھا جانے کی (الضحیٰ: ۱، ۲) اور کبھی خود زمانہ کی، (العصر: ۱) دونوں کی آمد و رفت اور سورج و چاند کے طلوع و غروب سے اوقات کا علم ہوتا ہے، قرآن مجید نے جا بجا اللہ کی نعمت کی حیثیت سے ان کا ذکر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی، جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کر سکیں، اولم نعمر کم مایتذکر فیه من تذکر (الفاطر: ۳۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن آدمی سے اس بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں گذاری، اور اپنی جوانی کو کس مقصد میں صرف کیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں، صحت اور فراغتِ وقت۔

سلف صالحین جنہوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لمحہ کو وصول کرتے تھے، اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے، امام ابو یوسفؒ (۱۱۳-۱۸۲ھ) اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ان کے بارے میں اہل تذکرہ نے قاضی بن جراح سے نقل کیا ہے، کہ وہ مرض وفات میں امام صاحب کی عیادت کے لئے پہونچے، آپ پر بے ہوشی طاری تھی، ابراہیم بیٹھے رہے، کچھ دیر میں ہوش آیا، امام صاحب نے پوچھا کہ حج میں جمرات کی رمی پیدل کرنا افضل ہے یا سواری پر؟ ابراہیم نے استاذ سے عرض کیا، کہ اس حال میں بھی آپ فکر و تحقیق کو نہیں چھوڑتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، ابراہیم نے کہا سوار ہو کر رمی کرنا افضل ہے، امام ابو یوسفؒ نے کہا یہ غلط ہے، ابراہیم نے کہا پھر پیدل رمی کرنا افضل ہوگا، فرمایا یہ بھی غلط، ابراہیم نے عرض کیا کہ جو رائے صحیح ہو، اسے آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: جس رمی کے بعد کوئی اور رمی ہو، اس کو پیدل کرنا افضل ہے، اور جس

کے بعد کوئی اور رمی نہ ہو، اسے سوار ہوکر، ابراہیم وہاں سے اٹھے، اور امام صاحب کے گھر کے دروازہ ہی پر پہونچے تھے کہ اہل خانہ کے رونے کی آواز آئی، پہلے تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہوگیا ہے، یہی امام ابو یوسفؒ ہیں جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے سترہ ۱۷ سال تک اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہوگیا، تو تجہیز وتکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کو حوالہ کر کے درس میں شریک رہے، اور درس سے محرومی کو گوارا نہیں کیا (مناقب مکی: ۱/۲/۴۷)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیش گذرے ہیں جو امام بخاری اور امام مسلم کے اساتذہ میں ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا، بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے، اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتی (سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۴۵۸) احمد بن یحیٰ شیبانی (۲۰۰۔۲۹۱ھ) عربی لغت، ادب، گرامر اور قراءت وغیرہ کے بڑے نامی گرامی آدمی تھے، اور ثعلب کے نام سے مشہور تھے، ان کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے کہ کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں (الحث علی طلب العلم الخ للعسکری: ۷۷) امام ثعلب کا معمول تھا کہ راستہ چلتے بھی ہاتھ میں کتاب رہتی، اور مطالعہ کرتے جاتے، چنانچہ اسی طرح چل رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹکر دی، گڈھے میں گر پڑے اور ایسی چوٹ آئی کہ دوسرے ہی دن وفات ہوگئی۔

(وفیات الاعیان لابن خلقان: ۱/۱۰۴)

اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہلِ علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ سن کر اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام ابن جریر طبریؒ بہت ہی بلند پایہ، مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انہوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳ / ہزار اوراق میں ۲۸۳ھ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ھ میں فارغ ہوئے، یہ

دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا ۶ ؍ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، طبری کی یہ تفسیر ۱۱ ؍ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو یومیہ ۱۴ ؍ ورق یعنی ۲۸ ؍ صفحات کا اوسط ہوتا ہے۔

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب کیا گیا تو وہ سات سو درہم کی تھی، ابوریحان بیرونی کی وفات کے وقت اس زمانہ کے مشہور فقیہ ابوالحسن ولوالجی گئے، بیرونی نزع کی حالت میں تھے، اور سینے میں گھٹن محسوس کر رہے تھے، اس وقت علامہ ولوالجی سے ''جدات فاسدہ'' ونانی کے حق میراث کا مسئلہ پوچھا، ولوالجی کو رحم آیا اور کہنے لگے کہ اس وقت بھی آپ کو یہ فکر پڑی ہے؟ بیرونی نے کہا کہ دنیا سے اس مسئلے سے واقف ہو کر جانا بہتر ہے یا ناواقف ہو کر؟ ولوالجی نے مسئلہ کی وضاحت کر دی اور واپس ہوئے، کچھ ہی دور آئے تھے کہ رونے دھونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ علامہ بیرونی کا انتقال ہو گیا ہے۔

وقت کی حفاظت کرنے والے بزرگوں میں علامہ ابن عقیل بھی ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی سب سے اہم کتاب ''الفنون'' ہے، جس کے بارے میں بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی ۸ ؍ سو جلدیں تھیں، اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر جارج مقدسی مستشرق نے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ - ۱۹۷۱ء میں شائع کیا ہے، امام ابن جوزی تاریخ اسلام کے بڑے مصنفین میں ہیں، وہ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، جو چاہتے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والے سے بہت نالاں رہتے، اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اسی طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسب ضرورت کاغذ کاٹے جاتے، قلم تراش لیتے، اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے، اس کا نتیجہ تھا کہ بقول حافظ ابن رجب شاید ہی کوئی فن ہو، جس میں ابن جوزی کی کوئی کتاب نہ ہو، ابن جوزی کی تصنیفات پانچ سو سے اوپر ہیں، اور ان میں سے بعض بیس جلدوں اور بعض ۱۰ ؍ جلدوں پر مشتمل ہیں، ابن جوزی کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے جن قلموں سے حدیثیں تحریر کی تھیں، ان کے ڈھیر

سارے تراشے جمع ہوگئے تھے، انہوں نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے غسل کا پانی اسی سے گرم کیا جائے، چنانچہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی قلم کے تراشے بچے رہے۔

مشہور مفسر اور صاحب نظر امام رازی کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہوجاتا ہے، مشہور محدث علامہ منذری کے صاحبزادے رشید الدین (م ۶۴۳) کا انتقال ہوگیا، جوان کو بہت محبوب تھے، تو اپنے جواں مرد بیٹے کی نماز جنازہ خود پڑھائی، مدرسہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالہ کرکے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے، امام نوویؒ جیسا محدث اور صاحب علم سے کون ناواقف ہوگا، راستہ چلتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، اس کا نتیجہ ہے کہ صرف ۴۵ رسال کی عمر پائی، لیکن ہزارہا ہزار صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہل علم کے لئے حرز جاں ہیں۔

ابن النفیس میڈیکل سائنس کی یادگار شخصیتوں میں ہیں، جسم میں دوران خون کا نظام سب سے پہلے آپ ہی نے دریافت کیا، طب میں آپ کی کتاب ''الشامل'' تقریباً ۳۰۰ جلدوں میں ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا حال یہ تھا کہ سفر وحضر اور صحت و بیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد ابن قیم نے ان کی تصنیفات کی تعداد پر جو رسالہ لکھا ہے وہ خود ۲۲ رصفحات کا ہے، اخیر دور کے اہل علم میں علامہ شوکانی کا حال یہ تھا کہ روزانہ دس اسباق پڑھاتے، فتاویٰ بھی لکھتے، فریضۂ قضاء بھی انجام دیتے، اور اس کے ساتھ ساتھ ایک سو چودہ اہم تصنیفات آپ کی یادگار ہیں، اعلامہ شہاب الدین آلوسی (۱۲۱۷۔۱۲۷۰ھ) کا حال یہ تھا کہ روزانہ چوبیس اسباق پڑھاتے، افتاء کا کام بھی کرتے، اور اس کے ساتھ انہوں نے روح المعانی کے نام سے ایسی عظیم الشان اور مبسوط تفسیر لکھی ہے کہ جس کی پورے عالم اسلام نے داد دی ہے۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے صرف ۳۹ رسال کی عمر پائی، لیکن ان کی تصانیف ۱۱۰ رسے بھی زیادہ ہیں، اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرف آخر

ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے، مولانا عبدالحی حسنی نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے علماء سلف اور مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی نہایت اہم اور فاضلانہ تصنیف ''قیمۃ الزمن عند العلماء'' میں سلف صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات ملتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب وقت کی قدر جاننے اور اس کی قیمت پہچاننے کا نتیجہ ہے، جو لوگ وقت کو سستی اور بے قیمت شئی سمجھتے ہیں اور اس کی قدر دانی نہیں کرتے، وہ زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتے، اسلام نے وقت کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے تمام عبادات کو وقت سے جوڑ رکھا ہے، نمازوں کے اوقات مقرر ہیں، روزہ متعین وقت سے شروع ہوتا ہے، اور متعین وقت پر ختم ہوتا ہے، حج کے افعال بھی متعین ایام واوقات میں انجام دیئے جاتے ہیں، قربانی بھی متعین دنوں میں ہوتی ہے، زکوٰۃ میں بھی مال ہر ایک سال گذرنے کا وقت مقرر کیا گیا ہے، اور شریعت میں کتنے ہی احکام ہیں، جو وقت سے مربوط ہیں، لیکن افسوس کہ یہ امت اپنے وقت کو جس قدر ضائع کرتی ہے اور اس کو جتنا بے قیمت سمجھتی ہے، شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، مسلمان نوجوانوں کی یار باشی، ہوٹل بازی اور بے مقصد سیر وتفریح ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، بلکہ ضرب المثل بنتی جارہی ہے، شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبات میں جس بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ اوقات ضائع کئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دینی جلسوں اور اجتماعات میں بھی اوقات کی پابندی کے معاملہ میں جو بے احتیاطی روا رکھی جاتی ہے، وہ کس قدر افسوس ناک ہے!

آیئے! نئی صدی اور نئے ہزار سالہ کا استقبال کرتے ہوئے ہم عزم مصمم کریں، کہ وقت کی پوری قدر دانی کریں گے، اور اپنے ایک ایک لمحہ کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اگر ہم سب اس کا عزم کریں اور اپنے آپ کو اس پر قائم رکھیں تو کون ہے جو اس امت مرحوم کی سربلندی کو روک سکے؟؟

تہذیبی ارتداد

ایمان کچھ حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے، جن میں سب سے اہم اللہ پر، رسول پر، اللہ کی کتاب پر اور آخرت پر ایمان لانا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے صرف ایمانیات ہی پر زور نہیں دیا، بلکہ عبادات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں میں اپنی ہدایات سے سرفراز فرمایا اور پوری قوت اور تاکید کے ساتھ امتِ مسلمہ کو ان تعلیمات پر کار بند رہنے کی تلقین فرمائی، کیوں کہ کسی قوم کے لئے اپنے تشخص کو برقرار رکھنا صرف عقیدہ کے ذریعہ ممکن نہیں، بلکہ تہذیب و معاشرت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ہیں جو آج ہندوستان کا حصہ بن چکی ہیں، وہ اعتقادی اور نظریاتی اعتبار سے اپنا الگ وجود رکھتی ہیں، لیکن انہوں نے دوسری قوموں سے سماجی اور تہذیبی فاصلہ قائم نہیں رکھا، رہن سہن، لباس و پوشاک، خورد و نوش، شادی بیاہ، خوشی اور غم کی تقریبات وغیرہ میں انہوں نے اپنا رنگ برقرار نہیں رکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا تشخص کو کھو دیا، اور آج ہندوستان ان کو اپنا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی تشخص سے محروم کر دیا جائے، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی سماجی انفرادیت سے محروم ہو جاتی ہے، تو وہ آہستہ آہستہ دین و مذہب ہی سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے، اور اگر وہ کسی دوسرے مذہب کے دائرہ میں داخل نہ ہو، جب بھی الحاد و انکار کا راستہ اختیار کر لیتی ہے، یا کم سے کم وہ مذہب کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کر لیتی ہے، غیر سنجیدہ رویہ سے مراد یہ ہے کہ مذہب سے اس کی کوئی ذہنی اور فکری وابستگی نہیں ہوتی، البتہ وہ اسے ایک خاندانی روایت سمجھ کر ڈھوتی رہتی ہے، مذہبی اقدار پر اس کا کوئی یقین نہیں ہوتا البتہ

خاندانی روایت کے تحت خاص خاص مذہبی تقریبات اور تہواروں میں اس کی شرکت ہو جاتی ہے اور گاہے گاہے کچھ عبادت کی توفیق میسر آجاتی ہے، لیکن حلال وحرام، معاملات، کسبِ معاش اور سماجی زندگی میں مذہب کے لئے کوئی خانہ نہیں ہوتا، اسی کیفیت کو میں نے ''تہذیبی ارتداد'' سے تعبیر کیا ہے۔

یہ ارتداد دبے پاؤں آتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر داخل ہوتا ہے، اور ایسا میٹھا زہر بن کر حلق سے اترتا ہے کہ زہر کھا کر بھی انسان تحسین وآفریں کے کلمات کہہ اٹھتا ہے، یہ ارتداد نہ سوئے ہوؤں کو جگاتا ہے، نہ غافلوں کو متوجہ کرتا ہے، نہ فکر مند دِلوں میں تلاطم پیدا کرتا ہے، نہ قلب وذہن کو جھنجھوڑتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے سماج میں کوئی ہلچل پیدا ہوتی ہے، یہ اس بیماری کی طرح ہے، جو بہ ظاہر ہلکی ہو، لیکن بہ تدریج انسان کو موت کی طرف لے جائے، اور یہ ایسا نشہ ہے کہ مقتول خود قتل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، اس لئے اس ارتداد کو خوب سمجھنے، اس کے اسباب پر نظر رکھنے اور اس کے نتائج وعواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت پوری دنیا جو بنیادی طور پر یہودی دماغ اور یہودی منصوبہ بندی کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے، اور اس کے اشارہ چشم وابرو پر رقصاں ہے، اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ اگر مسلمانوں کو کھلے عام مرتد نہیں کیا جاسکتا، تو ان پر ایسی زبردست تمدنی یلغار کردی جائے کہ وہ خوشی خوشی تہذیبی ارتداد کو قبول کرلیں، اور اس مقصد کے لئے اتنے طاقتور حربے استعمال کئے جارہے ہیں کہ بہ ظاہر اس سے زیادہ دور رس اور قوی و مؤثر کوئی اور ذریعہ نہیں، ٹی، وی نے اس رفتار کو بہت تیز کردیا ہے، اور ڈش انٹینا کی وجہ سے مسلمان اور مشرقی ملکوں میں ایسے فحش پروگرام کا ایک طوفان سا آگیا ہے کہ جن کا اسلام اور مسلم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، اب انٹرنیٹ نے اس تہذیبی یلغار کو مزید طاقت ور بنادیا ہے، اور ایک ایسی چیز جو بہترین تعمیری اور تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال ہوسکتی تھی، وہی چیزیں انتہائی تخریبی اور غیر اخلاقی مہم جوئی کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں، اب جو نئی معاشی اصلاحات کا عمل پوری دنیا میں جاری ہے، اور ''عالمیانے''

کی نئی اصطلاح شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجہ میں مغربی صحافت، مغربی لٹریچر، اور مغربی کمپنیوں کے وساطت سے مخرب اخلاق غذائی اور غیر غذائی اشیاء کی آمد کا ایک سیل بلا جاری وساری ہے۔

اس وقت اس منصوبہ کے نقوش مشرقی علاقوں میں اور مسلم ملکوں میں نہایت واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں، ادھر چند سالوں میں عرب اور اسلامی ممالک میں خواتین کے لباس اس قدر تبدیل ہوگئے ہیں کہ امریکی ویورپی ملبوسات اور عرب خواتین کے ملبوسات میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، بہت سے عرب اور مسلم ممالک وہ ہیں جہاں عوام تو کجا؟ علماء بھی داڑھی نہیں رکھتے، ڈاڑھی جسے کسی زمانہ میں صلاح وتقویٰ اور شرافت واعتاد کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب دہشت گردی اور شدت پسندی کی پہچان سمجھی جاتی ہے، مجھے ایک بار حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جس کے استقبالیہ پر ایک دین دار، خوش شکل، مصری نوجوان لڑکا بیٹھا کرتا تھا، اور اس کے چہرے پر داڑھی بہت بھلی محسوس ہوتی تھی، میں اکثر عشاء کے بعد مسجد سے واپس ہوتے ہوئے دو چار منٹ اس کے پاس بیٹھ جاتا، کبھی مذہب پر، کبھی عربی زبان کے بارے میں، اور کبھی مصر میں مسلمانوں کے حالات کے متعلق اس سے گفتگو ہوتی، وہ بہت برجستہ اور بہت ہی بلیغ اور سہل عربی زبان میں گفتگو کرتا، اور بہت ہی اخلاق ومروت سے پیش آتا، اس لئے اس نوجوان سے گفتگو کرتے ہوئے لطف سا آتا تھا، میں نے ایک دن کہا کہ مصر کے لوگ اکثر داڑھی نہیں رکھتے، لیکن تم نے جو یہ داڑھی رکھی ہے، یہ بہت اچھی بات ہے، اس سے تمہارے چہرے پر ایک نورانیت اور معصومیت سی معلوم ہوتی ہے، میری یہ بات سن کر وہ افسردہ سا ہوگیا، اور اس نے سنجیدہ ہوکر کہا کہ شیخ آپ سچ کہتے ہیں، میں داڑھی رکھنا چاہتا ہوں، لیکن مصر میں داڑھی رکھنے میں بڑی مشکلات ہیں، ہمارے یہاں داڑھی رکھنے والوں کو باضابطہ اپنا رجسٹریشن کرانا پڑتا ہے، میں جب پہلی بار داڑھی رکھ کر اپنے وطن گیا تو مجھے سات آٹھ گھنٹہ ایرپورٹ پر تفتیش کے لئے روک لیا گیا، اور میرے پورے اہلِ خاندان کو طلب کیا گیا، جن میں میری ماں اور بہنیں بھی تھیں، اور ان سے بھی کافی دیر تک تفتیش کی گئی،

اس کے بعد سے مجبوراً میں مصر جاتے ہوئے اپنی داڑھی صاف کرالیتا ہوں، اور واپسی کے بعد پھر داڑھی رکھ لیتا ہوں ـــــ غور کیجئے! کیسا غضب ہے کہ ایک مسلمان ملک میں مسلمانوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہ ہو، کاش یہ اسرائیل ہی سے سبق حاصل کرتے جہاں یہودی مذہبی طبقے کے داڑھی رکھنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، جب مسلمان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ حال ہے تو ان مسلمانوں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو مغربی ثقافت کی آغوش میں محوِ غفلت ہیں، اور اسے دنیا ہی میں جنت تصور کرتے ہیں۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی ممالک نے عرب اور اسلامی ممالک اور مختلف علاقوں میں بسنے والے تارکین وطن مسلمانوں کے لئے نہایت فراخ دلی کے ساتھ اپنا دامن دل کھول رکھا ہے، انہیں شہریت دی جاتی ہے، انہیں ملازمت اور مزدوری کے مواقع ملتے ہیں، اور انہیں اپنے ملکوں سے بڑھ کر شہری حقوق دے دیئے جاتے ہیں، تارکین وطن خوش ہیں کہ انہیں پھلنے، پھولنے اور آگے بڑھنے کے بھرپور مواقع ہاتھ آرہے ہیں، لیکن انہیں نہیں معلوم کہ وہ ان ممالک کے ہاتھوں اپنی اگلی نسلوں کا سودا کر رہے ہیں، چنانچہ لاکھوں عرب اور فلسطینی جو پچاس سال پہلے امریکہ گئے، اب ان میں اپنے مسلمان ہونے کی پہچان بھی باقی نہیں رہی، مذہبی شعور رخصت ہوا، رہن سہن بدل گیا، زندگی کے طور وطریق تبدیل ہوگئے، یہاں تک کہ ان کے نام میں بھی مسلمانیت کی کوئی بو باقی نہیں رہ گئی ہے، حالاں کہ ان کے آباء واجداد راسخ العقیدہ مسلمان اور عرب تہذیب کے علمبردار بن کر یہاں آئے تھے، اگر آج ان گذری ہوئی روحوں کو دوسری زندگی دے دی جائے تو شاید ہی وہ خود اپنی نسل اور اپنی اولاد کو پہچان سکیں، یہ ہے اس تہذیبی ارتداد کا اثر، جو بہ تدریج افراد واقوام کو فطری اور اعتقادی ارتداد کی طرف لے جاتا ہے!

اسی پس منظر میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اور مماثلت اختیار کی، وہ ان ہی میں سے ہوگیا، اس روایت کو امام ابو داؤد نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور امام طبرانیؒ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے اس حدیث کو "حسن" یعنی مقبول قرار دیا ہے، (الجامع الصغیر، حدیث نمبر:

۸۵۹۳) رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں عقیدۂ و ایمان میں غیر مسلموں سے مماثلت مراد نہیں ہے، کیوں کہ جو شخص عقیدہ کے اعتبار سے غیر اسلامی فکر اختیار کرلے، وہ تو پہلے ہی سے مسلمان نہیں ہے، اس کے غیر مسلموں سے مشابہت اختیار کرنے کے کیا معنی؟ لہٰذا اس حدیث میں عملی اور سماجی زندگی میں غیر مسلموں کے تشبہ سے منع فرمایا گیا ہے، اور مختلف مسائل میں حضور ﷺ کی تشریح وتوضیح نے اس نکتہ کو مزید واضح کیا ہے، مثلاً آپ ﷺ نے سورج نکلنے، سورج ڈوبنے، اور سورج کے نصف آسمان پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ یہی اوقات عام طور پر مشرک اور آفتاب پرست قوموں کی عبادت کے رہے ہیں، جو قومیں سورج کی پرستار ہیں، وہ انہی اوقات میں سورج کی پوجا کرتی ہیں، اس لئے ان اوقات میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا۔

روزہ میں حکم دیا گیا کہ افطار جلدی کیا جائے، افطار میں تاخیر نہ کی جائے، کیوں کہ افطار میں تاخیر اہلِ کتاب کا طریقہ ہے، یومِ عاشوراء کے ساتھ مزید ایک روزہ رکھنے کا حکم ہوا، کیوں کہ اس دن یہود بھی روزہ رکھا کرتے تھے تا کہ مسلمان اپنی عبادت میں ان سے ممتاز رہیں، حج میں بہت سے ایسے افعال جن کو مشرکین بہت اہمیت دیتے تھے، اسلام نے ان کو ختم کیا، یا ان میں تبدیلی پیدا کی، پھر یہی ہدایات آپ نے وضع قطع اور لباس و پوشاک کے بارے میں بھی دی، مجوسی داڑھی منڈایا کرتے تھے، بعض قومیں داڑھی بڑھایا کرتی تھیں، آپ نے ان دونوں باتوں سے منع فرمایا، اہلِ ایران اظہار فخر کے لئے ٹخنوں سے نیچے کپڑے پہنتے تھے، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا، اہلِ مکہ سر میں مانگ بھی نکالا کرتے تھے، چنانچہ مکی زندگی میں آپ نے سیدھے بال رکھنے کو پسند فرمایا تا کہ مسلمان ان سے ممتاز رہیں، مدینہ میں یہود سیدھے بال رکھتے تھے، تو وہاں آپ نے مانگ نکالنے کو پسند فرمایا، پھر جب تمام عرب نے اسلام قبول کرلیا، تو آپ ﷺ نے دونوں طرح بال رکھنے کی اجازت مرحمت فرمادی، اسی طرح عرب یا تو صرف ٹوپی پہنتے تھے، یا صرف عمامہ باندھتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو ابتداءً ہدایت دی تھی کہ وہ ٹوپی اور

عمامہ دونوں کا استعمال کریں، تاکہ ان کے اور مشرکین کے درمیان امتیاز باقی رہے، بعد کو جب اہلِ عرب ایمان لے آئے، تو آپ نے صرف ٹوپی یا صرف عمامہ کے استعمال کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔

دین کا یہ مزاج کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے دوسری اقوام سے ممتاز اور متشخص رہنا چاہئے، فقہاء نے بھی اپنے اجتہاد واستنباط اور قانون شرع کی تشریح وتوضیح میں ہمیشہ اس کو ملحوظ رکھا ہے، اور لباس و پوشاک، خورد ونوش، عبادات، یہاں تک کہ عبادت گاہوں کے طرزِ تعمیر وغیرہ ہر مرحلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ مسلمان ایک امتیازی شان کے حامل ہیں، اور وہ اپنے دین و مذہب اور تہذیب وتمدن میں دوسری قوموں سے ممتاز اور متشخص رہیں، کیوں کہ جب کوئی قوم اپنی تہذیب سے محروم ہو جاتی ہے، اور تمدن وثقافت کے میدان میں دریوزہ گری پر اتر آتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے فکر وعقیدہ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

ہندوستان میں اس وقت سنگھ پریوار کی جانب سے اس بات کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان نماز پڑھیں، مسجدوں کو جائیں، عید بقرعید وغیرہ کرلیا کریں، لیکن اسلامی تہذیب کو خیر باد کہہ دیں، اس کے لئے بظاہر معمولی لیکن نتائج کے اعتبار سے دور رس اقدامات کئے جارہے ہیں، نصاب تعلیم میں تبدیلی لائی جارہی ہے، ہندوازم کو ایک نظریۂ وعقیدہ کے بجائے قومی ثقافت کے روپ میں پیش کیا جارہا ہے، اسکولوں میں دیویوں، دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی ہیں، ہندو مذہبی تقریبات میں مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے، اور انہیں شریک کیا جاتا ہے، اور ہمارے مسلمان نوجوان دیوالی اور ہولی میں ذوق وشوق کے ساتھ شریک ہورہے ہیں، مردوں اور عورتوں کے لئے دھوتی نما پائجامہ بنائے جارہے ہیں، بہت سے علاقوں میں مسلمان عورتیں ہندوانہ رسم ورواج کے مطابق سندور لگاتی، یا کالی پوت کے ہار پہنتی ہیں، بین مذہب شادی بیاہ کا رواج بھی بڑھ رہا ہے، بعض جگہ مسلمان بچوں کے ہندی نام بھی رکھے جارہے ہیں، ٹی وی پروگراموں کا ہندو کرن کیا جارہا ہے اور ہندو دیوتاؤں اور فرمانرواؤں کو قومی ہیرو کے روپ میں پیش کیا

جا رہا ہے، اور اس طرح کی بہت سی چیزیں ہیں، جو ہمارے سماج میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہی ہیں، آج ہم ان کے قدموں کی آہٹ سننے سے قاصر ہیں، لیکن اگر ہم نے حالات کو محسوس نہیں کیا تو مستقبل میں اس سے ناقابلِ تلافی نقصان کا اندیشہ ہے، اس لئے اس وقت اس تہذیبی ارتداد کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو پوری قوت کے ساتھ روکنے کی ضرورت ہے، کہ یہ محض سیاسی وثقافتی مسئلہ نہیں، بلکہ اپنے دوررس اثرات کے اعتبار سے ہمارے ملی بقا اور دینی تحفظ کا مسئلہ ہے !

(.................)

کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟

مسلمان اس وقت ہندوستان میں ہر چہار جانب سے نوع بہ نوع فتنہ میں گھیرے جا رہے ہیں، اسلام سے ان کی محبت اور ہزار ابتلاؤں کے باوجود ایمان پر ان کی استقامت فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بنی ہوئی ہے، جہاں مسلمانوں کی معیشت منصوبہ بند طور پر کمزور کی جا رہی ہے، تعلیم کے راستے محدود کئے جا رہے ہیں، مسلم تاریخ پر سیاہی پھیرنے اور مسلمانوں کو قومی سطح پر احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش جاری ہے، مسلمانوں کے تاریخی نقوش یا تو مٹائے جا رہے ہیں، یا تاریخی حقائق میں تبدیلی عمل میں لائی جا رہی ہے، اور مسلمان تہذیب وتمدن کو اکثریتی تہذیب میں جذب کرنے کی کوشش جاری ہے، وہیں ایمان وعقیدہ اور دین ومذہب کے پہلو سے بھی ان کو ہدف بنایا جا رہا ہے، اور ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے جو مسلمانوں کے ایمان ویقین کے سوداگر اور ان کے دین کے غارت گر ہوں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی قادیانیت ہے، جو اپنے آپ کو احمدی مسلمان کہتے ہیں، حالاں کہ ان کا ایمان سے محروم اور دائرۂ اسلام سے باہر ہونا ایک متفق علیہ حقیقت ہے، مرزا غلام احمد قادیانی پنجاب کے ایک شہر قادیان میں پیدا ہوئے، یہ وہ وقت تھا کہ انگریز ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے، اور اہل وطن کا جذبۂ جہاد اپنے شباب پر تھا، انگریز چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی صف سے کچھ ایسے لوگ کھڑے ہوں جو دین ومذہب کا لبادہ اوڑھ کر جذبۂ جہاد کی اس آگ کو بجھائیں اور مسلمانوں کو ذہنی انتشار سے دوچار کر دیں تاکہ وہ باہمی مسائل ہی میں الجھے رہیں، اور انگریزوں کے خلاف ان کی طاقت متحد باقی نہ رہ سکے، اسی پس منظر میں انگریزوں کی شہ پر مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے

مجدد ہونے کا پھر امام مہدی ہونے کا اور اس کے بعد مسیح موعود ہونے کا دعوی کر دیا، مگر مرزا صاحب کسی عہدہ و منصب پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ ایک زمانہ میں تو خود ہی امکان نبوت کی شدومد سے نفی کرتے تھے، لیکن پھر خود ہی نبی ہونے کا دعویٰ بھی پیش کر دیا، اور نبوت ہی کجا؟ مرزا صاحب نے دعوے تو خدا اور مثلِ خدا تک ہونے کے کئے ہیں، مرزا صاحب کے دعاوی اتنے متضاد اور مختلف ہیں کہ کسی ایسے آدمی سے ان کا صدور کا تصور دشوار ہے جو دماغی اور عقلی طور پر متوازن ہو، مرزا صاحب نے جہاد کے منسوخ ہونے کا اعلان بھی کر دیا اور امت میں انتشار اور بے محل ان کی قوت کے ضائع ہونے کا سروسامان بھی کیا۔ اور یقیناً ان کے اس طرزِ عمل نے انگریزوں کو فائدہ پہونچایا، چنانچہ مرزا صاحب نے اپنے آپ کو "حکومت انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا" (برطانیہ کا لگایا ہوا پودا) قرار دیا ہے، حکومت برطانیہ کی مہربانیوں اور ملکہ برطانیہ کی عنایتوں پر مرزا صاحب جس طرح رطب اللسان ہیں، درباری شاعروں کی خوشامد اور تملق بھی اس پر ہزار بار قربان ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے بوئے ہوئے اس پودے کو تناور بنانے میں اپنی طاقت کی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد اولاً پاکستان کی نوخیز ریاست اس فتنہ کا ملجاء و ماوی بنی، جب وہاں سے اس کی بیخ کنی ہوئی تو برطانیہ اور اسرائیل کو اس نے اپنا مرکز بنایا، اس وقت صلیبی اور صیہونی طاقتیں اس کی ناصر و مددگار ہیں، بدقسمتی سے ادھر ہندوستان میں بھی انہوں نے اپنی شرانگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کا دامن پھیلا دیا ہے، اور فرقہ پرست طاقتوں سے اپنا گٹھ جوڑ قائم کر لیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ دور دراز دیہاتوں کے جاہل و ناواقف مسلمان اپنی جہالت اور ناآگہی کی وجہ سے ان کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں۔

اگر کوئی شخص علی الاعلان کفر کی طرف بلائے اور اسلام سے بغاوت کی دعوت دے تو انشاء اللہ کوئی مسلمان ایسی مذموم دعوت پر لبیک نہیں کہہ سکتا، لیکن جب کوئی فتنہ اسلام کا لباس پہن کر اور دین حق کا روپ بھر کر سامنے آتا ہے تو یقیناً جو لوگ ناواقف ہوتے ہیں اور

ان کا علم سطحی ہوتا ہے وہ اس فتنہ میں گرفتار ہوکر رہ جاتے ہیں، اور ان کے تئیں علماء دین اور قائدین امت کی ذمہ داریاں بہت ہیں، اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آندھرا پردیش میں ورنگل، نلگنڈہ، کھمم، وشاکھاپٹنم، سریکاکولم اور وجے نگرم وغیرہ کے اضلاع کے دور دراز کے دیہات قادیانیت کے مسموم فتنہ سے بُری طرح متاثر ہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں دیہاتی ناخواندہ مسلمان ہیں، جو ان کے دام تزویر میں آچکے ہیں، مالی تحریص، مساجد و مکاتب کے نام سے نام نہاد عبادت گاہ اور درس گاہ کی تعمیر اور اسلام کے نام پر دھوکہ دہی کے ذریعہ ان مسلمانوں کے ایمان کا سودا کیا جارہا ہے۔

یہ فتنہ تمام فتنوں سے زیادہ سنگین اور یہ مصیبت تمام مصیبتوں سے سوا ہے، یہ ایسی صورتِ حال ہے جو ہر مسلمان کو تڑپا دے، ہر صاحب ایمان کی کروٹوں کو بے سکون کر دے، اور جس سے سیاست کے ہر دردمند کی آنکھیں بے خواب ہوجائیں، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب پہلی بار جھوٹی نبوتوں کے فتنوں نے سر اٹھایا اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ختم نبوت پر حملہ ہوا، تو اس نے صحابہ کو بے قرار کردیا، یہ زمانہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا، خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جوش اور غیرت دینی کا حال یہ تھا کہ ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص ساتھ نہ ہو تو ابوبکر تنہا جہاد کرے گا (رضی اللہ عنہ) یہ بات ضرب المثل بن گئی کہ جب کوئی فتنہ ارتداد اٹھتا اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے والے لوگ نہیں رہتے تو کہا جاتا کہ یہ ایسا فتنہ ارتداد ہے کہ جس کے لئے کوئی ابوبکر موجود نہیں، ردۃ و لا ابا بکر لھا — اگر اہلِ بصیرت دل کے کان کھول کر سنیں اور عبرت و موعظت کی نگاہوں سے دیکھیں تو شاید وہ نبوت محمدی ﷺ کو اپنی طرف متوجہ پائیں گے، اور اس صدائے درد کو سنیں گے کہ ہائے میری حفاظت کے لئے کوئی ابوبکر موجود نہیں؟؟

ان حالات میں ضرورت ہے کہ مسلمان مسلک و مشرب کے اختلاف سے پرے اٹھ کر اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوں اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر مسلمانوں کو اس ایمان لیوا عفریت سے بچائیں۔ اس سلسلہ میں چند تدابیر جو ذہن میں آتی ہیں، وہ ذکر کی جاتی ہیں :

۱۔ مساجد کے خطباء جمعہ کے اردو بیانات میں ختم نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھائیں اور وقفہ وقفہ سے بار بار اس کا ذکر کریں تا کہ عام مسلمان اس سے آگاہ ہوسکیں۔

۲۔ سیرۃ النبی کے جلسوں میں مقررین حضرات اس موضوع پر بیانات کریں اور عوام کو اس کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ کریں۔

۳۔ رسائل و جرائد اور اخبارات میں بار بار اس موضوع پر مضامین شائع کئے جائیں، اردو زبان کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تلگو رسائل میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے۔

۴۔ جو طلبہ درسگاہوں میں پڑھتے ہیں، خواہ وہ درس گاہیں مسلموں کے زیرِ انتظام ہوں یا غیر مسلموں کے، ان میں اس موضوع پر لکچرس رکھے جائیں۔

۵۔ دینی مدارس میں اس موضوع کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شریک نصاب کیا جائے۔

۶۔ عام مسلمانوں کے لئے مختلف علاقوں میں اور خاص کر متأثرہ مقام کے قرب و جوار میں ایک روزہ، دوروزہ، سہ روزہ تربیتی کیمپ رکھا جائے اور ان کو ان کے ذہنی معیار کے اعتبار سے اس مسئلہ کے مالہٗ وماعلیہ سے آگاہ کیا جائے۔

۷۔ مختلف زبانوں میں ختم نبوت اور قادیانیت کے مسئلہ پر چھوٹے چھوٹے مختصر، آسان اور مدلل رسائل مرتب کئے جائیں، اور انہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچایا جائے۔

۸۔ جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ بھی اس فتنہ کی شناعت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔

۹۔ ایسے دیہات جو قادیانیت سے متأثر ہو چکے ہیں یا جو متأثر تو نہیں ہوئے لیکن وہاں کوئی مدرسہ، مکتب، مسجد یا کوئی عالم دین موجود نہیں ہے، وہاں مکاتب قائم کئے جائیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ مختلف تنظیمیں، جماعتیں

اور بڑے مدارس ان دیہاتوں کو اپنے اوپر تقسیم کرلیں، مثلاً پانچ سو دیہات متاثر ہیں یا ان کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے تو حیدر آباد سے مختلف تنظیمیں اور مدارس ان میں سے دو، چار، پانچ دیہاتوں میں مکتب قائم کریں اور وہی اس کے ذمہ دار ہوں، اگر کسی مدرسہ میں دس مدرس رکھنے کی صلاحیت ہے تو پانچ مدرس مرکز میں رکھ لے، اور پانچ مدرس کے ذریعہ پانچ بستیوں میں مکاتب قائم ہو جائیں، اس طرح دیہات کے بہت بڑے علاقے کا احاطہ کیا جا سکے گا۔

۱۰۔ جن مدارس میں دارالاقامہ قائم ہے وہ اپنی گنجائش کا کچھ حصہ ان دیہاتوں کے لئے مخصوص کردیں، مثلاً کسی مدرسہ میں دو سو طلبہ کی گنجائش ہے تو سو طلبہ ان دیہاتوں کے اس طرح رکھے کہ بیس دیہاتوں سے پانچ پانچ طلبہ لائے جائیں اور ان کو یہاں تعلیم دی جائے، تاکہ وہ اپنے گاؤں میں مسلمانوں کی دینی ضروریات کو پوری کرسکیں، اس طرح اگر چند مدرسے باہمی ارتباط کے ساتھ طلبہ کو لائیں تو چند سال میں ہزاروں دیہات تک علم کی روشنی پہونچائی جا سکتی ہے۔

۱۱۔ اس سلسلہ میں بہت اہم رول تبلیغی جماعت ادا کرسکتی ہے، جماعتوں کا رخ زیادہ سے زیادہ ان دیہاتوں کی طرف کیا جائے، وہاں سے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کی جائے، ایسے علاقوں میں خاص طور پر ضلعی سطح کے اجتماعات رکھے جائیں، اس سے بڑا نفع ہوگا

۱۲۔ دینی مدارس بھی اگر اپنے فنڈ کا کچھ حصہ اس کام کے لے مخصوص کرلیں اور ہر ماہ دو، تین دنوں کا دورہ ان علاقوں میں وفد کی صورت میں کریں، سفر کے اخراجات تو خود برداشت کریں ہی، مقامی لوگوں سے بھی خورد ونوش کی صورت میں کچھ حسن سلوک کریں تو اس کا بھی بڑا فائدہ ہوگا، اور یہ بھی سنت نبوی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو ہاشم کو دعوت اسلام دینے کے لئے کھانے ہی

پرتو مدعو فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کا عظیم فتنہ ہے، اور اس کے مقابلہ کے لئے سوز صدیق کی ضرورت ہے، حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ہم سے سرگوش ہے کہ کیا اس ارتداد کے لئے کوئی ابوبکر نہیں؟؟

(۴؍فروری ۲۰۰۰ء)

اخوت اسلامی کا فقدان

اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو اخوت اور بھائی چارہ کے رشتہ سے باندھ دیا ہے، مسلمان دنیا کے کسی بھی گوشہ میں ہو، مغرب میں یا مشرق میں شمال میں یا جنوب میں، گورا ہو یا کالا، مالدار ہو یا غریب، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو یا معمولی مزدور، اور بڑا ہو یا چھوٹا، وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تمام اہلِ ایمان بھائی بھائی ہیں، انما المومنون اخوة (الحجرات: ۱۰) یہ ایمانی رشتہ رنگ ونسل، علاقہ و وطن، زبان اور خون کے رشتوں سے بڑھ کر ہے، یہ رشتہ ہمیں ایک آفاقی اور عالمگیر خاندان کا رکن بنا دیتا ہے، یہ ہمیں رشتہ و تعلق کے محدود دائرہ سے نکال کر عالمگیر وسعت میں لے آتا ہے۔

اسی رشتہ نے حبش کے بلال اور روم کے صہیب، فارس کے سلمان، اسرائیلی نسل کے عبداللہ بن سلام، بنو ہاشم کے علی و عباس اور دوسرے عرب کے ابوبکر و عمر وغیرہ کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا، یہ ایک دوسرے پر خون چھڑکنے والے، اور باہم خودمٹ کر دوسروں کو بچانے والے لوگ تھے، یہ اسلامی اُخوت ان کے ذہن وفکر اور دل و دماغ پر اس قدر حاوی تھی کہ یہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلانے اور خود پھٹے پرانے کپڑے پہن کر دوسروں کو اچھے کپڑے پہنانے میں خوشی محسوس کرتے تھے، یؤثرون علی انفسھم و لو کان بھم خصاصة (الحشر: ۹)۔

مسلمانوں کے لئے ایمان کے بعد اس اخوت ایمانی کو قائم رکھنا سب سے اہم ضرورت ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ اس رشتہ کو تازہ فرمانے کی سعی کی، آپ ﷺ

نے فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو ایک مسلمان دوسرے پر ظلم کرسکتا ہے، نہ اسے چھوڑ سکتا ہے، جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آتا ہے، اللہ اس کی ضرورت میں کام آتے ہیں، جو کسی مسلمان سے مصیبت کو دور کرتا ہے، اللہ قیامت کے دن اس کی مصیبت کو دور فرماتے ہیں، اور جو کسی مسلمان کی عیب پوشی کرتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیب کو چھپائیں گے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰) اس ارشاد میں آپ ﷺ نے اسلامی اخوت کے پانچ تقاضوں کو بیان فرمایا ہے، اول یہ کہ وہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرے، دوسرے یہ ایک دوسرے کے ناصر و مددگار ہوں، اور اپنے بھائی کو حالات کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دے، تیسرے اپنے بھائی کی ضرورت میں کام آئے، چوتھے اس پر کوئی مصیبت آئی ہو تو اُسے دُور کرنے میں معاون و مددگار بنے، پانچویں اگر کسی مسلمان سے غلطی یا گناہ ہو جائے تو اس پر پردہ رکھنے کی کوشش کرے اور اُسے رسوائی سے بچائے۔

آپ ﷺ نے اس امت کے باہمی تعلق کو بڑی مؤثر اور معنی خیز مثالوں سے سمجھایا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ باہمی محبت اور تعلق میں اہلِ ایمان کی مثال ایک جسم کی سی ہے، کہ اگر ایک عضو بیمار ہو جائے، تو پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے، (بخاری، حدیث نمبر: ۶۰۱۱، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۶)، اس تمثیل کی معنویت پر غور کیجئے، جسم کے تمام اعضاء یکساں اہمیت اور حیثیت کے حامل نہیں ہوتے، دماغ پورے جسم کا بادشاہ ہے، اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر جسم کا ہر ہر انگ کام کرتا ہے، اور ہر صلاحیت متحرک ہوتی ہے، قلب پورے بدن کے لئے پاور ہاؤس ہے، اگر یہ کسی حصے کو خون کی سپلائی چھوڑ دے، تو لمحوں میں اس حصہ کی موت واقع ہو جائے گی، پھر دوسرے اعضاء میں بھی کچھ زیادہ اہم ہیں، اور کچھ کم، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ اگر انگلی کو تکلیف ہو تو دل و دماغ یہ سوچے کہ ایک حقیر عضو کے لئے ہم کیوں مبتلائے رنج ومحن ہوں، اور پاؤں یہ نہیں سوچتا کہ تکلیف انگلی کی ہے، ہم کیوں دواخانہ کا چکر لگائیں؟ یہاں تک کہ اگر ناخن بھی ضرورت سے زیادہ کٹ جائے تو پورا جسم اس کی کسک کو

محسوس کرتا ہے، حد یہ ہے کہ بال جو ہیں ہی کاٹنے کے لئے، جس کے کٹنے سے جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا، وہ بھی انسان کو محبوب ہوتے ہیں، تو جیسے جسم کا ہر عضو، دوسرے کے غم میں شریک ہے، نہ اس میں رنگ کا فرق مانع ہے، نہ کسی عضوء کا کم اہم ہونا رکاوٹ ہے، اسی طرح پورا ''اسلامی خاندان'' ایک دوسرے کے لئے لائق محبت ہے، کوئی مسلمان غریب ہو، ان پڑھ ہو، کسی اور مسلک کا حامل ہو، کسی دوسری جماعت اور تنظیم سے تعلق رکھتا ہو، کسی اور علاقہ یا کسی اور ملک کا رہنے والا ہو، محض اس فرق کی وجہ سے اخوتِ اسلامی کی آگ بجھ جائے، اور انسان اپنے بھائی کے لئے محبت کی شبنم بننے کے بجائے نفرت کا شعلہ بن جائے، یہ یقیناً ایمان کی کمزوری کی بات ہے، جس شخص کا ایمان جس قدر قوی ہوگا، اسلامی اخوت کا جذبہ اسی قدر اس میں موجزن ہوگا، اور حمیت ایمانی جتنی کم ہوگی، تعصبات اور تنگ نظریاں اسی قدر اس کے سینہ کو اپنے لئے پناہ گاہ بنائیں گی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس اسلامی رشتہ کو ایک اور مثال سے سمجھایا، آپ نے فرمایا: یہ پوری امت ایک عمارت کے درجہ میں ہے، جیسے عمارت کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، اسی طرح اس قصرِ اسلامی کی ہر اینٹ دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہے، **المومن للمومن كالبنيان يشد بعضه بعضا** (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۵) یہ مثال بھی بڑی ہی معنی خیز اور چشم کشا ہے، عمارت کے تمام اجزاء قوت اور اہمیت کے اعتبار سے ایک درجہ کے نہیں ہوتے، بنیاد کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، پھر ستون ہیں، اس کے بعد چھت ہیں، دیواریں اور فرش بھی عمارت کا حصہ ہیں، عمارت کا ایک حصہ وہ ہے جو لوگوں کے سر پر سایہ فگن ہے، اور ایک حصہ وہ ہے جو اس کے قدموں کے نیچے روندا جاتا ہے، بنیاد کے پتھر نظر نہیں آتے، اور زیبائش و آرائش کے لئے کھڑے کئے گئے گنبد اور مینار دُور سے دعوتِ نظارہ دیتے ہیں، بنیاد اپنے آپ کو نیچے دبا کر دوسروں کو سر بلند کرتی ہے، یہی حال اس اُمت کے افراد کا ہے، کوئی زیادہ اہم ہے اور کوئی کم اہم، کسی نے ایک کام کو سنبھال رکھا ہے، کسی نے دوسرے کام کو، کسی نے خود کو گمنامی کے غار میں

دفن کر کے دوسروں کو سر بلند کر رکھا ہے، لیکن سب ایک دوسرے کے لئے معاون و مددگار بھی ہیں، اور ضرورت بھی، اگر دیوار کی ایک اینٹ نکال دی جائے، تو پوری دیوار کمزور ہو جاتی ہے، اسی طرح امت کے کسی فرد یا گروہ کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کہ یہ سب ایک دوسرے کے لئے تقویت کا سامان ہیں، اور ایک دوسرے کی مدد کرنے میں ہی پوری امت کا بقاء اور اس کا تحفظ ہے۔

اسلام نے اس رشتہ اُخوت کو اتنا مضبوط اور مستحکم کیا کہ نازک سے نازک وقت میں بھی مسلمان نے اسے یاد رکھا، اور انہوں نے دوسروں کو کسی مسلمان گروہ پر ان سے اختلاف کے باوجود دست درازی کی اجازت نہیں دی، حضرت علی ﷺ اور حضرت معاویہ ﷺ میں ایک سے زیادہ جنگیں ہوئیں، رومیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھانا اور حضرت علی ﷺ پر یلغار کرنا چاہا، تو حضرت معاویہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے حضرت علی ﷺ کی طرف ترچھی نگاہ سے بھی دیکھا تو میں تیری آنکھ نکال لوں گا، یا یہ کہا کہ علی ﷺ کی فوج کا پہلا سپاہی میں ہوں گا، عباسیوں کے عہدِ خلافت میں جب اندلس پر بنواُمیہ کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت بھی عیسائیوں نے بنواُمیہ سے تعاون کی پیشکش کی، لیکن اموی بادشاہ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سے ہی یہود و نصاریٰ نے محسوس کیا کہ جب تک اسلامی اُخوت کے اس جذبہ بیکراں پر تیشہ نہ چلایا جائے، مسلمانوں کو زیر کرنا ممکن نہیں ہوگا، چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس مقصد کے تحت ترکیٔ مرحوم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا عظیم سانحہ پیش آیا، اس حقیر کے خیال میں سیاسی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کو سب سے بڑا نقصان دو واقعات سے ہوا، ایک حضرت علی ﷺ کے عہدِ خلافت میں عراق اور شام میں دو الگ الگ مسلم مملکت کا وجود، کیونکہ اس وقت تک عالمِ اسلام کی تقسیم کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، اس تقسیم نے بعد کو چل کر الگ الگ مسلم مملکتوں کے تصور کو تقویت پہونچائی، اور دنیا کے مختلف حصوں میں خلافتِ اسلامی سے آزاد مسلمان مملکتیں قائم ہونے لگیں، خود ہندوستان

بھی اس کی ایک مثال ہے، جہاں بعض مسلم سلطنتوں کے اندر خطبہ میں خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا اور بعض میں نہیں، اور جہاں پڑھا جاتا تھا، تو وہ بھی برائے نام، خلیفہ سے کوئی حقیقی ربط و تعلق نہیں ہوتا تھا۔

دوسرا حادثہ خلافتِ عثمانیہ کا سقوط ہے، خلافتِ عثمانیہ جیسی کچھ بھی ہو، لیکن بہرحال وہ مسلمانوں کی وحدت، اجتماعیت اور مرکزیت کا ایک نشان تھی، اور دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی افتاد آئے، مسلمانوں کی نگاہ مرکزِ خلافت کی طرف اٹھتی تھی، اور یہیں سے اس کی ترجمانی ہوتی تھی، یہ ایک ایسی بنیاد تھی، کہ جس کو وسیلہ بنا کر پوری دنیا کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا جا سکتا تھا، اس حقیقت کو اس دور کے ناسمجھ عرب اور ترک قائدین نے نہیں سمجھا، اور مغرب کے اشارہ پر خلافت ختم کر دی گئی، پھر اس اسلامی اخوت کے جذبہ کو سرد کرنے اور ان کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے لئے مغرب نے وطن پرستی کی کاشت لگائی، اور اسے خوب آبیار کیا، کیونکہ یہی وطنی قومیت کا جذبہ اسلامی اُخوت کا بدل بن سکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ شام، مصر، حجاز، یمن، ترکی، عراق اور پورا عالمِ اسلامی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا، اور آج وہ مغرب کے لئے بازیچہ اطفال ہے، اسرائیل قتل عام کرے، اور مسلمانوں کی زمین پر غاصبانہ قابض ہو، بوسنیا میں نسل کشی کی جائے، انڈونیشیا اور سوڈان میں مسلمان حکومتوں کے خلاف مرتد عیسائیوں کو ورغلایا جائے، اور الجزائر میں ایک منتخب حکومت کو بلا وجہ تختِ اقتدار سے تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے، تو یہ دہشت گردی نہیں، اور مسلم ممالک کو خود ساختہ الزامات کے ذریعہ دہشت گرد قرار دیا جائے، لیکن اللہ رے سناٹا! کیا مجال کہ کوئی زبان بھی اس کے خلاف جنبش کر سکے!!

یہ محض اُخوتِ اسلامی سے محرومی اور حمیت ایمانی سے مہجوری کا نتیجہ ہے، اس سے زیادہ بدقسمتی کی کوئی اور کیا بات ہو سکتی کہ لوگ مسلمانوں کے مسائل کو ملکوں اور علاقوں کی اصطلاحات میں سوچنے لگیں، کہ یہ جغرافیائی تقسیم ہم انسانوں کی تقسیم ہے، نہ کہ خالقِ انسان کی، یہ جغرافیائی لکیریں کیا ایمانی رشتوں کو بدل دیں گی؟ افسوس کہ مسلمانوں

میں بین الاقوامی سطح سے لے کر ملک، ریاست، ضلع، اور شہر کی سطح تک علاقہ پرستی کا مزاج پیدا ہوتا جار ہا ہے، جو قومیں دریا کے کناروں کی طرح ایک دوسرے سے نہیں مل سکتی تھیں، وہ تو آج ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، اور جو اُمت جسدِ واحد بنائی گئی تھی، اس کا عضو، عضو ایک دوسرے سے اس طرح روٹھا ہوا ہے کہ ایک کی مصیبت دوسرے کو اشکبار نہیں کرتی۔ **فیا اسفاہ و یا عجباہ !**

(..................)

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک!

مسلمان آج کیسی زبوں حالی سے دوچار ہیں، یہ محتاجِ اظہار نہیں، خون ان کا اتنا ارزاں ہے کہ بعض اوقات اس کی قیمت پینے کے صاف پانی سے بھی کم ہوتی ہے، مسلمانوں کا قتل عام ہوسکتا ہے، لیکن کیا مجال کہ نامزد قاتلوں پر بھی کوئی آنچ آسکے؟ ملیانہ اور ہاشم پورہ کا مقتل ہو، مرادآباد کی عیدگاہ ہو، یا آسام میں نیلی اور بہار میں بھاگلپور کا مشہد اکبر، کون سی جگہ ہے جو مسلمانوں کے خون ناحق سے لالہ زار نہیں؟ مال واسباب اور دکان و کاروبار انہیں مسلمانوں کے لوٹے جاتے ہیں، حیدرآباد میں، جمشید پور میں، مرادآباد اور بھاگلپور میں، راوڑکیلا اور احمد آباد میں شاید اب بھی ایسے تلخ واقعات کے نقوش موجود ہیں، عزت وآبرو چھپ کر بھی نہیں بلکہ برسرِ عام کن کی نیلام ہوتی ہے؟ مظلوم مسلمانوں کی! اگر سورت کی سڑکوں کو قدرت کی طرف سے قوتِ گویائی دے دی جائے تو شاید آج بھی وہ گواہی دے اور پھر اس انسانیت سوز اور شرافت دوز حرکتوں کا ویڈیو بھی تیار ہوتا ہے اور بمبئی کے گلی کوچوں میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے تاکہ مسلمان خوب بے آبرو ہوں، اور ان کی ذِلت ورسوائی اپنی نہایت کو پہنچ جائے۔

یہ تو مسلمانوں کے جان و مال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی بات ہے، لیکن کونسا میدان ہے، جس میں ان کا حال بہتر ہے؟ معاشی اعتبار سے وہ اتنے گئے گذرے ہیں کہ معاشی پسماندگی میں اب کوئی قوم ان کی شریک وسہیم نہیں، تعلیمی صورتِ حال یہ ہے کہ اب ناخواندگی کی سطح مسلمانوں میں ہریجنوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے اور ہماری تعلیمی پسماندگی ملک میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہمارا

حصہ دو تین فیصد بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اتر پردیش ملک کی اہم ترین ریاست ہے۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بھی قابلِ لحاظ ہے، لیکن ریاست کے اضلاع میں سے ایک میں بھی مسلمان ڈی ایم نہیں، کوئی کمشنر مسلمان نہیں، کوئی آئی۔ جی، ڈی، آئی جی مسلمان نہیں، ملک میں قومیائے ہوئے بینکس ہیں، جن میں ۴۶۷ ڈائرکٹرس ہیں، ان میں مسلمان صرف چار ہیں۔

ہم ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم سب سے بے وزن سیاسی قوت ہیں، ہندوستان میں سکھوں کی آبادی کا تناسب دو فیصد ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب حکومت کے بیان کے مطابق بھی ۱۳ فیصد ہے، جو یقیناً حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے، لیکن سکھ بھی اپنی ایک سیاسی قوت رکھتے ہیں، اسی طاقت کا نتیجہ ہے کہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے فساد مین مارے گئے سکھوں کے قاتلوں کو انہوں نے سزائیں دلوائیں اور ایک ایک مقتول کا معاوضہ دس دس لاکھ منظور کرایا۔ لیکن مسلمانوں کو فسادات میں جو نقصان پہونچے، بعض اوقات تحقیقاتی کمیشن قائم ہوئے لیکن اس کی رپورٹ پر کبھی عمل نہیں ہوا، اور بمبئی کے فساد کے سلسلہ میں شری کرشنا رپورٹ کو تو نہایت ہی بے شرمی کے ساتھ حکومت مہاراشٹر نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، اور مسلمان کچھ نہیں کر سکے، یہ تفاوت محض سیاسی بے وزنی کی وجہ سے ہے۔

آخر جو قوم صدیوں اس سرزمین پر فرماں روائی کر چکی ہے اور جس کی عزت و شوکت کے نقوش اور شرافت و انسانیت کے عکوس اس ملک کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں، آج کیوں ذِلت و انحطاط کے اس مقام تک پہنچ چکی ہے اور وقت کی ٹھوکریں بھی اس کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے میں ناکام و نامراد ہیں؟ ___ غور کریں تو ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خدا سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا ہے اور فرقہ بندیوں اور باہمی عداوتوں نے ہمیں سمندر کی سی طاقت رکھنے کے باوجود قطروں میں تقسیم کر دیا ہے، ایسا قطرہ جسے دھوپ کی ہلکی سی تمازت اور ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی وجود سے محروم کر سکتا ہے۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کو ایک گونہ ہزیمت سے دو چار

ہونا پڑا، اور ستر صحابہ جاں بحق ہو گئے، قرآن نے تفصیل سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، قرآن میں اس شکست کے اسباب اور اثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے اسی واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **واعتصموا بحبل الله جميعا و لا تفرقوا** (آل عمران: ۱۳۰) یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑیوں میں بٹنے سے بچو، اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع سے بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں جھگڑو نہیں کہ آپسی نزاع تمہارے لئے ناکامی اور نقصان کا پیش خیمہ بنے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، **ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم** (الانفال: ۴۶)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی بے وزنی، بحیثیت قوم کے ان کی بے وقعتی اور ہوا خیزی کا اصل سبب یہی آپسی نزاع واختلاف اور بکھراؤ ہے۔ اتحاد واتفاق اور اجتماعیت یوں تو ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آج کے سیاسی پس منظر میں یہ اتنی بڑی ضرورت ہے کہ شاید ہی کبھی اس قدر ضروری رہا ہو۔ فرقہ پرستی کی گھنگھور گھٹائیں ہر سو چھائی ہوئی ہیں۔ پورے ملک کے اُفق پر زعفرانی شفق چھایا چاہتا ہے، شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کا کوئی فرق نہیں، پڑھے لکھے لوگوں، دانش وروں اور جاہل عوام سب پر فرقہ پرستی کا نشہ سا چھاتا جا رہا ہے اور اس آتش فشاں سے جو لاوا اُبلنے والا ہے، یقیناً مسلمان ہی اس کا نشانہ ہیں، اور ہماری صفوں میں اتحاد ویکجہتی اور اشتراک وتعاون کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں جس کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا جا سکے، اور اس ملک کے امن وامان کی حفاظت ہو سکے، یہ سیلاب اتنا ہلاکت خیز ہے کہ اگر مسلمان اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ نہ صرف مسلمانوں کے جان ومال کو بلکہ ان کی تہذیب وثقافت اور مذہبی وجود کو بھی ____ خدانخواستہ اور ہزار بار خدانخواستہ ____ بہا لے جائے گا۔

اسلام میں اتحادِ اُمت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج اظہار نہیں، اُمت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسی چیزوں کی اجازت دی جو عام حالات میں گناہ بلکہ گناہ کبیرہ ہے، جھوٹ بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی کس

قدر مذمت فرمائی ہے؟ لیکن دو مسلمانوں میں اختلاف کو دُور کرنے اور شکستہ دِلوں کو ملانے کی غرض سے آپ نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دی، جب دو اشخاص و افراد کا اتحاد اتنا اہم ہے تو مسلمانوں کے دو گروہوں جماعتوں اور تنظیموں کے اختلاف کو دور کرنا اور ان کو ایک صف میں کھڑا کرنا کتنا اہم عمل ہوگا، کہ اس کے لئے تو شاید سو جھوٹ بھی جائز ہو، اسی طرح بُرائی سے روکنا اور برائی کے خلاف آواز اٹھانا مسلمانوں کا مذہبی اور ملّی فریضہ ہے، لیکن جہاں ''نھی عن المنکر'' فساد و اختلاف کا باعث بن جائے اور اندیشہ ہو کہ اس سے ملّت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو ایسے موقع پر آپ نے وقتی طور پر بُرائی کو انگیز کر لینے اور تحمل برتنے کا حکم دیا، آپ نے ایک بار حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہو جائیں گے جو تم سے وصول کریں گے اور اپنی عیش کو شیوں میں خرچ کریں گے، ایسے موقعہ پر تم کیا کرو گے؟ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں اس کو نوکِ شمشیر سے سیدھا کر دوں گا، آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرنا، بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا جب تم بھی اللہ سے آملو اور یہ امراء بھی، منشاءِ نبوی یہ تھا کہ منکر اور بُرائی کو روکنے میں ایسے تشدد سے کام نہ لیا جائے جو امّت میں تفریق اور انتشار کا باعث بن جائے، بلکہ ایسے موقع پر صبر و تحمل اور بردباری کا راستہ اختیار کیا جائے، اور ان کے عمل کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے کہ وہی احکم الحاکمین ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ امام مقتدیوں کی نماز کا ضامن ہے، اسی لئے امام کی نماز فاسد ہو جائے تو مقتدی کی نماز آپ سے آپ فاسد ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے: **الامام ضامن**، اس لئے امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا حامل ہونا چاہئے، وہ صاحبِ علم ہو، عمدہ قرآن پڑھتا ہو، ورع و تقویٰ کا حامل ہو، لیکن اگر کوئی خراب شخص ہی امام بن جائے اور اس کو ہٹانے میں فتنہ وانتشار کا اندیشہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھی جائے۔ **صلوا خلف کل برّ و فاجر**۔ گویا امام کا نسبتاً کم بہتر ہونا امت کے اختلاف و انتشار اور نزاع و افتراق سے کمتر ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت کی وحدت اور اجتماعیت کو برقرار رکھنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ایک تو ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور باہم دست و گریباں ہیں، دوسرے مسلمانوں میں پڑھے لکھے سمجھدار اور باشعور لوگ اس بات کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کے ایسے اختلاف کو دُور کرنے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں، حالانکہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا اور ان کی باہمی کدورتوں کو دُور کرنے کی سعی کرنا بھی امت کے اجتماعی فرائض میں سے ایک ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک نماز میں جماعت کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مرض وفات میں بھی جب بالکل مجبور ہوگئے تب ہی آپ کی جماعت فوت ہوئی، لیکن قبیلہ عمرو بن عوف کے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے آپ کو مسجد تشریف آوری میں تاخیر ہوگئی، تاخیر کے باعث حضرت ابوبکرؓ کو امام بنایا گیا، بعد میں آپ شریک جماعت ہوئے (بخاری عن سھل بن سعد ساعدی) غرض، یہ نہایت اہم اور مبارک کام ہے، جس کی طرف مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اتحاد اس طرح نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص یا کوئی تنظیم سوچنے لگے کہ تمام لوگ اپنے وجود کو اس کے وجود میں گم کردیں، اور اس کے تابع ہو کر اتحاد قائم کریں، اس کی تنظیم اور جماعت کو اپنا مرکز تسلیم کرلیں، ایسا خیال کرنا یقیناً خود فریبی اور خوش فہمی ہی کی بات ہوگی، اتحاد کی بنیاد یہی ہوسکتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنا بلکہ ایک دوسرے کے کام اور طریقۂ کار کا احترام کرنا سیکھیں، اگر کام کے میدان الگ الگ ہوں تو اپنے اپنے دائرے بنائیں اور دوسرے کے کام کو بھی قدر و منزلت سے دیکھیں، اور اگر ایک ہی میدان میں کام کررہے ہیں تو اس میں بھی تقسیم ہوسکتی ہے، مثلاً اگر ایک شہر میں دو مسلمان سیاسی جماعتیں ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شہر کے حلقہ ہائے انتخاب کو باہم تقسیم کرلیں تاکہ مسلمانوں کا ووٹ بٹنے نہ پائے اور ہمارا اختلاف فرقہ پرست طاقتوں کو فائدہ نہ پہونچائے؟ اس کے لئے اپنی انا کو قربان کرنے، خود پرستی کے خول سے باہر آنے اور جرأت مندی کے ساتھ حقائق کو سمجھنے کی ضرورت پڑے گی، لیکن اگر ہماری سیاسی جماعتیں اس پر تیار ہوجائیں تو یہ نہایت ہی اہم قدم ہوگا۔ اس میں امت کی سرخروئی بھی ہے اور ان

جماعتوں کا بقا بھی۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ اس وقت جس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، وہ کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ ایسے لوگ جن کا ایک ساتھ بیٹھنا، سال دو سال پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا اور ایسی جماعتیں جن کے اشتراک کا چند ہفتوں پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ آج ایک دوسرے سے بغل گیر اور سیاست کی بساط پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کھڑے ہوئے ہیں، پھر مسلمان جن میں اتحاد کی کتنی ہی بنیادیں موجود ہیں، کیا وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟ مصیبت اور پریشانی شیر اور بکری اور سانپ اور نیولے کو بھی ایک جگہ جمع کر دیتی ہے، لیکن کیا ہم اس قدر بے حس اور بے شعور اور شخصی مفادات کے حریص اور لالچی ہیں کہ سیلاب بلا اور طوفان بے درماں بھی ہم کو متحد نہیں کر سکتا؟۔ شاید علامہ اقبال کی روح ہم پر نوحہ کناں ہو، اور استفسار کر رہی ہو کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں؟
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

(۶؍اگست ۱۹۹۹ء)

بات کہنے کا سلیقہ چاہئے

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں قسم قسم کی مخلوقات پیدا کی ہیں، ایک سے ایک طاقتور اور خوبصورت سے خوبصورت تر، انسان بظاہر ان کے مقابلہ میں کم تر محسوس ہوتا ہے، اس کو نہ ہاتھی کا ڈیل ڈول حاصل ہے نہ شیر کی قوت، نہ ہرن کی نشیلی آنکھیں، نہ چیتے کی طرح خوبصورت نقش ونگار کا پیرہن اور نہ گلاب کی سی خوش رنگی، لیکن ان سب کے باوجود پوری کائنات گویا اس کے اشاروں پر رقص کرتی ہے، اس کی وجہ انسان کی کچھ امتیازی صلاحیتیں ہیں، انہیں امتیازی اوصاف میں ایک اظہار و بیان کی قوت ہے، قرآن مجید نے انسان پر اللہ تعالیٰ کے خصوصی احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''اللہ نے اس کو بیان سکھایا'' (الرحمٰن: ۲) گفتگو کے ذریعہ اپنے مقصود کا اظہار اور خیالات وافکار کو الفاظ کا جامہ پہنانا، انسان کی ایسی صلاحیت ہے کہ شاید ہی کوئی مخلوق اس میں اس کی ہمسری کر سکے، شیر جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے، لیکن کبھی اس کے اعزاز میں نہ جلسہ ہوا نہ جلوس، اور نہ کبھی اس نے اپنے خطابِ شاہانہ ہی سے اہل جنگل کو نوازا ہے، مگر یہ حضرت انسان ہیں کہ ان کی تقریروں، نعروں، مشاعروں اور نغموں نے پوری فضاءِ کائنات کو اپنا اسیر بنالیا ہے، اس لئے زبان اور قوتِ بیان اللہ کی بڑی نعمت ہے۔

نعمت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس کی قدر دانی بھی اسی نسبت سے واجب ہوتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ'' جو میرے لئے دو چیزوں کی ضمانت لے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت لوں گا: ایک زبان، دوسرے نفسانی خواہشات'' زبان کو قابو میں رکھنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ ہر گناہ نے اپنی فانی لذت کے ساتھ پریشانی اور خطرات کو

بھی دوش بدوش رکھا ہے، چور چوری کرتے ہوئے خطرات سے گزرتا ہے اور مشقتیں اٹھاتا ہے، راہزن رہزنی میں اپنی جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے، لیکن زبان کے گناہ میں نہ کوئی خرچ ہے نہ مشقت، اور نہ دنیا میں جان و مال کا خطرہ، اس سے ایسے لوگوں کو بڑی لذت ملتی ہے جن کو کوئی اور کام نہ ہو۔

زبان بگڑے ہوئے معاملات کو سلجھانے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور اچھے خاصے ماحول کو بگاڑنے کی بھی، زبان کے ایک بول ہی سے رشتے بنتے بھی ہیں اور بنے بنائے رشتے ٹوٹتے بھی ہیں، ایک ہی بات کو دو طرح سے کہا جا سکتا ہے، ایک انداز ادب کا ہے اور دوسرا بے ادبی کا، کسی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ بڑے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہیں؟ عمر پوچھنی مقصود تھی، اس لئے سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ میں بڑا ہوں، لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ نہ کہا، فرمایا بڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عمر میری زیادہ ہے، ''ھو اکبر و انا اسن'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے خاص مومنانہ فراست عطا فرمائی تھی، کئی مواقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو رائے تھی، اس کے مطابق آیت قرآنی نازل ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اس کو بیان کیا ہے، کوئی کم فہم ہوتا تو کہتا کہ فلاں فلاں بات میں اللہ نے میری موافقت فرمائی ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کمالِ ادب ملاحظہ ہو، فرمایا کہ تین باتوں میں میں نے اپنے رب کے منشاء کے موافق رائے اختیار کی، ''وافقت ربی فی ثلاث'' کتنا ادب ہے اس فقرہ میں!

سب سے بڑھ کر ادب سے معمور زبان اللہ کے پیغمبروں کی ہوتی ہے، کیوں کہ

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

قرآن مجید میں نمرود سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مکالمہ نقل کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مکالمہ میں اللہ تعالیٰ کا تعارف کراتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ میرا خدا وہ ہے کہ جب بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ ''وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ'' (الشعراء: ۸۰) غور کیجئے کہ اصل میں تو بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفاء وصحت بھی،

لیکن بیماری بہر حال ایک تکلیف دہ چیز ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت سے گریز فرمایا اور اپنی طرف نسبت کی، شفاء میں شر کا کوئی پہلو نہیں اس لئے اس کو صراحتا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔

گفتگو کا سلیقہ صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کے ساتھ مطلوب نہیں، اس کی ضرورت ایک انسان کی دوسرے انسان سے باہمی گفتگو میں بھی ہے۔ ''ماں'' کا لفظ کتنا مقدس ہے، اس میں کس قدر محبت، پیار اور احترام ہے! لیکن ماں کا ترجمہ ''باپ کی جوڑو'' سے کیا جائے تو طبع سلیم کو اس کا سننا بھی گراں گزرتا ہے، خوش سلیقگی کے ساتھ اختلافِ رائے ہو تو اختلافِ رائے سے بھی گرانی نہیں ہوتی، لیکن بدسلیقگی کے ساتھ ''تعریف'' کے بھی گالی ہونے کا خیال گزرتا ہے، مثلاً آپ کو کسی کی رائے سے اختلاف کرنا ہو اور آپ یوں کہیں کہ تمہیں تو عقل ہی نہیں ہے اور تمہاری یہ رائے بالکل غلط اور مطلقا نا قابل قبول ہے تو بات ''تو تو، میں میں'' سے بڑھ کر جیب و گریباں تک بھی آسکتی ہے، لیکن اگر اس بات کو اس طرح کہا جائے کہ آپ تو ماشاء اللہ سمجھ دار اور ذی رائے آدمی ہیں، مجھ سے زیادہ عقل وفہم رکھتے ہیں، ممکن ہے آپ ہی کی رائے زیادہ صحیح ہو، لیکن میری ناقص عقل میں فلاں فلاں وجہ سے یہ بات اس وقت مناسب محسوس نہیں ہوتی تو اختلاف میں شدت بھی پیدا نہ ہوگی، دوسرے شخص کے لئے اس کی رائے وقار کا مسئلہ بھی نہ رہے گی اور اس کے لئے آپ کی رائے کی طرف رجوع کر لینا آسان ہوگا، اس لئے حضرت کلیم کا یہ شعر مجھے بڑا پسند ہے اور شاید آپ کو بھی پسند آئے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کرنے کا سلیقہ چاہئے

(۲۰/فروری ۱۹۹۸ء)

اسلام
نسل پرستی کا علاج

جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن میں نسل پرستی کے موضوع پر اقوام عالم کی کانفرنس زور و شور کے ساتھ جاری ہے، اور اس کی خبریں روزانہ اخبارات کی شاہ سرخیوں کی غذا بن رہی ہیں، یہ کانفرنسیں نسل پرستی کے ختم کرنے میں کس قدر مفید ثابت ہوں گی، یہ تو وقت ہی بتلائے گا، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ داروغۂ عالم ''امریکہ'' جو پوری دنیا میں انسانی حقوق کی حفاظت کو اپنی خود ساختہ ذمہ داری سمجھتا ہے، وہ اس لئے کانفرنس سے باہر نکل آیا ہے کہ دنیا کی بدترین نسل پرست حکومت اسرائیل کے خلاف ایک حقیقت پسندانہ تجویز منظور ہوگئی ہے، یہ کیسا المیہ ہے کہ جو ملک دنیا بھر میں انسانی حقوق کا احتساب کرتا ہو، وہ خود انسانی حقوق کی پامالی کا بدترین مرتکب ہو، جو دوسروں کے یہاں مچھر بھی چھانتا ہوا سے خود اپنے یہاں اونٹ نگل جانے میں بھی کوئی تکلف نہ ہو۔

اگر اقوامِ عالم حقیقت پسندی سے کام لیں اور تنگ نظری کے خول سے باہر آکر سوچیں اور دیکھیں تو محسوس کریں گی کہ وہ نسل پرستی کی جس دشواری سے دوچار اور وحدتِ انسانی کے جس پیغام کی خواہش مند ہیں، وہ اسلام کے دامن میں موجود ہے، اسلام کی بنیادی تعلیم اور انسانیت کے بارے میں اسلامی تصورات کا ترجمان پیغمبر اسلام ﷺ کا وہ عظیم الشان خطبہ ہے، جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اے لوگو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی، تم سب آدم

کی اولاد ہو، اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں ہے، مگر تقویٰ کے ذریعہ۔

یہ کوئی معمولی اعلان نہیں تھا، یہ ایک انقلاب کی دعوت تھی، مروجہ فکر کے رُخ کو موڑنے والی اور انسانی ذہن کو جھنجھوڑنے والی دعوت، رسول اللہ ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے، اس وقت دنیا کی جن قوموں کا ذِکر ملتا ہے، ان سبھوں کی فکر نسل پرستی کے تصور پر قائم تھی۔

یہود و نصاریٰ کے بارے میں تو خود قرآن نے کہا ہے کہ وہ کہتے تھے، ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، **وقالت الیهود والنصاریٰ نحن ابناء الله واحباؤه**، (المائدہ:۱۸) خود عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ غیر عرب کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عجمی (گونگا) کی تعبیر خود بتاتی ہے کہ دوسری قومیں ان کی نگاہ میں کیا درجہ ومقام رکھتی تھیں، خود عربوں کے مختلف خاندان ایک دوسرے کے مقابلہ احساس برتری میں مبتلا تھے، اور وہ عبادت و بندگی کے موقع پر بھی اپنے آپ کو اس احساس سے فارغ نہیں کر پاتے تھے، قریش کا حال یہ تھا کہ وہ حج کے موقع سے مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے، اور وہ اسے اپنے مقام کے منافی جانتے تھے، کہ حدودِ حرم سے باہر عرفات تک جائیں، کعبہ کا دروازہ اس لئے اونچا کر دیا گیا تھا، کہ عام لوگ کعبہ میں داخل نہ ہو سکیں، یہ اونچ نیچ کا تصور دوسرے قبائل کے ذہنوں میں بھی اس طرح بٹھا دیا گیا کہ وہ بھی اپنے آپ کو قریش سے کمتر خیال کرتے تھے، وہ طواف کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ قریش مکہ کے کپڑے پہن کر ہی طواف کریں، یہاں تک کہ جن لوگوں کو قریش کے پہنے ہوئے کپڑے میسر نہ آئیں وہ بے لباس طواف کرتے، مرد دن میں اور عورتیں شب میں۔

اہلِ ایران کا حال یہ تھا کہ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ باور کرتے تھے، شاہِ ایران کو ''خداؤں میں انسان لافانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی'' کہا جاتا تھا، ہندوستان میں بعض خاندان سورج کی اور بعض چاند کی اولاد سمجھے جاتے تھے، اور منو کے قانون کے تحت

نسلِ انسانی کو مستقل طور پر چار طبقوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، سب سے اونچا طبقہ برہمن، دوسرا چھتری، تیسرا ویش اور چوتھا شودر جوان سب میں زیادہ بدقسمت اور کم نصیب طبقہ تھا، چین و یونان اور روم قریب قریب تمام علاقے نسل پرستی کی لعنت میں مبتلا تھے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اللہ کی وحدت کے ساتھ انسانی وحدت کا تصور دیا، اور قرآن نے صاف کہا کہ اللہ نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے، اور ایک ہی ماں باپ سے تمام انسانیت کو جنم دیا ہے، **خلقکم من نفس واحدة، و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا كثيرا و نساء ا** (النساء:۱)

رسول اللہ ﷺ کے اس خطبہ میں دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ شرف و کرامت اور عزت وفضیلت کا معیار انسان کا عمل اور اس کا کردار و ''اکتساب'' ہے، نہ کہ اتفاقاً اس کا کسی خاص نسل یا خاندان میں پیدا ہو جانا، اللہ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، خود قرآن نے بھی اس حقیقت کو بے غبار لفظوں میں کہا ہے، **ان اكرمكم عند الله اتقكم** (الحجرات:۱۳) یہ وہ تصور ہے جو اونچ نیچ کی غیر فطری، مصنوعی اور خود ساختہ عمارت کی دیوار منہدم کر دیتا ہے، اور یہ گویا نسل پرستی کی شہ رگ پر تیشہ لگانے کے مترادف ہے۔

تیسری اصولی بات جو قرآن نے کہی ہے، وہ یہ کہ خاندان کا مقصد تعارف اور پہچان ہے، نہ کہ تفاخر، اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے کا ذریعہ، ارشادِ ربانی ہے:

يا ايها الناس انا خَلَقْنٰكُمْ من ذكر و انثى و جعلنكم شعوبا و قبائل لتعارفوا (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان محض اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے اسی حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا:

بیشک اللہ نے تم لوگوں سے زمانۂ جاہلیت کا تعصب اور آباء

واجداد پر فخر کرنے کو ختم کر دیا، اب یا تو مؤمن تقی ہے، یا بدکار شقی،

گویا انسانیت کی تقسیم عمل کے اعتبار سے ہے نہ کہ خاندان کے اعتبار سے، خاندان بڑے اور چھوٹے ہونے کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ یہ محض پہچان اور شناخت کا ذریعہ ہے، جیسے پہچان کے لئے مختلف افراد کے نام رکھے جاتے ہیں، مختلف علاقوں کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، اداروں اور کمپنیوں کا نام ہوتا ہے، اسی طرح یہ انسانی گروہوں اور افراد کی مختلف اکائیوں کے نام ہیں، نسل پرستی اور خاندانی برتری اور کمتری ہمیشہ اسی یقین سے وجود میں آتی ہے، کہ خاندانی نسبتیں ایک دوسرے پر فخر کا سامان ہیں، اور ان نسبتوں سے عظمت و حقارت جسم سے جدا نہ ہونے والے سایہ کی طرح لگی ہوئی ہیں، قرآن نے اس کھوٹی فکر کی اصلاح کی، اور قوموں کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا۔

پھر اسلام نے اسے عملاً برت کر دکھایا، غور کیجئے! حضرت بلال ؓ ایک حبشی نژاد اور نسلاً غلام ہیں، لیکن حضرت عمر ؓ نے ان کو اپنا آقا اور سردار برسرِ عام کہتے ہیں، حضرت سلمان ؓ ایرانی النسل ہیں، لیکن آپ ﷺ ان کو اپنے اہلِ بیت میں شمار فرماتے ہیں، **سلمان منا من اهل البيت**، نماز کی امامت نہایت معزز عمل ہے، آپ نے اس کے لئے علم اور قراءت کو معیار بنایا، اور نسب کا اس سلسلہ میں ذکر تک نہیں فرمایا، عبداللہ ابن ام مکتوم آزاد شدہ غلام ہیں، لیکن پندرہ سولہ دفعہ آپ ﷺ نے اپنی عدم موجودگی میں ان کو مدینہ کا گورنر نامزد کیا۔

عرب شادی بیاہ کے معاملہ میں خاص طور پر خاندان و نسب کا بہت خیال کرتے تھے، آپ ﷺ نے اس تصور کو بھی مٹانے کی کوشش کی، حضرت زید بن حارثہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زینب سے فرمایا، جو آپ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اور جو بعد کو آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں، حضرت مقداد بن اسود بنو زہرہ میں سے تھے، جو بنو ہاشم سے کمتر سمجھے جاتے تھے، آپ ﷺ نے ان کا نکاح اپنی چچا زاد بہن ضباعہ بنت زبیرؓ سے کیا، اور فرمایا کہ مقداد ؓ اور زید ؓ کا نکاح ہم نے اس طرح اس لئے کیا ہے کہ اخلاق ہی شرافت کا معیار قرار پائے، **لیکون اشرفکم عند**

اللہ احسنکم خلقا ، (بیہقی: ۱۳۷/۷) حضرت بلال ﷛ کو عجمی اور حبشی ہونے کی وجہ سے لوگ اپنی لڑکی دینا نہیں چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے بہ نفسِ نفیس ایک عرب نژاد خاتون فاطمہ بنت قیس سے فرمایا، ابوطیبہ نے بنو بیاضہ کے یہاں نکاح کر دیا، آپ ﷺ نے انہیں نکاح کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنۂ وفساد پیدا ہوگا، الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر (بیہقی: ۱۳۶/۷)، حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ نے اپنی بہن سے فرمایا کہ میں تجھے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی بھی مسلمان سے نکاح کرلو، خواہ رومی ہو یا حبشی، (المغنی: ۲۸۰/۶) حضرت عبدالرحمان بن عوف ﷛ نے اپنی بہن سے حضرت بلال ﷛ کی شادی کی۔ (فتح القدیر: ۱۸۷/۲) اس طرح کی کتنی ہی مثالیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے درمیان موجود ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے بعد علومِ اسلامی کی جتنی بھی ممتاز شخصیتیں ہیں، ان میں غالب ترین اکثریت عجمی علماء کی ہے، سب سے بڑے فقیہ امام ابوحنیفہؒ عجمی النسل، سب سے بڑے محدث امام بخاریؒ عجمی النسل، علم کلام اور تصوف کی ممتاز ترین شخصیتیں عجمی النسل ہیں، امام غزالیؒ جیسی شخصیت جس پر علومِ اسلامی کی تاریخ کو ناز ہے، عجمی ہیں، عربی زبان کے رمز شناس اور اس زبان سے متعلق قواعد کے وہ ائمہ جو گویا مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اکثر فارسی النسل ہیں، خود سیبویہؒ امام نحو عجمی ہیں، تفسیر کے بڑے بڑے ائمہ اور حضرت عبداللہ ابن عباس ﷛ کے اکثر تلامذہ عجمی نژاد ہیں، علوم اسلامی کی تدوین اور ارتقاء میں آزاد شدہ عجمی غلاموں کا بڑا حصہ رہا ہے، اس سے نسل ونسب کے معاملہ میں اسلام کی بے تعصبی اور وسیع النظری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اسلام جہاں گیا، وہ انسانی وحدت واخوت کی سوغات اپنے ساتھ لے کر گیا، اس نے مظلوم انسانوں کو اپنے انسان ہونے کا احساس دلایا اور مختلف علاقوں میں جن لوگوں نے اپنے لئے بڑائی کے بت تراش لئے تھے، ان کی جبر و زیادتی کی چکی میں پسنے والی انسانیت کو عزت وشرافت سے ہمکنار کیا، اور ان میں مقام ومرتبہ کا احساس جگایا، جس کی

بازگشت آج پوری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے، افسوس کہ مغرب آج تک نسلی تفوق کے اس فسوں سے باہر نہ آسکا، نازیوں کا نسلی برتری کا احساس تو کل کی بات ہے، یوگوسلاویہ میں نسلی تطہیر کی شرمناک اور نفرت انگیز مہم کے لہو تو ابھی خشک بھی نہ ہو پائے ہیں، جس کے پیچھے درپردہ پوری مغربی دنیا تھی، اسرائیل اور یہودیوں میں نسلی برتری کا خیال کوئی نئی بات نہیں، بلکہ بائبل کی عبارتوں اور قرآن وحدیث کی صراحتوں سے ان کا یہ مزاج و مذاق پوری طرح واضح ہے، مغربی دنیا اگر اس نسل پرست قوم کی پشت پر ہے تو چنداں باعث تعجب نہیں، کہ نسل پرستی تو مغرب کی تاریخ رہی ہے، یہودیوں کے علاوہ دنیا کی سب سے بدترین نسل پرست قوم ہندوستان کے برہمن رہے ہیں، جو کئی ہزار سال سے ایک بہت بڑے طبقہ کو عملاً اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں، اور اس ملک کی تہذیب و ثقافت پر ان کی زیادتی کے نقوش اس درجہ نمایاں ہیں کہ جنھیں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، درحقیقت یہودیت اور برہمنیت نسل پرستی کا دوسرا نام ہے، اور اسی لئے ان دونوں کی قربت روز افزوں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا کو نسل پرستی کی لعنت سے نجات پانا ہے اور اس کائنات کو انسانی وحدت کے نغمہ سے معمور کرنا ہے تو اسے رحمت عالم محمد ﷺ کے دامن میں آنا اور اسلامی تعلیمات کو فکر و نظر کا سرمایہ بنانا ہوگا۔ جس نے انسانی وحدت کا انقلابی تصور انسانیت کو دیا، جس نے عزّت و شرافت کے مصنوعی اور کھوٹے معیار کو توڑا اور جس نے بتایا کہ اصل میں نسلِ انسانی کا ایک ہی شجرۂ طوبیٰ ہے اور اس سے پھوٹنے والی شاخیں جو الگ الگ ناموں سے موسوم ہوگئی ہیں، یہ محض تعارف کا ذریعہ ہیں نہ کہ تفاخر کا۔

(۷؍دسمبر ۲۰۰۱ء)

گناہ پر فخر

قرآن مجید نے مختلف انسانی گروہوں کے مزاج اور ان کی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے، اور ہر ایک کے بارے میں دکھتی ہوئی نبض پر انگلی رکھ دی ہے، اس میں مشرکین کا ذکر بھی ہے، یہودیوں کا بھی، عیسائیوں کا بھی، اور منافقین کا بھی، دعوت حق کے بارے میں کس کا کیا رویہ ہے؟ اور زندگی کے مسائل کے بارے میں کس کے سوچنے کا کیا انداز ہے؟ قرآن نے اس کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ آج بھی اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اعراب یعنی دیہاتیوں کا جو مزاج قرآن نے بتایا ہے، آج بھی شہری ثقافت سے محروم دیہات کے لوگوں میں پوری طرح وہ کیفیت محسوس کی جا سکتی ہے، یہودیوں میں زندگی کی بے پناہ چاہت اور موت سے بے حد خوف کی جو نفسیات بیان کی گئی ہے، اسرائیل اس کی جیتی جاگتی مثال ہے، ہر دور میں ایک ایسا گروہ موجود رہا ہے، جس کے ظاہر اور باطن میں ایسا فاصلہ ہوتا ہے، جیسے دریا کے دو کنارے، اور جن کی زبان دل کی رفاقت سے محروم رہتی ہے، اسی گروہ کو قرآن ''منافق'' سے تعبیر کرتا ہے، قرآن کی مدنی سورتوں میں ان منافقین کی ریشہ دوانی اور بزدلی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اتنا مکمل اور بھرپور ہے کہ اس سے بہتر اس گروہ کی تصویر نہیں کھینچی جا سکتی۔

اسی طرح قرآن نے ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر کیا ہے، جو دیدہ و دانستہ سچائی کی مخالفت پر پوری طاقت کے ساتھ کمر بستہ رہتا ہے، اس کی کیفیت ایسی ہے کہ گویا اس کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو، جس کے کان مہر بند کر دیئے گئے ہوں، جس کی آنکھوں پر جھوٹ کا اتنا دبیز پردہ چڑھا ہوا ہے کہ سچائی اسے بالکل نظر نہیں آتی، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ

عَلٰی سَمْعِهِمْ وَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ، (البقرہ:۷) ایسا نہیں کہ ان کے سینے میں دھڑکنے والا گوشت کا لوتھڑا ہی نہ ہو، ہے، لیکن سمجھنے سے محروم، کان نام کا عضو، ان کے پاس بھی ہے، لیکن حقائق کو سمجھنے سے قاصر، پتلیاں ان کے حلقۂ چشم میں بھی موجود، لیکن سچائی کو دیکھنے سے قاصر، لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم أعين، لا يبصرون بها ولهم آذان لايسمعون بها.

قرآن کی ان تعبیرات کو اگر ایک فقرہ میں سمیٹا جائے، تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس گروہ کے پاس اعضاء جسم تو ہوتے ہیں، لیکن یہ ضمیر سے محروم ہوتا ہے، جیسے دل کے مرجانے کے بعد جسم ایک لاشہ اور زمین کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے، اسی طرح ضمیر کی موت انسان کے اندر چھپی ہوئی جوہر انسانیت کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے اور اخلاق و تمدن کی دنیا کیلئے اس کا وجود ایک بار گراں بن جاتا ہے، جیسے مردار جسم انسان کے لئے زہر کی ٹوکری ہے، اسی طرح بے ضمیر اور مردہ ضمیر انسان کی آدمیت کے لئے زہر کا پیالہ ہے، وہ جس منہ سے لگے اسے بھی جوہر انسانی سے محروم کر دیتا ہے، اور ایک ایسے طبقہ کو وجود میں لاتا ہے، جو انسانی شکل وصورت کا درندہ ہوتا ہے نہ کہ انسان،

انسان خطاؤں کا مجموعہ ہے، انسانی ضمیر انسان کو اس کی خطاؤں اور غلطیوں پر متنبہ کرتا رہتا ہے، وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، لیکن اس کی چوٹ بھی محسوس کرتا ہے، وہ گرتا ہے، لیکن گر کر اٹھتا ہے، اور اپنے گرد آلود جسم کو صاف ستھرا بھی کرتا ہے، اگر کوئی شخص غلطی پر غلطی کرتا جائے، لیکن اسے اپنی غلطی پر پشیمانی تک نہ ہو، ٹھوکریں کھائے لیکن اتنا بے حس ہو کہ پتھر کو پھول سمجھ لے، بار بار گرے، لیکن اپنے گرد آلود دامن کو بے داغ و بے غبار تصور کرے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کے ضمیر میں کوئی رمق حیات باقی نہیں رہ گئی ہے، اس کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، وہ انسانیت کے لئے ایک بوجھ ہے، وہ ایک زندہ لاش ہے، جس کا تعفن صحت منداور باضمیر انسانوں کے لئے سراسر نقصان دہ اور مضر ہے۔

گجرات کے بدنام زمانہ اور بقول وزیر اعلیٰ بنگال جناب بھٹا چاریہ سب سے زیادہ بے شرم ''چیف منسٹر نریندر مودی'' نے انسانیت کے قتل اور غارت گری کا جو عریاں

رقص سرزمین گجرات میں کیا ہے، اس پر انہیں اتنی مسرت اور عزت کا احساس ہے کہ اس کارنامہ پر وہ گوروپا ترا (کاروانِ فخر) نکال رہے ہیں، گویا قتل انسانیت پر فخر کیا جارہا ہے، اس سے زیادہ باعث شرم کوئی اور امر ہوسکتا ہے؟ چور کو اپنی چوری پر، راہ زن کو اپنی راہزنی پر اور قاتل کو اپنے جور و ظلم پر بھی پچھتاوا ہوتا ہے، بہت سے مجرمین اپنے ضمیر کی ملامت کی وجہ سے نفسیاتی مریض ہوتے ہیں، اور بہت سے شدت احساس کی وجہ سے خودکشی کر گذرتے ہیں، یا ان کا دماغی توازن متاثر ہوجاتا ہے، لیکن یہ ایسا شخص ہے جس کے سینہ میں دل نہیں شاید پتھر کی سل ہے، جو احساس سے خالی اور حیاء سے عاری ہے!

دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اپنی کسی بات پر خوش ہونا کبر ہے، جو سب سے بڑا اخلاقی مرض اور تمام روحانی بیماریوں کی جڑ ہے، دوسروں کو حقیر سمجھے بغیر اپنے اوپر ہونے والی کسی نعمت کا اظہار فخر ہے، لیکن اکثر فخر کی سرحدیں کبر سے جا ملتی ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ جب اپنی کسی منقبت کو بیان فرماتے (اور رسول اپنے درجہ و مقام کو واضح کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور ہوتا ہے) تو ساتھ ہی ساتھ فخر کی نفی بھی فرماتے، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں، **أنا سید ولد آدم ولا فخر**، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے آباء و اجداد پر فخر کرنے کو ناپسند فرمایا ہے اور حج کے موقع سے جو لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے، اس کو منع کر کے، اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کا مزاج پیدا فرمایا، یہی اسلام کی تعلیم اور اسکا مزاج ہے، کوئی اچھی بات ہو تو اس کا سر خدا کے سامنے جھک جائے اور کوئی غلطی ہو تب بھی جبیں ندامت خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو اور مخلوق کے سامنے زبان پر کلمۂ اعتراف ہو، یہی ایک اچھے انسان کی پہچان ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے کیا خوب فرمایا کہ ہر انسان خطا کا مرتکب ہوتا ہے، لیکن بہترین خطا کار وہ ہے جس کو اپنی غلطی پر پشیمانی اور شرمندگی ہو، **کل بنی آدم خطاء و خیر الخطائین التوابون**، یہ اعتراف ہی انسان اور شیطان کے درمیان اصل وجہ امتیاز ہے، سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے ذرا سی چوک ہوئی تو وہ ندامت سے پانی پانی ہوگئے، اور اپنی لغزش سے کہیں بڑھ کر توبہ فرمائی، اور جب شیطان نے اللہ تعالیٰ کی عدول حکمی کی تو بجائے نادم

اور پشیماں ہونے کے اس نے تکبیر اور فخر کا راستہ اختیار کیا اور اسی چیز نے اس کو ہمیشہ کے لئے خالق کائنات کی نظر میں محروم و مغرور بنا دیا، پس برائی اور کوتاہ کاری پر ندامت اور اعتراف کے بجائے فخر ''ابلیسی صفت'' ہے، اور کسی شخص میں اس کیفیت کا پایا جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ روح آدمیت سے محروم اور مزاج شیطانی سے قریب ہو چکا ہے۔

مسلمانوں کو بھی سوچنا چاہئے کہ انہوں نے آج فخر و تعلّی کے جو بت تراش لئے ہیں، کیا یہ واقعی متاع فخر و اعزاز ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ دولت و ثروت آج ہمارے سماج میں وجہ افتخار بن چکا ہے، پرشکوہ عمارتوں پر فخر کیا جاتا ہے، ہماری خواتین کے لئے زیورات کی بھاری مقدار وجہ افتخار ہے، نکاح کی تقریبات میں جس قدر دولت کی نمائش مسلمانوں کے یہاں ہوتی ہے اور کھانے پینے کی دعوتوں میں ہمارے یہاں جس تنوع، اسراف اور فضول خرچی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور پھر اسے باعث فخر سمجھا جاتا ہے، یہ سب غلطی پر اعتراف کے بجائے غلطی پر افتخار کی مثالیں ہیں، رشوت اور کرپشن کس قدر لائق شرم فعل ہے، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس آمدنی کو بالائی آمدنی اور اوپر کی آمدنی کے لفظ سے ذکر کرتے ہیں، ماں باپ کو اپنے بال بچوں کی ایسی آمدنی پر شرمندگی اور خفت کے بجائے مسرت اور عجب کا احساس ہوتا ہے، اور جو شخص حلال پر قناعت کی وجہ سے سادہ زندگی گذارتا ہو، اسے بے وقوف اور بے عقل باور کیا جاتا ہے۔

سودی اداروں کی ملازمت ناجائز ہے، فلمی اداکاری ناجائز ہے، لیکن لوگ اپنا اور اپنے عزیزوں کا فخریہ تذکرہ کرتے ہیں، کہ یہ فلاں سودی ادارہ میں فلاں عہدہ پر ہیں، فلمی اداکاروں سے ملاقات کو اعزاز تصور کیا جاتا ہے، مسلمان تنظیمیں انہیں اپنے جلسوں میں عزت کے احساس کے ساتھ مدعو کرتی ہیں، اور ان کی شرکت کی تشہیر کرتی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ اور گناہ گاروں پر فخر کرنے ہی کی صورتیں ہیں، مسلمانوں میں شاید ابھی یہ بلا نہیں آئی، لیکن دوسری قوموں میں مغرب کے زیر اثر حسن کی نمائش کا جو ذوق چل پڑا ہے، اس نے سماج کو اتنا بے حیاء کر دیا ہے کہ والدین اپنی لڑکیوں کے حسن کے عریاں ہونے پر خوشی میں ناچتے اور رقص کرتے ہیں، ''حسنِ بے پردہ'' تو وجہ عار تھا، لیکن مردوں کی نگاہ

ہوس نے عورتوں کا استحصال کرنے کے لئے اسے وجہ افتخار بنا دیا۔

بعض لوگ بدزبان اور بدمزاج ہوتے ہیں، معمولی معمولی باتوں پر برہمی اور اپنے بزرگوں اور سماج کے باعزت لوگوں پر حرف گیری کا مزاج رکھتے ہیں، جس کو جو جی میں آیا کہہ دیا، بلکہ موقعہ ہوا تو دشنام طرازی سے بھی نہیں چوکے، پھر اسے فخریہ بیان کرتے ہیں، اسے اپنا کمال سمجھتے ہیں، یا اسے صاف گوئی کا عنوان دیتے ہیں، حالانکہ صاف گوئی کے معنی دوسروں پر طنز و تعریض یا تنقیص نہیں، اور اپنی ان نازیبا باتوں پر فخر بھی کرتے ہیں، کہ ہم نے فلاں کو ایسی کھری کھری سنائی اور فلاں شخص کو برسرِ عام ایسا اور ویسا کہا، حالاں کہ یہ سب قابل شرم باتیں ہیں نہ کہ قابل فخر، ان پر انسان کو شرمانا چاہئے نہ کہ اترانا۔

غرض گناہ پر شرمانے، لجانے اور عفو خواہ ہونے کے بجائے فخر کرنے، اترانے اور اپنی عزت محسوس کرنے کا ایک مزاج سا بن گیا ہے، یہ سماج کے بے ضمیر ہونے اور اس کے جوہر انسانیت کے مردہ ہوجانے کی ایک علامت ہے اور کیوں نہ ہو کہ حکمرانوں کا اثر رعایا پر پڑتا ہی ہے: الناس علی دین ملوکھم، جس سماج میں گناہ پر فخر ہونے لگے اور غلطی وجہ ندامت ہونے کے بجائے وجہ افتخار قرار پائے، وہاں برائیاں پنپتی ہی رہیں گی، اور جو روظلم میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا، کیوں کہ جب گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھا جائے تو گناہ پر ٹوکنے والی زبانیں اور گناہ سے روکنے والے ہاتھ کہاں رہیں گے؟ جو لوگ خدا پر اور آخرت پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں ان سے گناہ پر فخر کرنے کے بابت کیا شکوہ کیا جائے، اصل شکوہ تو اپنے ان بھائیوں سے ہے جو دین حق کے حامل و ترجمان ہونے کے باوجود گناہ کے بارے میں اتنے جری ہیں کہ انہوں نے نیکی و بدی کی اصطلاحیں ہی بدل دی ہیں اور برائیوں کو نیکی کا نام دے دیا ہے!

فسادات کا سبق

گجرات کے حالیہ فساد نے ایک بار پھر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک طبقہ نے اب تک ہندوستان کے ہمہ مذہبی اور ہمہ تہذیبی کردار کو قبول نہیں کیا ہے، جو لوگ اس ملک میں اقلیتوں کے بھارتیہ کرن کا نام لیتے ہیں اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے قومی دھارے میں شامل ہونے کی خواہش کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ اقلیتوں کو اپدیش دینے کے بجائے اکثریتی طبقہ میں پائے جانے والے فرقہ پرست عناصر کی صحیح تربیت کریں اور ان کو انسانی زندگی کی اہمیت کا سبق پڑھائیں۔

گجرات کے حادثہ میں غیر جانب دار ذرائع کا خیال ہے کہ دو ہزار سے زیادہ مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ان میں بڑی تعداد خواتین اور کمزور معصوم بچوں کی ہے، انسان کو مارنے کا شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ اور بے رحمانہ طریقہ اس کو زندہ جلا دینا ہے، گجرات میں زیادہ تر یہی سفاکانہ طریقہ اختیار کیا گیا، حکومت کے حفاظتی عملوں نے دن کی روشنی میں کئے جانے والے اس جور و ستم پر نہ صرف خاموشی اختیار کی بلکہ بلوائیوں کی مدد بھی کی اور ستم زدہ لوگوں کے ساتھ مزید یہ ستم کیا کہ ان کی فریاد بھی صحیح طور پر درج نہیں کی گئی، گذشتہ چند سالوں میں یہ ریاست کئی بھیانک فسادات سے گذری ہے، ہر فساد نے پہلے فساد کے ظلم و جور کا ریکارڈ توڑا ہے اور انسانیت سوزی اور بربریت سے سبقت حاصل کی ہے، جہاں اس ریاست میں بار بار مسلم کش فسادات ہوئے ہیں وہاں قدرت نے بار بار انہیں جھنجھوڑا بھی ہے، زلزلہ کے حادثہ کو تو ایک سال سے ہی زیادہ عرصہ ہوا ہے، اس سے پہلے ایک کم گشتہ بیماری پلیگ نے بھی اسی ریاست کو اپنے پنجہ انتقام میں

کس لیا تھا، طوفان اور سیلاب نیز گجرات کے ایک حصہ میں بدترین خشک سالی ان کے علاوہ ہے، کیوں کہ خدا کو اپنی بسائی ہوئی اس بستی میں ظلم و جور سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں، نہ معلوم اب قدرت کے دست انتقام کے ہاتھوں یہاں کیا کچھ ہونے والا ہے!

اس فساد میں کئی باتیں قابل توجہ بھی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ جہاں وی، ایچ، پی کے جنونیوں اور مفسدوں نے ظلم و جور کی خونی داستان اپنی آدم خور اور انسانیت سوز ترشول سے لکھی ہے، وہیں ہندوؤں کو نہ صرف روا رکھتا ہے بلکہ قتل و غارتگری کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

مسلم آبادی میں جو غیر مسلم رہے ہوں اور فساد کے دوران مسلمانوں نے ان کے ساتھ بہتر اخلاق کا سلوک کیا ہو، ضرورت ہے کہ ان کے تأثرات لکھائے جائیں؟ آڈیو اور ویڈیو کے ذریعہ ان تاثرات کو محفوظ کیا جائے اور غیر مسلم بھائیوں تک انہیں پہونچایا جائے، اگر الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا تک ان تأثرات کے لئے رسائی حاصل کی جاسکے تو کیا کہنے ہیں! کیوں کہ آپ بیتی اور خود گذشت کا اثر انسان پر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے بنانا چاہئے، جن دیہات اور قریہ جات میں چند مسلمان گھر آباد ہیں یا شہر کے جن اکثریتی محلے میں چند مسلمان رہتے ہیں، ہندوستان کے موجودہ حالات میں نہ صرف ان کی جان و مال اور عزت و آبرو بلکہ ان کا دین و ایمان بھی خطرہ میں رہتا ہے، وہ فسادات میں اس طرح روند دیئے جاتے ہیں جیسے ہاتھی کی زد میں چیونٹیاں آجائیں، معاشی اعتبار سے بھی ان کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں، غیر مسلم تہذیب و ثقافت بھی انہیں متأثر کرتی جاتی ہے، بارہا یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ایسے علاقوں میں بسنے والے مسلمان اپنی شکل و صورت لباس و پوشاک نیز بول چال اور رکھ رکھاؤ سے ذرا بھی پہچانے نہیں جاتے، بعض علاقوں میں تو ان کے ناموں میں بھی مسلمانیت کی خو، بو باقی نہیں رہی، اور ایسا بھی ہوا کہ مخلوط معاشرہ اور مغلوب ثقافت کی وجہ سے برادران وطن کے تہواروں وغیرہ میں بے تکلف اور پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور پوجا پاٹ وغیرہ میں بھی انہیں کوئی عار نہیں ہوتی، گویا آہستہ آہستہ وہ دین و ایمان سے بھی

محروم ہوتے جارہے ہیں۔

اس ساری صورتحال کا ایک اہم سبب معاشرہ کا اختلاط ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی سے الگ اپنی آبادیاں بنانے کا حکم دیا، قبیلۂ خشعم کے کچھ لوگ غلط فہمی میں مارے گئے، آپ ﷺ نے ان کے سلسلہ میں فرمایا: جو مسلمان کسی مشرک کے ساتھ بود و باش رکھتا ہو، میں اس سے بَری ہوں، ''انی بریئ من کل مسلم مع مشرك '' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں میں سے ایک کی آگ دوسری طرف نظر نہیں آنی چاہئے۔''الا لا ترأی ناراھما ''(نسائی:۴۷۷۷)اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ سیوطی نے''نہایہ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

''مسلمان پر یہ بات لازم و واجب ہے کہ اس کا گھر مشرک کے گھر سے دور ہو، ایسی جگہ نہ رہا جائے کہ جب وہاں آگ سلگائے تو مشرک کو اپنے گھر سے نظر آئے''

(شرح نسائی: موسوعۃ السنۃ وشروحھا: ۳۷/۱۶)

حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے امن پسند افراد کی بھی تھی جنہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو اپنے یہاں جگہ دی، اور ان کی جانیں بچائی، بلکہ اپنی اس ہمدردی اور انسانیت کی وجہ سے وہ فرقہ پرستوں کی لعنت و ملامت، دھمکیوں اور سنگ باریوں کا نشانہ بھی ہے، اس سے امید کی ایک کرن نظر آتی ہے کہ انسانیت ابھی زندہ ہے، ایسا نہیں ہے کہ تمام ہندو خونخواری اور آدم کُشی پر اتر آتے ہیں بلکہ یہ ایک چھوٹا سا گروہ ہے، عام ہندو سماج قتل و غارت گری کو ناپسند کرتا ہے اور انسانیت، بھائی چارا اور رواداری پر یقین رکھتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ فرقہ پرست میڈیا جو زہر افشانی کر رہا ہے، ہم ان پروپیگنڈوں کے زہر سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کریں اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں انہیں حقائق سے آگاہ کریں، گروپ میٹنگ، ہندو مسلم مخلوط اجتماعات اور شخصی ملاقاتوں کے ذریعہ ہم برادرانِ وطن تک پہونچیں، اور انہیں صحیح صورتحال سے آگاہ کریں، مسلمان اس کام کو مہم کے طور پر منصوبہ بند طریقہ سے پورے ملک میں انجام دیں، مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈوں کی

جو جنگ چھیڑی گئی ہے یہ اس کا مثبت اور مؤثر جواب ہوگا۔

اس واقعہ کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہاں ہندو کم تعداد میں، ہندوؤں نے اس علاقہ کو خالی کر کے ہندو اکثریت محلّہ میں جانے سے انکار کر دیا اور انہوں نے اپنے مسلمان پڑوسیوں پر پورے اعتماد کا اظہار کیا، یہ بہت خوش آئند بات ہے اس سے مسلمانوں کی اخلاقی برتری اور کردار کی بلندی ثابت ہوتی ہے، ایسے واقعات کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا چاہئے، حق وسچائی نے توپ وتفنگ اور فولاد وآہنگ کی طاقت سے معرکے نہیں جیتے ہیں، بلکہ اخلاق وکردار کی طاقت اور دلیل و برھان کی قوت سے دشمنوں کے قلوب کو فتح کیا ہے، جنگ وجدال کی فتح سامانیاں اور ظفر بندیاں وقتی اثر ڈالتی ہیں، لیکن ان کا اثر دیرپا نہیں ہوتا، جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، یہی کامیابی ان کے لئے آہستہ آہستہ لوگوں کی نفرت کا باعث بنتی جاتی ہے۔

لیکن! قلب ونظر کی فتح کا معاملہ اس سے مختلف ہے، یہ دھیرے دھیرے اپنا قدم بڑھاتی ہے، اور لازوال کامیابی سے انسان کو ہم کنار کرتی ہے، اسی چیز نے اسلام کو اس کی ابتدائی دور میں غلبہ عطا کیا ہے اور یہی چیز ہر عہد میں مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے، انسانی جان و مال اور عزت وآبرو کا احترام مسلمانوں کی فطرت میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان ہے ہی وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے محفوظ رہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: مؤمن ہے ہی وہ جس کا پڑوسی اس کے شر سے عافیت میں رہے، آپ ﷺ نے غیر مسلم بھائیوں کے خون اور مال کو وہی درجہ دیا جو خود مسلمانوں کی جان و مال کا ہے، اسلام کی یہ تعلیمات برادران وطن تک نہیں پہونچی، انہیں بتایا گیا ہے کہ اسلام ایک ناروادار، سخت گیر اور متشدد مذہب ہے، جو دوسرے اہل مذہب کے ساتھ بدسلوکی جس کا رہن سہن کسی مشرک کے ساتھ ہو وہ اسی کے جیسا ہے، ''**جامع المشرك وسكن معه فانه مثله**'' (ابوداؤد حدیث نمبر: ۲۷۸۷) ــــ علامہ خطابی نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ساتھ ان کے علاقہ میں رہنا درست نہیں، ''**فلا يجوز لمسلم ان يساكن للكافر في بلادهم**'' (موسوعۃ السنۃ وشرحھا: ۱۰۵/۹)

یہاں حدیث کا منشاء یہی ہے کہ مسلمانوں کے محلے اور آبادیاں علیحدہ ہونے چاہئے، علیحدہ آبادی میں ان کی جان کی بھی حفاظت ہے جیسا کہ ظاہر ہے، مال وکاروبار کی بھی حفاظت ہے، اس آبادی میں وہ اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ زندگی گذار سکیں گے، اور اجنبی ثقافت سے اپنے آپ کو بآسانی بچاسکیں گے، جو اسلامی معاشرت کا بنیادی مزاج ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کی مشابہت اختیار کرنے کو منع فرمایا ہے، ایسی آبادیوں میں دینی تحریکات بھی اپنے کاموں کو بہتر طور پر انجام دے پاتی ہیں اور اس کی وجہ سے مذہبی وابستگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مخصوص ماحول میں مسلمانوں کی علیحدہ آبادی سے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشرتی مفادات بھی متعلق ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ ریاستی اسمبلی نیز پارلیامنٹ میں مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے ان کی نمائندگی بہت ہی کم ہے، مثلاً خود گورنمنٹ کے اعداد وشمار کے مطابق بہار اور یوپی میں مسلم آبادی کا تناسب پندرہ فیصد ہے، اس لحاظ سے بہار میں ان کے ارکان اسمبلی پچاس کے قریب اور یوپی میں ساٹھ سے اوپر ہونے چاہئیں، اسی طرح آندھرا پردیش میں نو فیصد کے قریب مسلم آبادی تسلیم کی گئی ہے، اسی لحاظ سے پچیس سے زیادہ مسلمان ارکان اسمبلی ہونے چاہئیں، لیکن عملاً نمائندگی کا تناسب اس سے بہت کم ہے، کیرالہ میں مسلم آبادی کا تناسب بہار ویوپی ہی سے قریب ہے، لیکن وہاں مسلمان نمائندوں کی تعداد ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہے اور ان کے تعاون کے بغیر کوئی سرکار بن نہیں پاتی، اس کی بنیادی وجہ کیرالا میں مخصوص علاقوں میں مسلمان آبادی کا ارتکاز اور دوسرے علاقوں میں مسلم آبادی کا بکھراؤ ہے، مسلمان اگر مختلف علاقوں میں اپنی آبادی کے جزیرے قائم کرلیں اور بتدریج وہاں اپنی آبادی کو مجتمع کرلیں تو مستقبل میں ایسی سیاسی طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں کہ وہی اس ملک کے بادشاہ گر ہونگے اور انہی کے قلم سے حکمرانوں کی تقدیر لکھی جائے گی۔

معاشی اعتبار سے بھی آبادی کا ارتکاز ایک مفید عمل ہوگا، کیوں کہ اس آبادی کی ضروریات کے لئے جن دکانوں اور چھوٹی صنعتوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ مسلمانوں کے

ہاتھ میں ہونگے ،آج صورت حال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے صنعت وتجارت میں اپنے قدم آگے بڑھائے تو فرقہ پرست عناصر انہیں چن چن کر نشانہ بناتے ہیں اور بعض متعصب صنعت کار بھی نہیں چاہتے کہ انہیں ابھرنے دیں، جب مسلمانوں کی اپنی محفوظ آبادیاں ہوں گی ،تو آپ وہاں کل کارخانے بھی قائم کرسکیں گے ،اورآپ کو اپنی تجارت کے لئے ایک مناسب مارکیٹ بھی ہاتھ آجائے گا ،اس لئے یہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے باشعور اور معاشی اعتبار سے مستحکم طبقے اس حقیقت کو محسوس کریں ، وہ دور دراز بسنے والے غریب بھائیوں کو اپنے سینے سے لگائیں ،انہیں مناسب قیمت پر اور ادائے گی کی مہلت کے ساتھ زمینیں فراہم کریں اور مسلمان نسبتاً زیادہ بسائیں کہ اس میں نہ صرف ان کی حفاظت ہے بلکہ وہ آپ کی حفاظت کے لئے بھی بہترین ڈھال کا کام کریں گے۔

(۲۰۰۲ء)

مردم سوزی

انسانیت سوزی کا بدترین نمونہ

آہ، اے مظلومانِ گجرات! اور صد آہ، اے ستم زدگانِ دنیائے بے ثبات!! جو مظالم تم بے گناہوں پر ڈھائے جا رہے ہیں، کیوں کر ان کا بیان ہو؟ قلم کا جگر شق ہو جائے تو تعجب نہ ہونا چاہئے، کہ اگر پتھروں کو دیکھنے کی قوت میسر ہوتی، تو شاید وہ بھی اس بربریت کو دیکھ ریزہ ریزہ ہو جاتے اور سمندر کو رونے والی آنکھیں نصیب ہوتیں، تو شاید ان کے بھی سوتے خشک ہو جاتے، ایسا جور و جفا جنہیں دیکھ کر درندے بھی شرم سے پانی پانی ہو جائیں، اور ایسا ظلم و ستم جنہیں سن کر تاریخ کے ستم شعار لوگوں کی روح بھی وجد میں آجائے، زبان و قلم کی کیا مجال کہ ان مظالم کے شایانِ شان مرثیہ کہے، ان آنکھوں کے سفید اور ٹھنڈے آنسو اس انسانیت سوزی پر کیا قربان ہوں، اگر قلب و جگر کی آنکھیں ہوتیں، اور وہ گرم و حرارت انگیز خون ولہو کے آنسو نچھاور کر سکتیں تو شاید کچھ اس غم کا بیان ہو سکتا، ____ صد ہزار رحمتیں ہوں تمہاری جان پر سوز اور روح شہادت شعار پر، جو جرم بے گناہی کی سزا پا رہے ہیں، اور جنہیں صرف اس لئے آتش نمرود میں جھونکے جانے کی سنت ادا کرنی پڑ رہی ہے کہ وہ خوئے آزری کو قبول کرنے کو تیار نہیں، اور دین ابراہیمی کا علم تھامے ہوئے ہیں؟ ____ تم پر خدا کی بے پناہ رحمتیں ہوں، اور تمہارے لئے خدا کے نام پر مرنا مبارک ہو!!

کتنی عجیب بات ہے، کہ جو لوگ اہنسا اور عدم تشدد کی بات کرتے ہیں، جو انسانی ضرورت کے لئے جانوروں کو ذبح کرنے کو بھی منع کرتے ہیں، ان کا حقیقی چہرہ آج دنیا اپنی چشم سر سے دیکھ رہی ہے، کہ خون خواری و خوں آشامی سے ان کو لطف آتا ہے، اور انسان سوزی کا

تماشا ان کی آنکھوں کو روشن کئے دیتا ہے، اور اس پر حیرت نہ ہونی چاہئے کہ سنگھ پریوار جس دھرم راج کی نمائندہ و ترجمان ہے اس میں پہلے سے انسانیت سوزی کی روایت چلی آرہی ہے، چنانچہ شودر یعنی نچلی ذات والوں کے بارے میں منوجی نے جو قانون مقرر کیا تھا، اس میں دو دفعات اس طرح ہیں:

> اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لے کر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کرکے اس کے حلق میں اتار دی جائے۔
>
> (۸:۲۷۱)
>
> اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجہ اس کے منھ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے۔ (۸:۲۷۲)

مردم سوزی کی تاریخ بہت قدیم ہے، اسلام سے پہلے خاص طور پر ان لوگوں کو یہ سزا دی جاتی تھی، جو اپنے روایتی مذہب سے منحرف ہو جائیں، اس سلسلہ میں دو واقعات کا ذِکر تو خود قرآن میں بھی ملتا ہے، ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اور دوسرے اصحاب الاخدود (خندق والوں کا)، حضرت ابراہیم علیہ السلام جس ماحول میں پیدا ہوئے، اس میں شرک کی متنوع صورتیں پائی جاتی تھیں، بتوں کی پوجا عام تھی، اور بڑے بڑے بت خانے بنے ہوئے تھے، قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات کواکب پرست بھی تھے اور چاند، سورج اور ستارے سبھی کی پوجا کرتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے ایک مباحثہ بھی ہوا، ان میں بادشاہ پرستی کا مرض بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اس سلسلہ میں بادشاہ وقت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ہونے والے مکالمہ کو نقل کیا ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت ہی بردبار، نرم خو اور شفیق انسان تھے، اور انہوں نے ہر طرح اپنی قوم کو اس برائی کی طرف متوجہ کرنا چاہا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھے، لیکن وہ آپ کی اس خیر خواہانہ کوشش کو ذرا بھی خاطر میں نہ لائے، اور اپنی مشرکانہ روش پر ڈٹے رہے، بالآخر حکومت اور عوام نے مل کر بیک آواز فیصلہ کیا کہ آپ کو زندہ نذر آتش کر دیا جائے، اور یہ شب و روز کی بحث ہی باقی نہ رہے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا، اور اس بندۂ وفا شعار

کے رضا بقدیر کو دیکھئے کہ اپنے رب سے یہ بھی درخواست نہ کی کہ مجھے اس آگ سے بچانے کا سروسامان کیا جائے، کیوں کہ خدا کی راہ میں اپنے گوشت و پوست کو جلانے اور اپنی ہڈیوں کو کوئلہ بنانے سے بڑھ کر کسی مؤمن وفا شعار کے لئے اور کیا عمل ہوسکتا ہے؟

قرآن مجید میں دوسرا واقعہ ''اصحاب اخدود'' (خندق والوں) کا آیا ہے، (البروج، آیت نمبر:۴) ــــ یہ حق پرست عیسائی تھے، جو دینِ حق پر ایمان رکھتے تھے، اسی کی پاداش میں ان کے لئے گہری خندقیں کھودی گئیں اور انہیں آگ سے پاٹ دیا گیا، پھر جو اہلِ ایمان تھے انہیں ایک ایک کر کے اس خندق میں پھینکا جاتا، یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتے، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اس طرح کے کئی واقعات متعدد صحابہؓ سے منقول ہیں، اسی لئے اہلِ علم کا خیال ہے کہ ایسے واقعات ایک سے زیادہ دفعہ پیش آئے ہیں، تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض واقعات میں بیس سے چالیس ہزار افراد اسی طرح زندہ نذر آتش کر دیئے گئے۔

خود عیسائیوں میں جو مذہبی جھگڑے کھڑے ہوئے اور مختلف مذہبی فرقوں کا وجود ہوا، تو جو فرقہ طاقت حاصل کر لیتا وہ اپنے مخالفین کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لئے مذہبی عدالتیں قائم کرتا، قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے جان ڈیون پورٹ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مذہبی عدالت کے احکام سے ہلاک کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تک پہونچتی ہے (رحمۃ للعالمین: ۲/۲۵۴) عام طور پر یہ سزائے قتل اسی طرح جاری ہوتی تھی کہ مقدمہ کی معمولی سماعت کے بعد ملزم کو زندہ جلا دیا جاتا تھا، صرف اسپین میں جو عیسائی مخالف مذہبی عدالتوں کے حکم پر زندہ نذر آتش کر دیئے گئے ان کی تعداد بیس ہزار سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے، پروفیسر لیکی نے ''تاریخ اخلاق یورپ'' میں ایسی بہت سی مثالیں نقل کی ہیں۔

ارتداد اختیار کرنے والوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے متبعین پر بھی جب لوگ قابو پا جاتے تو ان کو نذر آتش کرنے میں انہیں خوب لطف آتا، صلیبی جنگوں کے درمیان جب ایک مرحلہ میں بیت المقدس پر عیسائیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے ستر ہزار مسلمانوں کو بشمول بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے شہید کیا ہی، لیکن یہودیوں کو ان کی مقدس قربان گاہ میں جمع کر کے ایک ساتھ نذر آتش کر دیا ــــ اسلام سے پہلے خود عربوں میں بھی انسان سوزی کی

بہیمانہ خو پائی جاتی تھی، منذر بن امرأالقیس جنگ آوارہ میں قبیلہ بنو شیبان پر فتح یاب ہوا، تو اس نے ان کی عورتوں کو زندہ جلانا شروع کر دیا، اور بعض لوگوں کی منت، سماجت پر بڑی مشکل سے اس سے باز آیا، عمرو بن منذر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نذر مانی تھی کہ بنو دارم پر غلبہ پانے کے بعد اس کے سو آدمیوں کو زندہ جلادوں گا، چنانچہ وہ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوا، قبیلہ کے ننانوے افراد ہاتھ آ گئے، اس نے ان سب کو نذر آتش کر دیا، ایک شخص کی کمی باقی رہ گئی تھی، بدقسمتی سے اس وقت ایک دوسرے قبیلہ کا ایک شخص وہاں سے گذر رہا تھا، اس نے بھنے ہوئے گوشت کی بو محسوس کی، تو آگے بڑھ کر جھانک کر دیکھا، کہ شاید کھانا پک رہا ہو، عمرو نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کو بھی آگ میں جھونک دیا تا کہ اس کی نذر تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے، زمانۂ جاہلیت کے شعراء نے ان قاتلین انسانیت کی بہادری اور شجاعت کے طور پر اس دل دوز واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ (دیکھئے: الجہاد فی الاسلام/۱۹۹۔۲۰۰)

ہندوستان میں انسان سوزی کی ایک شرمناک رسم رشتہ وتعلق اور محبت کے عنوان سے بھی پائی جاتی تھی، جو عورتیں بیوہ ہو جاتیں، ایک تو انہیں دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی، خواہ وہ کتنی ہی کم عمر ہوں، لیکن بیوہ عورتوں کے لئے مثالی طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلادی جائیں، اور اس کو ''ستی'' سے موسوم کیا جاتا، ایک تو ستی کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور اس کو باعث اجر وثواب اور سبب سعادت قرار دیا جاتا، اس لئے عورتیں خود رضا کارانہ اس اندوھناک عمل کے لئے تیار ہو جاتیں، دوسرے بعض اوقات شوہر یا اس لڑکی کے خاندان والے بھی اسے اس انسانیت سوز فعل پر مجبور کرتے، اور اس طرح آئے دن بے قصور و بے گناہ عورتیں اس رسم کی بھینٹ چڑھا دی جاتیں۔

اسلام نے اس غیر انسانی حرکت کو ختم کرنے اور ایسے ظالمانہ طریقہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کی نتیجہ خیز کوشش کی، اسلام نے کہا کہ یقیناً بعض جرائم ایسے ہیں، جن پر قتل کی سزا دینا جرم کے سد باب کے لئے ضروری ہے، لیکن اس کے لئے دو باتیں ضروری ہیں، اوّل یہ کہ جرم پوری طرح ثابت ہو جائے، اور وہ جرم واقعی اس درجہ کا ہو، دوسرے قتل بھی ایسے طریقہ پر ہو جو مقتول کو بہت زیادہ اذیت پہونچانے والا اور تکریم انسانیت کے پہلو کو مجروح

کرنے والا نہ ہو۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اگر جانور کو ذبح کرو تو بہتر طریقہ پر کرو، اور کسی مجرم کو قتل کرنے کی نوبت آئے تو قتل میں بھی بہتر طریقہ اختیار کرو، اگر کوئی باغی فطرت انسان جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو جانور کو جلادینے کا حکم ہے، کیوں کہ اگر وہ چلتا پھرتا رہے تو اس سے برائی کا چرچا پھیلے گا اور جب کسی چیز کا چرچا ہونے لگتا ہے تو اس سے بھی اس چیز کا چلن بڑھ جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں بھی یہ حکم دیا گیا کہ اولاً اس کو ذبح کردیا جائے پھر اس کے گوشت و پوست جلادیئے جائیں۔

آپ ﷺ نے عین میدانِ جہاد میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ کسی دشمن کو آگ میں جلانے کی سزادی جائے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مہم پر روانہ فرمایا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم فلاں اور فلاں شخص کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلادینا پھر جب ہم اپنے مہم پر روانہ ہونے لگے تو فرمایا کہ میں نے فلاں اور فلاں شخص کو جلادینے کا حکم دیا تھا، لیکن آگ سے عذاب دینا صرف اللہ ہی کا حق ہے، اس لئے ایسا نہ کرنا، البتہ اگر وہ تمہارے ہاتھ آئیں تو انہیں قتل کردینا، **وان لنار لا یعذب بھا الا اللہ فان وجد تموھما فاقتلوا ھما** (بخاری: کتاب الجہاد، حدیث نمبر: ۳۰۱۶) ــــ یہ بات متعدد روایتوں میں آئی ہے کہ آگ میں جلانے کی سزادینا اللہ ہی کے شایانِ شان ہے، کسی اور کو اس کا حق نہیں۔

اسلام میں کسی کو جلانے کی سزا نہیں دی جاسکتی، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور دوست ہو یا دشمن، نیز وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو، انسان تو کیا، جانوروں کو بھی جلانے کی ممانعت ہے، قرآن مجید میں پیغمبر خدا حضرت سلیمان علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعہ میں چیونٹیوں کے جلانے کا ذکر آیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ممکن ہے پہلی شریعتوں میں اس کی اجازت رہی ہو، لیکن شریعت اسلامی میں کسی حیوان کو بھی آگ میں جلانے کی سزا دینا درست نہیں (دیکھئے: الجامع لاحکام القرآن، ۱۳/۱۱۶) ــــ بلکہ بعض روایات میں جنگ کے موقع پر بلاوجہ سرسبز درختوں اور کھیتوں کو جلانے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، گویا نباتات کو بھی بلا وجہ جلا کر خاکستر کردینا درست نہیں، چہ جائیکہ انسان اور حیوان، اسی لئے اسلامی تاریخ میں

شاید ہی ایسی کوئی مثال مل سکے کہ مسلمانوں نے اپنے مفتوحین کے ساتھ یہ سنگ دلانہ سلوک روا رکھا ہو۔

عجیب بات ہے کہ جو لوگ دوسروں کو دہشت گرد اور امن شکن قرار دیتے ہیں وہ خود انسانیت کے خلاف ایسے گھناؤنے جرم کا منصوبہ بند طریقہ پر ارتکاب کر رہے ہیں، کہ درندے بھی ان کی درندگی پر شرمسار ہوں، اور آتش ظلم بھی ان کو دیکھ کر پانی پانی ہو جائے، ___ الٰہی! ان ننگِ انسانیت ظالموں کو ہدایت دے اور اگر ان کے لئے ہدایت مقدر نہیں تو اس زمین پر اُنس و محبت کی جو بستی تو نے بسائی ہے، اسے ایسے جفا شعار لوگوں اور درندہ نما انسانوں سے پاک فرمادے!!

(۳رمئی ۲۰۰۲ء)

درندگی کی فتح

آج کل بہت سی ایسی الکٹرانک مشینیں ہیں جن میں مشین کی اندرونی کیفیت کے اظہار کیلئے اسکرین لگے ہوئے ہیں۔ مشین میں کہیں سے بھی کوئی خرابی ہوتو فوراً اسکرین پر اس کا سگنل نمودار ہوتا ہے' اور جان لیا جاتا ہے کہ مشین کے فلاں پرزہ میں خرابی ہے' اللہ تعالیٰ نے انسان کی شکل میں جو خوبصورت' محیر العقول اور نازک مشین بنائی ہے اس میں بھی انسانی کیفیات کے اظہار کیلئے علامتی سگنل رکھے گئے ہیں' کچھ تو وہ ہیں جن کا تعلق انسان کی جسمانی کیفیات سے ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ بہت سی بیماریاں چہرہ' آنکھ' ہونٹ' زبان اور ناخنوں کی رنگت سے پہچانی جاتی ہیں۔ یا نبض کی حرکت کے ذریعہ ان کا علم ہوتا ہے۔ یہ گویا خود انسانی جسم میں لگے ہوئے اسکرین ہیں جن کے ذریعہ انسان کی اندرونی جسمانی کیفیات کا علم ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح انسان کی روحانی اور اخلاقی کیفیات کیلئے بھی قدرت کا ایک نظام ہے جسے سر کی آنکھوں سے دیکھا تو نہیں جاسکتا' لیکن محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انسان کوئی بھلائی کرے تو اس میں خوشی کا احساس ہوتا ہے' کوئی برائی کر گذرے تو خواہ وہ کتنی ہی لذت اور سرمستی کا باعث ہو لیکن بعد میں پچھتاوے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' ندامت و شرمندگی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو شرمسار محسوس کرتا ہے۔ یہ وہی اخلاقیات کا اسکرین ہے جو آدمی کو اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں حقیقی صورتحال سے آگاہ کرتا ہے۔

انسان کی اسی قوت احساس کو ''ضمیر'' کہا جاتا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کئی ارشاداتِ میں انسان کی اس فکری استعداد کی طرف اشارہ فرمایا ہے' مثلاً ایک صاحب نے کچھ سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اپنے دل سے سوال کرو''۔ اصل میں بعض دفعہ انسان کوئی کام

کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا ضمیر اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے، پھر نفس کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ آدمی ایسا کرنا بھی چاہتا ہے، اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کیلئے یہ بھی چاہتا ہے کہ کسی مستند و معتبر شخص سے اس کے جواز کی سند حاصل کرلے، ایسے موقع پر انسان کچھ الٹ پھیر اور ہیرا پھیری کے ساتھ سوالات کرتا ہے تاکہ اس کے نفس کے تقاضوں کے مطابق جواب مل جائے، ایسے ہی مواقع کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ خود اپنے ضمیر سے اس بارے میں سوال کر کے دیکھو، ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''گناہ وہ ہے جس سے تمہارے دل میں کھٹک پیدا ہو''۔ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں انسان کی اسی فطری قوت کی طرف اشارہ ہے جو برائی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو تھامنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسان کا اس سے محروم ہو جانا نہایت ہی محرومی اور کم نصیبی کی بات ہے، کہ انسان گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے اور اس کا ضمیر اس کو جھنجھوڑ نہ پائے، اس لئے کہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور کی نعمت عطا فرمائی ہے اور خیر و شر کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اگر شر کی طاقت اسے برائی کی طرف دعوت دیتی ہے تو خیر کی قوت اسے برائی سے روکتی ہے۔ اس معاملہ میں عقل و شعور اس کیلئے مدد معاون بنتی ہے اور اس کی فطرت سلیم بدی کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کھینچتی ہے اور کسی نے ایک دفعہ برائی کرلی تو اس پر شرمسار کرتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور طریقہ پر بھی فطرت انسانی کی اس صلاحیت کو سمجھایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو اسے شر کی طرف بلاتی ہے۔ دوسری وہ جو اسے خیر کی طرف بلاتی اور شر سے روکتی ہے۔ پہلا شیطان ہے اور دوسرا فرشتہ، (مشکاۃ المصابیح حدیث: ۷۴، باب فی الوسوسہ جلد ۱/۶۵)۔ پھر اگر انسان سے برائی سرزد ہو ہی جائے تو وہ از سر نو بدی سے نیکی کی طرف سفر کرتا ہے، اسی کو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان غلطی کرتا ہے۔ لیکن بہتر خطا کار وہ ہے، جسے غلطی کرنے کے بعد اپنے کئے پر پچھتاوا ہو۔

آپ نے اپنے اس ارشاد میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ غلطی پر پچھتاوا فطرت انسانی کا تقاضہ اور اس کا حصہ ہے۔ آپ دیکھئے شیر اور بھیڑیئے درندے ہیں، یہ صبح و شام

کتنے ہی بے قصوروں کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتے ہیں، لیکن کیا کبھی یہ بات سنی گئی کہ شیر کو اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہوتی ہو، سانپ رات کے اندھیروں میں کتنے لوگوں کو ڈس کر اپنی پیاس بجھاتا ہے، لیکن کیا کبھی اسے اپنی اس حرکت پر پچھتاوا بھی ہوا ہے؟ نہیں، کیونکہ درندوں کی فطرت میں چیرنا اور پھاڑنا ہی ہے۔ وہ ظلم کر کے خوش ہوتا ہے۔ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اسے سکون ملتا ہے۔ اسے کبھی اپنی ظلم وزیادتی پر پچھتاوا نہیں ہوتا ہے۔ ندامت وشرمساری ان درندوں کی ڈکشنری ہی میں نہیں ہے۔ وہ اس میں معذور ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی کو اس سے محروم رکھا ہے۔

لیکن انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان کیسا بھی برا ہو اور کتنا ہی گیا گذرا ہو۔ اس کی فطرت سلیمہ اسے نیکی کی طرف بلاتی اور برائی سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ کبھی انسان کا ضمیر سو جاتا ہے۔ لیکن یہی فطرت انسانی اسے جگاتی اور بیدار کرتی ہے۔ اسی لئے ایسے تو بہت سے واقعات پیش آتے ہیں کہ ایک شخص بڑا ظلم پیشہ ہے، اس نے قتل کا ارتکاب کیا، لوگوں کی جان اور عزت وآبرو سے کھیلا، ان کے مال واسباب لوٹے لیکن جب نشہ جور وستم اترا تو اب ضمیر نے اسے ملامت کرنا شروع کیا۔ یہ ضمیر کی پکڑ اتنی بڑی اور موثر ہوتی ہے کہ اس کا چین وسکون چھین لیتی ہے۔ اسے بے چین کر کے رکھ دیتی ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت سی ہو جاتی ہے۔ احساس کی یہ شدت بعض دفعہ ذہنی توازن کو بھی متاثر کر دیتی ہے۔ ایسے مجرمین ماہرین نفسیات سے رجوع ہو کر اپنی کہانیاں سناتے ہیں اور ذہنی تناؤ اور اندرونی بے چینی کے علاج کے طلب گار ہوتے ہیں۔

لیکن جب انسان بے ضمیر ہو جاتا ہے تو اسے نہ اپنے جرم پر کوئی ملامت ہوتی ہے، نہ مظلوموں کی آہ وفغاں اسے تڑپاتی ہے اور نہ اس کا ضمیر اس کے دل سنگ کے دروازہ پر کوئی دستک لگاتا ہے۔ ایسا انسان درندوں سے بھی بڑھ جاتا ہے کیوں کہ درندوں کی پیاس تو ایک دو انسان یا جانور کا خون پی کر بجھ جاتی ہے لیکن ایسے درندہ صفت انسانوں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ سینکڑوں ہزاروں انسانوں کا خون بھی اسے آسودہ نہیں کر پاتا۔ اس کو انسانی لہو میں وہ لذت ملتی ہے جو کسی بلانوش بادہ خوار کو جام جم کے پینے میں، جسے ایک سلیم الفطرت انسان

گلاب کی خوش رنگ پھلواری اور سبزہ زار کو دیکھ کر خوش ہوتا اور عش عش کرتا ہے۔ اسی طرح یہ جفا شعار انسان نما درندہ انسان کی تڑپتی اور جلتی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر وجد میں آتا اور لذت وسرور محسوس کرتا ہے۔ ایسے انسانوں پر شاید درندے بھی شرمندہ اور انگشت بدنداں ہوں کہ یہ کیسی مخلوق ہے جسے اس کے مالک نے زمین پر اصلاح کیلئے پیدا کیا تھا لیکن اس نے اپنی تخریب اور فساد میں ہم درندوں سے بھی آگے قدم بڑھالیا ہے۔

ایسے درندہ صفت لوگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں کیوں کہ خدا نے اس کائنات میں یہی نظم رکھا ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹے اور شبنم کے ساتھ شعلے بھی رہا کریں، ایسے ہی درندہ صفت انسانوں میں ایک نمایاں نام نریندر مودی کا ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ امن و آشتی اور صلح و رواداری کے داعی ونقیب مہاتما گاندھی جی بھی یہیں پیدا ہوئے اور نریندر مودی جیسے شخص نے بھی اسی زمین میں جنم لیا۔ درد اور درد کا درماں بھی' زخم بھی اور زخم کا مرہم بھی بھارت واسیوں کو اسی کھیت سے مل رہا ہے۔ مودی کی ظلم و زیادتی اور مردم آزاری وخوں آشامی پر تو جتنا افسوس کیجئے کم ہے ہی، لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک اور شرمناک بات یہ ہے کہ گجرات کے لوگوں نے جور وظلم کے جاری رکھنے کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ ایک بے ضمیر شخص کو رسوا کرنے کی بجائے اسے عزت دی گئی ہے۔ ظلم کے ہاتھ تھامنے کی بجائے اسے مزید طاقتور بنایا گیا ہے۔ یہ اور زیادہ شرمناک بات ہے اور انسانیت' جمہوریت اور رواداری کے نام پر کلنک ہے۔

درندی اور ظلم و جور کی اس فتح میں سیکولر پارٹیوں کا کیا قصور ہے؟ اسے تو وہ سمجھیں، لیکن اس میں ہم مسلمانوں کی غفلت شعاری اور کوتاہی کو کیا دخل ہے؟ اس کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے برادرانِ وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنانے اور ان کے دلوں سے شکوک وشبہات کے کانٹے نکالنے میں کیا محنت کی؟ اپنے پڑوسیوں سے اپنے تعلقات کو بہتر کرنا وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے اور اس پر ہر جگہ اور ہر سطح سے کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے سماج سے بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۔ سماج ہی انسان کا اصل محافظ ہے اور اس کیلئے معتدل اور خوشگوار تعلقات

ضروری ہیں، یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہوسکتا، اس کیلئے مسلسل اور متواتر محنت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم حوصلہ نہ ہاریں اور مناسب طور پر اس سمت میں کوشش کریں تو ہم ضرور برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر کر سکتے ہیں اور فرقہ پرست طاقتوں کا سحر توڑنے میں ہمیں کامیابی ہوسکتی ہے۔

دوسری ضروری بات حکمت اور مصلحت اندیشی سے متعلق ہے' کس وقت کس بات کا کیا اثر ہوگا؟ کونسی باتیں علی الاعلان کہنے کی ہیں اور کونسی باتیں چھپ کر پہنچانے کی ہیں۔ اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع سے جب حضرت نعیم ابن مسعود مسلمان ہوئے تو آپ نے انہیں اپنا ایمان چھپانے کا مشورہ دیا کیوں کہ اس وقت مسلمانوں کا مفاد اسی میں تھا۔ گجرات میں علما اور قائدین نے کانگریس کے حق میں متفقہ اپیلیں جاری کیں۔ ان اپیلوں کو سنگھ پریوار نے شر انگیزی کا ثبوت دیتے ہوئے فتوی سے تعبیر کیا، اس اعلان نے ہندو ووٹ کو متحد کیا اور جو ووٹ بکھرے ہوئے تھے مذہبی بنیاد پر ان کی صف بندی ہوگئی۔ اسی طرح سنگھ پریوار کی مراد برآئی اور درندگی نے انسانیت پر اور ظلم نے انصاف پر فتح حاصل کی۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے مواقع پر جوش پر ہوش کو غالب رکھیں اور جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقائق اور واقعات کو ملحوظ رکھیں۔

(۲۱ر دسمبر ۲۰۰۲ء)

ایک مظلوم کا مقدمہ۔ انصاف کی عدالت میں

مسلمانوں نے آزاد ہندوستان میں بہت سے غم دیکھے ہیں، چوٹیں سہی ہیں، زخم کھائے ہیں، دکانیں لٹائی ہیں، اپنے عزیزوں اور بزرگوں کی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں، کبھی کبھی عزت وآبرو کی قربانی بھی دینِ حق پر استقامت کی پاداش میں دی ہے اور اس ملک کے چپہ چپہ کو اپنے لہو کے انمٹ نقوش سے لالہ زار کیا ہے، لیکن ۶ ردسمبر کا زخم ایسا ناسور ہے جو کسی طور مندمل نہیں ہوتا، اور جب تک دوبارہ یہاں اللہ کا گھر نہ بن جائے اور اس کے میناروں سے اللہ کی کبریائی اور توحید کی اذان جانفزا بلند نہ ہونے لگے اس وقت تک اس غم کا مداوا نہ ہوسکے گا، مسلمانوں کی اگلی نسلیں بھی اس غم کو فراموش نہ کرسکیں گی، کہ متاعِ غم متاعِ حیات بن چکا ہے اور اسے لٹایا نہیں جا سکتا۔

فرقہ پرست عناصر کہتے ہیں کہ بابری مسجد رام جی کی پیدائشی مقام پر بنائی گئی ہے، یہ دعویٰ عقل ونقل اور تاریخ وآثار ہر پہلو سے غلط ہے، اولاً تو یہ بات ہی متعین نہیں کہ کیا رام جی کا حقیقی معنوں میں وجود تھا یا محض ایک افسانوی نام اور علامتی کردار ہے؟ کیونکہ رام جی سے وابستہ جو تاریخ ہندو مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اس کے توھماتی اور دیو مالائی ہونے میں کسی حقیقت پسند ہندو دانشور کو بھی شک وشبہ نہیں، اس لئے بہت سے ہندو دانشوروں کا بھی خیال ہے کہ رام جی، کی حیثیت ایک افسانوی کردار کی ہے نہ کہ حقیقی شخصیت کی۔ اگر مان لیا جائے کہ رام جی کا حقیقی وجود تھا اور آپ ایودھیا میں پیدا ہوئے تھے تو سوال یہ ہے کہ ایودھیا سے کون سا علاقہ مراد ہے؟ کیوں کہ حال ہی میں آثارِ قدیمہ کے ڈپٹی سپرینڈنٹ ایم وی این کرشنا راؤ نے انکشاف کیا ہے اور ثبوتوں کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ اصل ایودھیا ہریانہ کا مقام "بناوَلی" ہے (قومی آواز دہلی ۶ رمارچ ۹۸ء) واضح ہو کہ مسٹر

راؤ آثارِ قدیمہ کے ماہرین میں سے ہیں، رامپور کے ایک پنڈت جی کا دعویٰ ہے کہ رام جی کی پیدائش کی اصل جگہ رام پور ہے، اور اس سلسلہ میں اس کے پاس ثبوت موجود ہے، اس طرح کے دعویٰ کو بے دلیل نہ سمجھنا چاہئے، کیونکہ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شہر کسی نام سے معروف تھا اور یہ اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے کافی دور پہنچ گیا، شہر کے باشندے اور کاروباری نقل مکان کرتے رہے اور پھر وہی دوسری جگہ اس شہر کے نام سے موسوم ہوگئی۔

اگر ایودھیا وہی جگہ ہے جو اس وقت ''ایودھیا'' کہلاتی ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اس شہر میں رام جی کی پیدائش کس جگہ پر ہوئی؟ کیوں کہ اس وقت ایودھیا میں تقریباً نو دس ایسے مندر موجود ہیں جن کی بابت ان مندروں کے متولیوں کا دعویٰ ہے کہ یہی رام جی کی جائے پیدائش ہے، پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں رام جی کی اصل جائے پیدائش معلوم کرنے کے لئے باضابطہ ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اس کمیٹی نے کافی تلاش وجستجو کے بعد دو مقامات کے بارے میں اندازہ لگایا کہ شاید یہ رام جی کی جائے پیدائش ہو، ان میں سے ایک کا نام ''رام جنم استھل'' رکھا اور دوسرے کا ''رام جنم بھومی''، (DISPUTEDMOSQUE) یہ دونوں جگہیں بابری مسجد کے علاوہ ہیں، بابری مسجد کے محلِ وقوع کے رام جی کے جائے پیدائش ہونے کا ذِکر مفسد اور تفرقہ انداز انگریزوں سے پہلے نہ کسی تاریخی کتاب اور سفر نامہ میں ہے اور نہ ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں میں۔

اگر یہ بات فرض بھی کرلی جائے کہ رام جی کی جائے پیدائش وہی جگہ ہے تو بھی اس بات کا ثبوت مطلوب ہوگا کہ اس جگہ پر مندر بھی بنایا گیا تھا؟ اور اگر اس مقام پر مندر کے پائے جانے کا کوئی ثبوت ملتا ہے تب بھی یہ بات محتاجِ دلیل ہے کہ مسلمانوں نے اس جگہ جبراً مسجد بنائی ہے، کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مقام کے باشندوں نے اس جگہ کو مسلمانوں سے فروخت کردیا ہو اس لئے کہ مسلمانوں کے یہاں مسجد کی زمین خرید و فروخت نہیں کی جاسکتی، لیکن دوسری قوموں کے یہاں مذہبی عبادت گاہوں کے بارے

میں ایسا تقدس نہیں پایا جاتا، چنانچہ یورپ میں یہودی اور عیسائی بے تکلف اپنے چرچ فروخت کرتے رہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بابر نے اس مندر کو منہدم کر کے مسجد تعمیر کیا تھا، لیکن یہ بات تاریخی حقائق کی رو سے قطعاً ناقابلِ یقین ہے، کیونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بابر کبھی ایودھیا گیا بھی ہو، بابر نے خود ترکی زبان میں ''بابر نامہ'' تحریر کیا ہے نہ اس میں اس کا ذکر ہے اور نہ دوسرے مؤرخین نے اس کا ذکر کیا ہے، بابر نامہ کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر ایودھیا سے تقریباً ۷۲ میل دور مقیم ہوا تھا، چنانچہ پروفیسر سری واستو نے لکھا ہے کہ کوئی ٹھوس تاریخی شہادت ایسی موجود نہیں کہ بابر یا اورنگ زیب ایودھیا آئے ہوں، (بابر صفحہ ۹۳) پروفیسر آر ناتھ (یونیورسٹی جے پور راجستھان) نے بھی یہی لکھا ہے کہ بابر کبھی ایودھیا نہیں آیا، (بابر صفحہ ۹۶)

کسی شخص سے جو بات منسوب کی گئی ہو اس کی صداقت کو پرکھنے کے لئے ایک اہم طریقہ یہ ہے کہ خود اس شخص کے مزاج و مذاق کی اس سے مطابقت اور ہم آہنگی دیکھی جائے، اس پہلو سے بھی بابر کی طرف مندر کے منہدم کرنے کی نسبت قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے، کیونکہ بابر کٹر مذہبی قسم کا آدمی نہیں تھا اور مذہبی رواداری کا بہت ہی زیادہ لحاظ رکھتا تھا، منصف مزاج غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے، راجہ شیو پرشاد نے اپنی کتاب ''آئینہ تاریخ'' کے پہلے حصہ میں بابر کے عدل و انصاف اور نیک دلی کی بہت تعریف کی ہے، اس کے دور میں نظم حکومت میں بھی بہت سے ہندو شریک تھے، وہ ہندو جوگیوں سے بہت عقیدت سے پیش آیا کرتا، پروفیسر آر ناتھ کا بیان ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں کہ بابر کو متعصب ٹھہرایا جا سکے، پروفیسر سری رام شرما نے لکھا ہے کہ ایسی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ بابر نے کبھی کسی مندر کو توڑا ہو یا ہندوؤں پر مذہبی اختلاف کی بنا پر کوئی ظلم روا رکھا ہو، پروفیسر آر سی رائے چودھری لکھتے ہیں کہ بابر وہ بادشاہ تھا جس نے مذہبی رواداری اور برداشت کی پالیسی کا بیج بویا (بابر صفحہ ۸۰) مشہور محقق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' میں بابر کی

عالی ظرفی اور حسنِ سلوک پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، پروفیسر بنرجی نے ہندوؤں کے ساتھ بابر کے مخلصانہ برتاؤ اور کلیدی عہدوں پر ہندوؤں کے فائز کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کی طرف مندر اور مقدس مقامات کے مسمار کرنے کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے، اور پروفیسر سری واستو نے اپنی پوری تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ بابر پر الزامات اس کی شخصیت اور کردار سے قطعی میل نہیں کھاتے (بابر صفحہ ۸۲) یہاں تک کہ بابر نے اپنے وصیت نامہ میں گاؤکشی سے منع کیا ہے تاکہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں۔

رام شنکر اپادھیائے نے مارچ ۱۹۹۵ء میں بابری مسجد کے مقدمہ کی سماعت کرنے والی لکھنؤ بنچ کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے۔

> ''میں نے ہندو دھرم کی کتابیں پڑھی ہیں...... رام چرت مانش'' یا تلسی داس کے کسی دوسرے ساہتیہ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ ایودھیا میں شری رام کے مندر کو توڑ کر کوئی مسجد بنائی گئی ہو، ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب میں کوئی ایسا ذکر نہیں ملتا کہ رام چندر جی کے جنم استھل پر بابری مسجد بنائی گئی ہو یا رام چندر جی کی جنم استھل وہاں واقع ہوئی ہو جہاں بابری مسجد تھی۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ بات گھڑی کہ یہ مسجد مندر کو منہدم کر کے بنایا گیا ہے، اس مقصد کے لئے انگریز اسکالروں نے بابر نامہ کے ترجموں میں تحریف بھی کی اور اپنے قیاسات بھی ظاہر کئے کہ مسجد کے ستون غیر اسلامی ہیں وغیرہ، ورنہ حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس مسجد کو بابر نے نہیں بلکہ بابر کے نام پر اس کے ایک افسر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں تعمیر کیا تھا، اکبر کو چونکہ وحدتِ ادیان کا جنون سا تھا، اس لئے اس نے اس سے متصل چبوترہ پر رام کی مورتی بنوادی، ۱۹۴۶ء سے پہلے غالباً بابری مسجد کے محلِ وقوع کے سلسلے میں کوئی جھگڑا نہیں تھا بلکہ صرف اس بات کا جھگڑا تھا کہ ہندو اس چبوترہ پر مندر بنانا چاہتے تھے اور مسلمان اس سے روکتے تھے، مارچ ۱۹۸۵ء میں پہلی مرتبہ جب یہ مسئلہ

عدالت میں گیا اس وقت مہنت رگھو پرداس نے عدالت سے درخواست کی تھی کہ رام جی کو سردی گرمی اور برسات سے بچانے کے لئے چبوترے کو مندر میں تبدیل کرنے کی اجازت دی جائے لیکن ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو عدالت نے یہ عرض رد کردی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود ہندو بھائیوں کے یہاں بھی مندر کے انہدام اور مسجد کی تعمیر کا خیال پہلے نہیں پایا جاتا تھا۔

پھر غور کیجئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے غصب کی ہوئی زمین پر نماز پڑھنا جائز نہیں گو کہ نماز اس سے ادا ہو جاتی ہے لیکن مغصوبہ زمین پر نماز ادا کرنے والا گنہگار ہے اور ظاہر ہے کہ مسجدیں ثواب کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں نہ کہ گناہ کے لئے، تو کوئی مسلمان کیسے ایک زمین غصب کر کے مسجد تعمیر کرسکتا ہے؟ اس لئے نہ عقل اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، نہ تاریخ کی گواہی اس کے حق میں ہے، علم الآثار سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ عقل ہی اس دعویٰ کو قبول کرتی ہے، اس لئے بابری مسجد کا مسئلہ اس ملک کی جمہوریت اور نظام عدل کے لئے ایک چیلنج اور امتحان ہے جب تک اس مظلوم مسجد کو انصاف نہیں ملے گا اس ملک کی جمہوریت اور رواداری کا چہرہ داغ دار رہے گا۔

(یکم ر دسمبر ۲۰۰۰ء)

دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یوں تو اللہ تعالیٰ کا ہر حکم بندہ کے لئے واجب التعمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی نسبت سے جو گناہ بہ ظاہر معمولی نظر آتا ہے، وہ بھی غیر معمولی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں وہ ہیں، جن سے دین اور امتِ اسلامیہ کی شناخت متعلق ہے، ایسی ہی چیزوں کو قرآن مجید نے شعائر اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ بات فرمائی ہے کہ ان کی حرمت پامال نہ کرو، **لَا تحلوا شعائر الله** (المائدۃ:۱) اسی کو قرآن میں دوسری جگہ ''حرمت الله'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، (الحج:۳۰) اور بتایا گیا ہے کہ جو اللہ کی حرمتوں کی عظمتوں کو برقرار رکھے گا وہ اس کے لئے اس کے پروردگار کے نزدیک بھلائی کا سامان ہوگا، **فهو خير له عند ربه** (الحج:۳۰) یہ بھی ارشاد ہوا کہ اللہ کے شعائر کی تعظیم نیک دل اور خدا ترس ہونے کی علامت ہے، **ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب** (الحج:۳۲)

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا، اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب نے انہیں آ پکڑا، قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں ہیں، حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سفینۂ نجات بنایا، یہ بھی اللہ کی ایک نشانی تھی، آپ علیہ السلام کی قوم نے کشتی کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کا برتاؤ کیا، اور بالآخر پوری قوم عذاب خداوندی میں مبتلا ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے مطالبہ پر اونٹنی کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، جسے قرآن نے ''ناقة الله'' یعنی اللہ کی اونٹنی کا نام دیا ہے، اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ایسے عذاب میں گرفتار ہوئی کہ صفحۂ ہستی سے نام ونشان تک مٹ گیا، اس طرح کے کتنے ہی عبرت خیز واقعات ہیں، جو قرآن اور بعض دیگر آسمانی

کتابوں میں نشانِ عبرت کے طور پر مذکور ہیں۔

مساجد بھی شعائر اللہ میں داخل ہیں، یہ اللہ کی عبادت و بندگی کا مرکز ہیں، مسجد کو دیکھتے ہوئے غافل سے غافل بندہ کو بھی ایک لمحہ کے لئے سہی، اپنا خالق و مالک یاد آتا ہے، یہیں سے شب و روز اور بار بار اللہ کی توحید اور کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے، اس لئے یقیناً مسجدیں شعائر اللہ میں داخل ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مسجد کے احترام کا خصوصی حکم دیا، اور ناواقفیت میں اگر کبھی کسی سے کوئی بات احترامِ مسجد کے خلاف ہوگئی تو تنبیہ کے طور پر اس پر بھی برہمی کا اظہار فرمایا، مسجد کی عظمت و تقدس کے لئے یہ بات کافی ہے کہ انبیاء کرام نے عملی طور پر مساجد کی تعمیر میں شرکت فرمائی ہے، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اپنے مبارک ہاتھوں سے کعبۃ اللہ کی تعمیر کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے، اور مسجدِ نبوی میں پیغمبر اسلام ﷺ کے پتھر اٹھانے کا احادیث میں ذکر آیا ہے، اس لئے خدا کی نظر میں اس کے گھر کی جو اہمیت و عظمت ہے، اور اس کی حرمت و مرتبہ کی رعایت جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے۔

اس لئے مساجد کی بے حرمتی کرنے والے اللہ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے، دیر و سویر خدا کا ہاتھ ضرور انہیں آ پکڑے گا، قرآن مجید نے اس طرح کے ایک واقعہ کی طرف بہت واضح لفظوں میں اشارہ کیا ہے، اور وہ ابرہہ کے کعبۃ اللہ پر حملہ کی مذموم کوشش کا واقعہ ہے، ابرہہ یمن کا فرماں روا تھا، اور یمن میں اس وقت عیسائیت کو غلبہ حاصل تھا، فرماں روائے یمن چاہتا تھا کہ عربوں کا جو رجوع کعبۃ اللہ کی طرف ہے، وہ یمن کی طرف ہو جائے، چنانچہ اس نے ایک بہت عظیم الشان گرجا "قلیس" نام سے تعمیر کیا، اور عربوں سے خواہش کی کہ اب وہ کعبۃ اللہ کے بجائے یمن آ کر اس گھر کا طواف کیا کریں، اس دعوت میں مذہبی جذبہ کے ساتھ ساتھ معاشی مفاد کا خیال بھی کارفرما رہا ہوگا۔ کہ اتنے سارے لوگوں کے آنے کی وجہ سے یمن کی تجارتی منڈی اور زیادہ نفع بخش ہو جائے گی۔ اور باشندگان یمن کو مالی فوائد حاصل ہوسکیں گے۔

لیکن عربوں کے دل میں کعبۃ اللہ کی عظمت تھی، وہ ہرگز اس طرح نکل نہ سکتی تھی، اسی لئے بعض سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق بعض عربوں کی جانب سے قلیس کی بے حرمتی کی وجہ سے ابرہہ نے طے کرلیا کہ اسے مکہ پر چڑھائی کرنی ہے، چنانچہ ابرہہ ہاتھیوں کا ایک لشکرِ جرار لے کر حجاز کی طرف بڑھا، اور مکہ سے بالکل قریب آ گیا، عین اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابابیل پرندوں کا ظہور ہوا، جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں کنکری لے رکھی تھی، انہوں نے یہ کنکریاں برسائیں، اور کیا ہاتھی اور کیا ہاتھی بان؟ سبھی قرآن کی زبان میں ''کھائی ہوئی بھوس کی مانند'' ہوگئے، (الفیل) خدا کی قدرت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کی تذلیل کا کیسا سامان کیا کہ ایک معمولی پرندہ اور اس سے بھی زیادہ معمولی کنکریوں کے ذریعہ اس لشکر کا صفایا کر دیا گیا، یہ انسان کی تحقیر کی نہایت ہے!—

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اس مبارک گھر کو ظالم و جابر لوگوں کی دستبرد سے بچائے رہیں گے، **فَلَمْ ینله جبار قط** (مجمع الزوائد: ۲۹۶/۳)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں ایک فوج کعبۃ اللہ پر حملہ آور ہوگی، جب یہ فوج مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء نامی جگہ پر پہونچے گی تو پورے کے پورے لوگ از اوّل تا آخر زمین میں دھنسا دئے جائیں گے۔ **فاذا کانوا ببیداء من الارض یخسف باولهم و آخرهم** (بخاری، حدیث نمبر: ۲۱۱۸)

اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو چیزیں اسلام کے شعار کے درجہ میں ہوں، ان کی خاص اہمیت ہے، اور ان کے ساتھ بے حرمتی اسی قدر عذاب و عقاب کا موجب، چنانچہ اذان سنت ہے نہ واجب، لیکن اگر کسی جگہ تمام لوگ اذان کے ترک کر لینے پر اتفاق کر لیں تو چوں کہ یہ شعائر دین کی بے حرمتی ہے، اس لئے ان سے جہاد کا حکم ہے، مشہور فقیہ علامہ شامی امام محمد کا قول نقل کرتے ہیں:

> **لو اجتمع أهل بلدة علی ترکه قاتلتهم علیه** (ردالمحتار: ۴۹/۲)
> اگر کسی شہر کے لوگ ترک اذان پر اتفاق کر لیں تو اس بات پر ان سے جہاد کیا جائے۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں پیش آیا، یہ ایسا شرمناک واقعہ ہے کہ شاید اس پر شیطان کو بھی اپنی کم حوصلگی کا گلہ ہوا ہوگا، شاید ہی ایسی کوئی مثال ملے کہ اس شور و ہنگامہ کے ساتھ علی الاعلان بہ زور طاقت اخلاق وقانون کی تمام حدود کو پامال کرتے ہوئے کسی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کیا گیا ہو، منہدم ان غنڈوں نے نہیں کیا ہو جو غنڈہ گرد ہونے کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، بلکہ ان غنڈوں نے کیا کہ جن کی سیاسی قیادت ہندوستان کی سیاسی افق پر مہر و ماہ بن چکی تھی، مسلمان نہتے اور مجبور تھے، ستم رسیدہ اور کمزور تھے، پولیس نے ایودھیا میں غنڈہ کارسیوکوں پر گولیاں نہ چلا کر جو کچھ بارود بچا رکھا تھا، بےقصور اور پُر اَمن مسلمان احتجاجیوں پر ان گولیوں کو بے تکلف خرچ کیا، اور کتنے ہی جوان اور بوڑھے اور عورتیں اور بچے خاک وخون میں تڑپ اٹھے، جو لوگ اقتدار کے نشہ میں مست تھے وہ سمجھتے تھے کہ کسی مظلوم کا ہاتھ ان کی گردن تک پہونچ سکے گا؟ شاید انہیں اللہ کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔

لیکن مقامِ حیرت ہے کہ اللہ نے کس طرح ان کو ذلیل ورسوا کیا ہے، کلیان سنگھ جن کی راست حکومت میں یہ سب کچھ ہوا، ان کو خود ان کی پارٹی نے ایسا بے آبرو کر کے نکال باہر کیا کہ کم اس کی مثال ملے گی، ارون نہرو اور بوٹا سنگھ راجیو گاندھی کے زمانہ میں شیلا نیاس کرانے کے ذمہ دار تھے، ارون تو ایسی سیاسی موت مرے کہ نام ونشان بھی باقی نہ رہا، اور بوٹا سنگھ جو کسی زمانہ میں وزیر داخلہ تھے۔ آج جیل کی ہوا کھانے کے لئے تیار ہیں، نرسمہا راؤ ایسے مغرور وزیر اعظم تھے کہ کوئی ان کے سامنے پر نہیں مار سکتا تھا، لیکن آج ایسے یکہ وتنہا ہیں کہ عدالت نے ان کے لئے جو سزا مقرر کی ہے، اس پر کوئی آنسو بہانے اور اظہار افسوس کرنے والا بھی نہیں، اور ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں'' کی مثال بنے ہوئے ہیں، مسجد کی شہادت میں لاتور اور عثمان آباد کے شیو سینک سب سے آگے آگے تھے، زلزلہ نے انہیں اس طرح اپنی لپیٹ میں لیا، کہ اپنی ہولناکی اور تباہ کاری کے اعتبار سے وہ تاریخ کے مشہور زلزلوں میں سے ایک ہوگیا، سورت کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ جو حیوانیت برتی گئی، اور کھلے عام عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، سورت والوں نے پلیگ کی وباء کی

صورت میں اپنے اس ظلم کا مزہ چکھ لیا ہے، اور جن لوگوں کے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف بھی کیا ہے، 'ابھی کچھ اور چہرے ہیں، جو آج روشن نظر آتے ہیں، لیکن عذابِ خداوندی کا طمانچہ ان کو سیاہ فام کر کے رہے گا، خدا کے دشمن اپنی طاقت پر نازاں ہیں، اور غیبی طاقت ان پر خندہ زن ہے کہ:

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ سے

(۲۰/اکتوبر ۲۰۰۰ء)

تم صرف پیچھے ہٹے ہو!

رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو ایک فوجی مہم پر روانہ کیا۔ یہ حضرات گئے، مقابلہ بھی بہادری کے ساتھ کیا، لیکن مقابلہ میں جم نہ سکے اور راہ ﷺ فرار اختیار کرنی پڑی۔ جب مدینہ واپس آئے تو مارے شرم کے چھپے پھرتے تھے اور آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے، کہتے تھے کہ ہم لوگ تو بھاگے ہوئے لوگ ہیں، نحن الفرارون۔ آپ ﷺ داناؤں کے دانا اور حکیموں سے بڑھ کر حکیم تھے، موقع و محل کی خوب پہچان رکھتے تھے اور انسانی نفسیات سے خوب واقف تھے، آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ موقع زجر و توبیخ اور شرمساروں کو مزید شرمسار کرنے کا نہیں، بلکہ ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے کا ہے۔ آپ ﷺ نے لطف و کرم کا لب ولہجہ اختیار کیا اور فرمایا کہ تم بھاگے نہیں ہو بلکہ تم اس لئے پیچھے ہٹے ہو کہ پیچھے آ کر دوبارہ حملہ کرو، تم نے اس لئے پسپائی اختیار کی ہے کہ نئی کمک ساتھ لے کر مقابلہ پر اُترو، أنتم الكرارون، أنتم العكارون، یعنی اس واقعہ کو تم ''بزدلی'' کے بجائے ''تدبیر'' کا واقعہ بنا دو، گویا یہ ایک طرح کی فوجی تدبیر ہے کہ پیچھے ہٹ کر پھر مقابلہ کیا جائے، یہ ایک جنگی چال ہے نہ کہ شکست و ہزیمت۔

انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے، اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے اور ایک کا اندر کی دنیا سے۔ باہر کی دنیا میں ضروری ہے کہ اس کام کے لئے مطلوبہ وسائل اختیار کئے جائیں، فوجی اور سپاہی ہے تو اسلحہ اور حملہ کرنے اور دفاع کرنے کے آلات سے لیس ہو، تاجر ہے تو تجارت کا تجربہ اور ضروری سرمایہ رکھتا ہو، طالب علم ہے تو اس کے پاس کتابیں ہوں اور اچھے اساتذہ سے اس کا ربط ہو، انسان کے اندر کی دنیا سا کلا ''دل'' ہے اور اس کا سرمایہ حوصلہ و ہمت اور یقین ہے۔

کسی بھی اہم کام کے لئے حوصلہ اور یقین سب سے بنیادی ضرورت ہے، اس بات کا حوصلہ کہ وہ اس کام کو کر سکے گا، اس بات کا یقین کہ وہ اس کام کو ضرور اس کے انجام تک پہنچا کر رہے گا اور اپنے آپ پر اعتماد کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ راستہ کی مشکلات آسان کرتا ہے، منزل کی جستجو کو بڑھاتا ہے، ہمت وحوصلہ کی طاقت ظاہری وسائل کی کمی کا بدل ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ تاریخ میں کتنے ہی واقعات آپ کو مل جائیں گے کہ ایک بے سروسامان شخص اٹھا، نہ اس کے پاس فوج تھی نہ حکومت اور نہ مادی وسائل، لیکن بلند حوصلگی، عالی ہمتی، اپنے مقصد پر یقین اور خود اعتمادی نے اس کو اتنی طاقت بہم پہنچائی کہ اپنے زمانہ کے فراعین کی گردنیں بھی اس کے سامنے خم ہوگئیں اور وہ طوفانوں کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوگیا، اور ایسی مثالیں بھی آپ کو ملیں گی کہ وسائل کی فاوانی ہے اور تعداد کی کثرت ہے، لیکن پست حوصلگی اور کم ہمتی نے پوری قوم کو غلامی میں پابہ زنجیر کردیا۔

مسلمانوں نے بھی بحیثیت قوم اس کا خوب تجربہ کیا ہے، غور کیجئے کہ وہ مسلمان ہی تھے جو عرب کے ریگزار سے اٹھے اور افریقہ ویورپ سے مشرقِ بعید تک ابرِ رحمت کی طرح چھا گئے، محض سولہ سال کے ایک نوجوان نے سمندر پار اُتر کر ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک کو اسلام اور اسلامی نظام کی نعمتِ عظمیٰ سے ہم کنار کیا اور اسپین پر اپنی فتح مندی کے نقوش ثبت کئے اور وہ بھی مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں موجود علمی اور فنی لٹریچر کو عربی زبان میں منتقل کیا، تحقیق وریسرچ کا جو چراغ یورپ میں بجھ چکا تھا اور جہاں کسی سائنسی تحقیق اور نظریہ کا پیش کرنا بھی گردن زدنی جرم تھا، وہاں علم وفن کی نئی بزمیں آراستہ کیں اور تحقیق واکتشاف کی ایک نئی دُنیا کو وجود بخشا، یہ دراصل اسی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا کرشمہ تھا۔

اور وہ بھی مسلمان ہی تھے کہ جب تاتاریوں کا فتنہ اٹھا تو چند تاتاریوں کا وجود پوری مسلمان فوج کی شکست کے لئے کافی ہوتا تھا اور ایک تاتاری عورت بھی دسیوں مسلمان مردوں کو تہ تیغ کرسکتی تھی اور آج ہماری بدنصیب آنکھیں اس منظر کو دیکھ رہی ہیں کہ

مسلمانوں کے پاس دنیا کے بہترین معاشی ذرائع ہیں، کثیر افرادی وسائل ہیں، ذہانتیں اور صلاحیتیں ہیں، لیکن علم وتحقیق کے میدان میں ان کا درجہ صفر ہے اور عالمی سطح پر ان کا شمار پسماندہ اقوام میں ہے۔ اس میں بڑا دخل اسی کم ہمتی کو ہے۔ جب کسی قوم میں پست حوصلگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ہمت ہار دیتی ہے، تو پھر محنت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور وہ دشوار گزار راہیں طے نہیں کر سکتی۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں، وہ کسی بھی باعزت قوم کے شایانِ شان نہیں۔ سیاسی اعتبار سے وہ ایک منتشر انبوہ ہیں، افرادی قوت کے لحاظ سے ملکی سیاست پر ان کا کوئی اثر نہیں، معاشی اعتبار سے ان کی پسماندگی ضرب المثل ہے، نہ تجارت میں ان کا قابل لحاظ حصہ، نہ صنعت میں۔ سب سے افسوسناک بات مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور زبوں حالی ہی ہے، جس نے ان کو سیاسی شعور سے بھی محروم رکھا اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا ہے، اس لئے کہ اس دور میں ملازمت ہی نہیں، اعلیٰ درجہ کی صنعت وتجارت بھی تعلیم کی رہین منت ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ خود کوئی سیاسی قوت نہیں ہیں، اس بات نے عام طور پر مسلمان قائدین کو بے ہمتی کا شکار اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ مسلمان تجارت میں اترنے کا حوصلہ نہیں پاتے، معمولی تجارتوں پر قانع ہیں، صنعت اور کاروبار آج مقابلہ کا اصل میدان ہے اور سخت محنت اور اعلیٰ صلاحیت کے بغیر کوئی اسے سر نہیں کر سکتا، اس میدان میں قدم رکھنے سے بھی مسلمان گھبراتے ہیں۔ یہی حال تعلیم کا ہے۔ مسلمان طلبہ ایک طرح کی احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں، اعلیٰ مقابلاتی امتحان میں شرکت کا تناسب مسلمان طلبہ کا بہت معمولی ہے۔

ملک میں جہاں مسلمانوں نے بہت سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں، وہیں ایک ایسے ادارہ یا ٹیم کی بھی ضرورت ہے جو مختلف میدانوں میں ان لوگوں کی اخلاقی مدد کرے اور حوصلہ افزا مشورے دے، جن کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور وہ پست حوصلگی کے باعث میدانِ مسابقت چھوڑنے لگیں۔ کتنے ہی مسلمان طلبہ ہیں جو ساتویں جماعت کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں لیکن جماعت دہم تک نہیں پہنچ پاتے، کتنے مسلمان تاجر

ہیں جو اُبھرتے ہیں لیکن کسی وقتی واقعہ کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لے اس میدان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ یہی حال ہر شعبۂ زندگی کا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو ہمت دلائی جائے اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے پر آمادہ کیا جائے، ان کو اس تجربہ سے آگاہ کیا جائے کہ بعض طلبہ میٹرک میں فیل ہوگئے، لیکن پھر مسلسل اور مردانہ وار کوشش نے ان وک اس لائق بنادیا کہ انہوں نے اعلیٰ مسابقتی امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ تجارتی نقصان نے ان کو دیوالیہ کردیا لیکن بلند حوصلگی کے ساتھ محنت نے ان کو از سر نو کھڑا کردیا۔اسی طرح ان کو شکست اور بے یقینی کے دلدل سے نکال کر خود اعتمادی اور یقین سے بہرہ ور کیا جائے کہ شکست کے احساس اور پست ہمتی کے ساتھ کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی!!

(۲۷/مارچ ۱۹۹۸ء)

•••

چشمِ صیاد بہر سو نگراں آج بھی ہے

اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو عقیدہ خطِ امتیاز کھینچتا ہے وہ توحیدِ خالص کا عقیدہ ہے۔ ''توحید خالص'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اکیلا ہے، نہ کوئی اس کا باپ ہے اور نہ ماں، نہ بیوی اور نہ اولاد، نہ خاندان اور کنبہ، اپنی صفات اور اختیارات میں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا اور بے مثل ہے۔ حیات وموت، رزق میں وسعت اور تنگی، صحت اور بیماری، علم اور علم سے محرومی کی تمام کنجیاں اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، نہ کوئی طاقت کا دیوتا ہے، نہ کوئی تعلیم و رزق کی دیوی۔ توحید میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ حقوق ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی اور اس میں شریک و سہیم نہیں، عبادت اور بندگی اللہ ہی کی کرنی ہے، دُعاء اللہ ہی سے مانگنی ہے، اللہ ہی سجدہ کا مستحق ہے، حلال وحرام کرنے کی کلید اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، نہ اور کسی کی پوجا جائز ہے، نہ سجدہ کرنا اور نہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑنا، یعنی توحید ذات میں بھی ہے، ''صفات'' میں بھی اور ''حقوق'' میں بھی۔

اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں یا تو صریحاً شرک کے داعی ہیں یا اگر توحید کے قائل ہیں تو بالواسطہ شرک میں مبتلا ہیں۔ کوئی خدا کے لئے اولاد کا قائل ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ خدا نے بھی کائنات کے نظام کے لئے کابینہ بنا رکھی ہے اور اپنے اختیارات کو مختلف وزارتوں کے حوالہ کر دیا ہے، کوئی زبان سے خدا کو ایک کہتا ہے، لیکن اپنی پیشانی مختلف چوکھٹوں پر جھکاتا ہے، خالص اور بے آمیز توحید اسلام کی خصوصیت ہے اور یہ انسانیت کے لئے بہت بڑی رحمت ہے، یہ توحید مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور در در ہاتھ پھیلانے سے نجات دیتی ہے، انسانی مساوات و برابری کا یقین پیدا کرتی ہے، رنگ و

نسل کی بنیاد پر انسان اور انسان کے فرق کو مٹاتی ہے اور اسلام کی تمام تعلیمات کے لئے عنوان کا درجہ رکھتی ہے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر اور رسول آئے، ان سب کا اصل مشن یہی دعوتِ توحید تھا، پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین تھے اور ضرور تھا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ تصورِ توحید کو اس درجہ راسخ کر دیا جائے کہ ہمیشہ کے لئے علمی اور استدلالی اعتبار سے تصورِ شرک مغلوب اور مفتوح ہو جائے، آپ ﷺ نے اس دعوت کے لئے بے حد تکلیفیں اٹھائیں، گلیوں، کوچوں میں آبلہ پائی کی، چوٹیں کھائیں، پتھر کھائے، کڑوی کسیلی برداشت کی، فاقہ مستیوں سے گزرے اور ہر طرح کی تکلیف اٹھاتے ہوئے ایک ایک شخص کی خوشامد کی کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اقرار کرو اور کامیابی سے ہمکنار ہو، ''فولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا''۔

اسلام سے پہلے عقیدہ شرک کو ایسا فکری غلبہ حاصل تھا کہ جو مذاہب توحید کی دعوت لے کر اٹھتے تھے، وہ بھی شرک سے اپنا دامن بچا نہیں پاتے تھے۔ گوتم بدھ کی اصل تعلیم توحید ہی کی تھی، لیکن بتدریج بودھ مت ایک مشرکانہ مذہب بن گیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ایک ڈیڑھ صدی کے اندر ہی عیسائیت تثلیث کے سانچہ میں ڈھل گئی، خود ہندو مذہب کے قدیم مآخذ کو دیکھا جائے تو ان میں بھی نمایاں طور پر توحید کی تعلیم ملتی ہے، لیکن اس وقت ہندو مت شاید دُنیا میں مشرکانہ تصور کا سب سے بڑا نمائندہ ہے، جس کے پاس دیویوں اور دیوتاؤں کی اتنی بڑی فوج ہے کہ ان کا شمار کرنا بھی آسان نہیں۔

یہ اسلام کی انقلابی شان ہے کہ اس نے اس فکر کی کایا پلٹ کر کے رکھ دی اور عقیدۂ توحید کو ایسا غالب کیا کہ جو مشرک مذاہب تھے وہ بھی اپنے اندر توحید کے عناصر تلاش کرنے لگے، عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقہ پیدا ہوا، جس نے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا انکار کیا، ہندوؤں میں آریہ سماجی تحریک اٹھی جس کا مقصد مورتی پوجا کی مخالفت تھی، بہت سے مشرک مذاہب تو وہ تھے جو اسلام کی آمد کے بعد ناپید ہو گئے، یا ان کا دائرہ

اتنا محدود ہو گیا کہ ان کا شمار ناپید ہونے میں ہے۔

ہندوستان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہندو مذہب نے پہلے تو دوسرے مذاہب کو بزورِ طاقت ملک بدر کرنے کی کوشش کی، بودھ مت اور جین مت اس کی مثال ہیں، لیکن جب یہ بات ممکن نہ ہو سکی تو اس نے دوسرے مذاہب کو اپنے اندر جذب کرنے کی تدبیر کی اور اس میں اس کو بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی، بودھ مت اور جین مت عملاً اس وقت ہندو مت ہی کی ایک شاخ ہے، یہی حال گرونانک جی کے قائم کئے ہوئے ''سکھ مت'' کا ہوا۔ اسلام کے ساتھ بھی ہندو مت نے اپنی اس تاریخ کو دہرانا چاہا، وحدتِ ادیان کا تصور اور اس تصور کے تحت ہندوتاریخ کی مشہور ''بھگتی تحریک'' ایسی ہی کوششوں کا حصہ ہے، بعد کو اکبر اور داراشکوہ جیسے فرماں رواؤں کے ذریعہ اس تحریک کی تقویت کا سامان کیا گیا، جس کو اورنگ زیب عالمگیرؒ جیسے صاحبِ علم، صاحبِ دل اور بالغ نظر مدبّر نے ناکام کر دیا، جو اقبال کی زبان میں ''ترکش مارا خدنگ آخریں'' کا مصداق تھا۔

جو لوگ ہندوستان کو صرف ہندو مذہب کے زیرِ سایہ دیکھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ بات پریشانی کا باعث ہے کہ آخر صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان ہندو مذہب اور تہذیب میں کیوں ضم نہیں کئے جا سکے؟ اس لوہے کے چنے کو کس طرح پگھلایا جائے؟ اس کے لئے پہلے فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کیا گیا کہ مسلمان تنگ آکر اسلامی تصورات اور اسلامی تہذیب کا دامن چھوڑ دیں، لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور دنیا نے محسوس کیا کہ ایک مسلمان کے لئے اپنا آخری قطرۂ خون دے دینا زیادہ آسان ہے، لیکن وہ اپنے مذہب اور دین سے دستبردار نہیں ہو سکتے، پھر مسلمانوں کے شخصی قانون کو نشانہ بنایا گیا کہ اگر یہ قوانین نہ رہیں تو مسلمان اور برادرانِ وطن کے درمیان تہذیبی فاصلہ ختم ہو جائے گا اور شاید اس طرح وہ اس قوم کو اپنے ساتھ جذب کر لیں گے، لیکن ملتِ اسلامیہ ہند کی وحدت نے اس سازش کو بھی ناکام کیا۔

اس پس منظر میں فرقہ پرست عناصر نے محسوس کر لیا ہے کہ فکر و عمل کی اصل شہ رگ تعلیم گاہیں ہیں، جب تک تعلیم گاہوں سے توحید اور شرک کی اس دوئی کو مٹایا نہ جائے، یہ

مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا، اسی تناظر میں ایک طرف دینی درسگاہوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے، جو ادارے حقیقی معنوں میں انسانیت کے علمبردار ہیں، ان کو دہشت گرد کہا جارہا ہے اور دوسری طرف سرکاری درسگاہوں کے نصابِ تعلیم میں ایسی تبدیلی لائی جارہی ہے کہ وہ عملاً ہندو مذہب کا تعارف اور اس کی دعوت بن جائے اور دوسری قوموں میں کمتری اور محرومی کا احساس پیدا ہو، اس کے ساتھ ساتھ ''وندے ماترم'' اور ''سرسوتی وندنا'' پڑھنے کی تحریک شروع کی جارہی ہے، وندے ماترم مشرکانہ نظم ہے، جس میں زمین کو معبود کا درجہ دیا گیا ہے، یہ ایک ایسے قوم دشمن شخص کی نظم ہے جو انگریزوں کی آمد پر خوشی مناتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کا بیج بوتا ہے، سرسوتی جی ہندو بھائیوں کے یہاں تعلیم کی دیوی ہیں ''سرسوتی وندنا'' کا مطلب سرسوتی جی کی پوجا کرنا ہے، ان ناپاک تدابیر کا اصل مقصد ونشانہ یہی ہے کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو ہندو مذہب اور تہذیب میں جذب کرلیا جائے، وہ شرک سے مانوس ہو جائیں اور توحید کے پاکیزہ تصور سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں یا کسی اور قوم سے ان باتوں کا مطالبہ درحقیقت اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی اعتقادات اور تصورات سے سبکدوش ہو کر اکثریت کے مذہبی افکار کو قبول کرلیں، یہ بالواسطہ تبدیلی مذہب کی سازش ہے، یہ محض قومی مسئلہ نہیں، بلکہ خالص مذہبی اور اعتقادی مسئلہ ہے اور مسلمانوں کے لئے مذہبی اعتبار سے گویا یہ موت وزیست کا مسئلہ ہے۔

یہ نہ صرف اقلیتوں کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ ہمارے اس کثیر قومی ملک کے سیکولر کردار اور جمہوری اقدار کا بھی علانیہ قتل ہے، اس لئے یقیناً یہ ایسی بات ہے جو ہر محبِ وطن شہری کو تڑپا دے اور اس ملک سے پیار رکھنے والوں کو بے چین کردے۔

اسلام میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سب سے زیادہ مقدس مقامات ہیں، لیکن یہاں کی خاک بھی ان کے لئے لائق پرستش نہیں، انبیاءِ کرام اور محمد رسول اللہ ﷺ ان کی نگاہ میں سب سے زیادہ برگزیدہ شخصیتیں ہیں، لیکن وہ ان کی ''وندنا'' اور ''بندگی'' کے بھی قائل

نہیں، اس لئے وہ کیوں کر ایسے مطالبات کو پورا کر سکتے ہیں! پھر مسلمانوں نے اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی ہے، اگر انہوں نے عقیدہ و مذہب کے معاملہ میں جبر کا یہ راستہ اختیار کیا ہوتا تو شاید یہاں اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ نہیں ہوتا اور پورا برصغیر ایک مذہب اور ایک تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوتا، لیکن مسلمانوں نے مذہب وعقیدہ، تہذیب وتمدن یہاں تک کہ زبان کے بارے میں بھی کبھی جبرو دباؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ:

۱) وہ زیادہ سے زیادہ نجی عصری درس گاہیں قائم کریں، تاکہ سرکاری درسگاہوں کی اس ''مذہبی دہشت گردی'' سے محفوظ رہ سکیں۔

۲) نصابِ تعلیم میں ہونے والی زہر آلود تبدیلیوں اور نئی تاریخ لکھنے کی کوشش کا پوری قوت سے مقابلہ کریں اور سرکاری درس گاہوں میں ''وندے ماترم'' کے صرف لزوم ہی کی مخالفت نہ کریں، بلکہ ملک کے سیکولر کردار اور دستوری تحفظات کے پس منظر میں اس بات کی مہم چلائیں کہ کوئی بھی مذہبی نظم اسکولوں میں پڑھی ہی نہ جائے۔

۳) گاؤں گاؤں، قریہ قریہ دینی تعلیم کے جزء وقتی اور ہمہ وقتی مراکز قائم کریں، اس بات کا نظم کریں کہ کوئی مسلمان بچہ دین کی بنیادی تعلیم سے نا آشنا نہ رہے، نیز مسلمان اپنے زیر انتظام عصری درسگاہوں میں بنیادی دینی تعلیم کا اہتمام کریں اور طلبۂ وطالبات کو اسلامی تہذیب سے قریب کریں۔

۴) دینی مدارس اس وقت ہمارے ملک میں اسلامی اقدار کی حفاظت اور اسلام کے خلاف فتنوں کی مدافعت کا سب سے بڑا مرکز ہیں، ان کو تقویت پہنچائیں اور ان پر کوئی آنچ نہ آنے دیں۔

۵) اپنے بچوں کے دلوں میں شرک کی نفرت بٹھائیں اور عقیدۂ توحید کو ان کے دلوں میں خوب راسخ کریں۔

۶) نئی نسل کو منظم طور پر مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی، علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ سے روشناس کریں۔ ہندوستان کی سچی اور حقیقت پر مبنی تاریخ انہیں پڑھائیں، تاکہ

مسلمان بچے احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں اور وہ یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ ہم نے ہندوستان کو لوٹا نہیں، بلکہ اس ملک کو سنوارا ہے اور اس کو بہت کچھ دیا ہے۔

۷) برادرانِ وطن میں تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور سادہ ذہن لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی اور تقریری وتحریری طور پر بتائیں کہ وندے ماترم اور اس جیسی باتوں کا مطالبہ کرنا گویا ان سے اپنے دین ومذہب سے سبکدوش ہو جانے کا مطالبہ ہے۔

اگر ہم نے اس وقت اس جانب توجہ نہیں دی تو نہ معلوم مستقبل کا نقشہ کیا ہوگا؟؟_ کہ:

گوشۂ امن نہیں آج بھی بلبل کو نصیب
چشمِ صیاد بہر سو نگراں آج بھی ہے

(۱۴؍دسمبر ۱۹۹۸ء)

پھر کسی صلاح الدین ایوبیؒ کی ضرورت ہے!

۴۴ سال پہلے عالم اسلام پر ایک ایسی کاری ضرب لگی جس کا درد ہر باشعور مسلمان کو تڑپاتا ہے اور جس کی ٹیس ہر صاحب ایمان اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے، یہ زخم تھا ۷ر جون ۱۹۶۷ء کو مسلمانوں کے قبلۂ اوّل بیت المقدس پر اسرائیل کے قبضہ کا، افسوس کہ عام مسلمان یہاں تک کہ مسلم ممالک بھی اس ناقابل فراموش واقعہ کو فراموش کرتے جارہے ہیں، کسی قوم کے لئے سب سے بڑی محرومی کی بات یہ ہے کہ وہ لٹ جائے اور اسے لٹنے کا احساس نہ ہو، وہ اپنے سرمایۂ غم سے بھی محروم ہو جائے، اور محرومی کا احساس بھی اس کے دل ودماغ سے رخصت ہو جائے، علامہ اقبال نے خوب کہا ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بیت المقدس وہ مقدس مقام ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں طور پر متبرک ہے، یہیں معراج کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو عالم بالا کا سفر کرایا گیا، پیغمبر اسلام ﷺ نے نبوت کے بعد سولہ ماہ سے زیادہ عرصہ تک اسی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمائی، اس لئے یہ مسلمانوں کا قبلہ اوّل ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوا ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر کے کچھ عرصہ بعد سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے بیت المقدس کی بھی تعمیر فرمائی تھی، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰ علیہ السلام، حضرت مسیح علیہ السلام اور کتنے ہی انبیاء کرام کی حیات طیبہ اس مبارک مقام سے متعلق رہی ہے، شہر بیت المقدس کے قرب وجوار میں بھی مختلف علاقے ہیں، جو مختلف پیغمبروں سے منسوب ہیں، اسی لئے

اسلام کی نگاہ میں اس شہر اور اس مسجد کی خاص اہمیت ہے۔

ایک صاحبہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے بیت المقدس کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ حشر و نشر کی سرزمین ہے، یہاں آؤ اور نماز ادا کرو، کہ اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نماز ادا کرنے کے برابر ہے، ان صاحبہؓ نے استفسار کیا کہ اگر میرے اندر وہاں تک جانے کی استطاعت نہ ہو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کم سے کم تیل کا ہدیہ ہی بھیج دو جو وہاں چراغ میں کام آئے، (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۰۴۵) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے دعاء فرمائی، اس میں ایک دعاء ایسی حکومت کی تھی جو آپ کے بعد کسی کو میسر نہ آئے اور اس میں ایک دعاء یہ بھی تھی کہ جو اس مسجد میں صرف نماز کے لئے آئے، تو اس کے گناہ اس طرح معاف ہو جائیں کہ گویا وہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین دعاؤں میں سے دو تو مقبول ہو ہی گئی، اور مجھے امید ہے کہ یہ تیسری دعاء جو مغفرت سے متعلق تھی، وہ بھی مقبول ہوگئی ہوگی (ابن ماجہ: حدیث نمبر: ۱۴۰۶) اور یہ روایت تو حدیث کی متعدد کتابوں میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خاص طور پر تین ہی مسجدوں کے لئے سفر کرنا درست ہے، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۱۴۰۸، ۱۴۰۷) اس لئے مسلمانوں کو اس مقدس اور متبرک مقام سے ہمیشہ قلبی اور جذباتی تعلق رہا ہے۔

اسلام سے پہلے یہ شہر بار بار تخت و تاراج کیا گیا، خاص کر چھٹی صدی قبل مسیح، بابل کے حکمراں بخت نصر نے اس شہر اور اس کے مقدس مقامات کی جس طرح اینٹ سے اینٹ بجائی اور ایک لاکھ یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا، وہ تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک ہے، یہودی جو اپنے آپ کو اس شہر کا اصل وارث سمجھتے ہیں صرف تہتر ۷۳ رسال ہی اس شہر پر برسر اقتدار رہے، حضرت عمرؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں بیت المقدس کا علاقہ حضرت عمرو ابن العاصؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ نے فتح کیا، مسلمان چاہتے تھے کہ شہر میں خون ریزی نہ ہو اور صلح کی صورت نکل آئے، عیسائیوں نے یہ شرط لگائی کہ خلیفۃ المسلمین

خود آکر دستاویز پر دستخط کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قبول فرمالیا، اور مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام بنا کر رجب ۱۶ء میں بیت المقدس تشریف لائے، بیت المقدس سے پہلے ہی جابیہ نامی مقام پر اسلامی لشکر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا، وہیں عیسائی رہنما بھی آگئے، اور معاہدۂ صلح کی تحریر عمل میں آئی، اس معاہدہ کے تحت عیسائی باشندوں کی جان ومال، مذہبی مقامات، حضرت مسیح کی مورتیوں وغیرہ کی حفاظت کی ضمانت دی گئی، بلکہ عیسائی یہودیوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی اس خواہش کو بھی قبول فرمایا، اور یہودیوں کی الگ آبادی بنائی گئی۔

اس کے بعد سے یہاں برابر مسلمان حکمران رہے یہاں تک کہ گیارہویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں شروع ہوئیں، اور ۲۳ رشعبان ۴۹۲ھ کو عیسائی دوبارہ فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوئے، انہوں نے شہر میں ایسا قتل عام مچایا کہ بچے، بوڑھے، جوان اور مرد وعورت کو بلا امتیاز تہہ تیغ کیا گیا، شہر میں لاشوں کے انبار لگ گئے! خود مغرب مورخین نے اس خوں آشامی کا اعتراف کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ صرف ایک دن میں شہر اور اس کے مضافات میں ستر ہزار افراد شہید کئے گئے، یہ سفاکانہ رویہ ٹھیک اس کے برعکس تھا، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور مسلمان فاتحین نے عیسائیوں کے ساتھ روا رکھا تھا، سقوط بیت المقدس کے اس واقعہ نے پورے عالمِ اسلام کو بے چین اور بے سکون کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ ۱۱۶۹ء میں سلطان نورالدین زنگی جیسے خدا ترس بادشاہ کے بیٹے مجاہد الاسلام سلطان صلاح الدین ایوبیؒ مصر کے تخت اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے، اور شام کے علاقے فتح کرتے ہوئے ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو فتح کیا، صلاح الدین ایوبیؒ نے احسان فراموش عیسائیوں کے ساتھ ایسی رحم دلی کا سلوک کیا کہ تاریخ میں اس کی مثال کم ملے گی، چنانچہ خود عیسائی دنیا (جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا تھی) پر اس کا گہرا اثر پڑا، آخر اکانوے ۹۱ سال کے بعد قبۃ الصخرہ پر لگائی گئی سنہری صلیب اتاری گئی، اور اس کی جگہ ''ہلال'' نصب کیا گیا، جب ہی سے ہلال مسلم ملکوں کا شعار سمجھا جانے لگا، یہ اکیانوے ۹۱ سال کا عرصہ مسلمانوں کے لئے ایسا تکلیف دہ اور غم انگیز عرصہ تھا، کہ پورے

عالمِ اسلام کی آنکھیں بے سکون اور دل بے قرار تھے۔

خلافت عثمانیہ ترکیہ کے دور میں ہی یہودیوں نے سازشیں بنی شروع کر دی تھیں، لیکن خلیفہ نے کسی قیمت پر یہودیوں کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت نہیں دی، بالآخر مغربی سازشوں سے خلافت عثمانیہ کا سقوط ہوا، اور ۱۹۴۸ء میں عالم اسلام کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپ دیا گیا، یہ زخم بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کا قبلہ اوّل ان کے ہاتھوں سے جاتا رہا، میرے خیال میں پہلی صلیبی جنگ کی شکست اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ اور سب سے اندوہ ناک سانحہ تھا، کہ اگر اس واقعہ پر آسمان خون کے آنسو بہاتا اور زمین کا سینہ شق ہوجاتا تو بھی باعث تعجب نہ تھا، لیکن آہ! ہم مسلمانوں کی بے حسی اور بے شعوری کہ ہماری نسلوں نے تو اس واقعہ کو بھی اپنے صفحہ دل سے مٹا دیا ہے، اور مسلمان حکمراں اسرائیل سے ایسا کٹا کاٹا اور عاجز و مجبور فلسطین مانگ رہے ہیں، کہ شاید کوئی فقیر بھی ایسی الحاح ولجاجت سے دست سوال دراز نہ کرتا ہوگا، اور کیوں نہ ہو، کہ ’’ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات‘‘!

صورت حال یہ ہے کہ ہزار خوشامد کے بعد عربوں سے کچھ وعدے کئے جاتے ہیں اور پھر بلا ادنیٰ جواز کے ان سے انکار کر دیا جاتا ہے، ۱۳؍ ستمبر تک فلسطین کے سلسلہ میں قطعی معاہدہ کی تاریخ طئے تھی اور خیال ہوتا تھا کہ شاید مسلمان قبلہ اوّل کی واپسی کا مژدۂ جانفزا سنیں گے، لیکن معاہدہ تو کیا ہوتا؟ اب طرح طرح کے شکوک وشبہات کی گھٹائیں چھاتی جا رہی ہیں اور ڈر لگتا ہے کہ خدانخواستہ اقتدار کا لالچی گروہ بیت المقدس کے حق سے ہی دست بردار نہ ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو اس محرومی کے ساتھ فلسطینی مسلمانوں کے لئے ایک جسد بے روح ہی ہوگی۔

اگر مسلمان اپنی صفوں میں وحدت کا ثبوت دیتے اور عالم اسلام ٹکریوں میں بٹ نہ گیا ہوتا، قومی تعصب اور علاقائیت کے غیر اسلامی نعروں نے عرب دنیا کو چھوٹی چھوٹی مملکتوں کی صورت میں بانٹ نہ دیا ہوتا، تو آج مسلمانوں کو ایک حقیر گداگر کی طرح ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آتی، بلکہ وہی اس سرزمین کی قسمت کا مالک ہوتے، انسان کی

طلب اور اس کی تڑپ کے اعتبار سے نصرت الٰہی متوجہ ہوتی ہے، جب انسان کا دل سچی طلب سے خالی ہو اور خدا کے بجائے ظاہری و فانی سہاروں پر انسان نے انحصار کر رکھا ہو، تو ان کے ساتھ کیوں کر خدا کی مدد ہو سکتی ہے؟ عرب ممالک پر قومیت کا ایسا نشہ مسلط ہوا کہ عرب زعماء اللہ کے نام کے بجائے عرب قومیت کے نام سے اپنے خطبے کا آغاز کرتے تھے، اور مذہب کے بجائے خالص قومی مسئلہ کی حیثیت سے اس مسئلہ کو پیش کرتے تھے، اس سے بڑھ کر اپنے خالق و مالک سے بغاوت کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اسی لئے افغانستان میں نہتے اور بے کس و بے آسرا مجاہدین نے روس جیسی بڑی طاقت کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ بوسنیا میں ہر طرح کی اعانت سے محروم دشمنوں میں گھرے ہوئے مسلمان اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن فلسطین میں ایسا کچھ نہ ہو سکا، خود فلسطینی تحریک میں بھی جب تک مخلص مجاہدین اور تحریک حماس کی شرکت نہ ہوئی کامیابی کی منزل دور سے دور تک ہوتی رہی، آج اگر اسرائیل یاسر عرفات سے گفتگو کرتا ہے تو یہ عرب قوم پرستوں کی جدوجہد کا نہیں بلکہ مخلص مجاہدین کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس لئے پھر ضرورت ہے کہ قبلۂ اوّل کی محرومی کا احساس مسلمانوں کو تڑپائے، اور یہ تڑپ خدا کی طرف ان کو متوجہ کرے، جب ہی اللہ تعالیٰ کی نصرت متوجہ ہو سکتی ہے، اور مسلمانوں کا قبلۂ اوّل ان کو واپس مل سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آج پھر عالم اسلام کو وقت کے صلاح الدین کا انتظار ہے، خدا کرے وہ وقت جلد آئے، اور مسلمانانِ عالم کو اس ذلت و نکبت اور رسوائی سے نجات ملے، جس سے وہ اس وقت دوچار ہیں!!

(۱۵/ ۹/ ۲۰۰۰)

تو تیر آزما، ہم جگر آزمائیں!

جس وقت یہ سطریں قارئین کی نظروں سے گذریں گی، نہ معلوم حوصلہ مند، غیور اور خوددار افغانوں کی سرزمین پر کیا گذر رہی ہوگی؟ وہ افغان جنہوں نے پورے ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اختیار کرلینے کے باوجود افغانستان میں ان کے قدم جمنے نہیں دیئے، اور جن کی غیرت ایمانی اور حمیت افغانی نے روس جیسے ملک جو کسی خطۂ ارض میں ایک بار قدم رکھنے کے بعد وہاں سے ہٹنا نہ جانتے تھے، اور سر بزیری اور خمیدگی جس کی لغت میں نہیں تھی، بھی ہمت جواں اور حوصلۂ لازوال کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا، اور یہیں سے سودیت یونین کا بکھراؤ شروع ہوا، اب اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے متکبر طاقت امریکہ اس لٹی پٹی بے سروسامان لیکن غیرت ایمانی سے معمور قوم سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہے، افغانوں کی جگہ کوئی اور قوم ہوتی تو نہ جانے کتنی بار امریکہ کے سامنے رکوع وسجود بجالا چکی ہوتی، لیکن یہ اس قوم کی ہمت مردانہ ہے، کہ وہ اب بھی خم ٹھوک کر کہہ رہی ہے کہ :

ادھر آؤ ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

دیکھئے! یہ آزمائش کیا رنگ لاتی ہے، مغربی لٹیروں کے ہاتھوں کیسی کیسی انسانیت سوزیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، اور مغرب کی روایتی دہشت گردی اور آبائی صفتِ خوں آشامی کیا رنگ لاتی ہے؟ **اللھم زلزل اقدامھم و خذھم اخذ عزیز مقتدر !**

بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سب عیار فطرت قوم یہودیوں کی سازش ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کو بدنام کرنا، امریکہ اور مغربی ملکوں کو مسلمانوں کے بارے میں بدگمان کرنا اور

صدر بش یہودیوں کے بارے میں جو ایک گونہ ناموافق ذہن رکھتے ہیں، اس رُخ کو موڑنا ہے، انتخاب کے وقت بش اور یہودیوں کے درمیان ان بن رہی ہے، اور امریکی قوم نے واضح طور پر اس کو محسوس کیا ہے، پھر بش کابینہ میں کسی یہودی کو جگہ نہ مل سکی، اور کولن پاول جن کا یہودیوں سے بُعد معروف ہے، کابینہ میں ایک اہم منصب کے حامل ہوئے، اس پس منظر میں مسلمانوں کی طرف نفرت کا رخ موڑنے کے لئے یہودیوں نے یہ بات ضروری محسوس کی ہوگی کہ اسامہ بن لادن کا ہوا کھڑا کیا جائے، چنانچہ امریکی فوجی انٹیلیجنس کی ایک رپورٹ میں ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگن کے حادثہ میں اسرائیلی خفیہ سروس ''موساد'' کا ذکر آنے لگا ہے، مگر اندیشہ اس بات کا ہے کہ یہودی میڈیا بہت ہی خوبصورتی سے اس کو پس منظر میں ڈال دے۔ اور امریکہ کو ورغلا کر ایک نئی جنگ میں جھونک دے۔

دنیا کے قانون میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سزا مجرم کو دی جاتی ہے نہ کہ ملزم کو، ملزم وہ ہے جس پر جرم کا الزام ہو، اور مجرم وہ ہے جس پر یہ الزام ثابت ہو گیا ہو، اسامہ بن لادن کے معاملہ میں طالبان یہی کہتے ہیں کہ اگر ان کے جرم کا ثبوت پیش کر دیا جائے تو وہ انہیں حوالہ کرنے کو تیار ہیں، باوجودیکہ افغانستان اور امریکہ کے درمیان حوالگیٔ مجرمین کا کوئی معاہدہ نہیں ہے، پھر بھی افغانستان کی طرف سے یہ پیشکش ان کی فراخدلی اور انصاف پروری کو ظاہر کرتی ہے، اور عین مطابق انصاف ہے۔ لیکن امریکہ کو ایک ہی بیجا اصرار ہے کہ اسامہ کو زندہ یا مردہ اس کے حوالہ کر دیا جائے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو حادثہ پیش آیا، اور جس طرح اس میں بے قصور لوگوں کی جانیں گئیں، وہ انتہائی افسوسناک اور تکلیف دہ بات ہے، اور اس سے امریکہ جیسی سوپر طاقت کا سیکوریٹی نظام مشکوک ہو کر رہ گیا ہے، اور ایک ایسی سپر طاقت کے لئے اس طرح کا واقعہ پیش آجانا نہایت رسوا کن امر ہے، لیکن محض اپنی جھینپ کو دور کرنے کے لئے بلا تحقیق کسی کو اپنے جور و استبداد کا ہدف بنا دینا اس دہشت گردی سے بڑھ کر دہشت گردی ہوگی؟

دوسرا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کیا تمام انسانوں کے خون کی قیمت برابر ہے، یا ایک خطہ میں بسنے والے انسانوں کا خون زیادہ اہم اور دوسرے خطہ میں بسنے والے انسانوں کا

کم اہم ہے؟ فرق درست نہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غیر مسلموں کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح ہیں، دمائهم کدمائنا و اموالهم کاموالنا۔ امریکہ خود جس دہشت گردی کا مرتکب ہوتا رہا ہے اور جس طرح اس نے انسانی خون کو ارزاں کیا ہے، جنگ کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، ۱۹۴۵ء میں اس نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا، جس میں ۷۰ر ہزار اشخاص بیک لحمہ موت کی نیند سو گئے، اور اتنے ہی زخمی ہوئے، اور صرف تین دنوں بعد ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا، جس میں چالیس ہزار افراد یکلخت لقمۂ اجل بن گئے، اتنے ہی زخمی ہوئے، اور اب تک اس خطہ میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ معذور اور ناقص الخلقت، اور زمین ایسی بنجر ہوگئی ہے کہ اب تک سبزہ کی روئیدگی سے محروم ہے، عراق میں امریکہ کی بے جا پابندیوں کی وجہ سے لاکھوں بچے مر چکے ہیں، اور کتنے ہی مریض ہیں جو دواؤں کے لئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں، امریکہ کی کھلی ہوئی پشت پناہی کی بنا پر اسرائیل ہر دن بے قصور فلسطینیوں کا قتل عام کر رہا ہے، کیا ان انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں ہے، اور کیا یہ دہشت گردی نہیں تو انسانیت نوازی ہے؟

عجیب بات ہے کہ مغربی ممالک مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام لگاتے ہیں، بلکہ مغرب کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اسلام اور دہشت گردی مترادف الفاظ ہو گئے ہیں، حالاں کہ دہشت گردی تو اصل میں مغرب کا طرۂ امتیاز رہا ہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کن قوموں کی دین ہے؟ کہا جاتا ہے کہ پہلی جنگِ عظیم میں ۹۰ لاکھ فوجی ہلاک ۲ر کروڑ ۲۰ر لاکھ معذور اور ۲ر کروڑ ۵۰ر لاکھ لاپتہ ہوئے، اور دوسری جنگِ عظیم میں ساڑھے تین کروڑ آدمی مارے گئے۔ اور دو کروڑ معذور ہو گئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد روس نے معذور فوجیوں کے لئے مصنوعی اعضاء بنانے اپنے کارخانوں کو جو آرڈر دیئے وہ تو دیئے ہی، جب یہ کافی نہ ہوئے تو ۴۰ر لاکھ مصنوعی پیر بنانے کا آرڈر امریکی کارخانوں کو دیا، اور یہ سب کچھ معذور فوجیوں کے لئے، عام شہری جو معذور ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں، فرانس نے الجزائر پر جو مظالم ڈھائے، برطانیہ اور پرتگال نے اپنی نو آبادیات پر جو جور و ستم روا

رکھا اور امریکہ نے ویتنام میں جو خوں آشامی کی، وہ آج بھی تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں، بوسنیا میں جس طرح مسلمانوں کا قتل عام ہوا، بے قصوروں سے عقوبت خانے سجائے گئے، عورتوں کی کھلے عام عصمت دری کی گئی، اور سینکڑوں مسجدیں شہید کر دی گئیں، اور اذیت رسانی کے ایسے واقعات پیش آئے کہ شاید ہی ظلم و جور کی تاریخ میں اس کی مثال مل سکے، یہ سب مغرب کی دہشت گردی کی ادنیٰ مثال ہے۔

ہمارا ملک ہندوستان بھی اس وقت دہشت گردی کی مذمت میں پیش پیش ہے، اور وزیر داخلہ جناب ایڈوانی بار بار بمبئی بم دھماکہ کی یاد دلاتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دھماکہ دہشت گردی کا واقعہ ہے، لیکن کیا بھاگلپور اور مرادآباد کا قتل عام، بمبئی اور سورت میں بربریت کا برہنہ رقص، ۱۹۸۴ء میں سکھوں کے خلاف خونی یلغار اور عیسائی مبلغین پر انسانیت سوز حملے، دہشت گردی نہیں ہے؟ جب ہم دہشت گردی کی مذمت کریں تو اس میں تفریق و امتیاز نہ ہونا چاہئے، اور ہمیں اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے کہ شدت پسند غیر قانونی گروہوں کے مقابلہ قانون کی پابند کسی ریاست یا مملکت کی دہشت گردی زیادہ شرمناک، زیادہ لائق افسوس اور زیادہ قابل مذمت ہے۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت نہایت نازک اور صبر آزما ہے، کہ ایک مسلم ملک کو بے ثبوت اور بلا دلیل ظلم و جور کا ہدف بنایا جا رہا ہے، تمام باطل طاقتیں اپنے ناپاک عزائم کے لئے متحد ہیں، اور مسلمان حکومتیں حقائق کا سامنا کرنے سے آنکھیں چرا رہی ہیں، اور بزدلی کا شکار، نیز: ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات'' کی حقیقی تصویر بنی ہوئی ہیں، ان حالات کی عکاسی رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک وقت آئے گا کہ قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جیسے کھانے والے دسترخوان پر گرتے ہیں، صحابہؓ نے عرض کیا: کیا اس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن تمہارے اندر ''وَھن'' پیدا ہو جائے گا، صحابہؓ نے دریافت کیا، ''وَہن'' کیا شئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ لوگ تم پر جری ہو جائیں گے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی وجہ دو باتیں ہوں گی: حب الدنیا و کراھیۃ الموت ''زندگی کی

محبت، اور موت کا خوف" (ابوداؤد)

اس وقت واقعہ ہے کہ یہودی، عیسائی اور زعفرانی طاقتیں اسلام کے خلاف متحد ہوکر کھڑی ہوگئی ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے لئے تین باتیں نہایت اہم ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع، اور اللہ سے اعداء دین اور معاندین اسلام کے مقابلہ کے لئے نصرت غیبی کی طلب، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صلوٰۃ اور صبر کے ذریعہ اللہ کی مدد کے طلب گار رہو، **استعینوا بالصبر والصلوٰۃ** صلوٰۃ کا ترجمہ گو نماز سے کیا جاتا ہے، لیکن صلوٰۃ دراصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے، کیوں کہ نماز کی کیفیت ایسی کیفیت ہے جس میں انسان اپنا سراپا خدا کے حضور بچھا دیتا ہے، اور یہ خدا کی طرف رجوع کرنے کی کامل ترین صورت ہے، چنانچہ اس وقت مسجدوں میں دعاء اور قنوت نازلہ کا اہتمام ہونا چاہئے۔ دوسری ضروری چیز حکمت وتدبیر ہے، تدبیر کیا ہے؟ عقل کو جذبات پر اور ہوش کو جوش پر غالب رکھنے کا نام! غالباً اسی کو قرآن نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے، اور اس کو حدیث میں "فراست ایمانی" کہا گیا ہے، بعض اوقات حکیمانہ فیصلے کے لئے اپنے جذبات کا آپ خون کرنا پڑتا ہے، لیکن اسی میں وسیع تر مستقبل کی بھلائی اور فلاح مضمر ہوتی ہے۔

تیسری ضروری چیز امت کی وحدت اور اس کی شیرازہ بندی ہے، اس وقت مسلمانوں کا باہمی اختلاف وانتشار ضرب المثل بن چکا ہے، اور محلّہ کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک یہ بکھراؤ موجود ہے، اگر اس وقت عالم اسلام متحد ہوتا تو مغربی طاقتوں کے لئے ایسی بے دلیل وحجت ستم انگیزی کی شاید جرأت نہ ہوتی، خود ہم ہندوستان کے حالات دیکھیں، کہ ایک طرف فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں، مسلم درس گاہوں اور تحریکات کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی ہیں، اور صیہونی اور صلیبی طاقتوں سے ان کا ربط مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جارہا ہے، اور دوسری طرف ہم اپنے فروعی مسائل میں مناظرہ کی مجلسیں گرم کررہے ہیں، اور ایک دوسرے کی تذلیل وتحقیر کی مہم چلا رہے ہیں، یہ نہایت ہی افسوس ناک صورت حال ہے، اور ہماری فراست ایمانی اور غیرت اسلامی

کے لئے کھلا ہوا چیلنج ہے۔

گو حالات بہت ابتر ہیں، لیکن اسلام بارہا ایسی ابتلاؤں اور آزمائشوں کا مقابلہ کر چکا ہے، اور یقین ہے کہ اعداءِ دین کسی قدر بھی ظلم و تعدی اور فریب و عیاری کی راہ اختیار کریں وہ حق و راستی کے چراغ کو بجھا نہ پائیں گے۔ اور یہ نور اپنے اوجِ کمال کو پہنچ کر ہی رہے گا۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون !!

(..................)

کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟

اس وقت مادی اعتبار سے دنیا کے سب سے طاقتور ملک نے ایک ایسے چھوٹے پس ماندہ ملک کو کسی دلیل و حجت کے بغیر اپنی دست درازی اور ستم فرمائی کا نشانہ بنا رکھا ہے جو قدرتی طور پر قحط زدہ، معاشی اعتبار سے مفلوج، اور سالہا سال سے جنگی حالات سے دوچار ہے، اور جو ایک دہے سے زیادہ ایک دوسری بڑی طاقت کے ظلم وستم کا نشانہ بن چکا ہے، اس قوم کی غیرت وحمیت کا حال یہ ہے کہ اس پسماندہ اور نہتے ملک کا مغرب ومشرق کی طاقتوں نے بار بار امتحان لیا ہے، لیکن وہ ہمیشہ اس امتحان میں پورا اترا ہے، جن لوگوں کو اپنے دست وبازو پر ناز ہے، اس بے دست قوم نے ان سے پنجہ آزمائی کی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مدد خاص کے ذریعہ ان کو ان کی بد اعمالیوں کا مزا چکھایا ہے، خدا کرے کہ پھر اس غیبی طاقت کو جوش آئے، اور اس عہد کا فرعون پاش پاش ہو کر رہ جائے، وماذلك على الله بعزيز۔

سوال یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے ان مظلوم اور نہتے بھائیوں کی اخلاقی مدد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے، انہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے، ___ رسول اللہ ﷺ نے ایک اصول بیان فرمادیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے تو اوّل اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو زبان سے، اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے، یعنی دل سے بُرا سمجھے، اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی قدرت دیں گے، وہ اُسے روکنے کی کوشش کرے گا (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۳۴۰) ___ ظلم وجور سے بڑھ کر کوئی فکر اور بُرائی نہیں، یہ تو دنیا میں شرک سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ دنیوی احکام کی حد تک شرک کو گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ظلم ایسی بُرائی ہے کہ وہ کسی

طور پر قابلِ قبول نہیں، ایسا جرم نہیں کہ جو شخص پہلے سے اس عقیدہ پر ہو، اُسے قتل کرنا جائز ہو، لیکن اگر کوئی شخص کسی کا مال لے لے، کسی کی عزت وآبرو پر حملہ آور ہو، یا کسی کو قتل کردے تو وہ ضرور لائقِ سزا ہے، پس ظلم سب سے بڑی بُرائی ہے، اور اپنی طاقت وصلاحیت بھر اس کی مخالفت واجب ہے!—

مخالفت اور ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ترک تعلق بھی ہے، اور ظالموں کے ساتھ ترک تعلق کی تعلیم خود قرآن مجید نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء ، بعضھم اولیاء بعض ، ومن یتولھم منکم فانه منھم ، ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین : (المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بیشک اللہ ظلم شعار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ ''دوست نہ بنانے'' کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلب ونگاہ کی محبت، فکر ونظر کا تاثر، سماجی زندگی کی مماثلت اور مالی معاملات وتعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی شدت پر مبنی حکم نہیں ہے، بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا، کہ جو یہود ونصاریٰ ظلم وجور پر کمربستہ ہوں، مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوا کم فی الدین و

اخرجوا کم من دیارکم وظاهروا علی اخراجکم ان تولوهم، ومن یتولهم فاولئك هم الظالمون (الممتحنة: ۹)

بیشک اللہ تم لوگوں کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا، اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی، اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا، محض دین کی بنا پر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہونچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل بد طینت یہودیوں اور نصرانیوں سے بے تعلق برتنے کا حکم دیا گیا ہے، غور کیجئے کہ کیا آج امریکہ و برطانیہ ان جرائم کے مرتکب نہیں ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بوسنیا میں مسلمانوں کے قتل عام میں در پردہ برطانیہ نے ظالم سربوں کی مدد کی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج ان ممالک کی جفا کاریوں اور ستم انگیزیوں کی وجہ سے افغانستان کے بے آسرا مسلمان اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور ہیں؟ کیا یہ اس ظالم اسرائیل کے ناصر و مدد گار نہیں ہیں، جو آئے دن بے قصور فلسطینی مسلمانوں کا قتل عام کرتے ہیں؟ اور جنہوں نے لاکھوں فلسطینیوں کو اپنے مادر وطن میں رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا ہے؟ قرآن نے جن یہود و نصاریٰ سے بے تعلق ہونے اور رشتۂ محبت کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، ان مغربی طاقتوں میں ان میں سے کون سی بات نہیں پائی جاتی؟

جناب بُش نے اس جنگ کو تہذیبی اور صلیبی جنگ کا نام دے کر کیا اس بات کا صاف اعلان نہیں کر دیا کہ انہیں افغانستان کے بے آب و گیاہ صحراؤں اور خشک پہاڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا اصل نشانہ وہ لوگ ہیں، جو اپنی سرزمین میں اس سرزمین کے باسیوں کی رضامندی سے اللہ کے دین کو جاری و قائم کرنا چاہتے ہیں، نہ وہ کسی ملک سے قرض کے طلب گار ہیں، نہ انہوں نے پڑوسی ملک کی طرح معاشی

امداد کا کاسۂ گدائی مغرب کے دروازہ پر بڑھایا ہے، انکا قصور صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کے اس حصہ زمین پر، جو خود ان کے قبضہ میں ہے، خدا کے دین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، پھر کیا ایسے اعداء دین سے بے تعلقی واجب نہ ہوگی؟

لا ینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوا کم فی الدین ولم یخرجوا کم من دیارکم ان تبرّوھم و تقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین ۔(الممتحنۃ:۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا، جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں، اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں، اوران کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں —— بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور نا منصفانہ روش اختیار کررکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص شخص کی حوالگی یا کسی خاص مطالبہ کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن کردے گی، اور اسلام کے خلاف بغض وعناد کی جو آگ ان کے سینوں میں سلگی ہوئی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہوجائے گی محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکرو عقیدہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، اور اسلامی نظامِ حیات ہے، قرآن نے یہود و نصاریٰ کی نفسیات اوران کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے، اور یہ جس قدر رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مبنی بر واقعہ تھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

لن ترضی عنك الیھود ولا النصاریٰ حتی تتبع ملتھم ، قل ان ھدی اللہ ھو الھدی ولان اتبعت اھواء ھم بعد الذی جاء ك من العلم ، مالك من اللہ من ولی

ولا نصیر ۔(البقرہ:۱۲)

یہود ونصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود ونصاریٰ کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے، اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالم اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں، اس لئے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیرباد نہ کہدیں اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبین تسلیم خم نہ کردیں، ان کی تشفی نہیں ہوسکتی، اور انشاء اللہ مسلمان کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس لئے کہ وہ دین کے لئے سب کچھ کھونے کو ''پانا'' اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو ''جینا'' تصور کرتے ہیں، اور یہ ان کے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے!

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں، اور انہیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں، منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومت ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی ناوابستہ پالیسی پر قائم رہے، اور امریکہ کی آنکھ بند کر کے حمایت نہ کرے، ورنہ اندیشہ ہے کہ کل ہو کر ان کا پنجۂ استبداد ہمارے ملک کی طرف بھی بڑھے گا، اور انہیں ہمارے ساتھ بھی تحکم آمیز رویہ اختیار کرنے کی جرأت پیدا ہوگی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور برطانیہ کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے،

اور شرعاً بہ حیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کرنا ہمارے لئے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، یہ انسانی فریضہ ہے، یہ شرعی ذمہ داری ہے، اور حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی للکار کر ہم سے پوچھ رہی ہے کہ کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟؟

(۱۶/۱۰/۲۰۰۱ء)

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے!

مغربی قومیں بہ ظاہر روادار، انسانیت دوست اور تہذیب کی علمبردار سمجھی جاتی ہیں، اور دوسروں کے گھر میں انسانی حقوق کی حفاظت کا تو گویا انہوں نے بیڑہ اٹھا رکھا ہے، لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے، یہ حقیقی تصویر نہیں، بلکہ اس پر چڑھایا ہوا خوبصورت اور دبیز غلاف ہے، اس قوم کا باطن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض وعناد اور کدورت سے بھرا ہوا ہے، گو انہیں اپنی اس اندرونی کیفیت کے چھپانے کا بڑا ملکہ حاصل ہے، لیکن جیسے برتن لبریز ہو جائے تو پانی چھلک ہی جاتا ہے، اسی طرح وقتاً فوقتاً ان کے حقیقی ارادے کسی نہ کسی طرح نوک زبان پر آ ہی جاتے ہیں، دشمنانِ اسلام کی نفسیات اور ان کی کیفیات کے بارے میں قرآن مجید کا کیا خوب ارشاد ہے:

قد بدت البغضاء من افواھھم و ما تخفی صدورھم اکبر، قد بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون ، (آل عمران: ۱۱۸)

بغض ان کے منہ سے ظاہر ہوا چاہتا ہے، اور ان کے سینوں نے جو کچھ چھپایا ہوا ہے، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے، اور ہم نے احکام کو کھول کر بیان کر دیا ہے، تا کہ تم لوگ دانائی سے کام لو،

یہ حقیقت اس وقت ظاہر ہوگئی، جب جناب بُش صدر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کو "صلیبی جنگ" کے تعصب انگیز لفظ سے تعبیر کیا، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، مسٹر آئی یوجین روستو نائب وزیر خارجہ امریکہ نے ۱۹۶۷ء میں صاف کہا تھا کہ ہم یورپ اور مسلمانوں کے درمیان ہر قیمت پر صلیبی جنگیں جاری رکھیں گے، اور فرانس نے مراقش میں جنگ وجدال کے بارے میں پوری صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جنگ ہلال اور صلیب کے درمیان ہے،

بوسنیا میں عیسائی مظالم نے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا کہ صلیبی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، بلکہ صرف عنوان اور اسلوب بدل گیا ہے، اگست ۱۹۹۲ء میں بوسنیائی شہر تزلہ کے ایک سرب پادری ''واصل'' نے کہا کہ ''بوسنیا کے خلاف لڑی جانے والی جنگ ایک جنگ مقدس ہے،'' یہ سب اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہے، کہ صلیبی جنگوں کی ہزیمت ابھی یورپ کے ذہن سے محو نہیں ہوئی ہے، اور اس وقت عالم اسلام اس کا واحد نشانہ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خوں آشامی اور محسن کشی مغرب کی فطرت کا ایک حصہ ہے، عیسائی کلیساؤں نے اپنے دور اقتدار میں جو مظالم ڈھائے ہیں، کون تاریخ آشنا اس سے نا آشنا ہوگا، کہا جاتا ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں ۵۰/لاکھ اشخاص کو کلیسا نے پوپ کی حکم عدولی پر نہایت ہی بے رحمی کے ساتھ اور سخت ایذاؤں سے گذار کر سولی پر چڑھا دیا، ۱۴۸۱ء سے ۱۴۹۹ء تک صرف ۱۸/سال کے عرصہ میں ملحدین کی تفتیش کرنے والے محکمہ نے ایک ہزار بیس افراد کو زندہ جلا دیا، ۶۸۶۰/انسانوں کو دو ٹکڑے کر دیئے گئے۔ سائنس دانوں اور دانش وروں پر عرصۂ حیات تنگ تھا، کہا جاتا ہے کہ محکمہ تفتیش نے ۳/لاکھ سے زیادہ اہلِ علم کو زندہ نذرِ آتش کر دیا، پارنیلی (Parnili) کو صرف یہ کہنے پر کہ ''ستارے اپنی جگہ سے نہیں گرتے'' بے تحاشہ تازیانے لگائے گئے، کامپلانڈ (Campland) کو محض اس عقیدہ کی بنیاد پر کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں ہیں، ۲۷/دفعہ جیل بھیجا گیا، بعض سائنس دانوں کو صرف یہ کہنے کے جرم میں کہ انسان کی رگوں میں خون حرکت کرتا ہے، سخت ترین سزائیں دی گئیں، گیلیلیو (Galileo) یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ زمین متحرک ہے، عیسائی علماء اسے خلاف مذہب تصور کرتے تھے، اس بنیاد پر اسے قید بامشقت کی سزا دی گئی، حد یہ تھی کہ مردوں کے خلاف بھی عقیدہ کی تفتیش کی جاتی تھی، اور اگر کسی میت کے بارے میں یہ معلوم ہوگیا کہ وہ بدعقیدہ تھا، تو اس کی جائداد ضبط کر لی جاتی، ورثا محروم کر دئے جاتے، اور مخبری کرنے والوں کو ۳۵/ سے ۵۰/فیصد تک اس کا ترکہ دے دیا جاتا تھا، (مغربی تمدن کی ایک جھلک، سید مجتبیٰ موسوی: ۳۲،۳۳)

۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۰ء تک مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگوں کا سلسلہ رہا ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور فراخدلی

کا مظاہرہ کیا، لیکن صلیبی فوج بچوں، عورتوں، بوڑھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے آگے بڑھتی اور مفتوحین کے ساتھ ایسا سلوک کرتی کہ درندوں نے بھی خواب وخیال میں اس کا تصور نہ کیا ہوگا، خود عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ جب بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو یہ حال تھا کہ گذرنے والے گھوڑے زانوں تک خون میں ڈوب جاتے تھے، اور ہر طرف انسانوں کے کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں نظر آتے تھے۔

اس وقت جو مغربی ممالک انسانیت دوستی کا علم اٹھائے ہیں، خود ان کا کیا حال ہے؟ گوئٹے مالا سی آئی اے کی سازش سے ۱؍لاکھ ۱۰؍ہزار افراد کا قتل عام ہوا، الجزائر میں فرانس نے ظلم و بربریت کا جو ننگا رقص کیا ہے، وہ استعماریت کی تاریخ کا نہایت ہی سیاہ باب ہے، کہا جاتا ہے کہ کم سے کم دس لاکھ مسلمان اس جہاد آزادی میں قربان ہوئے، اور اب جمہوریت کو کچل کر فرانس کے تعاون سے جو فوجی حکومت قائم ہے، ان کے ہاتھوں تہہ تیغ ہونے والوں کی تعداد بھی تقریباً ۳۰؍ہزار ہے، (رواداری اور مغرب: ۱۱۹)

امریکہ اور یورپ کی ناجائز اولاد اسرائیل کی ستم انگیزیاں اور وحشت خیزیاں بھی در اصل مغرب ہی کے کھاتہ میں ہیں، ستمبر ۱۹۸۲ء میں صابرہ اور شتیلہ میں فلسطینیوں کا جو قتلِ عام کیا گیا، اس کی یادیں اتنی دردناک ہیں، کہ ان کا پڑھنا بھی حساس دلوں کے لئے ایک آزمائش ہے، لبنان کے پولیس اور اسپتالوں کے ریکارڈ کے مطابق صرف ۴؍جون تا ۳۱؍اگست ۱۹۸۲ء میں قریب ۱۸؍ہزار فلسطینی اسرائیلی بمباری سے شہید ہوئے، اور اسرائیل کی درندگی کے جو واقعات آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، وہ محتاج بیان نہیں، اقوامِ متحدہ کی پابندیوں کی وجہ سے ۵؍لاکھ سے زیادہ عراقی بچے اب تک لقمۂ اجل بن چکے ہیں، یہ سب مغرب کی شرافت کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔

یورپ کی انسانیت سوزی کی سب سے کھلی ہوئی مثال بوسنیا میں ہونے والے مظالم اور انسانیت کش واقعات ہیں، بوسنیا میں بوگومیل نامی عیسائی فرقہ پر رومن کیتھولک نے سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کردئے تھے، اس فرقہ کے لوگ عاجز تھے، انہوں نے ترکی خلیفہ سے ان کے علاقہ میں فوج کشی کی التجا کی، تاکہ انہیں اس ظلم سے نجات مل سکے، چنانچہ سلطان محمد ثانی

نے بوسنیا پر فوج کشی کی، اور صرف ایک ہفتہ کے اندر ستر شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے، کیونکہ سربیا کی عوام خود اپنے حکمرانوں کے مظالم سے پریشان تھی، اور انہیں مسلمانوں کی صورت نجات دہندہ مل گئے سینکڑوں سال بعد سربوں نے نہایت سفاکی کے ساتھ اس کا انتقام لیا۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، زندہ انسانوں کے سینوں پر خنجروں سے صلیبیں بنائی گئیں، والدین کو بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا، مسلمانوں کے تن سے جدا کئے ہوئے سروں سے فٹبال کھیلے گئے، مسجدیں شہید کی گئیں، قیدیوں کی آنکھیں نکال دی گئیں، لوگوں کو زندہ نذر آتش کیا گیا، ہزاروں عورتوں کی برسرِ عام عصمت ریزی کی گئی، انہیں زبردستی حاملہ کیا گیا، تاکہ وہ سرب بچوں کو جنم دیں، زندہ انسانوں کے سر ہتھوڑے سے توڑ دیئے گئے، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے، بچوں کے سر کا تحفہ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بوسنیا اور اس کے گردوپیش کے علاقہ میں مغربی وحشت ناکیوں کے واقعات اتنے تکلیف دہ ہیں، کہ سنگ دل سے سنگ دل آدمی بھی انہیں سننے کی تاب نہیں لاسکتا، اور پھر پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر جو مظالم ہوئے، وہ بھی ان ستم انگیزیوں کے مقابلہ ہلکے محسوس ہوتے ہیں، کیونکہ ان بمباریوں میں تو یکلخت لوگ زندگی کے قفص سے آزاد ہوگئے تھے، لیکن قلب یورپ کے ان مظلوموں کو تو گویا بار بار اور مسلسل قتل کیا گیا، عزت وآبرو کا قتل، جسم وجان کا قتل، آنکھوں کے سامنے معصوم نونہالوں اور بے زبان آبگینوں کا قتل، تاریخی ورثاء اور قومی یادگاروں کا قتل، ہر قتل ایسا کہ دلوں کو تڑپا دے، اور زبان سے گویائی چھین لے۔

عجیب بات ہے کہ جتنے انسانیت سوز ہتھیار بن رہے ہیں، وہ سب مغرب ہی کا تحفہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ کے پاس دوسو چالیس ہزار، روس کے پاس ۸۰؍ ہزار اور برطانیہ کے پاس پندرہ ہزار صرف میگائی بم ہیں، جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرنے والے بم سے کئی ہزار گنا زیادہ طاقت ور ہیں، ایک محقق کا تجزیہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں اسلحہ سازی اور جنگ میں جتنی رقم خرچ ہوئی ہے، اس سے پچاس سال تک دنیا کے تمام لوگوں کو مفت غذا اور دو تہائی آبادی کے لئے مکان فراہم کیا جاسکتا تھا، لیکن مغرب کو موت کی سوداگری کا جو شوق ہے، اس کی وجہ سے مہلک ہتھیاروں کی صنعت اس وقت سب سے بڑی

صنعت ہے، اور دن رات ایسے ہتھیار بنانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسان ہلاک اور آبادیاں ویران کی جاسکیں، اور موت و ہلاکت کے یہ تاجر الٹے مسلمانوں کو دہشت گرد ٹھہراتے ہیں۔

افسوس کہ منصوبہ بندی کے فقدان اور ذرائع ابلاغ تک رسائی سے محرومی نے مسلمانوں کو مظلوم ہونے کے باوجود ظالموں کی صف میں کھڑا کردیا ہے، حالانکہ مغرب کی تاریخ کا ایک ایک حرف بے گناہوں کے خون سے سرخ فام ہے، اور اس کے ہر بن مو سے آواز آرہی ہے کہ:

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

(۲۸/ستمبر ۲۰۰۱ء)

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

افغان جنگ کا ایک مرحلہ تمام ہو چکا ہے، اور اس میں خونِ مسلم کی جو ارزانی ہوئی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، حقیقت یہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط، مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ اور جزیرۃ العرب میں یہود و نصاریٰ کی واپسی کے بعد عالمِ اسلام کے لئے یہ سب سے بڑا حادثہ ہے یہ عدل پر ظلم کی فتح اور دلیل و حجت کی طاقت پر آہن و فولاد کی طاقت کا غلبہ ہے، یہ اصول و قانون کے مقابلہ لا قانونیت کی جیت ہے، اس نے مغرب کی ستمگری اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے جور و جفا اور نا انصافی کو بے نقاب کر دیا ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ ایشیائی اور ترقی پذیر ممالک کو مغربی طاقتوں کا کھلونا بن کر رہنا پڑے گا، اور اگر وہ اپنے حقوق کے معاملے میں سرخمیدگی کے بجائے سرفرازی کا راستہ اختیار کریں گے تو کسی دلیل و حجت کے بغیر ان کا سر کچل دیا جائے گا۔

دراصل طالبان اس وقت اسلام کی فرمانروائی اور اس کی حکمرانی کی صلاحیت کی ایک علامت بن گئے تھے، طالبان کی آمد سے پہلے افغانستان میں امن اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں تھی، طوائف الملوکی کی کیفیت تھی، مختلف علاقے مختلف کمانڈروں کے زیر اختیار تھے، اور ہر گروہ اپنے مخالفین کے ساتھ نہایت سفاکی سے پیش آتا تھا، ان حالات میں طالبان ابرِ رحمت بن کر اس ملک کی فضاء میں اترے، اور بہت کم عرصہ میں پورا ملک ان کے زیر نگیں آ گیا، وہ جس علاقہ میں گئے وہاں امن و سلامتی، حسنِ سلوک، اسلامی اخوت اور انسانی محبت کی سوغات لے گئے، جہاں عین دوپہر میں دکانیں لوٹ لی جاتی تھی، وہاں یہ حال ہو گیا کہ لوگ رات میں بھی اپنی دوکان کو مقفل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے،

کمیونسٹوں کے عہدِ اقتدار میں اس بات کی منظم کوشش کی گئی کہ مسلمان اسلامی تہذیب کو خیر آباد کہہ دیں، منصوبہ بند طور پر بے حجابی اور بے نقابی کو فروغ دیا گیا، اور زندگی کے ہر گوشہ میں ملحدانہ ثقافت کا رنگ گھولنے کی کوشش کی گئی، طالبان نے نہایت کامیابی کے ساتھ سماج میں پھیلے ہوئے اس کینسر کا علاج کیا، یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات اس میں غلو اور افراط کے واقعات بھی پیش آئے، لیکن اس سے زیادہ غیر جمہوری واقعات دوسرے ملکوں اور حکومتوں میں پیش آتے رہے ہیں، اس لئے وہ کچھ اس قدر نا قابلِ برداشت بھی نہ تھے جو ایک ملک کے دوسرے ملک میں مداخلت کا جواز فراہم کرتے ہوں۔

مغرب کو افغانستان کا یہی اسلامی کردار کھٹکتا رہتا تھا، کیوں کہ افغانستان نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اسلام بحیثیت سماج و سیاسی نظام کے آج بھی نہ صرف قابل نفاذ ہے، بلکہ دنیائے انسانیت کی کامیاب رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے، مغرب نے معاشی پابندیاں لگا کر ہر چہار طرف سے خشکی سے گھرے ہوئے اس ملک کو مفلوج کرنے کی کوشش کی، اور سمجھا کہ اس طرح افغان مغربی طاقتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے نہایت ہی استقامت کے ساتھ اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور حکومت کے ذمہ داروں اور عہدیداروں نے ایسی سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی اختیار کی کہ دیکھنے والوں کو خلافت راشدہ کا دور یاد آ جاتا تھا، ملک کے پچانوے فی صد حصہ پر قابض ہونے کے باوجود ان کو ملک کا جابر حکمراں تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا، اور انہیں بین الاقوامی سطح پر تنہا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی، لیکن انہوں نے خدا پر بھروسہ رکھا، اور انسانی سہاروں کی فکر نہیں کی، نہ کبھی انہوں نے قرض کے ہاتھ پھیلائے، نہ کسی سے اعانت و امداد کے طالب ہوئے، اور یہ بھی وضاحت کرتے رہے کہ اس ملک کا اسلامی نظام یہاں کے باشندوں کی مرضی سے ہے، اور ہم اسے کسی دوسرے ملک پر تھوپنا نہیں چاہتے۔

گیارہ ستمبر کو امریکہ کی بے آبروئی کے واقعہ کے بعد بھی امریکہ کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کر سکا جو دہشت گردی کے اس واقعہ میں اسامہ بن لادن، القاعدہ یا افغانستان کی شرکت کو بتلاتا ہو، بلکہ متعدد قرائن اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ اصل میں یہ سب کچھ

یہودیوں کی کارستانی تھی، جن کی تاریخ سازشوں، ریشہ دوانیوں اور دہشت گردی کے واقعات سے پُر ہے، لیکن چوں کہ افغانستان کی اسلامی شناخت مغرب کی نظر میں چبھ رہی تھی اس لئے بلاثبوت اور بلا حجت و دلیل افغانستان پر ظالمانہ اور نا منصفانہ فوجی کاروائی کی گئی، جس نے ہزاروں بے قصوروں کی جان لے لی، اور ایک جائز حکومت کو حق حکمرانی سے محروم کر دیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ کسی ملک سے خطرہ کم اور محدود ہوتا ہے، اگر اس ملک کو فتح کر لیا جائے تو وہ ملک قابو میں آجاتا ہے، لیکن نظریہ کی طاقت ملک اور حکومت سے زیادہ ہوتی ہے، اور اس کا دائرہ اثر بہت وسیع ہوتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ کوئی ایسا مذہب مدمقابل ہو جو آفاقی حیثیت کا حامل ہو، مغرب پر گو مذہباً عیسائیت کا غلبہ ہے، لیکن عملاً وہ ایک غیر مذہبی نظام حیات کا نقیب ہے، کلیسا اور حکومت کی جنگ کے بعد عملی زندگی سے مذہب کو نکال باہر کیا گیا ہے، اور قیصر کو "خدا" سے زیادہ با اختیار بنا دیا گیا ہے۔

اس نظام حیات کا لب لباب ایسی زندگی ہے جو اخلاق اور آخرت کے جوابدہی کے تصور سے یکسر آزاد ہے، جو ایسی ثقافتی آزادی کا داعی ہے کہ اس میں بہت سی مسلمہ اخلاقی قدروں کی آمیزش تک نہ ہو، جس میں شرم و حیا کو خود قابلِ حیاء سمجھا جاتا ہو، جو عیش کوشی اور عشرت سامانی میں کہیں حائل نہ ہوتا ہو، انسان کی خواہشات اور عیش کامیوں کے اصل سرچشمے دو ہیں، جنس اور مال، یہ اباحیت پسند نظام حیات ان دونوں کو کھلی آزادی اور بے قید اجازت عطاء کرتا ہے، اس کی وجہ سے مغرب میں بہت سی برائیوں کے ساتھ خاص طور پر دو چیزوں نے بہت فروغ پایا، ایک تو غیر قانونی جنسی تعلق، یہاں تک کہ وہ رشتے جن سے جنسی اتصال کے بارے میں خود فطرتِ انسانی اباء کرتی ہے، ان پر بھی کوئی قدغن باقی نہیں رہی، اور ہم جنسی جیسے غیر فطری اور صحت انسانی کے لئے مضرت رساں فعل کو بھی قانونی اجازت دے دی گئی۔

معاشی تگ و دو میں سرمایہ داروں کو اس بات کی پوری چھوٹ دے دی گئی کہ وہ جیسے چاہیں کمائیں، اور جس طرح پر منظور ہو غریبوں کا استحصال کریں، چنانچہ لوگوں کو عیش

پرستانہ زندگی کا خوگر بنایا گیا، اسباب عشرت کی فراہمی کو آسان کردیا گیا، اور اس طرح سودی نظام کو ایسا مستحکم کیا گیا کہ آج مغرب زدہ ممالک میں سود سے بچ کر کسی کاروبار کا انجام دینا دشوار ہوگیا ہے، اور خود مغربی ممالک میں تو روزمرہ کی ضروریات میں بھی سود سے بچنا مشکل ہوگیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ غریب مزدور پوری زندگی کماتے اور سود بھرتے جاتے ہیں، اور دولت مندوں کی تجوریاں ان کے لہو سے سدا آباد رہتی ہیں۔

مغرب کے استحصالی نظام کے مقابلہ کمیونسٹ تحریک کھڑی ہوئی جو مزدوروں کے استحصال کے خلاف برسرِ پیکار تھی، اور سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ظلم تصور کرتی تھی، لیکن اشتراکی نظام چونکہ کسی مثبت فکر کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا تھا، بلکہ منفی سوچ اور ردعمل کے طور پر اس کی نشو نما ہوئی تھی، اس لئے وہ افراط وتفریط سے خالی نہیں رہا، انفرادی ملکیت کے بجائے اجتماعی اور سرکاری ملکیت، مزدوروں کے لئے حق حکومت، اور شخصی آزادی کا اس حد تک گلا گھونٹ دینا کہ اس نظام کے خلاف کسی زبان کو جنبش کی بھی اجازت نہیں، وہ امور تھے جنہوں نے اشتراکی نظام کے بت کو سو سال سے بھی کم عرصہ میں پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

اب دنیا میں اس اباحی نظام حیات کے مقابلہ اسلام کے سوا کوئی اور نظام حیات نہیں، کیوں کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس کا دائرہ مسجد تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ہمہ گیر نظام ہے، جس نے انفرادی اور شخصی زندگی سے لے کر سماجی زندگی، معاشی وسیاسی نظام اور بین ملکی تعلقات تک ہر گوشہ کا احاطہ کیا ہے، اور بحیثیت مسلمان ہر صاحب ایمان کے لئے اسلام کی ان وسیع الاثر تعلیمات پر ایمان رکھنا ضروری ہے، پھر یہ ایسا معتدل، متوازن، فطرت انسانی سے ہم آہنگ اور عہد کے تقاضوں کے مطابق ہے، کہ انسانی فطرت اور عقل سلیم بے اختیار اس پر لبیک کہتی ہے، اس میں شخصی آزادی بھی ہے، لیکن اس کی معقول حدود ہیں، اس میں معاشی مسابقت کی حوصلہ افزائی بھی ہے، لیکن استحصال کی اجازت نہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت بھی ہے، لیکن مرد وعورت کے درمیان صلاحیت کا جو قدرتی فرق پایا جاتا ہے اس کا لحاظ بھی ہے، اس میں صلح وامن اور بین ملکی

تعلقات سے متعلق ہدایات بھی ہیں، لیکن بلا دلیل وحجت کسی ایک گروہ کے پوری انسانیت پر مسلط ہو جانے کا موقع نہیں، اس میں افراد و اشخاص کی صلاحیتوں میں پائے جانے والے تفاوت کا لحاظ بھی ہے، لیکن بحیثیت انسان، انسانی وحدت ومساوات کا تصور بھی۔

پھر چوں کہ یہ دین قدم قدم پر انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور انسانی ضرورتوں کا پاسدار ہے، اس لئے یہ ایک عملی دین ہے، ایک ایسا دین جو افلاطون وارسطو کے تھیوری کی طرح محض کتابوں کے صفحات میں نہیں رہا، بلکہ ایک ہزار سال سے زیادہ بڑی حد تک وہ زندگی کے تمام شعبوں میں جاری وساری رہا ہے، اور اس نے ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے خطہ پر حکمرانی کی ہے، مغربی اقوام کو اصل پریشانی یہی ہے کہ ان کے جدید اباحیت پسندانہ آزادانہ نظام حیات کو پورے عالم تک وسعت دینے میں سوائے اسلام کے کوئی اور مزاحم نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ کمیونزم کے زوال کے بعد، سے اس طرح کی باتیں شروع کر دی گئی تھیں کہ اب اس کے بعد اس سے بڑا مدمقابل اسلام ہے، بوسنیا کی جنگ کے موقع پر برطانیہ کے وزیر اعظم جان میجر نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ہم یوروپ کے قلب میں کسی مسلم مملکت کو برداشت نہیں کر سکتے، اہل مغرب بوسنیا، میں سفاکی کا شب وروز مشاہدہ کرتے رہے، اور انسانیت اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کو سربوں کی خوں آشامی اور غارت گری پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا، چیچنیا اور کوسوو میں بھی انسانیت سوزی کا ننگا رقص ہوتا رہا، اور مغربی اقوام کو اس وقت مظلوموں کی دادرسی کا کوئی خیال نہیں آیا، ایران نے اسلامی نظام کا علم اٹھایا، تو عراق کو اس کے خلاف اکسایا گیا، پھر عراق کی طاقت کو توڑنے کے لئے ایک خاص منصوبہ کے تحت عراق وکویت جنگ کرائی گئی، اور اب کسی دلیل وثبوت کے بغیر افغانستان کی طالبان حکومت کو نشانہ بنایا گیا، اور صدر امریکہ جناب بش اس کو تہذیبی اور صلیبی جنگ قرار دے کر دل میں چھپے ہوئے بغض کو اپنی زبان تک لے آئے۔

دراصل کسی نظریہ اور نظامِ حیات کا مقابلہ نظامِ حیات ہی سے ہوسکتا ہے، فولاد و آہن سے زمین فتح کی جاسکتی ہے، اور ملکوں کو تخت وتاراج کیا جاسکتا ہے لیکن دلوں کی

دنیا نہیں جیتی جاسکتی، اور ذہن و دماغ کی مملکت کو اپنا تابع نہیں بنایا جاسکتا، غور کیجئے کہ ایرانیوں، تاتاریوں اور مغلوں نے ابتدائی دور میں عالم اسلام پر کیسی یلغاریں کیں؟ ایسا لگتا تھا کہ ان کی تلاطم خیز موجوں کے آگے اسلام خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا، لیکن ان قوموں کے پاس فوج تھی، سپاہی تھے، تیر و شمشیر کی کثرت تھی، معرکہ کارزار کے لئے مطلوبہ سواریاں تھیں، لیکن ان کے پاس انسانیت کو دینے کے لئے، اور ان کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی قابل عمل نظام حیات، اور قلب و روح کو اپنی طرف کھینچنے والی کوئی فکر سلیم موجود نہیں تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک و زمین اور حکومت و اقتدار کے فاتح قلب و نگاہ کے مفتوح بن گئے، اور جو طوفان اسلام کو تہہ و بالا کرنے کے لئے اٹھا تھا وہی مدتوں اس دین حق کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتا رہا، اسی کو اقبال نے کہا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانے سے

مغرب پر اسلام کی جاذبیت، اس کی کشش، قلب و روح میں اتر جانے کی صلاحیت، فکر و نظر پر فتح پانے کی لیاقت اور اپنے متبعین میں حق و راستی کے لئے آتش انقلاب سلگا دینے اور جوشِ جنوں بھر دینے کی اہلیت کا خوف چھایا ہوا ہے۔

افسوس کہ ہم مسلمان بھی آج کل واقعات کو مادی نتائج کے پیمانوں میں تولنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور ظاہری ظفر مندی و فتح سامانی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن اسلام میں اصل کامیابی یہ ہے کہ آدمی آخر دم تک اپنے آپ کو حق پر ثابت قدم رکھے، سچائیوں کے لئے گنوانا ''کمانا'' ہے۔ حق و راستی کے لئے کھونا ''پانا'' ہے، اہلِ جنوں کو اپنی منزل کے لئے لٹ جانے میں بھی لطف آتا ہے، اس صحابی کے واقعہ کو یاد کیجئے کہ دشمن نے تیر ماری، اور جان نکل رہی ہے، لیکن اس وقت بھی زبان اپنی شادکامی و کامرانی کا نعرہ بلند کرتی ہے کہ ''فزتُ و رب الکعبة'' (رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا) پیغمبروں کو اپنا وطن چھوڑنا، بے وطنی اور جلا وطنی کو قبول کرنا پڑا، بعض انبیاء گذرے ہیں کہ آروں سے جسم مبارک دولخت کر دیا گیا، تو کیا نعوذ باللہ یہ انبیاء ناکام رہے؟ ہرگز نہیں! کیوں کہ اپنے

مقصد میں آخری درجہ کی کوشش اور اس کے لئے سب کچھ نثار و قربان کر دینا ہی اصل کامیابی ہے۔

مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہئے، اور یہ عزم رکھنا چاہئے کہ وہ ہر طرح کی آزمائش سے گزریں گے، لیکن ہمیشہ حق کے طرف دار اور اسلام کے علمبردار بن کر رہیں گے، اور دنیا کو سمجھ لینا چاہئے کہ یلغار کے مظالم یا افغانستان کی جنگ سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکتے، اور نہ ان کے ایمان کا سودا کیا جاسکتا ہے، یہ وہ نشہ ہے کہ جس قدر اتارنے کی کوشش کی جائے اسی قدر چڑھتا جاتا ہے، یہ وہ پودا ہے کہ جس قدر تراشا جاتا ہے اسی قدر سر بلند اور سایہ دار ہوتا جاتا ہے۔ قلعہ مسمار کئے جاسکتے ہیں، کاشانے ویرانے میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں، پہاڑ کی چوٹیوں کو خاکستر بنایا جاسکتا ہے، آتش فشاں بجھائے اور دریاؤں کے رُخ موڑے جاسکتے ہیں، ملکوں کے جغرافیہ تبدیل ہوسکتے ہیں اور تختِ اقتدار پر بیٹھنے والوں کو تختۂ دار کی زینت بنایا جاسکتا ہے، لیکن دلوں میں جو ایمان کی انگیٹھیاں سلگی ہوئی ہیں، اسے بجھایا نہیں جاسکتا، اور ذہن و دماغ کی مملکت پر ایمان کی حکمرانی کے جو نقشِ دوام ثبت ہیں انہیں مٹایا نہیں جاسکتا، اس لئے اقبال کا شعر تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ بے تکلف زبان پر آتا ہے کہ ؎

اگر افغانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۲۱۔ دسمبر۔ ۲۰۰۱ء)

تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

جب انسان پر کوئی مصیبت اور آزمائش آئے تو ہمارا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ادفع بالتی ھی احسن السیئة (المومنون:۹۶)

بری بات کے جواب میں بہتر طریقہ اختیار کرو

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس جانب بھی متوجہ فرمایا ہے کہ یہ بہتر طریقۂ جواب (دفاع بالاحسن) دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرتا ہے، یہ صبر آزما ہے، لیکن کامیابی کی کلید ہے:

ولا تستوی الحسنة ولا السیئة، ادفع بالتی ھی احسن، فاذا الذی بینك و بینه عداوة كانه ولی حمیم، و ما یلقّٰھا الا الذین صبروا وما یلقھا الا ذو حظ عظیم

(المومن:۳۴،۳۵)

نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتی، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو، ممکن ہے کہ تمہارے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہے، وہی دلی دوست ہو جائے، اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو قوتِ برداشت رکھتے ہوں، اور یہ بات اسے حاصل ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہے۔

یہ ''بہتر بات'' کیا ہے؟۔ قرآن ہی نے اس کو ان آیات سے پہلی آیت میں بیان فرمایا ہے:

و من احسن قولا ممن دعاء الی الله وعمل صالحا

وقال اننی من المسلمین (المومن:۳۲)

اس سے بہتر کس کی بات ہوسکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے ، خود بھی نیک عمل کرے ،اور کہے : میں فرماں برداروں میں سے ہوں؟

یعنی بہتر بات سے ’’ دعوت الی اللہ‘‘ مراد ہے، دعوت دشمن کو دوست بناتی ہے، دعوتِ حق کی علمبردار قوم کونصیب ور بناتی ہے، البتہ اس کے لئے صبر، قوتِ برداشت اور حسن تدبیر کی ضرورت ہے، صبر کے معنی صرف چوٹ کھا کر خاموش رہنے کے نہیں ہیں، بلکہ صبر بڑے مقصد کے لئے مصیبتوں اور آزمائشوں کو سہنے اور حوصلہ شکن حالات میں بے برداشت ہونے کے بجائے حکمت وتدبیر سے کام لینے کے ہیں۔

اس وقت عالمی حالات مسلمانوں کے لئے بہ ظاہر بہت حوصلہ شکن اور ہمت کو پست کرنے والے ہیں، اچھی خبروں کے لئے کان ترستے ہیں، خوش کن نتائج کو دیکھنے کے لئے آنکھیں سراپا انتظار ہیں، سکون وطمانینت دینے والی اطلاعات کے لئے قلوب بے چین ہیں، بہ ظاہر ہر طرف ظلمت کی گھٹائیں اور اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، لیکن مومن کا کام یہ ہے کہ وہ ان اندھیروں میں بھی روشنی تلاش کرلے، ناامیدیوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں سے بھی امید کی کرنیں اسے نظر آئیں اور وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، صحابہ کا یہی طریقہ تھا، وہ ناموافق حالات میں بھی ایسے پہلو تلاش کر لیتے تھے، جس سے طمانینت ہو اور جس سے ان کا خدا راضی ہو جائے ، لوگ انہیں خوف دلاتے ، کہ پوری دنیا تمہارے مقابلہ پر جمع ہوگئی ہے، اور وہ کہتے ہمارے لئے خدا کافی ہے، **حسبنا اللہ و نعم الوکیل** ، ان کے ایمان میں ایسی وحشت انگیز خبروں سے اضافہ ہی ہو جاتا، لوگ انہیں ان کے رفقاء کی شہادت کا طعنہ دیتے اور وہ اسے اپنے بھائیوں کے لئے انعام تصور کرتے ۔

اس وقت حالات گو بہت بُرے ہیں، لیکن اس میں ایک پہلو خیر کا بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کو سمجھنے اور اسلام کے بارے میں جاننے کا جو رجحان اس وقت پیدا ہوا ہے، کم از کم پچھلے پچاس سال میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی ، اسلام کے خلاف میڈیا کی زہرافشانی اور اس کے نتیجہ میں اسلام کو جاننے کی خواہش کو دیکھتے ہوئے سیرت کا وہ واقعہ یاد آتا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی میں جب حج کا موسم آتا، یا کوئی بڑا تجارتی میلہ لگتا، تو آپ کی طرف سے لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لئے اہلِ مکہ طرح طرح کی باتیں کرتے، اور زیادہ تر یہ کہا جاتا کہ آپ جادوگر یا مجنون ہیں، (والعیاذ باللہ) اور ایسا جادو جانتے ہیں، جس کے ذریعہ والدین اور اولاد اور شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے ہیں، لیکن یہی پروپیگنڈہ آپ کی طرف لوگوں کی توجہ کا باعث بن جاتا، باہر سے آنے والوں میں ایک کھوج پیدا ہو جاتی کہ آخر یہ کون شخص ہے جس کی مخالفت اس شدو مد کے ساتھ کی جارہی ہے؟ یہی تجسس لوگوں کو بارگاہ نبوت تک لاتا، پھر وہ آپ سے متاثر ہوکر اور دامن دل کو ایمان سے بھر کر واپس ہوتے، یہ آپ کی دعوتی زندگی کا بڑا صبر آزما مرحلہ تھا، آپ ہر بری بات کا جواب ''بہتر بات'' یعنی سنجیدہ طریقہ پر دعوت الی اللہ سے دیتے، لوگ گالیاں دیتے، اور آپ ان کے لئے ایمان کی دعاء فرماتے، لوگ بُرا بھلا کہتے، اور آپ کی راہوں میں کانٹے بچھاتے، اور آپ ان پر میٹھے بول کے پھول برساتے، اور کہتے: قولوا لاالٰہ الا اللہ تفلحون، (خدائے حقیقی سے اپنا رشتہ جوڑلو تو تم کامیاب ہوگے) لوگ آپ کے خلاف زہر افشانی کرتے لیکن آپ کی زبان مبارک سے کبھی ان کی ذات کے لئے کوئی تلخ کلمہ بھی نہیں نکلتا، لوگ آپ کی ذات کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے، اور آپ شب وروز خدا کی توحید کا اعلان فرماتے، لوگ نفرتوں کی آگ سلگاتے، اور اس کی آنچ کو تیز تر کرنے کی کوشش کرتے، اور آپ محبت کی پھوار سے اسے بجھانے کی راہ اختیار کرتے۔

یہی وہ ''طریقہ احسن'' ہے جس کی قرآن نے دعوت دی ہے، اور جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی توفیق ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کا پیکر ہوں، موجودہ حالات میں بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم نفرت کا جواب کلمہ محبت سے دیں، مشتعل کردینے والی باتوں کا جواب سنجیدہ، مدلل اور حقیقت پسندانہ اسلوب میں دیا کریں، تو اس طرح ہم اسی شر کو اپنے لئے سرچشمۂ خیر بنا سکتے ہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۱؍ستمبر کے واقعہ کے بعد وسط دسمبر تک کی اطلاع یہ ہے کہ امریکہ میں ۳۵؍ہزار لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں سالانہ قبول اسلام کی شرح

۲۵؍ ہزار ہے، لیکن ۱۱؍ستمبر کے واقعہ کے بعد اس میں چار گونہ اضافہ ہوگیا ہے (ماہانہ رفیق منزل ،جنوری ۲۰۰۲ء: ۲۳) پوری دنیا میں اسلامی ویب سائٹس کے وزیٹرس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

سعودی عرب میں اٹلی کے سفیر ٹارکوٹو کارڈیلی نے قبول اسلام کا اعلان کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، ریاض کے ایک مرکز دعوت میں پورے رمضان المبارک اس سال ہر دن اوسطاً ۵؍غیر مسلم آکر اسلام قبول کرتے رہے، جب کہ صرف ریاض میں اس طرح کے تقریباً ۲۰؍مراکز ہیں، (حوالۂ سابق بحوالہ عرب نیوز ۲۷؍نومبر) یہ بات قارئین کے علم میں ہوگی کہ جو امریکن فوج سعودی عرب آئی تھی، اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمان سماج سے متأثر ہوکر ان میں سے دو ہزار سپاہیوں نے اسلام قبول کرلیا، اس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شکست مسلمانوں نے کھائی ہے نہ کہ اسلام نے، مسلمانوں کے فاتح تاریخ میں اکثر اسلام کے مفتوح بنتے رہے ہیں، اور آج بھی یہ تاریخ دہرائی جاسکتی ہے۔

اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ منصوبہ بند پروپیگنڈہ کا جواب منصوبہ بند دعوت سے دیا جائے، اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ہر علاقہ اور ہر ملک میں اسلام کا تعارف پیش کریں، اسلام نے امن وآشتی، صلح ورواداری اور محبت کا جو پیغام انسانیت کے لئے دیا ہے، اس پیغام کی خوشبو سے ہم پوری دنیا کی فضاء کو عطر بار بنادیں، اور لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع فراہم کریں کہ اسلام محبت اور انسانی اخوت کو جلا دینے والی بادسموم نہیں، بلکہ انسانیت کو اخوت و بھائی چارہ کی خنکی سے ہمکنار کرنے والی بادنسیم ہے۔

ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قریہ قریہ، شہر شہر، محلّہ محلّہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماعات رکھیں، اور قرآن صلح و امن کی جو تعلیم دیتا ہے اس کو خوش اسلوبی سے پیش کریں، ان آیات کے ترجموں پر مشتمل ورقئے طبع کرائیں، اور اسے برادران وطن تک پہونچائیں، تلگو اور مقامی زبان کے اخبارات تک ایسے مضامین پہنچانے کی کوشش کریں، گو اس سلسلہ میں انگریزی اخبارات کا رویہ ایک حد تک غیر

حقیقت پسندانہ رہا ہے، اور یہ شکایت عام ہے کہ اسلام کے خلاف جو بے سروپا باتیں آتی ہیں، انہیں تو یہ بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں، اور اس کے جواب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اسے بہت کم قابل اعتناء سمجھتے ہیں، لیکن اس میں ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے، ہم اس بات کی کوئی منظم کوشش نہیں کرتے کہ ایسے مضامین اور مراسلات کا سنجیدہ، غیر جذباتی اور مدلل جواب دیں، اور انگریزی اخبارات کے ذمہ داروں تک پہنچ کر انہیں مسلمانوں کی شکایت کی طرف متوجہ کریں، ہم اشتعال واحتجاج کے بجائے انہیں قائل کریں، اس طرح ہم انگریزی اخبارات تک بھی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعہ ایک ایسے ذریعہ ابلاغ تک ہمیں رسائی حاصل ہوئی ہے، جس میں اپنی بات، اپنی زبان اور اپنے قلم سے پہنچانے کا پورا موقع حاصل ہے، اس میں ہم نہ کسی سہارے کے محتاج ہیں، اور نہ کثیر وسائل کے، اور اس وقت یہ سمجھدار اور باشعور لوگوں تک رسائی کے لئے نہایت وسیع الاثر ذریعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرے ذرائع ابلاغ بھی ہیں، جن کے ذریعہ ہم لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ہم ان وسائل وذرائع سے استفادہ کریں، اور جذبات کے بجائے حکمت وتدبیر اور اشتعال کے بجائے صبر واستقامت کی راہ اختیار کریں، اس طرح ممکن ہے کہ یہی طوفانِ مغرب امتِ مسلمہ کو ایک نئے ساحل سے ہمکنار کردے، بہ قول شاعر اسلام علامہ اقبال:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

(۱۵ر فروری ۲۰۰۲ء)

بہار ہو کہ خزاں

کامیابی اور ناکامی، جیت اور ہار انسان کی زندگی کا ساتھی ہے، اسلام کی نگاہ میں غلبہ اور کامیابی حق ہونے کی اور مغلوبیت اور ظاہری ناکامی کسی بات کے غلط ہونے یا کسی انسان یا جماعت کے ناحق ہونے کی دلیل نہیں، ایسا ہوتا تو کبھی کفر کو اسلام پر ظاہری غلبہ حاصل نہ ہو پاتا، لیکن بسا اوقات اور تو اور خود انبیاء کو شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے، بدر کی لڑائی بے سروسامانی کی تھی، اس میں مسلمانوں کو فتح ہوئی، حنین واحد میں خود حضور ﷺ موجود تھے، لیکن ایک میں ابتداءً اور دوسری میں آخری مرحلہ میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے تاکہ برے وقتوں میں بھی امت کے لئے نبی کا اسوہ موجود رہے۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ انسان کا ہاتھ حق اور سچائی کے لئے اٹھے، سچائی کی مدد اصل کامیابی ہے۔ اگر یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہو جب بھی انسان ناکام نہیں اور غلطی میں تعاون بہرصورت ناکامی ہے، گو بظاہر نتیجہ اس کے حق میں ہو جائے۔

اصل میں یہ دونوں گھڑیاں اہل ایمان کے لئے امتحان کی ہیں، مومن وہ ہے کہ جب فتح مند ہو اور کامیابی اس کے قدم چومے، تو اس کا سر جھکا ہوا ہو، اس کی زبان پر خدا کی حمد ہو، اس کی پیشانی اللہ کے سامنے خم ہونے کو بے قرار ہو جائے، وہ اکڑفوں میں مبتلا نہ ہو جائے، تواضع و نیازمندی اس کے ایک ایک انگ سے نمایاں اور عجز و فروتنی اس کے ایک ایک بول سے ہویدا ہو، جن سے اس کا اختلاف رہا ہو، ان کے لئے وہ ریشم کی طرح نرم ہو جائے، فتح مکہ کا موقع ہے، اس سے بڑھ کر آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے جاں نثاروں کے لئے خوشی کا کیا موقع ہو سکتا تھا؟ جہاں ٹھکرایا گیا، جھٹلایا گیا، ارض وطن چھوڑ کر نکلنے پر مجبور کیا گیا اور سر پر انعام مقرر ہوا، آج وہی سرزمین مکہ آپ کے استقبال

کے لئے دل کی آنکھیں بچھائے ہوئے ہے اور دس ہزار جان نثاروں کا لشکر جرار اپنا سر دھڑ آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور کرنے کو تیار ہے۔ یہ موقع ہے پر جوش نعروں کا، دشمنوں پر کم سے کم فقرہ بازیوں اور طعنہ اندازیوں کا، سینہ تنا ہوا اور سر مارے فخر کے اونچا نہ ہو تو جشن فتح کا کیا لطف آئے؟ لیکن آج آپ ﷺ پر عبدیت و بندگی کا رنگ ہر دن سے بڑھ کر ہے، اونٹنی پر سوار ہیں، زبانِ مبارک حمد الٰہی سے تر ہے، تواضع سے سر مبارک جھکا ہوا اور بار ہا اونٹنی کی کوہان سے لگ جاتا ہے، مکہ میں داخل ہوئے تو حضرت ام ہانی کے گھر کو اپنی میزبانی سے رونق بخشی اور وہیں غسل کر کے نماز شکر ادا فرمائی۔

اگر کبھی ہزیمت ہو، شکست ہو، ظاہری ناکامی سے انسان دوچار ہو، تو اس وقت بھی توازن قائم رکھے، صبر و استقامت کی راہ اختیار کرے اور اللہ ہی کی طرف رجوع کرے، طائف کے واقعہ سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ واقعہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پیش نہیں آیا، آپ ﷺ اہلِ مکہ سے مایوس بڑی امیدوں کے ساتھ طائف پہنچے تھے، لیکن اہلِ طائف کا سلوک اہل مکہ سے بھی برا ثابت ہوا، پتھروں کی بارش نے جسم مبارک کو لہولہان کر دیا تھا، آپ ﷺ اس دُکھ بھری گھڑی میں اللہ سے رجوع ہوئے اور ایسی درد انگیز دُعاء فرمائی کہ آج بھی قلب سلیم اس سے لرز اٹھتا ہے، مگر اس وقت بھی زبانِ مہربان پر اپنی قوم کے لئے دُعاء کے الفاظ ہیں اور خدائے رحمان سے کوئی گلہ نہیں؛ بلکہ ایک ایک لفظ سے صبر و رضا اور بر و وفا ظاہر ہے۔

ایمان انسان کے اندر خدا کی خشیت پیدا کرتا ہے، جس انسان کے اندر خدا کا خوف اور اس پر یقین پیدا ہوتا ہے وہ پوری دنیا سے بے خوف ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ یقین رکھتا ہے کہ نفع و نقصان کے فیصلے دنیا میں نہیں آسمان میں ہوتے ہیں، خدا کی مشیت کے بغیر نہ کوئی اسے نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، ایمان انسان کو بے ضمیری اور اُصولوں پر سمجھوتہ سے باز رکھتا ہے، مکی زندگی میں مسلمانوں پر کیا کچھ آزمائشیں نہ آئیں، وہ کن کن ابتلاؤں سے نہیں گزرے؟ اور ان کو راہِ حق سے منحرف کرنے اور کفر و شرک سے سمجھوتہ کرنے کے لئے ترغیب و تحریص کے کیا کیا وسائل اختیار نہ کئے گئے؟ مال و زر کے، اعلیٰ

عہدوں کے، حکومت واقتدار کے اور حسن و جمال کے، فکر وایمان کی قوت نے کبھی پائے استقامت میں تزلزل نہیں آنے دیا، مسلمان جہاں کہیں بھی رہے، اس کی پیشانی صرف خدا کے سامنے جھکتی ہے، وہ حالات کے سامنے سپر نہیں ڈال سکتا، وہ مقابلہ کی ہمت وحوصلہ سے محروم نہیں ہوسکتا، وہ اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرسکتا، وہ ایمان فروش نہیں ہوسکتا اور اس کے دین وایمان کا سودا نہیں کیا جاسکتا۔

''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے'' یہ احساس اس کو موجوں سے کھیلنے کا حوصلہ بخشتا ہے اور وہ سرد وگرم کو سہتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے، ہر حال میں اللہ کی طرف نگاہ ہو، یہی ایک مسلمان کے لئے اصل اسوہ ہے۔

جب انسان پر برا وقت آئے، ایسے حکمراں مسلط ہوں یا ایسے لوگ حکمرانی سے قریب پہنچ جائیں جن سے ظلم و جبر اور حق تلفی و ناانصافی کا اندیشہ ہو تو اپنے اعمال پر نگاہ کرنی چاہئے، کیوں کہ انسان کے اعمال ہی کے مطابق اس کو احوال بھی پیش آتے ہیں۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا، قتل عام کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو ایک بزرگ نے فرمایا کہ ہماری بداعمالیوں نے نادر کی صورت اختیار کرلی ہے ''شامتِ اعمالِ ما درصورت نادر گرفت!''۔ اس لئے ایسے حالات دعوت دیتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں اور اپنے حالات پر نظر کریں کہ کہیں ہماری بداعمالیوں نے تو ہم کو یہاں تک نہیں پہنچایا ہے، فرقہ بندی، افتراق، باہمی دل شکستگی، رجوع الی اللہ کی کمی، احکامِ الٰہی کے ساتھ بے نیازی اور دین سے بے تعلقی نے تو ہم کو اس صورتِ حال سے دوچار نہیں کیا ہے؟

غرض مؤمن کی نگاہ ہر حال میں خدا کی طرف ہونی چاہئے، نہ فتح مندی اسے مغرور کرے، نہ ظاہری شکست مایوس و پست ہمت۔

بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

(۶/ مارچ ۱۹۹۸ء)

بیسویں صدی کا سبق

بیسویں صدی گذر چکی ہے اور ہم لوگ اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں، زندہ قوموں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ماضی سے سبق لیتی ہیں اور اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کا نقشہ تیار کرتی ہیں، اسی لئے قرآن مجید میں انبیاء اور ان کی قوموں کے کتنے ہی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے اور ان واقعات میں عبرت وموعظت کے جو پہلو ہیں، انہیں نمایاں فرمایا گیا ہے، تاکہ اگلی قومیں اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور اس چراغ کی روشنی میں اپنا سفر طے کریں۔ پس امتِ مسلمہ کا یہ طریقہ ہونا چاہئے کہ ماضی سے سرسری طور پر نہ گذر جائے، بلکہ اس کا جائزہ لے، خود اپنا احتساب کرے اور اس کی روشنی میں مستقبل کے لئے لائحۂ عمل طے کرے۔ اس لئے ہمیں بھی گذری ہوئی صدی کا جائزہ لینا چاہئے اور اس کو اپنے لئے آئینہ بنا کر اپنے اجتماعی چہرہ کو سنوارنا اور آراستہ کرنا چاہئے۔

اس صدی میں متعدد ایسے حادثات ہوئے ہیں، بلکہ پیہم ہوتے رہے ہیں جنہوں نے بار ہا دردمند دلوں کو بے چین اور آنکھوں کو اشکبار کیا ہے اور امت پر ایسے ایسے طوفان آئے ہیں کہ بہت سی قومیں اس سے معمولی واقعات پیش آنے پر بکھر کر رہ گئیں اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا، لیکن ان میں سے تین واقعات ایسے ہیں جو بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور جو ہمیشہ مسلمانوں کو بے سکون اور مضطرب رکھیں گے۔ ان میں پہلا واقعہ خلافتِ عثمانیہ ترکی کے سقوط کا ہے، جو ۱۹۲۳ء میں پیش آیا۔ خلافتِ عثمانیہ اخیر زمانہ میں گو اثر ونفوذ کھو چکی تھی اور شوکت وشکوہ سے محروم ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور عالم اسلام کی وحدت کی ایک علامت تھی، چنانچہ افریقہ سے لے کر ہندوستان تک جمعہ کے خطبوں میں خلیفۂ عثمانی کا نام لیا جاتا تھا، دنیا میں جہاں کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے،

ایوانِ خلافت کی طرف لوگوں کی نگاہ اٹھتی تھی اور گوترکی کو یورپ کا ''مردِ بیمار'' کہا جاتا تھا، لیکن اس کی صدائے حق مغرب اور مشرق کے ایوانہائے حکومت کو متأثر کئے بغیر نہ رہتی تھی، مغربی دنیا کو صلیبی جنگوں میں عالمِ اسلام سے جو پے بہ پے ہزیمتیں اٹھانی پڑیں اور ہزار سازشوں کے باوجود وہ خلافتِ اسلامیہ کے تار و پود بکھیرنے سے قاصر رہے، اس چیز نے ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ جب تک خلافت کی قبا چاک نہ ہوگی اور مسلمانوں کی اجتماعیت اور وحدت کا یہ علامتی ادارہ ختم نہ ہوجائے گا، عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کرنا، ان کو اپنی مرضیات کے تابع کرنا، اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنانا اور ان کی ہمتوں کو پست کرنا ممکن نہیں، چنانچہ ایک زبردست سازش کے نتیجہ میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے عالمِ اسلام میں قومیت اور وطنیت کے فتنہ کو نہایت ہی قوت کے ساتھ ابھارا گیا، عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا گیا اور خود عالمِ عرب میں بھی مختلف علاقوں میں علیٰحدہ قومیت کے نعرے لگائے گئے، ادھر جنگِ عظیم میں جرمن اور اس کے اتحادیوں کی شکست نے ترکوں کو بے وزن کر ہی دیا تھا، عربوں کو ترکوں کے خلاف کھڑا کر کے خود ترکوں میں بھی اپنی قومی عظمت کا صور پھونکا گیا اور اس طرح خلافتِ عثمانیہ ترکیہ کا سقوط ہوا اور پورا عالمِ اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔

سقوطِ خلافت کے پیچھے خاص طور پر یہودی سازش کار فرما تھی، اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے یہ افسوس ناک حقیقت کافی ہے کہ جس یہودی نمائندہ نے آخری عثمانی خلیفہ سے بیت المقدس اور فلسطین میں یہودیوں کے زمین خریدنے کی اجازت مانگی تھی اور کہا تھا کہ اگر خلیفہ اس درخواست کو قبول کرلیں تو قرضوں سے دبی ہوئی خلافت کے پورے قرضے یہودی ادا کردیں گے، وہی یہودی مصطفیٰ کمال پاشا کی طرف سے الغاءِ خلافت کا پروانہ لے کر خلیفہ عبد المجید کے پاس گیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس گہری سازش اور دور رس گھیرابندی کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کا چراغ بجھایا گیا اور عالمِ اسلام کو فوجی اعتبار سے بے اثر کرنے کے لئے ایسی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ دیا گیا جو کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز و قاصر رہے، پھر چوں کہ عالمِ اسلام کے اکثر حصہ

پر مغرب کی استعماری طاقتیں براجمان تھیں، اس لئے ان ملکوں کو آزاد کرتے ہوئے ان چھوٹی چھوٹی مملکتوں کے درمیان بھی سرحدی جھگڑے برقرار رکھے گئے، تاکہ یہ کبھی اپنی باہمی آویزشوں سے آزاد نہ ہونے پائیں اور ہمیشہ صلیبی اور صیہونی طاقتوں کا لقمۂ تر بن کر رہیں۔

چنانچہ خلافت کے سقوط کے بعد جلد ہی فلسطین میں اس اسرائیلی حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کا صدیوں سے یہودی خواب دیکھتے تھے اور جو ۱۹۴۸ء سے آج تک عالمِ اسلام کے قلب میں ایسا ناسور ہے جس سے امت کا پورا وجود کراہ رہا ہے۔ آخر یہی اسرائیل توسیع پسندانہ عزائم کے تحت ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کے قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ پر قابض ہوا اور نہ صرف فلسطین بلکہ مصر واردن اور شام تک کے ایک بہت بڑے علاقہ پر صرف چھ دن کے عرصہ میں بزورِ طاقت قبضہ کرلیا۔ یہ اس صدی کا دوسرا بڑا حادثہ ہے جو مسلمانوں کے لئے المناک بھی ہے اور شرمناک بھی، کہ ایک چھوٹا سا ملک غاصبانہ مسلمانوں کے قبلۂ اوّل پر قابض ہے اور پچاس سے زیادہ عرب اور مسلم ممالک مل کر اس کو بازیاب کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ اگر عوام کا خوف نہ ہو تو بعض عرب قائدین تو مقامِ مقدس کا سودا کرنے کو بھی تیار ہیں۔ اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ اور فلسطینی بھائیوں پر جور وستم جس قدر افسوس ناک ہے اس سے زیادہ حسرت عالمِ اسلام کی بے بسی، اعداءِ اسلام سے ان کی قربت اور اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت سے ان کی محرومی پر ہوتی ہے۔ صلاح الدین ایوبیؒ سے پہلے جب بیت المقدس صلیبی طاقتوں کے قبضہ میں گیا اور کم وبیش ۹۰ سال مسلمان اپنے اس مقدس مقام سے محروم رہے تو اس وقت امت کا ایک ایک فرد بیت المقدس کے حصول کے لئے بے چین تھا اور سلاطینِ اسلام سمجھتے تھے کہ صرف یہی ان کا مقصد وجود ہے، لیکن آج اسلامی ممالک اس معاملہ میں اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ گویا کوئی اہم واقعہ ہی نہیں، اور اگر بعض مسلم حکمرانوں کو اپنی عوام کے احتجاج کا اندیشہ نہ ہو تو شاید وہ طشت میں سجا کر اس مقامِ مقدس کو اسرائیل کے حوالے کر دیں، حیرت اس بے حیائی پر ہوتی ہے کہ بعض مسلم ممالک نے ایسی غاصب یہودی قوت کے ساتھ اپنے تجارتی اور دفاعی معاہدات

بھی قائم رکھے ہیں۔

تیسرا بڑا حادثہ وہ ہے جو ۶ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کی صورت میں پیش آیا۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے پہلے کوئی مسجد شہید نہ کی گئی ہو، خاص کر ہندو پاک کی تقسیم کے وقت کتنی ہی مسجدیں ہیں جن پر غاصبانہ قبضہ کرلیا گیا، لیکن بابری مسجد کی نوعیت ان سب سے الگ ہے، بابری مسجد کو شہید کرنے کے لئے ایک ایسی تاریخ گھڑی گئی جس کے لئے کوئی سند نہیں، پھر اسے بت خانہ میں تبدیل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بند مہم چھیڑی گئی، فرقہ پرستی کی آگ بھڑکائی گئی اور شہر شہر، قریہ قریہ، فرقہ پرست طاقتوں نے اس موضوع کو ہر عام و خاص کے ذہن میں داخل کیا اور پھر علی الاعلان مجمع عام میں پہلے سے دی گئی تاریخ پر مسجد کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور اللہ کے گھر کو بت خانہ میں تبدیل کردیا گیا، یہ صرف ایک مسجد کی شہادت نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد پورے اعلان و اظہار کے ساتھ شعائرِ اسلام کی اہانت اور مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر تھی، جس کے ذریعہ پوری دنیا میں امتِ مسلمہ کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ سر اٹھانے کی کوشش نہ کریں، بلکہ ایک مجبور ومقہور قوم کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہیں، اسلامی ممالک کی اس واقعہ پر خاموشی اور بہت سے ممالک کے ردعمل کے اظہار سے بھی گریز نے اس بات کو صاف ظاہر کردیا کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں کے ساتھ کتنا بڑا واقعہ بھی پیش آئے، عالمِ اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں، بعض لوگوں کو شبہہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں یہ واقعہ اسرائیل کے اگلے منصوبہ کے لئے آزمائش نہ ہو۔

بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ بھی اصل میں اسی یہودی ذہن کی غماز ہے جو اسرائیل کے وجود کے پیچھے کارفرما ہے، یہودی اور برہمن دو ایسی قومیں ہیں جو اپنی نسلی برتری کی دعویدار ہیں اور یہ قومی تفاخر کا جذبہ محض سماجی رسم ورواج کے درجہ میں ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے عقیدہ وایمان کا حصہ ہے، چنانچہ ہندوستان میں جب نچلی ذات کے لوگ کھڑے ہونے لگے اور انہوں نے برہمنوں کو چیلنج کیا، تو ہندوستان کی برہمن طاقت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو اٹھایا، تاکہ یہ نئی تحریک دب جائے اور فرقہ وارانہ منافرت اپنے شباب کو پہنچ

جائے، یہاں تک کہ برہمن فکر کی نمائندہ فرقہ پرست تنظیمیں بامِ اقتدار پر پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں، جیسے یہودی مغرب کی معیشت اور ذرائع ابلاغ کو اپنی گرفت میں لیئے ہوئے ہیں اور کلیدی عہدے پر متمکن ہیں، اسی طرح ہندوستان میں برہمنوں نے ملک کی معیشت اور پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور اسی لئے اقتدار کے تمام کلیدی عہدوں پر ان کا قبضہ ہے، ہندوستان اور اسرائیل کی قربت نے ان دونوں ہم فکر قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، ان کی قوت کو توڑنے اور انہیں احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی تدبیروں اور سازشوں میں دونوں دوش بدوش ہیں۔

غور کیا جائے تو مسلمانوں کی اس پسپائی اور وقتی ہزیمت کے اسباب میں سے دو نہایت اہم سبب ہیں: ایک مسلمانوں کا باہمی اختلاف، دوسرے مسلمانوں اور عالمِ اسلام کے دشمنوں اور کھلے ہوئے مخالفوں کے ساتھ مسلمانوں کے ایک طبقہ کی دوستی اور قربت۔

عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک جہاں کہیں مسلمانوں نے نقصان اٹھایا ہے، بنیادی طور پر اس کا سبب باہمی اختلاف وانتشار ہے۔ عالمِ اسلام پر جتنی بڑی بڑی آفتیں آئی ہیں، وہ سب اسی اختلاف کی دَین ہیں، تاتاریوں کا فتنہ کیوں کر داخل ہوا اور کس طرح اس نے دارالخلافہ بغداد تک کی اینٹ سے اینٹ بجادی؟ اسپین مے مسلمانوں کو آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد پھر کیوں رختِ سفر باندھنا پڑا؟ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں مغربی قومیں کیوں کر فتح یاب ہوئیں؟ عالمِ اسلام کے قلب میں اسرائیل کا وجود کیسے پنپ سکا؟ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا سورج کیوں اور کب غروب ہوا؟ تاریخ کے صحیفہ میں اس طرح کے جتنے واقعات موجود ہیں ان سب کے بارے میں سوال کر لیجئے اور تاریخ کی عدالت سے اس کا جواب پوچھئے تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلاف نے ان کی قوت کو پاش پاش کیا، ان کے دشمنوں کی جرأتیں بڑھائیں اور پھر فتح مندی اور ظفر مندی نے ان سے ایسا منہ موڑا کہ گویا اس قوم کی قسمت میں یہ چیز آئی ہی نہ ہو۔

یہ امت کے ترقی وتنزل اور فتح وشکست کے اس الٰہی قانون کے عین مطابق ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے :

''وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ،'' (انفال:۴۶)

''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔''

یعنی مسلمانوں کے اختلاف وانتشار کے ساتھ ان کی پسپائی اور رہواخیزی اللہ کی طرف سے مقدر ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا قانون بدل نہیں سکتا۔

دوسرا سبب مسلمانوں کی اعداءِ اسلام کے ساتھ قربت، یہاں تک کہ رازدارانہ معاملات میں بھی ان پر اعتماد واعتبار ہے۔ قرآن میں کتنے ہی مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیونکہ وہ تم کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اور ہمیشہ تمہاری تکلیف اور مشقت کے آرزومند رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ''بطانة'' (آل عمران:۱۱۸) کا لفظ استعمال فرمایا ہے، ''بطانہ'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اندورنی حالات اور رازہائے دروں سے واقف ہو۔ آج عالمِ اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی فوجی تنصیبات اعداءِ اسلام کے ہاتھوں میں ہے، ملک کی داخلی اور خارجی حکمتِ عملی ان کے حوالے ہے۔ یہ بات کس قدر حیرت ناک ہے کہ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر کے متعدد کمانڈر وہ تھے جن کی بیویاں یہودی تھیں اور اس لئے جنگ کی تمام تدبیریں اسرائیل کے سامنے اس طرح تھیں جیسے کوئی شخص آئینہ میں اپنی صورت دیکھ رہا ہو۔ آج بھی بڑے بڑے عرب فرمانراؤں کے نکاح میں اسرائیل اور یہودی عورتیں ہیں، خود ہندوستان میں ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جو لوگ علی الاعلان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں اور جن جماعتوں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کو اپنا منشاء ومقصود بنا رکھا ہے، ان کو بھی مسلمان ہمنوا اور مسلمان دوست مل جاتے ہیں۔ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس معاملے میں یہودی اور عیسائی ایک ہی ہیں، ان میں کوئی فرق

نہیں ، کیوں کہ مسلمانوں کے مقابلہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور ہم نوا ہیں ، لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى اَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (المائدۃ :۵۱)اور جو فطرت یہودیوں کی ہے وہی مشرکین کی ہے، اسی لئے مسلمانوں کی عداوت میں قرآن نے دونوں کوہم پلہ قرار دیا ہے۔

یہی افتراق اور اسلام دشمنوں کے ساتھ دوستی (موالات) ہے، جس نے اس صدی میں عالمِ اسلام اور امتِ مسلمہ کوقدم قدم پرنقصان پہونچایااور ذلت ونکبت سے دو چار کیا ہےاورضرورت ہے کہ اب مسلمان اس عالمی سازش کو سمجھیں ، اپنے آپ کوانتشار سے بچائیں ،خوش تدبیری کا راستہ اختیار کریں اوران عناصر سے اپنے آپ کودوررکھیں جو اسلام اورمسلمانوں کے خلاف برسر پیکار ہیں، کہ یہ چیز ہمیں کمزوربھی کرتی ہے اوراللہ کی مدد سے محروم بھی رکھتی ہے!جہاں گذرنے والی صدی نے زخم اور کسک کے نقوش امت کو دیئے ہیں وہیں اس صدی کے بعض ایسے خوش آئند اور خوش گوار پہلو بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔یہ ایک ایسی صدی ہے کہ یہودی ،عیسائی اورکمیونسٹ جوقریب قریب پوری دنیاپر بلا واسطہ یابالواسطہ حکومت کررہے تھے ،انہوں نے اسلام کومٹانے ،مسلمانوں کو اسلام سے دورکرنے ،ان میں احساسِ کمتری اورفکری تشکیک پیداکرنے اورانہیں اپنے اندر جذب کرنے میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی ،ترغیب وتحریص کے وسائل بھی اختیار کئے گئے ،علمی اورفکری یلغاریں بھی ہوئیں ،سازشوں کے نوع بنوع جال بھی بنے گئے ،جوروستم بھی ایک سے بڑھ کر ایک رَوا رکھا گیا اور سارے حربے مسلمانوں پر آزمائے گئے ، غالبًا دشمنانِ اسلام کے ترکش میں کوئی ایسا تیرنہیں تھا جو اسلام اورمسلمانوں پر پھینکا نہ گیا ہو، لیکن اس کے باوجود نہ وہ مسلمانوں کے قدم کومتزلزل کرسکےاور نہ اسلام کی محبت کی جوتخم ان کے دلوں میں ہے وہ اسے اکھاڑنے میں کامیاب ہوئے ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی بیداری اوراسلامی حمیت میں اضافہ ہی ہوا، جتنا انہیں دَبایا گیاوہ اتنے ہی اونچے اٹھےاور جتنا انہیں تپایا گیااسی قدران کے حوصلہ وہمت میں اضافہ ہوتا گیا۔

اہل یورپ سمجھتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا چل چلاؤ ہےاور

کچھ ہی عرصہ میں وہ اسلام کے خلاف عداوت اور نفرت وانتقام کی جو آگ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں، کی پیاس بجھ جائے گی، لیکن یقیناً وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوسکے، شاید انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کو عیسائیت اور دوسری قوموں پر قیاس کیا، کہ جیسے عیسائیوں نے مظالم سے بچنے کے لئے ایک ایسے مذہبی تصور کو قبول کرلیا جو یونان کی قدیم بت پرستی سے ہم آہنگ تھی اور اصل عیسائیت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی، اور جیسے ہندوستان میں برہمنوں کے جور وستم سے عاجز اور ان کی سازشوں کا شکار ہوکر مختلف مذہبی اکائیوں نے ہندو مذہب اور ہندو سماج میں جذب ہوجانے کو گوارا کرلیا، اسی طرح جب خلافت کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت بکھر کر رہ جائے گی اور وہ فوجی اور عسکری طاقت کے اعتبار سے اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ شکست خوردہ ہوجائیں گے، نیز مغرب کی طرف سے اسلامی عقیدہ سے لے کر شریعتِ اسلامی کے مآخذ، اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین پر فکری یورشیں منصوبہ کے ساتھ کی جائیں گی تو بالآخر مسلمان وہی کچھ کرنے پر مجبور ہوں گے جو ان دوسری مظلوم ومقہور قوموں نے کیا ہے۔

لیکن سخت ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں نے جس استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، وہ بھی ایک مثال ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے روشن مثال ماضی قریب میں بوسنیا، کوسووا اور چچنیا کی ہے۔ مغرب جو اپنے آپ کو تہذیب کا علمبردار کہتا ہے، اس نے یورپ کے قلب میں جیسی انسانیت سوز حرکتوں کا ارتکاب کیا ہے اور ظلم وستم کے بازار گرم کئے ہیں، شاید درندے بھی ان کو دیکھ کر عرق آلود ہوگئے ہوں اور شیطان نے بھی ان کا لوہا مان لیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا قتل عام، عصمت دری اور عزت ریزی کے اجتماعی مراکز کا قیام، اور نہ جانے کیسی کیسی شرمناک اور ہولناک حرکتیں کہ جن کا تصور کرکے بھی کلیجہ منہ کو آئے اور یہ سب کچھ مغربی طاقتوں نے باہمی یگانگت کے ساتھ کیا ہے اور کوئی قوم ہوتی تو یقیناً سر تسلیم خم کردیتی اور اپنے دین ومذہب کا سودا کرچکی ہوتی لیکن قربان جایئے اس علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں پر، جو مدتوں سے کمیونسٹ حکومتوں کے زیرِ اقتدار رہنے کے باوجود اپنے سینوں میں ایمان کا آتش فشاں چھپائے بیٹھے تھے،

جنہیں جور وستم کا سمندر بھی بجھا نہ سکا اور آخر ایسے نہتے وسائل سے محروم قوم نے ہر طرف سے تعاون اور مدد کے راستے منقطع ہونے کے باوجود نہ صرف اپنے ایمان کو باقی رکھا بلکہ بوسنیا اور کوسووو تو اپنے سیاسی وجود کو بھی برقرار رکھنے میں کامیاب رہا اور چیچنیا کو گو روس نے جبر وتشدد کے ذریعہ حاصل کرلیا ہے لیکن مجاہدین کی جرأت فرزانہ نے آج بھی ان کی نیند حرام کر رکھی ہے۔ اگر کوئی ایسی تاریخ مرتب کی جائے جس میں اپنے مذہب اور اپنے دین کے بقاء کے لئے پیش کی جانے والی قربانیوں کی داستان رقم کی جائے تو یقیناً یہ اس کے زریں ابواب ہوں گے۔

روس میں کمیونزم کے ستر سالہ جابرانہ اقتدار کے بعد پھر اس کے بطن سے پانچ مسلمان ملکوں کا ظہور اور ان میں اپنے اسلامی اور مذہبی تشخص کا شعور خود ایک ایسا واقعہ ہے جس کو اس صدی کا معجزہ کہا جاسکتا ہے اور جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک ایسی طاقت ہے کہ نہ کوئی آگ اسے جلا سکتی ہے اور نہ کوئی طوفان اسے نابود کرسکتا ہے، اس کی جڑیں اہلِ ایمان کے قلوب میں اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں اکھاڑا جانا ممکن نہیں۔ اسلام کی فتح وکامیابی اور نصرت وظفر مندی کی سب سے بڑی اور روشن مثال نہایت ہی ذلت وحقارت کے ساتھ افغانستان سے روس جیسی سپر طاقت کا ناکام اور نامراد واپس ہونا ہے۔

اسلام دشمن طاقتیں یہ سمجھتی تھیں کہ مسلمانوں کو سیم وزر سے خریدنا اور دنیا کی متاعِ حقیر کے ذریعہ ان سے دین وایمان کا سودا کرنا تو ممکن نہیں، لیکن شاید جبر واستبداد کے ذریعہ ان کے مذہبی جذبات کو کچلا جاسکتا ہے، لیکن ان کا یہ اندازہ غلط ہی ثابت ہوگا۔ جس شخص نے اسلامی تاریخ پڑھی ہے اور کم سے کم فتنۂ تاتار کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ آگ کے سمندر سے گذر کر بھی اپنی متاعِ ایمان کو بچایا اور اسلام اور پیغمبر اسلام سے تعلق پر اپنی جان ومال اور اپنے اقارب واولاد کو اس طرح نثار کیا ہے جیسے کوئی شخص کسی پودے کو تناور کرنے کے لئے بے قیمت اور مفت کا پانی اس کی جڑوں میں ڈالتا ہے۔

فتنۂ تاتار کے موقع سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ماوراء النہر، خراسان اور عراق کا علاقہ خون کے سمندر میں تبدیل ہو گیا، کتنے ہی شہر لاشوں کے ڈھیر میں بدل گئے، بخارا کے قلعہ میں تیس ہزار اور شہر میں ستر ہزار، نیز سمرقند میں ایک لاکھ مرد، عورت اور بچے تہہ تیغ کر دیئے گئے، خوارزم میں ایک لاکھ افراد کو قیدی بنالیا گیا اور پھر انہیں زندہ نذر آتش کر دیا گیا، یہ ان تین لاکھ لوگوں کے علاوہ ہیں جو وہیں قتل کر دئے گئے، خراسان اور مرو میں تیرہ لاکھ مرد، عورت اور بچے ذبح کر دیئے گئے، نیشاپور جوان شہروں میں تھا، جسے اسلامی تہذیب وثقافت میں ایک خاص مقام حاصل تھا، وہاں عورتوں اور بچوں کے علاوہ دس لاکھ چالیس ہزار صرف مرد قتل کیئے گئے، ہرات ایک بہت ہی آباد علاقہ تھا، مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہاں سولہ لاکھ مسلمان قتل کیئے گئے اور صرف پندرہ آدمی باقی رہ گئے، بغداد کا تو ذکر ہی کیا، کہ تین دنوں تک بغداد کے گلی کوچوں میں پانی کے بجائے خون بہتا رہا اور دجلہ کا پانی میلوں تک سرخ ہو گیا، چھ ہفتوں تک مسلسل قتل عام کا سلسلہ رہا، مدارس میں طلبہ اور اساتذہ کو ذبح کیا گیا، قبریں اکھیڑ دی گئیں اور بڑے بڑے کتب خانے ایسے جلائے گئے کہ مہینوں ان سے دھواں اٹھتا رہا، غرض کہ تاتاری ایسی قہر سامانی کے ساتھ عالمِ اسلام پر ٹوٹ پڑے اور ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی کہ لگتا تھا کہ واقعی اب دنیا میں اس قوم کا آخری دن ہے، ۱۲۱۸ء سے ۱۲۶۰ء تک ۴۲ سال عالمِ اسلام پر ایسی قیامت ٹوٹتی رہی کہ مؤرخین کا قلم یہاں پہنچ کر خون کے آنسو بہاتا ہے اور شیخ سعدیؒ نے خوب کہا ہے کہ اس واقعہ پر آسمان خون برساتا تو حق بجانب ہوتا۔

”آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں“

لیکن ایسی قیامت کے باوجود بحمد اللہ مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی کو متاثر نہیں کیا جاسکا، ایک طرف اسلام کی کشش نے خود تاتاریوں کو دامن اسلام سے باندھ دیا اور زمینوں کی فاتح قوم دلوں کی مفتوح ہو کر خود اسلام کی محافظ بن کر کھڑی ہوئی جب ۱۲۵۶ء میں چنگیز خاں کا پرپوتا دامن اسلام میں آ گیا اور دوسری طرف مسلمانوں نے اپنی اجتماعیت کو بچانے کے لئے خلیفہ معتصم باللہ کی شہادت کے بعد دو سالوں کے اندر عباسی خاندان

کے ایک زندہ بچ جانے والے شخص ابوالقاسم احمد کو مستنصر باللہ نام سے خلیفہ تسلیم کرلیا اور سب سے پہلے سلطان بیبرس نے خود خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

یقیناً بیسویں صدی میں بھی بہت سے طوفانوں سے گذرنے کے باوجود مسلمانوں نے اسلام سے اپنی اٹوٹ وابستگی کو برقرار رکھا ہے اور اپنے ایمان کی حفاظت کو ہر قربانی پر ترجیح دی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ان میں تین باتیں زیادہ اہم ہیں: اول پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے امت کی والہانہ محبت اور آپ ﷺ کی حرمت پر ہر قربانی کا ان کی نگاہ میں آسان بلکہ سامانِ سعادت ہونا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ بھی جو دین کے بارے میں بہت زیادہ شعور نہیں رکھتے، اسلامی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں، شریعت کے بہت سے احکام ان کی زندگیوں میں نہیں ہیں، یہاں تک کہ بنیادی فرائض اور ارکان کی توفیق سے بھی محروم ہیں، برائیوں اور گناہوں نے ان کے پورے وجود کو اپنا اسیر بنالیا ہے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی چاہت سے ان کے قلوب معمور ہیں، آپ ﷺ کا نام نامی آتے ہی چشم عقیدت جھک جاتی ہے، آپ ﷺ کے ذکر گرامی پر ان کی آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں، اس کے کان ایسی کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے جس سے ذرا بھی آپ ﷺ کی بے احترامی کی بو آئے، اس کی زبان ہر معاملہ میں بدل جائے، لیکن اپنے نبی ﷺ کے ذکر میں محبت واحترام کا وضو کرکے ہی کچھ کہتی اور بولتی ہے، یہ حبِ رسول اللہ ﷺ جو ایمان کی بنیادوں میں سے ایک ہے، جس کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا اور جو صحابہؓ سے نسل در نسل مسلمانوں کو میراث میں ملی ہے، اس محبت نے عام مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت، اسلام اور شریعتِ اسلامی اور سنتِ رسول ﷺ سے ان کی وابستگی اور اسلام کے لئے مر مٹنے اور سب کچھ نثار کردینے کے جذبہ کی برقراری میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اسی لئے مغربی مصنفین اور یہودی اور عیسائی مستشرقین نے سب سے زیادہ سیرتِ محمدی ﷺ ہی کو اپنا نشانہ بنایا ہے اور آپ ﷺ کے تقدس اور صداقت کو مشکوک کرنے کی بہت ہی منصوبہ بند اور غیر محسوس کوششیں کی ہیں اور آج بھی کررہے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اتھاہ محبت اور آپ ﷺ کے نام پر مر مٹنے کا بے

پناہ جذبہ مسلمانوں کی ایک خداداد میراث ہے جو آپ ﷺ کے جلیل القدر رفقاء اور صحابہؓ سے آج تک مسلمانوں میں چلی آتی ہے اور انشاء اللہ قیامت تک باقی رہے گی اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ محبت اور عشق و شیفتگی کے اس جذباتی عنصر کو اپنی اگلی نسلوں تک مسلسل پہنچاتے رہیں، ان کے ساتھ آج ان کا دوستانہ ہیں، ہندوؤں میں کتنے ہی لوگ ہیں جو علی الاعلان دیویوں اور دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن یہودی، عیسائی یا ہندو سماج میں اس سے کوئی ردِعمل نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ اپنے پیشواؤں کے تئیں محبت و احترام کا وہ اتھاہ جذبہ ان کے اندر موجود نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ودیعت کیا ہے اور جو ہمارے لئے ایمان کی حفاظت کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔

دوسرا اہم سبب من جانب اللہ اس امت میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتوں اور تحریکوں کا تسلسل ہے، چوں کہ سلسلۂ نبوت رسول اللہ ﷺ پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ امت اصحابِ خیر مصلحین اور اصلاحی و تجدیدی تحریکوں سے خالی رہی ہو، دوسری قوموں میں ایسی تحریکیں تو موجود ہیں جو ان میں قومی نخوت پیدا کریں، جو ان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کریں اور جو ان کو دوسری قوموں سے پنجہ آزمائی پر اکساتی رہیں، لیکن ایسی مثبت تحریکیں جو محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے لوگوں کو اس مذہب پر قائم رکھنے کی جد و جہد کرے جسے وہ حق سمجھتے ہوں اور جس کا مقصد ہی دین کو آمیزشوں سے بچانا اور مخلوق کو خالق سے جوڑنا ہو، موجود نہیں۔

یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ اس امت میں ہر عہد میں اصلاحی اور تجدیدی شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور وہ دین کی فکری سرحدوں کی حفاظت کا کام سرانجام دیں گی، چنانچہ اس صدی میں سنوسی تحریک، سید احمد شہیدؒ کی تحریک، عالمِ عرب میں الاخوان المسلمون، ہندوستان میں مولانا الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت و تبلیغ، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی تحریک امارت، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریکِ اسلامی وغیرہ ایسی تحریکات ہیں جن سے یہ تو ممکن ہے کہ بعض افکار اور نقاطِ نظر میں اختلاف کیا جائے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں ایک بہت بڑی تعداد

ایسے مخلصین کی ہے جن کا مقصد خالصتاً لوجہ اللہ، اللہ کے دین کی حفاظت واشاعت اور اس کی سربلندی ہے اور غالباً ان تمام تحریکات سے زیادہ خاص کر ہندوستان میں جس تحریک نے اثر ڈالا ہے وہ دینی مدارس کی تحریک ہے، جسے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء نے اٹھایا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند، مولانا شاہ انوار اللہ صاحبؒ نے جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی، مرزا حاجی منور علی صاحب نے دربھنگہ (بہار) میں مدرسہ امدادیہ کی اور آپ ﷺ کے مختلف متوسلین نے مختلف علاقوں میں الگ الگ ناموں سے چھوٹی بڑی درسگاہوں کی بنیاد رکھی۔

یہ ان تحریکات ہی کا اثر ہے جس نے نہ صرف بوڑھوں بلکہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اسلام سے قریب کیا، جن کی کوششوں سے مسجدیں آباد ہیں اور جن کی مساعی سے اسلامی شعائر زندہ ہیں، بلکہ بعض غیر مسلم ممالک میں بہ مقابلہ مسلم ملکوں کے دینی بیداری اور ایمانی حمیت کے مظاہر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنی سیاسی، تعلیمی اور معاشی مساعی کے ساتھ ساتھ خالص مذہبی اور دینی، اصلاحی کوششوں سے اپنے آپ کو مربوط رکھیں، کہ اس کی وجہ سے ان کے ایمان کو ایک نئی تازگی اور ان کے دینی رجحان کو ایک نئی توانائی حاصل ہوتی رہے گی۔

تیسرا اہم سبب روحِ جہاد کی از سر نو بیداری ہے، دوسری جنگ عظیم، خلافتِ عثمانیہ کے سقوط اور عالمِ اسلام کی پسپائی کے بعد ایسا لگتا تھا کہ مسلمانوں کی ڈکشنری سے جہاد اور باطل سے پنجہ آزمائی کا لفظ ہی نکل گیا ہے، اگر مسلمانوں میں جہاد کی روح بیدار ہوتی، اللہ کے لئے جاں نثاری ان کا مطمحِ نظر ہوتا اور آرزوئے شہادت ان کو تڑپاتی رہتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ ایک چھوٹا سا ملک مسلمانوں سے ان کا قبلۂ اوّل چھین لے، دنیا کی قومیں پیشہ ورانہ بنیادوں پر جنگ کرتی ہیں، جس کا مقصد ملک گیری اور کشور کشائی ہے، تنخواہوں اور معاشی سہولتوں کی لالچ میں سپاہی اپنی جان ہتھیلی پر لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ جہاد ایسے فاسد جذبہ اور فاسد مقصد کے تحت کی جانے والی لڑائی نہیں ہے، جہاد یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور شہادت کی آرزو کے ساتھ باطل کا مقابلہ اور اسلام کی سربلندی کے

لئے ایک سپاہی اپنا قدم آگے بڑھائے، اس کا مقصود مظلوموں کی مدد اور اللہ کے دین کی حفاظت ہو، نہ کہ ملک وعلاقہ کی فتح اور سیم وزر کا حصول اور دوسری قوموں پر ظلم وجور، جہاد کا مطمح نظر اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے، اس لئے اس راہ میں ناکامی کے لئے کوئی جگہ نہیں، کہ اس میں جیتنے والا بھی فتح مند ہے اور بظاہر ہارنے والا بھی، بلکہ بعض اوقات پانے والے سے زیادہ کامیاب کھونے والا ہے، یہ جذبۂ جہاد امت میں ایمانی حمیت کو باقی رکھتا اور اسلامی اخوت کو پروان چڑھاتا ہے، دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر خنجر چلے اور دوسرے کونہ میں رہنے والا مسلمان تڑپ اٹھے، رسول اللہ ﷺ نے اس امت کی سربلندی اور عزت کو جہاد سے متعلق بتایا ہے، چنانچہ اس بات کی خاص طور پر کوشش کی گئی کہ مسلمانوں سے مجاہدانہ اسپرٹ ختم کردی جائے اور اس لفظ کو اتنا بدنام کردیا جائے کہ دوسرے تو دوسرے اپنے بھی اس کو بولنے اور لکھنے سے گھبرائیں۔

افغانستان میں غاصب روسیوں کے خلاف افغانوں کی تحریک جہاد نے امت کو دوبارہ جہاد سے لذت آشنا کیا اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے غیبی نصرت ومدد کے ایسے نظارے دیکھے کہ جسے وہ صرف تاریخ میں پڑھتے تھے، اور ان پر مشکل سے یقین کرتے تھے، ایک ایسی قوم جس کے پاس نہ ہتھیار تھے نہ کوئی تربیت یافتہ فوج تھی، نہ افرادی قوت کے اعتبار سے دنیا کی بڑی قوموں میں ان کا شمار تھا، نہ بین الاقوامی سطح پر ان کی کوئی ساکھ تھی اور انہوں نے ایسی ایسی طاقت کا مقابلہ کیا جو اسلحہ کے اعتبار سے دنیا کی دو بڑی طاقتوں میں سے ایک اور فوج کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی اور جس کے بین الاقوامی اثر ورسوخ کا حال یہ ہے کہ اسے اقوامِ متحدہ میں "ویٹو" کا حق حاصل تھا، نیز ایشاء، یورپ بلکہ جنوبی امریکہ میں بھی کتنی ہی حکومتیں اس کے چشم وابرو کے اشارہ پر عمل کرتی تھیں اور شکست ونامرادی کا لفظ کئی دہائیوں سے اس کی تاریخ میں کہیں نہیں آیا تھا، اس کے باوجود اس بے سروسامان قافلہ نے اتنی بڑی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔

اس نے پوری دنیا میں مسلمانوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، ایک نئی ہمت اور طاقت عطا

کی، اللہ کی نصرت پر اس کا یقین بڑھا، بڑی طاقتوں سے مرعوبیت ان کے دلوں سے نکلی اور ظالموں اور حقیقی دہشت گردوں کے خلاف پوری دنیا میں جہاد کی ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، بوسنیا ہو یا کوسوو، چیچنیا ہو یا تاجکستان، فلسطین کا انتفاضہ ہو یا فلپائن کا جنوبی علاقہ، برما کے مظلوم مسلمان ہوں یا جنوبی سوڈان کے، ہر جگہ مسلمانوں میں صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا نیا حوصلہ پیدا ہوا اور یہی حوصلہ ہے جس نے آج مشرق ومغرب کو لرزہ براندام کر رکھا ہے کہ وہ کتنی بھی جالیں بن لیتے ہیں مگر بالآخر وہ تارِ عنکبوت ہی ثابت ہوتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس صورتِ حال نے مسلمانوں کی ایمانی حمیت میں اضافہ کیا ہے اور خاص کر جدید تعلیم یافتہ نئی نسل میں ایک نئی اُمنگ پیدا کی ہے، یہ بات کچھ بہت پہلے کی نہیں کہ ہماری مسجدیں صرف چند بوڑھے اور ضعیف لوگوں سے آباد ہوتی تھیں، لیکن آج ہماری مسجدیں نوجوانوں سے آباد ہیں، دو دَہے پہلے مسلمانوں میں ڈاڑھی رکھنے اور اسلامی لباس اور وضع قطع کو اختیار کرنے سے ایک طرح کا گریز پایا جاتا تھا، لیکن آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ایسے بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں ایک عام آدمی کو مدرسہ کا طالب علم ہونے کا گمان ہوتا ہے، مساجد و مدارس اور دینی کاموں کے لئے مسلمان بہت کم خرچ کرتے تھے، لیکن آج مسلمانوں میں اپنے مذہبی ورثہ کی حفاظت کا نہایت ہی خوش آئند رجحان پیدا ہوا ہے، غرض طلبہ اور تجار سے لے کر عام مسلمانوں تک میں مذہبی وابستگی کے جذبات بڑھے ہیں۔ اس کیفیت کو باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔

غرض کہ جہاں ہم نے اس صدی میں کھویا ہے وہیں پایا بھی ہے اور جہاں ہم پیچھے ہٹے ہیں، وہیں ہم نے اپنے قدم آگے بھی بڑھائے ہیں، جہاں یہ صدی ہماری بے عملی اور کوتاہیوں پر خندہ زن ہے وہیں اس امت کی استقامت و ثابت قدمی، دین پر مر مٹنے کی اتھاہ جذبات، اسلام سے بہ ہر قیمت اپنی وابستگی کو برقرار رکھنے اور ظلم کے طوفان میں رہتے ہوئے بھی اپنے ایمان و عقیدہ کے آشیانہ کی بہر صورت حفاظت کرنے اور اس کے

لئے سب کچھ مٹا اور گنوا دینے پر گواہ بھی ہے۔ خدا کرے کہ اکیسویں صدی اسلام، عالمِ اسلام اور امت اسلامیہ کی فتح و نصرت کی تاریخ رقم کرے اور حق کی سر بلندی اور سچائی کی بالا دستی نیز ظلم و جور کی پسپائی اور اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں کی ناکامی کی صدی ثابت ہو۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ !

(۱۲، ۱۹/ جنوری/ ۲۰۰۱ء)

اپنی تاریخ کو بچایئے!

ہندوستان میں مسلمان اس وقت جن حالات سے گذر رہے ہیں وہ بڑے صبر آزما اور تشویش ناک ہیں، یہ بات یقیناً بہت خوشگوار اور خوش آئند ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی جو شدت پہلے محسوس کی جاتی تھی، اب اس میں کمی آئی ہے، اور اس اعتبار سے بہ ظاہر امن و امان کی فضا قائم ہو رہی ہے، ان حالات کو دیکھ کر بعض لوگ جو قومی اور ملی مسائل پر سطحی انداز سے سوچنے کا مزاج رکھتے ہیں، ایک گونہ مطمئن بھی ہیں، لیکن حقیقت بیں نگاہیں اس سے آگے دیکھ رہی ہیں، اور وہ موجودہ صورت حال کو زیادہ خطرناک اور مستقبل کے اعتبار سے کہیں زیادہ مضرت رساں سمجھتی ہیں۔

اور وہ یہ ہے کہ آر ایس ایس نے اپنے اصل نظریہ پر کام کرنا شروع کر دیا ہے، فساد کا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ مسلمان ذہنی طور پر مرعوب ہو جائیں، اور ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، یہاں تک کہ بالآخر ذہنی طور پر وہ اکثریت کے سامنے سپر انداز ہو جائیں، اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں جذب کر لیا جائے، وہ اپنی شناخت سے محروم ہو جائیں، ان میں احساس کمتری پیدا ہو جائے، اس کے لئے وسیع الاطراف پروگرام بنایا گیا ہے، جواب آہستہ آہستہ بے غبار ہوتا جارہا ہے، ایک طرف نصاب تعلیم میں تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں، دوسری طرف ملک اور ملک کی آزادی کی نئی تاریخ لکھی جارہی ہے، تیسری طرف الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ہندو تصورات اور تہذیبی طور طریقوں کو تقویت پہونچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں، یہ اتنے خطرناک اقدامات ہیں کہ جن کی سنگینی کا اندازہ مستقبل میں ہی ہو سکے گا، اگر بروقت ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو پھر اس کی تلافی شاید ممکن نہ ہوگی۔

سرکاری تاریخی ادارے انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ نے ملک کی آزادی پر ایک دستاویزی کتاب ''تووارڈس دی فریڈم'' کے نام سے دوجلدوں میں مرتب کی ہے، جسے ممتاز مورخ پروفیسر کے این پانیکر نے ایڈٹ کیا ہے، حکومت ہند نے نظر ثانی کے نام پر اس کتاب کو شائع ہونے سے روک دیا ہے، حکومت کا مقصد ظاہر ہے کہ اس میں فرقہ پرستانہ مسموم فکر کو داخل کیا جائے، خود پروفیسر ہانیکر نے بھی واضح کیا ہے کہ مرکزی حکومت تاریخ کو توڑ مروڑ کر اس پر ''بھگوارنگ'' چڑھانے کی کوشش کررہی ہے، ظاہر ہے اس کا مقصد خاص کر مسلمانوں کو ملک دشمن اور قوم دشمن ثابت کرنا نیز ملک کی آزادی میں ان کے کردار کو غیر مؤثر ثابت کرنا ہے۔

یہ نہایت اہم مسئلہ ہے، اور باشعور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے حل کی طرف متوجہ ہوں، کسی بھی قوم کے لئے اس کی تاریخ بڑی اہمیت رکھتی ہے، اسی لئے تاریخ کو قوموں کا حافظہ کہا جاتا ہے، تاریخ سے انسان ہمت وحوصلہ حاصل کرتا ہے، تاریخ مایہ عبرت اور اثاثۂ موعظت ہے، ماضی کی تاریخ مستقبل کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہے، جو قومیں تاریخ سے محروم ہوں ان کی مثال بے نسب آدمی کی سی ہے، جو ہمیشہ احساس کمتری سے دوچار رہتا ہے، اور مقابلہ ومقاومت کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، غور کیجئے کہ قرآن مجید ہدایت وموعظت کی کتاب ہے، اور یہی اس کا موضوع ہے، لیکن قرآن کا ایک قابل لحاظ حصہ قصص وواقعات پر مشتمل ہے، اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً ایک ہزار آیات واقعات وقصص سے متعلق ہیں، ۲۶ر پیغمبروں اور ان کی اقوام کا ذکر آیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اقوام اور دعوت حق سے ان کے انکار کا تو بار بار ذکر آیا ہے اور چھ سورتیں تو ایسی ہیں جو خاص انبیاء کے نام پر ہیں، اس کے علاوہ متعدد سورتیں کسی قوم، کسی شخصیت یا کسی اہم واقعہ سے موسوم ہیں، اور وجہ اس کی وہی ہے کہ تاریخ کسی بھی قوم کے لئے سامان حوصلہ بھی ہوتی ہے، سرمایہ عبرت بھی اور نقشِ راہ بھی، اسی لئے قرآن انبیاء اور اقوام کے قصص وواقعات کو نقل کرتے ہوئے عبرت وموعظت کے پہلو کی طرف بھی

اشارہ کرتا جاتا ہے، کبھی کہتا ہے فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین، (النمل:۱۴) کبھی کہتا ہے: فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین: (القصص:۴۰) یعنی دیکھو کہ مفسدین اور ظالمین کا کیا انجام ہوا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ یہ سامان موعظت ہے، ھذا ذکر، (ص:۴۹) کبھی فرعون کی سرتابی اور اس کا انجام نقل کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ اس میں اہل خشیت کے لئے عبرت ہے، ان فی ذلک لعبرۃ لمن یخشی (النزعات:) اسی طرح احادیث میں انبیاء اور ان کی اقوام نیز عربوں کے ابتدائی حالات سے متعلق اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، اس سے تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

چنانچہ مسلمانوں کے یہاں تاریخ اور تذکرہ کا موضوع ہمیشہ سے اصحاب تصنیف کا ایک مقبول اور پرکشش موضوع رہا ہے، اور علم کی دنیا میں تاریخ کے موضوع پر جتنا بڑا سرمایہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے، شاید ہی کوئی اور قوم اس میں اس کی ہمسر ہو، اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ سے لے کر آج تک پوری اسلامی تاریخ روشنی میں ہے، اسلام سے مسلمانوں کا رشتہ مستحکم اور استوار رکھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، خود ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے جو پُر جوش کردار ادا کیا اس میں بھی مسلم تاریخ نے ایک اہم محرک کی حیثیت سے تقویت پہونچائی ہے، مسلمانوں کا یہ احساس کہ انہوں نے کبھی غلامی کا جوا اپنی گردن پر برداشت نہیں کیا ہے، اور انہوں نے سر جھکانے کے بالمقابل آزمائش اور ابتلاء کے موقعوں پر سر کٹانے کو ترجیح دی ہے، ان کے جوش جنوں میں اضافہ کیا اور تمام تر بے سروسامانی کے باوجود انکو ایک ایسی قوم کے مقابلہ استقامت و پامردی عطا کی کہ جس کی حکومت میں اس وقت کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

اس لئے کسی قوم کو اس کی تاریخ سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے کی خاندانی شناخت گم ہو جائے، ایسے بچے کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور کسی دوسرے خاندان کے ساتھ ضم کر دینا چنداں دشوار نہیں ہوتا، اسی طرح جب کوئی قوم اپنی تاریخ سے محروم ہو جائے یا اپنی تاریخ کے بارے میں احساس کمتری کی شکار ہو جائے تو اسے مرعوب کرنا اور

فکری اور تہذیبی اعتبار سے اکثریتی اور طاقتور گروہ کے ساتھ جذب کر لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں، جس کی واضح مثال اس ملک میں دلت ہیں، جو اپنی کثرت تعداد کے باوجود زبردستی ہندو تہذیب میں جذب کر لئے گئے ہیں، اور برہمنوں کے لئے آلۂ کار اور خدمت گار ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے کا مقصد مسلمانوں کے ساتھ اسی تجربہ کو دوہرانا ہے، مسلمانوں نے کبھی کسی قوم کی تاریخ مسخ نہیں کی، جن لوگوں سے صدہا برس ان کی جنگیں ہوئیں، جن قوموں کے ساتھ ان کے معرکے ہوئے اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، ان کے ساتھ بھی مسلمان مورخین نے کبھی ناانصافی روا نہیں رکھی، اس لئے کہ قرآن مجید کی واضح ہدایت ہے کہ کسی قوم کی برائی، اس کے ساتھ ناانصافی کا جواز فراہم نہیں کرتی: **لا یجرمنکم شنأن قوم علی ان لا تعدلوا** (المائدہ:) خود ہندوستان پر عرب مورخین اور سیاحوں نے قلم اٹھائے ہیں، جو خامیاں تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے، اور خود ہندو مورخین کو ان سماجی کمزوریوں کا اعتراف ہے، اور جو خوبیاں تھیں ان کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے، ہندوستان کے علم و حکمت، طب و معالجہ کی صلاحیت اور بہادری وغیرہ کا تفصیل سے ذکر آیا ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ ملک جس کو مسلمانوں نے وسعت و وحدت عطا کی، معاشی فراخی دی، امن و امان دیا، عدل و مساوات سے آشنا کیا، سماجی انصاف کی دولت دی، اس کے چپہ چپہ پر تاریخی عظمت کے نقوش سجائے اور اسی زمین کو اپنا مسکن اور مدفن بنایا، ان کی قربانیوں کو وہ لوگ مسخ کرنا چاہتے ہیں جن کے تلووں میں اس ملک کے بنانے، سنوارنے اور بچانے میں شاید ایک کانٹا بھی نہ چبھا ہو۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک طرف ہم اس صورت حال کا قانون اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے مقابلہ کریں، اور دوسری طرف مسلمان مؤرخین انصاف پسند غیر مسلم مورخین کے اشتراک کے ساتھ ہندوستان کی آزادی اور اس کی تعمیر کی بابت مسلمانوں کی جدو جہد کی تاریخ مرتب کریں۔ اور درست علمی مواد قوم و ملک کے سامنے

پیش کریں، یہ ایک طرف اس ملک کے ساتھ بہی خواہی ہوگی، انصاف ہوگا، اس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا ہوگی، لوگ حقائق سے واقف ہوسکیں گے، اور دوسری طرف خود مسلمان نوجوان اور آنے والی نسل احساس کمتری سے محفوظ رہے گی، اور اپنی تاریخ سے اس کا رشتہ مربوط اور استوار رہے گا، اگر اس وقت اس صورت حال پر توجہ نہیں دی گئی تو پھر آئندہ شاید ان مضرتوں کی تلافی ممکن نہ ہو۔

(..................)

صبر ایک تدبر ہے!

رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے: ایک یہود، دوسرے منافقین۔ یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی اور منافقین بغلی دشمن تھے، جو ہمیشہ درپردہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں رچاتے تھے اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، عبد اللہ ابن ابی ان کا سردار تھا، ابتداءاً اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا، بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، مگر اسلام کے بعد عبد اللہ ابن ابی کا خواب پورا نہ ہو سکا، غالباً اس لئے بھی عبد اللہ ابن ابی کے سینہ میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتش غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ ﷺ اپنے رفقاء ''مہاجرین اور انصار'' کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبد اللہ ابن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمرؓ کے غلام اور انصاری صحابیؓ کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لئے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخصوں کا نہ رہا، بلکہ دو جماعتوں ''انصار و مہاجرین'' کا اختلاف بن گیا، آپ ﷺ نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا، لیکن عبد اللہ ابن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین وانصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لئے آئی کہ تم نے محمد (ﷺ) اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری

مثال عربی زبان کے اس محاورے کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو تا کہ وہ تمہیں کو کھا جائے''سمن کلبك لتا کلك'' پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ ابن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی۔ ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید ابن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبۂ ایمان کے تحت رسول اللہ ﷺ سے صحیح صورتِ حال عرض کر دی، حضرت عمرؓ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا، انہوں نے آنحضور ﷺ سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ ﷺ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کر رہے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے براہِ راست عبداللہ ابن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی، اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی، انصار میں سے اکابر اور سر برآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ ابن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید تو بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی، بہر حال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہو گیا اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ ﷺ نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، آپ ﷺ کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے، لیکن خلافِ معمول آپ پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے، چلچلاتی ہوئی دھوپ، گرم ریت، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہو گئی تھی اس کا اثر بھی جاتا رہا، دراصل یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر آپ ﷺ نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا، تا کہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں!

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبداللہ ابن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آ گیا، حضراتِ انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہوگیا، تو عبداللہ ابن ابی کے صاحبزادے جو مخلص مسلمان تھے اور ان کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں، لیکن مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اایسا نہ ہو کہ ایک منافق کی وجہ سے ایک مخلص مسلمان کا قتل ہو جائے؛ کیوں کہ میں اپنے والد کے قاتل کو شاید نہ دیکھ سکوں! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو آپ ﷺ مجھے حکم فرمائیے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کردوں۔ آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورتِ حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہو سکتے تھے اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور در پردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں اور خود ان کا لڑکا اس کے قتل کے لئے تیار ہے، حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی اس دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) کی رائے میں برکت رکھی ہے، بارك الله فی رأی رسوله ۔

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن مجید نے ''صبر'' سے تعبیر کیا ہے۔ صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لئے صحیح موقع ومحل کا انتخاب کرنے کے ہیں، صبر یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے؛ اس لئے کہ اشتعال اور غیظ وغضب کی حالت میں انسان کی قوتِ فیصلہ کم یا ختم ہو جاتی ہے اور فراست ودانشمندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمے کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، **لا يقضى القاضی وهو غضبان**؛ کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی

معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دوررس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ ﷺ نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا۔ صلح نامہ لکھتے ہوئے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا گیا، اہل مکہ کے نمائندہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ پر "باسمك اللهم" لکھنا پڑے گا، آپ ﷺ نے اسے مان لیا، پھر صلح کے فریق کی حیثیت سے آپ ﷺ کا اسم گرامی "محمد رسول اللہ" لکھا گیا، دوسرے فریق نے "رسول اللہ" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ ﷺ اس پر بھی تیار ہو گئے، حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ اس کلمۂ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے اسے خود محو فرمادیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کر دیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے۔ یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں۔ یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لئے ہتھیار رکھنا بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا اور مسلمانوں کے لئے یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جا رہے تھے، لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ ﷺ نے منظور فرمایا، اکثر صحابہ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے آپ ﷺ سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لئے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے۔ جب آپ ﷺ نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس

طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی "فتح مبین" قرار دیا۔ (فتح:۱) در اصل آپ ﷺ کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح و شام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کو معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف و دہشت کی فضاء میں کھل کر دعوتِ اسلام کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا، آپ ﷺ کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی اور جن لوگوں کو میدانِ جنت میں فتح نہیں کیا جاسکتا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب واذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ ﷺ کے رفقاء کم وبیش چودہ سو تھے، اس واقعہ کے صرف دو سال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دو سال بعد جب آپ ﷺ نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغازِ نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سواڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوالاکھ کے قریب تو خود آپ ﷺ کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دی تھی۔

آپ ﷺ کا یہ عمل مسلمانوں کے لئے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالات سے گزر رہے ہوں، وہ سیاسی اور افرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصاً، اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں۔ جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ وغضب پر صبر اور خوش تدبیری اور مناسب موقع ومحل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک کر اٹھائیں، ایسا ردعمل

نہ ظاہر کریں جوخودکشی کے مترادف ہواور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے۔ یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہو جانا فرقہ پرستوں کی سب سے بڑی کامیابی اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا، فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت ہےاور حقیقت میں فتح مبین !!

(۲۶/جون ۱۹۹۸ء)

پروپیگنڈہ کا جواب عمل سے!

کئی سال پہلے کی بات ہے، میں دہلی سے حیدرآباد آرہا تھا، میرا ریزرویشن فرسٹ کلاس میں تھا، فرسٹ کلاس کے کیبن میں عام طور پر دو یا چار برتھ ہوتے ہیں، لیکن اتفاق سے یہ بوگی کے کنارے کا کیبن تھا، وہ ایک طرف سے کسی قدر دبا ہوا تھا، اس لئے اس میں تین برتھ تھے، دہلی سے ہم دو ہی آدمی اس کیبن میں سوار ہوئے، ایک طرف میں، اور ایک طرف میرے ہی ہم عمر ایک مسافر جو سفید کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے، اس کی پیشانی پر سرخ وسفید قشقے ہندو مذہب پر اس کے ایقان اور اس کی مذہبیت کو ظاہر کررہے تھے، گاڑی جب بھوپال پہنچی تو ایک ہندو فیملی آئی، ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی، جس کی عمر اٹھارہ بیس سال رہی ہوگی، یہ لوگ اصل میں ناگپور کے رہنے والے تھے، اور کسی ضروری امر کے تحت لڑکی کو اچانک بھیج رہے تھے، لمبا راستہ اور تنہا ایک لڑکی کا سفر، اس سے وہ لوگ پریشان تھے۔

انہوں نے کیبن میں اس کا سامان رکھا، اور حالانکہ وہ ہندو بھائی میرے سامنے ہی بیٹھے تھے، اور میری شکل وصورت سے ان کے لئے یہ پہچاننا بالکل دشوار نہیں تھا کہ میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ایک مولوی واقع ہوا ہوں، اس کے باوجود وہ ہماری طرف مخاطب ہوئے، اور کہنے لگے: ''مولانا صاحب! اسے ناگپور جانا ہے، یہ اب آپ کی لڑکی ہے، اور ہم اسے آپ کے حوالہ کررہے ہیں،'' گاڑی نے سیٹی بجائی اور انہوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنی لڑکی کو رخصت کیا، میں برابر اس سے پوچھتا رہا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے، جب میں اپنے لئے پانی لینے کو اترتا تو اس کے پانی کا برتن بھی ساتھ لے لیتا۔

یہ لڑکی طالبہ تھی، اور کسی قدر شوخ بھی، کچھ دور بعد اس نے مجھ سے کچھ سوالات کئے، جب اسے معلوم ہوا کہ میں اسلامی علوم کی تدریس کا کام کرتا ہوں تو اس نے اسلام کے بارے میں بہت سے سوالات کئے، جن میں زیادہ تر قرآن اور نبی کی ضرورت سے متعلق تھے، اس نے مذہب کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

لیکن اس کے بعد اسلام میں خواتین کا کیا درجۂ ومقام ہے؟ اس بارے میں سوالات کی بوچھاڑ کردی، مجھے حیرت ہوئی کہ اس بارے میں اسے کافی مخالفانہ معلومات حاصل تھیں، تعدد ازدواج، طلاق، میراث، پردہ، عام طور پر وہ تھوڑی بحث کے بعد میرے جواب سے مطمئن ہو جاتی، آخر میں اس نے دیت (خون بہا) کے بارے میں سوال کیا، آپ کے مذہب میں عورتوں کے خون کی قیمت مردوں کے خون سے کم رکھی گئی ہے؟ مجھے تعجب ہوا کہ بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے قانون دیت کے بارے میں علم نہیں ہوگا، لیکن اس نوعمر غیر مسلم لڑکی کو یہ معلومات حاصل ہیں، میں نے اس سے بتایا کہ دیت کا تعلق انسان کے درجۂ ومقام سے نہیں، بلکہ اس میں دو پہلو ہیں، ایک تو قاتل کی سرزنش، دوسرے مقتول کے پسماندگاں کی معاشی مدد، صورتِ حال یہ ہے کہ مرد پر خاندان کی معیشت کا بوجھ ہوتا ہے، اگر وہ مارا جائے تو بچے ہوئے لوگوں کو دکھ تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس کے زیر پرورش لوگوں کی گذراوقات کا بھی مسئلہ ہو جاتا ہے، اگر عورت ماری جائے تو صدمہ تو بعض اوقات مرد کے قتل سے بھی زیادہ ہوتا ہے، کیوں کہ ایک بچہ کے دل میں ماں کی محبت باپ سے زیادہ ہوتی ہے، لیکن معاشی مسائل پیدا نہیں ہوتے، اسی بنیاد پر مرد کی دیت زیادہ رکھی گئی، تاکہ قاتل کی سرزنش بھی ہو، اور مقتول کے لوگوں کے لئے جو معاشی مسائل پیدا ہوئے ہیں، کسی حد تک ان کا مداوا بھی ہو سکے، عورت کی دیت میں صرف قاتل کی سرزنش کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس لئے مقدار کا یہ فرق مقتول کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے، نہ کہ درجۂ ومقام کی بناء پر، اگر درجۂ ومقام کی بناء پر دیت میں فرق کیا جاتا تو نیک وبد اور عالم وجاہل، حاکم اور محکوم اور مذہبی نقطۂ نظر سے

مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان بھی کیا جاتا۔

اسکے بعد اس نے کہا کہ مجھے اسلام سے بڑی دلچسپی ہے، اور یہ میرے لئے بہت اچھا موقع ہے کہ مجھے براہ راست ایک مسلمان اسکالر سے اسلام کو سمجھنے کا موقع مل رہا ہے، اس نے مجھ سے بار بار اشتعال انگیز اور غصہ دلانے والے سوالات کئے، لیکن میں نے ہمیشہ تحمل اور صبر کے ساتھ جواب دیا، اس بات نے خاص طور سے اسے متاثر کیا، اور کہنے لگی کہ کیا آپ کو غصہ آتا ہی نہیں ہے؟ میں نے اسے حضور کی وہ حدیث سنائی جس میں بار بار آپ سے جینے کا طریقہ دریافت کیا گیا، اور آپ ﷺ نے ہر بار ایک ہی بات ارشاد فرمائی کہ غصہ نہ کرو، **لا تغضب**، جب ٹرین ناگپور پہنچی تو اس کے ماموں وغیرہ پلیٹ فارم پر موجود تھے، اس نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ ''مولانا صاحب ہمارے گرو اور ہمارے پتا جی کے سَمان ہیں''، یعنی ہمارے استاذ اور باپ کے درجہ میں ہیں، پھر ٹرین کھلنے تک وہ لوگ رکے رہے، اور میری تواضع کرتے رہے۔

یہ واقعہ ہمیں ہمیشہ یاد رہتا ہے، جہاں تک اسلام کے بارے میں سوال و جواب کی بات ہے، تو اس کی نوبت تو ٹرینوں اور سواریوں میں آتی ہی رہتی ہے، اصل میں جس چیز نے مجھے متأثر کیا وہ یہ کہ اس کیبن میں میرے برابر ہی میں ایک ہندو شخص موجود تھا اور اپنی ہندو پہچان کے ساتھ تھا، نیز اسے بھی حیدرآباد آنا تھا، انسان کے لئے عزت و آبرو کا مسئلہ جان و مال سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے، لیکن بہ مقابلہ اس غیر مسلم کے ہندوستان میں ہندو فکر کے سب سے بڑے مرکز ناگپور کے ہندوؤں نے ایک مسلمان مولوی پر زیادہ اعتماد کیا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اور حاملین اسلام کے بارے میں سماج کیا سوچتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ یہ سوچ تجربات پر مبنی ہوتی ہے۔

۱۱ رستمبر کے واقعہ سے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کی گھٹائیں چھا گئی ہیں، لیکن خود میرے ساتھ بعض واقعات اس کے بعد ایسے پیش آئے جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، حیدرآباد میں ایک مارکٹ ٹرپ بازار ہے، جس میں الیکٹرک اشیاء اور تعمیری سامان کے علاوہ گیس کے چولھوں کی بھی بڑی

دکانیں ہیں، جمعہ کے دن مسجد جاتے ہوئے ایک چولہا خریدنے اسی بازار کی ایک دکان میں جانا ہوا، جو ہندو بھائی کی دکان ہے، ہم نے ایک چولہا پسند کیا، قیمت طے کرلی، اور اسے پیک کرالیا، اب جو جیب میں ہاتھ ڈالا، تو متعینہ قیمت میں پانچ سو روپے کم تھے، میں بڑا شرمندہ ہوا، اور ان سے کچھ ظاہر کئے بغیر کہا کہ آپ ابھی اس سامان کو اسی طرح رہنے دیں، میں انشاء اللہ کل آکر لے جاؤں گا، اس نے سبب پوچھا، میں نے ٹالنا چاہا، لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے صورت حال بتادی، اس نے بلا تامل کہا کہ اس میں کیا بات ہے؟ جو پیسے ہیں دے دیں اور چولہا لے جائیں، آپ دھوکہ تھوڑا ہی دیں گے، میں ہچکچایا، لیکن اس نے اپنے ملازم سے چولہا میری گاڑی میں رکھوا دیا، اور کہا کہ کل ہی پیسہ لاکر دینا ضروری نہیں، آپ دو چار روز میں جب بھی اس طرف آئیں، اس وقت مجھے پیسے دے دیں، ظاہر ہے کہ اس کا یہ اعتماد مجھ پر نہیں، بلکہ داڑھی، ٹوپی، اور میری مولویانہ وضع پر تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کے بدترین پروپیگنڈوں کے باوجود آج بھی مسلمان مذہبی طبقہ پر لوگوں کو کس قدر اعتماد ہے؟ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے، اور میری طرح بہت سے لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی مسلمان جھوٹ بولتا تو غیر مسلم انہیں عار دلاتے کہ تو مسلمان ہوکر جھوٹ بولتا ہے؟ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور معمولی واقعات ہیں، اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، اور بہت سے لوگ عملی طور پر اس کے تجربہ سے گذرتے ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کے ذہن پر اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاق کے تئیں ایک نقش جمیل اب بھی ثبت ہے۔

فرقہ پرست عناصر چاہتے ہیں کہ غیر مسلم اذھان سے اس نقش کو مٹادیں، اور ان کے ذہن میں یہ بات راسخ کردیں کہ مسلمان قاتل، رہزن، لٹیرے، عورتوں پر ظلم وجور روا رکھنے والے، دھوکہ باز اور اپنی قوم کے علاوہ سبھوں سے نفرت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، مسلمان علماء اور اہل مدارس کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں عام تصور یہی تھا کہ یہ نیک اور انسانیت پسند لوگ ہوتے ہیں، اسی لئے خاص طور پر انہیں دہشت گرد اور شدت

پسند ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، یہ ایسی صورتِ حال ہے کہ آزاد ہندوستان میں مدارس کے لئے کبھی ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی، اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد عالمی سطح پر مسلمان ایسی "پروپیگنڈہ جنگ" کا نشانہ نہیں بنے تھے، پروپیگنڈے کی یہ جنگ توپ وتفنگ کی جنگ سے بھی بڑھ کر ہے، کیوں کہ ہتھیاروں کی جنگ ہر جگہ نہیں کی جاسکتی، اور ہر شخص اس سے متأثر نہیں ہوتا، لیکن پروپیگنڈہ کے لئے کوئی سرحد اور کوئی دائرہ نہیں ہے، یہ بچے سے بوڑھے، مردوں سے عورتوں، اور دانش وروں سے جاہلوں تک ہر طبقہ کو متأثر کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نصف صدی سے مغرب کی غلامی کی وجہ سے ہم اس موقف میں نہیں ہیں کہ ان پروپیگنڈوں کا مقابلہ ان ہی وسائل سے کریں جنہیں مغرب استعمال کررہا ہے، کیوں کہ ذرائع ابلاغ پر پوری طرح مخالف اسلام لابی (Lobby) قابض ہے، عالمِ اسلام کا حال یہ ہے کہ ان کی کوئی منظم، عالمی نیوز ایجنسی بھی نہیں ہے، جو لوگوں تک صحیح خبریں پہونچائے، اور جھوٹی خبروں کا پردہ فاش کرے، ہندوستان میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی انگریزی اخبار نہیں، نہ مسلمانوں کا ایسا ٹی وی چیانل ہے جس کی رسائی دوسری چیانلوں کے مقابلہ کی ہو، اس غفلت کیش، بے سروسامانی اور وسائل واسباب کے باب میں بے جا قناعت کے ساتھ ہم کیا خاک اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرسکیں گے؟

ہمارے لئے ایک ہی صورت ہے کہ ہم پروپیگنڈہ کا جواب عمل کے ذریعہ دیں، عمل کے جواب میں کچھ دیر لگتی ہے، لیکن اس کے اثرات گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں، پروپیگنڈہ کے ذریعہ بات جلد پھیلتی ہے، لیکن اس کا اثر دیر تک نہیں رہتا، مسلمان ایک منصوبہ کے ساتھ غیر مسلم بھائیوں سے حسن سلوک اور حسن اخلاق کا رویہ اختیار کریں، یہ کوئی مصنوعی اور نمائشی عمل نہیں ہوگا بلکہ اسلامی احکام اور نبوی ہدایات کے عین مطابق ہوگا۔ سفر کے درمیان جن غیر مسلموں کا ساتھ ہو، ان سے نرم گفتگو کریں، ان کے معاملہ میں ایثار سے کام لیں، کوئی عورت، یا عمر دراز شخص آجائے تو خود سمٹ کر یا اٹھ کر ان کو بٹھا

دیں، کسی کو پانی کی ضرورت ہو تو پانی پیش کریں، غیر مسلم فقراء کی اعانت کریں، محلّہ میں کوئی غیر مسلم بیمار ہو تو اس کی عیادت کر لیں، غریب ہو تو علاج کے لئے کچھ پیسہ دے دیں، غیر مسلم بھائی کے یہاں شادی ہو، یا بچہ کی ولادت ہو تو جا کر مبارکباد دیں، کسی کے یہاں انتقال ہو جائے تو تعزیت کریں، ہسپتالوں میں جا کر بیمار غیر مسلم بھائیوں کو پھل پیش کریں، آپ ڈاکٹر ہوں تو ان میں جو غریب لوگ ہوں، مفت ان کا علاج کر دیں، تاجر ہوں تو غیر مسلم گاہکوں کے ساتھ اکرام سے پیش آئیں،

اگر وہ اپنی نا سمجھی یا تعصب کی وجہ سے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے والے سوالات کر لیں تو بغیر اشتعال کے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ان کے سوال کا جواب دیں، اگر کسی مسلمان اور غیر مسلم کا معاملہ ہو تو مسلمان کی بے جا طرف داری نہ کریں، بلکہ جو بات عدل وانصاف کی ہو وہ کہیں، ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہونچائیں، ان کے دیوی دیوتاؤں اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں سطح سے گری ہوئی باتیں نہ کہیں، آپ کے پڑوس میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اپنی جان و مال کی طرح ان کی جان و مال اور اپنی عزت وآبرو کی طرح ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کریں،

یہ ساری باتیں سیاست اور وقتی مصلحت کی نہیں ہیں، بلکہ ہمیں اللہ اور اس کے رسول نے ان باتوں کا حکم دیا ہے، اور یہ ایک مذہبی فریضہ ہے، جو ہم پر بہ حیثیت مسلمان عائد ہوتا ہے، اگر واقعی ہم دین کے ان احکام پر عمل کریں اور عملی زندگی میں اس کو ملحوظ رکھیں تو یہ عمل کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا جواب ہوگا، یہ جواب انشاء اللہ اس پروپیگنڈہ سے زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوگا۔ مکہ والے رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنی پروپیگنڈہ مہم کو تیز کئے ہوئے تھے، حج کا اجتماع، عکاظ کا تجارتی میلہ اور اسفار ہر جگہ وہ پوری قوت سے اس مہم میں سرگرم تھے، ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ سے پہلے یہ مواقع حاصل نہیں تھے، لیکن مدینہ کی بستی کو آپ نے اخلاق ومحبت، مروت ورواداری اور انسانی شرافت کا گہوارہ بنا دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پروپیگنڈوں سے بدگمان رہتے، اور کسی مسلمان سے گھنٹہ دو گھنٹہ بھی ملاقات ہوتی تو ان کے دل کی حالت بدلنے لگتی، مکہ سے ہجرت کر کے

آنے والے مسلمانوں کی تعداد تین سو کے آس پاس تھی، لیکن جب فتح مکہ کے موقع سے مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے تو ان کی تعداد کم و بیش دس ہزار تھی، اور جان نثاروں کے اس نورانی لشکر کو دیکھ کر اہلِ مکہ کی نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں، یہ کس چیز کا کرشمہ تھا؟ یہ وہی عمل اور حسن اخلاق کے ذریعہ پروپیگنڈہ کا مقابلہ تھا، اس وقت یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ ہم حسنِ عمل، حسنِ سلوک، حسنِ اخلاق اور حکمت و مصلحت کی تلوار سے اس جھوٹے پروپیگنڈہ کا مقابلہ کریں!

(..................)

دعوتِ دین سب سے اہم فریضہ

عہدِ صحابہ ﷺ کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمانوں کی تاریخ یہ رہی کہ جہاں وہ فاتحانہ داخل ہوتے وہاں صرف سیاسی غلبہ پر ہی نہیں اکتفا کرتے، بلکہ اپنے اخلاق و انسانیت دوستی اور دیانت داری کے ذریعہ مقامی لوگوں کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ دینی اور مذہبی لحاظ سے بھی ''اسلامی ملک'' بن جاتا، ایران، یمن، مصر اور سندھ وغیرہ کے علاقہ میں یہی صورت پیش آئی، عرب تاجروں ہی کے ذریعہ مالدیپ، ملیشیا اور انڈونیشیا کے باشندوں نے اسلام قبول کیا، ہندوستان میں بھی محمد بن قاسم یہی کرنا چاہتے تھے، مگر بنو امیہ کی باہمی خصومت نے ان کو اس کا موقع نہ دیا اور ان کی سپہ سالارانہ قابلیت واہلیت کا بدلہ ان کو ''دارورسن'' کی صورت میں ملا۔

اس کے بعد ہندوستان کی زمام اقتدار عربوں کے بجائے عجمی خاندانوں کے ہاتھ چلی گئی، جن کو اپنی بادشاہی کے تحفظ کے سوا اسلام کی تبلیغ واشاعت یا اس کی اقامت وتنفیذ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان میں سے فیروز تغلق اور اورنگ زیب عالمگیر کو چھوڑ کر تمام بادشاہوں نے اپنی بہترین ذکاوت وصلاحیت اور غیر معمولی قابلیت وفراست کا استعمال محض اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے کیا اور اگر کچھ کام دعوت وتبلیغ کا ہوا بھی تو اس کا سہرا بڑی حد تک صوفیاء اور مشائخ کے سر ہے۔

لیکن دعوتِ دین سے غفلت اور اپنے ہی مفتوحہ ممالک میں عددی تناسب کے لحاظ سے کم ہونے کے باعث بالآخر سیاسی اعتبار سے بھی ان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا، اسپین میں عیسائیوں سے شکست کھانے کے بعد سوائے ان کی کچھ یادگار عمارتوں کے اور کوئی چیز باقی

نہ رہی، ہندوستان میں انگریزوں کے غلبہ کے بعد ہزار جد وجہد کے باوجود مشرق ومغرب کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی ہی ان کی قسمت میں آسکی اور ملک کے تین چوتھائی حصہ میں ان لوگوں کا غلبہ رہا جن کو درحقیقت قدرت نے ایک دسترخوان کی طرح مسلمانوں کے سامنے بچھا دیا تھا، کہ وہ اپنی اخلاقی قوت کے ذریعہ ان کو اسلام کے وجود میں ہضم کر لیں، مگر مسلمانوں نے اس ''معنوی نعمت'' کے ساتھ وہی سلوک کیا جو بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ''مادّی نعمت'' کے ساتھ کیا تھا۔

لیکن انگریزوں کی تاریخ واضح طور پر اس سے مختلف ہے، سترہویں صدی میں جب ایک طویل عرصہ کے بعد مغرب نے انگڑائی لی اور پہلے علم وصنعت میں اور پھر اپنی غیر معمولی سائنسی صلاحیت کے جلو میں سیاسی اعتبار سے آگے بڑھنا شروع کیا تو اس کے باوجود کہ ماضی قریب میں یورپ میں مذہب اور سیاست کے درمیان طویل اور بھیانک جنگ ہو چکی تھی اور ''کلیسا'' کو شکست دے کر مغربی اہلِ علم ونظر سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا ہے اور ناقابلِ تسخیر رکاوٹ کو مسخر کر لیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو ضروری جانا کہ مشرق میں جہاں بھی فوجی اور سیاسی اعتبار سے ان کے قدم مضبوط ہوں وہاں عیسائیت کے مبلغین اور داعیوں کی ایک فوج بھی پیچھے پیچھے ان کے ساتھ رہے اور وہ لوگوں کے دل اور دماغ فتح کرنے کے لئے سرگرم رہے، اس طرح نہ صرف یہ کہ عیسائیت کو وسعت حاصل ہو سکے گی بلکہ ان کی حکومت اور سیاسی قوت کو بھی استحکام حاصل ہو سکے گا ،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوا سو سال کے بعد مغرب کا سیاسی اقتدار تو ختم ہو گیا، مگر عیسائی مشنری نے ان ممالک میں جن لوگوں کو عیسائی بنایا تھا وہ مقامی لوگ باقی رہے اور مشنریاں بھی اپنے کام میں مصروف رہیں۔

عیسائیوں کے اس حملے کا زیادہ نشانہ تو بت پرست قومیں ہی بنیں، مگر ''امتِ محمدیہ'' بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکی اور مسلمانوں کی استقامت وثابت قدمی اور دین کے معاملہ میں جماؤ کے مقابلہ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے عیسائی اداروں نے عالمی سطح پر اجلاس اور مذاکروں کے ذریعہ اپنا طریقۂ کار طے کیا اور منصوبہ بند اور منظم طور پر پورے

عالم اسلام میں اپنی جد و جہد شروع کردی، ان کے تحریصی اور ترغیبی حربہ سے ہندوستان سے مولوی صفدر علی، مولوی عماد الدین، مولوی برکت اللہ، تبریز سے مرزا ابراہیم اور بیروت سے کامل جیسے لوگ انکے دام میں گرفتار ہونے سے نہ بچ سکے۔

پاکستان جیسے مسلم ملک کے متعلق ___ جو اسلام اور مذہب کے معاملہ میں نسبتاً زیادہ حساس اور بیدار سمجھا جاتا ہے اور جس کی تاسیس ہی اسلام کے نام پر ہوئی ہے ___ بھی رومن کیتھولک چرچ نے اپنی رپورٹ ۱۹۵۷ء / ۱۹۵۸ء میں لکھا ہے:

"مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سب سے زیادہ شاندار کامیابی پاکستان میں حاصل ہوئی۔"

گو کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جن مسلم ممالک میں بھی عیسائیت کو تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوسکی ہے، اس کا بڑا سبب مسلمانوں کی جہالت اور ناواقفیت ہے، چنانچہ Ale Chatelier کا بیان ہے:

"عیسائی بننے والے مسلمانوں میں اکثریت عام لوگوں اور جاہلوں کی ہے۔"

یہ سب کچھ اس کے باوجود ہے کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد عقل و دانش سے دور ہیں اور مذہبی خوش گمانی اور غلو آمیز عقیدت کے سوا کوئی چیز نہیں ہے جو اس کو قبول کر سکے، خدا کے بارے میں تین (خدا، ابن خدا اور روح القدس) میں ایک اور ایک میں تین کا تصور کسی "لال بجھکڑ" سے کم نہیں ہے، حضرت مسیح ایک طرف خدائی کے منصبِ عظیم پر فائز نظر آتے ہیں، دوسری طرف اس قدر عاجز و درماندہ کہ صلیب پر نہایت ذلت کے ساتھ چڑھا دیئے جاتے ہیں اور ایک بے کس و بے بس انسان کی طرح خدا کے حضور جاں بخشی کے لئے فریاد کناں ہوتے ہیں۔ "کفارہ" کا عقیدہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی اور ان کی وساطت سے نسل آدم میں منتقل ہونے والی غلطیوں کا کفارہ ادا کردیا، ایک ایسی بات ہے جو صریح طور پر عقل کے خلاف ہے، کہ غلطی ایک کرے اور سزا ایک پائے اور یہ کہ غلطی حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور گنہگار ان تمام انسانوں کو سمجھا

جائے جوان کی نسل سے پیدا ہوتے رہے، حالاں کہ ہر آدمی ارادہ اور عمل کے لحاظ سے اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے مقابلہ اسلام عقل و مصلحت کے عین مطابق ہے اور جوں جوں علم وفن کا ارتقاء ہوتا جاتا ہے، اسلام کی عصریت اور عقل وحکمت سے مطابقت نمایاں ہوتی جاتی ہے، مستشرقین ہر چند کہ اسلام کے معاملہ میں بہت متعصب اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں اور قرینہ ہائے دور دراز سے کبھی کبھی ایسی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی فہم و دانش پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، تاہم اب ان میں بھی ''موریس بوکائی'' جیسے لوگ پیدا ہور ہے ہیں، جو موجودہ سائنسی اکتشافات کے لحاظ سے قرآن مجید کی واقعیت اور بائبل پر اس کے تفوق و برتری کا بانگِ دہل اعلان کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ یہ بات اب قریب قریب پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ مذاہب عالم میں اسلام ہی واحد مذہب ہے، جو تفریق و امتیاز کی ساری دوریوں کو مٹا سکتا ہے اور پست طبقات کو دوسروں کا ہم قدم اور ہم دوش بنا سکتا ہے، ہندو سماج کا کہنا ہی کیا ہے، مغربی معاشرہ جو انسانی حقوق کے تحفظ کا سب سے بڑھ کر مدعی ہے، کالوں کو انسان کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔

ذرائع ابلاغ اور نظام مواصلات کو اس زمانے میں جو ترقی حاصل ہوئی ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، شہنشاہیت کے بجائے اس عہد میں جمہوریت اور سیکولرزم کا غلبہ ہے، جو ہر شہری کو مذہب اور اظہار رائے کی آزادی عطا کرتی ہے اور اپنے نقطۂ نظر کی دعوت و تبلیغ کا حق دیتی ہے، ماضی میں شاہی حکومتوں اور مذہبی تعصّبات کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

یہ سب کچھ گویا خالق کائنات کی طرف سے امتِ مسلمہ کے لئے ایک بیش قیمت انعام ہے، جن سے فائدہ اٹھا کر غیر مسلموں میں دعوتِ دین کا کام اس سے کہیں آسانی سے کیا جا سکتا ہے جن سے مسلمان عہد اوّل میں دو چار ہوئے۔ اسلام کی صداقت وراستی اور ضرورت اس قدر واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دشمن اور ناقد سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی اپنا لب ولہجہ نرم کرنے پر مجبور ہیں اور اسلام کی بہت سی خوبیوں کا کھلے عام اعتراف

کرتے ہیں، مہاتما گاندھی جی جیسے ذہین، سنجیدہ اور تسلیم شدہ مذہبی و سیاسی ہندو قائد کا اہل وطن کو اپنے طرزِ حکومت میں ''ابوبکر و عمر'' کے طریق کار کی تقلید کی ترغیب دینا، دوسرے لفظوں میں اسلام کی عہدِ حاضر کے لئے موزونیت اور دوسرے مذاہبِ عالم کا زمانۂ اقتدار گذر جانے کا اعتراف ہے۔

خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ان ساری سہولتوں کے باوجود مسلمان اگر ''دعوتِ دین'' کا کام نہ کریں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ قدرت ان کے بجائے کسی اور قوم کو خدا کے دین کی سربلندی اور اشاعت کے لئے اٹھائے گی، اس لئے کہ یہ اب اس کے اہل باقی نہیں رہ گئے۔ (محمد: ۳۸) افسوس کہ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر جگہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسر پیکار ہیں، یہ دشمن کہیں استعمار اور سرمایہ دار کی صورت میں ہیں، کہیں الحاد اور کمیونزم کے لباس میں، کہیں مذہبی تعصب اور تنگ نظری ہے، کہیں لسانی اور علاقائی مسائل ہیں، ہر جگہ احتجاج کے ذریعہ دشمنوں کا مقابلہ کیا جارہا ہے، مگر کوئی نہیں جو اس ''بے آواز لاٹھی'' کا سہارا لے جو مقابلہ کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے دشمنوں کے مقابلہ جس ہتھیار سے مدد لی تھی، جو دلوں کو فتح کر لے، جو لوہے کو موم کردے اور جو جان لیواؤں کو جان نثار بنادے۔

بہت سے علاقوں میں آج جو لوگ جہاد کی بات کرتے ہیں، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کردیتے ہیں کہ تلوار اور قوت کا استعمال جہاد کا آخری مرحلہ ہے، جسے مجبوری کے درجہ میں گوارا کیا جاتا ہے، جہاد کا پہلا مرحلہ جو اصل مقصود ہے۔ ''دعوت'' ہے، چنانچہ فقہاء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ''دعوت'' دینے کے بعد ہی غیر مسلموں سے جہاد کیا جاسکتا ہے، **یجب ان یبدو المسلمون بالدعوة قبل القتال**، یہاں تک کہ قاضی ابوالحسن ماوردی نے اسلام کے نظام مملکت پر اپنی فاضل و معروف تصنیف ''الاحکام السلطانیہ'' میں لکھا ہے کہ جن لوگوں تک دعوت نہ پہنچی ہو اور استدلالی اعتبار سے ان پر اسلام کی حقانیت واضح نہ کردی گئی ہو، ان پر جہاد کا اقدام حرام ہے، **یحرم علینا الاقدام علی قتالھم** اور اگر اسلامی لشکر نے ان تک دین کی دعوت پہنچنے سے پہلے حملہ کر

دیا تو مقتولوں کا خون بہا اس کے ذمہ ہوگا، ،ضمن دیات نفوسهم ۔

لیکن اس کے باوجود ملک کے طول وعرض میں مسلمانوں کی ہزاروں تنظیموں اور تحریکوں کے باوجود شاذ و نادر تنظیمیں ہیں جو اس مقصد کو سرانجام دینے کے لئے اٹھی ہو اور ہم وطنوں میں آخرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف دعوت دینے کا کام کر رہی ہوں ۔

ہندوستانی مسلمانوں کی غفلت کا یہ حال ہے کہ اب تک ہندوستان میں متعدد ایسی زبانیں ہیں جن میں تعارفِ اسلام کی کوئی مناسب کتاب اور قرآن مجید کا ترجمہ تک نہیں، متعدد ایسی زبانیں ہیں جن کو مسلمانوں کی قابلِ لحاظ تعداد بولتی ہے، مثلاً تلگو، تمل، بنگلہ، اڑیا وغیرہ، مگر ان زبانوں میں اسلام سے متعلق جو لٹریچر ہے وہ کمیت اور کیفیت ہر دو لحاظ سے نہایت معمولی ہے، خود ہندی میں بھی، جو ملک کی اوّل درجہ کی قومی زبان ہے۔ اسلام سے متعلق صحیح معلومات فراہم کرنے والی کتابیں انتہائی ناکافی ہیں اور ان مقامی زبانوں میں اسلامیات کا جو کچھ سرمایہ ہے دعوتی اسلوب اور نفسیات کے لحاظ سے وہ غیر مفید اور غیر مؤثر بھی ہے، ان زبانوں میں اگر ہم ارکانِ اسلام سے متعلق مسائل جمع کر دیں اور اس طرح کے کام کریں تو یہ مسلمانوں کے لئے تو مفید ہوگا مگر غیر مسلموں کے لئے اس میں کشش کا کوئی سامان اور غور وتدبر کی کوئی چیز نہ ہوگی ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام مقامی زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ، احادیث نبوی ﷺ کا عمدہ اور مؤثر انتخاب اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سادہ انداز میں سیرت پیش کی جائے، جس میں آپ ﷺ کے اخلاقی پہلو کو زیادہ نمایاں کیا جائے، اسلام کے عقائد اور اس کی معقولیت اور جدید اکتشافات کی روشنی میں اس کی صداقت اور واقعیت کو نمایاں کیا جائے، اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصول، ان کا توازن اور ان کی افادیت کو واضح کیا جائے، دوسرے مذاہب اور جدید نظریۂ ہائے حیات سے اسلام کا سنجیدہ تقابل کرایا جائے اور ایسی تحریروں میں معروضی اور مثبت اسلوب اختیار کیا جائے، مناظرانہ، جارحانہ اور منفی طرزِ تعبیر سے بچا جائے ۔

اسلام سے متعلق پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ طبقہ کی معلومات بھی کس قدر کم ہیں؟ اس

وقت اس کا اندازہ ہوتا ہے جب اسلامی زندگی کا کوئی پہلو قومی صحافت میں زیر بحث آتا ہے اور غیر مسلم دانشور اور چوٹی کے اہلِ قلم اس پر کچھ لکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس ''غلط بیانی'' کا پورا پورا قصور صرف انہیں کے ''فردِ عمل'' میں ڈال دیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت اس غلطی میں بڑا حصہ خود ان کی غفلت کا ہے کہ انہوں نے اب تک ملکی اور قومی زبانوں میں اسلام سے متعلق معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم نہیں کیا جس سے استفادہ کر کے غیر مسلم اہل قلم اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس کی بے غبار ترجمانی کر سکیں۔

زبان سمجھنے اور سمجھانے کا محض ایک ذریعہ ہے، زبان کبھی مقصود نہیں ہوتی، نہ زبان کا کوئی مذہب اور عقیدہ ہوتا ہے، اسی لئے اسلام نے زبان کے معاملے میں فراخ دلی اور وسیع النظری سے کام لیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر عبرانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا اور انہوں نے صرف پندرہ دنوں میں عبرانی سیکھ لی، بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید چھ زبانوں سے واقف تھے، روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فارسی زبان سیکھ لی تھی اور وہ اس سے آگاہ تھے۔

فارسی کوئی اسلامی زبان نہیں تھی، بلکہ مشرک، بت پرست اور آتش پرست اقوام کی زبان تھی اور فارسی میں اب بھی کثرت سے ایسی تعبیرات و تشبیہات موجود ہیں جن کی جڑیں شرک سے ملتی ہیں، لیکن جب اسلام ایران میں داخل ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کی دعوت و اشاعت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی سیکھی اور اس میں اس درجہ مہارت حاصل کی کہ تحریر کے اپنے مستقل اسلوب اور طرز نگارش کی بنیاد رکھی، فارسی ہی زبان میں ایسے ایسے نئے محاورات، ضرب المثل اور تشبیہیں وضع کیں جو اسلام کے مزاج و مذاق سے مطابقت رکھتی تھیں اور اس زبان میں اس قدر لکھا اور اسلام کے مختلف علوم و فنون پر کام کیا کہ رفتہ رفتہ فارسی ایک اسلامی زبان بن گئی اور اسلام فارسی زبان پر اس طرح چھا گیا کہ آج اسلام کو الگ کر کے فارسی ادب اور شاعری کا تصور بھی دشوار ہے۔

لیکن بدقسمتی سے ہندوستان میں اب بھی دینداروں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو عربی اور اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کو اچھوت اور بے برکت سمجھا ہوا ہے اور صرف اردو

زبان میں تھوڑا سا کام کر کے قانع اور مطمئن ہے کہ اس نے اسلام کی دعوت کا حق ادا کر دیا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام اس وقت کیا جانا چاہئے جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے اور خود مسلمانوں کا معاشرہ ایک مکمل اسلامی معاشرہ بن جائے، یہ دراصل شدید غلط فہمی اور اپنی ذمہ داری سے گریز ہے، اسلام نے ایسی کوئی ترتیب قائم نہیں کی ہے کہ غیر مسلموں کو دعوت دینے کی ذمہ داری اسی وقت مسلمانوں پر عائد ہوگی جب خود ان کا پورا معاشرہ اسلامی ہو جائے، رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ یہ دونوں کام انجام دیئے ہیں اور قرآن معاشرتی اور خانگی زندگی کے احکام کی تکمیل سے پہلے ہی سے غیر مسلموں کو اپنی دعوت کا اولین مخاطب بنا تا رہا ہے، عہدِ رسالت میں بیک وقت اسلام لانے والوں کی تربیت وتعلیم کے لئے بھی اہلِ علم صحابہؓ کو بھیجا جاتا تھا اور غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کے لئے بھی صحابہؓ وتابعین روانہ کئے جاتے تھے۔

مسلم معاشرہ کو اسلامی بنانے کے بعد غیر مسلموں کو دعوتِ دین کا مخاطب بنانے کا مطلب عملاً اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ پوری توانائی صرف مسلمانوں کی اصلاح پر صرف کر دی جائے اور اسی پر قناعت کرتے رہا جائے، اس لئے کہ مسلمانوں کو مکمل اسلام پر لانا کسی غیر مسلم کو مسلمان بنانے سے زیادہ دشوار ہے، کیوں کہ اسلام خدا کے وجود اور اس کی توحید کی کائناتی حقیقت کو تسلیم کر لینے کا نام ہے اور یہ اصحابِ ضمیر کے لئے آسان ہے، جب کہ مسلمانوں کے اندر حقیقی اسلام پیدا کرنا اپنے نفس کی مکمل سپردگی سے عبارت ہے اور یہ آسان نہیں ہے۔

اس پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کرنا چاہئے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ہیں، شرعاً خود ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کو سمجھیں، ان کے اندر دین کی طلب ہو اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ ہو اور اگر وہ سب جان بوجھ کر بھی اپنی کوتاہ عملی میں مبتلا رہیں تو عند اللہ خود ہی جواب دِہ ہیں، اس کے برخلاف جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں، ان کے متعلق مسلمان ذمہ دار ہیں اور عند اللہ مسئول ہیں کہ انہوں نے خدا کا دین ان تک پہنچانے سے تغافل کیوں برتا؟

افسوس کہ اتنی اہم ذمہ داری جس کے لئے امتِ محمدیہ برپا کی گئی (آل عمران: ۱۱۰) جو خدا کی نصرت و مدد کا ہتھیار اور مسلمانوں کی کامیابی کا اثاثہ ہے، جو جہاد کا نقطۂ آغاز ہے، جو انبیاء کی بعثت کا مقصود ہے اور جس سے گریز انسانیت کے ساتھ سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی اور خدا کے دین کے ساتھ سب سے بڑا ظلم ہے، جو اسلام کے پیغام کو آفاقی اور اس کے نبی عربی ﷺ کی رحمت کو عام و تام کرتا ہے اور جو خود مسلمانوں کے لئے خدا کی طرف سے حفاظت و سلامتی کی کلید ہے، کی طرف سے ملتِ اسلامیہ ہند غافل ہے۔

پھر کیا کچھ دل ہیں جو اس فریضہ نبوت کی ادائے گی سے غفلت پر لرز اٹھیں اور کیا کچھ خریداران آخرت ہیں جو سیاسی شہرت سے دور گوشۂ گمنامی میں رہ کر اسلام کا شجرۂ طوبیٰ لگانے پر آمادہ ہوں؟

(۲۰/۶/۲۰۰۱ء)

ایک اہم فریضہ جس سے ہم غافل ہیں!

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیشہ سماج میں دو طبقے موجود رہتے ہیں، ایک ان لوگوں کا جنہوں نے کسی ذریعہ سے بالاتر حیثیت حاصل کر لی ہے، دوسرے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ لوگ جو ان کے استحصال کا شکار ہوں۔ اس دوسرے طبقہ کو قرآن نے ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے۔ (النساء: ۷۵) قرآن نے مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ وہ ان کمزور، دبے کچلے مردوں، عورتوں اور بچوں کو نجات دلانے کے لئے جہاد کیوں نہیں کرتے، جو دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالموں کی بستی سے نجات عطا فرمایئے اور ہمارے لئے اپنے پاس سے حمایتی اور مددگار عطا فرمایئے۔'' (النساء: ۷۵)

مسلمان جب اس ملک میں آئے تو ابتداءً انہوں نے اپنے اس کردار کو نبھایا اور اللہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے آزاد کرانے کی سعی کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کے باشندوں میں سے ایک بڑے گروہ نے ان کو ابرِ رحمت سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور وہ اس ملک کی اکثریت کے لئے نگاہوں کا نور اور دل کا سرور بنے رہے، لیکن افسوس کہ مسلمان زیادہ دنوں تک اپنے اس کردار کو باقی نہ رکھ سکے اور کم ہی عرصہ میں وہ دعوتی مزاج سے محروم ہو کر جامد اور عیش وعشرت پرستار قوم کی طرح برادرانِ وطن کے مسائل اور احوال سے بے تعلق ہو کر رہ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب کوئی مذہب نہیں ہے اور مختلف قوموں کا جو انبوہ ہندو دھرم کے نام پر اکٹھا ہو گیا ہے، اس میں معمولی درجہ کی فکری وحدت بھی موجود نہیں ہے، ہندو قوم زبردست تضادات کا مجموعہ ہے۔ برہمن اونچی ذاتیں اور نچلی ذاتوں کے درمیان جو فاصلے ہیں، بعض مصلحین نے ان کو پاٹنے کی بہت کچھ کوشش کی، لیکن چوں کہ طبقاتی

تقسیم کا تصور محض ایک سماجی اور رواجی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اس کی جڑیں فکر و عقیدہ میں پیوست ہیں، اس لئے اس کی اصلاح شاید سماج کے اس دائرہ سے باہر نکلے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آج کے جمہوری دور میں اور ہندوستان جیسی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں بھی پوری کے شنکرا چاریہ علی الاعلان کہہ سکتے ہیں کہ: ''اچھوت ہندو نہیں ہیں''، تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نچلی ذاتوں کے بارے میں برہمنوں کے یہاں کیسی شدید نفرت پائی جاتی ہے۔

اس نفرت کا نتیجہ ہے کہ برہمن جو ملک کی کل آبادی کا زیادہ سے زیادہ ۵رفیصد ہیں، انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں کلیدی عہدوں پر قبضہ کر کے دوسرے لوگوں کو عملاً غلام بنا رکھا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں ایوان اقتدار میں ۵رفیصد برہمنوں کا تناسب کیا تھا؟ اور ملک میں اقتدار اور معیشت کے اہم مواقع پر برہمنوں کا کیا تناسب تھا؟ اس کا اندازہ حسب ذیل اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱)	لوک سبھا	۴۸	فیصد برہمن
(۲)	راجیہ سبھا	۳۶	فیصد برہمن
(۳)	گورنر۔ لیفٹننٹ جنرل	۵۰	فیصد برہمن
(۴)	لیفٹننٹ جنرل کے سکریٹری	۵۳	فیصد
(۵)	مرکزی کابینی سکریٹری	۵۳	فیصد برہمن
(۶)	وزراء کے چیف سکریٹری	۵۴	فیصد برہمن
(۷)	وزراء کے نجی سکریٹری	۷۰	فیصد برہمن
(۸)	جوائنٹ راسپیشل سکریٹری	۷۲	فیصد برہمن
(۹)	یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر	۵۱	فیصد برہمن
(۱۰)	سپریم کورٹ کے جج	۵۶	فیصد برہمن
(۱۱)	ہائی کورٹ رایڈیشنل جج	۵۰	فیصد
(۱۲)	سفراء۔ قونصل	۴۱	فیصد برہمن

(۱۳) پبلک سیکٹراداروں کے سربراہان:

(الف)	مرکزی	۵۷	فیصد برہمن
(ب)	ریاستی	۸۲	فیصد برہمن
(ج)	بینک	۵۷	فیصد برہمن
(د)	ایرلائنس	۶۱	فیصد برہمن
(ہ)	آئی اے ایس افسران	۷۲	فیصد برہمن
(و)	آئی پی ایس افسران	۶۱	فیصد برہمن
(ز)	ریڈیو۔ٹی وی	۸۳	فیصد برہمن
(ح)	سی بی آئی۔ کسٹمز، ایکسائز	۷۲	فیصد برہمن

(وائس آف دی ویک: اکتوبر ۱۹۸۹ء)

میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی حیثیت اقتدار کے لئے سیڑھی کی ہے اور ادھر چند انتخابات سے سیاسی شخصیتوں اور جماعتوں کو اونچا اٹھانے اور نیچا گرانے میں اس نے جو اہم کردار ادا کیا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ اس اہم ترین وسیلۂ طاقت پر بھی برہمنوں کا قبضہ ہے۔ ''انڈین اکسپریس'' کے عملہ میں ۹۳ / فیصد، ''ہندو'' کے عملہ ۹۷ / فیصد اور ''ٹائمز آف انڈیا'' کے عملہ میں ۷۳ / فیصد برہمن ہیں۔ ملک کے ان تین بڑے اخبارات سے دوسرے اخبارات ورسائل کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندو مذہبی کتابوں کے مطابق شری رام جی نے سمبو کو محض اس لئے قتل کیا کہ وہ شودر ہونے کے باوجود سنسکرت کا علم حاصل کررہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جو شخصیتیں کسی مذہب اور اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے آئیڈیل ہوں، جب انہی کے عمل میں نفرت کا یہ پیغام موجود ہو تو اس قوم میں ایک طبقہ کے استحصال کا جذبہ کیوں نہ پیدا ہوگا۔ نچلی ذاتوں کے لوگوں کو طویل عرصہ سے اقتدار سے محروم رکھنے اور غلام بنا کر رکھنے کی وجہ سے خود ان میں بھی خوئے غلامی پیدا ہوگئی ہے، اونچی ذاتیں ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرتی ہیں، ان کو اختلاف وانتشار کا شکار بنا کر رکھتی ہیں اور خود اس کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے

پچاس سال کا عرصہ گذر چکا، ملک کی آزادی سے پہلے ہی برہمن فکر نے آر، ایس، ایس کی بنیاد رکھی، جس نے طویل المدت منصوبے بنائے اور بالآخر وہ بامِ اقتدار تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اقتدار کو انہوں نے صرف کسبِ مال کا وسیلہ نہیں بنایا، بلکہ اپنی کھوئی فکر اور مذموم عزائم کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے انہوں نے نئی منصوبہ بندی کی ہے اور سبک خرامی کے ساتھ غیر محسوس طریقہ پر وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

مسلمانوں نے حکومت و اقتدار کا ایک طویل عہد پایا، اگر وہ اس مدت میں نا انصافی کو مٹانے اور ہزاروں سال کے ستم رسیدہ انسانوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرتے تو آخرت میں تو اجر پاتے ہی، دنیا میں بھی اس طویل وعریض علاقہ کے تاج دار ہوتے۔ بالآخر ہم نے اپنی غفلت کی سزا پائی اور جو لوگ تختِ اقتدار کی زینت تھے، وہ تختۂ دار کی زینت بنے، ملک آزاد ہوا اور تقسیم ملک کی وجہ سے ایک طوفان تھا جو امتِ مسلمہ کے سر سے گذر گیا، لیکن جمہوری نظام کے تحت ہم اس ملک کے اقتدار میں حصہ دار تھے، ہمیں اپنی قوم کو سنبھالنے اور دوسرے بھائیوں تک اللہ کا دین پہنچانے کے وسیع مواقع حاصل تھے، یہ وقت تھا کہ مسلمان اس ملک کے مستضعفین کو اپنے ساتھ لیتے، ان کی یاوری کرتے، ان کو ظلم کے شکنجے سے نکالنے کی کوشش کرتے اور ان کے دکھ درد کو بانٹنے کی کوشش کرتے، اس سے دوہرے فوائد حاصل ہوتے، ایک طرف اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ کھلتی اور وہ کام انجام پاتا جس کام کے لئے یہ امت مبعوث ہوئی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی اعتبار سے طاقت حاصل ہوتی، اگر وہ بادشاہ نہ ہوتے تو بادشاہ گر ہوتے، اس ملک میں کوئی فیصلہ شاید ان کی مرضی اور منشا کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن افسوس کہ ہم نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ ہم نے بھی ان کو اچھوت اور انسانیت کا ایک گراہوا طبقہ تصور کیا۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا نہ کوئی سیاسی وزن ہے اور نہ سماجی مقام، نہ تعلیم میں انکی حیثیت نمایاں ہے اور نہ معیشت میں، مسلمانوں کو دہشت گرد، انتہا پسند اور بنیاد پرست مشہور کر کے اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ ایک قابلِ نفرت قوم بن گئے ہیں،

لیکن ان سے خوف کھاتے ہیں، عجب نہیں کہ بعض گھروں میں مائیں اس سے اپنے بچوں کو ڈراتی بھی ہوں۔ نچلی ذاتوں کی جو قیادتیں ادھر چند سالوں میں اُبھری ہیں، برہمنوں نے یا تو انہیں اتنا بدنام کر دیا ہے کہ وہ بے اثر ہیں یا ان کے درمیان اتنا انتشار برپا کر دیا ہے کہ وہ بکھر کے رہ گئے ہیں اور جب کوئی طاقت بکھر جاتی ہے تو اس کو اپنے ساتھ جذب کر لینا اور اپنا آلۂ کار بنا کر رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ لالو پرساد یادو، کاشی رام، ملائم سنگھ اور رام ولاس پاسوان وغیرہ اس کی واضح مثال ہے۔

آج بھی مسلمانوں کے لئے صحیح راہ یہی ہے کہ پوری نیک نیتی کے ساتھ دبے کچلے لوگوں کو اپنے ساتھ لیں، ان کو ظلم سے نجات دلانے کی جد و جہد کریں اور سیاسی مفادات اور اقتدار کی حرص کرنے کے بجائے اس تعلق کو اسلام کی اشاعت و حفاظت کے لے استعمال کریں۔ اس کے بغیر ہمارے لئے اس ملک میں اپنے ملی وجود کو باقی رکھنا شاید دشوار ہو جاے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تو انصار یہودیوں کے استحصال کا شکار تھے، مسلمانوں کا قافلہ جب روم کی سرزمین میں پہنچا تو وہاں کی عوام نے خیر منائی، جب اہلِ ایماں کا کارواں ایران پہنچا تو اس نے یہی کہا کہ ہم تم کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنے آئے ہیں، جب بادشاہ کے تاج کی قیمت لاکھوں ڈالر ہوتی تھی اور غریب کسان گراں بار ٹیکسوں کے خوف سے پہاڑوں اور جنگلات کی پناہ لینے پر مجبور تھے، ان حالات میں مسلمان ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے ان ملکوں میں پہنچے اور انہوں نے بے جان زمینوں پر قبضہ کرنے سے زیادہ لوگوں کے قلوب کو فتح کرنے کی کوشش کی۔

مسلمانوں کے لیے اس ملک میں باعزت زندگی کی راہ یہی ہے کہ وہ ایک نجات دہندہ قوم کی حیثیت سے سامنے آئیں اور نقش دیوار پڑھ کر اپنے لیے ایک ایسا منصوبہ بنائیں جو دیر سے سہی لیکن منزل مقصود کو پہنچاتا ہو اور محض حقیر اور وقتی مفادات پیش نظر نہ ہوں۔

مسلمانانِ ہند کا ایک اہم فریضہ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے، تو عام طور پر ان کا سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک ''ملأ قوم''، یعنی قوم کے سربرآوردہ لوگ، جن کو باعزت اور بلند مرتبت سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے ''اراذل قوم'' یا ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور کمزور لوگ، جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، ہر نبی کی دعوت اپنی قوم میں ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے ابھرتی ہے، قوم کے سربرآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، البتہ ان میں جو لوگ حقیت پسند اور نیک خو ہوتے وہ اپنی بڑائی کو قربان کر نبی کی دعوت پر لبیک کہتے، لیکن ابتداءً ان کی تعداد بہت کم ہوتی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوتِ حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ پہل کرتے اور پھر ظلم وجور کی بھٹی میں تپائے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظام غیبی کے تحت ہوتا، کہ چونکہ وہ پہلے سے مظلوم وستم رسیدہ ہوتے، اس لئے ان کے لئے ظلم وزیادتی اور تحقیر وتذلیل کا رویہ کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوتِ حق کو قبول کرنے میں سردارانِ قوم ہی اصل میں رکاوٹ بنتے ہیں، اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کی کس قدر مخالفت کی، اس لئے نظامِ غیبی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سرداران مکہ جمع کر دئے گئے، اور وہ سب بدر میں ہلاک ہوئے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دئے ہیں، بدر کے بعد اہلِ مکہ کے دو ہی قابلِ ذکر سردار باقی رہ گئے، ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، مدینہ میں جو اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہوئی، تو اس کی ایک وجہ وہی تھی جس کی طرف

حضرت عائشہؓ نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی بعثت سے پہلے اوس وخزرج کی خانہ جنگی میں عبد اللہ بن ابی کے علاوہ صفِ اوّل کے تمام قائدین لقمۂ اجل بن چکے تھے، اس لئے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظم طاقت موجود نہیں تھی، عبد اللہ بن ابی نے اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، لیکن انصارِ مدینہ پر نشۂ ایمانی چڑھ چکا تھا، کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے غیبی نظام کے تحت بعثت محمدی سے پہلے ہی سرداران مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لئے نرم وہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورتِ حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو یہی طبقہ ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے معاند تھے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، حالاں کہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں، قالوا أنومن لك واتبعك الارذلون (الشعراء:۱۱۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ''ارذلون'' کا ترجمہ ''کمینہ'' سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قومِ نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے، کہ سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں، اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں، وما نری اتبعك الا الذین هم أراذلنا (ہود:۲۷)

ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس میں کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو ''ملأ قوم'' بنا رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بسا دیا ہے کہ وہ فرمانروائی اور حکمرانی ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازوؤں سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انہوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کم تر ہیں، وہ دوسروں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے، لیکن وہ ملک میں ۶۵ ؍ فیصد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں، اور

اقتدار کے در و بام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی و منشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملأ قوم ہیں، جن کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں عدل و انصاف اور سچائی کے سامنے سر خمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ ''دلت'' کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں ''اراذل قوم'' کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انہیں نیچ، گنوار اور کم تر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم و جور کی چکی میں پسی جارہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے، انہیں تحفظات دیئے جارہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انہیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگادیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیراعظم نہیں بن سکے، کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، اور ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لئے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتائیے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے!

جو لوگ مظلوم، دبے کچلے، اور دبائے ہوئے ہوں ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے صرف سیاسی مصلحت نہیں بلکہ دینی اور ملی فریضہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں
لڑتے جو مغلوب ہیں، مرد، عورتیں اور بچے (النساء: ۷۵)

قرآن نے یہاں مغلوبوں کے لئے ''مستضعفین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے ''مستضعفین'' ہیں تو شاید

بے جا نہ ہو، اس لئے ان کو ساتھ لینا اور اس ملک کے ظالموں کو مشترک تدبیر کے ذریعہ ظلم سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، بدقسمتی سے ہم نے اس اہم کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی، بلکہ ہندوؤں کی اونچی برادری سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کم وبیش یہی رویہ اختیار کیا، بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں بھی مختلف دیواریں کھڑی کر لیں، بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہو جاتی ہیں کہ پاس کا آدمی نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہونچایا ہے، ایک تو اس ملک میں دعوت اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اگر ہم اس طبقہ سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہو سکتے تھے، ہر قوم میں دعوتِ حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے، کہ پہلے ایسے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے، پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا تو بالآخر جو طبقہ انہیں نیچ گردانتا تھا، اس کے لئے بھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا، پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا، پھر اہلِ مدینہ نے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اہلِ مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہوئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے، یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے، کالے، گورے، عرب، عجم کی کوئی تفریق نہیں، ایک ہی مسجد میں سب کو خدا کی عبادت کرنی ہے، جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو، وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو، اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو، انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں، بلکہ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے، یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور مبنی بر انصاف ہے کہ جن قوموں کو نیچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لئے بہت بڑی رحمت باور کرتی ہیں، اگر اسلام کے اس عظیم اصولِ زندگی کو ان محروم ومظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوں، اور اس ابرِ رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں، مگر افسوس، اور صد ہزار افسوس! کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اعتبار سے ہم خود اچھوت ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہو جاتے، جن کی تعداد ملک میں ساٹھ، پینسٹھ فیصد سے کم نہیں، تو اگر ہم بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں، اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلت ہی کو اپنا ہتھیار اور آلۂ کار بناتے ہیں، اگر ہم انہیں قریب کرلیں، تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہو جائیں۔

وقت ابھی بھی گیا نہیں ہے، اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہئے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہئے کہ دلت سیاسی وسماجی قائدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں، انہیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، یوپی کے حالیہ الیکشن میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا، گو بعض سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستی اور اقتدار کی بڑھتی ہوئی حرص کی وجہ سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ بی جے پی کو سخت صدمہ پہونچا، اور اس کی وجہ سے پورے ملک میں اس کی ساکھ متاثر ہوئی، اس لئے مسلمان قائدین کو اعلیٰ سطح پر دلت قائدین سے ربط قائم کرنا چاہئے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے!

سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انہیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انہیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیرِ انتظام اسکولوں میں انہیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں، پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کرلیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی

کے ساتھ آپ کی طرف راغب ہو جائیں گے، ایک ایسی قوم جو انسان تسلیم کئے جانے کے لئے جد و جہد کر رہی ہے، اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل جیتنے کے لئے کافی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایک ٹھکرائی ہوئی قوم کو سینہ سے لگائیں، اور انہیں محبت کی سوغات دیں، اس میں ہماری جان و مال کی حفاظت ہے، عزت و آبرو کا تحفظ ہے، سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے دعوت کے وسیع مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔

کاش ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!

اخبارات کی ایک خبر یقیناً پڑھنے والوں نے حیرت کی آنکھوں پڑھا ہوگا اور چشم تعجب سے اسے دیکھا ہوگا، اور وہ خبر ہے ایک ایسے شخص کے ایمان لانے کی جو نہ صرف بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا بلکہ مسجد شہید کرنے والے مجرمین کی قیادت کرر ہا تھا، آپ بھی اس خبر کو ایک مقامی اخبار کی زبان میں پڑھیں:

> ۶ر ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو جب ایودھیا میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو اس گھناؤنے کام میں شیوسینکوں کی ٹولی پیش پیش تھی اور اس ٹولی نے مسجد کے گنبدوں پر چڑھ چڑھ کر انہیں شہید کیا تھا، شیو پرساد نامی ایک نوجوان جو کہ فیض آباد میں رہتا تھا، بجرنگ دل کی اس ٹولی کا سرغنہ تھا جسے مسجد کی شہادت کے کام کی نگرانی سونپی گئی تھی اور اس نے اس مقصد کے لئے ۴ر ہزار والینٹروں کو تربیت دی تھی، اس دن مسجد کے عالیشان میناروں کو دیکھ کر شیو پرساد نے ''رام رام'' کا نعرہ بلند کیا تھا لیکن ۷ر سال بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی اس شرمناک حرکت کے لئے معافی کا طلبگار ہے، ۷ر سال بعد ۶ر ڈسمبر ۱۹۹۹ء کو شیو پرساد بابری مسجد کے انہدام کی کاروائی میں اپنی شمولیت پر نادم وشرمسار ہے اور اس نے اسلام قبول کرلیا ہے، شیو پرساد کا نیا اسلامی نام ''محمد مصطفیٰ'' ہے۔ ''ملیالم نیوز'' کے ۷ر ڈسمبر ۹۹ء کے شمارے میں شائع کردہ ایک خبر کے مطابق شیو پرساد کا باپ ٹی راما ناتھن سنگھ پریوار کے اہم کارکنوں میں شمار کیا جاتا تھا اور اس کا پورا خاندان بابری مسجد کی شہادت میں شریک تھا۔ مسجد کی شہادت کے فوری بعد سے

ہی شیو پرساد کو شدید مجرم ضمیری کا احساس ہونے لگا تھا۔ ۱۹۹۷ء میں وہ شارجہ چلا گیا لیکن ملازمت میں بھی اس کا ذہن منتشر رہتا تھا۔ ۴؍ ڈسمبر ۱۹۹۸ء کو جب کہ وہ شارجہ کی سڑکوں سے گذر رہا تھا، اس نے جمعہ کے دن ایک مسجد میں ہونے والے وعظ کے الفاظ سنے اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کی تقریر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیام نے اس کے دل میں انقلاب برپا کر دیا اور جب اس نے مسلسل وعظ سننے شروع کئے تو اس کے دل کی کایا پلٹ ہوگئی، الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے اسے راہِ راست دکھادی اور اس نے گمراہی کو ترک کر کے سیدھا راستہ اختیار کرلیا ہے، جب شیو پرساد نے اسلام قبول کرلیا تو اس کے خاندان والوں نے جو کہ آر ایس ایس کے کٹر حامی ہیں، اسے خاندان سے خارج کر دیا لیکن اس کے باوجود شیو پرساد کی دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خاندان والوں کو بھی راہِ راست دکھادے، شیو پرساد کا کہنا ہے کہ اڈوانی اور اشوک سنگھل نے بابری مسجد کی شہادت کی کارروائی کی قیادت کی تھی اور شہادت کے دن پولیس اور سی آر پی ایف نے بی جے پی، آر ایس ایس اور بجرنگ دل قائدین سے ساز باز کر رکھی تھی۔ اسے یاد ہے کہ اس دن اشوک سنگھل نے فوجی یونیفارم پہن رکھا تھا اور ہدایات دے رہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد انہوں نے فیض آباد کے مسلم علاقوں میں جا کر ''جئے شری رام'' کے نعرے لگائے تھے لیکن اب قرآن پاک کی ۱۷؍ سورتیں حفظ کر لینے کے بعد وہ ایک سچا اسلامی مبلغ بننے کا خواہاں ہے تاکہ گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لا سکے، انشاءاللہ اس کا ارادہ پورا ہوگا اور جن ہاتھوں نے بابری مسجد کو شہید کیا تھا، وہی اس کی دوبارہ تعمیر کریں گے۔''

یہ خبر بظاہر خلاف توقع اور حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن جو لوگ اسلام کی تاریخ سے

آگاہ ہیں اور جنہوں نے خصوصیت سے اسلام کی دعوت واشاعت کی داستانیں پڑھی ہیں ان کے لئے یہ کوئی نئی اور تعجب خیز بات نہیں!

پیغمبر اسلام ﷺ نے جب مکہ میں صدائے توحید بلند کی تو قریش نے کس شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی؟ اور پھر صلح حدیبیہ تک اس شدت میں کوئی کمی نہیں آئی لیکن صلح حدیبیہ جس میں بظاہر آپ ﷺ نے دب کر صلح فرمائی، نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے، اسلام کو سمجھنے اور مسلمانوں کے ماحول کو جاننے کا جو موقع فراہم کیا، اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں کی ظاہری شکست کو اسلام کی فتح مبین میں تبدیل کر دیا اور جن دلوں کو تلوار کے ذریعہ مسخر کرنا ممکن نہیں تھا اسلامی تعلیمات کی قوتِ تسخیر نے اس کو اپنا گرویدہ اور غلام بے دام بنالیا،

عرب کے پڑوس میں جو مملکتیں تھیں ان میں سب سے بڑی طاقت ایران تھی جو مشرکانہ فکر واعتقاد کی نمائندہ تھی اور اس لئے اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت گویا ان کی گھٹی میں تھی، لیکن یہ اسلام کی کشش ہی تھی کہ نہ صرف اہلِ ایران نے اسلام قبول کیا بلکہ یہی ایران کا علاقہ ہے جس نے علومِ اسلامی کی جمع وتدوین اور حفاظت کا فریضہ انجام دیا، یہاں سے ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں جو پوری دنیا میں علوم اسلامی کی سب سے مستند ومعتبر ترجمان ونقیب سمجھی گئیں، اور جن کے سامنے عربوں نے بھی سر احترام خم کیا۔

اس سلسلہ کا سب سے اہم تاریخی واقعہ تاتاریوں کے قبول اسلام کا واقعہ ہے، یہ ایسی وحشی قوم تھی کہ جیسے انسان راہ کے سنگریزوں کو روندتا ہوا گذر جاتا ہے، اسی طرح اس قوم نے انسانوں کو روندتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھائے اور عالم اسلام کو ایسا پامال کیا کہ دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی، لاکھوں انسانوں کو تہہ تیغ کیا اور بغداد جیسا شادوآباد اور بارونق شہر ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا، یہاں تک کہ خود خلیفۃ المسلمین مستعصم باللہ گرفتار کئے گئے، اور انہیں لاتوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے مار مار کر ختم کر دیا گیا، پھر اس آفت بداماں آندھی نے شام کا رخ کیا اور دیکھتے ہی

دیکھتے یہی حشر شام میں بھی ہوا اور مسلمانوں پر ایسی قیامت ٹوٹی کہ ان صدمات اور مظالم کے بیان میں مبالغہ کے خوگر شعراء بھی الفاظ کے تنگیٔ داماں کی شکایت کرنے پر مجبور ہوئے، کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وحشی، ستم شعار اور مسلمانوں کی بدترین دشمن قوم کبھی مسخر بھی ہو سکے گی؟؟

لیکن تاریخ میں اس سے زیادہ غیر متوقع اور ناقابل قیاس شاید ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو، کہ اسلامی مملکت کے اس عظیم فاتح نے اسلام کے ہاتھوں شکست کھائی، اور زمین کی سلطنت کو زیر کرنے کے بعد اپنی فکر ونظر اور دل ونگاہ کی سلطنت اسلام کے حوالہ کر دی، چنگیز خاں کے چار بیٹوں کی الگ الگ مملکتیں قائم ہوئیں، اور ایک صدی کے اندر پوری قوم دامنِ اسلام کے اندر آ گئی، اس میں سب سے دلچسپ اور عبرت خیز واقعہ تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷ء-۱۳۶۳ء) کے قبول اسلام کا ہے، یہ کاشغر کا ولی عہد شہزادہ تھا، کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ شکار کے لئے نکلا، شکارگاہ میں کسی اور کے آنے کی ممانعت تھی، اتفاق سے شیخ جمال الدین نامی بزرگ نادانستہ اپنے رفقاء کے ساتھ اس ممنوعہ علاقہ میں آ گئے، شہزادہ نے اس جرم میں ان سبھوں کو مشکیں کسوا کر طلب کیا، شہزادہ کے ساتھ اس کا شکاری کتا بھی تھا، اس نے کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ سے پوچھا کہ تم بہتر ہو یا یہ بہتر ہے؟ شیخ نے جواب دیا: اگر میں ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ بہتر، شیخ کا یہ جواب تیر کی طرح بادشاہ کے دل میں چبھ گیا اور شکار کرنے والا خود شکار ہو گیا۔

اس نے پوچھا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ شیخ نے نہایت ہی دل نشیں پیرایہ میں ایمان کی حقیقت سمجھائی اور ''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے'' کے مصداق تغلق پر شیخ کی بات کا گہرا اثر ہوا، اس نے خواہش کی کہ جب اس کی تخت نشینی عمل میں آ جائے تو وہ اس کے پاس آئیں اور اس سلسلے میں گفتگو کریں، اس واقعہ پر ایک عرصہ گذر گیا یہاں تک کہ شیخ بیمار پڑے اور ان کی وفات کا وقت آ پہونچا، اپنی موت کے قریب شیخ نے اپنے صاحبزادے شیخ رشید الدین سے فرمایا کہ وقت آئے گا کہ تغلق تیمور تخت شاہی پر متمکن ہوگا

اس وقت تم ان کے پاس جانا اور انہوں نے مجھ کو جو وقت دیا تھا، یاد دلاتے ہوئے ان پر ایمان پیش کرنا، تغلق کے بادشاہ بننے کے بعد شیخ رشید الدین نے بادشاہ سے ملاقات کی بڑی کوشش کی، لیکن مسلمان اس وقت اتنے حقیر اور بے وزن تصور کئے جاتے تھے کہ کسی طور ایوان شاہی تک رسائی حاصل نہیں ہو پاتی تھی، آخر شیخ رشید الدین نے اس کے لئے ایک انوکھی تدبیر سوچی اور ایک دن شاہی خیمہ کے سامنے ٹھیک فجر کے وقت اذان دینی شروع کردی، بادشاہ کی نیند میں خلل ہوا اور اس نے غضبناک ہو کر شیخ رشید الدین کو طلب کیا، شیخ آئے اور انہوں نے اپنے والد کا پیغام پہونچایا، بادشاہ کو اپنا پُرانا وعدہ یاد آیا اور وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا، پھر اس نے اپنی رعایا کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اس طرح چنگیزی سلطنت کا وہ حصہ جو چنگیز کے بیٹے چغتائی کی اولاد کے زیرِ تسلط تھا پورا کا پورا مسلمان ہوگیا، اقبال نے اس کو شعر کا جامہ پہنایا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانہ سے
مل گیا پاسباں کعبہ کو صنم خانہ سے

کعبۂ اسلام میں دشمنوں کو جان نثار اور خون آشاموں کو اپنا فدا کار بنانے کی جو صلاحیت پہلے تھی، وہ اب بھی ہے، اور ’’شیو پرشاد‘‘ کا اسلام قبول کرنا اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے!

جمہوریت نے یقیناً مذہبی رواداری کا مزاج پیدا کیا ہے، اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کا سابقہ ایسی قوموں سے رہا جو کلمۂ حق سننے کے بھی روادار نہ تھے اور جب کوئی شخص یا قوم کسی بات کو سننے ہی کو تیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کا اس سے متاثر ہونا اور اس دعوت کا قبول کرنا دشوار ہوتا ہے۔ آج یقیناً دین حق کی دعوت کے مواقع پہلے سے کہیں بڑھ کر ہیں، لیکن افسوس کہ ہم میں آج شیخ جمال الدین اور شیخ رشید الدین موجود نہیں ہیں، تیرگیٔ شب کی آغوش سے سورج طلوع ہوتا ہے اور جب جھلسا دینے والی گرمی زمین کو جلا کر رکھ دیتی ہے تو رحمت کی گھٹائیں زمین پر نثار ہوتی ہیں، اسی طرح جب کسی قوم میں اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں کی عداوت اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور نفرت کے شعلے

پوری طرح بھڑک اٹھتے ہیں تو اسی عداوت کی تاریکی سے محبت کی صبح طلوع ہوتی ہے اور نفرت کی خاکستر سے ایمان کے چشمے پھوٹتے ہیں، اس لئے مایوسی کی نہیں بلکہ خود احتسابی کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہم نے خیر امت کی حیثیت سے اپنا فریضہ ادا کیا ہے؟......

کاش! وقت کی چنگیزی طاقتوں کے مقابلہ کے لئے ہم میں بھی کوئی شیخ جمال الدین ہوتا!!

(۲۲ رجون ۲۰۰۰ء)

نہایت اہم کام

۱۱۹ کتوبر ۱۹۹۸ء کے منصف میں آخری صفحہ پر ایک ایسی خبر شائع ہوئی ہے، جس نے یقیناً ہر اس شخص کو مسرور وشاد کام کیا ہوگا جو اپنے دل میں ایمان ویقین کی کوئی چنگاری رکھتا ہو، یہ خبر ہے جیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر ۶۷ سالہ ''مسٹر نڈم پلی وینکٹ بالا سبرا منیادت'' کے مشرف بہ اسلام ہونے اور ''محمد اسماعیل'' بن جانے کی۔ جناب دت کا تعلق برہمن گھرانے سے ہے۔ World University of Tuscon امریکہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، وہ اپنے نومسلم فرزند محمد نظیف (سابق نام: نڈم پلی راجہ راما) کی ترغیب پر ایمان لائے ہیں، جناب نظیف علی گو ایک سال پہلے ہی ایمان سے سرفراز ہوئے ہیں، لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے انہوں نے مدتوں تلاش حق کا سفر کیا اور آخر انسانیت کے نام اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہدایت ''قرآن مجید'' نے ان کو اس نعمت سے ہمکنار کیا، جس کے لئے ان کی روح بے تاب تھی۔

بھلے ہی اخبارات اور ذرائع ابلاغ کے لئے یہ معمولی خبر ہو، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ ایک اہم واقعہ اور خدا کا ایک زندہ پیغام ہے، یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیشہ نا اُمیدیوں کی شب تاریک سے صبح اُمید طلوع ہوتی ہے، ملک کے سیاسی اُفق پر گو فرقہ پرستی کی گھٹا چھائی جارہی ہے، لیکن دلوں کی دنیا پر جھوٹے بازی گروں کی حکمرانی نہیں، اب بھی اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حقیقت پسند اور سچائی کے پرستار ہیں، محض ایک دستک ان کے دلوں کے بند دروازے کو کھول سکتی ہے اور قلب ونظر کی دُنیا کو فتح کرسکتی ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس

کے اندر نئے افکار و نظریات اور عقائد و تصورات کو قبول کرنے کی خاص صلاحیت ہے، اسی لئے بودھ مت، جین مت اور ہندو مت اسی ملک میں پیدا ہوا اور یہیں اس نے فروغ پایا، پارسی مذہب نے بھی ہندوستان کے سایہ میں اپنے آپ کو باقی رکھا ہے، ورنہ بظاہر اس کو اپنا وجود کھو دینا چاہئے تھا، سکھ مت کو اگر مستقل مذہب سمجھا جائے تو اس نے بھی ہندوستان ہی میں آنکھیں کھولیں اور یہیں پروان چڑھا، عرب سے چند ہزار مسلمان ہی سندھ کے ساحل پر اُترے تھے، ہندوستان نے اس دینِ حق کا بھی استقبال کیا اور اس کو اپنی چشم اعتقاد کا سرمہ بنایا، آج برصغیر میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، وہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس ملک نے کبھی بھی دعوتِ حق کو قبول کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

اسلام اور اسلام کے اولین مرکز جزیرۃ العرب سے ہندوستان کا قدیم تعلق رہا ہے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں تیغ و شمشیر کے جلو میں آئے اور ان کی اصل دلچسپی دلوں کی کشور کشائی کے بجائے زر و زمین کو فتح کرنے سے تھی، لیکن یہ صحیح نہیں، عرب اور افغان مسلمان حکمراں یقیناً یہاں درّہ خیبر کی راہ سے آئے، لیکن اسلام اس ملک میں ساحلی علاقوں کے ذریعہ پہنچا اور اس نے یہ سفر فوجیوں اور سپاہیوں کے ذریعہ نہیں، بلکہ داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ طے کیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق اسلام سب سے پہلے عرب تاجروں کے ذریعہ جزیرۂ سرندیپ میں پہنچا اور مسلمان تاجروں سے متاثر ہو کر سرندیپ کا راجہ ۴۰ھ میں مشرف بہ اسلام ہوا، مشہور سیاح ''بزرگ بن شہریار ناخدا'' کا بیان ہے کہ راجہ سرندیپ کو کسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کا علم ہوا اور اس نے باضابطہ اپنا نمائندہ تحقیق حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس زمانہ میں سفر آج کی طرح آسان نہ تھا، راجہ کی فرستادہ کو مدینہ پہنچنے میں اتنی مدت لگ گئی کہ وہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پہنچا اور حضرت عمرؓ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد کا دوسرا راستہ، جزیرۂ مالدیپ، ہے۔ یہاں ہر مہینہ

سمندر سے ایک بلا آتی تھی، لوگ اس سے بچنے کے لئے ایک کنواری لڑکی کو بنا سنوار کر ساحلِ سمندر کے ایک بت خانہ میں چھوڑ آتے تھے، لیکن مراقش کے ایک شیخ ابوالبرکات بربری جو اتفاق سے یہاں آگئے تھے، کی دعاء سے یہ بلا ٹل گئی، وہاں کا راجہ اس سے بہت متاثر ہوا اور خود راجہ (جس کا نام شنوارزہ تھا)، اور اس کی رعایا شیخ کے ہاتھ پر ایمان لے آئی۔ اس طرح مالا بار، کورومنڈل اور گجرات کے بعض علاقے ہیں جہاں مسلمان داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ اسلام کی روشنی پہنچی اور اس نے اپنی انسانیت دوستی، انصاف پر مبنی تعلیمات اور حقیقت پسندانہ نظریات کی بنا پر لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش کیا۔

مسلمان مجاہدین نے بھی جو بیک وقت میدانِ جنگ کے سپاہی بھی ہوتے تھے اور دردمند داعی اور مبلغ بھی، شروع ہی سے ہندوستان پر اپنی نگاہ رکھی، پیغمبر اسلام ﷺ کے وصال کے پانچ سال بعد یعنی ۱۵ھ میں حضرت عمرؓ نے بحرین اور عمان کے علاقہ پر عثمان بن ابی العاص ثقفی کو گورنر مقرر فرمایا، انہوں نے اپنے بھائی حکم بن ابی العاص کو بحرین کا ذمہ دار مقرر کر کے ہندوستان پر فوج کشی کا حکم دیا، حکم نے کشتیوں کے ذریعہ دریائی سفر کی کٹھن منزلیں طے کیں اور ساحل گجرات پر قدم رکھا، اس فوج میں یقیناً بہت سے صحابہ بھی شریک تھے، جو شہادت سے سرخرو ہوئے اور بقول مولانا عبدالحی حسنیؒ یقیناً ممبئی اور بھروچ کے گردونواح میں یہ خزانہ سپرد خاک ہوا ہوگا، پھر حکم نے بھروچ پر حملہ کیا۔ ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے خشکی کے راستہ سے سندھ پر قبضہ کیا، اس طرح گویا عہد فاروقی ہی سے ہندوستان مسلمان مجاہدین کا مرکز توجہ رہا ہے۔

جہاں ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ متعدد صحابۂ کرام اور تابعین عالی مقام کی خواب گاہ ہے، وہیں ابوبکر ربیع بن صبیح سعدی البصریؒ، جو تابعین میں ہیں اور فن حدیث کے پہلے مصنف بلکہ "کشف الظنون" کے مصنف کے بقول تاریخ اسلامی کے اولین صاحب تصنیف گزرے ہیں، عباسی خلیفہ مہدی کے عہد میں واردِ ہند ہوئے اور یہیں پیوند خاک ہوگئے، اس ملک کی سعادت مندیوں اور خوش بختیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید کا سب سے پہلا ترجمہ ہندوستان

ہی کے ایک راجہ مہروگ کی خواہش پر ۲۷۰ھ میں ہندی زبان میں کیا گیا ہے

(عرب و ہند کے تعلقات: ۱۴۱)

ان تاریخی حقائق سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان پر اہل دین اور داعیان اسلام کی کیسی کچھ توجہ تھی؟ چنانچہ حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ (م ۴۶۵ھ)، خواجہ معین الدین اجمیریؒ (م ۶۲۷ھ) اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (م ۶۳۳ھ) جیسے اہل دل اسی ملک میں خیمہ زن ہوئے، رشد و ہدایت کی محفلیں آراستہ کیں اور یہیں آسودۂ خواب ہوئے، لیکن بدقسمتی سے ہندوستان پر جن مسلمان قبائل کو حکمرانی کا موقعہ ملا، وہ عرب نہیں تھے اور ان میں سے اکثر حکمراں وہ تھے جن کو اقتدار محبوب تھا اور اسلام سے ان کا تعلق بہت کمزور اور معمولی تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین حکمرانوں کو چھوڑ کر عام طور پر ان سلاطین نے اسلام کی دعوت واشاعت اور تبلیغ و توسیع پر کوئی توجہ نہیں دی اور ایک ایسی سرزمین جو ہدایت کی محتاج تھی اور جس کو معمولی سعی و کاوش کے ذریعہ اسلام کی طرف لایا جاسکتا تھا، ایمان سے محروم رہی، اسلامی تاریخ میں مشرک ممالک میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمانوں نے وہاں کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی ہو اور اس کے باوجود اس ملک کی اکثریت اسلام کی نعمت سے محروم رہی ہو۔

ہمارے ملک کا موجودہ جمہوری نظام اپنی بہت سی کمزوریوں کے باوجود ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس میں دعوتِ دین کے وسیع مواقع ہیں، لیکن آج بھی ہم نے اس پہلو پر بہت کم توجہ دی ہے، حالاں کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے اہم کام یہی ہے۔ تاریخ میں ہمیشہ جن قوموں کو جنگ کے میدان میں سرخمیدہ نہیں کیا جاسکا اور ایوانِ سیاست میں جن پر غلبہ حاصل نہیں ہوا، دعوتِ اسلام نے ان کو فتح کیا اور اسلام نے ان کے دل و دماغ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنالیا، اس کی سب سے بڑی مثال خود حیات نبوی ﷺ ہے، مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، صلح حدیبیہ کے موقع سے جو رفقاء آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد چودہ سو تھی، اس صلح نے امن و امان کی فضا فراہم کی اور آپ ﷺ کو کارِ دعوت کی طرف توجہ کا موقع ملا، اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے بعد جب فتح مکہ کے موقعہ سے آپ ﷺ تشریف لائے تو اس وقت آپ کے رفقاء کی تعداد دس ہزار سے بھی متجاوز تھی اور فتح مکہ کے دو سال بعد حجۃ الوداع میں جو صحابہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے ان کی تعداد ایک لاکھ سے بھی متجاوز تھی۔ غرض ۶ ہجری میں جو تعداد چودہ سو تھی صرف چار سال کے عرصہ میں وہ ایک لاکھ سے بھی آگے بڑھ گئی۔ ظاہر ہے یہ دعوتِ دین اور تبلیغ اسلام ہی کا کرشمہ تھا کہ جن لوگوں کو بدر واحد اور خندق وحنین میں فتح نہیں کیا جاسکا، اسلام کی دعوت نے ان کو غلام بے دام بنادیا۔

آج بھی ہندوستان میں اور پوری دُنیا میں مسلمانوں کے مسائل کا اصل حل یہی ہے۔ یہ وقت کا سب سے اہم کام ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ آج بھی اگر اس سمت میں تھوڑی سی سعی کی جائے تو منزل کو پانا دشوار نہیں:

درِ مئے خانہ وا ہے، سب کے لئے
شرط لیکن وفا ہے، سب کے لئے

(۳۰/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اس آگ کو بجھایئے!

اگر کسی گھر میں آگ لگ جائے تو آبادی کے تمام لوگ آگ بجھانے اور گھر کو بچانے دوڑ پڑتے ہیں اور ہر شخص اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ایک ساتھ دو بالٹی اٹھاتا ہے، کوئی ڈول دوڑ ول لے کر پہنچ جاتا ہے، کوئی لوٹا دو لوٹا ہی پانی ڈال دیتا ہے، چھوٹے بڑے امیر غریب جوان بوڑھے اور مرد وعورت ہر شخص اپنی طاقت اس بلاءِ ناگہانی سے بچنے بچانے میں صرف کر دیتا ہے، کیوں کہ اگر آگ پھیلی تو صرف اسی گھر کا نقصان نہیں ہوگا جس گھر میں آگ لگی ہو، بلکہ یکے بعد دیگرے سارے گھر جلیں گے اور پوری بستی خاکستر ہو کر رہ جائے گی، آگ ایسی کورچشم اور عدم ناآشنا ہے کہ اس کی سرشت میں من وتو کا کوئی امتیاز ہی نہیں، نہ امیر کا خیال کرتی ہے نہ غریب پر رحم کھاتی ہے، نہ طاقت اور حکومت والوں سے ڈرتی ہے نہ بے قصور رعایا اور کمزوروں پر اسے ترس آتا ہے، ایک بلاء بے درماں ہے جو زد میں آتا ہے اسے جلا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر دریا پانی سے لبریز ہو اور پشتہ ٹوٹنے کا خطرہ ہو، تو سارے لوگ اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی طاقت بھر پشتہ کو مضبوط کرنے اور پانی کو تھامنے کی تدبیر کرتا ہے، کیونکہ پانی بھی آگ ہی کی طرح بے رحم اور بے حس واقع ہوا ہے، کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، خوش رنگ پھلواریاں ہوں، ہرے بھرے کھیت ہوں، پر رونق آبادیاں ہوں، آبادی میں معصوم بچے رہتے ہوں، بے زبان جانور ہوں، بیمار اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے لوگ ہوں، اس کی تلاطم خیز موجیں کودتی پھاندتی، دوڑتی بھاگتی، ہر شئے کو غرقاب اور تہہ آب کرتی پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لئے آگ لگ جائے اور سیلاب آجائے تو ایک دوسرے سے

برسرِ پیکار دشمن بھی اپنی عداوتوں کو فراموش کر کے اس مصیبت کا سدِ باب کرنے کے لیے یک جٹ ہو جاتے ہیں۔

یہ آگ اور پانی کی مصیبتیں وہ ہیں جو ہمیں مادی نقصان پہنچاتی ہیں، جن کی وجہ سے ہمارے در و دیوار ویرانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، لیکن ایک اور آگ ہے جس کا نقصان اس نقصان سے بھی بڑھ کر ہے اور ایک سیلاب ہے جس کی تباہکاری اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہے، وہ ہے بُرائی اور بے حیائی کی آگ، جو انسانی آبادی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی ہے اور وہ ہے منکرات اور فواحش کا سیلاب، جس کی زد سے کوئی پکا اور کچا مکان محفوظ نہیں ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس آگ اور سیلاب کو بجھانے اور تھامنے کی ہمارے اندر کوئی فکر نہیں، یہ آگ گھر گھر کو سلگا رہی ہے اور یہ سیلاب اخلاق و کردار کی عمارتوں کو زمین بوس کرتا جارہا ہے، لیکن نہ اس پر بے چین ہونے والے دل ہیں، نہ اس پر رونے والی آنکھیں ہیں، نہ اس کے لئے جنبش میں آنے والے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ سماج کے بزرگوں کو اس کی فکر ہے نہ نوجوانوں میں اس کے مقابلہ کا عزم۔

بُرائی کی طرف میلان انسانی فطرت میں موجود ہے، اس کا مقابلہ اس کے بغیر نہیں کیا جاسکتا کہ جس قوت سے بُرائی پھیل رہی ہے اسی قوت سے بلکہ اس سے بڑھ کر بُرائی کو روکنے کی تدبیریں کی جائیں، اسی تدبیر کا نام قرآن مجید کی زبان میں "**نهي عن المنكر**" ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ امتِ محمدیہ کا ایک بنیادی مقصد نہی عن المنکر ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس کو اقوامِ عالم میں خیر امت یعنی بہترین انسانی گروہ کا لقب دیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۰) مسلمانوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ: "وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اس دوستی کا حق یوں ادا کرتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بھلائی کی دعوت دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔" (التوبہ: ۷۱) بُرائی سے روکنے والوں کو صالحین میں شمار کیا گیا ہے۔ (آل عمران: ۱۱۴) اور ارشاد ہوا کہ: "کم سے کم ایک ایسا گروہ ہمیشہ ضرور رہنا چاہئے جو خیر کی طرف دعوت دیتا ہو، بھلائی کا حکم دیتا ہو اور برائی سے روکتا ہو، کہ یہی لوگ دراصل کامیاب ہیں۔" (آل عمران: ۱۰۴)

قرآن کی اس تعبیر پر بھی غور کیجئے کہ بھلائی کو معروف اور برائی کو منکر سے تعبیر کیا گیا ہے، معروف کے اصل معنی ایسی بات کے ہیں جو لوگوں میں مروج اور مشہور ہو اور جس کا چلن قائم ہو گیا ہو، اس کے مقابلہ میں منکر کا لفظ ہے، یعنی ایسی بات جو ان پہچانی اور نامانوس ہو، گاہے گاہے پیش آجاتی ہو، اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سماج میں نیکیوں کا عام چلن ہونا چاہئے، وہ سماج کا مروج اور مشہور عمل ہو اور برائی کو سماج میں اتنا کم ہونا چاہئے کہ وہ لوگوں کے لئے اچنبھے کا باعث ہو، خلافِ معمول کبھی یہ بات پیش آجاتی ہو۔

اس تعبیر سے نہی عن المنکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی تاکید فرمائی اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب بُرائی کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے روکنے کی کوشش کرے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا کم سے کم درجہ ہے۔ (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۷) دل سے روکنے کا مطلب دو ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ دل سے اس پر کراہت محسوس کرے، دوسرے یہ کہ دل میں اس بات کا عزم رکھے کہ جب اسے قدرت حاصل ہوگی وہ اس بُرائی کو روکنے کی کوشش کرے گا، ہاتھ سے روکنے کا منشا مار پیٹ اور جنگ و جدال ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے اثر و رُسوخ اور اخلاقی دباؤ کا استعمال کرنا بھی اس میں داخل ہے، جیسے انسان دنیا کے مسائل میں اپنے رُسوخ اور اپنی حیثیت کو کام میں لاتا ہے، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بارے میں اسے اس سے بڑھ کر اپنی اخلاقی قوت استعمال کرنا چاہئے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ جن چیزوں کا برائی اور منکر ہونا متفق علیہ ہے اور جن کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی عوام تو کیا، اہلِ علم اور اہلِ دین بھی کھلے تساہل سے کام لیتے ہیں، اس سے کس کو اختلاف ہوگا کہ گانا بجانا حرام ہے، شادی بیاہ میں مروجہ تصویر کشی اور ویڈیو گرافی جس میں عورتوں کی بھی تصویریں محفوظ کر لی جاتی ہیں، ناجائز ہیں، اس سے کسے اختلاف ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بے جا مطالبات حرام ہے اور رشوت کے حکم میں ہے، کون نہیں جانتا کہ سودی کاروبار پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

لعنت ہے، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سماج کے با اثر لوگ جب علانیہ ان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جھوٹی شان بگھارتے ہیں، تو نہ صرف یہ کہ ہماری زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں، بلکہ ہم خود ان تقریبات میں شریک ہو کر رونق محفل میں اضافہ کرتے ہیں، ہم خود حرام اور ناجائز کاروبار کرنے والوں کی اہتمام اور احتشام سے معمور دعوتوں میں شریک ہو کر عملاً اس برائی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

حدیث میں اسی لئے برائی سے روکنے کو زبان کا جہاد (جہاد باللسان) قرار دیا گیا ہے، (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹) کیوں کہ نیکی کی دعوت آسان ہے، اگر آپ کسی کو نماز روزہ کی دعوت دیں، حج وزکوٰۃ کے لئے توجہ دلائیں تو اس سے اس کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی، نہ اس سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے، لیکن جب کسی انسان کو اس کی برائی پر ٹوکا جائے تو اس سے اس کی انا مجروح ہوتی ہے، وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بجائے وہ بے جا رد عمل کا اظہار کرتا ہے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بہت بڑا گناہ ہے (اکبر الذنب) ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم اللہ سے ڈرو، تو وہ جواب میں کہے: تم اپنی فکر کرو، **علیك نفسك** ۔

(مجمع الزوائد: ۷/۲۷۱)

جو چیز برائی پر ٹوکنے اور اس سے روکنے میں رکاوٹ بنتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں، ایک دنیا کی محبت، دوسرے اہلِ ثروت اور اہلِ اقتدار کا خوف، اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم میں دنیا کی محبت گھر کر لے گی تو تم نہ نیکی کا حکم دو گے اور نہ برائی سے روکو گے، اور نہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو گے۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۷۱) اور حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا: خبردار! کسی شخص کو لوگوں کی ہیبت حق جاننے کے باوجود حق کہنے سے باز نہ رکھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۰۰۸) یہ اس امت کے ادبار اور پستی کی علامت ہے کہ اس میں برائی پر ٹوکنے والی زبانیں باقی نہ رہیں، حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس دین کے اقبال کی علامت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں میں دین کا فہم ہو، اس میں ایک دو برے لوگ

ہوں تو وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اوراس دین کے ادبار کی علامت یہ ہے کہ عام لوگ گناہ میں مبتلا ہو جائیں، اکا دکا اشخاص دین پر قائم ہوں، وہ سماج میں ذلیل سمجھے جائیں اور بات کریں تو مطعون ٹھہریں، یہاں تک کہ علانیہ شراب پی جائے، ایک عورت قوم پر سے گذرے، قوم میں سے ایک شخص اس کی طرف کھڑا ہوا اور دامن اٹھا کر اس طرح برائی کرے جیسے کسی مادہ جانور کی دم اٹھا کر نر اس سے جفتی کرتا ہے، اس دن جو شخص یہ کہے کہ تم نے اس کو اس دیوار کے پیچھے تو کرلیا ہوتا، تو وہ اس دن اس میں ویسے ہی ہوگا جیسے تم میں ابوبکر وعمرؓ، اس دن جو نیکی کی طرف بلائے اور بُرائی سے روکے، اس کے لئے ایسے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا جس نے مجھے دیکھا ہو، میری اطاعت کی، مجھ پر ایمان لایا ہو اور میرے ہاتھوں پر بیعت ہوا ہو۔ (مجمع الزوائد: ۷/۲۶۲) بُرائی کے سیلاب کو دیکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ شاید اب وہ وقت قریب آ گیا ہے۔

بُرائی سے نہ روکنے کا گناہ صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ دنیا سے بھی متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے نہ روکیں، تو اللہ تعالیٰ کا عذاب سبھوں کو پکڑ لے گا اور جس قوم میں گناہ کیا جاتا ہو، کچھ لوگ اس سے دور کرنے پر قادر ہوں، پھر بھی وہ اسے دور نہ کریں، تو قریب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب کو اپنی پکڑ میں لے لے۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۵۳۸، ترمذی، حدیث مبر: ۲۱۶۸) رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے قریب ایک لشکر کے زمین میں دھنسا دیئے جانے کا ذکر کیا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: شاید ان میں ایسے لوگ بھی ہوں جنہیں زبردستی لایا گیا ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کے عذاب میں تو سب شامل ہوں گے، آخرت میں نیتوں کے اعتبار سے معاملہ ہوگا (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۱۷۱)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل میں اس طرح بُرائی کا آغاز ہوا کہ ایک شخص دوسرے کو اس برائی پر ٹوکتا اور کہتا کہ یہ حلال نہیں اور کل ہو کر اسی کا ہم نوالہ، ہم پیالہ اور ہم نشیں بن جاتا، چنانچہ یہی چیزیں بنی اسرائیل پر عذابِ الٰہی آنے کا باعث ہوئی۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۴۳۳۶) آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

کچھ لوگوں کے گناہ کی وجہ سے پوری قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے، بلکہ جب کچھ لوگ گناہ کرتے ہیں اور اکثریت قدرت کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کرتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عوام وخواص سبھوں کی ہلاکت کا فیصلہ ہوتا ہے، فذاك حين ياذن الله في هلاك العامة و الخاصة (مجمع الزوائد: ۷/۲۶۸)۔

یہ ضروری ہے کہ سماج کا ضمیر زندہ ہو، وہ بُرائی سے ایسی ہی نفرت کرتا ہو جیسے انسان گندگی سے نفرت کرتا ہے، سماج میں جب کوئی بُرائی ہو تو کتنی زبانیں ہوں جو اس پر ٹوکنے کے لئے آمادہ ہوں، جب ایک ہاتھ ظلم کرے تو سینکڑوں ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، جب کوئی نگاہ بُرائی کرے تو کتنی ہی غضب آلود نگاہیں اس کے حوصلے پست کر دیں، خدا کی نافرمانی پر انسان کو اپنی نافرمانی سے زیادہ طیش آئے، اپنے بھائی پر جب کوئی ظلم ہوتا ہوا دیکھے تو اسے محسوس ہو کہ یہ ظلم خاص اس پر ہو رہا ہے، جب وہ کسی آبرو کو لٹتے ہوئے دیکھے تو اسے خیال ہو کہ یہ عزت وآبرو کی مقتول عورت اس کی بہن یا بیٹی ہے، برائیوں کے بارے میں جب تک ضمیر زندہ نہ ہو حدود اللہ کی اہمیت انسان کے ذہن میں نہ ہو اور خدا کے خوف سے ہمارے سینے معمور نہ ہوں اس وقت تک برائیوں کے اس سیلاب کو تھامنا، بے حیائی کی اس آگ کو بجھانا اور بد اخلاقی کی اس تیز آندھی کو روکنا ممکن نہ ہوگا۔

……اور اب تبلیغی جماعت بھی

دہلی کے جنوب میں راجپوت نومسلموں کی ایک قدیم آبادی تھی، یہ میو کہلاتے تھے، اور اسی مناسبت سے یہ علاقہ میوات کہلاتا تھا، شجاعت و بہادری اور جنگ جویانہ صلاحیت متوارثاً ان کے رگ و ریشہ میں سرایت تھی، مسلمانوں کے عہد حکومت میں دارالسلطنت دہلی پر آئے دن ان کی طرف سے لوٹ مار ہوتی رہتی تھی، اور حکومتوں کو گاہے گاہے ان کی سرکوبی کے لئے باضابطہ فوج کشی کرنی پڑتی تھی، غالباً اسی وحشت و جہالت کی وجہ سے یہ ایک فراموش کردہ گروہ تھا، جو ایمان اور کفر کے درمیان زندگی گذار رہا تھا، عیدین، محرم، شب براءت اگر ان کے مسلمان ہونے کی پہچان تھی، تو دسہرہ، دیوالی، جنم اشٹمی اور ہولی بھی وہ کم جوش وخروش سے نہیں مناتے تھے، وہ برہمن سے شادیوں کے لئے تاریخ لیتے اور برہمن اور قاضی دونوں کے اشتراک سے رسم نکاح انجام دیتے، دھوتی مردوں کا عام لباس تھا، اور مسجدیں ان کی آبادیوں میں خال خال ہوتی تھیں، وہ بھی نمازیوں کے لئے مرثیہ خواں۔

اللہ تعالیٰ نے اس طبقہ کی اصلاح کا ایک غیبی نظام پیدا فرمایا کہ بستی نظام الدین دہلی میں (جو اس زمانہ میں گویا میوات کی سرحد تھی) ایک بزرگ مولانا محمد اسماعیلؒ قیام پذیر ہوئے، انہوں نے اس بھلائے اور ٹھکرائے ہوئے علاقہ کو اپنی کوششوں کی آماجگاہ بنایا، اور انہوں نے یہی ایک مکتب قائم کیا، وہاں میوات سے دینی تعلیم کے لئے بچوں کو لانے لگے اور اس علاقہ میں آمد ورفت کا سلسلہ شروع کیا، اس طرح میواتیوں میں محبت کی چنگاری جل اٹھی، انہوں نے سوچا کہ یہ کون ہے جو ٹھکرائے ہوؤں کو گلے لگاتا ہے! اور اس

طرح اس سرکش قوم کا ایک گروہ بارگاہ اسماعیلی میں سرخمیدہ ہونے لگا، مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے بعد ان کے بڑے فرزند مولانا محمد صاحبؒ نے اس جگہ کو سنبھالا، اور اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا، محبت کی جو تخم بوئی گئی تھی، اس کی جڑیں کچھ اور مضبوط ہوئیں، مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد ایک ایسے شخص نے اس مسند کو سنبھالا جو محبت کا سوداگر تھا، جس کے رگ وریشہ میں امت کا پیار سمایا ہوا تھا، جس کا دل دردمند ہر لمحہ امت کے لے تڑپتا اور پھڑکتا رہتا تھا، اور جس کی آنکھیں انسانیت کے غم میں شب وروز آنسوؤں سے وضو کیا کرتی تھیں، جس کی زبان لکنت زدہ تھی، لیکن اخلاص وایمان کی حرارت اور درد دل کی گھلاوٹ کی وجہ سے وہ لوہے کو موم اور شعلہ کو شبنم بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی، وہ شخصیت تھی مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی، جو مولانا محمد اسماعیل کے صاحبزادے اور مولانا محمد کے برادر خورد تھے۔

وہ اس وقت مظاہر علوم سہارن پور میں اچھے خاصے، کامیاب اور مقبول مدرس تھے، اور ہر طرح کے بارغم سے آزاد، لیکن خدا نے جس کو غم سہنے اور غم اٹھانے کے لئے پیدا کیا ہو وہ کیوں کر اس بوجھ سے آزاد رہ سکتا ہے؟ میواتیوں کی فکر اور ان کی بے دینی کا غم مولانا کو سہارن پور سے میوات لایا، اس وقت مولانا کے پاس سرمایہ زندگی کچھ بھی نہ تھا، البتہ اللہ پر توکل کی متاع گراں مایہ ساتھ تھی، اور بارہا ایسا بھی ہوتا تھا، کہ آپ فاقہ مستی کی لذتوں سے اپنے آپ کو شادکام فرماتے تھے، میوات میں مدارس کے لئے مالی وسائل فراہم کرنا تو دور کی بات ہے، لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے بھی روادار نہیں تھے، ان حالات میں آپ نے گاؤں گاؤں قیام مکاتب کی تحریک چلائی، اور بے شمار مکتب قائم فرمائے، لیکن میوات میں جہالت وبددینی کا جو طوفان تھا، مکاتب کے یہ کمزور دیئے ان کو روکنے میں چنداں مؤثر ثابت نہیں ہوئے، اور مولانا کی بے قراری بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ جب ایک مکتب کا حافظ جذبۂ مسرت وافتخار کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، اور آپ نے دیکھا کہ اس کی داڑھی منڈی ہوئی ہے، اور وضع قطع میں کہیں مسلمانیت کا کوئی رنگ نہیں، تو آپ اور بے چین ہوگئے، اور اس نے امت کے اسیر غم کو اور بھی گھلانا شروع کردیا۔

یہاں تک کہ شوال ۱۳۴۴ھ میں دوسری بار حج کے لئے روانہ ہوئے، جب مدینہ سے واپسی کا وقت آیا تو مولانا پر ایک عجب اضطرابی کیفیت طاری تھی، ایسی کہ جیسے ایک غلام نے طئے کرلیا ہو کہ اپنے آقا سے دامن مراد بھرے بغیر چوکھٹ چھوڑے گا نہیں، یہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں دعوت واصلاح کا وہ طریقہ ڈالا جو آج تبلیغی تحریک کے نام سے معروف ہے، مولانا کو خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور ارشاد فرمایا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے، تمہیں ہندوستان واپس جانا چاہئے، ۲۹؍ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ کو جامع مسجد سہان پور میں مولانا نے اس سلسلہ کا پہلا خطاب فرمایا، دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے افراد کی تشکیل کی، پھر انہی دِنوں میں دعوت کے اصول مقرر فرمائے، ابتداء میں آپ نے دعوت کے مضمون کو اتنی وسعت دی تھی کہ وہ ۶۰؍تک پہونچ گئے، لیکن ظاہر ہے کہ مولانا جس طرح امت کے ہر طبقہ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، ان کے لئے احکام دین کی اتنی طوِیل فہرست کو سنبھالنا ممکن نہیں تھا، اس لئے تجربہ سے مختصر کرتے ہوئے، مولانا نے اس تحریک کو چھ نکات پر مرتکز فرمادیا، ایمان، اخلاص، نماز، ذکر، علم، اور اکرام مسلم، یہ ایسی باتیں ہیں، جن پر امت کے تمام طبقات کا اتفاق ہے، اور جس سے کسی مسلمان کے لئے اختلاف کی گنجائش نہیں، یہ گویا امت کے لئے کلمہ سواء کا درجہ رکھتا ہے۔

قدرت نے انسان کو پانی فراہم کرنے کے دو ذرائع رکھے ہیں، ایک کنواں، اور دریا جہاں پیاسے خود پہنچتے ہیں، دوسرے بادل جو پانی کی کشکول اٹھائے، دردر کا چکر لگاتا ہے، اور خود پیاسوں کو پانی پہونچاتا ہے، مولانا چاہتے تھے کہ جیسے مدارس اور خانقاہیں، علم و اصلاح کے سرچشمے اور سمندر ہیں ویسے ہی علم کا ایک بادل بھی اٹھے اور وہ بے طلبوں تک دین کا آبِ حیات پہونچائے، کہ انبیاء کے یہاں اشاعت دین کے یہ دونوں طریقے موجود تھے، ایک طرف لوگ دار ارقم (مکہ) اور صفہ (مدینہ) پہونچ کر انوار نبوت سے اپنے سینے معمور کرتے تھے، تو دوسری طرف مکہ کی گلیوں، طائف کے بازاروں اور عرب کے دور دراز قبیلوں تک خود آفتاب نبوت پہونچتا تھا، اور جو لوگ نورِ حقیقت سے ناآشنا تھے، ان میں اس کی طلب پیدا کرتا تھا۔

مولانا کو اس بات پر پورا یقین تھا کہ دعوت الی اللہ کا جو نہج رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا، وہی سادہ طریقہ مفید و کار آمد ہے، اس لئے سادگی اور رسمیات سے آزاد ہوکر کام کرنے اور اللہ کے سامنے رونے دھونے، گڑگڑانے، مانگنے اور تڑپنے، التجا کا ہاتھ پھیلانے اور رات کی تنہائیوں کو نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی سے آباد رکھنے کے ذریعہ ہی اس کام کو تقویت حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ اسی طریقۂ و نہج پر مولانا نے اس تحریک کو شروع کیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک امت کے غم میں گھلتے، اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے فکر مند رہے، اور اسی کے برگ و بار بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ۲۱ر رجب ۱۳۶۳ھ شنبہ کو ٹھیک اذان فجر کے وقت جب صبح صادق طلوع ہو رہا تھا، اصلاح امت کی فکر میں اپنے سینہ کو جلانے والا یہ چراغ بجھ گیا اور تحریک کے بزرگوں کے مشورہ سے آپ کے فرزند ارجمند، داعی الی اللہ مولانا محمد یوسف صاحب کو آپ کا جانشیں منتخب کیا گیا، اور آپ کا عمامہ بزرگوں کے ہاتھوں مولانا یوسف صاحب کے زیب سر ہوا۔

مولانا یوسف صاحب کو ابتداءً کار دعوت سے کچھ زیادہ اشتغال نہیں تھا، لیکن اپنے والد ماجد کی آخری زندگی میں اس طرف توجہ ہوئی، پھر تو وہ اس تحریک کے لئے یوسف مصر بن کر درخشاں ہوئے، اور ان کے روئے عالمتاب سے مشرق و مغرب تک اس تحریک کی روشنی پہونچی، ۲۹ر ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ کو ایک دعوتی سفر کے دوران آپ کی وفات ہوئی، مولانا کو امت کا درد اور ان کی فکر والد ماجد سے بکمال و تمام میراث میں ملی تھی، انہیں کم مدت ملی، لیکن، اس پوری مدت وہ ایک ''سکوں نہ آشنا پارہ'' کی طرح تڑپتے، اور میکدۂ عشق کے دیوانوں کو تڑپاتے، اگر مولانا الیاس صاحب کو لکنت موسی سے نسبت حاصل تھی تو مولانا محمد یوسف صاحب نے بلاغت ہارون سے حصہ پایا تھا، اور ان کا خطاب دلوں کی دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتا تھا، مولانا نے اپنے آخری خطاب میں جو فکر انگیز باتیں فرمائی، ان سے بالکل صرف نظر کر کے گذر جانا طبیعت کو گوارہ نہیں، آپ نے فرمایا:

امت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والے کا نام نہیں،
بلکہ سینکڑوں، ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جڑ کر امت بنتی ہے، جو کوئی

کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے، وہ امت کو ذبح کرتا ہے، اور ٹکرے ٹکرے کرتا ہے، اور حضور ﷺ اور صحابہ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے، امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہلے خود ہم نے ذبح کیا، یہود و نصاری نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا، اگر مسلمان اب بھی امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکیں گی، ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے، لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم! ہتھیار اور تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی۔ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی، امت میل ملاپ اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی، بلکہ جب بنے دوسروں کے لئے اپنا حق اپنا مفاد قربان کیا جائے گا، حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اپنے اوپر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا۔

(سوانح مولانا انعام الحسنؒ: ۱/۱۵۰)

غور کیجئے! اور ان الفاظ میں جھانکئے کہ ان کے ہر بُن مو سے امت کی محبت کا کیسا جذبۂ بے پایاں ظاہر ہوتا ہے!

مولانا کی وفات کے بعد مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ اس تحریک کے تیسرے امیر منتخب ہوئے، مولانا نہ صرف اس قافلہ کے اولین شرکاء میں تھے، بلکہ وہ مولانا الیاس صاحب کے وقت سے ہی گویا اس تحریک کے دماغ تھے، جنہوں نے مولانا عبید اللہ بلیاویؒ مولانا محمد عمر پالنپوریؒ اور دوسرے رفقاء کے ساتھ اس تحریک کو دنیا کے کونے کونے تک پہونچایا، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کے عہد میں یہ تحریک دنیا کی سب سے وسیع الاثر تحریک بن گئی، اور اب شاید ہی کوئی ملک ہو جو اس کے فیض سے محروم ہو، ۱۰ رمحرم ۱۴۱۶ھ کو مولانا کا انتقال ہو گیا، اور اب تحریک نے اجتماعی قیادت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے

تحریک کے تین آزمودہ کار شخصیتوں کو اس کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے منتخب کیا، ان میں سے مولانا اظہار الحسن صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، اور اب دو جواں سال اور جواں حوصلہ ذمہ دار مولانا محمد سعد صاحب اور مولانا محمد زبیر صاحب اس عالمگیر تحریک کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے حوصلہ وہمت اور تدبر وفراست میں اضافہ فرمائے، اور اس سفینہ کو ساحل مراد سے ہم کنار رکھے۔

تبلیغی جماعت نے ہمیشہ سے اپنی یہ پالیسی رکھی ہے کہ پارلیمانی اور غیر پارلیمانی سیاست سے دور رہتے ہوئے خالص مذہبی امور کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے، اللہ کے بندوں کو اللہ کے گھر تک لایا جائے، ان میں خوف آخرت کے تحت عمل کا جذبہ ابھارا جائے، اسی لئے اس جماعت کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہاں آسمان کے اوپر یا زمین کے نیچے کی باتیں ہوتی ہیں، لیکن اب ہندوستان کی فرقہ پرست تنظیموں کو اس غیر سیاسی، شور اور شورش سے دور، خالص مذہبی جماعت میں بھی دہشت گردی کی بو آنے لگی ہے، ڈھاکہ، رائی ونڈ اور بھوپال کے اجتماع کو بنیاد پرستی کی جڑ قرار دیا جا رہا ہے، اگر پروین تو گاڑیہ اور اشوک سنگھل جیسے اسیران نفرت ایسی بات کہیں تو کیا تعجب کہ چند ماہ پہلے کلدیپ نیر جیسے سیکولر خیال کئے جانے والے صحافی کے قلم سے بھی ایسی بے سروپا باتیں اخبارات میں آئیں، نہ معلوم ان حقیقت ناشناس اور سچائی سے عداوت رکھنے والے صحافیوں کے تیغ قلم سے کتنی سچائیوں کا خون ہوگا، اور اس خون ناحق سے جھوٹ اور نفرت کی کھیتی بارآور کی جائے گی۔

یہ ایک بہت بڑی سازش ہے جس کا مقصد ایک ایسی تحریک کو نقصان پہونچانا ہے جو پر رونق شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قریوں، دیہاتوں، اور کم آباد صحراؤں اور جنگلوں تک دین کو پہونچانے اور مسلمانوں میں اپنا مذہبی شناخت پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہے اور آج اس کا نفع ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر جگہ سر کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، میں دین کے تمام کاموں کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مختلف تنظیموں اور تحریکوں کے کاموں کو اختلاف کار کے بجائے تقسیم کار خیال کرتا ہوں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ

دعوت وتبلیغ کی یہ تحریک جتنی دور رس اثر کی حامل ہے، اور جتنی انقلاب خیز اور اثر انگیز اور طریقہ کار کے اعتبار سے سادہ اور آسان ہے اور جس طرح قدم قدم پر خدا سے لولگانے کا عادی بناتی ہے، وہ ایک نمونہ ہے، ایسا نہ ہو کہ اعداء اسلام کو مسلمانوں کے باہمی اختلاف بلکہ غلط فہمیوں سے فائدہ اٹھا کر امت کے اچھے کاموں کو نقصان پہونچانے کا موقع ملے، حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت کی ضرورت ہے، کہ مسلمانوں کا ایک گروہ باران حق کا امین اور سحاب رحمت بن کر بے طلبوں تک پہونچے اور ان میں طلب اور پیاس پیدا کرے اور یہ تحریک عملاً اس وقت اس کام کو انجام دے رہی ہے۔

(۲۰۰۲/۸/۳۰ء)

وقت کا جہاد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (الانفال:٦٠)

’’اور جہاں تک ممکن ہو دشمنانِ اسلام کے مقابلہ کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے دشمنوں کو خائف کرسکو، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کے راستہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کو ناپسند کیا ہے، کہ وہ غفلت اور بے خبری کی زندگی بسر کریں۔ پھر قرآن نے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ دشمن کے مقابلہ اپنی بھرپور طاقت کو مجتمع رکھنا چاہیے، اس میں ایسی تعبیر اختیار نہیں کی گئی جس سے صراحتاً عسکری و فوجی قوت ہی مراد ہو، قوت میں عسکری اور غیر عسکری، مادّی اور معنوی ہر طرح کی قوت شامل ہے، البتہ آگے جنگی گھوڑوں سے خاص فوجی طاقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اس کی مخاطب ہیں جو دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی بیان فرمایا کہ اس طاقت کا مقصود دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا اور دنیا کے امن و

آشتی پر غارت گری کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد دشمن کی حریصانہ نظر کو خوف زدہ کرنا اور ان کے جارحانہ حوصلہ کو توڑنا ہے۔ اسی کو قرآن نے تُرْهِبُوْنَ بِهٖ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایسی طاقت جو دشمن کو مرعوب کرنے والی ہو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، جس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ طاقت کی تیاری (اعدادِ قوت) میں سرمایہ اور مالی تعاون کی ضرورت بھی پڑسکتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے جو کچھ خرچ کیا جائے، وہ اللہ کے راستہ ہی میں خرچ کرنا ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قیامت تک انسانیت کے لیے رہبر و رہنما ہے، اسی لیے قرآن میں ایسی تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں جو ہر دَور کا ساتھ دے سکیں اور ہر زمانہ کے وسائل پر ان کی تطبیق آسان ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں قوت مہیا رکھنے کی بات بہت ہی معنی خیز اور قابل توجہ ہے۔ ہر دَور میں طاقت کا ایک ہی سبب نہیں ہوتا، بلکہ مختلف ادوار میں آلاتِ قوت اور اسبابِ طاقت جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں ایک بہت بڑی طاقت ذرائع ابلاغ ہیں۔ ذرائع ابلاغ کسی گروہ کو بامِ اقتدار پر پہنچاتا بھی ہے، اور تختۂ دار پر لٹکاتا بھی ہے، وہ چاہے تو بے قصوروں کو جرم کے کٹہرے میں کھڑا کردے اور چاہے تو مجرموں کو معصوم و بے گناہ بنادے، سماج کا دل و دماغ ذریعۂ ابلاغ کی مٹھیوں میں ہے، اس لیے میڈیا اس دَور کی بہت بڑی طاقت ہے، اور یقیناً ''اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' میں شامل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نبی بنائے گئے، تو آپؐ نے اس کے اعلان اور ایمان کی دعوتِ عام کے لیے خاص طور پر صفا کی چوٹی کا انتخاب فرمایا۔ یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں، بلکہ اہل مکہ کا طریقہ تھا کہ جب بھی کسی اہم بات کی خبر دینی ہوتی، صفا کی چوٹیوں پر چڑھ کر آواز لگاتے، یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، جس سے لوگوں کو باخبر کرنا مقصود ہے، اس لیے تمام اہل مکہ اہتمام کے ساتھ جمع ہوجاتے اور گوش برآواز ہوکر اس اعلان کو سنتے، گویا یہ اس زمانہ میں مکہ کا سب سے بڑا ذریعۂ ابلاغ تھا۔ جس طرح آج پورے شہر تک کسی خبر کو پہنچانے کے لیے اخبارات کا سہارا

لیا جاتا ہے اور اس میں اشتہارات شائع کرائے جاتے ہیں، اسی طرح اس دور میں صفا کی پہاڑی سے اعلان کئے جاتے تھے۔

سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر بھی دعوتِ اسلام کا کام کیا کرتے تھے، حالانکہ اس زمانہ میں حج میں بہت سی منکرات اور برائیاں اہل مکہ نے اپنی طرف سے شامل کر لی تھیں، یہاں تک کہ بعض لوگ احترام کے نام پر کعبہ کی بے احترامی کرتے تھے اور مرد دن میں اور عورتیں رات میں بے لباس طواف کیا کرتے تھے، منیٰ اور عرفات میں اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش کے بجائے لوگ اپنے آباء واجداد کی تعریف کے نغمے گاتے اور اشعار پڑھتے تھے، عکاظ کا میلہ تو خالص تجارتی میلہ تھا، اس میں وہ تمام رنگ رلیاں ہوا کرتی تھیں اور شراب وکباب کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں جو عیش کوشیوں اور سرمستیوں بلکہ بدمستیوں کے لوازم میں سے ہیں، لیکن اس میلہ میں بھی آپ ﷺ پہنچتے اور لوگوں تک حق کی دعوت پہنچاتے، اہل مدینہ حج کے اجتماعات کے ہی برکت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے اور پھر ایسے جاں نثار ہوئے کہ تاریخ عالم میں ایسی جاں نثاری اور خودسپردگی کی مثال نہیں ملتی۔

ان اجتماعات میں جانا اور وہاں دعوتِ حق پہنچانا اس زمانہ کے طاقتور ترین اور وسیع الاثر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کی بہترین مثال ہے، اس لیے اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانا اور ان تک رسائی حاصل کرنا صرف مصلحت کا تقاضا نہیں، بلکہ اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ افسوس کہ جہاں اور بہت سے پہلوؤں سے ہم نے غفلت کی راہ اختیار کی ہے، وہیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے ہماری بے توجہی بھی ایک قومی گناہ سے کم نہیں۔

یہودیوں کے کم تعداد میں ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر ان کے غلبہ کا اصل راز یہی میڈیا کی طاقت ہے، جس نے ان کی پروپگنڈہ کی صلاحیت کو بے پناہ کر دیا ہے، دس سال پہلے کے اعداد وشمار کے مطابق پوری ریاستہائے متحدہ امریکہ سے مجموعی طور پر یہودیوں کے ایک ہزار سات سو انسٹھ روزنامے شائع ہوتے ہیں، ماہنامے،

پندرہ روزے، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ جرائد اس کے علاوہ ہیں۔ (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۸) یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہودی اخبارات ورسائل صرف امریکہ اور یورپ میں چھپتے ہیں، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک ان کی آماجگاہ ہیں، خود عالمِ اسلام میں ترکی سے یہودیوں کے آٹھ ہفت روزے اور دو ماہنامے، مراکش سے دو ہفت روزے، دو ماہنامے اور چار سالنامے اور ایران سے ایک ہفت روزہ شائع ہوا کرتا ہے۔ سنگاپور اور فلپائن جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی ان کے جرائد ورسائل کی تعداد بالترتیب دس اور نو ہیں۔

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی پانچ کمپنیاں ہیں، ان میں سے چار یہودیوں کی ہیں، اے بی سی، سی بی ایس، این بی سی۔ ان کمپنیوں کے ذریعہ صرف امریکہ میں سات سو سے گیارہ سو تک ٹیلی چینل کام کرتے ہیں اور اپنے پروگرام پوری دنیا میں سیاروں کے ذریعہ نشر کرتے ہیں۔ (دیکھئے: مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۰) یہودیوں کے زیر اثر شائع ہونے والے اخبارات اپنی تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے صفِ اوّل کے اخبارات و رسائل ہیں، مثلاً نیویارک ٹائمس کی اشاعت بارہ لاکھ سے زیادہ ہے، مشہور سائنسی رسالہ ریڈرس ڈائجسٹ کی تعدادِ اشاعت پونے دو کروڑ کے قریب ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب محض ۲،۹ فی صد ہے، لیکن ان کی ذرائع ابلاغ کی طاقت کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں کل ۶۵ / ملین روزنامے قارئین تک پہنچتے ہیں، ان میں سے ۶۲ / ملین اخبارات کے مالکین بھی یہودی ہیں، پھر اخبارات میں نوے فیصد کارکن یہودی ہیں اور ان کو پوری دنیا میں تقسیم کرنے کی سترہ سو پینتالیس ایجنسیاں اور اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب یہودیوں کے قبضہ میں ہیں۔ (مغربی ذرائع ابلاغ: ۱۲۹)

یہودیوں نے ذرائع ابلاغ پر غلبہ حاصل کر کے نہ صرف اپنی تجارت اور معیشت کو فروغ دیا، بلکہ اسے عیسائیت کی تباہی کا وسیلہ بھی بنایا۔ اس مقصد کے لیے یہودی ذرائع ابلاغ نے عریانیت اور آزاد جنسی تعلقات کی دعوت کو اپنا خاص موضوع بنالیا، مکالموں، نغموں اور تصویروں کے ذریعہ آبرو باختگی اور بے عفتی کو عیسائی معاشرہ میں اس درجہ رواج دیا کہ امریکہ و یورپ کا عیسائی سماج شراب و شباب کی بدمستیوں میں پوری طرح غرق

ہو چکا ہے اور اس طرح اس غفلت کوش، اپنے انجام سے بے خبر اور قوتِ عمل سے محروم معاشرہ پر یہودیوں نے مکمل معاشی غلبہ حاصل کرلیا ہے اور ان کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔

عیسائی دنیا کو تباہ کرنے کے بعد اب ان کا نشانہ عالم اسلام، عالم عرب اور مشرقی ممالک ہیں، مسلمانوں اور عربوں پر یہودی ذرائع ابلاغ کی دوہری یلغار ہے، ایک طرف فلموں، ڈراموں اور مکالموں کے ذریعہ تصور پیدا کیا گیا ہے کہ مسلمان عموماً اور عرب خصوصاً جاہل، شدت پسند، مجرم خو، قتل وخونریزی کے عادی، بے وقوف وکند ذہن، غریب وقلاش اور عیش پرست ہوا کرتے ہیں اور عرب، عورتوں کے دیوانے اور شہوت میں ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ انہیں اگر اس طرح کی کوئی رشوت دی جائے تو وہ فوراً رام ہو جاتا ہے ۔اسلامی شعائر کی بے حرمتی کے لیے بھی اشاعتی ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے، عریاں تصویروں کو قرآنی آیات کے ہالہ میں شائع کرنے کے کئی واقعات سامنے آچکے ہیں۔ مغربی میڈیا کا عربوں کے ساتھ کس قدر تمسخر آمیز اور توہین انگیز رویہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ C.N.N جیسی مشہور عالمی ٹی، وی کمپنی ایک صابن کا اشتہار اس طرح دیتی ہے: ''یہ صابن ہر چیز صاف کرسکتا ہے، حتیٰ کہ گندے عربوں کو بھی'' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی اور یہودی میڈیا اسلام سے، مسلمانوں سے اور عربوں سے کیسی نفرت کا صور پھونکتا ہے اور دنیا کے سامنے ان کی کیسی تصویر بناتا ہے۔

دوسری طرف ٹی، وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عالم عرب میں بے حیائی وفحاشی کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے، عالم عرب میں اپنی ذہانت اور قائدانہ صلاحیت کے اعتبار سے مصر کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے، اس لیے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی خطہ کو مغرب نے اپنا ہدف بنایا ہے۔ مصری ٹی، وی کے نو چینلوں سے روزانہ ۱۶۶/ گھنٹے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، ان میں دینی پروگراموں کا تناسب محض ساڑھے تین فیصد ہے۔ (مغربی میڈیا: ۲۰۳) مصر میں فلمیں اور ناولیں ایسے ناموں سے منظر عام پر آرہی ہیں کہ ان ناموں ہی سے شرم وحیا اور عفت وپاکبازی کا خون ہوتا ہے، اکثر عرب ممالک میں امریکی اور مغربی فلمیں (جو زیادہ تر یہودیوں کا نتیجہ

فکر ہوتی ہیں) دیکھی جاتی ہیں، یا ان کے عربی ترجمے ناظرین و قارئین تک پہنچتے ہیں۔ عالم عرب پر ان کا نہایت ہی منفی اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہندوستان پر حالیہ برسوں میں مغربی تہذیب و ثقافت جس قوت کے ساتھ حملہ آوری ہوئی ہے اور جس تیزی سے مغربی فیشن ہندوستان کے مشرقی سماج کو اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے، وہ ایک کھلی حقیقت ہے اور شاید ہی کوئی حساس دل ہو جو اس کی کسک کو محسوس نہ کرتا ہو۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ذرائع ابلاغ کی طرف توجہ دیں اور میڈیا تک رسائی حاصل کریں۔ ہندوستانی میڈیا پر سنگھ پریوار کے غلبہ کی وجہ سے مسلمانوں کو گذشتہ نصف صدی میں جو نقصان اٹھانا پڑا ہے وہ نا قابل تلافی اور نا قابل بیان ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسلمان اپنا اثر و رسوخ بڑھائیں، اس کے لیے منصوبہ بند طریقہ پر چند کام کرنے ہوں گے: اوّل ملک کے مختلف علاقوں سے ذہین و باصلاحیت مسلمان طلباء کو جرنلزم کا کورس کرانا اور انہیں انگریزی اور مقامی زبانوں کے اخبارات وغیرہ میں داخل کرنا، دوسرے جو لوگ صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہیں یا جو دوسرے ذرائع ابلاغ میں مصروفِ کار ہیں، وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات سے انہیں دعوت دینا اور مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے بارے میں ان کو صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنا، تیسرے اپنے مسائل آپ پیش کرنے کے لیے ایسے چینل قائم کرنا جس کی پالیسی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس کا خوشگوار تجربہ قطر کا الجزیرہ چینل ہے، جو غلط فہمیوں کو دور کرنے اور حقائق کو پیش کرنے میں بہتر کردار ادا کر رہا ہے اور خود مغربی ممالک تک بھی حقائق کو پہنچانے میں اس نے کسی قدر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو ایسی تدبیر اختیار کرنی ہوگی، تاکہ برادرانِ وطن کے قلوب میں شکوک وشبہات کے جو کانٹے چبھوئے جا رہے ہیں وہ انہیں نکالنے میں کامیاب ہو سکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا انگریزی اخبار ایک خواب ہے، نہ معلوم کہ تعبیر اس کی قسمت میں ہے یا نہیں؟ یہ بات نسبتاً آسان ہے کہ مختلف علاقوں کی مقامی زبان میں مسلمان اپنا اخبار نکالیں، جیسا کہ اس وقت ملیالم اور گجراتی زبان میں مسلمانوں نے اپنا

اخبار نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ گجرات کے حالیہ فساد میں ظلم و جور کا جو رقص ہوا ہے، اس میں بعض شر پسند گجراتی اخبارات کا بنیادی کردار ہے، جنہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط طریقہ پر پیش کیا اور ہندو عورتوں کی عصمت ریزی کی غلط اطلاع نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان مقامی زبانوں خاص کر ہندی میں اپنا اخبار نکالیں، کم سے کم ہندی، تمل، مراٹھی، اڑیا اور بنگالی زبانیں ایسی ہیں کہ صرف مسلمان قارئین کے ذریعہ اخبار کو زندہ رکھا جا سکتا ہے۔

غرض ذرائع ابلاغ عصر نو کا طاقتور ہتھیار ہے اور اس میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کرنا اور اس رسوخ کو دینی اور قومی مفادات کے لیے استعمال کرنا وقت کا بہت بڑا جہاد ہے۔ !

(۲۸/جون ۲۰۰۲ء)

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

انسان کو جو چیزیں مخلوقاتِ عالم سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں وہ صلاحیتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ایک عقل اور دوسرے قوتِ اظہار۔ عقل کا مرکز دماغ ہے، جو واقعات اور ان وقعات سے ثابت ہونے والے نتائج کو سمجھتا ہے اور اظہار کا ذریعہ و وسیلہ زبان ہے، جو دماغ کی فکر اور دل کے احساس کو دوسروں تک پہنچاتی ہے۔ کون انسان ہے جو اپنے خیالات اور جذبات کو ظاہر نہ کرتا ہو، لیکن سلیقۂ اظہار بھی بڑی چیز ہے۔ ایک شخص اپنا فسانۂ غم سناتا ہے تو انسان کا دل بھی نہیں پگھلتا اور یہی داستانِ الم اس شخص کی زبان سے سنئے جو زبان و بیان کا سلیقہ رکھتا ہو تو لگتا ہے کہ پتھر بھی موم ہو جائے گا، چہ جائے کہ انسان کا دل اپنی دھڑکنوں اور آنکھیں اپنے آنسوؤں پر قابو رکھیں، اسی سلیقۂ کلام و بیان کا نام ادب ہے۔ غرض ادب اپنے افکار اور احساسات کے ایسے اظہار کا نام ہے جو دل کی انگیٹھی کو سلگا سکے اور ذہن و دماغ کو اپنا اسیر بنا سکے۔

پس ادب اظہار کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ انسان اچھے مقاصد کے لئے بھی اس کو استعمال کر سکتا ہے اور اسی سے فساد و بگاڑ پھیلانے کا بھی کام لے سکتا ہے، لیکن افسوس کہ انسان نے اپنی اس عظیم اور امتیازی صلاحیت کا استعمال بہتر اور تعمیری مقاصد کے لئے کم اور خراب اور تخریبی مقاصد کے لئے زیادہ کیا ہے۔ اسلام سے پہلے شعر و ادب کے جو مکاتب گذرے ہیں، قریب قریب ان سب نے شعر و سخن کا موضوع ایسی چیزوں کو بنایا ہے جو نہ انسان کی فکر و اخلاق کی تعمیر میں معاون تھا اور نہ انسان کے حقیقی مسائل کو ابھارنے میں، روم و یونان ہو یا عرب و ایران۔ چار صنفیں تھیں جو ادیبوں کے فکر و خیالات کا محور بنی ہوئی تھیں ایک تو رجزیہ نظم و نثر، جس میں جنگ و جدال پر اُبھارا جاتا، اپنے ممدوح کی

بہادری اور شجاعت کا اظہار ہوتا اور اپنی فتح اور دشمنوں کی شکست کے مافوق العادت نقشے کھینچے جاتے، خود ہندوستان میں رامائن اور گیتا ایسے ہی ادب کا نمونہ ہے۔

دوسرا موضوع مرثیہ اور نوحہ و ماتم کا تھا، عرب شاعری نے بھی اس میں بڑا حصہ پایا ہے، کسی شخصیت کی موت کا ایسا نقشہ کھینچا جاتا گویا اس کی وفات سے زمین میں بھی زلزلہ بپا ہو گیا اور آسمان میں آنسوؤں کی برسات بہہ پڑی۔ ادب کا تیسرا موضوع تملق اور خوشامد ہوتا تھا، ادباء اور اربابِ سخن اپنی کاہلی اور سست گامی کے لئے مشہور تھے، بادشاہوں، رئیسوں، نوابوں کی خوشامد میں اشعار کہتے، انشائیہ لکھتے اور زمین کو آسمان سے ہم آغوش کر کے ایسی تعریفیں کرتے جو عقل و فہم سے بھی ماوراء تھے اور انعام و اکرام کی صورت میں اس کی قیمت وصول کرتے، اس لئے جھوٹ اور مبالغہ لوگوں کی عام بول چال میں ایک سنگین برائی ہے، لیکن شعر و سخن کی دنیا میں یہی سب سے بڑی خوبی، بلکہ ادب کا امتیازی وصف ہے۔ شعراء اور ادباء کا چوتھا موضوع حسن و عشق اور شراب و شباب رہا ہے، جن اخلاق سوز اور حیا باختہ باتوں کو کوئی شریف انسان اپنی مجلسِ احباب میں بھی نہیں کہہ سکتا، شعر و ادب کے نام پر انہی باتوں کو ادیبوں اور شاعروں نے مجمع عام میں گنگنانا اور اپنی تحریروں کے ذریعے چاردانگِ عالم میں پھیلانے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھی۔ یہ موضوع جوان سب میں زیادہ بگاڑ اور فساد کا موجب تھا، مشرق و مغرب کے ادب میں اسی قدر محبوب و مطلوب قرار پایا۔ کمیونزم کے ابھرنے کے بعد ادب میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا، جس نے بغاوت کا لب ولہجہ اختیار کیا اور پیٹ کو اپنا لیلائے مقصود بنایا۔ پیٹ ہی سے اس کی ابتداء ہے اور پیٹ ہی پر اس کی انتہاء ہے۔

ادب کی یہ ساری صنفیں انسانی سماج کو اخلاقی بگاڑ اور فکری انتشار کے سوا اور کچھ نہیں دیتیں، یہ انسان کو باغی اور دہشت گرد بناتی ہیں، خوشامد اور چاپلوس بناتی ہیں، محبوب کے گیسو و رخسار کا اسیر کرتی ہیں اور انسان کے سفلی جذبات ہی کو ان کا مقصد وجود بنا دیتی ہیں، یا پھر مال و دولت کا حریص اور ایک بھوکے جانور کی طرح شکم پروری کے لئے مضطرب و بیقرار کر دیتی ہیں۔ کیا ایسی شاعری اور ایسا ادب انسانی سماج کو کوئی نفع پہنچا سکتا

ہے اور کیا اس سے کسی سماج کی تعمیر اور کردار سازی میں مدد مل سکتی ہے؟ اسلام نے اس مزاج کو بدلا اور ایک ایسے ادب کو وجود بخشا جو صالح انقلاب کا داعی تھا، جو انسان کے اندر اپنے خالق و مالک کی محبت پیدا کرتا ہے، بغاوت کے بجائے محبت و ایثار کی تعلیم دیتا ہے، خوشامد کے بجائے حقیقت پسند بناتا ہے، محبوب کے نقش و نگار اور خد و خال کو بے پردہ کرنے کے بجائے شرافت و پاکیزگی اور حیا کی تعلیم دیتا ہے، زندگی کے حقیقی مسائل کو ابھارتا ہے اور پاکیزہ اخلاقی جذبات کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ ادب برائے ادب اور شعر برائے شعر کا قائل نہیں، بلکہ ادب برائے تعمیر و اصلاح کا قائل ہے۔

شعراء ادب کے اسی فرسودہ تصور کے اسیر ہو کر رہ گئے، جس کا مقصد خیالی شاعری اور خیالی جذبات نگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ آج کا ادیب و شاعر آسائش گاہوں میں بیٹھ کر غریبوں کا فسانہ بیان کرتا ہے اور جشن و طرب کی بزم میں سجا کر نوحہ و ماتم کرتا ہے۔ ایسے ادب میں دِلوں کی دنیا کو بدل دینے اور برف میں آگ لگانے کی صلاحیت کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے، جس شاعری میں اور ادب میں خونِ جگر شامل نہ ہو، جس کی تہوں میں درد انگڑائیاں نہ لیتا ہو، جس کے الفاظ کے پس پشت حقیقی معنوں میں درد و کسک نہ ہو، اس ادب سے کان کی لذّت کا سامان تو ہو سکتا ہے، دلوں کی دنیا نہیں بدل سکتی۔

اردو زبان اسلام کے آغوش میں پلی، اخلاق و شائستگی کی گود میں اس نے پرورش پائی، لیکن بدقسمتی سے اردو شاعری نے بھی جلد ہی حسن و عشق کی غلامی کو قبول کر لیا، یہاں تک کہ مولانا محمد حسین آزاد کو کہنا پڑا:

> ”یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے، یعنی مضامین عاشقانہ، میخواریٔ مستانہ، بیگل و گلزار، وہی رنگ و بو کا پیدا کرنا، ہجر کی مصیبت کا رونا، وصال موہوم پر خوش ہونا، دنیا سے بیزاری، ...... حسن و عشق، کے ...... مضمون اس قدر مستعمل ہوئے کہ سنتے سنتے کان تھک گئے ...... گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں، انہیں کو چباتے ہیں

اور خوش ہوتے ہیں، خیال کرو، اس میں کیا مزا رہا، حسن وعشق، سبحان اللہ، بہت خوب، لیکن تابہ کے؟ گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے، حسن وعشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وہ سو برس کی بڑھیا ہوگئی۔" (آبِ حیات)

یہی بات مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں کہی ہے اور اسی کو شاعر حق ترجمان علامہ اقبال نے فرمایا:

ہند کے شاعر وصورت گرو افسانہ نویس

آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اردو ادب میں اس بے سمتی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مغربی دنیا سے اتنے مرعوب ہوئے کہ شعر وسخن اور زبان وادب میں بھی ہم نے انہیں کو کعبۂ تقلید بنا رکھا ہے۔ ہندوستان کے اہلِ علم ونظر مغرب سے کس درجہ مرعوب تھے، اس کا اندازہ سرسید مرحوم جیسے صاحبِ نظر اور دردمند شخص کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے، جو ان کے خط کا اقتباس ہے۔ یہ خط اکتوبر ۱۸۶۶ء میں لندن سے لکھا گیا تھا۔

"بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، عالم سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم وتربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی نہایت اور لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے جانور کو۔" (مکاتیب سرسید: ۱۸/)

اسی لئے اقبالؒ کو ہندوستان کے ادباء وشعراء کو یہ آواز دینی پڑی کہ ؎

اٹھا نہ شیشہ گراں فرنگ کے احسان

سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

اسلامی ادب اور اسلامی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ سچی حقیقتوں اور صداقتوں کی ترجمان ہوتی ہے اور سماج کی اصلاح وتربیت کی خدمت انجام دیتی ہے، منظر نگاری اور

نظامِ فطرت کی عکاسی ادب کا ایک اہم حصہ ہے، عام شعراء اس سے آتش ہوس کو بھڑکاتے ہیں اور اسلامی شعروادب کا ترجمان اسی سے خدا کی یاد دلاتا ہے اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے جوڑتا ہے، غرض ایک ہی واقعہ کے بیان میں دونوں اپنے اپنے مزاج کے مطابق صالح اور فاسد فکر کا پیغام دیتے ہیں۔ اگر شعروادب کی زلفیں سنوارنے والے اور لوح وقلم کی بزمیں سجانے والے انسانیت کی تعمیر، سماج کی اصلاح اور انسانوں کے حقیقی مسائل کو پیش کرنے کی سعی وکوشش کو اپنی منزل بنالیں تو یقیناً ان کے ذریعہ ایک صالح انقلاب آسکتا ہے، اور دلوں کے درمیان تلاطم پیدا ہوسکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ہندوستان کے ادیبوں، شاعروں، دانش وروں اور اہلِ نظر سے اس موضوع پر تفصیلی خطاب کیا ہے، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ کاش! اقبالؔ کی یہ نوائے درد ہمارے ادیبوں اور ادب دوستوں کے کانوں سے ٹکرا کر نہ رہ جائے، بلکہ دل کی دنیا تک پہنچے۔ آپ ان اشعار کو پڑھئے اور دامن دل سے باندھئے!

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئی کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہو،
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

۱۷/ مارچ کے اخبارات میں ایک خبر چھپی ہے کہ بی۔ جے۔ پی کے سینئر قائد ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، جو خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ، پڑھے لکھے سیاسی لیڈر ہیں اور بی۔ جے۔ پی کے صدر بھی رہ چکے ہیں، آج کل سیاسی جوڑ توڑ کے علاوہ پنڈتوں اور جیوتشیوں سے بھی بڑے پیمانہ پر ملاقات کر کے مبارک اور منحوس کے ''فتوے'' حاصل کر رہے ہیں۔ پنڈتوں نے بڑے غور وفکر کے بعد انہیں بتایا کہ پارٹی کے مرکزی دفتر (جو ۱۱/ اشوک روڈ، دہلی میں واقع ہے) کے باب الداخلہ کے سامنے نیم کا درخت بی۔ جے۔ پی کے منزل اقتدار تک پہنچنے کے لئے راستہ کی رکاوٹ بنا ہوا ہے اور پورے ملک میں فرقہ پرستی کا رقص کرنے اور ظلم وجور کی آگ لگانے والے اس معمولی کڑوے درخت کے سامنے ایسے بے بس ہیں کہ اس کے نحس کو راہ سے ہٹا نہیں سکتے، چوں کہ اس درخت کے کاٹنے میں وقت در پیش تھی اس لئے باب الداخلہ کو بند کر دیا گیا ہے اور دوسری سمت کے دروازہ سے آمد و رفت کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

واجپائی جی کی حلف برداری کے لئے بھی دس بج کر نو منٹ کا وقت مقرر ہوا ہے اور اس کو ''شبھ گھڑی'' مانا گیا ہے، کہیں وقت کے اندازے میں غلطی نہ ہو جائے، اس کے لئے خصوصی طور پر ٹائم پیس خریدی گئی ہے اور وہ بھی چار عدد۔ ایک پارٹی کے دفتر میں رہے گی، ایک راشٹرپتی بھون میں، ایک واجپائی جی کے پاس اور ایک اڈوانی جی کے پاس۔

''شبھ گھڑی'' کا انتخاب کوئی نئی بات نہیں ہے، ملک کے آٹھویں وزیر اعظم نرسمہا راؤ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ، کئی زبانوں کے ماہر تھے اور دانشوروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، گو ملک کے سیکولر اور جمہوری کردار کو جو نقصان ان سے پہنچا ہے، وہ کسی ڈاکو اور غارت گر سے

بھی نہیں پہنچا، انہوں نے بھی اپنی حلف برداری کے لئے باضابطہ جیوتشیوں سے وقت لیا تھا اور ان کی دانشوری اس میں کچھ بھی مانع نہ ہو سکی۔ وزارت عظمیٰ ان کے لئے ایسی ''مبارک'' ثابت ہوئے کہ کسی طور کرسی صدارت سے اُترنے کو تیار نہ تھے، بالآخر ان کے رفقاء نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو اس کرسی سے نیچے اُتار پھینکا۔ اس کے بعد پارلیمانی پارٹی کی صدارت کا مرحلہ تھا اس عہدہ سے بھی وہ کسی طور سے سبکدوش ہونے کے لئے آمادہ نہ تھے، لیکن ان رفقاء نے بہ قول ان کے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جیسے بھرے دربار میں ''درو پدی'' کی ساڑی کھینچنے کی کوشش کی گئی اور کوئی اس کی حمایت کرنے والا نہ تھا، آخر ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' کے مصداق انہوں نے اس عہدہ کو خیر باد کہا اور آج کل اپنے گناہوں کے جال میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ کسی طرح چھٹکارا نہیں پاتے اور صورتِ حال یہ ہے کہ ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!''

اس سے بھی زیادہ حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو (جو بہت روشن خیال تصور کئے جاتے تھے) نے بھی حلف اٹھانے کے وقت جیوتشیوں سے مشورہ کیا تھا اور اسی لئے ۱۲/ بجے شب سے ۵/ منٹ پہلے حلف لینے کی خواہش کی تھی، ماؤنٹ بیٹن کے لئے بھی نہرو کی یہ بات خلاف توقع اور باعثِ حیرت تھی، وہ نہرو جیسے سائنٹفک ذہن کے آدمی سے اس کی ذرا بھی توقع نہیں رکھتے تھے، لیکن نہرو جی نے جیوتشیوں کے فلسفہ نفع ونقصان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

سائنس نے آج کتنی ترقی کر لی ہے، انسانی قدم نے چاند کے کلیجے کو روند دیا ہے، مریخ پر اس نے کمند ڈالا ہے، سمندر کی موجوں کو چیر کر وہ اس کی تہہ تک پہنچ گیا ہے اور کائنات کی ایک ایک شئی کو وہ اپنے علم وتحقیق کی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے، یہاں تک کہ اس نے حیوانات کی پیدائش کے لئے ایک مصنوعی نظام کا اختراع بھی کیا ہے، لیکن اگر انسان عقیدہ وایمان سے محروم ہو تو علم وتحقیق بھی اس کو اوہام کی غلامی سے آزاد نہیں کرا سکتا، وہ دُنیا کی ان حقیر چیزوں کو اپنی تقدیر کا مالک تصور کرنے لگتا ہے جو اس کی ٹھوکروں میں ہیں اور جن کو خدا نے خود اس کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔

اسلام نے انسانیت کوتوحید کا جو عقیدہ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے لئے بڑا اعزاز ہے۔ توحید یہ ہے کہ انسان صرف خدا ہی کو اس کائنات کا رب اور نفع و نقصان کا مالک تصور کرے اور اس بات کا یقین رکھے کہ خدا نے اس کے لئے جو کامیابی لکھی ہے، کوئی سازش اسے ناکامی سے بدل نہیں سکتی ہے اور خدا نے جو ناکامی مقدر کر دی ہے، کوئی تدبیر اس کو اس سے بچا نہیں سکتی۔ دریا ہوں یا پہاڑ، درخت ہوں یا مہر و ماہ، ستارے ہوں یا کوئی سا وقت اور مکان، یہ انسان کی قسمت اور تقدیر میں کوئی دخل نہیں رکھتے ہیں۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو توہمات کی دیوار کو زمین بوس کر سکتا ہے اور انسان کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور اپنی کتابِ تقدیر ان کے ہاتھ میں دینے سے بچاتا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی بعض مہینوں، جانوروں اور پرندوں کو منحوس خیال کیا جاتا تھا، لیکن عقیدۂ توحید نے اس قسم کے اوہام وخرافات کی ظلمتوں کو چاک کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شاہ تیمور نے ہندوستان کو فتح کیا اور جمنا پار کرنا چاہا تو جیوتشیوں نے منع کیا اور کہا کہ یہ نامبارک وقت ہے، تیمور کچھ زیادہ لکھا پڑھا آدمی تھا، نہ سائنسی علوم حاصل کئے تھے، نہ کسی زبان کا ماہر تھا نہ کسی یونیورسٹی کا فاضل تھا، لیکن مسلمان تھا، اس نے برجستہ انکار کیا اور کہا کہ اس طرح کی بات پر مشرکین اور تثلیث کے ماننے والے (عیسائی) یقین رکھتے ہیں، ہم مسلمان اور اہل توحید ایسی باتوں کا یقین نہیں کرتے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے عہد میں مصر کا علاقہ فتح ہوا، مصر میں مشرکانہ مذاہب مروج تھا۔ مصر کی زراعت کا دارومدار دریائے نیل پر تھا، اتفاق کہ مسلمانوں کے قبضہ کے بعد دریا خشک ہوگیا، گورنر سے اہل ملک نے کہا کہ دریا قربانی کا خواستگار ہے، ہم لوگ ہر سال ایک کنواری لڑکی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، اس کے بعد ہی پانی جاری ہوتا ہے، گورنر نے حضرت عمرؓ کے پاس اطلاع بھیجی، آپؓ نے ایک تحریر لکھی، یہ تحریر دریا کے نام تھی کہ ''اگر تو خدا کے حکم سے بہتا ہے تو جاری ہو جا، ورنہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو جا!''، آپؓ نے ہدایت فرمائی کہ اسے دریا میں ڈال دیا جائے، ایسا ہی کیا گیا اور دریا کا پانا ایسا جاری ہوا کہ پھر خشک نہ ہوا۔ (دیکھئے محمد رضا: الفاروق عمر بن خطاب ط: مصر ۲۷۲)

اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ نہ کوئی وقت منحوس ہے اور نہ کوئی جگہ، نہ کوئی درحت نامبارک ہے اور نہ کوئی جانور، برکت اور نحس کا تعلق خود اپنے عمل سے ہے۔ انسان کا برا عمل اور انسانیت کے ساتھ غیر انسانی رویہ سب سے بڑا نحس ہے اور حق اور سچائی پر استقامت اور انسانیت کے ساتھ بھلائی سب سے بڑا سببِ برکت اور ''شبھ'' ہے۔ جیوتشیوں سے مبارک و منحوس کے بارے میں استفسار کرنے سے بہتر ہے کہ انسان خود اپنے ضمیر سے (بشرطیکہ بالکل مردہ نہ ہو) اپنے اعمال اور رویہ کے بارے میں استفسار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات لمحۂ فکریہ ہے کہ توحید کا عقیدہ کتنی بڑی رحمت ہے، اس عقیدہ نے ایک خدا کے سامنے انسان کی جبین احترام کو ضرور ختم کیا ہے، لیکن اس نے کتنے ہی دروازوں پر جھکنے سے انسان کو بچایا ہے اور کتنے ہی توہمات کی پرستاری اور غلامی سے اسے نجات بخشی ہے۔ اسی کی طرح شاعر حق شناس علامہ اقبال نے اشارہ فرمایا ہے کہ:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰/اپریل ۱۹۹۸ء)

کامیابی کی کلید

طوفان اس لئے آتے ہیں کہ اپنی تباہ خیزیوں کے ساتھ گذر جائیں، موجیں اس لئے متلاطم ہوتی ہیں کہ ساحل کو روند کر واپس چلی جائیں، آتش فشاں اس لئے پھوٹتے ہیں کہ زمین کے سینہ میں جولاوے چھپے ہوئے ہیں وہ باہر آکر ساکت وجامد ہوجائیں، ان کی ہلاکت خیزیاں اور تخریب انگیزیاں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ ان کے پنجۂ استبداد سے بچ نہیں سکے گا، لیکن ان کو ثبات ودوام حاصل نہیں ہوتا، انسان کی شخصی اور اجتماعی زندگی میں بھی ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ جس سے دل لرزنے اور قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، لیکن اصل میں یہ اس کے لئے آزمائش کے لمحات ہیں، اگر وہ کچھ دیر اس میں استقامت کا ثبوت دے، کم ہمتی سے دوچار نہ ہو، جذبات سے مغلوب نہ ہو اور رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہوکر کوئی غیر دانشمندانہ اقدام نہ کر بیٹھے، تو یہی مصیبت اس کے لئے راحت کا مقدمہ اور یہی وقتی پستی اس کے لئے سربلندی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مؤمن کو قرآن نے ایسے مواقع پر دو باتوں کا حکم دیا ہے، صبر اور صلوٰۃ ___ صبر کیا ہے؟ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی عزیز وقریب کی موت پر رونے دھونے سے اجتناب کا نام "صبر" ہے، لیکن حقیقت میں صبر کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور اس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، صبر کے معنی برداشت کرنے کے ہیں، قوت برداشت بہت بڑا جوہر ہے اور اس قوت سے محرومی بہت بڑا عیب ہے، جس آدمی میں قوت برداشت ہوتی ہے، اس میں تدبیر کی صلاحیت ہوتی ہے، اور وہ مخالفت سازشوں سے نمٹنے کی مؤثر کاروائی کرسکتا ہے، انبیاء کو چوں کہ سب سے زیادہ مخالف حالات سے گذرنا پڑتا ہے، اس لئے ان میں حلم و بردباری اور مخالفت کو سہنے کی صلاحیت من جانب اللہ سب سے زیادہ ودیعت ہوتی ہے،

میرا افشاء یہ نہیں ہے کہ صبر کا مطلب بزدلی اختیار کرنا، اور حوصلہ ہار جانا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حکمت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہئے، اور اپنے جذبات کو بے محل خرچ کرنے سے بچنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں قدم قدم پر اس کی مثالیں ملتی ہیں، صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہلِ مکہ کی جانب سے ایک جتھے نے مسلمانوں پر حملہ کیا جو کم و بیش چالیس افراد پر مشتمل تھا، ظاہر ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں کے جان کے درپے ہو کر حملہ آور ہوئے تھے، اور ان کی حقیقی سزا یہ تھی کہ یہ جس مقصد کے لئے آئے تھے، وہی رویہ ان کے ساتھ اختیار کیا جاتا یعنی انہیں قتل کر دیا جاتا یا کم سے کم وہ قید کر لئے جاتے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں یوں ہی رہا فرما دیا، کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یقیناً جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی اور اس سے چاہے جانی یا مالی نقصان کسی بھی فریق کا ہوتا، لیکن عربوں میں اسلام کے تئیں نفرت اور بڑھ جاتی، کیوں کہ وہ حرم کا بے حد احترام کرتے تھے، انہیں خیال ہوتا کہ مسلمانوں نے اب حرم کی حرمت کو بھی پامال کرنا شروع کر دیا ہے، یہ ہوش کو جوش اور حکمت و مصلحت کو جذبات پر غالب رکھنے کی ایک مثال ہے۔

حضور ﷺ کی زندگی کا ایک معرکہ ''غزوۂ بنو مصطلق'' کے نام سے معروف ہے، اس غزوہ میں ایک انصاری اور حضرت عمرؓ کے غلام کے درمیان معمولی سی بات پر کچھ تیز و تند، گفتگو ہوگئی، پھر انصاری نے اپنی مدد کے لئے انصار کو، اور حضرت عمر کے غلام نے مہاجر کو آواز دی، اور اس طرح دو افراد کا جھگڑا دو گروہ کا جھگڑا بن گیا، عبد اللہ بن اُبَی جو نفاق کے مرض میں مبتلا تھا، بلکہ گروہ منافقین کی قیادت کرتا تھا، اور کسی ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، جس سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہونچے، اس نے اس موقع کو اپنی ناشائستہ حرکت کے لئے بہت غنیمت جانا، اور انصار کو یہ کہہ کر برانگیختہ کیا کہ مہاجرین کے معاملہ میں تمہاری مثال عربوں کے اس محاورہ کی سی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو، کہ وہ تمہیں ہی کاٹ کھائے ''سمن كلبك ياكلك'' عبد اللہ بن ابی کی اس ریشہ دوانی کی اطلاع حضور کو ایک کمسن انصاری صحابیؓ نے دی، جب آپ نے عبد اللہ بن ابی کو بلا کر استفسار فرمایا تو وہ صاف مکر گیا، کچھ دوسرے بزرگ انصار جو عبد اللہ بن ابی

کے نفاق سے واقف نہیں تھے، انہوں نے بھی عبد اللہ بن ابی کی حمایت کی، اس موقع پر قرآن مجید کی آیت ان کمسن انصاری صحابیؓ کی تصدیق میں نازل ہوئی، حضور ﷺ نے ازراہِ شفقت ان کی گوش مالی کرتے ہوئے، ارشاد فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق کی ہے۔

حضرت عمرؓ پر حق کا جوش غالب رہتا تھا، انہوں نے آپ سے اجازت مانگی، کہ عبد اللہ بن ابی کی گردن ماردی جائے، اگر حضور ﷺ اس کی اجازت مرحمت فرماتے تو یقیناً یہ بجا ہوتا، کہ ''الفتنة اشد من القتل'' لیکن آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا تا کہ اگر میں ایسا کروں تو انصار کو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے، اور لوگ بھی ایسا سوچیں گے کہ محمد ﷺ خود اپنے رفقاء کو قتل کرا رہے ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور صحابہؓ کو کوچ کرنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ اس پورے دن، رات اور آئندہ دن دو پہر تک خلاف معمول چلتے رہے، یہاں تک کہ صحابہؓ تھک کر چور ہو گئے تو آپ نے پڑاؤ کرنے کا حکم فرمایا، اس مسلسل سفر کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اتنا تھک جائیں کہ انصار و مہاجرین کے درمیان جو تلخی وہاں پیدا ہو گئی تھی، اس کا اثر جاتا رہے، پھر ایک وقت آیا کہ خود عبد اللہ بن ابی کے صاحبزادے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ بہت مخلص مسلمان اور نبی کریم ﷺ کے خاص محبین میں تھے، انہوں نے درخواست کی کہ میں اپنے والد کے نفاق سے واقف ہوں، اور اگر آپ ﷺ کا حکم ہو تو میں خود انہیں قتل کر سکتا ہوں، آپ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد ہوا کہ جب تک کوئی شخص اپنے آپ ﷺ کو مسلمان ظاہر کرے گا، میں اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا ہی معاملہ کروں گا، پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو یہ صورت حال بتائی کہ اگر ہم اس وقت عبد اللہ بن ابی کے قتل کا حکم دیتے تو اس سے بعض مخلص مسلمانوں کو بھی غلط فہمی ہو سکتی تھی، لیکن اب یہ صورتِ حال ہے کہ خود ان کے بیٹے ان کا سر قلم کرنے کو تیار ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی رائے میں برکت رکھی ہے، بارك الله فى راى رسوله

یہ وہی حکمت و مصلحت اور ہوش کو جذبات اور جوش پر ہوش کو غالب رکھنے کی بات

ہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس کی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں، موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ اس صورتِ حال کو سمجھیں، اگر ہم نے مغلوب الجذ بات ہو کر چند پتھر پھینک دیئے، تو اس سے یقیناً دوسروں کا کچھ خاص نقصان نہیں ہوگا اور نہ اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا، البتہ اس سے آپ کے لئے بہت زیادہ نقصان ومضرت کا اندیشہ موجود ہے، کوئی انسان کتنا بھی ظالم اور بدخو ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو اپنے ظلم وجور کے لئے کوئی دلیل ہاتھ آجائے، خواہ وہ کمزور سے کمزور تر کیوں نہ ہو، شیطان نے بھی اپنی عدول حکمی کے لئے ایک دلیل دریافت کرلی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مادۂ تخلیق اس کے مادہ تخلیق سے کمتر ہے، اس لئے وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کرے گا۔

اگر ہم مشتعل اور بے برداشت ہوکر کوئی معمولی سی حرکت بھی کر گزریں تو جو لوگ اپنے سینوں میں بغض چھپائے رکھتے ہیں، ان کو اپنی زیادتی کے لئے سند جواز ہاتھ آجاتی ہے، گویا ہم اپنے ہاتھوں ان کو اشتعال کا ہتھیار دے دیتے ہیں، پھر لوگ واقعات اور اس کے اصل محرکات کو نہیں دیکھتے، بلکہ ظاہری سبب کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اس لئے ایسے مواقع پر سوچنا چاہئے کہ کون سا قدم ہمارے مقصد کے لئے مفید ومعاون ہوگا، مثلاً یہی افغانستان پر امریکہ کے ظالمانہ حملہ کی بات ہے، اگر ہم حکومت سے نمائندگی کریں کہ وہ اس معاملہ میں مظلوم کی طرفداری یا کم سے کم غیر جانبداری کو برقرار رکھے، تو یہ ایک معقول بات ہوگی، اسی طرح مغربی اور عالم اسلام کے سفارت خانوں سے بھی ملاقاتیں کر سکتے ہیں اور ان کے سامنے اپنے جذبات رکھ سکتے ہیں، لیکن اگر ہم اس مقصد کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں تو اس سے ہمارے مقصد کو تو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوگی، لیکن فرقہ پرست طاقتوں کے کاز کو ضرور تقویت ملے گی، اور یہ ہمارے لئے کس قدر نقصاندہ ہوگا، وہ محتاج بیان نہیں۔

خدا کی مدد کا دوسرا ہتھیار ''صلوٰۃ'' ہے صلوۃ کے اصل معنی نماز کے ہیں، نماز ایک ایسی عبادت ہے، جس میں انسان خدا کے سامنے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچھا دیتا ہے، اور پیشانی سے لے کر پاؤں تک انگ انگ خدا کی بندگی میں مشغول ہوتا ہے، اس لئے نماز

دراصل رجوع الی اللہ کا عنوان ہے، یعنی مشکل حالات میں انسان اپنے رب کی طرف پوری طرح رجوع ہو جائے، وہ خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی رکھ دے، کہ ہم محتاج ہیں تو غنی، ہم فقیر ہیں تو داتا، تو ان ہاتھوں کو خالی واپس نہ فرما، خدا کی طاقت بے پناہ ہے، یوں تو روز و شب خدا کی قدرت کو ہم دیکھتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ قدرت اسباب کے پردہ میں ظہور پذیر ہوتی ہے، کبھی کبھی خدا کی طاقت اسباب سے آزاد ہو کر بھی انسان کے مشاہدہ میں آتی ہے، غور کرو کہ جب حضرت موسیٰ اور قوم بنی اسرائیل کا پیچھا کرنے کے لئے فرعون کا لشکر جرار جمع ہو رہا تھا، اور کبر و غرور سے مغرور ہو کر نکل رہا تھا، تو لوگ یہی دیکھ رہے تھے کہ یہ لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے چل رہا ہے، لیکن اللہ کے یہاں یہ بات مقدر تھی، کہ ان کا یہ اجتماع خود ان کے نیست و نابود ہونے کا ذریعہ بن جائے گا چنانچہ وہی ہوا، بدر کے معرکہ میں بڑے بڑے سورما اور بہادر مکہ سے چلے آئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہارے سامنے ڈال دیا ہے، ان کے جوش و خروش کو دیکھ کر لوگوں کو خیال گذرا ہوگا کہ یہ تو مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، لیکن کسے خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سورماؤں کو اس لئے جمع کر رہا ہے کہ خود ان کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور مکہ کو اپنے ضدی سرداروں سے نجات مل جائے، آئندہ اہلِ مکہ کے لئے دعوتِ حق کو قبول کرنا آسان ہو، غزوۂ احزاب میں اتحادیوں کی ایک پہاڑ جیسی فوج اس لئے جمع ہوئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ تمام اسلام مخالف طاقتوں کو متحد و مربوط کر دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ اس آخری کوشش کی ناکامی کے بعد ہمیشہ کے لئے ان کی ہمت ٹوٹ جائے، اور خود ان کی صفیں بکھر جائیں۔

اس لئے ہمیں خدا کی طرف اور اس کے خزانہ و طاقت سے مدد لینا چاہئے، پھر اس کے لئے نہ کوئی چیز انہونی ہے اور نہ کوئی بات ناممکن، وہ چاہے تو وقت کی سپر طاقتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا دے، اور اپنے کمزور بندوں کو آہن و فولاد سے زیادہ طاقتور، دعاء کا مقصد یہی ہے کہ مومن خدا کے غیبی خزانہ سے اپنا مدعا حاصل کریں، ___ یہی صبر اور رجوع الی اللہ اللہ کی مدد کی کلید اور کامیابی کا ہتھیار ہے اور بے صبری اور خالق کے بجائے، مخلوق پر

بھروسہ، مؤمن کے لئے ناکامی و نامرادی کا پیش خیمہ، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ سے مدد چاہو، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یہ آخری فقرہ صبر کی مزید تاکید کے لئے ہے، کیوں کہ صبر ایک مشکل کام ہے یہ اپنے جذبات کی آگ کو اپنے آپ بجھانا، اور نفس کے تقاضوں کو آپ قتل کرنے کے مترادف ہے، انسان کا کسی مقصد کے لئے یکبارگی جان دیدینا، نسبۃً آسان ہے، لیکن کسی کاز کے لئے گھٹ کر مرنا اور مسلسل اپنے جذبات کو تختۂ دار پر چڑھانا بہت دشوار، اسی لئے شاعر نے خوب کہا ہے:

سلگنا اور شئی ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا
ہوا ہے کام جو ہم سے وہ پروانوں سے کیا ہوگا

موجودہ حالات میں ہمیں اپنے آپ سلگنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہئے، ہمارے دل حوصلہ و ہمت سے معمور ہوں، ہمارے جذبات کی لگام حکمت و شعور کے ہاتھوں میں ہو، ہماری پیشانی میں خدا کے یقین کا نور ہو، اور ہمارے ہاتھ اپنے خالق کے حضور اٹھے ہوئے ہوں، یہی ہمارے لئے کامیابی کا راستہ ہے اور اسی طرح ہم اللہ کی مدد کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

(۹؍نومبر ۲۰۰۱ء)

راہِ عمل ۲

حقائق اور غلط فہمیاں

جس میں اسلام اور شریعتِ اسلام سے متعلق ملکی و عالمی سطح پر پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور پروپیگنڈوں کا سنجیدہ جائزہ لیا گیا ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات اور اس کی عقل و فطرت اور حکمت و مصلحت سے ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تالیف

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مقدس مسجد اُردو بازار، کراچی

از

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

کتاب کا نام ——— راہِ عمل ۲ حقائق و غلط فہمیاں

تاریخ اشاعت ——— جون ۲۰۰۹ء

مطبع ——— احباب زمزم پبلشرز

ناشر ——— زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دار الہدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
BI1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

۱۹۹۸ء سے روزنامہ منصف حیدرآباد نئی اور خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ اور نئی انتظامیہ کے تحت شائع ہونے لگا، اس موقع سے اخبار کے منتظمین نے اس حقیر سے خواہش کی کہ ہر جمعہ کو اخبار کے لئے ایک خصوصی کالم لکھا کروں اور اس کو ''شمع فروزاں'' کا عنوان دیا گیا، چوں کہ اخبار کی رسائی کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اور عوام و خواص، مرد و خواتین، چھوٹے اور بڑے سبھی اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اگر صحیح استعمال ہو تو یہ خیر کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم الحروف نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

چنانچہ شروع سے آج تک ہر جمعہ کو یہ کالم اس حقیر کے قلم سے ہوتا ہے، جس میں کوشش کی جاتی ہے کہ پیش آنے والے نئے حالات اور تازہ واقعات کے پس منظر میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا جائے، تاکہ لوگ محسوس کریں کہ یہ ایک زندہ اور زندگی سے مربوط مذہب ہے، اس کالم کے تحت ان غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو اسلام سے متعلق پیدا کی جارہی اور پھیلائی جارہی ہیں۔ عام لوگوں کی استعداد اور ان کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے ان مضامین میں خالص علمی و تحقیقی انداز اختیار کرنے کے بجائے تذکیری اور دعوتی رنگ کو غالب رکھا جاتا ہے اور اس رنگ میں کوشش کی جاتی ہے کہ علمی دلائل بھی آجائیں، چنانچہ ۱۹۹۹ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک جو مضامین شائع ہوئے، ان میں سے اسلام سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالہ پر مبنی تحریروں کا یہ مجموعہ ''حقائق اور غلط فہمیاں'' اشاعت پذیر ہورہا ہے۔

شمع فروزاں کالم کے تحت شائع ہونے والے مضامین کو محفوظ رکھنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے تھا، افسوس کہ نہیں ہوسکا اور بعض مضامین باوجود تلاش بسیار کے نہیں مل پائے، لیکن جو کچھ مضامین دستیاب ہوئے، اس کے لئے عزیزی مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی سلمہ شکریہ کے مستحق ہیں، انہوں نے بڑی محنت سے جن مضامین کی زیراکس کاپی محفوظ تھی، ان کو تاریخ کے لحاظ سے مرتب کیا، پھر جو مضامین نہیں مل سکے، ان کے لئے مختلف جگہ سے اخبارات جمع کرنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک مضامین کو اکٹھا بھی کر لیا، اس کے بعد چند ہی مضامین ہیں، جو حاصل نہیں کئے جاسکے، پھر انہوں نے ان مضامین کو موضوع کی مناسبت سے الگ

الگ مجموعوں کی شکل دی، جن میں سے ایک اس وقت آپ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان سے دین اور علم دین کا زیادہ سے زیادہ کام لے، اور اس حقیر مجموعہ کو شکوک و شبہات کے ان کانٹوں کو نکالنے میں مفید و مؤثر بنائے، جو مغرب کی جانب سے بوئے جارہے ہیں، وہ مغرب جو اونٹ کو نگلتا اور مچھر کو چھانتا ہے اور جو شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر برسانے کا عادی ہے۔

و باللہ التوفیق وھو المستعان .

۲۲/رجب ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۷/ستمبر ۲۰۰۴ء

(خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

عرض مرتب

اس دنیائے بے ثبات میں حق و باطل اور خیر وشر کا معرکہ ہمیشہ سے گرم رہا ہے، جب بھی حق نے اپنی چادر رحمت کو پھیلایا، باطل نے اس کا پیچھا کیا، انبیاء کرام کی تاریخ اس معرکہ سے بھری پڑی ہے، کہ جب بھی کسی نبی نے راہِ حق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، لوگوں نے اس کا انکار کیا اور غلط فہمیاں پھیلا کر قبول حق سے لوگوں کو باز رکھا، اسلامی تاریخ کو بھی اس طرح کی کشمکش کا سامنا رہا ہے، چنانچہ آج بھی غلط فہمیاں پیدا کرنے والوں کی نمائندہ تحریکیں زیادہ منظم اور منضبط طور پر اپنی تخریبی کاروائیوں میں دن و رات مشغول ہیں، اور جہاں مستشرقین نے مغرب میں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں اور بے جا اعتراضات پھیلانے کا سہرا اپنے سر لیا ہے، وہاں ایشائی ممالک میں بھی ان کے زیر اثر بہت سی تنظیمیں اس سلسلہ میں سرگرم عمل ہیں، ہندوستان کے پس منظر میں وشوہندو پریشد اور آر۔ ایس۔ ایس والے اس سلسلہ میں جو کردار ادا کر رہے ہیں، وہ اہل علم کی نظروں سے مخفی نہیں۔

ان اسلام مخالف غلط فہمیوں کو ہوا دینے میں مغربی تہذیب وثقافت کا خاص رول رہا ہے، کیوں کہ مغربی تہذیب جس راہِ حیات کی حامل ہے، وہ اسلام کی مذہبی قدروں اور انسانی فطرتِ سلیمہ کے مغائر ہے۔ پردہ، طلاق، تعدادِ ازدواج، عورتوں کے حقوق اور دائرہ کار ان موضوعات میں سے ہے، جو اس وقت اسلام کے خلاف مغرب کی یلغار کا خاص موضوع ہے، ان کی سوچ میں تضاد اور عملی بھی ہے، وہ ایک طرف عورتوں کے خلاف ہونے والے مظالم کے مقابلہ آواز بھی بلند کرتی ہیں اور دوسری طرف عورتوں کی عصمت ریزی پر عائد ہونے والی سزاؤں پر احتجاج سے بھی گریز نہیں کرتیں اور قرآن نے جو اس سلسلہ میں زنا کی سزا متعین کی ہے، اسے عقل انسانی کے خلاف اور انسانی تکریم کے مغائر سمجھتی ہیں۔

آج جب کہ بھی میڈیا نے اسلام اور مسلمان مخالف جذبات کو ہوا دینا اپنا خاص مشغلہ بنا رکھا ہے، ان حالات میں اگر کوئی غلط فہمی ان کے ہاتھ آجائے تو اسے وہ اپنا کمال سمجھتے ہیں اور اس کی نشر و اشاعت میں اپنی پوری کوشش صرف کر دیتے ہیں، ظاہر ہے ان غلط فہمیوں کا ازالہ علماء کی ایک اہم ذمہ داری ہے، جس کے لئے ان کے اندر علمی گہرائی و گیرائی کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانہ کے اندازِ فکر اور مسائل کو مصالح شریعت اور عقل انسانی سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کی صلاحیت درکار ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ (ناظم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد و جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کو اللہ تعالیٰ نے جہاں فقہ اسلامی میں مہارت اور شانِ امتیاز عطا کیا ہے، وہیں احکامِ شریعت کی مصلحتوں اور فطرتِ انسانی اور عقلِ سلیم سے ان کی ہم آہنگی پر بھی ان کی گہری نظر ہے، نے اپنی توجہات کا مرکز ان غلط فہمیوں کو بھی بنایا اور اسلام کے خلاف پیدا جانے والی غلط فہمیوں کا شریعتِ اسلامی اور انسانی عقل سلیم کے تناظر میں مثبت اور دلچسپ انداز میں جواب دیا ہے اور جہاد، تعدد ازدواج، پردہ، طلاق، ذبح حیوان، یونیفارم سول کوڈ، تبدیلی مذہب جیسے اہم موضوعات ___ جن کے بارے میں عام طور پر غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں ___ پر مدلل اور بصیرت مندانہ گفتگو کی ہے، تقریباً چھ سالوں سے آپ ہندوستان کے کثیر الاشاعت اُردو روزنامہ "منصف" حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن "مینارۂ نور" میں "شمع فروزاں" کے عنوان سے ہر ہفتہ سماجی، سیاسی، نئے مسائل اور اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں جیسے موضوعات پر اپنا مضمون سپردِ قلم کرتے ہیں، زبان و بیان کی سلاست و شگفتگی اور رعنائی نیز عام فہم ہونے کی وجہ سے یہ مضامین عوام و خواص میں یکساں طور پر مقبول ہیں؛ اس لئے عام دنوں کے مقابلہ جمعہ ایڈیشن خاصی زیادہ تعداد میں شائع ہوتا ہے، یہ مجموعہ روزنامہ منصف میں شائع شدہ ان ہی مضامین کا گلدستہ ہے، احقر نے روزنامہ منصف کی فائلوں سے ان مضامین کو جمع کیا، جو یقیناً احقر کے لئے باعثِ سعادت ہے، جس سے عملی زندگی میں احقر نے بہت ہی فائدہ بھی محسوس کیا اور اب افادۂ عام کی غرض سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، اس مجموعہ میں مولانا مدظلہ کا ۲۴ آیتیں نامی رسالہ بھی شامل ہے، جو اصل میں وی۔ ایچ۔ پی والوں کی طرف سے قرآن مجید کی جن ۲۴ / آیتوں کو نشانہ بنایا گیا ہے، اس کا جواب ہے، جو روزنامہ منصف میں ہی پہلی بار سات قسطوں میں شائع ہوا تھا، اس کا ہندی اور گجراتی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ کتاب اسلام کے خلاف پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالہ کا سبب بنے، اس کا نفع زیادہ سے زیادہ عام ہو اور یہ حقیر کوشش مصنفِ کتاب حضرت الاستاذ مدظلہ کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذخیرہ آخرت بنے۔

۲۲ / رجب ۱۴۲۵ھ

محمد نعمت اللہ قاسمی

۸ / ستمبر ۲۰۰۴ء

(ڈپلوما ان انگلش المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہ!

حال ہی میں وی، ایچ، پی لیڈر گری راج کشور کا نہایت ہی مذموم، غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان آیا ہے کہ قرآن وحدیث کے مضامین میں تبدیلی ہونی چاہئے، اور بقول ان کے جن آیات واحادیث میں غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، اُن کو نکال دینا چاہئے، یہ بیان نا معقول بھی ہے، اور ناشائستہ بھی، ناشائستہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے مذہبی مآخذ پر حملہ کرنے کے مترادف ہے، نامعقول اس لئے کہ کسی بھی تحریر و بیان میں صاحبِ تحریر ہی کو تبدیلی کا حق حاصل ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کوئی بات کہے، اور دوسرا شخص اس بات کو واپس لے لے، اس سے قطعِ نظر کہ مسلمان قرآن کو اللہ کا کلامِ حق ترجمان اور حدیث کو منشاءِ ربانی کا بیان سمجھتے ہیں، خالص عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ نہایت ہی نامعقول بات ہوگی، لیکن اس قسم کے غیر دانش مندانہ مطالبات مسلمانوں کے لئے کوئی اچنبھے کی چیز نہیں ہیں۔

جس عہد میں قرآن مجید نازل ہوا، اس وقت بھی مشرکین نے یہی مطالبہ کیا تھا، اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی یہی جواب دلایا گیا تھا کہ ہماری کیا مجال کہ ہم قرآن کو بدل دیں، یا ہم اپنی طرف سے کوئی بات لے آئیں، ارشاد ہے:

> جب ان پر ہماری آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے، جو واضح ہیں، تو جن لوگوں کو (آخرت میں) ہماری ملاقات کا یقین نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لے آؤ، یا اس میں تبدیلی کردو، آپ فرمادیں: مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں؟ میں تو صرف ان احکام کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، اگر

میں اپنے رب کی نافرمانی کروں، تو مجھے برے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (یونس:۱۵)

غور کیجئے! کہ وی ایچ پی نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ کس قدر مشرکین مکہ کے مطالبہ کے مطابق ہے، زمانہ مختلف ہے، لب ولہجہ میں فرق ہے، زبان وبیان کا اختلاف ہے، لیکن فکر ونظر اور قلب وذہن کے فساد میں کیسی یکسانیت ہے: كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (البقرۃ:۱۱۸) اور ظاہر ہے کہ آج بھی امتِ مسلمہ اس کا وہی جواب دے گی، جو اس کے پیغمبر نے دیا تھا، کہ یہ ہماری تصنیف یا ہمارے خیالات نہیں ہیں، بلکہ یہ احکامِ خداوندی ہیں، ہماری مجال نہیں کہ اس میں کوئی تبدیلی کریں، اگر ہم نے اس میں ایک شوشہ کی تبدیلی بھی گوارا کی، تو آخرت کے عذاب سے نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

اور یہ کچھ مشرکین مکہ ہی پر موقوف نہیں، بلکہ ہر عہد میں گمراہ، خدا بیزار اور حقیقت ناشناس لوگ ایسی نامعقول اور ناشائستہ باتیں کہتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے قوم بنی اسرائیل کا واقعہ تو واضح طور پر ذکر کیا ہے، کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی طرف سے توراۃ لے کر آئے، تو یہود (جن کی پوری تاریخ اللہ کے احکام سے سرکشی وسرتابی، انبیاء ورُسل کے ساتھ استہزاء وتمسخر، اور ایذاء رسانی، نیز ظلم وجور سے عبارت ہے) نے اس کے احکام کو ماننے سے انکار کر دیا، ان کا مطالبہ تھا کہ اسے آسان کیا جائے اور اس میں جو سخت احکام آگئے ہیں، انہیں بدل دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس سرکشی کو دیکھتے ہوئے ان پر کوہِ طور کو اٹھالیا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو احکام دیئے ہیں، انہیں مضبوطی سے تھامو، اور اسے یاد رکھو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے پیس دیئے جاؤ گے "وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ، خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَافِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" (البقرۃ:۱۶۳) تب جا کر انہوں نے سرِ تسلیم جھکایا، اور احکامِ الٰہی کو قبول کیا۔

انسان جیسے خود فانی ہے، اس کے خیالات وافکار بھی فانی اور ناپائیدار ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے باخبر اور فطرت کائنات کا خالق

و مالک ہے، اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل برابر ہے، اس کا کوئی حکم عدل کے خلاف اور واقعہ کے مغائر نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کا کوئی قانون توازن اور اعتدال سے خالی ہوسکتا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی کی بات سوچنا بھی بے وقوفی اور نادانی ہے، قرآن نے اس بات کو بہت واضح طور پر کہا ہے:

> آپ کے رب کی بات پوری ہوگئی، سچائی اور عدل کے اعتبار سے،
> کوئی نہیں جو اس کے احکام کو بدل دے، وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے،
> جو لوگ زمین میں ہیں، اگر آپ ان کی اکثریت کی بات ماننے لگیں، تو وہ
> تو آپ کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں گے، وہ تو محض گمان کی پیروی کرتے
> ہیں، اور محض اٹکل لگاتے ہیں، (الانعام: ۱۱۵، ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زبان سے کہلایا کہ کیا اللہ کے سوا میں کسی اور حاکم کو تلاش کرسکتا ہوں؟ جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر تفصیلی کتاب اُتار دی ہے "اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا" (الانعام: ۱۱۴) یعنی یہ ایسا ناپاک خواب ہے جو قیامت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا؟

یہ کہنا کہ قرآن و حدیث میں نفرت کی تعلیم دی گئی ہے، کھلا ہوا بہتان اور اتہام ہے، قرآن انسانوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت سکھاتا ہے، قرآن اس بات سے منع کرتا ہے کہ انسانوں کا کوئی طبقہ دوسرے انسانوں کو ذلیل وحقیر سمجھے، قرآن کہتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ ہیں، اور آدم وحوا ہی سے تمام انسان پیدا ہوئے ہیں، یہ انسانی وحدت کا تصور جہاں مساوات کی بنیاد فراہم کرتا ہے، وہیں ایک خاندان اور ایک کنبہ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے اُنس ومحبت کا برتاؤ بھی سکھاتا ہے، قرآن نے مسلمان اور غیر مسلم میں فرق کیئے بغیر کسی بھی نفسِ انسانی کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا" (المائدہ: ۳۱) اگر اسلام نے غیر مسلموں سے نفرت کی تعلیم دی ہوتی تو یہ بھی کہا ہوتا کہ مسلمان دوسری قوموں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں، لیکن قرآن نے صاف اعلان کیا

کہ مذہب کے معاملہ میں کسی طرح کا جبر واکراہ درست نہیں، "لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ:۲۵۶)

اسلام تو امن وامان اور صلح وآشتی کا مذہب ہے، اور قرآن وحدیث میں قدم قدم پر اس کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ جو غیر مسلم مصالحانہ رویہ اختیار کریں، اور تمہارے ساتھ صلح وآشتی کی زندگی گذارنا چاہیں، تم بھی ان کے ساتھ صلح کا راستہ اختیار کرو: وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا، وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانفعال:۶۱)

قرآن نے مسلمانوں سے برسرِ پیکار غیر مسلموں سے مقابلہ کی تلقین کرتے ہوئے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا جن سے مسلمانوں کا صلح وامن کا معاہدہ ہو، چنانچہ ارشاد ہے:

> ان لوگوں سے قتال نہ کرو جو ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو، یا وہ تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں اور نہ اپنی قوم سے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط فرما دیتا، پھر وہ تم سے جنگ کرتے، اگر وہ تم سے جنگ کرنے سے گریزاں ہیں، اور تم سے صلح چاہتے ہیں، تو اللہ نے تمہارے لئے ان کے خلاف جنگ کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے، (النساء:۹۰)

کتنا واضح حکم ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں، ان کے حقوق کے غاصب نہ ہوں، اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کی راہ نہ اختیار کرتے ہوں، ان سے نہ جنگ وجدال کی اجازت ہے، اور نہ نفرت وبیگانگی کی گنجائش، ہاں! جو لوگ مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے درپے ہوں، اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی سوداگری کرتے ہوں، ان سے یقیناً جہاد کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہ صرف اسلام کی تعلیم ہے، بلکہ دنیا کے تمام مہذب قوانین میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے بنیادی حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔

گری راج کشور کے بیان کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بیان میں نہ صرف اسلام کی بلکہ ہندو مذہب کی بھی توہین کی ہے، انہوں نے اپنے طور پر اس بات کا

ذمہ لیا ہے کہ وہ ہندو مذہبی کتابوں میں تبدیلی کے لئے تیار ہیں، اولاً تو کشور صاحب کوئی مذہبی شخصیت نہیں ہیں، اس لئے ان کو اپنے یا دوسروں کے مذاہب کے معاملہ میں اظہار خیال سے احتیاط کرنی چاہئے، مذہب کا تعلق عقیدہ اور جذبات سے ہے، یہ سیاست کا میدان نہیں ہے، جس میں ہرنا کردنی اور ہرنا گفتنی کو جائز کرلیا گیا ہے، دوسرے خود ہندو مذہب کے لئے ان کا بیان کس قدر اہانت آمیز ہے، کہ وہ اپنے آپ کو اس میں ترمیم وتبدیلی کا حق دار سمجھتے ہیں، کاش! ہندو مذہبی رہنما اس حقیقت پر توجہ دیں، اور اس کا نوٹس لیں۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ایسے ناشائستہ بیان پر بھی اشتعال سے بچیں، اس طرح کی باتیں کہنا ان لوگوں کا مزاج ہوتا ہے جو فکر ونظر اور استدلال کے معرکہ میں شکست خوردہ ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ فریق مخالف کو مشتعل کر کے حقائق کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹادیں، اگر ہم ایسی باتوں پر بے برداشت ہو جائیں، تو یہ ان ہی کا تعاون اور ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل ہوگی اس لئے ہمیں پوری سمجھ داری اور دانش مندی سے کام لینا چاہئے، علم واستدلال کی زبان میں ایسی بے معنی باتوں کا جواب دینا چاہئے، اور واضح کر دینا چاہئے کہ نہ ہم اپنے مذہب کے لئے ایسی باتوں کو گوارا کر سکتے ہیں، اور نہ ہم دوسرے مذاہب کے بارے میں ایسا مطالبہ کرتے ہیں، ہم تمام مذاہب کے احترام اور بقاءِ باہم کے اصول پر کاربند ہیں اور رہیں گے۔

(۲؍اگست ۲۰۰۲ء)

قرآن مجید اور دہشت گردی

قرآن مجید جس عہد اور جس سماج میں نازل ہوا، اس کا سب سے تکلیف دِہ پہلو لاقانونیت، بدامنی اور غارتگری تھی، لاقانونیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جزیرۃ العرب میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، عرب کے گرد و پیش جو حکومتیں قائم تھیں، وہ نسل برتری اور کہتری پر یقین رکھتی تھیں اور جو انسانی سماج پیدائشی عظمت اور تحقیر کے تصور پر قائم ہو ظاہر ہے کہ وہاں عدل و انصاف کا قائم ہونا ممکن نہیں ایسے ماحول میں اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا، اس کتاب میں جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس میں علم اور قلم کی اہمیت کو بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ تمام انسان کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے، اس میں انسانی وحدت کی طرف اشارہ تھا، علم انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے اور انسانی مساوات کے تصوّر سے عدل کا جذبہ اُبھرتا ہے اور تکریمِ انسانیت کا عقیدہ پروان چڑھتا ہے، اسی لئے ایک ایسا ملک جو امن و امان سے یکسر محروم تھا اور جہاں ظلم و جور اور دہشت گردی نے قانون کا درجہ حاصل کرلیا تھا، اسلام نے اس کو امن و سلامتی سے ہمکنار کیا، انسانی اُخوت کا سبق پڑھایا، اور رسول اللہ ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ایک خاتون تنہا اونٹنی پر سوار ہوکر صنعاء یمن سے شام تک کا سفر کرے گی۔

اس نے اپنے متبعین کے لئے دو ایسی تعبیرات اختیار کیں جن کے معنی ہی ''امن و امان'' اور ''صلح و سلامی'' کے ہیں، یعنی ''مومن اور مسلم''، مومن کے معنی امن دینے والے کے ہے اور مسلم کے معنی صلح اور دوسروں کی سلامتی کا لحاظ رکھنے والے کے، اس کتاب کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ، اور آپ ﷺ کے مہربان ہونے کا ذِکر ہے اور پہلی سورت کی پہلی آیت میں ہی خدا کو ''تمام کائنات کا

رب'' قرار دیا گیا ہے، رب کا لفظ بے پناہ شفقت اور ممتا کو ظاہر کرتا ہے اور تمام عالم کا رب کہہ کر پوری کائنات کو رشتۂ اخوت میں باندھ دیا گیا ہے، اور ایسی آفاقیت کا تصور دیا گیا ہے کہ جس میں پوری انسانیت ایک کنبہ اور ایک خاندان کا درجہ رکھتی ہے، غرض کہ قرآن مجید امن واماں، انسانی اخوت اور آفاقیت کا علمبردار ہے، لیکن بدقسمتی سے سورج پر تھوکنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور بعض تنگ نظر حضرات یہ کہنے کی جسارت کررہے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ نقص ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کے پڑھنے والوں میں دہشت گردی کا رجحان پیدا ہوتا ہے، یہ ایسی بہتان تراشی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس نے سرسری طور بھی قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہوگا وہ ہرگز اس سے متاثر نہیں ہوسکتا، کہ یہ دن کو رات اور برف کو آگ کہنے کے مترادف ہے!

عربی زبان میں دہشت گردی کو ''ارھاب'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن نے مسلمانوں کو یقیناً اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ان کے پاس ایسی طاقت موجود رہنی چاہئے کہ ان کے دشمنوں کو ظلم وجور کے ارتکاب کی ہمت نہ ہو، اور وہ مرعوب رہیں، اس کو قرآن نے ''قوت مرہبہ'' سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ''۔ (الانفال:۶۰)

ان کے لئے جس قدر ممکن ہو طاقت اور گھوڑے تیار کر کے رکھو، تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ اور اپنے دشمن اور دوسرے لوگ جنہیں تم نہیں جانتے، لیکن اللہ انہیں جانتا ہے، مرعوب رکھ سکو۔

قرآن کے اس بیان سے واضح ہے کہ طاقت دشمنوں کو مرعوب رکھنے اور ان کو ظلم وجور سے باز رکھنے کے لئے ہے، نہ کہ بے قصور لوگوں کو نشانہ بنانے اور تباہی و بربادی پھیلانے کے لئے۔

قرآن کے احکام جہاد سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ وہ بے قصور، کسی بھی غیر مسلم پر

حملہ کرنے اور اس کو ہلاک کر دینے کی اجازت دیتا ہے، اور اس کے لئے اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے، جس میں کفار کو قتل کرنے کا عمومی حکم ہے، یہ محض غلط فہمی ہے، اس آیت کا تعلق مشرکین مکہ سے ہے، وہ مستقل طور پر مسلمانوں سے برسر جنگ تھے، اور مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی صلح کی کوششوں کو قبول کرنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھے، چنانچہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، اور جن لوگوں نے ان کو گھر سے بے گھر اور شہر سے شہر بدر نہیں کیا تھا، قرآن ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور عدل واحسان کا حکم دیتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے :

" لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ " (الممتحنة:۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک اور انصاف سے نہیں روکتے، جو تم سے دین کے معاملہ میں برسر پیکار نہیں ہیں، اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

دہشت گردی میں بنیادی طور پر اس بات پر توجہ نہیں دی جاتی کہ اصل ظالم کون ہے؟ بلکہ اس کے متعلقین میں جو بھی ہاتھ آجائے اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اسلام نے اس کو قطعاً غیر اصولی اور غیر انسانی حرکت قرار دیا ہے، قرآن نے قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ایک شخص کی غلطی کا بوجھ، اور اس کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جاسکتی:

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى"

(الفاطر:۱۸)

قرآن نے ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے، "مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا "

(المائدہ: ۳۱)

قرآن نے ان اسباب کو بھی روکنے کی کوشش کی ہے جو دہشت گردی کا موجب بنتے

ہیں، زیادہ تر دہشت گردی کا سبب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ دوسروں کو جبراً اپنے مذہب وعقیدہ کا متبع بنانا چاہتے ہیں، عیسائیوں کی مذہبی تاریخ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، قرآن سے صاف اعلان کر دیا کہ دین کے معاملہ میں جبر واکراہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے: ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ'' (البقرۃ:۲۵۶) اس لئے اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ کوئی گروہ دوسروں کے مذہبی مقتدا اور پیشواؤں کو بُرا بھلا کہے، کہ اس سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں:

''لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' (الانعام:۱۰۷)

کسی معاشرہ میں دہشت گردی کے پنپنے کا اصل سبب ظلم وناانصافی ہے، جو گروہ مظلوم ہوتا ہے، اگر وہ ظالم کا مقابلہ نہیں کر پاتا ہے، اور انصاف کے حصول سے محروم رہتا ہے، تو اس میں منتقمانہ جذبات پرورش پاتے ہیں، اور جب وہ دیکھتا ہے کہ قانونی راستے بند ہیں، تو غیر قانونی راستہ اختیار کر لیتا ہے، اس لئے دہشت گردی کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ میں ظلم وجور کا دروازہ بند کیا جائے، اور عدل وانصاف کو پوری غیر جانبداری کے ساتھ نافذ کیا جائے، تا کہ دہشت گردی پر ابھارنے والے عوامل باقی نہ رہیں، اسی لئے قرآن نے جگہ جگہ عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کی بڑی تاکید کی ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں: ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ'' (النحل:۹۰)۔ قرآن نے تاکید کی ہے کہ کسی قوم سے عداوت بھی تم کو اس کے ساتھ ظلم وناانصافی پر کمربستہ نہ کر دے، اور جادہ عدل سے ہٹانے نہ پائے، (المائدہ:۸)

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ عالمِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہایت شدت کے ساتھ دہشت گرد ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، حالانکہ خود مسلمان ملکی اور عالمی دہشت گردی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مسلمانوں کی حالتِ زار ناقابلِ بیان ہے، مسلمان اگر اپنے ملک میں بھی خود اپنی خواہش اور مرضی سے اسلامی نظامِ حیات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کو تہذیبی تصادم اور شدت پسندی کا نام دے کر مداخلت کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اور ان سے وہی کچھ کہا جاتا ہے، جو انبیاء کی اقوام ان سے کہا کرتی تھی، مثلاً حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا

(الاعراف:۸۸)

حضرت شعیب کی قوم میں سے تکبر پر آمادہ گروہ نے کہا کہ اے شعیب! ہم تجھ کو اور تیرے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے شہر سے نکال کر ہی رہیں گے، یا تو تم ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔

آج ہندوستان میں فرقہ پرستوں کی طرف سے نعرہ لگایا جاتا ہے ’’کہاں جائے گا مسلمان؟ پاکستان یا قبرستان!‘‘ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا کیا یہ نعرہ اس سے مختلف ہے؟ قریب قریب یہی صورتحال مسلمانوں کے ساتھ دنیا کے مختلف علاقوں میں ہے، اعداء اسلام اور طاغوتی طاقتیں اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتیں جب تک مسلمان اپنے ایمان وعقیدہ اور تہذیب وثقافت سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور ظاہر ہے کہ اصحابِ ایمان کے لئے یہ قطعاً ناقابلِ قبول ہے، قرآن نے یہود ونصاریٰ کی نفسیات اور اسلام کے تئیں ان کے بغض وعداوت اور مزاج ومذاق کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ

(البقرۃ:۱۲۰)

یہود ونصاریٰ آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں۔

آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف اصل ناراضگی اسی کی ہے کہ یہ مغرب کی مادر پدر آزاد ثقافت کے سامنے سرنگوں کیوں نہیں ہوتے؟ یہ اخلاقی اقدار اور شرم وحیاء کے علمبردار کیوں بنے پھرتے ہیں؟ مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ ان مشکل حالات میں صبر واستقامت سے کام لیں، اور مغرب ومشرق کی مشترکہ دہشت گردی اور انسانیت سوزی سے خوف زدہ نہ ہوں کہ یہ ایک آندھی ہے جو گذر جائے گی، اللہ تعالیٰ نے حضراتِ صحابہ کی

استقامت کا کیا خوب ذِکر فرمایا ہے کہ انہیں جس قدر ڈرایا جاتا اسی قدر ان کے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا جاتا تھا:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۔ (آل عمران:۱۷۳)

صحابہ سے لوگوں نے کہا کہ (مخالفین نے) بہت سارے لوگ تمہارے مقابلہ میں جمع کر لئے ہیں، تم ان سے ڈرو، تو ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہی ہو گیا۔

ایمان کی علامت یہی ہے کہ اللہ کے دین کی سر بلندی کی راہ میں جس قدر ابتلائیں اور آزمائشیں آئیں، عداوتوں کے طوفان اٹھیں، مخالفتوں کی لہریں موجزن ہوں خوف ودہشت کا ماحول پیدا کیا جائے، حوصلہ شکن حالات کا سامنا ہو، اسی قدر ان کی ہمتیں بلند ہوتی جائیں، ان کے حوصلے ٹوٹنے نہ پائیں، اور مخلوق کا خوف ان پر غالب نہ ہونے پائے، اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کے تئیں دہشت گردی کا جو پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، یہاں تک کہ قرآن جیسی عظیم کتاب کو بھی نشانۂ تنقید بنایا جا رہا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان ہمت ہار جائیں، وہ مغرب کی ریشہ دوانیوں کی سامنے سرنگوں ہو جائیں، اور اسلام کے بارے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر رہ جائیں، پس ان حالات میں مسلمانوں کو اپنا حوصلہ بلند رکھنا اور صبر واستقامت کی راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۲۸؍دسمبر ۲۰۰۱ء)

۲۴ آیتیں

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، یہ انسانیت کے لیے ابدی پیغام اور زندہ دستور العمل ہے، یہ بیک وقت دماغ کو بھی مطمئن کرتی ہے اور بربطِ دل کو بھی چھیڑتی ہے۔ یہ ایک انقلاب انگیز کتاب ہے، جیسے سورج کی تمازت میں کبھی کمی نہیں آسکتی اور سمندر کی وسعتوں کو کم نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اس کتاب کی اثر انگیزی، اس کی تاثیر، دلوں کو زیر و زبر کردینے کی صلاحیت اور فکر و نظر پر چھا جانے کی طاقت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوسکتی، یہ رَواں دَواں زندگی میں انسان کی رہنمائی کی پوری صلاحیت رکھتی ہے، اس لیے اس کی آب و تاب میں کوئی فرق نہیں آسکتا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، جو اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن مجید قیامت تک اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ محفوظ رہے گا۔

دنیا میں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں، انسانی زندگی سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، آج کوئی ہندو، بدھسٹ یا عیسائی اپنی تجارت، کاروبار، نظامِ حکومت، طریقۂ عدل و انصاف، ازدواجی زندگی، خاندانی تعلقات، مختلف قوموں کے باہمی روابط اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں اپنی مذہبی کتابوں سے رجوع نہیں کرتا، نہ اپنے مذہبی علماء سے احکام و مسائل معلوم کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ بعض قومیں نحس و برکت وغیرہ کے سلسلہ میں جو توہمات ہیں، ان کے لیے مذہبی شخصیتوں سے رجوع ہوتے ہیں اور کچھ عبادتی رسوم کو اپنی عبادت گاہوں میں انجام دے لیتے ہیں، عام لوگ ان کتابوں کو نہ پڑھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ کچھ مخصوص لوگ ہی اس کو پڑھنے اور سمجھنے کے اہل ہیں، اس لیے ان قوموں کی زندگی میں مذہب کا ہمہ گیر تصور نہیں پایا جاتا اور وہ زندگی کے عام مسائل میں اپنی خواہش کے متبع ہیں، نہ کوئی حلال ہے نہ حرام، نہ جائز نہ ناجائز اور نہ مکروہ نہ مستحب۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ امتِ مسلمہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور کوتاہ عملیوں کے باوجود آج بھی اپنے مذہب سے مربوط ہے، خود ہمارے ملک ہندوستان میں بیسیوں دارالافتاء ہیں، جن کے پاس روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں فتاویٰ کی ڈاک آتی ہے اور لوگ زندگی کے نوع بنوع مسائل کے بارے میں حکمِ شرعی دریافت کرتے ہیں، کسی جبر و دباؤ کے بغیر اپنے سینکڑوں نزاعات کو شرعی پنچایت اور دارالقضاء ہی میں لے جاتے ہیں اور مسلمان چاہے زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی زندگی گذارے، اسی چیز نے اسے الحاد و بد دینی کے اس طوفان میں بھی دین سے مربوط رکھا ہے اور وہ اس لادینی ثقافت کے آگے سرِتسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہیں، جس کے سامنے آج تمام قومیں اپنی شکست تسلیم کر چکی ہیں، یہ سب قرآن مجید کا فیض ہے، یہ وہ چیز ہے جس نے حق اور سچائی کے دشمنوں کو قرآن مجید کے خلاف کھڑا کر دیا ہے، لیکن یہ بات کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ حذف کر دیا جائے، کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ مطالبہ تو خود نزولِ قرآن کے زمانہ میں بھی رہا، لیکن جیسے ان معاندین کی خواہش ناکام و نامراد ہوئی، آج جو لوگ قرآن مجید کے خلاف زبان کھول کر سورج پر تھوکنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کی اس بے جا خواہش اور مطالبہ کا بھی وہی حشر ہوگا۔

ہندوستان میں حقیقت پسند ہندو علماء نے ہمیشہ قرآن مجید کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا ہے۔ گاندھی جی اور ونوبا بھاوے مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ گاندھی جی قرآن مجید سے بہت متاثر تھے اور اس کی تلاوت بھی کیا کرتے تھے، یہی حال ونوبا جی کا تھا، انہوں نے تو قرآن کی منتخب آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی ''روح القرآن'' کے نام سے مرتب کی ہے، ہندوستان میں طباعت و اشاعت کی موجودہ سہولتوں اور پریس کی کثرت کے دَور سے پہلے قرآن مجید کی طباعت میں سب سے نمایاں کام 'منشی نولکشور لکھنؤ' کا ہے، وہ صحت کے مکمل اہتمام کے ساتھ قرآن مجید طبع کیا کرتے تھے اور طباعت کے لیے سنگی تختیاں تیار کرتے تھے، نیز انہیں احتراماً دوسری زیرِ طباعت کتابوں اور ان کی تختیوں سے اوپر رکھا کرتے تھے، یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

قرآن مجید کے بارے میں ہندو علماء کے تأثرات

قرآن مجید کے بارے میں بابا بھوپندر ناتھ باسو فرماتے ہیں:

تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاک روب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندانی مسلمانوں کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

بابو بپن چندر پال کہتے ہیں:

قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات، پات کا امتیاز موجود نہیں ہے، نہ کسی کو محض خاندانی اور مالی عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

مشہور قائد مسز سروجنی نائیڈو کا یہ بیان کس قدر حقیقت پسندانہ ہے کہ:

قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے، دنیا اس کی پیروی سے خوش حال ہو سکتی ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کا ارشاد ہے:

مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ برابر بھی تأمل نہیں ہے۔

(سہ روزہ دعوت: ۱۳ر مئی ۱۹۸۸ء ص ۶۷)

قرآن مجید کے ہندو مترجمین وناشرین

قرآن مجید سے اسی تعلق اور عقیدت کا اثر ہے کہ مختلف ہندو اہل علم نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے، یا قرآن کی منتخب آیات کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، ونوبا بھاوے کی ''روح القرآن'' کا ذکر اوپر آچکا ہے، ہندی کے مشہور شاعر بھارتبند وہرش چندر نے بھی قرآن کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو رسالہ ہرش چندر میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا، لکھنؤ کے نند کمار اوستھی نے بھی قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، آریہ سماجیوں کی طرف سے بھی وید کے منتروں سے تقابل کرتے ہوئے قرآنی آیات کا انتخاب مع ترجمہ شائع کیا گیا ہے، ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کے سابق کیبنٹ سکریٹری ونود چند پانڈے نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا ہے، انہیں اعتراف ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے بلکہ وحی ہے، سردار جگجوت سنگھ کی فرمائش پر کنہیالال لکھداری نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، جو چار

سو پندرہ صفحات پر دھرم سبھا لدھیانہ سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا تھا، اس ترجمہ میں شاہ عبد القادر صاحب کے ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔

بنگال کے ایک ہندو عالم گریش چندر سنگھ نے ۱۸۸۱ء میں قرآن مجید کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا، ۱۹۲۶ء میں بنگلہ بولنے والے مسلم علماء نے اس ترجمہ کو مستند قرار دیا۔ پنڈت کیلاش چندر برہست نے جناب امام الدین رام نگری کے ساتھ مل کر مولانا صدر الدین اصلاحی مرحوم کے ترجمہ کو ہندی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ ۱۹۵۵ء میں رامپور سے شائع ہوا اور اس کے صرف دو ہی پارے منظر عام پر آسکے، جناب پران ناتھ نے اپنی گجراتی تالیف ''قلزم سروپ'' میں قرآن اور وید کے متن کا انتخاب پیش کیا ہے، دھن پرکاش ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی نے قرآن مجید کا منظوم ہندی ترجمہ ''پوتر قرآن درشن'' کے نام سے کیا ہے، جسے ''الوک پرکاش'' نے شائع کیا ہے اور فروری ۲۰۰۰ء کے کتابی میلہ میں اسے نمائش وفروخت کے لئے بھی رکھا گیا تھا، شیخ محمد یوسف کا ہندی ترجمہ قرآن جس شخصیت نے شائع کیا، وہ ہیں پنڈت دولت رام شرما، یہ ترجمہ اسٹار پریس بازار ہال امرتسر سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

(ملخص از دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کا حصہ: ص ۱۵۸-۱۵۵)

یہ ان ہندو بزرگوں کا حال تھا، جنہوں نے قرآن مجید کو پڑھا تھا اور براہِ راست اس عظیم کتاب کے مطالعہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

اب یہ بے چارے وی، ایچ، پی والے جو سیاست کے لیے مذہب اور دھرم کا ناجائز استعمال کرتے رہے ہیں اور اپنی زہر آلود تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ انسانوں کو بانٹنے اور دلوں کو تقسیم کرنے کا کام کررہے ہیں، ان ہی لوگوں نے سیدھے سادھے، سادہ لوح ہندو بھائیوں کے دلوں میں نفرت کی بیج بونے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد پیدا کرنے کی غرض سے قرآن مجید کی ۲۴ آیتوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ قرآن کریم غیر مسلموں کو قتل کرنے، ان کا دشمن ہونے اور انہیں دوست نہ بنانے کی تعلیم دیتا ہے، اس لیے مسلمان کبھی بھی غیر مسلموں کے حق میں مہربان اور رحم دل نہیں ہوسکتے۔

اس پروپگنڈے کی حقیقت یہ ہے کہ انہیں آگے پیچھے کے مضمون سے کاٹ کر یا جن غیر مسلموں سے عہدِ نبوت کے مسلمانوں کا سابقہ تھا، ان کو نظر انداز کر کے اور ان آیات کو ان کے نازل ہونے کے پس منظر کو بیان کیے بغیر پیش کیا جا رہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی بھی بات کو اگر اس کے پس منظر سے ہٹا دیا جائے، یا اس کو آگے یا پیچھے کی عبارتوں سے کاٹ کر پیش کیا جائے، تو اچھی سے اچھی بات کا بھی غلط مفہوم نکالا جا سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان آیات کے بارے میں صحیح صورتِ حال پیش کر دی جائے۔

بحیثیتِ مجموعی یہ آیات تین طرح کی ہیں: دس آیات جہاد سے متعلق ہیں، چھ آیات غیر مسلموں سے تعلق و دوستی رکھنے نہ رکھنے اور ان کے دوستی کے لائق ہونے اور نہ ہونے سے متعلق ہیں اور آٹھ آیتیں غیر مسلموں پر عذاب سے متعلق ہیں۔ جن آیات کو زیادہ تر پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا گیا ہے، وہ جہاد سے متعلق آیتیں ہیں، اس لیے پہلے ان ہی آیات پر گفتگو کی جاتی ہے:

جہاد سے متعلق آیات

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّى يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا

(النساء: ۸۹)

وہ چاہتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ کفر کر رہے ہیں تم بھی کفر کرو، تا کہ تم ایک جیسے ہو جاؤ، تو تم ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ، جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر جائیں، اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں، تو انہیں جہاں کہیں پاؤ، پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو دوست اور مددگار نہ بناؤ۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ اس وقت اہل مکہ نے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچائی تھی، یہاں تک کہ ان کے قتل کے درپے ہو گئے تو مسلمانوں کو مجبور ہو کر ترکِ وطن

کرنا پڑا اور انہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی، پھر یہاں بھی مسلمانوں کا چین وسکون انہیں پسند نہیں آیا اور انہوں نے بار بار مدینہ پر اپنی یلغار جاری رکھی، ظاہر ہے جو لوگ مسلمانوں کی جان کے درپے ہیں، تو اپنی مدافعت کے طور پر وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل تھا، کہ وہ ان کی زیادتیوں کا جواب دیں، اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے تبدیلیٔ مذہب اور ارتداد سے کم کسی اور بات پر رضامند نہیں تھے، جو ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ظلم ہے۔

پھر اس سے اگلی آیات کو دیکھا جائے تو بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَآؤُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (نساء: ۹۰)

سوائے ایسے لوگوں کے جو ان سے جا ملیں، جن کے اور تمہارے درمیان عہد (معاہدۂ امن) ہو، یا وہ تمہارے پاس اس طرح آئیں کہ نہ تم سے لڑنا چاہتے ہوں نہ اپنی قوم سے، حالانکہ اگر اللہ چاہتے تو ان کو تم پر مسلط کردیتے، پھر وہ تم لوگوں سے جنگ کرتے، تو اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں جنگ نہ کریں اور صلح پیش کریں، تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

دیکھئے! اس آیت نے اس بات کو واضح کردیا کہ اس سے پہلی آیت میں قتال کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، جو غیر مسلم مسلمانوں کے حلیف ہوں، یا مسلمانوں کے حلیف کسی غیر مسلم گروہ کے حلیف ہوں، یا غیر جانبدار ہوں، نہ مسلمانوں سے جنگ چاہتے ہوں اور نہ ان لوگوں سے جو مسلمانوں سے جنگ کی حالت

میں ہوں، تو ان تینوں طرح کے لوگوں سے مسلمانوں کے لیے قتال درست نہیں، بلکہ قرآن نے صاف طریقہ پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ صلح وامن کا راستہ اختیار کریں، مسلمانوں کو ضرور ہی ان کے اس رویہ کا جواب صلح اور امن سے دینا چاہیے اور کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیے۔

دوسری آیت

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُواْ مِئَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّئَةٌ يَغْلِبُواْ أَلْفاً مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَفْقَهُونَ . (انفال : ٦٥)

اے نبی! ایمان والوں کو قتال پر آمادہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو ایک ہزار منکرین پر بھاری رہیں گے؛ کیوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی، بلکہ یہ پوری سورت ہی زیادہ تر غزوۂ بدر کے واقعات اور اس واقعہ سے متعلق شرعی احکام پر مشتمل ہے۔ غزوۂ بدر ان حالات میں ہوئی کہ مسلمان ظلماً مکہ سے نکال دیے گئے تھے، بہت سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قریب ترین اعزہ کو جبراً مکہ میں روک لیا گیا تھا، اہل مکہ کے مقابلہ مسلمان تعداد میں کم تھے، اسلحہ اور دوسرے وسائل کے اعتبار سے بھی مکہ کے حملہ آوروں کا پلڑہ بھاری تھا، اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تعداد کی کمی پر نظر نہ رکھیں، بلکہ اپنے مقصد پر نگاہ رکھیں، کہ مکہ کے لوگ تو بن سمجھے بوجھے محض اکسانے پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا ایک خاص مشن کے تحت ہے، اس لیے اگر تم کم بھی ہو تو زیادہ لوگوں پر غالب آسکتے ہو۔ اب غور کیجئے، کہ اس میں کن غیر مسلموں سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے، ان غیر مسلموں کے خلاف جو نہ تھمنے والے تلاطم کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر مسلمانوں پر حملہ کر رہے تھے اور ان کے جان و مال

کے در پے تھے، اگر مسلمانوں کی طرف سے پہل ہوتی، تو یہ جنگ بدر کے بجائے (جو مدینہ کے قریب واقع ہے) مکہ کے قریب ہوئی ہوتی، تو کیا حملہ آوروں کے لیے مقابلہ پر ابھارنا کوئی ناواجبی بات ہے؟ اگر ہمارے ملک پر دشمن حملہ آور ہوں تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہوگا کہ ہم اہل وطن کو ان سے مقابلہ کی ترغیب دیں غور کیجئے کہ ظلم کرنا مذموم ہے یا ظلم کا جواب دینا۔ یہ ایسی بات ہے جسے معمولی عقل وفہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔

تیسری آیت

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ، إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (التوبہ:۵)

جب حرمت والے مہینے گذر جائیں، تو تم ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ، قتل کرو، انہیں پکڑو، گھیرو، اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو، پھر اگر یہ توبہ کرلیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ معاف کرنے والے مہربان ہیں۔

اس آیت کے مضمون ہی سے ظاہر ہے کہ یہ ان اہل مکہ کے بارے میں ہے جو حرام مہینوں کا احترام کرتے تھے، جو بہت سے مسلمانوں کے قاتل تھے، بہت سے مہاجرین کے رشتہ داروں کو انہوں نے روک رکھا تھا، جہاں کہیں کوئی مسلمان ان کے ہاتھ آجاتا تھا، اسے گرفتار کر لیتے تھے اور اسے قتل کر کے یا قاتلوں کے ہاتھ بیچ کر ہی دَم لیتے تھے، اس سلسلہ میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جنہیں گرفتار کر کے اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کیا گیا اور انہوں نے غزوۂ بدر میں ہلاک ہونے والے اپنے مورث کے بدلہ نہایت بے دردی اور سفاکی کے ساتھ انہیں شہید کر دیا، انہیں مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم بھی ان سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکتے ہو۔

اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد جو آیتیں آرہی ہیں، اگر انہیں پڑھ لیا جائے تو

صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مشرکین کا ایک خاص گروہ مراد ہے نہ کہ تمام مشرکین، چنانچہ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْماً نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤُمِنِينَ. (التوبہ:۱۳)

کیا تم ایسے لوگوں سے قتال نہیں کروگے جنہوں نے اپنے عہد توڑ دیے، رسول کو جلاوطن کرنے کی ٹھان لی اور انہوں نے تمہارے مقابلہ میں خود ہی پہل کی ہے؟ کیا تم لوگ ان سے ڈرتے ہو؟؟ اللہ تعالیٰ زیادہ اس لائق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

اس آیت نے بات صاف کردی کہ پہلے جن مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کی، مسلمانوں کو وطن سے بے وطن کرنے پر کمربستہ رہے اور نقصان پہنچانے اور حملہ کرنے میں پہل کی، چنانچہ علامہ آلوسیؒ نے اوپر (آیت نمبر:۵) میں جن مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا، ان کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ اس سے یہی عہد شکنی کرنے والے مشرکین مراد ہیں۔ **المراد من المشركين الناكثون** ۔(روح المعانی:۶/۴۳) ـــ پھر سورۂ توبہ کی اس دوسری آیت (آیت نمبر:۱۳) نے اس بات کو واضح کردیا کہ قرآن نے بطورِ جواب اور مدافعت کے مشرکین سے قتال کی بات کہی ہے؛ کیوں کہ پہل ان ہی کی طرف سے تھی، یہ آیت اور آگے آنے والی آیت بھی دراصل فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے، مشرکین مکہ نے ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے اوّلاً تو مسلمانوں کو ان کے وطن 'مکہ' سے نکالا، پھر تین جنگیں ان پر مسلط کیں، ہجرت کے پہلے سال غزوۂ بدر، دوسرے سال غزوۂ احد اور پانچویں سال غزوۂ خندق کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ سے بھی اجاڑ دیا جائے، پھر ہجرت کے چھٹے سال اہل مکہ ہی کی شرائط پر صلح حدیبیہ ہوئی اور ایک ڈیڑھ سال کے اندر انہوں نے اس صلح کی بھی دھجی اڑادی ـــ اب بتایئے کہ ایسے لوگوں کے خلاف اگر مزاحمت کی دعوت نہ دی جائے تو کیا ان

کے راستہ میں پھولوں کی سیج بچھانے کو کہا جائے گا؟

چوتھی آیت

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ. (التوبہ:۱۴)

''ان سے قتال کرو، اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا، رسوا کرے گا، تمہاری ان کے مقابلہ میں مدد کرے گا اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔''

یہ سورۂ توبہ کی ۱۴ ویں آیت ہے کہ جس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر آیا ہے، جنہوں نے عہد شکنی کی تھی اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کے مرتکب ہوئے تھے، انہیں کے بارے میں یہ بات کہی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا اور تمہاری مدد کرے گا اور اہل مکہ کی زیادتی کی وجہ سے تمہیں جو دکھ پہنچا ہے ___ اور ظلم پر آدمی کا آزردہ خاطر ہونا ایک فطری چیز ہے ___ تو اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ میں تمہارے لیے تسکین خاطر کا سامان کرے گا، ظاہر ہے کہ اس آیت میں ظالموں سے بدلہ لینے کا ذکر ہے، جو عین مطابق انصاف ہے۔

مشہور مفسر امام مجاہدؒ نے نقل کیا ہے کہ اس آیت کا تعلق بنوبکر اور بنوخزاعہ کی لڑائی سے ہے، یہ دونوں ہی قبیلے مشرک تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ بنوبکر اہل مکہ کے حلیف تھے اور بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے، جب حدیبیہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ناجنگ معاہدہ ہوا، تو اس معاہدہ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ اہل مکہ اور مسلمانوں کے حلیف قبائل پر بھی اس کا اطلاق ہوگا اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی زیادتی نہیں کریں گے، لیکن ہوا یوں کہ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا، یہاں تک کہ حرمِ مکہ جہاں اسلام سے پہلے بھی لوگ اپنے جانی دشمنوں اور اعزہ واقرباء کے قاتلوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، بنوخزاعہ کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا اور اس عہد شکنی میں اہل مکہ بھی پوری طرح شریک و سہیم رہے، اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے

ذریعہ تم ان بدعہدی کرنے والوں پر غالب ہو گے اور ان کے ظلم وزیادتی کی وجہ سے فطری طور پر جو آتش انتقام تمہارے سینہ میں بھڑک رہی ہے، اللہ اسے بجھائیں گے اور تمہارے دلوں کو ٹھنڈا کریں گے۔ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۸/ ۸۶،۸۷)

اب غور کیجئے کہ جن لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہو اور خود ہی حملہ کرنے میں پہل بھی کی ہو، کیا ان کے خلاف جوابی کارروائی کرنا ناانصافی کی بات ہے اور کیا قرآن کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم اپنا اور اپنے حلیفوں کا قتل عام دیکھتے رہو، مگر ہاتھ پر ہاتھ دیے بیٹھے رہو، اپنی طرف سے کوئی جواب نہ دو؟؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے جو ظالموں کے مقابلہ خدا کی طرف سے مظلوموں کی مدد بات کہی ہے، یہ کوئی عجوبہ نہیں، بلکہ ہر مذہب میں حق اور سچائی پر قائم رہنے والوں کو اہل باطل اور ظالموں کے مقابلہ خداوندی فتح ونصرت کی خوشخبری سنائی گئی ہے، مثلاً رگوید میں خدا سے اس طرح دعائیں کی جاتی ہیں:

- ☆ اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلا دے، جن کی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں۔ (۵:۱۲/۱)
- ☆ تو آریوں اور وسیوں کے درمیان امتیاز کر جو اَدھرمی ہیں، ان کو سزا دے اور انہیں اس کے حوالہ کر دے جس کی گھاس (دیوتاؤں کے نذرانہ کے لیے) کی رکھی ہے۔" (۸:۵۱:۱)
- ☆ پس اے اندر! ہم کو بڑھنے والی شوکت عطا کر، ہم کو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں کو مغلوب کرے، ہمارے دولت مند سردھروں کو برقرار رکھ، ہمارے راجاؤں کی حفاظت کر، ہم کو دولت اور خوراک شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔" (۱۱:۵۴/۱)

بائبل نے مشرکین کی نسبت سے جولب ولہجہ اختیار کیا ہے، اسے ان اقتباسات میں دیکھا جا سکتا ہے:

> "بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انہیں کہہ، جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے

سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کردو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھادو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کردو اور وہاں آبسو، کیوں کہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو۔ (۳۳:۵۰-۵۴)

اور جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالہ کردے تو انہیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو کوئی ان سے عہد کیجیو، اور نہ ان پر رحم کریو، تم ان کے مذبحوں کو ڈھادو اور ان کے بتوں کو ڈھادو، ان گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلادو۔ (۷:۲-۵)

غرض کہ ظالموں کے مقابلہ مظلوموں کے ساتھ اللہ کی مدد ہونا اور ظلم کو روکنے کے لیے ظالموں کا پنجہ تھامنا ایک ایسی بات ہے، جو تمام مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے؛ کیوں کہ اگر خدا بھی ظالموں ہی کا طرفدار ہو تو پھر کون سا ایوانِ انصاف ہوگا جہاں ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ملے گی اور مظلوموں کی تسکین خاطر کا سامان ہوگا؟

پانچویں آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ. (التوبہ:۱۲۳)

اے ایمان والو! تمہارے آس پاس جو کفار ہیں، ان سے جنگ کرو اور وہ تمہارے اندر سختی (مضبوطی) پائیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ان کافروں سے جنگ کے لیے کہا گیا ہے جو ان کے قرب و جوار میں تھے، یعنی اہل مکہ اور ان کے حلف؛ کیوں کہ یہی مدینہ کے قریب کافروں کی آبادیاں تھیں اور اہل مکہ کا مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ ظاہر ہے، اگر مطلقاً کافروں کے مارنے کا حکم ہوتا تو قریب و دور کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مدینہ، یمن اور شام کے درمیان رہگزر کا درجہ رکھتا تھا اور مختلف غیر مسلم قافلے مدینہ کے قرب و جوار سے گذرتے رہتے تھے، اگر یہ حکم مطلقاً ان سے متعلق ہوتا تو دور کے غیر مسلموں پر بھی حملہ کرنے کو کہا جاتا،

لیکن یہاں قرآن نے ایسا حکم نہ دیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کا منشا ان مشرکین سے جنگ کرنا تھا جو بار بار مسلمانوں پر یلغار کرتے رہتے تھے، نہ رشتہ کا پاس ولحاظ کرتے تھے، نہ صلح اور معاہدہ کا لحاظ، چنانچہ ابن زیدؒ نے یہی کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین عرب تھے، المراد بهذه الآية وقت نزولها العرب. (تفسیر قرطبی: ۸/ ۲۹۷)

پھر اس آیت میں جو ''غلظہ'' کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی سختی کے بھی آتے ہیں اور طاقت ومضبوطی کے بھی، یہاں اصل میں یہی طاقت ومضبوطی کا معنی مراد ہے، أي شدة وقوة وحمية۔ (حوالہ سابق: ۲۸۹) پس مقصد یہ ہے کہ جو مشرکین تم سے برسر جنگ ہیں وہ تم کو طاقتور محسوس کریں، مرعوب رہیں اور تم کو روند جانے کی جرأت نہ کریں، ظاہر ہے کہ کسی بھی قوم کو یقیناً دوسروں پر تو ظلم نہیں کرنا چاہیے، لیکن اپنے آپ کو ایسا طاقتور ضرور رکھنا چاہیے کہ دوسرے اس کو لقمۂ تر نہ سمجھ لیں۔ یہ بالکل معقول اور قرینۂ انصاف ہے، مثلاً ہم ہندوستان کے رہنے والے اپنے دیش کے بارے میں جذبہ رکھتے ہیں کہ ہم دوسروں پر زیادتی تو نہیں کریں گے، لیکن ہم اپنے آپ کو یقیناً ایسا خود مکتفی بنا کر رکھیں گے کہ کسی کو ہم پر بری نگاہ ڈالنے کی ہمت نہ ہو، اگر ہم ایسا کہیں تو کیا یہ کوئی غلط بات ہوگی؟

چھٹی آیت

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ: ۱۱۱)

بے شک اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جان ومال اس کے بدلہ خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں، تو قتل کرتے بھی ہیں اور قتل کیے بھی جاتے ہیں۔ اسی پر سچا وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہے؟ سو تم خوشی مناؤ اپنی معاملت پر جو تم نے کی ہے اور یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت میں یہی بات تو کہی گئی ہے کہ جو مسلمان ظالموں کے خلاف سر ہتھیلی پر لے کر نکل آئیں اور اس راہ میں اپنی جان و مال کی بھی فکر نہ کریں، ان کو اللہ جنت سے نوازیں گے۔

قرآن کے اس ارشاد میں کون سی بات خلافِ انصاف ہے؟ کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اپنے دیش کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے، ہندو مذہب کی تاریخ میں گیتا نے جس جنگ کی تفصیل بیان کی ہے، یعنی کورووں اور پانڈوؤں کی جنگ، اس میں کرشن جی، ارجن کو یہی صلاح دیتے ہیں کہ وہ اسے حق و باطل کی جنگ سمجھ کر کورووں کے خلاف صف آراہوں اور اس پر پانڈوؤں کے بادشاہ ارجن سے خدا کی مدد کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہندو مذہب میں منو جی کی ہدایات کی خاص اہمیت ہے۔ ان کا بیان ہے:

> ''روئے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور کبھی منہ نہیں موڑتے وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں۔'' (۸۹/۷)

دیکھا آپ نے! قرآن نے تو اللہ کے راستہ میں جوابی جنگ پر جنت کا وعدہ کیا ہے، لیکن منو جی محض دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے اور ملک گیری کی غرض سے جنگ کرنے والوں کو بھی جنت کی خوشخبری سناتے ہیں۔ قرآن کے اس ارشاد پر تو داد دینی چاہیے، کہ اس نے ظالموں کے مقابلہ خود سپردگی کے بجائے، آخری حد تک جرأت و حوصلہ سے کام لینے کی تلقین کی ہے، کہ اگر مظلوموں میں یہ حوصلہ و ہمت اور جوش و جذبہ نہ ہو، تو ظالموں کا پنجہ استبداد سخت سے سخت تر ہوتا چلا جائے گا اور دنیا فساد کی آماجگاہ بن جائے گی۔

ساتویں آیت

> مَلْعُونِيْنَ، اَيْنَمَا ثُقِفُوا اُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيْلاً ۔ (الاحزاب:۶۱)
>
> پھٹکارے ہوئے، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور ضرور قتل کردیے جائیں گے۔

یہ بھی ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو وی، ایچ، پی نے قرآن مجید اور مسلمانوں

کے خلاف پروپیگنڈہ کا عنوان بنایا ہے، اس آیت کا اصل منشا کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے اس سے پہلی اور بعد کی آیت کے ساتھ اس کا ترجمہ دیکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۔ (الاحزاب:۶۰)

منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اور جو لوگ مدینہ میں افواہ اڑاتے ہیں، اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھائیں گے، پھر وہ اس شہر میں آپ کے ساتھ کچھ ہی دنوں رہ سکیں گے۔

مَلْعُونِينَ، أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا ۔ (الاحزاب:۶۱)

ایسے لوگوں پر پھٹکار ہے، یہ جہاں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ (احزاب:۶۱)

سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (الاحزاب:۶۲)

ان سے پہلے مجرمین کے لیے بھی اللہ کا یہی دستور رہا ہے اور تم اللہ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

یہ آیات بلکہ تقریباً یہ پوری سورت بنیادی طور پر پانچ ہجری کے واقعات، غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنو قریظہ سے متعلق ہے، غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے پڑوسیوں نے ان کے ساتھ ناقابل عفو دغا سے کام لیا تھا، مسلمانوں کا یہودیوں سے یہ معاہدہ تھا کہ مدینہ پر جب بھی کوئی حملہ ہوگا تو ہم لوگ مل کر دشمن کا مقابلہ کریں گے، صورتِ حال یہ تھی کہ اہل مکہ نے اس جنگ میں بلا کسی اشتعال اور سبب کے نہ صرف خود حملہ کیا، بلکہ اپنے دوسرے حلیف قبائل کو بھی لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے، افرادی وسائل اور اسلحہ کے اعتبار سے مظلوم مسلمانوں اور حملہ آوروں کے درمیان اتنا فرق تھا کہ مسلمان جنگی تدبیر کے طور پر خندقیں کھودنے پر مجبور ہو گئے، اس موقع سے یہود مسلمانوں کی مدد تو کیا کرتے اور حسبِ

معاہدہ مدینہ کی حفاظت میں کیا حصہ لیتے کہ وہ غیر جانبدار بھی نہ رہ سکے اور ان مشرکین کے ساتھ ہو لیے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ وہ تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، لیکن ان کی ساری ہمدردیاں مسلمانوں کے دشمنوں سے تھیں، ان حالات میں مسلمانوں کی سب سے بڑی طاقت ان کا ایمان ویقین اور حوصلہ و ہمت ہی تھی، یہ طرح طرح کی افواہیں اڑا کر مسلمانوں کو خوف میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، تا کہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور یہ نفسیاتی طور پر کمزور ہو جائیں، یہی دونوں طبقے ہیں جن کو ''منافقین'' سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کو ذلیل ورسوا کرنے کے درپے بھی ہوتے تھے اور شریف مسلمان خواتین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں اڑایا کرتے تھے، ایسی افواہوں سے انسان نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی گروہوں کے بارے میں قرآن مجید نے کہا کہ ان کا ایسے پڑوس اور بغلی دشمنوں کو اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں؛ کیوں کہ دوست نما دشمن انسان کے لیے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، کوئی صاحبِ انصاف دیکھے کہ جو لوگ بظاہر کسی قوم کے ساتھ رہ کر یا کسی ملک کے شہری بن کر اسی قوم و ملک کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، ان کے دشمنوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں اور برے وقتوں میں سارے عہد و پیماں کو فراموش کر کے دشمنوں کے دوش بدوش کھڑے ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا قتل اور پھانسی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟؟

پھر قرآن مجید نے ان پر پھٹکار بھیجتے ہوئے مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا کہ وہ ان پر ہلہ بول دیں، حالانکہ اگر قرآن نے ایسا کہا ہوتا تو بے جا نہیں ہوتا، لیکن یہاں حکم دینے کے بجائے صرف پیشین گوئی کی گئی ہے اور بار بار بے وفائی کرنے والوں کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہوئے انتباہ دیا گیا ہے، کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تو ان کا انجام دنیا میں بھی ہلاکت و بربادی ہے اور ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کی سنت یہی رہی ہے، یہ تحمل و بردباری قابل لحاظ ہے، اگر مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہوتا کہ تم کوئی مہلت دیے بغیر ان بغلی دشمنوں کا قلع قمع کر دو، تب بھی یہ کوئی خلافِ انصاف بات نہیں ہوتی، لیکن ایسی بدعہدیوں

اور جفا شعاریوں کے باوجود سنبھلنے کا مزید موقع دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کو قتال کا حکم دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی سنت بیان کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے، وی، ایچ، پی کے لوگ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ ہم لوگ اس ملک کے شہری ہیں اور اس زمین سے محبت رکھتے ہیں، اگر اس ملک میں رہنے والے اور اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھانے والے دشمن ملکوں کے ساتھ مل کر ملک کے خلاف سازشیں تیار کریں، جاسوسی کریں اور دشمنوں کے ساتھ جا ملیں تو آخر ان کی کیا سزا ہوگی؟ کیا انہیں گرفتار کرنا یا انہیں سزائے موت دینا خلافِ انصاف امر ہوگا؟ اور کیا آج دنیا کے مہذب قوانین میں ایسے شخص کے لیے بعینہٖ یہی سزا نہیں رکھی گئی ہے؟؟

کیا بہتر ہو کہ جناب اشوک سنگھل صاحب ان کلمات کو دیکھیں جو ہندو مذہبی کتابوں میں مخالفین اور دشمنوں کے بارے میں ہیں، بطورِ نمونہ اتھروید کے چند منتر یہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

☆ تمہاری گردنیں توڑ دے اے پشاچو! اور تمہاری پسلیاں چور چور کردے، اے یاتو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ رہیں، اے متراوا ردنا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا، ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے، بلکہ وہ سب چر پھٹ کرا کٹھے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ (۲:۳۲:۶)

☆ ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہوجائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بے کار کردیں، اور اس طرح اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔ (۳:۶۶:۶)

☆ یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضاء کو تین ٹکڑے کردے۔ (۸:۳:۶-۷-۱۰)

☆ اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے، اے دیوتا! آ جو رنج پر رنج پہنچاتے ہیں، انہیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح کر دے، ہمارے پاس دفع کر اور ان بندۂ شکم راکشسوں کو ٹکرے ٹکرے کر دے۔ (۳:۴:۳-۱-رگ وید ا:۸۷:۵:۱)

یہ محض بطورِ نمونہ چند مثالیں دی گئی ہیں، ورنہ دنیا میں جتنے مذاہب موجود ہیں، ان کے صحیفے ــــ (اس سے قطع نظر کہ وہ تحریف وتبدیلی سے محفوظ ہوں یا تحریف کا شکار ہو چکے ہوں) ــــ دشمنانِ حق کے خلاف جہاد کی ترغیب کی تعلیمات سے بھری پڑی ہیں، لیکن قرآن مجید کا منشأ بہر حال یہ نہیں ہے کہ جو غیر مسلم سامنے آئے مسلمان اسے تہہ تیغ کر دیں، بلکہ ان آیات میں وہ غیر مسلم مراد ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار اور ان کو نیست و نابود کر دینے کے درپے تھے۔

آٹھویں آیت

يَـا أَيُّهَـا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ. (التحریم:۹)

اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ انتہائی بدترین ٹھکانہ ہے۔

ان آیات کا پس منظر بھی وہی ہے جس کا پہلے بار بار ذکر آ چکا ہے، دراصل اسلام میں غیر مسلموں کے تین گروہ کیے گئے ہیں: ایک وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں ہوں، دوسرے وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ "بقائے باہم" کے معاہدہ کے تحت رہتے ہوں، جیسا کہ آج کے جمہوری ممالک ہیں، پہلے گروہ کو "ذمی" اور دوسرے کو "معاہد" کہتے ہیں، ان دونوں کی جان و مال کو کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانا ناجائز اور سخت گناہ ہے۔ تیسرے قسم کے وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں، ان سے قتال کا حکم ہے اور یہ آیات انہیں کے سلسلہ میں ہے ــــ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جب آپ پر کوئی شخص حملہ کرے تو آپ اپنی مدافعت کریں، تمام مذاہب اور قوانین میں انسان کو اپنی مدافعت اور حملہ آوروں کے

خلاف اقدام کی اجازت دی گئی ہے، جہاں تک ایسے ظالموں سے جنگ کی ترغیب دینے کی بات ہے تو یہ ___ جیسا کہ عرض کیا گیا ___ تمام ہی مذاہب میں موجود ہے۔

کرشن جی کا ہندو مذہب میں جو اہم مقام ہے عامی سے عامی ہندو بھی اس سے واقف ہے، لیکن ارجن ___ جو کوروؤں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا ___ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے انہوں نے کیسی کیسی ترغیب دی، دنیا اور آخرت کی فلاح دکھائی اور حیات وموت کے فلسفے بیان کیے، گیتا ان رزمیہ مضامین سے پُر ہے۔

مثلاً کرشن جی ارجن سے فرماتے ہیں:

> ہے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے، جو تیرے لیے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے، لہٰذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کرے گا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کر کے پاپ جمع کرے گا، بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لیے موت سے بدتر ہے۔ (۲:۳۲-۳۴)

غور کیجئے! کہ قرآن نے تو حملہ آوروں کی مدافعت کی ترغیب دی ہے، لیکن کرشن جی ارجن کو اقدامی حملہ کی ترغیب دیتے ہیں، اور کرشن جی کے دوسرے مواعظ جو گیتا میں مذکور ہیں، ان سے یہ بات جھلکتی ہے کہ اس کا مقصد اصل میں کشور کشائی، غلبہ وعزت اور ملک ومال کا حصول تھا نہ کہ ظالم کے ظلم کا سدِ باب ___ تو ایک طرف اس بے مقصد جنگ کی ترغیب کو تو برا نہیں سمجھا جائے اور دوسری طرف جارح کے خلاف اقدام کرنے کو بھی زیادتی سمجھا جائے، یہ کس قدر خلافِ انصاف بات ہے!

مال غنیمت سے متعلق دو آیتیں

> فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (الانفال:۶۹)

جو مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے، اسے پاکیزہ اور حلال سمجھ کر کھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ معاف کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔

وَعَدَكُمُ اللَّهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً (الفتح:۲۰)

اللہ نے تم سے بہت سارے مالِ غنیمت کا وعدہ کیا ہے، جسے تم پاؤ گے فوری طور پر تو فتح اس نے تمہیں عطا کردی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے؛ تاکہ یہ مومنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے۔

دونوں آیتوں میں مالِ غنیمت کا ذکر ہے، اس کا ترجمہ دی، ایچ، پی کے، پمفلٹ میں لوٹ کے مال سے کیا گیا ہے اور یہ تصور دیا گیا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کا جو بھی مال لوٹ لیں، وہ ان کے لیے جائز اور حلال ہے ___ جیسا کہ بار بار واضح کیا جاچکا ہے ___ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے، یہ آیات ہر غیر مسلم سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ یہ ان لوگوں سے متعلق ہیں جو مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں، کہ اگر مسلمان ان پر فتح پائیں اور جنگجو حضرات قید کرلیے جائیں، تو ان کے مال کا کیا حکم ہوگا؟ اس سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا کہ وہ مالِ غنیمت ہوگا، عربی زبان میں مشقت کے بغیر کسی چیز کے حاصل ہونے کو "غنم" ("غ" پر پیش یا زبر) کہتے ہیں۔ (القاموس المحیط: ۱۴۷۶) چوں کہ جنگ کے حاصل ہونے والے مال میں تجارت یا زراعت کی مشقت نہیں اٹھائی جاتی، اس لیے اس کو مالِ غنیمت کہتے ہیں، غنیمت کا ترجمہ "لوٹ کے مال" سے قطعاً درست نہیں، لوٹ تو ایک غیر قانونی طریقہ ہے، اسلام میں یہ حکم ہے کہ جب کوئی قوم مسلمانوں سے برسر جنگ ہو اور مسلمانوں کو فتح حاصل ہو تو جہاں تک ممکن ہو باغات اور کھیتیوں کو تاخت وتاراج نہ کیا جائے، مکانات منہدم نہ کیے جائیں، اپنے طور پر شکست خوردہ لوگوں کا مال لے کر استعمال نہیں کیا جائے، ایک غزوہ کے موقع سے فوجیوں نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ذبح کرکے

پکانے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بہت خفگی ظاہر فرمائی اور دیگیں الٹوا دیں۔

مالِ غنیمت کے سلسلہ میں اصول یہ رہا ہے کہ مفتوحین کے مال حکومت کے پاس جمع کیے جائیں، اس میں سے پانچواں حصہ حکومت کے خزانہ میں محفوظ کردیا جائے اور اسے رعایا کی بھلائی کے لیے خرچ کیا جائے، یہ رقم مسلمان رعایا پر بھی خرچ ہوگی اور غیر مسلم رعایا پر بھی، اس زمانہ میں فوجیوں کے لیے الگ تنخواہ نہیں ہوا کرتی تھی اور ان میں جنگ میں حاصل ہونے والے مال کے بقیہ چار حصے تقسیم کردیے جاتے تھے، بعض صورتوں میں حکومت اپنے اختیارِ تمیزی اور عوامی مصلحت سے کسی مال کو روک بھی سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی مفتوحہ اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم نہیں فرمائی، بلکہ بیت المال کی ملکیت میں باقی رکھا، بہرحال تقسیم کے بعد جو مال جس کے حصہ میں پڑے گا، وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مالِ غنیمت ہر غیر مسلم کے مال کو نہیں کہیں گے، بلکہ دشمن ملک کے حاصل شدہ مال کو مالِ غنیمت کہا جائے گا اور ایسا بھی نہ ہوگا کہ جس کے ہاتھ میں جو آئے وہ اس پر قابض ہوجائے، بلکہ قانونی طریقہ پر ہی کوئی شخص اس مال کا مالک ہوسکتا ہے۔

اب اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مالِ غنیمت کا تصور دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین اور مذاہب میں رہا ہے، اسلام سے پہلے عرب کے قریب ایرانیوں اور رومیوں کی حکومت تھی، ایرانیوں کے یہاں بھی یہی اصول تھا کہ وہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کرلیتے تھے، رومی تورات کے قانون کو مانتے تھے، یہودی بھی اسی قانون پر عقیدہ رکھتے ہیں، اب دیکھئے کہ بائبل میں مالِ غنیمت کی بابت کیا کہا گیا ہے؟

> اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردیوے، تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مویشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو، اس کی ساری لوٹ اپنے لیے لے اور تو اپنے دشمن کی اسی لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے، کھائیو۔'' (استثناء، ۲۰: ۱۲-۱۴)

توریت میں جا بجا مفتوحین کو لوٹنے کا ذکر ہے، یہاں ان سب کا تذکرہ درازیٔ

کلام کا باعث ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر ''گنتی'' اور ''استثناء'' نامی صحائف کو پڑھا جاسکتا ہے۔

اب خود ہمارے ہندو بھائی ایک نظر اپنی مذہبی کتابوں پر ڈالیں: رگ وید میں ہے:

اے اگنی! تیرے مالدار پجاری خوراک حاصل کریں اور امراء بڑی عمریں پائیں، ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کریں اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ نذر کریں، اے اگنی! ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، آدمیوں کے ذریعہ آدمی اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔'' (۱:۷۴:۵،۹)

یجر وید میں ہے:

یہ اگنی ہم کو وسیع مکان اور آرام وآسائش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مارتے بھگائے چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے۔'' (۸:۴۴)

سام وید میں ہے:

اے چابکدست بہادرو! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہو کر ہزار دو ہزار مالِ غنیمت لوٹ، اے سرگرم کار مگھون! پرشوق دعاؤں کے ساتھ ہم زرد رنگ کے مال اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں۔

(۲ : ۲ : ۱۲ : ۳)

اتھر وید میں کہا گیا ہے:

دشمن خالی ہاتھ ہو جائے، ہم ان کے اعضاء کو مفلوج کردیں اور اس طرح اے ذوالجلال سپہ سالار اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں سینکڑوں کی طرح سے بانٹ لیں۔(٦ : ٦٦ : ٣)

پنڈت کشیم کرن داس ترویدی جی نے اس اشلوک کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

فاتح بہادر دشمنوں کو فتح کرکے سپہ سالار کی ہدایت کے مطابق حکومت کا حصہ

نکال کر ان کے مال دولت کو تقسیم کر لیں۔

(قرآن مجید پر اعتراضات: ۱۷ بحوالہ ہندی ترجمہ کشیم کرن داس)

اتھرو وید میں ایک اور اشلوک اس طرح ہے:

اے سپہ سالار! اپنے بہادروں میں طاقتور شخص کو زرہ پہنا دے، اور دشمنوں میں ہرن کی طرح بزدلی پیدا کر دے، دشمن الٹے منہ چلا جائے، زمین ہماری طرف آجائے۔ (٦ : ٦٧ : ٣)

منوسمرتی ہندو مذہب میں قانون کی کتاب کے درجہ میں ہے اور اسی قانون پر ہندو سماج کی اور نظامِ حکومت کی اساس ہے، منوجی فرماتے ہیں:

''رتھ، گھوڑے، ہاتھی، چھتر، مال و دولت، جانور، عورت، گڑ، نمک، مادّی چیزیں، تانبا، پیتل وغیرہ چیزیں ان میں جس چیز کو جو جیت کر لاتا ہے، وہ اسی کا ہوتا ہے۔'' (منوسمرتی ۷: ۹۶،۹۵)

آج بھی جب کوئی ملک دوسرے ملک پر فتحیاب ہوتا ہے تو مفتوحہ علاقوں میں جو چیز فاتحین کو ہاتھ آتی ہے، وہ اسے اپنی صوابدید سے تقسیم کرتے یا استعمال کرتے ہیں، لیکن اسلام میں یہ ضروری نہیں کہ لامحالہ مفتوحین کے مال پر قبضہ کر ہی لیا جائے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ مسلم حکومت ان چیزوں کو مفتوحین کی ملکیت میں رہنے دیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کے ساتھ غزوۂ خیبر کے موقع پر کیا تھا۔

جزیہ

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ ۔ (التوبہ: ۲۹)

جو کتاب والے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں ٹھہراتے ہیں، اور دین حق کو اختیار نہیں کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ رعیت بن کر جزیہ دینے لگیں۔

اس میں وی، ایچ، پی والوں نے "حَتّٰی یُعْطُوْا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَّ هُمْ صَاغِرُوْنَ" کا ترجمہ کیا ہے: "ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھوں سے جزیہ دینے لگیں"؛ حالانکہ یہاں "صاغرون" سے مراد فاتحین کے اقتدار کو تسلیم کرنا ہے، یعنی مفتوح فاتح کے مقابلے اپنے رعایا ہونے کی حیثیت کا اعتراف کرلے، جیسا کہ آج بھی ہتھیار ڈالنے والے ممالک اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں، اس کا مقصد تحقیر و تذلیل نہیں ہے، جیسا کہ وی، ایچ، پی کے پروپیگنڈہ باز ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے، جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا، اس لیے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس جزیہ کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کے حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا، لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اس لیے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۱۲/ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۲۴/ اور زیادہ آمدنی والوں کے لیے ۴۸/ درہم۔ ۱۲/ درہم ۳ تولہ سے کچھ کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲ درہم ۲۶۵ روپیہ سے کچھ کم و بیش ہے۔ آپ حضرات غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکوریٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے، اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے تو ہم شکر گذار ہوں گے، یہ ہے اس جزیہ کی حقیقت جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم و زیادتی،

تشدد اور ناروا داری کا عنوان دیا گیا ہے۔

مشرکین ناپاک ہیں؟

یَـا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلاَ يَقْرَبُواْ الْمَسْجِدَ الْـحَرَامَ بَـعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ إِن شَاء إِنَّ اللّهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ. (التوبہ:۲۸)

''اے ایمان والو! شرک کرنے والے (مورتی پوجک) لوگ ناپاک ہیں۔''

اس آیت کے سلسلہ میں چند نکات ملحوظ رکھے جانے چاہئیں:

(۱) یہاں مشرک سے صرف بت پرست (مورتی پوجک) مراد نہیں ہیں، جیسا کہ وی، ایچ پی والوں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے، بلکہ وہ تمام لوگ شامل ہیں جو خدا کی ذات یا اس کی مخصوص صفات واختیارات میں دوسروں کو شریک ٹھہرائیں، خواہ وہ بت کا پرستار ہو، یا کسی پیغمبر کو خدا کا درجہ دیتا ہو، یا اللہ کے کسی نیک بندہ کو خدا کی قدرت واختیار میں ساجھے دار سمجھتا ہو، جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، لیکن انہوں نے خدانخواستہ غیر اللہ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہو اور رسول اور اولیاءؒ کی ذات میں وہ اختیارات مانتے ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں، تو وہ بھی مشرک کا مصداق ہیں۔

(۲) مشرکین کو ناپاک کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، ان کے کپڑے ناپاک ہیں، یا ان کا جھوٹا ناپاک ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی مہمان نوازی کی ہے، خود ان کی دعوت قبول فرمائی ہے، مسجد نبویؐ میں ان کو ٹھہرایا ہے، اپنے بستر پر انہیں بٹھایا اور سلایا ہے، اگر انہیں جسمانی اعتبار سے ناپاک سمجھا جاتا تو کس طرح آپؐ ایسا عمل فرماتے، اس لیے یہاں عقیدہ اور فکر کی ناپاکی مراد ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی شخص کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ناکام عزائم رکھتا ہے، یا آپ کہتے ہیں کہ فلاں دہشت گردوں کے ناپاک منصوبے ناپاک کردیے گئے، یہاں ناپاکی سے عمل اور سوچ کی غلط اور مبنی برخطا ہونے کا اظہار کیا جاتا ہے، گویا اس آیت میں شرک

کے نہایت غلط اور خلافِ واقعہ عمل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۳) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اثبات اور شرک کی نفی صرف اسلام ہی نے نہیں کی ہے، بلکہ یہ تمام ہی مذاہب کی اصل تعلیمات ہیں، بائبل میں جگہ جگہ شرک کی مذمت آئی ہے اور ہمارے عیسائی بھائی جو آج تین کے مجموعہ کو خدا مانتے ہیں ،ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے بائبل کا کوئی صریح فقرہ موجود نہیں ہے، اس لیے وہ تاویل کرتے ہیں کہ یہ تین مل کر ایک ہی ہیں، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی خدا کے بارے میں بہ تاکید وحدانیت کا ذکر ہے، شرک کی نفی ہے، کہا گیا ہے کہ خدا جسم والا نہیں ہے، وہ تنہا پورے عالم کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس سلسلہ میں پنڈت دیانند جی سرسوتی نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں بت پرستی کی تردید میں ہندو مذہبی کتابوں کے جو حوالے نقل کیے ہیں، وہ بہت ہی چشم کشا ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل ہندو مذہب توحید ہے نہ کہ شرک، اسی کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ویدوں کے چند حوالے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

☆ وہ محیط، پاک اور جسم سے خالی ہے۔'' (یجروید: ۴۰: ۸)

☆ میں افضل ترین قوت ونعمت کا منبع، سورج کی طرح تمام عالم کو منور کرتا ہوں، میں نہ کبھی مغلوب ہوتا ہوں اور نہ مرتا ہوں، یہ تمام عالم جو نعمتوں کا مخزن ہے اس کا خالق میں ہوں، تم مجھے ہی اس دنیا کا خالق اور مبتدا سمجھو، اے اہل علم! تم نعمت وحشمت کے حصول کے لیے کوشاں رہ کر علم وغیرہ نعمتوں کے لیے مجھ ہی سے التجا کرو، میری رفاقت سے کبھی روگرداں نہ ہو۔'' (رگ وید، ۵: ۴۸: ۱۰)

رگ وید ہی کے یہ ارشادات کس قدر بصیرت مندانہ اور عقیدۂ توحید کے بارے میں واضح ہیں:

☆ اے بنی نوع انسان! میری حقیقی حمد وثنا، راست گوئی ہے، ایسی حمد کرنے والے انسان کو میں ازلی علوم وغیرہ نعمتیں عطا کرتا ہوں ...... اس لیے عالم میں جو اشیاء موجود ہیں، ان کا خالق اور قیوم میں ہوں، اس لیے تم مجھے چھوڑ کر کسی اور کی

عبادت مت کرو اور نہ کسی کو میری جگہ معبود مانو اور جانو۔'' (اتھروید: ۱۰/ ۴۹: ۱)

پنڈت سرسوتی جی نے کینو پنشد (۱:۶) کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> جسے آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا، بلکہ آنکھ جس کی قدرت سے دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، اسے ہی تم خدا سمجھو، آنکھ سے دکھلائی جانے والی جن چیزوں کی لوگ عبادت کرتے ہیں، وہ خدا نہیں ہیں۔

ہندو مذہب کی اہم معتبر کتابوں کی عبارتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہرانا، یہی اصل ہندو دھرم ہے، تو مشرکوں کو ناپاک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے آپ کو ہندو کہے اور اصل مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو یہودی کہے اور اصل یہودی مذہب پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو عیسائی کہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات پر عمل نہ کرے، جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اس کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ ہو، وہ اپنے خیال وعقیدہ کے اعتبار سے ناپاک ہیں۔

(۴) جو لوگ کسی دھرم کا نام لیتے ہوں اور اس کی اصل تعلیم پر عمل نہ کرتے ہوں ان کو ہر مذہب میں عقیدہ کے بگاڑ کے اعتبار سے خراب نام دیے گئے ہیں، جن لوگوں نے بائبل کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس سے خوب واقف ہیں کہ اس کتاب میں بہت سے مواقع پر شرک کرنے والے کو کسبی، فاحشہ، زانی، بدکار وغیرہ کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، دھرم پر عمل کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کے درمیان فرق ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی زیادہ سخت لب ولہجہ میں ملتا ہے، ''دسیو'' اور ''داس'' کے نام سے ہندوستان کے اصل کالے باشندوں کو ویدوں میں یاد کیا جاتا ہے، جو آریہ لوگوں کے مذہب پر نہیں تھے، اس قوم کے بارے میں ویدوں کے کلمات ملاحظہ کیجئے:

☆ ہمارے گرد وہ دسیو ہیں جن کا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج۔ (رگ وید: ۱۰: ۲۲: ۲: ۸)

☆ اے بہادر! تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کر لیا۔ (رگ وید: ۷:۴۹:۴)

تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دسیوں کو قتل کرتا ہے۔ (رگ وید: ۵:۲۹:۱)

کہیں ان لوگوں کو ''سیاہ رو'' مخلوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، (رگ وید: ۶:۲۱) کہیں انہیں ''گھن کھائے درخت'' کہا جاتا ہے۔ (رگ وید: ۸:۴:۶) کہیں ''کالے غولوں'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، (سام وید: ۴:۲:۴:۱۱) ویدوں میں اَدھرمی لوگوں کے لیے حریص راکشش اور خبیث دشمن وغیرہ کے نام دیے جاتے ہیں۔

اب انصاف کی نظر سے دیکھا جائے کہ قرآن نے تو ایک جگہ مشرکین کو ناپاک کہا ہے، لیکن ویدیں اس مذہب کے مخالفین کو خبیث، بیل جیسے جبڑے والے نکٹے، سیاہ رو، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، بدذات، پاپی، حریص، راکشش وغیرہ کے الفاظ بے تکلف کہتی ہیں، بلکہ اتھر وید میں آدھرمی لوگوں کے لیے بعینہٖ ''ناپاک'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

یا تو دھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے کے لیے اٹھیں، توڑ دے، ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر اے اگنی! انہیں مار گرا، مردار خوار چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس ''پلید'' کو آدمیوں میں سے آدم خور کی طرح تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضاء کو توڑ ڈال۔ (اتھر وید: ۸:۳:۶-۷-۱۰)

(۵) یہ تو وہ القاب ہیں جو ادھرمی لوگوں کو دیے گئے ہیں، لیکن منوجی کی تعلیمات میں عقیدۂ وفکر کی بنیاد پر نہیں، بلکہ نسل و خاندان کی بنیاد پر شودروں کو نہایت ذلیل وحقیر القاب دیے گئے ہیں اور ان کے بارے میں وہ احکام دیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شودر جسمانی طور پر پیشاب، پائخانہ کی طرح ناپاک اور قابلِ اجتناب ہیں، اس سلسلہ میں میں ہندو مآخذ میں اتنا کچھ ہے کہ اگر ان سب کو نقل کیا جائے تو ایک رسالہ بھی ناکافی ہے، چند نمونے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں:

- ہاتھی، گھوڑے، شودر قابل نفرت ملیچھ لوگ، شیر، تیندوے اور سور (پنر جنم کے) وہ ادنیٰ درجے ہیں، جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔ (منوسمرتی، ۱۲:۴۳)
- شودر کا کھانا نہ کھائے۔'' (منوسمرتی:۴:۲۱۱)
- شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے نرک (دوزخ) میں چلا جاتا ہے۔

(منوسمرتی ۳:۱۷)

- اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھالے تو تین دن تک اُپاس کرے (بھوکا رہے) اور اگر جان بوجھ کر کھالے تو اس کا کفارہ وہی ادا کرے جو حیض، پائخانہ، یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لیے مقرر ہے۔'' (منوسمرتی:۴:۲۲۲)
- غذا سور کی بدبو سے، کتے کی نظر سے اور شودر کے چھونے سے گندہ ہو جاتی ہے۔

(منوسمرتی:۳:۲۹۱)

ان تصریحات سے ــــ جو نہ صرف منوشاستر میں ہیں، بلکہ ایسی بعض عبارتیں ویدوں میں بھی موجود ہیں ــــ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے ایک طبقہ کو ہندو مذہب کے موجودہ مآخذ کی روایت کے مطابق کس نظر سے دیکھا گیا ہے؟

تاہم مجھے یقین ہے کہ اصل ہندو مذہبی کتابوں میں ایسی ظلم وزیادتی کی باتیں اور غیر انسانی تصورات نہیں ہوں گے، یہ مذہب کی اصل کتابوں میں آمیزشوں اور ملاوٹوں کا نتیجہ ہوگا، ہمیں ہندو مذہب میں ذکر کیے جانے والے بزرگوں اور علماء کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ انہوں نے ایسی غیر انسانی باتیں کہی ہوں گی، بلکہ یقیناً ایسی غلط باتیں کچھ لوگوں نے دوسروں کے استحصال اور اپنی مقصد براری کے لیے ان کی طرف منسوب کردی ہوں گی۔

غیر مسلموں سے دوستی

اس پمفلٹ میں ان آیات کو بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے جن میں کفار کی عداوت اور ان سے دوستی نہیں رکھنے کا ذکر ہے، وہ آیات اس طرح ہیں:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَقْصُرُواْ مِنَ الصَّلاَةِ إِنْ خِفْتُمْ أَن يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُواْ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُواْ لَكُمْ عَدُوّاً مُّبِيناً. (النساء:۱۰۱)

اور جب تم ملک میں سفر کرو تو تم پر حرج نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کرو، اگر تم کو اندیشہ ہو کہ کافر تم کو ستاویں گے، بیشک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيراً مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ. (المائدہ:۵۱)

اے ایمان والو! تم یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا، وہ انہیں میں سے ہوگا، بیشک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الَّذِينَ اتَّخَذُواْ دِينَكُمْ هُزُواً وَلَعِباً مِّنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاء وَاتَّقُواْ اللّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. (المائدہ:۵۷)

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) مل چکی ہے اور وہ ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اگر تم ایمان والے ہو۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ آبَاءكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاء إَنِ اسْتَحَبُّواْ الْكُفْرَ عَلَى الإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (التوبہ:۲۳)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور بھائیوں کو اپنا دوست مت بناؤ، اگر وہ ایمان کے مقابلہ کفر کو پسند کریں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے گا، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہوں گے۔

پہلی آیت (النساء:۱۰۱) میں بھی اہل مکہ کا بیان ہے کہ یہ تمہارے کھلے ہوئے اور سخت دشمن ہیں، کہیں مسلمان کسی مرحلہ پر دھوکہ نہ کھا جائیں اور ان کی دوست نما دشمنی کا شکار نہ ہو جائیں، یہ آیت بھی انہیں مشرکین مکہ سے متعلق ہے۔

چنانچہ اس آیت کے بعد نمازِ خوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔(نساء:۱۰۲) کہ جب جنگ کی حالت ہو اور دونوں طرف سے فوجیں صف آرا ہوں، اس وقت مسلمانوں کو کس طرح نماز ادا کرنی چاہیے؟ کیوں کہ اہل مکہ سے اس وقت پے در پے معرکے درپیش تھے، یہ آیت تمام غیر مسلموں سے متعلق نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی واضح دلیل ہے، آپؐ نے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ کیا، بنوخزاعہ کافر تھے، لیکن مسلمانوں کے حلیف اور دوست تھے، اس طرح کے معاہدے آپؐ نے بعض اور غیر مسلم قبائل سے بھی کیے ہیں، اگر کفار سے مطلقاً دوستی کی اجازت نہ ہوتی اور وہ سب کے سب دشمن قرار دیئے جاتے، تو آپؐ نے کیسے ان غیر مسلم قبائل کو اپنا حلیف بنایا ہوتا؟

دوسری اور تیسری آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمان بار بار یہودیوں سے معاہدہ کرتے تھے اور یہودی اس وعدہ کی خلاف ورزی کرتے تھے، یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں تو انہوں نے اہل مکہ کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی بیخ و بن اکھاڑ دینے کی کوشش کی، یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متہم کرتے تھے اور ولد الزنا ٹھہراتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام پر تہمت لگاتے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر لعنت بھیجتے تھے، قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نبی ہونے کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا، ان پر اور ان کی والدہ پر جو تہمتیں لگائی جاتی تھیں، اس کی تردید کی، لیکن ہوا یہ کہ وہ بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو تقویت پہنچاتے اور اسلام کی دعوت کو قبول کرتے، اپنے پیغمبر کو گالی دینے والے یہودیوں کے ساتھ مل بیٹھے، اس لیے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ انہیں اپنا راز دار نہ بنائیں، کیوں کہ ایسے شدید اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے میں یہود و نصاریٰ اور کفارِ مکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، عقیدہ و مذہب کے تضاد کی وجہ سے

مسلمان انہیں اپنا راز دار بنا کر کہیں نقصان نہ اٹھالیں۔

پانچویں آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ بہ مقابلہ خونی رشتہ کی محبت کے مذاہب اور عقیدہ کا تعلق زیادہ اہم ہے، یعنی اگر کوئی شخص ایمان لے آیا ہو، اس کے آباء واجداد، بھائی بہن کفر کی حالت میں ہوں، تو ایسا نہ ہو کہ اپنے اعزہ اور اقارب کی محبت اور ان کا تعلق اسے حق کی راہ سے منحرف کردے؛ کیوں کہ جہاں حق اور ناحق کا مقابلہ ہو اور دو ایسی باتوں کا ٹکراؤ ہو جن میں ایک طرف حق اور سچائی ہو اور دوسری طرف رشتۂ قرابت، تو سچائی کو رشتوں پر ترجیح دینی چاہیے۔ یہ تو اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے اور ہر قوم کے لیے ہے کہ جس چیز کو وہ حق اور انصاف سمجھتی ہو اسے دوسرے تمام تعلقات پر غالب رکھے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو غیر مسلم اقرباء ہوں ان سے مسلمانوں کو نفرت کرنی چاہیے، ان کے ساتھ حسن سلوک نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حال میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، آپؐ نے غیر مسلم کی عیادت کی ہے، مکہ میں قحط پڑا تو آپؐ نے کفارِ مکہ کے لیے امداد بھجوائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک عزیز کے لیے ریشمی عباء بھیجی، بعض صحابہؓ کی والدہ ان کے مسلمان ہونے پر ناراض تھیں اور انہوں نے احتجاجاً کھانا کھانا چھوڑ دیا تھا، آپؐ نے انہیں نصیحت کی کہ اسلام پر قائم رہنا بھی ہے، لیکن اس کا بھی لحاظ رکھنا ہے کہ والدین کے ساتھ بدسلوکی نہ ہو۔ اگر غیر مسلم رشتہ داروں سے نفرت کی تعلیم دی گئی ہوتی، تو مسلمانوں نے اس طرح حسن سلوک کیوں کیا ہوتا؟ اصل یہ ہے کہ موالات سے ہر طرح کی دوستی اور تعلق مراد نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی مراد ہے جو انسان کے فکر وعمل پر اثر انداز ہونے لگے اور کسی گروہ کی رازدارانہ باتیں جن کا دوسروں تک پہنچنا اس گروہ کے لیے ضرر کا باعث بن سکتا ہو، پہنچنے نہ دے، ایسے گہرے تعلق کو اصل میں ''موالات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تعلق کے مختلف درجات ہیں، ان کو ایک ممتاز صاحبِ علم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ تعلقات چار طرح کے ہو سکتے ہیں: مدارات، مواساۃ، معاملات اور موالات۔ مدارات: دوستانہ برتاؤ اور خوش

خلقی کا نام ہے، یہ غیر مسلموں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ انہیں اس کا حکم دیا گیا ہے، مواساۃ: غمگساری و نفع رسانی اور مالی تعاون سے عبارت ہے، غیر مسلموں کے ساتھ بھی مواساۃ کا حکم دیا گیا ہے، تیسرے معاملات، یعنی مالی کاروبار جیسے تجارت، ملازمت وغیرہ، اس میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی فرق نہیں، چوتھا درجہ موالات کا ہے، موالات سے مراد ایسی دوستی ہے کہ آدمی دوسرے کی تہذیبی و تمدنی اثرات کو قبول کرنے لگے اور اپنے رازہائے سربستہ کو دوسروں تک پہنچائے جس سے اسے مضرت بھی پہنچ سکتی ہے، قرآن نے اسی درجہ تعلق "موالات" سے منع کیا ہے، أ **لاتجعلوا خاصتکم و بطانتکم منھم** ۔(تفسیر قرطبی: ۲۷۲/۳) اسی ممانعت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی بیاہ کا تعلق نہیں ہوسکتا، وہ ایک دوسرے سے میراث کے حق دار نہیں ہوتے۔

پس دو باتیں ان آیات کے بارے میں ذہن میں رکھنے کی ہیں: اوّل یہ کہ یہ آیات بھی ان کفار کے پس منظر میں ہیں جن سے اس وقت مسلمانوں کا سابقہ تھا، دوسرے اس میں ہر طرح کی دوستی کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ ایسی دوستی کی ممانعت ہے جس میں مسلمان اپنی تہذیبی اور تمدنی قدروں سے محروم ہو جائیں، وہ دوسری قوموں کے ساتھ تہذیبی اور فکری اعتبار سے جذب ہونے لگیں، یا جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہے ان تک اپنے ایسے راز و اسرار کو پہنچانے لگیں جو پوری قوم کے لیے نقصان دہ اور مضرت رساں ہوں ـــــ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی قوم اگر اپنی تہذیب کی حفاظت اور بچاؤ کی کوشش کرتی ہے، تو یہ کوئی مذموم و ناپسندیدہ بات نہیں، آج تو تمام تہذیبی اکائیوں کے لیے عالمی سطح پر اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے، کہ اپنے تمدن کی حفاظت کریں اور اسے کھونے نہ پائیں۔ خود ہمارے اس ملک میں چھوٹی چھوٹی تہذیبی اکائیوں کی رعایت سے بعض ریاستوں میں خصوصی قوانین ہیں، وہاں دوسرے لوگ زمینیں بھی نہیں خرید سکتے، نیز ملکی قوانین کی جگہ بعض امور میں ان کے روایتی قانون کو ترجیح دی جاتی ہے، اس لیے یہ کسی گروہ کے خلاف نفرت کی تعلیم نہیں، بلکہ مسلمانوں کو مختلف مذہبی اکائیوں کے ساتھ رہتے

ہوئے بھی اپنی ثقافت کو برقرار رکھنے اور اپنے مذہبی اقدار پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم ہے۔

اب یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ خود ہندو مذہب میں جو لوگ ادھرمی اور ہندو مذہب پر ایمان نہ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے، ان کے لیے عام طور پر ''دشمن'' ہی کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے، بلکہ اس طرح ان کا ذکر کیا جاتا ہے، جیسے ان کا نام ہی دشمن ہو، چند مثالیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

☆ ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، ہم تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کر کے۔ (رگ وید:۲:۱۱:۱۹)

☆ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوشحال ہوں۔

(رگ وید:۶:۸:۱۳)

☆ دشمنوں کے قتل کرنے والے در تیرا! دسیوں کو ہلاک کرنے والے!۔

(رگ وید:۱۰:۸۳:۳)

☆ تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر...... قتل کیے جاؤ دشمنوں کو کچلے جاؤ۔

(رگ وید:۱۰:۸۴:۲-۳)

☆ اندر اور سورما! تو خبیث دشمن کو جلا دے۔ (اتھرو وید:۳:۴:۱-۱)

غرض کہ ہندو مذہبی کتابوں میں ان لوگوں کو جو اس مذہب کو نہ مانتے ہوں یا جن کو آریہ نسلی اعتبار سے حقیر جانتے ہوں، انہیں عام طور پر ''دشمن'' ہی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شودروں کا بدقسمت گروہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اگر دوستی اور دشمنی کے پیمانے میں رکھ کر ان کے بارے میں ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیمات کو دیکھا جائے تو حقارت کے علاوہ ان سے نفرت کا اظہار بھی ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ اونچی ذات کے لوگوں کو ان لوگوں سے بے تعلق رہنا چاہیے اور ان سے ہرگز دوستی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہیے، مثلاً منو جی شودروں کے بارے میں ہدایت کرتے ہیں:

☆ وہ کسی برادری سے خارج کیے ہوئے شخص یا چنڈ کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔ (منوسمرتی:۴:۷۹)

واضح ہو کہ چنڈ سے مراد وہ شخص ہے جو شودر مرد اور برہمن عورت کے اختلاط سے پیدا ہوا ہو۔

☆ جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دے گا اور جو اسے مذہبی مراسم ادا کرنا سکھائے گا، وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم ورت نامی جہنم میں جائے گا۔ (منوسمرتی:۴:۸۱)

☆ چنڈ اور سپاس لوگوں کی رہائش بستی کے باہر ہونی چاہیے۔ (منوسمرتی:۱۰:۵۱)

☆ براہمن شودر سے کبھی دان نہ لے۔ (منوسمرتی:۱۱:۲۴)

یہ محض چند مثالیں ہیں، ورنہ منوسمرتی تو ایسی تعلیمات سے پُر ہیں اور ان کو اتنا قابل اجتناب سمجھا گیا ہے کہ:

☆ اگر براہمن کسی بلی یا نیولے یا چوہے یا مینڈک یا کتے یا چھپکلی یا اُلو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے۔

(منوسمرتی:۱۱:۱۳۲)

غور فرمایئے کہ نسل و مذہب کی بنیاد پر ایک طبقہ کے ساتھ کیسی نفرت وعداوت کو روا رکھا گیا ہے اور کس کس طرح لوگوں کو ان سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی ہے؟؟

غیر مسلم اور ہدایت

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ. (التوبہ : ۳۷)

اللہ کافر لوگوں کو صحیح راستہ نہیں دکھاتا

یہ آیت کا صرف آخری ٹکڑا ہے، پوری آیت کا ترجمہ دیکھ لیا جائے تو خود بخود غلط فہمی دور ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ بات بتائی کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت سے ہی سال کے بارہ مہینے ہیں، یعنی ۱۲ مہینوں میں سورج کے گرد زمین کی گردش پوری ہوتی ہے، ان میں سے چار مہینے ”حرام“ ہیں، یہ چار مہینوں کے حرام ہونے کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی عربوں میں چلا آ رہا تھا، ان مہینوں کے حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں جنگ کی مکمل ممانعت ہے، عرب کے خطہ میں جہاں کوئی قانونی حکومت نہیں تھی، ان

مہینوں کا احترام لوگوں کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا، کیوں کہ ان ہی مہینوں میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کر سکتے تھے، یہ چار مہینے تھے: رجب، ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔

لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ جب وہ ان مہینوں میں سے کسی مہینہ میں جنگ کے لیے مناسب موقع پاتے تو مہینے کو بدل دیتے، مثلاً کہتے کہ اس سال ذوقعدہ کی جگہ صفر ہے اور صفر کی جگہ ذوقعدہ، اسی طرح کبھی مہینہ بڑھا دیتے اور بارہ مہینوں کی جگہ تیرہ مہینوں کا سال قرار دیتے، کبھی مہینہ گھٹا کر ۱۱ مہینوں کا سال کر دیتے۔ قرآن مجید نے ان کے اس رویہ پر تنقید کی اور فرمایا:

> إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (توبہ: ۳۷)
>
> بیشک نسی (مہینوں کا اپنی جگہ سے ہٹا دینا) کفر میں زیادتی ہے، اس کے ذریعہ کفر کرنے والے گمراہ کیے جاتے ہیں، وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال حرام سمجھتے ہیں، تا کہ ان مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے، گنتی پوری کر لیں، پھر اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں، ان کی بداعمالیاں انہیں اچھی معلوم ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

غرض کہ اہل مکہ کے جانتے بوجھتے اس غلط روش کو اختیار کرنے کی قرآن نے مذمت کی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ عوام کو گمراہ کیا جاتا تھا، مثلاً کسی چیز پر سالانہ سود مقرر ہوا ہے اور آپس میں مشورہ کر کے دس مہینے کا سال قرار دے دیا، تو اب دس ہی ماہ میں وہ پورا سود بیچارے بھولے بھالے عوام سے وصول کرنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، اسی طرح کسی کو ایک سال کے لیے مزدوری پر رکھا اور اجرت سالانہ متعین کی، اب بارہ کے بجائے چودہ ماہ کا سال مقرر کر لیا اور دو مہینہ زیادہ اس سے خدمت لے لی، اس طرح پر عوام کو بے وقوف بنانے کا حیلہ تھا، اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ کچھ کافروں ہی کو اس نام پر گمراہ کیا جاتا ہے اور دھوکہ میں ڈالا جاتا ہے،

پھر اہلِ مکہ میں سے ان مجرم پیشہ لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ یہ چوں کہ دانستہ طور پر غلطی پر مصر ہیں، اس لیے ان کو ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔

پس یہ بات کافروں کے ایک خاص گروہ کے بارے میں ہے، ورنہ قرآن تو چاہتا ہی ہے کہ جو مسلمان نہیں ہیں وہ بھی ہدایت کے راستہ پر آئیں، اسی لیے قرآن نے اپنا تعارف ہی یہ کرایا ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ہدایت ہے "هُدًى لِلنَّاسِ" (البقرہ ۲:) اور اس امت کو حق اور سچائی کی طرف بلانے کا حکم دیا گیا ہے، تو اگر قرآن کا یہ تصور ہوتا کہ کسی غیر مسلم کو وہ راستہ مل ہی نہیں سکتا جس کو اسلام صحیح راستہ سمجھتا ہے اور ہدایت قرار دیتا ہے، تو کیوں کر امتِ مسلمہ کو انسانیت کی دعوت کے لیے مامور کیا جاتا؟

عیسائیوں میں آپسی عداوت

فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ. (المائدہ:۱۴)

پھر ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے اور اللہ جلد انہیں بتادے گا جو کچھ کہ وہ کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی آیت کا ایک ٹکڑا ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَى أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ. (المائدہ:۱۴)

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا، جو کچھ انہیں نصیحت کی گئی، اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے، تو ہم نے ان میں قیامت تک کے لیے باہم بغض و عداوت پیدا کر دی اور عنقریب اللہ انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں، ان کے بارے میں بتائیں گے۔

اس آیت میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ یہ ارشاد ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں، نہ کہ تمام غیر مسلموں سے متعلق، دوسرے قرآن نے ہمیں بتایا کہ ان سے حضرت عیسیٰ نے عہد لیا تھا کہ آپ کے بعد جو نبی آئے گا، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وہ ان پر ایمان لائیں گے، لیکن انہوں نے اس عہد کو پس پشت ڈال دیا، حالانکہ عیسائیوں نے اور خاص کر سینٹ پال نے عیسائی عقائد کو پوری طرح ردّ و بدل کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں اپنی طرف سے آمیزشیں کر دی ہیں، لیکن اس کے باوجود انجیل میں ابھی بھی محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی طرف اشارے موجود ہیں، یہاں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو ارشادات نقل کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

- اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ (یوحنا: ۱۴:۱۶)
- میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" (یوحنا: ۱۶: ۷، ۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی نبوت کا دعویٰ فرمایا، قرآن نے آپ کو "خاتم النبیین" یعنی ابد تک کی نبوت کا حامل قرار دیا اور آپؐ نے دنیا پر واضح کیا کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے معاندین میں کون راست باز ہے اور گنہ گار؟ اس طرح عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ اور انجیل کی تعلیم کے مطابق آپؐ پر ایمان لانا ضروری تھا، لیکن انہوں نے ایمان نہ لا کر اس عہد کی خلاف ورزی کی۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی قوموں پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بعض عذاب نازل کرتے ہیں، جن میں سے ایک ان کے درمیان باہمی اختلاف و افتراق کا پیدا ہو جانا بھی ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت

مسلمہ کے بارے میں بھی فرمایا کہ اس امت پر کوئی اجتماعی عذاب تو نازل نہیں ہوگا، لیکن آپسی اختلاف وافتراق کا عذاب ان کی شامتِ اعمال کی وجہ سے نازل ہوگا اور مسلمان عملاً آج اس سے گذر رہے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت تک عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان سخت اختلاف کی کیفیت باقی رہے گی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں میں جتنے زیادہ مذہبی فرقے ہیں، شاید ہی کسی اور مذہب میں ہوں اور مذہبی اختلاف کی بنیاد پر عیسائی فرقوں نے ایک دوسرے کو جس طرح بے تحاشا قتل اور زندہ جلا دینے کی سزا دی ہے، مشکل سے مذاہب کی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال ملے گی، کلیسائی نظام کے زمانۂ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کیے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، جن میں تین لاکھ چالیس ہزار کا تعلق صرف اسپین سے تھا اور ان میں بتیس ہزار وہ لوگ ہیں جو زندہ جلا دیے گئے، پھر عیسائی حکومتوں کی باہمی منافرت دیکھئے کہ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم دراصل ان ہی کی باہمی رقابتوں کے نتیجہ میں ہوئیں، جن میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بن گئے ۔ یہ قرآن کی ایک پیشین گوئی ہے اور ایسی پیشین گوئی ہے جو انسانیت کے مشاہدہ میں ہے، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ اعتراض، یا مسلمانوں کو کسی فرقہ کے خلاف بھڑکانے والی ہو۔

اس پمفلٹ میں چھ آیتیں وہ ذکر کی گئی ہیں جن میں کفر کرنے والوں کے لیے آخرت کی سزاؤں کا ذکر ہے۔ یہ آیات اس طرح ہیں:

غیر مسلم اور عذابِ آخرت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا لِيَذُوقُواْ الْعَذَابَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَزِيزاً حَكِيماً. (النساء: ٥٦)

بے شک جن لوگوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا، ہم انہیں دوزخ میں داخل کریں گے، جب جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم انہیں دوسری

کھالوں سے بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں، بیشک اللہ طاقت والا حکمت والا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ‏ (توبہ:۶۸)

منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے، یہی انہیں بس ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لیے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ أَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ (الانبیاء:۹۸)

یقیناً تم اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو، وہ دوزخ کا ایندھن ہیں اور تم لوگ اس میں اترو گے۔

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ . (حم السجدۃ:۲۷)

تو یقیناً ہم کفر کرنے والوں کو سخت عذاب چکھائیں گے اور ان کو ان کے برے کاموں کا بدلہ دیں گے۔

اس سے پہلے کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان لوگوں کے بارے میں فرمائی ہے جو قرآن مجید پڑھنے کے وقت شور وغل کرتے تھے اور لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے تھے۔

ذٰلِكَ جَزَآءُ أَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ . (حم السجدۃ:۲۸)

یہ بدلہ ہے اللہ کے دشمنوں کا، آگ، اسی میں ان کا ہمیشہ کا گھر ہے، اس کے بدلہ میں کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيَاتِ رَبِّهٖ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا إِنَّا مِنَ

الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ. (السجدۃ:۲۲)

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ یاددہانی کرائی جائے، پھر بھی وہ اس سے منہ پھیر لے، یقیناً ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والوں، اس کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں اور غیر اللہ کے سامنے سر جھکانے والوں کے لیے عذاب کا ذکر ہے، یہ بات وی ایچ پی کے بھائیوں کو بہت ناگوارِ خاطر ہے۔ دنیا کی معمولی حکومتیں بھی اپنے مخالفین کو سزائیں دیتی ہیں، وی، ایچ، پی اور بجرنگ دل والے بہت سے بے قصور لوگوں کو صرف اس لیے تکلیفیں دینا، زندہ جلانا اور نیست و نابود کردینا درست سمجھتے ہیں، کہ وہ ان کے ہم مذہب نہیں ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ خدا اتنا عاجز، بے حس اور بے شعور ہو کہ چاہے کوئی اس کا فرماں بردار ہو یا نافرمان، کوئی اس کے سامنے سر جھکائے یا اس کو برا بھلا کہے، کوئی اس کے حق میں دوسرے کو شریک ٹھہرائے، لیکن خدا کوئی حرکت نہ کرے، وہ اپنی آنکھیں اور کان بند کیے رہے اور ظلم و بدی کرنے والوں کو نہ دنیا میں کچھ کہے اور نہ مرنے کے بعد، یہ کیسی نامعقول اور ناانصافی کی بات ہے؟ خدا کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ پورا پورا انصاف کرے اور اچھے اور بروں کو ان کے عمل کی جزا و سزا دے، دنیا کے تمام ہی مذاہب میں جزا و سزا کے قانون کو مانا گیا ہے اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ انسان کو اچھے عمل کرنے چاہئیں، تاکہ وہ خدا کے عذاب سے بچ سکے، ہندو مذہب میں بعض اعمال پر سورگ اور بعض اعمال پر نرک کی جو پیشین گوئی ہے وہ آخر کیا ہے؟ یہ جو شری کرشن جی ارجن کو ترغیب دیتے ہیں کہ تم کوروں پر حملہ کرو، اس سے تمہارے لیے سورگ کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور منوجی کہتے ہیں کہ برہمن شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بھی بٹھا لے تو بیچارہ نرک میں چلا جائے گا۔ یہ سورگ اور نرگ کیا ثواب و عذاب سے عبارت نہیں ہے؟ ہندو مذہبی علماء آج جس پنر جنم کے قائل ہیں، اس کے مطابق ایک انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آئندہ کتا اور سوٴر بن سکتا ہے، یہ بھی دھرم کی خلاف ورزی پر خدا کی طرف سے عذاب ہی تو ہے؛ اس

لیے ان آیات پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں، بلکہ اگر خدا نافرمانوں کی گرفت نہیں کرتا، تو یہ خدا کی شان اور انصاف کے خلاف بات ہوتی، اگر نافرمانوں کے لیے کوئی سزا نہ ہوتی تو وید میں یہ دعا سکھائی نہ جاتی کہ وید مخالفوں کو ہلاک کر دے۔ (اتھر وید: ۲۰:۱۰۵:۱)

ہاں! اگر ان آیات میں اسلام کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف مسلمانوں کو اکسایا گیا ہوتا کہ وہ خدا کی عدالت کا انتظار نہ کریں، بلکہ خود ہی انہیں سزائیں دے دیں، تو اس سے اشکال پیدا ہوسکتا تھا، لیکن قرآن نے یہ اصول بتایا کہ دنیا میں ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق عمل کرے گا، مسلمان دوسری قوموں پر داروغہ نہیں، کہ وہ انہیں اپنی رائے پر عمل کرنے کے لیے مجبور کریں، لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ:۲۲) لیکن اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم، انہیں خود ان کی بداعمالیوں کی سزا دے گا، قرآن نے بار بار دوزخ میں آگ کی سزا کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو آگ میں جلانے کی سزا دے اور فرمایا کہ ایسی سزا دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے، غرض کہ دنیا کا قانون اور ہے اور آخرت کا قانون اور، اور اگر اللہ آخرت میں بھی ظالم و مظلوم اور فرماں بردار و نافرمان کا فرق نہ کرے تو پھر وہ خدا کہلانے کا مستحق بھی ہے؟

☆☆☆

اسلام —— صلح وآشتی کا مذہب

قارئین جب اس تحریر کو پڑھیں گے تو جناب جنرل پرویز مشرف ہندوستان سے واپس ہو چکے ہوں گے، پرویز صاحب پڑوسی ملک کے خود ساختہ صدر ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان پر کارگل جنگ تھوپنے کے پس پردہ اصل شخصیت انہی کی ہے، لیکن اس وقت وہ صلح وامن کے نقیب بن کر آئے ہیں، اور انہوں نے متضاد قسم کی باتیں کہی ہیں، پاکستان کے اٹل موقف کو دہرایا بھی ہے، اور لچکدار رویہ اختیار کرنے کی بات بھی کہی ہے، یہ بات خوش آئند ہے کہ ہمارے ملک نے ایک حد تک ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر ان کا گرم جوش خیر مقدم کیا ہے، اور ایک میزبان کی حیثیت سے اپنے مہمان کے اعزاز واکرام کا پورا پورا خیال رکھا ہے، اب وقت ہی بتائے گا کہ یہ ملاقات کس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے، اور دونوں ملکوں کو امن کی نعمت نصیب ہو پاتی ہے؟ اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ہندو پاک اور فی الحال دو حصوں میں بٹا ہوا کشمیر ہر جگہ لوگ امن کے پیاسے ہیں، اور دعاء کر رہے ہیں کہ ان ملکوں کے درمیان صلح وصفائی کی صورت نکل آئے، تا کہ بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کا ایک دوسرے سے ملنا آسان ہو سکے، اور ملک کے کثیر معاشی مسائل جو بے معنی جنگ وجدال پر خرچ ہو رہے ہیں، غربت دور کرنے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر خرچ ہوں، اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً یہ اس خطہ کی بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی، یہ دونوں ممالک اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح کے لئے خرچ کر سکیں گے، اور مغربی ممالک کی محکومیت اور غلامی سے بھی انہیں نجات حاصل ہوگی۔

افسوس کہ بعض فرقہ پرست اور امن دشمن عناصر ان مواقع پر امن اور صلح کو قوت پہونچانے کی بجائے ان کو غیر حقیقت پسندانہ اور خلاف واقعہ پروپیگنڈہ کے لئے استعمال

کرتے ہیں، چنانچہ اس وقت بھی یہ غلط تاثر پیدا کیا جارہا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد اور کٹر پسند مذہب ہے، جو دوسری قوموں کے ساتھ صلح، میل جول اور بقاء باہم کے اصول پر اتحاد کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس لئے اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ صلح کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے، اور مسلمان اپنے قومی مزاج کے اعتبار سے ہی شدت پسند ہیں، حالاں کہ یہ بات قطعاً خلافِ واقعہ اور نادرست ہے۔

اسلام "سلم" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہی صلح کے ہیں، قرآن نے بار بار صلح و آشتی کو اختیار کرنے کی تاکید کی ہے، اور صلح کے بعد پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے، قرآن نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا:

> اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں، اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو تجھ کو اللہ کافی ہے، اللہ ہی نے تجھ کو اپنی مدد کے ذریعہ اور مسلمان کے ذریعہ طاقت پہونچائی ہے۔ (انفعال: ۶۱، ۶۲)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ صلح کرنا چاہیں، اور امن و آشتی کے خواہاں ہوں، مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ ان کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں، بلکہ اس آیت میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ اگر صلح میں فریقِ مخالف کی طرف سے اندیشے اور خدشات ہوں تب بھی ممکن حد تک صلح کی راہ اختیار کرنی چاہئے، اور اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں، اور صلح و امن کے رویے پر قائم ہوں، ان سے جہاد جائز نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

> اگر وہ تم سے کنارہ کش ہوں، چنانچہ تم سے جنگ نہ کریں، اور صلح کی پیشکش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی، (النساء: ۹۰)

یہاں تک کہ اگر کسی غیر مسلم قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، اور وہاں مسلمان شہریوں

کے ساتھ کوئی زیادتی ہوتی ہو، تو اخلاقی اور سیاسی طور پر تو ضرور اس کے سدِ باب کی کوشش کرنی چاہئے، لیکن قرآن کہتا ہے کہ مسلمان حکومت کو ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق نہیں، چنانچہ قرآن کا بیان ہے :

> جو لوگ ایمان لائے اور (مسلم ملک کو) ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ وہ ہجرت کر کے آجائیں، اور اگر وہ تم سے دین کے بارے میں مدد طلب کریں، تو تم پر مدد کرنا لازم ہے، مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ (الانفعال: ۷۲)

اسلام نہ صرف مسلمانوں کو صلح کا حکم دیتا ہے، بلکہ خیر امت کی حیثیت سے مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان حسبِ ضرورت مصالحت کنندہ کا کردار ادا کریں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اکثر سرگوشیوں میں خیر نہیں، سوائے اس کے کہ صدقہ کا حکم دیا جائے یا بھلائی کا، یا لوگوں کے درمیان صلح کرائی جائے، (النساء: ۱۱۴) اللہ تعالیٰ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص لوگوں کے درمیان صلح نہ کرانے کی قسم کھالے، (البقرۃ: ۲۲۴) صلح بہر حال خیر کی چیز ہے، خواہ افراد کے درمیان ہو یا قوموں کے درمیان: اَلصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء: ۱۲۸) اور کیوں نہ ہو، کہ اسلام زمین میں قتل و خوں ریزی کو ناپسند کرتا ہے: لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف: ۵۶) بلکہ اگر کسی ملک یا قوم کے ساتھ تعلقات اچھے نہ ہوں، اس وقت بھی ان کے ساتھ بہتر رویہ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ آج کے دشمن کل کے دوست ہو جائیں، (الممتحنۃ: ۷) جیسے قرآن مجید میں بار بار صلح و آشتی کی تعلیم دی گئی ہے، اور بے سبب جنگ و جدال کو منع فرمایا گیا ہے، اسی طرح حدیث میں بھی صلح کرنے اور کرانے کی بڑی ترغیبات منقول ہیں، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے ابوایوب! کیا میں تجھے ایسا صدقہ نہ بتاؤں، جسے اللہ اور اس کے رسول پسند فرماتے ہیں؟ اور وہ یہ ہے کہ جب لوگوں میں باہم بغض وفساد پیدا ہو جائے تو تم ان کے درمیان صلح کراؤ (مجمع الزوائد: ۷۹/۸)

رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہمسایہ قوموں کے ساتھ امن و آشتی اور صلح و امان کی واضح مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نبوت سے پہلے حلف الفضول میں شریک ہوئے، جس کا مقصد مظلوموں کی بلا امتیاز نسل و قوم مدد کرنا تھا، آپ ﷺ نبوت کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی مجھے اس کی طرف دعوت دے تو میں اسے قبول کروں گا۔

جب آپ مدینہ تشریف لئے گئے تو مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور نسلی اکائیوں کے درمیان باہمی امن، مذہبی آزادی، ایک دوسرے کے احترام اور مدینہ کی مشترک مدافعت کے سلسلہ میں تحریری معاہدہ فرمایا، اور اس پر تمام فریقوں کا دستخط لیا گیا، اس سلسلہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تو سیرت کا ایک اہم عنوان ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ سے دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ کیا، اور اہلِ مکہ کی شرطوں پر کیا، اور جب تک خود اہلِ مکہ کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی پیش نہ آگئی، آپ اس معاہدہ پر قائم و ثابت قدم رہے۔

پھر جو معاہدہ ہو جائے اس پر قائم رہنا بھی شرعاً واجب ہے، یہ بات کہ ایک طرف صلح کی میز پر بیٹھیں، اور دوسری طرف اسی فریق کے خلاف اندرونی ریشہ دوانیاں بھی جاری رکھیں، کسی طرح درست نہیں، قرآن نے عہد و پیمان کی پابندی پر بہت زور دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو، یقیناً عہد کے بارے میں سوال ہوگا: **وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ، اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا**، (بنی اسرائیل: ۳۴) اہلِ ایمان کی علامت بتائی گئی ہے کہ وہ امانتوں اور عہد و پیمان کی نگہداشت کرتے ہیں، (مومنون: ۸) رسول اللہ ﷺ نے اسے نفاق قرار دیا ہے کہ آدمی عہد کے بعد اس کی خلاف ورزی کرے: **اذا عاهد غدر**، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ اگر کسی ایسی حکومت کی جانب سے اس کے مسلمان شہریوں پر زیادتی ہو، جن سے صلح ہو چکی ہے، تو وہاں مسلمانوں کو اپنا ہاتھ روکے رکھنا ہوگا۔

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کو برت کر دکھایا ہے، صلح حدیبیہ کے فوراً بعد حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کو اس دفعہ سے مستثنیٰ کر دیا جائے، لیکن اہلِ مکہ تیار نہیں ہوئے، چنانچہ آپ ﷺ نے ملال خاطر کے ساتھ انہیں واپس فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ ہم ان سے معاہدہ کر چکے

ہیں، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، اور ہمارے دین میں معاہدہ میں خلاف ورزی کی گنجائش نہیں: **ولا یصلح لنا فی دیننا الغدر**، (سیرت ابن ہشام: ۳۷۴/۳) اسی طرح حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ جب مکہ سے مدینہ آ گئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی واپس فرما دیا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد کی پابندی اسلام کی نظر میں کس قدر اہم اور ضروری ہے، بین قومی معاہدات کی خلاف ورزی کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عباس نے فرمایا کہ جب کوئی قوم بدعہدی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمنوں کو مسلط فرما دیتے ہیں: **ما غدر قوم بالعهد الا سلط الله عليهم العدو** (موطا امام مالک، باب ما جاء فی الوفاء بالامان)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ اسلام امن و آشتی، صلح و سلامتی اور انسانی اخوت و بھائی چارگی کا مذہب ہے، جو نہ صرف صلح کو پسند کرتا ہے، بلکہ چاہتا ہے کہ مسلمان صلح میں پیش قدمی کریں، اور حسبِ موقع ضرورت پڑے تو اس کے لئے اپنے جذبات و مفادات کی ایک گونہ قربانی بھی دیں، اور نہ صرف خود صلح کریں، بلکہ دوسری قوموں کے درمیان بھی صلح کے نقیب اور نمائندہ بن کر سامنے آئیں، اور جن شرطوں پر صلح ہو، ان کے پابند و پاس دار رہیں!

(۲۰؍جولائی ۲۰۰۱ء)

اسلام کا تصوّر جہاد

عام طور پر سب سے زیادہ جو مسئلہ غیر مسلموں کے تئیں اسلام کے رویہ کے بارے میں لوگوں کو کھٹکتا ہے اور بڑے زور وشور کے ساتھ اس کا نام لے کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، وہ ہے اسلام کا تصور جہاد! — آج کے میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے جہاد کو دہشت گردی اور لوٹ و غارت گری کے ہم معنی بنا دیا ہے، لیکن حقیقت اس کے بر عکس ہے، جہاد ظلم نہیں، بلکہ ظلم کو روکنے کی کوشش ہے، یہ ظالموں کے ہاتھ سے تلوار چھین لینے کی جدوجہد کا نام ہے، اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا (حج:۳۹) جہاد کا مقصد ملک گیری و کشور کشائی اور دوسری قوموں کو مغلوب اور ذلیل کرنا نہیں ہے، بلکہ اللہ کے دین کو غالب کرنا اور اس کی حفاظت کرنا ہے، اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (نساء:۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ جہاں اخلاق کی تلوار اور پند و موعظت کا ہتھیار نہیں چلتا، وہاں جنگ ضروری ہو جاتی ہے، اہنسا اور عدم تشدّد کا فلسفہ ہر جگہ کارگر نہیں ہوتا، ہمارے ملک میں مختلف ریاستوں میں اس وقت علاحدگی پسندی کا رجحان بڑھ رہا ہے، مختلف پڑوسی ملکوں سے بھی ہماری سرحدوں کو خطرات ہیں، کیا ان حالات میں ملک کا کوئی بہی خواہ اور محب وطن شہری اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ ملک اپنی دفاعی تیاریوں کو نظر انداز کر دے اور دشمنوں کے حملے سے نمٹنے کے لئے خود کو تیار نہیں رکھے؟

غور کیا جائے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب بھی گذرا ہے جس نے جنگ کو بالکل ممنوع قرار دیا ہو، یہودیوں کے یہاں جنگ کا بہت بے رحمانہ تصوّر ملتا ہے، بائبل میں ہے،

''جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو ان

سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں، اپنے سامنے بھگا دو، اور ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو، اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو، اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں۔ خارج کر دو، اور وہاں آبسو، (استثناء: ۳۳:۵۰،۵۴)

بائبل نے جنگی اعتبار سے غیر اسرائیلیوں کو دو حصہ میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ علاقہ جن کو یہودی عقیدہ کے مطابق خدا نے اسرائیل کی میراث میں دیا ہوا ہے، اس علاقہ کا جنگی قانون یہ ہے کہ مردوں اور شادی شدہ عورتوں کو قتل کر دیا جائے، صرف کنواری لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنے تصرف میں لے لیا جائے، اور دوسرا علاقہ وہ ہے جو بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں ہے، یہاں مردوں، عورتوں اور بچوں یہاں تک کہ ان کے جانوروں کو بھی تہہ تیغ کر دیا جائے۔

عیسائی حضرات خیال کرتے ہیں کہ ان کا مذہب جنگ وجدال کا مذہب نہیں ہے، گو آج پوری دنیا میں عیسائی اقوام ہی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کی اصل ذمہ دار ہیں، لیکن مذہبی اعتبار سے بھی عیسائی حضرات یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا، صلح کرانے نہیں، بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں،'' (متی: ۱۰:۳۴،۳۶)

ایک موقع پر حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت بھی فرمائی کہ وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدیں (لوقا: ۲۲:۳۶)

ہندو مذہب اپنے آپ کو اہنسا اور عدم تشدد کا مذہب کہتا ہے، گاندھی جی کا خیال ہے کہ ہندو مذہب کا سب سے بڑا حسن یہی ہے، لیکن ہندو مذہب کی تاریخ جنگوں سے پُر ہے، رامائن، شری رام جی کے حالات اور رام اور راون کی بھیانک جنگ کی کہانی ہے، گیتا جس کو ہندو بھائیوں کے یہاں بڑا تقدس حاصل ہے، اور جس کو خود گاندھی جی اپنی ماں کہا کرتے تھے، وہ تمام تر کوروؤں اور پانڈوؤں کی داستانِ جنگ ہے، ہندوؤں کے عقائد

میں ایک آواگمن بھی ہے، جس کے تحت ایک شخص موت کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، اس کے پیشِ نظر شری کرشن جی ارجن سے کہتے ہیں کہ روح کے لئے جسم کی حیثیت کپڑے کی ہے، گویا قتل انسانی پرانا کپڑا اپھاڑ کر نیا کپڑا پہنانے کے مترادف ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی بُری بات نہیں، شری کرشن جی مزید کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو آخر اسے مار ڈالنے میں کیا قباحت ہے؟ ظاہر ہے ان تعلیمات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ ہندو مذہب میں جنگ کا تصور نہیں ہے۔

اسلام نے بھی یقیناً جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ جو بھی غیر مسلم سامنے نظر آئے اس کی گردن ماردیں، بلکہ قرآن وحدیث کے ارشادات کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے: ذمّی، معاہد اور حربی۔

مسلم ملک کے غیر مسلم شہریوں کو ''ذمّی'' کہتے ہیں، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ذمّی کہنے میں ان کی تحقیر وتذلیل ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، ذمہ کے معنی عربی زبان میں ''عہد'' کے ہیں، اور ذمّی وہ ہے جس سے مسلمانوں کا عہد ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن طریقہ پر رہیں گے، اور ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت بھی کریں گے، گویا ان کو ذمّی کہہ کر مسلمانوں کو ان کے تئیں ذمہ داریوں کو یاد دلانا مقصود ہے کہ وہ ان کی حفاظت اور حقوق کا پورا پورا خیال رکھیں، ذمّی کی جان ومال، عزت وآبرو اور عام انسانی حقوق وہی ہیں جو مسلمانوں کے ہیں۔

غیر مسلموں کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''معاہدین'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہد ہو، یہ معاہدین بھی ذمّی ہی کے حکم میں ہیں، ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کا، اور یہ بھی جائز نہیں کہ ان سے طے شدہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی جائے۔

غیر مسلموں کی تیسری قسم وہ ہے جن کو ''حربی'' کہا جاتا ہے یعنی وہ غیر مسلم جو کسی غیر مسلم ملک کے شہری ہوں اور اس ملک سے مسلمانوں کا امن اور بقاء باہم کا معاہدہ نہ ہو،

اور وہ مسلمانوں کے برسر پیکار رہتے ہوں، جو اسلام اور انسانیت کے لئے غارت گر بنے ہوئے ہوں، اسلام صرف ایسے ہی لوگوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے غالباً سب سے پہلے جنگ کے مہذب اور شائستہ قوانین دیئے، اور آپ ﷺ نے اپنے فوجیوں کو نہایت اہمیت کے ساتھ ان اصولوں کا پابند رہنے کی تاکید فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: چرچ اور مذہبی عبادت گاہوں کے متعلقین کو قتل نہ کیا جائے، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو جنگ کے درمیان نشانہ نہ بنایا جائے، آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ مقتولین کا ''مُثلہ'' کیا جائے، اور ان کے اعضاء کاٹ دیئے جائیں، اس سے بھی منع فرمایا کہ کسی کو باندھ کر اسے نشانہ بنایا جائے، کسی کو نذرِ آتش کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوائے خدا کے کسی کو آگ میں جلانے کا حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں شدید ضرورت کے بغیر آتشیں اور نیوکلیر ہتھیاروں کا استعمال درست نہیں، کیوں کہ یہ آتشیں ہتھیار ہیں، اور اس کی زد میں فوجیوں کے ساتھ وہ پُر امن شہری بھی آجاتے ہیں، جو جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ جنگ کے موقع پر لوٹ مار اور چھینا جھپٹی ایک عام بات ہے، لیکن آپ ﷺ نے اس کو بھی منع فرمایا، آپ ﷺ نے فوجیوں کے لئے چلنے پھرنے کے بھی آداب بتائے، شور و ہنگامہ کو منع کیا، اس طرح چلنے اور منزل پر پڑاؤ ڈالنے کی تلقین کی کہ مسافر دقت محسوس نہ کریں، راہ گیروں کو نقصان پہنچانے اور ڈرانے دھمکانے سے سختی سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے سفارتی آداب کی بھی پوری پوری رعایت فرمائی، مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن حارث حاضر خدمت ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ واقعہ ہے کہ دنیا کو سب سے پہلے جنگ کے درمیان تہذیب وشائستگی، انسانی احترام اور احترامِ آدمیت کا سبق نبی عربی ﷺ نے دیا، اور یہ جو کچھ آج مشرق و مغرب میں قانونِ جنگ کا شور ہے، اور جس کی سب سے زیادہ خلاف ورزی خود ترقی یافتہ قوموں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے، یہ سب آپ ﷺ ہی کی مبارک تعلیمات کی بازگشت ہے۔

یہ تو وہ احکامِ جنگ ہیں جو عین جنگ کے درمیان اپنے دشمنوں کے ساتھ برتنے

کے ہیں، لیکن اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح مند کرے تو آپ ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ نہایت فراخدلانہ سلوک کی تعلیم دی، اور عفو درگذر کا راستہ اختیار کرنے کو فرمایا، اس سلسلہ میں فتح مکہ کا واقعہ اپنی مثال آپ ہے، اہلِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں پر کیا کچھ مظالم نہیں ڈھائے؟ لیکن جب اللہ نے مسلمانوں کو فتح وسربلندی سے نوازا اور اہلِ مکہ کو ہزیمت ہوئی، تو آپ نے انتقام لینے کے بجائے عام معافی کا اعلان کر دیا، ارشاد ہوا: **لا تثریب علیکم الیوم**، آپ ﷺ نے عفو درگذر ہی پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ آگے بڑھ کر ان کی عزتِ نفس اور تکریم کا بھی خیال رکھا، سردار قریش ابوسفیان کے بارے میں فرمایا: جو ان کے گھر میں پناہ لے لے وہ مامون ہے، **من دخل دار أبي سفیان فھو امن**۔

غزوۂ بدر میں ستر قیدی بنائے گئے، تو آپ ﷺ نے ان کو اس شان واعزاز کے ساتھ رخصت فرمایا کہ ان کے لئے جوڑے بھی سلائے، آپ ﷺ نے ان قیدیوں کو صحابہ پر تقسیم فرمادیا تھا، اور صحابہ کا حال یہ تھا کہ خود بھوکے رہ کر ان کو کھلاتے، اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیتے، غزوۂ حنین کے موقع پر چھ ہزار دشمنوں کو گرفتار کیا گیا، لیکن آپ ﷺ نے بغیر کچھ لئے ہوئے ان سب کو رہا کر دیا — غور کیجئے! ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ حسن سلوک اور انسانیت پروری ہے، دوسری طرف یورپ کی شرافت اور انسانیت دوستی کا حال یہ ہے کہ نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے سامان کو ایک بوجھ تصور کرتا تھا،

اسلام کے تصورِ جہاد کے پس منظر میں اس بات کا ذکر مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوات اور جہاد کے ذریعہ جو عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اس میں کس قدر کم جانی نقصان ہوا، آپ ﷺ کے کل غزوات وسرایا کی تعداد بیاسی ہے، جن میں مسلمان شہداء کی تعداد دو سو انسٹھ اور غیر مسلم مہلوکین کی تعداد سات سو انسٹھ ہے، اس طرح کل مہلوکین دس سو اٹھارہ ہیں، گویا فی جنگ مقتولین کا اوسط ۱۱ سے کچھ زیادہ ہے۔

اب آپ اس کا تقابل ان انسانی ہلاکتوں سے کیجئے جو دوسری قوموں میں پیش آئی ہیں، ہندو تاریخ کے مطابق صرف مہابھارت کی جنگ میں لاکھوں لوگ کام آگئے، عیسائی

دنیا میں کلیسائی نظام کے زمانۂ عروج میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر قتل کئے جانے والوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے، ان میں ۳۲؍ ہزار وہ بدقسمت ہیں جو زندہ جلا دیئے گئے، بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو بلا امتیاز مرد وزن، بچے بوڑھے ستر ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے، لیکن پھر اسی بیت المقدس پر جب دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو سلطان عادل صلاح الدین ایوبیؒ نے عفو عام کا اعلان کر دیا، اور عیسائی چونکہ یہودیوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لئے دونوں کی آبادیاں بھی الگ کر دی گئیں، پہلی جنگِ عظیم کے مہلوکین کی تعداد محتاط اندازہ کے مطابق ۷۴؍ لاکھ کے قریب پہنچی ہے۔

غور فرمایئے کہ جو لوگ تہذیب وتمدن کے مدعی ہیں اور اپنے آپ کو انسانیت کا علمبردار تصور کرتے ہیں، انہوں نے کس کس طرح انسانیت کی دھجیاں اڑائی ہیں! ان وضاحتوں سے آپ کو یقیناً اس پروپیگنڈے کی حقیقت کا بھی اندازہ ہوا ہوگا، جو اسلام کے تصور جہاد اور پیغمبر اسلام کے عملی جہاد کے بارے میں آج پوری دنیا میں جاری وساری ہے، افسوس کہ ہم مسلمان اپنی غفلت شعاری اور کوتاہ عملی کی وجہ سے دنیا کے سامنے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی انسانیت نوازی کا پہلو پیش کرنے سے قاصر ہیں!

(۱۳؍ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جہاد —— حقیقت اور فسانہ

انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جو بات اس سے بار بار کہی جاتی اور اس کے سامنے دہرائی جاتی ہے وہ اس کا یقین کر لیتا ہے، خواہ وہ بات کتنی ہی خلافِ واقعہ کیوں نہ ہو، اس کی ایک مثال اس وقت ''جہاد'' کے عنوان سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیاں بھی ہیں، مغربی ملکوں نے اپنی ظلم و زیادتی پر پردہ رکھنے اور اسلام کو بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو دہشت گردی کے ہم معنی قرار دے دیا ہے، اور پوری دنیا میں اسلام کے خلاف دہشت گردی کو عنوان بنا کر مہم چلائی جا رہی ہے، اسرائیل فلسطین کی زمین پر قابض ہے، فلسطینی تارکین کو اپنے گھر واپسی کے حق سے محروم کئے ہوا ہے، اور خود یہودی بستیاں بسا رہا ہے، اسرائیل کا موجودہ وزیرِ اعظم ایریل شارون خوں آشام طبیعت کا انسان ہے اور اس نے نہتے عربوں کا قتلِ عام کیا ہے، اس کے باوجود انہیں دہشت گرد نہیں کہا جاتا، اور فلسطینی جب ان مظالم کے خلاف جد و جہد کرتے ہیں تو ان کی مدافعانہ کارروائیوں کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں جن طاقتوں نے علانیہ بابری مسجد کو شہید کیا، عدالتی احکام کی خلاف ورزی کی، بھاگلپور، میرٹھ اور مختلف علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام کیا، اور جو گجرات میں منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کی جان و مال کو تباہ کر رہے ہیں وہ دہشت گرد نہیں کہلاتے، اور اگر مسلمانوں کی طرف سے کسی ردِ عمل کا اظہار ہو تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے، انڈونیشیا میں مشرقی تیمور کے علاحدگی پسندوں نے شورشیں برپا کیں تو انہیں دہشت گرد نہیں کہا گیا اور انڈونیشیا کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ اس خطہ کو آزاد کر دیں، اسے دہشت گردی نہیں سمجھا گیا، سوڈان میں جنوبی علاقے

کے عیسائی آمادۂ بغاوت ہیں، تو اس کو جنگِ آزادی کا نام دیا جاتا ہے، روس سے متعدد عیسائی ریاستوں نے اپنی علاحدگی کا اعلان کیا، تو ان کے اس حق کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن چیچینیا میں جب عوامی انتخاب کے ذریعہ ایک مسلم ملک وجود میں آیا تو اسے دہشت گرد کہا گیا اور پورا مشرق و مغرب مخالفت پر کمربستہ ہوگیا بالآخر قطعاً ظالمانہ طریقہ پر اس مملکت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

مغرب کی سامراجی طاقتوں نے دہشت گردی کا عجیب پیمانہ مقرر کیا ہے جس میں ایک ہی عمل کہیں ''دہشت گردی'' قرار پاتا ہے، اور کہیں ''حقِ مدافعت'' اور اسلام کو مزید بدنام کرنے کے لئے ''جہاد'' کو بھی دہشت گردی سے مربوط کر دیا گیا ہے، اس پس منظر میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم جہاد کے صحیح مفہوم کو سمجھیں، اور ان حالات اور مواقع کو سامنے رکھیں جن میں جہاد کی اجازت دی گئی۔

عربی زبان میں '' جَہد'' (ج کے زبر کے ساتھ) کے معنی طاقت کے ہیں، اور جُہد (ج کے پیش کے ساتھ) کے معنی مشقت کے ہیں، جہاد اسلام کی اشاعت وحفاظت کے لئے اپنی پوری طاقت استعمال کرنے اور اس راہ میں ہونے والی مشقتوں کو انگیز کرنے کا نام ہے، گویا جہاد ایک وسیع مفہوم کی حامل اصطلاح ہے، جس کا مقصد حفاظتِ دین اور اشاعتِ دین کی کوشش و کاوش ہے، جہاد کے مختلف وسائل و ذرائع ہیں، زبان و بیان بھی جہاد کا ایک ذریعہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کہنے کو سب سے افضل جہاد قرار دیا: **أفضل الجهاد كلمة عدل عند السلطان الجائر**

(ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۴۰۱۱)

جہاد کا ایک ذریعہ اس زمانہ میں قلم بھی ہے، بلکہ یہ نہایت مؤثر ذریعہ ہے، کوئی مسلمان اپنا قلم دین کی حفاظت واشاعت کے لئے وقف کر دے تو یہ بھی جہاد میں شامل ہے، آج کل دوسرے ذرائع ابلاغ بھی کسی فکر کی ترویج واشاعت اور اس کے غلبہ کے لئے نہایت مفید اور مؤثر ہیں، اور یہ بھی معنوی جہاد میں شامل ہیں۔

جہاد کی آخری اور سب سے مکمل صورت ''جہاد بالسیف'' ہے، یعنی اعداءِ اسلام کے

خلاف طاقت کا استعمال، لیکن اس کے لئے کچھ شرطیں اور تفصیلات ہیں، ایسا نہیں ہے کہ کسی مسلمان کی نظر جس غیر مسلم پر پڑ جائے یا جو غیر مسلم اس کی گرفت میں آجائے وہ اس کا کام تمام کردے، یہ جہاد نہیں بلکہ فساد ہے، جہاد کے سلسلہ میں قرآن نے ہمیں واضح طور پر بتایا کہ جو لوگ تم کو مرنے اور مارنے کے درپے ہوں تم بھی ان سے جہاد کرو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

" وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ " (البقرہ:۱۹۰)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہوں، اور زیادتی نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں، اول یہ کہ جہاد کا آخری درجہ جسے قرآن مجید میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں، جو مسلمانوں کے ساتھ بہتر رویہ رکھتے ہوں، ان سے قتال کا حق نہیں ہے، ایک اور موقع پر قرآن مجید نے اس حکم کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ارشاد ہے:

" لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ " (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہ کرتے ہوں اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالتے ہوں، اللہ تم کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ آیت صاف طور پر بتاتی ہے کہ جہاد کا حکم ان لوگوں سے ہے جو مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہوں، اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی قوم دوسری قوم سے جنگ وجدال کا تہیہ کئے ہوئی ہو،

تو اگر ان سے جنگ نہ کی جائے گی تو کیا ان کے لئے پھول کی سیجیں بچھائی جائیں گی؟

اوپر جس آیت کا ذکر ہوا ہے، اس میں دوسری اہم بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اسلام حالتِ جنگ میں بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان اخلاق اور انسانیت کی حدود کو پھلانگ جائیں، اسی کو قرآن مجید نے ''اعتداء'' یعنی ''زیادتی'' سے تعبیر کیا ہے، اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے، علامہ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ اور حسن بصری وغیرہ سے اس کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دشمن کا مُثلہ کرنا عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، مذہبی شخصیتوں کا قتل اور درختوں کو جلانا ہے، (تفسیر ابن کثیر: ۱/۲۶۶) رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی انسان کو جلانے کی سزا دی جائے، کہ اس سزا کا حق صرف اللہ کو ہے، مسلمانوں نے ہمیشہ اس ہدایت کو ملحوظ رکھا، انسانوں کو زندہ جلانے کی المناک اور انسانیت سوز صورت یا تو ان عیسائیوں کے یہاں ملتی ہے، جن کی مذہبی عدالتیں عقیدہ سے اختلاف رکھنے والوں کو زندہ نذرِ آتش کر دیا کرتی تھیں، یورپ کی مذہبی اور اخلاقی تاریخ کی کتابوں میں بہ کثرت اس کا ذکر آیا ہے دوسرے ہندوستان میں بیوہ عورتوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ جرم بے گناہی میں زبردستی جلا دیا جاتا تھا، جسے ستی کا نام دیا جاتا تھا، یہی ظالمانہ روایت ہے جس کو ابناء وطن اس وقت گجرات میں دہرا رہے ہیں۔

افسوس کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاد کے وسیع مفہوم کو صرف قتال میں محدود کر دیا ہے، اور اسلام کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے، جس میں رواداری، تحمل، قوتِ برداشت اور دیگر اہلِ مذہب کے ساتھ حسنِ سلوک کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو، بلکہ وہ چاہتا ہو کہ ہر ''غیر مسلم'' کو تہِ تیغ کر دے، یہ لفظ جہاد کی نہایت ہی غلط اور خلافِ واقعہ توضیح ہے، جو اسلام کے سر ڈال دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی غیر مسلموں کے تین طبقے ہیں، ایک تو وہ غیر مسلم جو مسلم ممالک میں آباد ہوں، ان کو ''ذِمّی'' یا ''اہلِ ذِمّہ'' کہا جاتا ہے، دوسرے وہ غیر مسلم جن کے ساتھ اقتدار میں شرکت اور بقاء باہم کے اصول پر مسلمان ایک ملک میں رہتے

ہیں، اس طرح کے غیر مسلموں کے لئے فقہاء کے یہاں ''معاہد'' کی تعبیر ملتی ہے، یعنی وہ شخص جس سے عہد ہو چکا ہے، ان دونوں سے جہاد نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی جان و مال کو مسلمانوں ہی کی جان و مال کی طرح قابلِ احترام قرار دیا ہے، ''دمائهم كدمائنا و أموالهم كأموالنا "، ہاں اگر یہ مسلمانوں پر زیادتی کریں تو اپنی مدافعت کرنا اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان سے ظلم کا بدلہ لینا جائز ہے، اور دنیا کے ہر قانون میں انسان کے لئے اس حقِ مدافعت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

جہاد ان لوگوں سے ہے جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ ہو، وہ مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روکتے ہوں، اور انہیں ان کے وطن سے بے وطن کرنا چاہتے ہوں، جیسا کہ اس وقت اسرائیل فلسطینیوں یا سرب بوسینیائی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں، ایسے لوگوں کے خلاف اسلام نے قتال کی اجازت دی ہے، اور یہ صرف اسلام کی بات نہیں، دنیا کے تمام مذاہب اور مہذب قوانین میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ جب کوئی قوم دوسری قوم پر زیادتی کرے تو اسے مدافعت اور جنگ کی اجازت اور ان سے جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔

آج دنیا کی بہت سی قومیں بلا وجہ محض مادی وسائل پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے دوسری قوموں پر حملہ زن ہو رہی ہیں، اور ایسے مہلک اسلحہ استعمال کر رہی ہیں، جن کی ہلاکت خیزیاں حساب و شمار سے باہر ہیں، بلا دلیل و ثبوت اپنے مخالفین کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے اور بے مقصد جنگیں مسلط کر دی جاتی ہیں، لیکن اسے دہشت گردی نہیں کہا جاتا، اور مظلوم کی آہ و فغاں کو بھی سرکشی اور دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ کس قدر غیر منصفانہ اور نامعقول رویہ ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان خود جہاد کی حقیقت سے واقف ہوں، اس بات کو جاننے کی کوشش کریں کہ جہاد کیا ہے؟ جہاد کن قوموں سے ہے؟ اور جہاد کا موقع و محل کیا ہے؟ تا کہ اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں اور جو زہر لوگوں کے ذہن میں بھی پیوست کیا جا رہا ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ اس کا جواب دے سکیں،

اور لوگوں کو زہر کا تریاق فراہم کرسکیں، افسوس کہ اسلامی لٹریچر سے بے توجہی اور اسلام کے بارے میں حد درجہ نا آگہی کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم دوسرے کی غلط فہمی تو کیا دور کرتے کہ خود ہی ان پروپیگنڈوں سے متأثر اور مرعوب ہوئے جاتے ہیں، اور خود ہمارا ذہن شکوک وشبہات کی تاریکی میں بے سمت ہوا جاتا ہے، ہمیں ایسے حساس موضوعات پر قرآن وحدیث کا مطالعہ کرنا چاہئے، سلف کی تحریروں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے، اور اصحابِ نظر علماء سے صحیح صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کرنی چاہئے!

(۲۶/ اپریل ۲۰۰۲ء)

اسلام —— دینِ اعتدال

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط وتفریط انسان کے لئے ناگوار خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیزیں بھی اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں یا حدِ ضرورت سے کم ہو جائیں تو انسان کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور انعامِ خداوندی کے بجائے عذابِ آسمانی بن جاتی ہیں، ہوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؟ لیکن جب آندھیاں چلتی ہیں تو یہی حیات بخش ہوا کتنی ہی انسانی آبادیوں کو تاخت وتاراج کر کے رکھ دیتی ہیں، پانی زندگی وحیات کا سرچشمہ ہے، لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرے سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد وآباد بستیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں، قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظامِ کشش ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوت کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے بڑھ جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد وقامت بلی اور چوہے کی طرح ہو جائے، اور بڑھ جائے تو انسان اونچے درختوں بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہو جائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہو جائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی، اور گھٹ جائے تو زمین پر ناقابلِ برداشت گرمی ہوگی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے، اور یہ ترازو ربِ کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ اپنے بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں، اور افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عدل کا حکم دیتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (　　　　) عدل کی روح اعتدال ہے، اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں، بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے، قرآن وحدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار ورفتار، خوشی وغم، سلوک وبرتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط وتفریط ناپسندیدہ ہے، اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے، اور اس میں اترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم زمین میں اترا کر نہ چلو، کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو: **ولا تمش فی الارض مرحا انك لن تخرق الارض و لن تبلغ الجبال طولا** (الاسراء:۳۷) بول چال میں اعتدال چاہئے، نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے، نہ اتنی بلند ہو کہ حد اعتدال سے گذر جائے، قرآن کہتا ہے کہ آواز حسب ضرورت پست ہونی چاہئے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے، لیکن سب سے ناپسندیدہ: **واغضض من صوتك، ان انكر الاصوات لصوت الحمير** (…………)

لباس وپوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو، آپ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے، تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آنا چاہئے، غرض کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط، ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بہ تاکید حکم فرمایا، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۶۳) دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ

سے آپ ﷺ کچھ داڑھی تراشا بھی کرتے تھے۔ (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۶۲)

دعاء کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دعاء کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا، **اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ** (الاعراف: ۵۵) بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا حق دیا گیا، ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۹۸) لیکن چوں کہ ولی کی شرکت کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں: **لا نکاح الابولی** (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے، لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قاعدۂ قانون اور اصول کے دائرہ میں ہو، اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو: **ومن قتل مظلوما فقد جعلنا لولیه سلطانا فلا یسرف فی القتل** (الاسراء: ۳۳) انفاق اسلام میں کس قدر مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے؟ لیکن قرآن نے یہاں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لو، اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود تمہارے لئے حسرت اور لوگوں کی ملامت کا سبب بن جائے، **لا تجعل یدك مغلولة الی عنقك و لاتبسطها کل البسط فتقعد ملوما محسورا** (الاسراء: ۲۹) ایک صحابی اپنی پوری جائیداد اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے تو آپ ﷺ نے اعتدال کا حکم دیا اور غلو کو منع فرمایا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مسلسل روزے رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے، آپ ﷺ کو علم ہوا تو ناپسندیدگی ظاہر کی، اور فرمایا: کبھی روزے رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، کیوں کہ تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی، اور تمہاری بیوی کا بھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۹۷۷) اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے بھی ارشاد فرمائی، (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۳۶۹) اگر کسی شخص کو روزہ رکھنے کی طرف بڑی رغبت ہو تو اسے صوم داؤدی رکھنے کا حکم دیا گیا، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے کا حکم ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل

یہ تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے، آپ ﷺ نے اس کو روزہ رکھنے کا سب سے معتدل طریقہ قرار دیا: وھو اعدل الصیام وھو صیام داؤد،

(ابوداود، حدیث نمبر: ۲۴۲۷)

حلال وحرام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اعتدال کا حکم فرمایا، جہاں اس بات کو منع کیا گیا کہ آدمی حرام کو اپنے لئے حلال کرلے، وہیں یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہو، دین میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے حلال کو بھی حرام نہ کرلیا جائے، وَلَاتُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَاتَعْتَدُوْا (المائدہ: ۸۷) جہاد میں دین و ایمان اور نفس و جان کا علانیہ دشمن سامنے ہوتا ہے، لیکن اس موقع پر بھی راہِ اعتدال کی رہنمائی کی گئی، کہ جو تم سے برسرِ جنگ ہو تمہاری جنگ ان ہی لوگوں تک محدود ہونی چاہئے، اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے: وَقَاتِلُوْا فِی سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرۃ: ۱۹۰) انسان جوشِ انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور حدِ اعتدال سے گذر جاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں: فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ.

(البقرۃ: ۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلاکر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداء اسلام نے تمہیں مسجدِ حرام سے روک رکھا ہے لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہو جانے کا باعث نہ بنے، (المائدہ: ۲) — تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ جائز نہیں کہ کسی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا، اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی

صورت پیدا ہو جائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو راہِ اعتدال سے منحرف کر دیتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں، بصارت بھی چھین لیتی ہے، اور اسے اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت وعداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہو تو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے، اور پہاڑ جیسی خوبی ہو تو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو قومیں گمراہ ہوئی، ان کی گمراہی کا باعث یہی ہوا، غلو آمیز محبت، یا انکار و نفرت، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے، دشمن بھی ہو تو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا، دوست اور مرکز عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو اور مبالغے اور تملق وخوشامد کو ناپسند کیا گیا، قرآن مجید کہتا ہے کہ کسی سے عداوت ہو، تو اس کو بھی حد اعتدال سے باہر نہ جانے دے، ممکن ہے کہ کل ہو کر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرما دے! عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (الممتحنۃ: ۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اسے مزید واضح فرمایا، حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: اپنے دوست سے حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے، اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۹۸) غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی، اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب وثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت و ناموری کے بام کمال تک پہنچیں، آج وہی امت افراط وتفریط، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے، زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا، تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی دونوں کی مثال نہیں ملتی۔ احترام وعقیدت میں ذرہ کو آفتاب بنانا اور اختلاف وعداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو

وجہ انتشار بنانا ہمارا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، ہمارا ایک گروہ حکومتِ وقت کے اشارہ پر آگ کو پانی کہنے میں بھی نہیں شرماتا، اور ہمارا ایک طبقہ چنگاری جیسے واقعہ پر خود شعلہ بن جاتا ہے، لوگوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں ہماری بے اعتدالی دن رات کا مشاہدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ افراط وتفریط آخرت میں اللہ کی پکڑ اور دنیا میں قوموں کی رسوائی کا سامان ہے، اور اعتدال ومیانہ روی آخرت میں سرخروئی اور دنیا میں کامیابی کی کلید!!

(۸؍ مارچ ۲۰۰۲ء)

مجسمہ کا انہدام ــــــ غور وفکر کے چند پہلو

افغانستان دو ہزار سال پہلے بودھوں کے زیرِ حکومت تھا، اس وقت بودھوں نے اس خطہ کے مختلف شہروں میں بودھ کے مجسمے تعمیر کئے تھے، پہاڑوں کو تراش کر قصور ومحلات تیار کرنا اور مجسمے بنانا اس عہد کا خاص فن تھا، اور غالباً وسطِ ایشیا کے علاقہ میں بودھوں نے اس کو بہت فروغ دیا، کہا جاتا ہے کہ افغانستان کا شہر بامیان کسی زمانہ میں بودھ حکومت کا دارالحکومت تھا، چنانچہ اس شہر میں دو نہایت ہی عظیم الشان اور دیو ہیکل مجسمے جن کی بلندی ۵۳ اور ۳۸ میٹر ہے، اونچی پہاڑیوں سے تراش کر بنائے گئے تھے، اس وقت طالبان نے پورے ملک افغانستان سے مجسموں کے انہدام اور انہیں بے نام ونشان کردینے کی کاروائی شروع کی ہے، یہ دونوں مجسمے اس کی زد میں ہیں، اس کارروائی نے پوری دنیا میں ایک آگ سی لگادی ہے، مشرق ومغرب اور شمال وجنوب سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، ہمارا ملک ہندوستان جو اپنے ملک میں ہونے والی بڑی سے بڑی زیادتی کو بھی داخلی مسائل کا نام دے کر دوسروں کے اعتراض کو رد کرنے کا عادی ہے، وہ بھی اس کے خلاف بیان بازی میں پیش پیش ہے اور مسلم ممالک جن کا رویہ ادھر عرصہ سے مسلمانوں کے مسائل میں نہایت ہی بزدلانہ ہوا کرتا ہے، وہ بھی اس موقع پر طالبان کو اپنی ''نصائح'' سے مستفید کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا انصاف کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے، طالبان کے اس اقدام میں کئی پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی طاقتوں کا رویہ کیا عدل پر مبنی ہے، یا ایسے مسائل میں دوہرا رویہ اختیار کیا جاتا ہے؟ دوسرے ہمارا ملک ہندوستان کیا بودھوں سے واقعی محبت

رکھتا ہے اور ان کا ہمدرد ہے؟ یا یہ محض بودھوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا کرنے کی ایک سازش ہے؟ تیسرے دوسرے مذاہب کے آثار کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور کیا طالبان کا عمل اسلامی نقطۂ نظر کی واقعی نمائندگی کرتا ہے؟

کوئی حقیقت پسند اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ جو رویہ آج طالبان نے بودھ مجسموں کے بارے میں اختیار کیا ہے، مغربی دنیا اس سے کہیں زیادہ سنگین اور ستم انگیز معاملات پر خاموشی اختیار کرتی رہی ہے، اگر ان کا تعلق مسلمانوں سے ہو، بوسنیا میں بے قصور اور نہتے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ مظالم نہ ڈھائے گئے، بوڑھوں، بچوں کا قتل عام کیا گیا، بوڑھی خواتین سے لے کر نابالغ لڑکیوں تک کی برسرِ عام آبروریزیاں کی گئیں، کتنی ہی تاریخی مسجدوں کو شہید کر دیا گیا اور یہ سب کچھ امریکہ و برطانیہ جیسے ممالک کی درپردہ مدد کے ذریعہ کیا گیا۔ صابرہ اور شتیلہ میں اسرائیلیوں نے قتلِ عام کیا، اور ہزاروں عربوں کو ان کے گھر سے جبراً نکال دیا گیا، مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی گئی، دنیا کے مختلف عیسائی ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے جارہے ہیں، یو باسٹی کیلیفورنیا میں دس لاکھ ڈالر خرچ کرکے ایک مسجد تعمیر کی گئی، جسے ۱۹۹۵ء میں دہشت گرد عیسائی تنظیموں نے جلا کر خاکستر کر دیا، لیکن ان خونریز اور انسانیت سوز واقعات پر نہ مغرب کا دل بے قرار ہوا، نہ مشرق کی رگِ انسانیت پھڑکی، لیکن عجیب بات ہے کہ انسانی خون سے ہولی کھیلنے والے اور معصوم انسانوں کی لاشوں پر رقص و سرود کی محفلیں جمانے والے آج بے جان مجسموں کے انہدام پر اس قدر گریہ کناں اور مشغول آہ و فغاں ہیں کہ گویا اس سے زیادہ خراب اور تکلیف دہ کوئی واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو،

روسیوں کے افغانستان سے جانے کے بعد سے پورے ملک افغانستان میں باضابطہ کسی حکومت کا وجود نہیں تھا، باہم خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور اندیشہ تھا کہ یہ ملک چھوٹی چھوٹی قبائلی ٹکریوں میں بکھر کر رہ جائے گا، ان حالات میں طالبان اٹھے اور انہوں نے ملک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ۹۵ فیصد سے بھی زیادہ علاقوں پر ان کی مستحکم حکومت قائم ہوگئی، انہوں نے ملک کو امن و آشتی اور

عدل وانصاف سے ہمکنار کیا، اور اس ملک کی وحدت کو برقرار رکھا، ان کی یہ فتحمندی صرف ان کی فوجی طاقت کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ تھی، اور امن کے لئے بے قرار عوام ہر جگہ ان کے استقبال کے لئے چشم براہ تھے۔ انصاف اور معقولیت کا تقاضہ یہ تھا کہ طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا، اور انہیں عالمی اداروں میں نمائندگی دی جاتی، ایسی صورت میں افغانستان سے دنیا بھر کے روابط برقرار رہتے، اور ان سے صلح کی میز پر گفتگو کرنا ممکن ہوتا؛ لیکن جوممالک آج دور سے آہ وزاری کررہے ہیں، انہوں نے خود ہی اس دروازہ کو بند کررکھا ہے جس سے کوئی مصالحانہ گفتگو کی راہ ہموار ہوسکتی تھی۔

ہمارے ملک ہندوستان کے لئے ایک محبِّ وطن کی حیثیت سے صحیح مشورہ یہی ہوسکتا ہے کہ اسے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے، بابری مسجد جو کئی سو سال قدیم مسجد تھی، جس میں نمازوں کا سلسلہ جاری تھا، اور جہاں پہلے مندر ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں، اسے علانیہ شہید کردیا گیا، اور جن بدبختوں نے مسجد کو شہید کیا، وہی آج قومی ہیرو بنے ہوئے ہیں، اور اب تک اس ظلم وناانصافی کی تلافی کی طرف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا گیا تو جو لوگ ایک ایسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کے مجرم ہوں جس میں عبادت کرنے والے لوگ اس ملک بلکہ اس شہر میں بالفعل ابھی موجود ہوں، وہ ایک ایسے مجسمہ کے انہدام پر اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟ کہ اس ملک میں اس مذہب سے تعلق رکھنے والا ایک متنفس بھی اب موجود نہیں۔

پھر برادرانِ وطن کو کچھ اپنے دامن کے داغ پر بھی نظر کرنی چاہئے، اور سوچنا چاہئے کہ بودھوں پر ہندوؤں سے بھی بڑھ کر کسی قوم نے مظالم ڈھائے ہیں، ہندوستان تو پورا ملک ہی بودھوں کا تھا، ہندوؤں اور آریاؤں نے ان پر ایسے مظالم ڈھائے کہ انہیں ہندوستان چھوڑ، چین، جاپان، کمبوڈیا، برما، اور سری لنکا وغیرہ کے علاقوں کی پناہ لینی پڑی، یہاں تک کہ بعض بودھ مندروں پر آج بھی ہندوفرقہ پرستوں نے قبضہ کررکھا ہے، اجنتا اور ایلورا کے غار جن میں بودھ خانقاہیں تھیں، وہ بودھوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جوروستم پر گواہ ہیں، کہ بودھ راہب جب ترکِ وطن پر مجبور ہوگئے تو انہوں نے اپنی ان عظیم الشان

خانقاہوں کو مٹی سے بند کر دیا؛ تا کہ وہ ان کے دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رہیں، یہ بھی دلیری کی انتہا ہے کہ آپ نے جس قوم کو غلام بنایا ہے، جن کے لہو سے ہولی کھیلی، اور جنہیں ترک وطن پر مجبور کر دیا، آپ ان مظالم پر خود شرمندہ ہونے کے بجائے دوسروں کو زیادتی کا طعنہ دیں، اور اپنے آپ کو اس قوم کے ایک ہمدرد اور بہی خواہ کی حیثیت سے پیش کریں، واقعہ ہے کہ ہندوستان جب تک بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کو پوری نہ کر لے، اس کو یہ بات بالکل زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے مسائل پر اظہارِ خیال کرے۔

جہاں تک اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو دو باتیں بالکل واضح ہیں:

اول یہ کہ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے، اور ایک مسلمان کے لئے شرک کسی بھی درجہ میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، جیسے ایک غیرت مند شوہر بیوی کی ہر کمزوری کو سہہ سکتا ہے، اور ہر ناز کو برداشت کر سکتا ہے، لیکن اس کی بد چلنی کو گوارا نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک صاحبِ ایمان کے لئے خدا کے ساتھ شرک کا معاملہ قطعاً نا قابلِ برداشت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں شرک کو اسی تمثیل سے سمجھایا ہے، جو قوم پہلے سے شرک میں مبتلا ہو، اس کے لئے نئے خداؤں کو وجود میں لانا یا کسی نئی طاقت کو خدا مان لینے کا مسئلہ چنداں دشوار نہیں؛ کیوں کہ اگر کوئی شخص سو خداؤں کو مانتا ہو تو ۱۰۱ واں خدا اس کے عقیدہ کو متاثر نہیں کرتا؛ بلکہ شاید ان کو خوشی ہی ہو کہ اسے ایک اور بھگوان ہاتھ آ گیا ہے، اسی لئے ہندو بھائی یہ پیشکش کرتے رہے ہیں کہ جہاں ہم اور بھگوانوں کی پرستش کرتے ہیں، ہم محمد (ﷺ) کی پرستش کرنے کو بھی تیار ہیں، **والعیاذ باللہ**، لیکن جو شخص ایک خدا پر ایمان رکھتا ہو، اور اس ایک کے ماسوا سبھوں کا انکار کرتا ہو، اس کے لئے مختلف چوکھٹوں پر سر جھکانے اور مختلف آستانوں پر جبینِ بندگی خم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، اور اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان اس کی جرأت کر لے، تو وہ مسلمان باقی ہی نہیں رہتا، یہ عقیدۂ توحید اتنا معقول قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور مدلّل ہے کہ جو لوگ شرک کے مرتکب ہیں، وہ بھی تھوڑی سی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے بعد خدا کی وحدت کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں پاتے، یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنے معاملہ میں تو اس قدر غیرت مند ہو کہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی

یا خود اپنی ذرا بھی غلط نسبت کو برداشت نہیں کرے، لیکن اپنے خالق و مالک کے معاملہ میں اس قدر بے غیرت اور تساہل سے عاری، کہ ہر دن نئے خالق و مالک کی اپنے ہاتھوں تخلیق کرتا جائے، اور اس مسئلہ پر تفکر و تدبر کے لئے بھی تیار نہ ہو۔

دوسرا اصول مذہبی رواداری اور دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا ہے، رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے، تو آپ ﷺ اس بات پر قادر تھے کہ یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہ کو منہدم کرا دیتے، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں شام اور فلسطین کا علاقہ فتح ہوا، جہاں عیسائیوں کے بڑے چرچ اور گرجا تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اپنے حال پر رکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب فتحِ بیت المقدس کے موقع سے وہاں تشریف لے گئے اور کلیسا کے متولی کی اجازت بلکہ خواہش پر ایک چرچ میں نماز ادا کی، تو پھر اسی چرچ کے لئے ایک خصوصی دستاویز مرحمت فرمائی، کہ کہیں مسلمان اس کو مسجد میں تبدیل کر دینے کی کوشش نہ کریں، اس کے بعد متولیان چرچ کی خواہش کے باوجود آپ نے چرچ میں نماز ادا نہیں فرمائی کہ مسلمان جبراً اس کو اپنی عبادت گاہ بنانے کی کوشش کریں گے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی جامع مسجد تعمیر فرمائی تو اس سے متصل ایک چھوٹا سا چرچ تھا، آپ رضی اللہ عنہ نے عیسائیوں سے پیشکش کی کہ یہ منہ مانگی قیمت لے کر مسجد کو دے دیں، تاکہ مسجد کے صحن کو وسعت دی جا سکے، مگر عیسائیوں نے نہیں مانا تو آپ خاموش ہو گئے، حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ اپنے گورنروں کو ہدایت فرماتے تھے کہ مفتوحہ علاقوں میں کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، مصر کا علاقہ جہاں اہرام مصر واقع ہے، اور جن میں فرعون کے مجسمے بھی ہیں، عہدِ فاروقی ہی میں فتح ہو گیا، لیکن مسلمانوں نے عہد شرک کی ان یادگاروں کو منہدم کرنے اور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہی وجہ ہے کہ آج تک یہ عجائبِ عالم مصر کی زمین پر موجود ہیں، یہی حال دوسرے علاقوں کا ہے، خود افغانستان کا علاقہ ابتدائی دور ہی میں فتح ہوا ہے، اور کم و بیش پونے چودہ سو سال سے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، افغانستان میں توقع ہے کہ بعض صحابہ نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہوگا، تابعین تو بہت سے آئے ہوں گے، اور اولیاء، صالحین تو نہ جانے کتنے پیدا ہوئے ہوں، لیکن ان

حضرات نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع سے بیت اللہ شریف کے بتوں کو منہدم فرمایا، اور مکہ میں جہاں کہیں جو بت تھے، انہیں صاف کرنے کا حکم دیا، لیکن یہ ایک استثنائی واقعہ ہے، مکہ دینِ توحید اسلام کا اعتقادی دار الخلافہ ہے، اس لئے ضروری تھا کہ وہاں شرک کے مظاہر باقی نہ رہیں، پھر اس شہر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بسایا تھا، اور اس گھر کو خالصۃً ایک اللہ کی عبادت کے لئے اللہ کے ان دو بندوں نے بنایا تھا، اس طرح یہ ابتداء ہی سے توحید کا مرکز تھا، جسے ناروا طریقہ پر بت پرستی کا مرکز بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اس لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ قدم اٹھایا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت طالبان کا یہ اقدام مصلحتِ وقت کے خلاف اور ان لوگوں کو نفع پہونچانے والا ہے جو مسلمانوں کو دہشت گرد اور شدت پسند بتاتے ہیں، اور اسلام کے خلاف طرح طرح کی نفرت انگیز غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں، دوسری طرف ایک ایسا ملک جو صد فی صد مسلمان ہے، اور جہاں ان مجسموں کی پہلے سے بھی کوئی پذیرائی نہیں تھی، وہاں ان کا باقی رہنا چنداں مضر نہیں تھا، ان حالات میں اس رواداری اور وسیع النظری کی راہ کو اختیار کرنا بہتر ہوتا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ اور مسلمانوں کی تاریخی روایات کے مطابق ہے اور اس طرح کا عمل بسا اوقات ردِ عمل کو جنم دیتا ہے، اور یہ ہرگز بہتر بات نہ ہوگی کہ کوئی مسلمان ناشائستہ ردِ عمل کا سبب بنے، قرآن نے اسی لئے معبودانِ باطل کو بُرا بھلا کہنے سے منع کیا، کہ اگر مسلمان ایسا کریں تو وہ بھی جواب میں شانِ باری تعالیٰ میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے، اور بالواسطہ طریقہ پر ہم اس کا سبب بنیں گے۔

(۱۶/ مارچ ۲۰۰۱ء)

کیا کافر کہنا توہین ہے؟

کوئی انسان خود اپنی مرضی اور خواہش سے دنیا میں پیدا نہیں ہوا ہے، اور نہ کوئی شخص اپنی خواہش اور مرضی سے دنیا سے واپس ہوتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی اور طاقت ہے جو انسان کو دنیا میں بھیجتی ہے، اور ایک مقررہ وقت کے بعد اسے واپس بلالیتی ہے، یہ کون سی طاقت ہے؟۔ اس سلسلہ میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سب اس فطرت کی کرشمہ سازی ہے جو پوری کائنات میں جاری وساری ہے، جولوگ خدا کا انکار کرتے ہیں اور ملحد و دہریہ ہیں، کائنات کے وجود اور اس کے بقاء کے سلسلہ میں ان کا یہی نقطۂ نظر ہے، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فطرت کو پھر بھی ایک خالق کی ضرورت ہے، جس نے مختلف چیزوں میں الگ الگ صلاحتیں رکھی ہیں، ایسا کیوں ہوا کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ٹھنڈک دیتا ہے، ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ آگ ٹھنڈی ہوتی اور پانی گرم ہوتا، گلاب کی فطرت میں سرخی اور موتیے کی فطرت میں سفیدی رکھی گئی، بکری ایک مسکین طبیعت جانور ہے اور شیر درندہ صفت، یہ اختلافِ فطرت کیوں ہے؟ پھر اگر زندگی اور موت فطرت کے تابع ہوتی ہر شخص کو ایک متعینہ وقت پر ہی موت آتی، ہر شخص ایک مقررہ وقت پر ہی باپ بنتا، لیکن ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس قانونِ فطرت کا بھی کوئی خالق ہے، جس کے سامنے فطرت سرِ تسلیم خم کئے ہوئی ہے، اور پل پل اس کے حکم کی تابعدار ہے، اسی اَن دیکھے وجود کا نام ''خدا'' ہے، خدا کے ماننے والوں کے مقابلہ، خدا کا انکار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ معمولی اور انگلیوں پر قابلِ شمار رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا یقین بجائے خود فطرتِ انسانی کا ایک حصہ ہے، دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں، قریب قریب یہ ان سب کے درمیان قدر مشترک ہے،

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں وہ اس بات کو بھی ماننے پر مجبور ہیں کہ ان کو اسی طریقہ کو اپنانا چاہئے جو خدا کی طرف سے ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو، کیوں کہ جو کسی مشین کو بناتا اور وجود میں لاتا ہے اسی کی ہدایت کے مطابق وہ چیز استعمال بھی کی جاتی ہے، خدا کے بتائے ہوئے طریقۂ زندگی کا نام ''دین'' ہے اور اسی کو لوگ ''مذہب'' سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دو متضاد چیزیں بیک وقت درست نہیں ہوسکتیں، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ دن و رات ایک ہی ہے، روشنی اور اندھیرا جدا گانہ حقیقتیں نہیں ہیں، میٹھا اور نمکین ایک ہی سکہ کے دو رُخ ہیں، تو یہ بات یقیناً سچائی کے خلاف ہوگی، یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی کو میٹھا پسند ہو تو نمکین پسند کرنے والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، اگر کسی کو اندھیرا بھاتا ہو تو وہ روشنی پسند کرنے والوں سے الجھے نہیں، لیکن یہ کہنا کہ روشنی اور اندھیرا دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، یقیناً ایک خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ بات ہوگی۔

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اصل دین ایک ہی ہے، اسی دین کو لے کر پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اس کائنات میں اترے، اسی کی دعوت حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی، اسی نعرۂ حق کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انبیاء بنی اسرائیل نے اپنے اپنے عہد میں بلند فرمایا، ہر قوم اور ہر زبان میں اسی صراطِ مستقیم کی سوغات لے کر انبیاء و رُسل پہونچے، جس کا سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہوا، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران:۱۹)۔ اس لئے اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا، خدا نے کھانے کے لئے الگ نالی بنائی ہے، اور سانس لینے کے لئے الگ نالی، اگر کوئی شخص سانس کی نالی میں کھانے کا لقمہ رکھ دے، تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں گے، اسی طرح، نجات کی طرف لے جانے والا راستہ ایک ہی ہے، یہ کہنا کہ راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، بظاہر ایک اچھا نعرہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ تمام دواؤں کا ایک ہی اثر ہوتا ہے۔

جو لوگ مذاہب کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں، وہ دراصل مذہب کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں ہیں، جو لوگ ایک خدا کو مانتے ہوں، جو تین خداؤں پر یقین رکھتے ہوں،

اور جو تین کرور خداؤں کے سامنے سر جھکاتے ہوں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں، اور کیوں کر سوچا جا سکتا ہے کہ بیک وقت یہ تمام باتیں درست ہوں گی؟ جن لوگوں نے خدا کی طاقت کو مختلف لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، اور جن کے نزدیک خدا قادرِ مطلق ہے، اس کی طاقت میں کوئی شریک وسہیم نہیں، یہ دونوں سچائی پر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس لئے یہ کہنا کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل ایک ہی ہے، اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

ایسی صورت میں ہر مذہب کو اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہ کوئی تعبیر اختیار کرنی ہوتی ہے، اس تعبیر کے لئے ایک طریقہ تو یہ ہے کہ جو دوسرے مذہب پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں، ان کے لئے اہانت آمیز لفظ استعمال کیا جائے، جیسے ہندو مذہب کی بعض کتابوں میں غیر ہندو کے لئے ملیچھ (ناپاک) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کے لئے اہانت آمیز تعبیر ہوگی، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک تعبیر اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے ہو اور ایک اس کے نہ ماننے والوں کے لئے، جس کا مقصد ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہو، اکثر آسمانی کتب میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو یہوداہ کی نسبت سے یہودی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے عیسائی کہا گیا اور تورات وانجیل میں اس زمانے کے اس دین حق پر ایمان نہ رکھنے والوں کے لئے ''کافر'' کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس انکار کو ''کفر'' کہا گیا۔

یہی تعبیر آخری، مکمل اور محفوظ کتاب ہدایت قرآن مجید میں بھی اختیار کی گئی ہے، جو لوگ اس کی تعلیمات پر یقین رکھنے والے ہیں ان کو ''مسلم'' یا ''مومن'' کہا گیا، یعنی احکام اسلام کو ماننے والا اور اسلامی تعلیمات پر یقین رکھنے والا، اور اس کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، چنانچہ قرآن مجید میں دینِ اسلام سے انحراف اور اس انحراف پر یقین رکھنے والوں کے لئے مختلف صیغوں میں کفر اور کافر کا لفظ ۴۹۴ بار استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ کوئی نئی تعبیر نہیں ہے۔

عربی زبان میں کفر کے اصل معنی چھپانے کے آتے ہیں، اسی لئے رات کے لئے بھی کافر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، کہ وہ بھی اپنے پردۂ ظلمت میں لوگوں کو چھپاتی ہے، کاشتکار چوں کہ بیج کو زمین کی تہہ میں چھپا دیتا ہے، اس لئے عربی زبان میں کاشتکار کو بھی بعض اوقات کافر سے تعبیر کیا جاتا ہے، (مفردات القرآن :۵۵۹/۲)۔ غالباً اسی مناسبت سے یہ لفظ سمندر اور اندھیرے بادل کے لئے بھی استعمال ہوا ہے (القاموس المحیط /۶۰۵)۔ کہ سمندر اپنی تہوں میں کتنی ہی جمادات و نباتات کو چھپائے ہوئے ہے، اور گھنا بادل دھوپ اور فضاء میں پائی جانے والی چیزوں کے لئے حجاب بن جاتا ہے، جو شخص ناشکرا اور جذبۂ شکر سے عاری ہو، وہ گویا اپنے محسن کی طرف سے آنے والی نعمت کو پردۂ خفا میں رکھ دیتا ہے۔ اس لئے ناشکری کے لئے بھی کفر کی اصطلاح استعمال ہوئی، خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (مفردات القرآن :۵۵۹/۲)

کسی بھی زبان میں ایک لفظ کا جو حقیقی معنی ہوتا ہے وہ براہِ راست اور بالواسطہ مناسبتوں کی وجہ سے نئے نئے پیکر میں ڈھلتا رہتا ہے، ناشکری میں نعمتوں سے جو دو انکار کا معنی پایا جاتا تھا، اس مناسبت سے کافر کا معنی مطلق انکار کرنے والا قرار پایا، اور جو لوگ اسلامی عقیدہ اور نظامِ حیات کو نہ مانتے ہوں، ان کے لئے کافر اور ان کی انکاری فکر کے لئے کفر کا لفظ استعمال ہونے لگا، **واعظم الکفر جحود الوحدانیة أو الشریعة أو النبوة** (مفردات القرآن :۵۵۹/۲)۔ قرآن مجید میں بھی غیر مسلموں کے لئے کافر کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا، علمائے یہود سے کہا گیا کہ تم اسلام کے اولین منکر نہ بن جاؤ: **وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ** (البقرۃ:۴۱)۔ قرآن نے ایک موقع پر حج کو فرض قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جو اس کو نہ مانے تو اللہ تعالیٰ کو کوئی پرواہ نہیں: **مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ** (آل عمران:۹۷) مشرکین مکہ آخرت کے جزاء وسزا کے منکر تھے؛ چنانچہ ان کے انکار آخرت کو قرآن میں اس طرح تعبیر کیا گیا: **وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ** (یوسف:۳۷)

یہاں کفر کے معنی انکار کرنے اور تسلیم نہ کرنے کے ہی ہیں، قرآن نے قیامت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے کہ اہلِ دوزخ جب شیطان پر لعنت ملامت کریں گے، تو شیطان

نہایت ڈھٹائی سے کہے گا کہ تم نے جو مجھ کو خدا کا شریک ٹھہرایا تھا، میں اس کا انکار کرتا ہوں، اس انکار کو قرآن نے کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: اِنِّیْ کَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَکْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (ابراہیم: ۲۲) اسی طرح حضرت موسیٰ پر ایمان لانے اور سحر کا انکار کرنے والے کے شرک سے منکر ہونے کو لغوی معنی میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے: وَ لَمَّا جَآءَ ھُمُ الْحَقُّ قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ کٰفِرُوْنَ (الزخرف: ۳۰)

دیکھئے یہاں توحید کے انکار کو نہیں بلکہ شرک کے انکار کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، گویا لغت کی رو سے کفر کے معنی، چھپانے، ناشکری کرنے، انکار کرنے اور نہ ماننے کے ہوئے۔

قرآن نے جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کو کافر کہا ہے، وہ اسی معنی میں ہے کہ یہ شخص اسلامی تعلیمات کا انکار کرتا ہے، گویا کافر کے معنی غیر مسلم کے ہوئے ؛ جیسے کوئی شخص ہندو نہ ہو تو اس کو غیر ہندو، اور عیسائی نہ ہو تو اس کو غیر عیسائی کہا جاتا ہے، اسی طرح جو شخص اسلام کو نہ مانتا ہو اسے غیر مسلم کہا جائے گا، عربی زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے ''کافر'' کا لفظ ہے، یعنی ایسا شخص جو خدا کو ایک نہ مانتا ہو، اور اسلامی افکار و معتقدات کا قائل نہ ہو، اس میں نہ کوئی خلافِ واقعہ بات ہے، نہ کسی کی اہانت ہے، نہ نفرت و عداوت کا اظہار ہے، اگر کسی غیر مسلم کو مسلمان زبردستی مسلمان کہتے، جیسا کہ ہمارے ہندو بھائی ان لوگوں کو بھی ہندو کہنے پر مصر ہیں، جو پوری وضاحت و صراحت اور اصرار کے ساتھ اپنے ہندو ہونے کا انکار کرتے ہیں، تو یہ یقیناً ان کی توہین کی بات ہوتی، پس حقیقت یہ ہے کہ اگر اس لفظ کے معنی پر غور کیا جائے، تو جن لوگوں کے لئے یہ تعبیر اختیار کی جارہی ہے، ان کے لئے یہ تعبیر محض ان کے نقطۂ نظر کا اظہار ہے، نہ کہ یہ عداوت و نفرت پر ابھارنے والی تعبیر ہے۔

پھر غور کیجئے کہ قرآن مجید میں زیادہ تر اہلِ مکہ کو کافر کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے، اگر اس تعبیر میں توہین اور تمسخر مقصود ہوتا، تو عرب جو اس زبان کے رمز آشنا اور ذوقِ ادب کے حامل تھے، وہ اس پر معترض ہوتے۔ لیکن اہلِ مکہ کی طرف سے کوئی ایسا احتجاج سامنے

نہیں آیا، بلکہ خود غیر مسلم اپنے کافر ہونے کا اقرار واعتراف کرتے تھے، اور کہتے تھے، کہ تم جو پیغام لے کر آئے ہو ہم اس سے کفر کرتے ہیں: اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (الزخرف:۲۴)

عجب بات ہے کہ اس وقت اسلام کے خلاف مغربی میڈیا اور سنگھ پریوار نے جو بے جا شورش شروع کر رکھی ہے، وہ ایسی تیز آندھی کی طرح ہے، کہ اس میں اڑنے والے خس وخاشاک کو بھی لوگوں نے گل وثمر سمجھ رکھا ہے، اور دنیا آنکھ بند کر کے اس پر آمین کہتی جاتی ہے، سنگھ پریوار کے لوگ تو اپنے تعصب اور جہالت میں اس قسم کی بے معنی باتیں کہتے ہی رہتے ہیں، پچھلے دِنوں بمبئی کی ایک عدالت کا جو فیصلہ سامنے آیا، وہ نہایت حیرت کا باعث ہے، کہ اس لفظ کے اصل معنی ومقصود کو سمجھے اور اس کی مناسب تحقیق کئے بغیر اس کو توہین آمیز اور نفرت انگیز تعبیر قرار دے دیا گیا، کسی مسلمان کو کافر کہنا تو یقیناً اس کی توہین ہے۔ کیوں کہ یہ اس کے دعویٰ اسلام کو جھٹلانے کے مترادف ہے، لیکن جو شخص مسلمان نہ ہو، اس کو کافر کہنا ایک سچائی کا اظہار ہے نہ کہ توہین۔

(۱۰؍مئی ۲۰۰۲ء)

مذہب کی تبدیلی

تمل ناڈ حکومت نے تبدیلیٔ مذہب کے سلسلہ میں جو آرڈینس جاری کیا ہے، وہ فرقہ پرست عناصر کو خوش کرنے کا ایک حربہ اور ہندوستان کے جمہوری اقدار کا علانیہ قتل ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج میں ایک عرصہ سے مذہب کی تبدیلی کا سلسلہ جاری ہے، ہندو مذہب میں بنیادی طور پر کوئی ایسا ٹھوس عقیدہ نہیں پایا جاتا، جس کو ہندو عقیدہ اور آئیڈیالوجی کا نام دیا جاسکے، جو لوگ رام کو بھگوان اور خدا مانتے ہوں، وہ بھی ہندو ہیں، اور جو گ راون کو خدا قرار دیتے ہوں اور رام کو بُرا بھلا کہتے ہوں وہ بھی ہندو مذہب ہی کے علمبردار ہیں، اور نہرو وغیرہ جیسے دانشور جو مورتی پوجا اور دیوی دیوتاؤں کے وجود کو توہم پرستی قرار دیتے ہوں وہ بھی ہندو ہیں، غرض ہندو مذہب موم کی ناک ہے، اس کی جو صورت چاہو، بنالو، توہم پرستی ہی کے نتیجے میں طبقاتی تقسیم ہندو عقیدہ کا اٹوٹ جزء ہے، اور اسی لئے ہندستان میں ہزاروں سال سے دبے کچلے ہوئے لوگوں کا احساس ہے، کہ ہندو مذہب در اصل مذہبی قالب میں ''برہمن واد'' کی حفاظت سے عبارت ہے، اس نظام نے صدیوں سے دلت اور پست طبقات کو اپنے طاقتور پنجہ میں دبا رکھا ہے، جب بھی انہوں نے انگڑائی لینے کی کوشش کی، نہایت ذہانت کے ساتھ ان پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی گئی۔

حالاں کہ ہمارا موجودہ جمہوری ڈھانچہ ذات پات کے تصور کی نفی کرتا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی برہمنوں کی تعداد تو چار، پانچ فیصد سے زیادہ نہیں، حکومت کے کلیدی عہدوں پر ان کی تعداد ۶۴ فیصد ہے، سیاسی تبدیلیوں سے چہرے بدلتے ہیں، لیکن اس حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، آج تک پست اقوام میں کوئی شنکر اچاریہ، اور مٹھ کا سربراہ نہیں بن سکا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندو قوم میں یہ مسئلہ محض ایک سماجی

مسئلہ نہیں، بلکہ اس کی جڑیں عقیدہ کی گہرائیوں میں پیوست ہیں، ان حالات نے دبے کچلے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہندوازم کے اس قید خانے سے اپنے آپ کو باہر نکالیں، اور باعزت انسان کی طرح سماج میں زندہ رہیں، اس کے لئے مشہور رہنما امبیڈکر نے بودھ ازم کو قبول کیا، لیکن جلد ہی سمجھ دار اور باشعور لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ شراب کو آب سمجھنے کے مترادف ہے، بدھسٹ سماج کو ہندو سماج نے اس طرح جذب کر لیا ہے کہ گویا یہ قید خانہ کی ایک کوٹھری سے نکل کر دوسری کوٹھری میں داخل ہونا ہے، وہی سماج، وہی تہذیب، وہی رسوم و رواج، بس خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ، یا کچھ دیوتاؤں کی تبدیلی، یہاں تک کہ دستورِ ہند کے مطابق بھی اسی تبدیلی مذہب کے باوجود وہ ہندو ہی شمار کیا جاتا ہے، لوگ یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ جن مذاہب کی پیدائش اور نشو ونما ہندوستان کی سرزمین میں ہوئی ہے، برہمنوں نے اپنی ذہانت سے ان کا ایسا ''ہندوکرن'' کر دیا ہے، کہ اب کسی کے لئے ان مذاہب میں سے کسی کو اختیار کرنے کے باوجود ہندو سماج کے مظالم سے نجات پانا اور انصاف حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اس لئے بے چین اور بے قرار ذہن وفکر رکھنے والوں کے لئے دو ہی راستے رہ گئے ہیں، عیسائیت یا اسلام؟ اس سے کسی حقیقت پسند غیر مسلم کو بھی انکار نہیں کہ اسلام کے عقائد اور اصول جتنے صاف و شفاف، عقل وفطرت سے ہم آہنگ، متوازن اور انسانی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہیں، کسی اور مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی، اللہ کی وحدت اور انسانوں کی وحدت، یہ اسلام کا انقلابی تصور ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر خدا ایک ہے، اس کا کوئی خاندان، کنبہ نہیں، اور کسی انسانی طبقہ سے اس کی قرابت مندی اور رشتہ داری نہیں تو اس سے خود بخود انسانی وحدت اور مساوات کا تصور ابھرتا ہے، پھر اسلام میں کوئی عقیدہ ''پہیلی'' کی طرح نہیں کہ اس کا سمجھنا مشکل اور سمجھانا مشکل تر ہو، جیسا کہ ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں ایک میں تین اور تین میں ایک کا تصور ہے، یا عقیدۂ کفارہ ہے کہ غلطی کوئی کرے اور سزا حضرت مسیح کو جھیلنی پڑے، اسی لئے مسلمان حالانکہ اس ملک میں بہت تھوڑی تعداد میں آئے، لیکن اس ملک

کے باشندوں نے جو طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ظلم و جور سے دوچار تھے، اور دیوتاؤں کی ایک فوج کی پرستش کرتے کرتے عاجز آچکے تھے، انہوں نے اسلام کی دعوت پر لبیک کہا، افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش اور برما تک جو مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے وہ اسلام کی اسی کشش کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس ملک میں جبراً تبدیلئ مذہب کرایا ہے، لیکن یہ ایسا جھوٹ ہے کہ خود عقلِ عام اس کو جھٹلاتی ہے، ہندوستان کی جنوبی اور ساحلی علاقوں میں تو اسلام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی کے عہد میں آچکا تھا، اور نہ صرف پرجا بلکہ بعض راجاؤں نے بھی اسلام قبول کیا تھا، اس وقت یقیناً درّہ جبر سے کوئی فوجی قافلہ ہندوستان نہیں پہونچا تھا، اس وقت جبر و دباؤ کی کیا گنجائش تھی؟ پھر غور کیجئے کہ مسلمانوں نے اس ملک کے مختلف حصوں پر کم و بیش آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے، آج جب حکومت کے بغیر ہندو سماج میں تبدیلئ مذہب کا طوفان اٹھا ہوا ہے، اور کئی ریاستوں میں آبادی کا توازن بدل چکا ہے، تو اگر اتنا طویل عرصہ جبر و دباؤ سے کام لیا جاتا تو کیا یہ ملک مسلم اکثریت نہیں بن گیا ہوتا؟، حقیقت یہ ہے کہ جبر و دباؤ تو الگ چیز ہے، مسلمان حکمرانوں نے تو عام طور پر اسلام کی تبلیغ و دعوت کی طرف بھی توجہ نہیں کی، اور اشاعتِ دین کی طرف سے انتہائی تغافل برتا، ورنہ اگر اس سلسلہ میں تھوڑی بھی کوشش کی جاتی تو اسلام میں جو کشش ہے، یہی لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے کافی ہوتی۔

اسلام کے بعد اس ملک کے لوگوں کے لئے زیادہ قابلِ توجہ مذہب عیسائیت ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے سو سال میں ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد نے عیسائیت کو قبول کیا ہے، اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، کئی ریاستوں میں تو عیسائیت اکثریتی مذہب بن گیا، میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ دو ہے، ایک تو مادی وسائل کا استعمال، ہسپتال، درسگاہیں، اور معاشی فلاح کے مراکز کے قیام و انتظام نے عیسائیت کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ مقامی آبادی میں اثر و نفوذ حاصل کرے اور ان میں داخل ہو سکے، دوسرے گو عیسائیت ایک عالمی مذہب اور ترقی یافتہ قوم کا مذہب ہونے کی وجہ سے ہندو ازم کے ساتھ

مکمل طور پر جذب نہیں کی جا سکتی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائیت کا کوئی سماجی تشخص، نہیں ہے، شادی، بیاہ، سماجی رسم ورواج وغیرہ میں وہ ہندو سماج ہی کا ایک حصہ بن گئے ہیں، ان کے پاس حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا کوئی مکمل نظامِ حیات نہیں، جو ان پر قیود و حدود عائد کرتا ہو اور اپنے پہلے معمولات سے روکتا ہو، اکثر اوقات تو نام بھی تبدیل نہیں کئے جاتے، بس کچھ تہواروں کا فرق ہوتا ہے، شرک پہلے بھی تھا، اور اب بھی ہے، مورتی کی پرستش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، اس لئے جب کوئی ہندو عیسائی مذہب قبول کرتا ہے تو اسے بہت ہی معمولی تبدیلیوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس کی عملی زندگی میں تو کوئی انقلاب آتا ہی نہیں، اور اسے فکر و عقیدہ کے اعتبار سے بھی کسی غیر معمولی تبدیلی سے گذرنا نہیں پڑتا۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں دورنگی اور دوعملی کو روا نہیں رکھتا، اسلام قبول کرنے کا مطلب خداؤں میں ایک خدا کا اضافہ نہیں، بلکہ اللہ سے رشتہ جوڑ کر تمام توہمات سے رشتہ توڑنا ہے، اس کی عبادتیں الگ ہیں، اس کے تہوار الگ ہیں، وہ غیر مسلم خاندانوں سے شادی بیاہ کا تعلق قائم نہیں رکھ سکتا، وہ ایمان لانے کے بعد اپنے والدین کے ترکہ سے حصہ نہیں پا سکتا، اس کو کھانے، پینے، خریدنے، بیچنے، کمانے غرض زندگی کے ہر شعبہ میں حلال وحرام کی حدیں قائم کرنی پڑتی ہیں، اور حرام سے بچنا پڑتا ہے، دین یقیناً آسان ہے، لیکن جو نفس کی ہر خواہش پر لبیک کہنے کا عادی بن چکا ہو، اس کے لئے حق پر گامزن ہونا لوہا کو چنا چبانے کے مترادف ہے، گویا مسلمان ہونے کے بعد انسان ایک سماج سے دوسرے سماج کی طرف ہجرت کرتا ہے، اس لئے یہ پھولوں کی سیج نہیں، بلکہ کانٹوں کا فرش ہے، اسی بناء پر جو لوگ خدا سے ڈر کر سچائی اور حقیقت کی تلاش کے جذبے سے معمور ہو کر اور عزم وارادہ کی قوت سے مسلح ہو کر قدم اٹھانا چاہیں، وہی اس راہ پر آ سکتے ہیں، کسی بھی شخص کو حقیر، معمولی اور مادی مقاصد کے تحت اس راہ میں آبلہ پائی کا حوصلہ نہیں ہو سکتا، چنانچہ ایک تو ان مشکلات اور دوسری طرف دعوتِ اسلام کے کاموں سے غفلت کی بناء پر آزاد ہندوستان میں عیسائیت کی طرف ہندو سماج کا رجوع زیادہ ہوا ہے۔

ہندوستان ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جو ہر شخص کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل

کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے، چنانچہ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق کی دفعہ: ۲۵ میں تمام شہریوں کے لئے آزادی ضمیر اور آزادی سے مذاہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا مساوی حق شامل ہے، اس لئے سنگھ پریوار کا ''دھرم پری ورتن'' پر چیں بہ جبیں ہونا یقیناً ہندوستان کے دستور سے بغاوت کرنے کا مترادف ہے، اپنی بیماری کو دور کرنے کے بجائے ان لوگوں کو بُرا کہنا جو بیماری کو بیماری سمجھتے ہیں، بے وقوفی ہی کہی جا سکتی ہے۔

اسلام نے بھی ضمیر واعتقاد کی آزادی کو تسلیم کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے صاف ارشاد فرمایا کہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ واضح ہو چکی ہے، لہٰذا دین کے معاملہ میں کوئی جبر ودباؤ نہیں ہے ''لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرۃ:۲۵۶) رسول اللہ ﷺ سے صاف ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کا کام صرف نصیحت کرنا ہے، آپ داروغہ نہیں ہیں کہ ان کو اپنی بات ماننے پر مجبور کردیں ''اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ'' (الغاشیہ:۲۱،۲۲) ایک موقع پر ارشاد ہوا کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسان ہی مومن ہو جاتے، پھر کیا آپ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کردیں گے؟ ''اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ '' (یونس:۹۹) پیغمبر اسلام ﷺ کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر وہ آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں، آپ پر تو محض یہ ہے کہ پیغامِ ہدایت کو صاف صاف اور کھلے طور پر پہونچا دیں، اور بس: ''فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (النحل:۸۲) آپ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ کفر پر بہ ضد ہیں ان سے کہہ دو کہ تمہارے لئے تمہارا دین ہے، اور میرے لئے میرا دین، لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ لِيَ دِيْنِ (الکافرون:۶) ایک اور موقع پر آپ کی زبان سے کہلا گیا کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال: لَنَا اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (الشوریٰ:۱۵)، غرض عقیدہ وضمیر کی آزادی کا قائل اسلام بھی ہے، وہ کسی شخص کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کرتا، ہاں جہاں اسلامی حکومت ہو اور ایک شخص نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے شہریت قبول کی ہو اور حقوق حاصل کئے ہیں، اس کا اسلام سے کفر کی طرف سفر کرنا نہ صرف روشنی سے تاریکی کی طرف سفر کرنا ہے، بلکہ گویا ملک سے بغاوت ہے، اور بغاوت کسی بھی سیاسی نظام

میں نا قابلِ برداشت ہے، اسی لئے جہاں اسلامی حکومت ہو وہاں ارتداد موجب قتل ہے۔

بہر حال تبدیلیٔ مذہب پر ہونے والی یہ بحثیں مسلمانوں کے لئے مایۂ عبرت ہیں کہ ہندو سماج جو پاکیزہ مذہبی تصورات اور عقل انسانی سے ہم آہنگ عقائد سے محروم اور توہمات کے شکنجہ میں قید ہے، اور جو روحانی سکون کے لئے مضطرب اور طبقاتی تقسیم کی وجہ سے مظلوم اور ستم رسیدہ ہے، اسلام جیسا صاف ستھرا، پاکیزہ، روحانی اور اخلاقی قدروں سے معمور، عقل وفطرت کے تقاضوں سے ہم آہنگ، انقلاب انگیز، اور انسانیت کی اصلاح کے لئے غیر معمولی صلاحیت کا حامل اور اثر انگیز مذہب وعقیدہ کا حامل ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے فرائض سے بے اعتنائی برتی، اور آج تک بھی ہم کوئی منظم اور منصوبہ بند، دعوتی اور تبلیغی سعی وکاوش نہیں کر رہے ہیں، حالاں کہ یہی فریضہ ہے، جو نصرت خداوندی کی کلید اور خدا کے غیبی نظام کے تحت مسلمانوں کی حفاظت وصیانت کا سب سے بڑا ہتھیار رہے۔

(یکم نومبر ۲۰۰۲ء)

اسلام اور غیر مسلم

اسلام ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح و سلامتی کے ہیں، اور ایمان ''امن'' سے ہے جو ظاہر ہے کہ امن و آشتی کو بتلاتا ہے، گویا صلح و سلامتی اور امن و آشتی اس دین کی خمیر میں داخل ہے، اسلام کی تمام تعلیمات اس کے اس مزاج و مذاق کی آئینہ دار ہیں، اس نے محبت کا سبق سکھایا ہے، اللہ سے محبت، اللہ کے رسول سے محبت، مسلمانوں سے محبت، پوری انسانیت سے محبت اور تمام مخلوقات سے محبت، غرض یہ دین دینِ محبت ہے، نہ کہ دین نفرت، یہ مذہب اخوت کا مذہب ہے نہ کہ عداوت کا، یہ صلح کی دعوت ہے نہ کہ جنگ کی، اس نے اس وقت محبت کی شمع جلائی جب ہر طرف بغض وعناد کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

مگر افسوس کہ جو لوگ صدیوں سے نفرت کے سوداگر ہیں، جو شب و روز انسانیت کو ہلاک و برباد کرنے والے ہتھیاروں کی تیاری میں مصروف کار ہیں، اور جو پوری دنیا میں انسانوں کی تباہی و بربادی کے اسباب کی تجارت کر رہے ہیں، اور یہی ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اور دنیا پر ان کے رعب و دبدبہ کا سبب و وسیلہ ہے، وہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں دہشت گردی اور انتہا پسندی کے پروپیگنڈے کر رہے ہیں، اور یہ پروپیگنڈہ اس شدومد اور قوت کے ساتھ ہو رہا ہے کہ مشرق و مغرب گویا اس پر ایمان لا چکا ہے، یہاں تک کہ خود بعض مسلمان بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہیں۔

جب بھی کوئی ایسا موقع آتا ہے، جس میں پروپیگنڈے کی اس آنچ کو تیز کرنے کا موقع ہو، تو ہمارا میڈیا ہرگز اسے ضائع ہونے نہیں دیتا، بلکہ نمک مرچ لگا کر اس میں اضافہ ہی کرتا ہے ـــــ اس کی ایک مثال ''طالبان'' سے متعلق حالیہ خبریں ہیں، پہلے یہ

خبر آئی کہ طالبان ہندو اقلیت کو افغانستان سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں، پھر یہ ہوا کہ انہوں نے ہندو اقلیت پر زرد کپڑے پہننے کا لزوم کردیا ہے، پھر یہ خبر آئی کہ ان کے لئے زرد شناختی کارڈ بنائے گئے ہیں، ان خبروں کو ہمارے ذرائع ابلاغ نے بلا تحقیق بلکہ طالبان کی وضاحت کے باوجود بہ اصرار اتنا پھیلایا کہ اس سے اکثریتی فرقہ میں بجا طور پر اشتعال کی کیفیت پیدا ہوئی، مسلمانوں کے تئیں نفرت میں اضافہ ہوا، ظاہر ہے کہ یہ ایک منصوبہ بند سازش ہے، اوراس کا مقصد پوری دنیا میں مسلمانوں کے وقار کو متاثر کرنا اور ہندوستان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے تئیں مخالفانہ جذبات کو ہوا دینا ہے، طالبان کی طرف سے یہ وضاحت آچکی ہے کہ انہوں نے اقلیت پر کسی خاص لباس کا لزوم نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے لئے محض شناختی کارڈ زرد رنگ کا جاری کیا گیا ہے، اور وہ بھی اس لئے کہ افغانستان میں مسلمانوں پر نماز با جماعت قانونی طور پر لازم قرار دی گئی ہے، غلط فہمی میں بعض دفعہ افغان پولیس غیر مسلموں کو بھی مسجد جانے کا پابند بناتی تھی، اس پر وہاں کے غیر مسلموں نے حکومت سے خواہش کی کہ ان کے لئے کوئی ایسی شناخت فراہم کی جائے کہ پولیس والے انہیں تنگ نہ کرسکیں، اسی پس منظر میں ان کے لئے زرد شناختی کارڈ جاری کیا گیا ہے، تاکہ پولیس کو پہچاننے میں سہولت ہو، اور غیر مسلم بھائیوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔

غور کیجئے کہ طالبان کے اس عمل میں اقلیت کی ایذا، اور ضرر رسانی کا جذبہ کارفرما ہے یا ان کی سہولت وآسانی کا؟ مختلف مصلحتوں کے لئے یہ بات مروج ہے کہ مخصوص کارڈ جاری کئے جاتے ہیں، بعض مغربی ملکوں میں شہریت کے کئی درجات ہوتے ہیں، اور ہر درجے کے لئے الگ الگ رنگوں کے کارڈ بہ طورِ شناخت ہوتے ہیں، اس میں تذلیل وتحقیر مقصود نہیں ہوتی، اگر طالبان نے بھی غیر مسلم بھائیوں کی سہولت اور اپنی قانونی مصلحت کے پیش نظر کوئی شناختی کارڈ جاری کیا ہو، تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور اسے کیوں کر ناانصافی کہا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر اس امر کی وضاحت مناسب ہوگی کہ غیر مسلموں کے بارے میں

اسلام کا رویہ کیا ہے؟ —— انسانی عزت وتکریم اسلام کی بنیادی فکر میں داخل ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ اسلام میں اسی کو عقیدہ کا درجہ حاصل ہے، تو بے جا نہ ہوگا، قرآن نے کہا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ، کہ اللہ نے بنی آدم کو کرامت وشرف کا تاج پہنایا ہے، قرآن نے انسان کے جسمانی قالب کو سب سے بہترین سانچہ قرار دیا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت آدم فرشتہ جیسی عظیم مخلوق کے بھی مسجود تھے، اور قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ تمام انسان حضرت آدم ہی سے پیدا ہوئے ہیں: خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ یہ انسانی کرامت کا پہلو بلا امتیاز مذہب تمام انسانوں کے احترام کا تصور عطا کرتا ہے، اس لئے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بھی تحقیر واہانت کا سلوک روانہیں۔

اس بات کو آپ ﷺ نے اپنی مختلف تعلیمات کے ذریعہ واضح فرمایا، آپ ﷺ نے جنگ کے دوران نعش کا مثلہ کرنے سے منع فرمادیا، غزوۂ خندق کے موقع سے جب ایک مشرک حملہ آور ہوا اور مارا گیا تو اہلِ مکہ نے لاش کی قیمت ادا کرنی چاہی، لیکن آپ ﷺ نے نفرت وانتقام کی آگ کے عین شباب کے وقت بھی اس کو گوارا نہیں فرمایا کہ انسانی جسم کی قیمت وصول کی جائے، ایک یہودی کا جنازہ گذر رہا تھا آپ ﷺ کھڑے ہو گئے، صحابہ نے عرض کیا: یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے، آپ نے غیر مسلم بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو خطوط لکھے تو ان کے احترام کا پورا پاس ولحاظ رکھا، بعض مشرکین آپ ﷺ کے یہاں مہمان ہوئے تو آپ ﷺ نے پورا اکرام فرمایا اور مہمان نوازی کا حق ادا کیا، غرض کہ انسانی تکریم اور احترام کے اعتبار سے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فرق نہیں کیا۔

اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی، ماں باپ، بال بچوں، بھائی بہنوں، بیوی اور دوسرے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور سفر کے ساتھیوں، مقروضوں اور کمزوروں، بیماروں اور مسافروں وغیرہ کے ساتھ حسنِ سلوک کے جو بھی احکام دیئے گئے، ان کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں رکھا گیا، بلکہ اسی سلوک کا حکم تمام انسانوں کے لئے

دیا گیا، رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ پر قحط کے موقع سے ایک بڑی رقم ان کی اعانت کے لئے عطا فرمائی، ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کروائی اور پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت فرمائی، واپسی پر دریافت فرمایا کہ کیا یہودی ہمسایہ کو بھی اس میں سے بھیجا گیا؟ جب جواب نفی میں ملا تو خاص طور پر ان کو بکرے کا گوشت بھیجا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا، رسول اللہ ﷺ نے اسیران بدر کو نئے جوڑے پہنا کر رخصت فرمایا، غرض کہ رشتہ، پڑوس، مجبوری وغیرہ کی بناء پر نیز عمومی طور پر حسن سلوک کا حکم جیسے مسلمانوں کے لئے ہے ویسے ہی غیر مسلم بھائی کے لئے بھی ہے۔

جان اور زندگی کا تحفظ غیر مسلموں کا اسی طرح واجب ہے جس طرح مسلمانوں کا۔ جو غیر مسلم مسلم ملک میں رہتے ہوں، یا اس ملک میں نہ رہتے ہوں، لیکن مسلمانوں کا ان سے معاہدہ ہو، ان کے بارے میں حضور ﷺ نے ایک اصول بیان فرمادیا کہ ان کا خون ہمارے خون کی طرح، اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہے: "**دمائهم كدمائنا و اموالهم كاموالنا**" اس لئے جو دیت (خون بہا) مسلمانوں کے لئے ہے، وہی غیر مسلموں کے لئے ہے، جیسے کسی مسلمان کے قتل پر قصاص واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم کے قتل پر بھی قصاص واجب ہے، ــــ اسی طرح کسبِ معاش، ملکیت مال اور حفاظت جائداد کے حق میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں، جیسے کسی مسلمان کا مال چوری کرنے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے، اسی طرح غیر مسلم کا مال چوری کرنے پر بھی۔

سب سے اہم مسئلہ مذہبی حقوق کا ہے، اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کا قائل نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لا اكراه في الدين**، اس رواداری کی بہترین مثال وہ معاہدہ ہے جو آپ نے مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان کرایا تھا، اور جس کے تحت ہر ایک کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی تھی، غیر مسلم اپنی عبادت اور اس کے طریقوں میں آزاد ہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عیسائی وفد کو خود مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں اپنے طریقہ پر عبادت کی اجازت دی تھی، اس

سے بڑھ کر رواداری کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟ مذہبی عبادت گاہوں کے احترام کا بھی اسلام نے پورا لحاظ رکھا ہے، شام اور بیت المقدس کا علاقہ جب فتح ہوا تو وہاں کتنے ہی چرچ تھے، جن کو مسلمانوں نے جوں کا توں باقی رکھا۔ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے گورنروں کو ہدایت فرمائی تھی کہ کوئی کلیسا یا آتش کدہ منہدم نہ کیا جائے، اسی طرح غیر مسلم بھائیوں کے جذبات بھی ملحوظ رکھنے کا حکم دیا تھا، اور وہ جن معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہوں، ان کو بھی بُرا بھلا کہنے کی ممانعت کی گئی، **ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ** (..........)

معاشرتی اور تمدنی قوانین میں بھی غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی، وہ جس چیز کے کھانے کو حلال سمجھتے ہوں، گو اسلام میں اس کا کھانا حرام ہو، لیکن ان کو اپنے مذہب کے مطابق کھانے پینے کی اجازت ہے، اس لئے غیر مسلموں کو شراب پینے اور آپس میں شراب وخنزیر کی تجارت کرنے کا حق حاصل ہوگا، جن خواتین کو قرآن نے محرم قرار دیا ہے، اور ان سے کسی قیمت پر نکاح کو روا نہیں رکھا ہے، اگر ان کے مذہب میں ان خواتین سے نکاح کی اجازت ہو، تو انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا حق حاصل ہوگا، یہی حال دوسرے سماجی وتہذیبی قوانین کا ہے۔

اگر مسلم ممالک میں کبھی غیر مسلم کو اپنے روایتی لباس اور پوشاک میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، تو اس کا مقصد ان کی تحقیر نہیں، بلکہ ان کی تہذیب کی حفاظت اور ان کے تشخص کو برقرار رکھنا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ ہر قوم اپنے تمدن کو قائم رکھے، اسی لئے مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کی وضع اختیار کرنے اور ان کی تہذیب میں جذب ہونے سے منع فرمایا گیا تو اگر تاریخ میں کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہوں، تو اس میں ان کی تحقیر واہانت نہیں بلکہ ان کا تحفظ اور ان کی تہذیب کے بقا کا سروسامان ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام نہ صرف عقیدہ وایمان بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اپنا تشخص چاہتا ہے، اور یہ بات کہ مسلمان اپنے وجود کو گم کردیں، اسے کسی قیمت پر گوارا نہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ دوسری قوموں کے تئیں حسنِ سلوک، رواداری، بقاء باہم کے

اصول پر ایک دوسرے کے بارے میں تحمل، عبادت اور سماجی قوانین میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور عدل کا داعی ہے، وہ دین محبت اور دین اخوت ہے اور اس نے پوری کائنات سے محبت کا درس دیا ہے، وہ انسان کو بحیثیتِ انسان قابلِ تکریم سمجھتا ہے اور تمام مخلوق کو اللہ کا کنبہ قرار دیتا ہے، رحم دلی اور عدل سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہیں اور ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز اسے ناپسند نہیں۔

(۲۹ / جون ۲۰۰۱)

غیر مسلموں سے تعلقات

موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کرگیا ہے اور افسوس ہے کہ ہم اس مسئلہ پر محض سیاسی اور مادّی نقطۂ نظر سے غور کرتے رہے ہیں، حالانکہ جب ہم اسلام کو ایک ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات سمجھتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ پر بھی اسلامی نقطۂ نظر سے سوچیں اور دیکھیں کہ اس بارے میں حقیقی اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

پوری انسانیت ــــ ایک کنبہ

اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق پوری انسانیت کا آغاز ایک ہی ہستی کے وجود سے ہوا ہے، خدا نے اسی ہستی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور اس جوڑے سے پوری انسانیت وجود پذیر ہوئی:

"یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَاءً ." (النساء:۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے، نیز ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت کو وجود بخشا۔

اس طرح اسلام کی نظر میں پوری انسانیت ایک ہی کنبہ اور خاندان ہے، یہ ایک ہی درخت کی شاخیں اور ایک ہی گلدستہ کے پھول ہیں، اس سے ہمیں انسانی اخوت کا سبق ملتا ہے، جیسے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اسی طرح ہر انسان، انسانی رشتہ سے

ہمارا بھائی اور ہمارے وسیع تر خاندان اور کنبہ کا ایک حصہ ہے، یہ اخوت و بھائی چارگی ہمیں محبت و پیار کا پیغام دیتی ہے اور اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ ہمیں ہر فرد و بشر سے محبت ہونی چاہیے۔

شرافتِ انسانی کا تصور

باہمی انسانی روابط کی دوسری بنیاد انسانی شرافت و کرامت اور احترامِ آدمیت ہے، انسان کو بحیثیتِ انسان اللہ تعالیٰ نے قابل احترام قرار دیا ہے:

"وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ اٰدَمَ ." (بنی اسرائیل:۷۰)

اس کے جسمانی سانچہ کو بہترین سانچہ قرار دیا ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ." (التین:۴)

''ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔''

یہ تکریم و احترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا، آپؐ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے، (بخاری، حدیث نمبر:۱۳۱۲، باب من قام بجنازۃ یہودی) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کردیں، تو آپؐ نے کوئی قیمت لیے بغیر نعش واپس کردی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کیے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آجائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی روا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لیے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کرکے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ'' (یوسف: ۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جس کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیا کرتے تھے؛ اس لیے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ'' (الزخرف: ۲۴) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے، ہیں ہم اس کا انکار کرتے ہیں،'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل گیا ہے: ''قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ'' (الزخرف: ۳۰)

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو ''کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا، لیکن انہوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انہوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا:

> ولو قال لذمي يا كافر! يأثم ان شق عليه. (الأشباه والنظائر: ۲/۲۵۷)
>
> اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے:

''رجل ذمی ، معناه له عهد .'' (لسان العرب:۵/۵۹)

مردِ ذمی کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لیے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں:

سمی أهل الذمة لدخولهم في عهد المسلمين و أمانهم.

(النہایۃ:۲/۱۶۸)

''اہل ذمہ اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہو جاتے ہیں۔''

اس لیے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبویؐ میں غیر مسلموں کے لیے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے:

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

الْمُقْسِطِيْنَ . (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انہوں نے تم کو تمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسرپیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انہیں بہرحال اس کا اجر مل کر رہے گا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لیے اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کرو گے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودیوں سے قرابت تھی، انصار ان پر اس لیے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (تفسیر قرطبی:۳/ ۳۳۷) اللہ تعالیٰ نے ان کے

اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے رفقاءؓ نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ؐ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لیے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالانکہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ؐ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کر رہے تھے۔ (ردّالمحتار: ۳۰۲/۳، باب المصرف)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے، "ما أنصفناك أكلنا شيبتك، ثم نأخذ منك الجزية" (نصب الرایہ: ۴۵۴/۳) چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیے جا سکتے ہیں، (دیکھئے الدرالمختار علی ہامش ردالمحتار: ۳۰۱/۳)

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان و مال اور عزت و آبرو سے ہے، چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو دی گئی ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں:

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَ أَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا. (نصب الرایۃ: ۴/ ۳۶۹)

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے:

لَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ. (بنی اسرائیل: ۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا. (المائدہ: ۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کر سکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی شخص کو قتل و غارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لیے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیں غیر مسلم ــــ جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو ــــ کے قاتل کے بارے میں فرمایا، کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا:

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَ اِنَّ رِيْحَهَا يُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا. (بخاری عن عبداللہ بن عمروؓ، حدیث نمبر: ۳۱۶۶)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پُر امن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالانکہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کر دے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے

شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ''اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ'' (المائدہ: ۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (مصنف عبدالرزاق: ۱۰/۱۰۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ''ذمی'' کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (مصنف عبدالرزّاق: ۱۰/۱۰۱) امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انہوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔

(مسندِ امام شافعی، السنن للبیہقی: ۱۲/۴۳)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قید کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے، چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپؐ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (سنن دارقطنی، کتاب الحدود) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔

(دیکھئے: نصب الرایہ: ۴/ ۶۸-۳۶۹) (جاری)

املاک کا احترام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کے جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا ''اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ

تَجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ'' (النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کر دیے اور کچھ پھل کھا لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ (ابوداؤد ،حدیث نمبر:۳۰۵۰)

متعدد صحابہؓ سے آپ کا یہ ارشاد منقول ہے:

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .

(ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۵۳)

آگاہ ہو جاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضامندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کر لے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (المغنی لابن قدامہ: ۱۲/ ۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاتفریقِ مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے پر شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَى أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ . (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت و آبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت و عصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، مطلقاً حرام ہیں، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبروریزی کی بھی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ عزت و آبرو کی حفاظت کا وہی حق مسلم ریاست میں آباد غیر مسلم باشندوں کو حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

خوشی و غم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا، کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات، خوشی و غم کے موقع پر دلداری وغیرہ امور بھی آتے ہیں، اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (صحیح بخاری، حدیث نمبر ۲۶۱۷ باب قبول الہدیۃ من المشرکین) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (الدر المنثور: ۱۸۱/۵) انہیں اپنا مہمان بنایا ہے (الخصائص الکبریٰ: ۱۲۳/۱) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز و تکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (اعلاء السنن: ۲۸۲/۸ باب ما یفعل المسلم اذا مات لہ قریب کافر) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے،
(صحیح البخاری، حدیث نمبر ۵۶۵۷ باب عیادۃ المشرک)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

☆ مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے، سوائے ذبیحہ کے۔

☆ مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا اور ذمی ہو یا حربی، حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔

☆ مسلمانوں کے لیے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔

☆ یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆ جب کسی غیر مسلم کی وفات ہوجائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لیے یہ الفاظ کہے جائیں:

اَخْلَفَ اللّٰهُ خَيْرًا مِّنْهُ وَ أَصْلَحَكَ . (ہندیۃ: ۵/۳۸۴)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

تعلیم و تعلم کا تعلق

غیر مسلموں سے تعلیم و تعلّم بھی درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''علم و حکمت مؤمن کی متاعِ گم شدہ ہے، ''اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ'' (ترمذی، عن ابی ہریرۃؓ، حدیث نمبر: ۲۶۸۷) چنانچہ جنگِ بدر کے قیدیوں میں جو لوگ پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپؐ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اسی لیے تعلیم و تعلّم کے مقدس رشتہ میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی ہے۔

البتہ سماجی تعلقات میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام نے وضع قطع، رسم و رواج وغیرہ میں اس بات کو پسند کیا ہے کہ مسلمان اپنی شناخت کو باقی رکھیں اور اپنے تہذیبی تشخص کو کھونہیں دیں، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ:

'لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا . (الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵)

جو دوسروں کی مماثلت اور مشابہت اختیار کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اسی لیے آپؐ نے سلام کے طریقہ، داڑھی اور سر کے بال کی وضع وغیرہ میں اس بات کو پسند نہیں کیا ہے کہ مسلمان اپنے امتیاز کو کھو دیں۔

معاشی تعلقات

معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپؐ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے، (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۴۲۴۸ بـــاب معاملة النبی علی اهل خیبر) مسلمانوں کے لیے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے، (کنز العمال: ۳۲۱/۲) حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انہوں نے عاص بن وائل کے لیے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے، ”**خباب کان قینا فعل للعاص بن وائل**“ (بخاری، حدیث نمبر: ۲۲۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۷۰۶۲)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطہ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لیے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو ”دلیل“ کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لیے بطورِ ’دلیل‘ اجرت دے کر ساتھ رکھا، (احکام أہل الذمۃ لابن قیم: ۲۰۷) اسی لیے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم

رکھ سکتے ہیں: يجوز أن يكون الأجير ذميا و المستأجر مسلما بلاخوف

(الموسوعة الفقهية: ۱۰۵، مادہ: اجارہ)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اَثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامینِ سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت ویلم کے تاجدار عضد الدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے مقالاتِ شبلی: ۲/ ۲۱۷-۲۱۹)

سیاسی تعلقات

انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، کیوں کہ سیاسی مدوجزر اور اتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے، چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا

حق ادا کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے، اس لیے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کر سکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لیے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپؐ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اور اس طرح ''حلف الفضول'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''لَوْ اُدْعِیٰ بِهٖ فِیْ الْاِسْلَامِ لَاَجَبْتُ''

(البدایۃ والنہایۃ: ۲/۲۹۱)

بنو امیہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسینؓ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کو اپنے ارادہ سے باز آنا پڑا، (سیرت ابن ہشام: ۱/۱۳۵) یہ واقعہ اس بات کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کر سکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جا سکتا اور ان سے تعاون لیا جا سکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی، ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ'' (یوسف: ۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انہوں نے

اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک و سہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی بر انصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی بر انصاف ہو؛ کیوں کہ آپ جس ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد، جو ہم نے ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ'' (المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ'' (الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدّ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر منکر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''منکر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اصول بتایا کہ اس کے لیے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَأىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، وَ مَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَ ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ .

(مسلم حدیث نمبر:۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لیے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے، لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ. (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔

(مجمع الزوائد: ۸/ ۱۲۰، باب ماجاء فی أذی الجاری)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے، البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا مقصود ہو۔

مذہبی تعلقات

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی تعلقات کا ہے، اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام، ان دونوں نکات کی کسی قدر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لیے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح، طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک، اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لیے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کیے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

اپنی شناخت کی حفاظت

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اسلام مسلمانوں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اپنے وجود کو دوسروں کے ساتھ گم نہ کرلیں، بلکہ اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تُشَبِّهُوا بِالْيَهُوْدِ وَ لَا بِالنَّصَارىٰ الخ

(الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں:

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں ـــــ فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے، مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس پر کفر کا حکم لگایا ہے: وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰى رَاْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ۔

(الملتقط فی الفتاوی الحنفیۃ: ۲۴۵)

اسی طرح فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت؛ یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تو حرام ہے اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید وتحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ۔'' (الملتقط: ۲۴۵) کیوں کہ آدمی، جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دوعملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لیے اسلام نہ مسلمانوں کے لیے اس بات کو پسند کرتا ہے

کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ تہذیبی تشبہ کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
(دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/۹۴)

لیکن تشبہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہو اور بعد کو اس کا استعمال عام ہو جائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبہ کی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آجائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں (امداد الفتاویٰ: ۴/۲۶۸ سوال نمبر ۳۴۵) اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔ (کفایت المفتی: ۹/۱۶۱)

(د) جو ملبوسات، وضع قطع اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، یا انتظام وانصرام سے متعلق امور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ، ان میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حساب وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا، (الفاروق مکمل: ۲/۱۳۰) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۴/۹۵)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے امور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبہ اور مماثلت سے بچنے کا جو اصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب

اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے؛ بلکہ اس کا مقصد تہذیبی ہمہ رنگی کو برقرار رکھنا ہے، اسی لیے وہ دوسری قوموں سے بھی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کی وضع قطع کو اختیار کریں۔

اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا اتاہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے بارے میں تنگ نظری ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے، اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لیے جبر وتشدد جائز نہیں:

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں، ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ . (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کردیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے وسق نامی غلام سے بار بار خواہش کی کہ وہ اسلام قبول کرلے، آپؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں مسلمانوں کی امانت کی کوئی ذمہ داری سونپوں گا؛ لیکن وسق اس سے ہمیشہ انکار کرتے رہے، حضرت عمرؓ ہمیشہ اس کے جواب میں فرماتے: ''لَا اِكْـرَاهَ فِـىْ الـدِّيْـنِ'' یہاں تک کہ وفات کے قریب آپؓ نے ان کو آزاد کردیا۔ (کتاب الاموال: ۱/۱۵۴)

مذہب پر عمل کی آزادی

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''لَـكُمْ دِيْنُكُمْ وَ لِىَ دِيْنٌ'' (الکافرون:۶) ''تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَـنَا اَعْـمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْـمَــالُـكُـمْ'' (الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رَواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجدِ نبویؐ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (احکام الذمۃ: ۱/۳۱۶) فقہاء نے لکھا ہے کہ:

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔
>
> (احکام أهل الذمۃ: ۱/۳۱۶)

> اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔
>
> (حوالہ سابق)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالانکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوْا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ . (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۴۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لیے انہوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کیے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (موسوعۃ الخراج:۱۴۳)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

جہاد ـــــ حقیقت اور غلط فہمی

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہِ تیغ کر دیتا ہے، اسی لیے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی عمل۔

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اوّل یہ کہ جو لوگ تم سے برسرِ پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۲۱۶۴)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے:

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. (محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کے ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس

مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۔ (النساء:۹۰)

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الأنفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پرامن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت بہت ہی قابل توجہ ہے:

وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلبگار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے

ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بالکل انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انہیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انہیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کے بجائے حسن سلوک اور صلح و آشتی کا حکم دیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور جہاد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/ افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں

آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، انھوں نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا:

''بوئے خوں آتی ہے، اس قوم کے افسانوں سے''

جزیہ کی حقیقت

آج کل وی، ایچ، پی کے لوگ اسلام کو بدنام کرنے کے لیے جزیہ کے مسئلہ کو بھی اٹھا رہے ہیں؛ لیکن یہ کوئی نیا اعتراض نہیں ہے، پہلے بھی مستشرقین کی جانب سے اس قسم کے سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں، اہل علم نے تفصیل سے اس کا جواب دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جزیہ سے مراد وہ خصوصی ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر وصول کرتی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہے، جسے حکومت وصول کرتی ہے، اگر غیر مسلموں پر بھی زکوٰۃ واجب قرار دی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف اور مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا؛ اس لیے ان پر ایک جداگانہ ٹیکس ''جزیہ'' کے نام سے لگایا گیا، جو ان کی جان و مال کی حفاظتی نظام کا معاوضہ ہے، یہ ان کے حالتِ کفر میں ہونے کا تاوان نہیں، اگر ایسا ہوتا تو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، معذوروں، بے روزگاروں اور ان سب سے بڑھ کر مذہبی طبقہ یعنی پادری، پنڈت وغیرہ سبھوں پر واجب قرار دیا جاتا؛ لیکن ان حضرات کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے؛ (دیکھئے: احکام الذمۃ: ۱/ ۱۴۸، ہدایہ: ۴/ ۳۱۸، باب الجزیۃ) اس لیے اس کی حیثیت محض ایک ٹیکس کی ہے، نہ کہ تاوان کی۔

پھر اس جزیہ کی مقدار بھی کس قدر معمولی ہے؟ کم آمدنی والوں کے لیے سالانہ بارہ درہم، متوسط آمدنی والوں کے لیے سالانہ ۲۴/ اور زیادہ آمدنی والوں کے لیے ۴۸ درہم۔ (بیہقی ۳۲۹/۹، حدیث نمبر ۱۸۶۸۵ باب الزیادۃ علی الدینار بالصلح) ۱۲/ درہم ۱۳/ تولہ سے کم چاندی ہوتی ہے، موجودہ نرخ کے لحاظ سے ۱۲/ درہم ۲۶۵ ۲/ روپے سے کچھ کم وبیش ہے، آپ حضرات خود غور کریں کہ اگر کوئی مملکت کسی شہری کی حفاظت اور سیکورٹی پر سال بھر میں اتنا حقیر معاوضہ وصول کرے تو کیا یہ زیادتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری حکومت اتنے

پیسے لے کر باشندگانِ ملک کی حفاظت کا انتظام کردے اور ان کے تحفظ کی ضمانت قبول کرے، تو ہم شکرگزار ہوں گے، یہ اس جزیہ کی حقیقت ہے، جس کو لے کر معاندین نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا ہے اور اس کو اسلام کے خلاف ظلم و زیادتی، تشدد اور ناروا داری کا عنوان دیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو غیر مسلموں کے بارے میں اسلام کی حقیقی تعلیمات، اس کی سیر چشمی، فراخ قلبی اور رواداری سے آگاہ کریں اور خود اپنے رویہ اور برتاؤ سے ثابت کریں کہ اسلام کوئی شدت پسند اور ناروادار مذہب نہیں ہے؛ بلکہ انسانیت پرور، آدمیت نواز، رحم دل، حد درجہ روادار اور سیر چشم، فراخ قلب مذہب ہے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے مسکن رحمت ہے۔ اِن الدین عند اللّٰہ الإسلام، اللّٰھم أرنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ، و أرنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابہ۔

فاصلے کیوں کر گھٹیں گے؟

حالیہ عالمی واقعات کے پس منظر میں عیسائیوں اور مسلمانوں کو قریب کرنے کی بعض کوششوں کا آغاز ہوا ہے، اور اس سلسلہ میں وزیر اعظم برطانیہ اور بعض دیگر عالمی قائدین کے بیانات آئے ہیں، نیز ڈائیلاگ بھی منعقد ہوئے، خدا کرے کہ یہ کوششیں اخلاص اور مفاہمت کے جذبہ پر مبنی ہوں اور اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں عالمی سطح پر پھیلائی گئی ہیں، یہ ان کے دور ہونے کا سبب بنیں۔

اسلام مذہب کے معاملہ میں جبر واکراہ کا قائل نہیں ہے، قرآن مجید نے صاف اعلان کردیا ہے کہ دین کے معاملہ میں جبر روا نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ ہدایت وگمراہی کو پوری طرح واضح کردیا ہے: لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی ( ) اگر پیغمبر اسلام ﷺ کا منشا اسلام کو تھوپنا ہوتا تو نہ مدینے میں کوئی یہودی باقی ہوتا، اور نہ فتح مکہ کے بعد مکہ میں کوئی مشرک، اسلام کی آمد سے پہلے یہ مزاج تھا کہ سلطنت کا جو مذہب ہوتا تمام لوگ اسی مذہب کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرنے کے پابند ہوتے، اسی لئے روم میں کوئی مشرک اقلیت تھی، نہ ایران میں اہلِ کتاب کا کوئی گروہ تھا، سرزمین عرب میں جب پیغمبر اسلام کے ذریعہ دین ابراہیمی کو تجدید ہوئی تو اتنی شدید مخالفت ہوئی کہ پیغمبر کے سوا کوئی اور شخص اس طوفان کے مقابلہ تھم نہیں سکتا تھا، یہودیوں کی اس وقت اپنی کوئی مملکت نہیں تھی، اسی لئے وہ بکھرے ہوئے تھے، اور نہایت ذلت ونکبت کی زندگی بسر کررہے تھے، ان میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو مدینہ اور اس کے جوار میں آباد ہوگئے تھے، کیوں کہ یہ علاقہ کسی باضابطہ حکومت کی عملداری میں شامل نہیں تھا۔

مذہب کے معاملہ اسلام کی وسیع النظری کی وجہ سے یہ فکر عام ہوئی کہ لوگوں کو کسی

خاص مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے، اسلام نے باضابطہ غیر مسلم اقلیت کے قوانین وضع کئے، ان کے حقوق و واجبات کو قانونی شکل دی، اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے سدِّ باب کی تدبیریں کیں، اس سے مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان بقاء باہم کے اصول پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کی راہ ہموار ہوئی، مدینہ تشریف لاتے ہی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان آپ نے جو عہد نامہ مرتب فرمایا وہ اسی اصول پر مبنی تھا، جس میں بہت صاف طور پر اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ تمام باشندوں کو اپنے اپنے دین پر قائم رہنے کا حق حاصل ہوگا، اور اگر کوئی بیرونی دشمن حملہ آور ہو تو وہ ایک دوسرے کی طرف سے مدافعت کریں گے، جب تک یہودیوں کی طرف سے بار بار اس عہد کی خلاف ورزی نہ ہوگی اور انہوں نے اہلِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی سازش میں شریک نہیں ہوئے، مسلمان اپنے عہد پر قائم رہے۔

اسلام میں اہلِ ذمہ سے متعلق جو قوانین ہیں، وہ سب اسی بقاء باہم کے اصول پر مبنی ہیں، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ مسلمان ان افکار و خیالات کو قبول کرلیں جس سے ان کے ایمان و عقیدہ پر حرف آئے، لیکن اسلامی تعلیم یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو حق و ہدایت کی طرف بلانے کی کوشش کریں، اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کے عقیدہ و عمل کے معاملہ کو اللہ کے حوالہ کردیں، اور دنیا میں انسانی رشتۂ اخوت کے تحت ان کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھیں، مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں ہمیشہ اسے برت کر دکھایا ہے، جب یہود پوری دنیا میں ذلیل و رسوا تھے، اور جگہ جگہ سے شہر بدر کئے جا رہے تھے، اس وقت عالم اسلام ہی میں ان کو پناہ ملتی تھی، صلیبی جنگوں میں عیسائی دنیا کی اپنے مسلمان مفتوحین کے ساتھ انسانیت سوز زیادتیوں کے باوجود مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں عیسائی رعایا کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کیا، اور ان کے سلاطین کا سلوک ہندو اور مسلم رعایا کے ساتھ برابری کا رہا، اگر پوری دنیا میں اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے کہ تمام اہلِ مذاہب کو اپنے اپنے مذہب اور طور و طریقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اپنے آپ پر نافذ کرنے کا حق ہے، تو تہذیبی تصادم کی نوبت نہ آئے، اگر مذہب یا تہذیب کے حامل

افراد اپنی چاہت کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں اور اس بات کے خواہاں ہوں کہ ان کی فکر ہر قوم اور ہر خطہ میں سکہ رائج الوقت بن جائے تو یقیناً اس سے مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں تصادم کی صورت پیدا ہوگی، اس وقت صورتحال یہی ہے، الجزائر اور ترکی میں جمہوری طریقہ پر عوام کے منتخب نمائندوں کو اس لئے حق نمائندگی سے محروم کر دیا گیا کہ وہ مغربی ثقافت کے مقابلہ اسلامی ثقافت کے علمبردار تھے، اسی اصول پر سوڈان اور یمن کو دہشت گرد قرار دیا جا رہا ہے، اور دنیا کے بعض دوسرے علاقوں میں مسلمان اور مسلم مملکت میں ظلم و زیادتی کا ہدف بن رہی ہیں۔

بقاء باہم کے اصول کا تقاضا ہے کہ تمام انسانیت کے خون کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ایک ہی قیمت لگائی جائے، رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم بھائیوں کے بارے میں فرمایا: ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے، **دمائهم كدمائنا و اموالهم كاموالنا**، لیکن آج جو لوگ انسانیت کے علمبردار ہیں، کیا وہ پوری انسانیت کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا امریکیوں اور فلسطینیوں کے خون میں فرق نہیں کیا جاتا؟ کیا مشرقی تیمور کے عیسائیوں اور بوسینیا کے مسلمانوں کے تحفظ میں دہرا رویہ اختیار نہیں کیا جاتا؟ اور کیا افغانستان میں بے قصور لوگوں کے خون سے ہولی نہیں کھیلی گئی؟ اور آگ کا طوفان نہیں بپا کیا گیا؟ کیا آج مغرب میں کالوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر نہیں رکھا گیا ہے؟ — یہ کیسی انسانیت ہے جو خون اور خون میں فرق کرتی ہو، یہ کیسی تہذیب ہے جس کے پاس چمڑے کا رنگ انسان کی قیمت مقرر کرنے کا پیمانہ ہے، یہ کیسی جمہوریت ہے جو اسرائیل کو دفاع کے نام پر بے گناہوں کا گھر زمین بوس کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے ان پر روا رکھے جانے والے مظالم کے مقابلہ آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

دنیا کی مختلف قوموں میں فاصلے دور کرنے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے دوسری ضروری تدبیر ''کلمۂ سواء'' کی تلاش ہے، ''کلمۂ سوا'' کیا ہے؟ مختلف قوموں کی مشترک تعلیمات اور متفق علیہ نظریات پر ان کو جمع کرنا، مذہب کی بہت سی

باتیں وہ ہیں جو قدر مشترک ہیں، کیوں کہ تمام مذاہب کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، مختلف قوموں میں اللہ کی طرف سے انبیاء اور رسل آتے رہے ہیں، یہ سلسلۂ سعادت پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ ﷺ تک پایۂ تکمیل کو پہونچا، آپ کی تعلیمات من جانب اللہ محفوظ ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں، ان کتابوں کے حاملین نے ان میں تحریف و تبدیلی پیدا کردی، اور اب وہ بے آمیز طریقہ پر دنیا میں موجود نہیں ہیں، لیکن چوں کہ ان سب کا اصل سرچشمہ ایک ہی ہے، اس لئے بہت سی صداقتیں پہلی کتابوں میں بھی موجود ہیں، اور ان سچائیوں پر تمام ہی مذاہب کے حاملین یقین رکھتے ہیں، خدا کا تصور، اچھے اور بُرے عمل کا تصور، جزا و سزا کا عقیدہ، انسانیت کے محبت کی تعلیم، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کے احترام کی تلقین، اور اخلاقی بھلائیوں اور برائیوں کا تصور، یہ تمام مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کون مذہب ہے جو ظلم و جور اور ناانصافی کو روا رکھتا ہو، کون سا دین ہے جس نے جھوٹ اور تکبر کو سراہا ہو؟ کون مذہبی پیشوا ہے جس نے قتل و خون، دوسروں کی عزت ریزی اور لوٹ مار سے منع نہ کیا ہو؟ اگر اقوامِ عالم ان مشترک تعلیمات کو لے کر ایک دوسرے سے بغل گیر ہوں، اور اپنی مذہبی تعلیمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانی محبت کی وہ تصویر پیش کریں جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ کرۂ فساد، کرۂ امن نہ بن جائے، اور محبت کی شبنم نفرت کے آتش فشاں کو سرد نہ کردے!

قرآن مجید نے اسی کلمہ سواء کی طرف انسانیت کو دعوت دی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ (آل عمران: ۶۴)

آپ کہہ دیجئے اے اہلِ کتاب! تم ہمارے اور اپنے درمیان مشترک بات کی طرف آجاؤ۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کس طبقہ میں اس دعوت کو قبول کرنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہے، اور کس طبقہ میں نہیں؟ چنانچہ

فرمایا گیا:

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین آمنوا الیھود والذین اشرکوا و لتجدن اقربھم مودۃ للذین آمنوا الذین قالوا انا نصاری، ذلک بانّ منھم قسیسین و رھبانا و انھم لایستکبرون (المائدۃ:۵۱)

آپ اہلِ ایمان کا سب سے زیادہ دشمن یہودیوں اور مشرکین کو پائیں گے، اور محبت میں مسلمانوں سے قریب تر ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور درویش ہیں، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ قومی نفسیات کے اعتبار سے بہ مقابلہ یہود و مشرکین کے عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ قربت ہے، چنانچہ آج پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، گو ان میں عیسائی اقوام آلہ کار بن رہی ہیں، مگر اصل میں اس کے پیچھے یہودی دماغ کارفرما ہے، تاہم اسلام نے کلمۂ سواء کی بنیاد پر جو اتحاد کی دعوت دی ہے، وہ کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ دعوت پوری انسانیت کے لئے ہے، یہود جن کی عداوت کو قرآن نے کھول کھول کر بیان کیا ہے، اس آیت میں ان کو بھی اشتراک کی دعوت دی گئی ہے۔

مذاہب اور قومیں اس طرح ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوسکتیں کہ ایک قوم دوسری قوموں کو نگل جائے، اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کو اپنا لقمۂ تر بنا لینا چاہے، بلکہ فاصلے اس وقت گھٹیں گے، اور اجنبیت کی دیواریں اس وقت چھوٹی ہوں گی جب ہم اسلام کے پیش کئے ہوئے ان دونوں اصولوں کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں، بقاء باہم اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور مشترکہ تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی قدروں پر قوموں کا باہمی اشتراک و تعاون!

(یکم رفروری ۲۰۰۲ء)

دہشت گردی کا مسئلہ — حقیت پسندانہ تجزیہ

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن وسلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سروسامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لاقانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی نعمت سے سرفراز فرمایا: اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ (قریش: ۴)

دہشت گردی سماج کے امن وامان اور سلامتی کے لئے سم قاتل ہے۔ جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان ومال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت وآبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب وتمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکر مند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے: ''مومن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے۔ مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اس طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

سلامتی حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوس کے لوگ امن میں رہیں۔ (بخاری:۶)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم وتعدی اور جور وستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو تھامنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لی اوران کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی خونچکاں لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوقِ غلامی اپنی گردن سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے، تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آئے ہوتے، تو کیا جدو جہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟

نہیں اور یقیناً نہیں !! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندو تاریخ میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے، وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے۔

قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بُری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے۔ لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء:۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں۔ امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے، حالاں کہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے واسطہ سے ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے، اسرائیل فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں، حالانکہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں۔ مصر الاخوان المسلمون اور ترکی وہاں کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں اور ممبئی اور سورت میں ظلم و جور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور ردعمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہنا بجائے خود ایک ''اخلاقی دہشت گردی'' اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اصول مقرر کر دیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: جَزَاءُ

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ: ۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار (موطاامام مالک) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جواباً نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدِ باب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بناتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور نا اُمیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نیکسلائیٹ تحریک اسی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسی احساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکھٹا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو امن کی میز سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب وعوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردعمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزورِ قوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور لا قانونیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب وعوامل پر توجہ دی۔ سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر اُبھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا مَا الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا اِلَّامَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاع دنیا کی محبت کم ہو جائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین بیٹھ جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگا اور یہ احساس اس کو اہلِ ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اکسائے گا، بلکہ وہ اپنے فقر و افلاس میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ و صدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، ان کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اخلاقی تعلیمات ان کے علاوہ ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جو اہلِ دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غرباء کو محرومی کے اساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہیں کی، بلکہ صلاحیت اور اہلیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت و سلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں: دمائهم كدمائنا واموالهم كاموالنا، قرآن مجید نے عدل و انصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو ناانصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو: وَلَا یَجْرِ مَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا: لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے، لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی، (فاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر خلافِ

واقعہ ہے تو ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں ''نھی عن المنکر'' اور ''شھادتِ حق'' ہے۔ اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (مومنون:۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، رحم اور عفو درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ ''رحمن و رحیم'' ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ ''رحمة للعالمین'' ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خودرو پودے بھی اکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ وفغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں، بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ

خِرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

(۱۷/نومبر ۲۰۰۰ء)

مسلم پرسنل لا: ایک غلط فہمی کا ازالہ

آج کی ترقیات اور انکشافات نے زندگی کی قدریں یکسر تبدیل کر دی ہیں، جو کل رینگتا تھا، وہ آج برق رفتار سواریوں کو وجود میں لا چکا ہے اور ہوا کے دوش پر اڑ رہا ہے، کل تک دریا کی معمولی موجیں جس کے لئے ایک ناقابل تسخیر مصیبت تھی، آج وہ سمندر کا جگر چیر کر لعل و جواہر کی دنیا سمیٹ رہا ہے، کل کا لکڑیاں جلانے اور چراغ میں تیل ڈالنے والا آج برقی، آلات و وسائل کی مدد سے پوری دنیا کو اپنی مضبوط گرفت میں لے چکا ہے، کل تک جو اپنی نحیف آواز میل دو میل کے فاصلے پر پہنچانا بھی ممکن تصور نہ کرتا تھا، آج کی حیرت انگیز ایجادات نے ان کی آواز کو آفاقی بنا دیا ہے اور اس کی آواز بیک وقت ایک دو شہر نہیں پوری کائنات میں پھیل سکتی ہے...... پھر آخر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس دور کا قانون آج کی اس ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ دے سکے اور ان کے لئے مشعلِ راہ بن سکے!

اس دلیل کو ہمارے مغرب زدہ اور علوم اسلامی سے نا آشنا حضرات نے ایسی تسلیم شدہ حقیقت تصور کر لیا ہے کہ گویا اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہو، حالاں کہ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو چیز بدلتی رہی ہے اور بدل رہی ہے، وہ کیا ہے؟ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ اس کے طبعی تقاضے تبدیل ہو گئے ہیں؟ یا محض وسائل اور اسباب میں تغیر رونما ہوا ہے؟ ذرائع زندگی میں فراوانی آئی ہے؟

اس نکتہ پر جب کوئی شخص غور کرے گا تو اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہے گا کہ ازل سے آج تک دنیا میں جو انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں اور جو تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں، ان کا تعلق اسباب و وسائل کی دنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کی

طبعی افتاد آج سے دس بیس ہزار سال پہلے جو تھی، وہی اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

ایک بچہ اپنے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی اپنے دل میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کی خواہش پاتا ہے، مگر وہ اپنے دست و پا کو اس سے بے بس پا کر روتا ہے، اشارہ کرتا ہے اور اپنے بڑوں کی گود کے سہارے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے، پھر جب اس کے پاؤں میں اتنی قوت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود سے جنبش کرے اور کسی قدر چل سکے تو وہ گھٹنوں کے سہارے کیڑوں کی طرح زمین پر رینگنا شروع کر دیتا ہے، وہ ذرا بڑھتا ہے تو ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا، جوان ہوتا ہے، عمر پختہ ہوتی ہے، جسم میں توانائی آتی ہے تو وہی دوڑنے لگتا ہے، چھلانگ لگاتا ہے، کودتا ہے اور پھر جلد سے جلد پہنچنے کی کوشش میں بسوں اور ٹرینوں، جہازوں اور راکٹوں کی طرف مدد کا ہاتھ پھیلاتا ہے۔ یہ بتدریج پیدا ہونے والی تبدیلیاں اگر غور کیا جائے تو محض وسائل میں رونما ہوتی رہی ہیں، اسباب سفر تبدیل ہوتے رہے ہیں، لیکن اس کے پس پردہ کارفرما انسانی فطرت، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی خواہش، ہر جگہ یکساں طور پر باقی ہے اور اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔

میں نے یہ محض ایک مثال دی ہے، ورنہ آپ جس چیز کے بارے میں بھی چاہیں، اس انداز میں تجزیہ کر لیجئے، آپ محسوس کریں گے کہ تغیر پذیر محض اسباب ہیں، انسان کی فطرت اپنی جگہ قائم ہے، وہ جس طرح کل کبھی رنج وغم اور کبھی مسرت وشادمانی محسوس کرتا تھا آج بھی کرتا ہے، پہلے آہ وواہ سے اس کا اظہار کرتا تھا اب بھی کرتا ہے، کل جس طرح اس کے دل میں اپنے دشمنوں کے خلاف انتقام کا شعلہ سلگتا تھا آج بھی سلگتا ہے اور جس طرح کل اس کا سینہ مال و دولت اور حرص و ہوس کی آماجگاہ تھا آج بھی اقتصادی ترقی کا بھوت اس کے ہوش وحواس پر سوار ہے، آج بھی اس کا نفس اس کو اخلاقی تقاضوں کے بالائے طاق رکھ دینے کی تلقین کرتا رہتا ہے، جس طرح ماضی کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، جس طرح کل جاگیرداری اور زمینداری کی تمنا اس کو بے چین کئے رہتی تھی آج بھی اس کے دل میں حکومت اور اقتدار کی آرزوئیں چٹکیاں لیتی رہتی ہیں، ...... پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی حد تک وہ فکری بنیادیں بھی آج تک قائم ہیں جو پہلے تھیں، جس طرح پہلے ''سچائی'' کو

''اچھائی'' اور ''جھوٹ'' کو ایک ''پاپ'' تصور کیا جاتا تھا آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی جھوٹ کو کوئی ''کارِ خیر'' تصور نہیں کیا جاتا، جس طرح کل ''ایفاءِ عہد'' محبوب تھا آج بھی ''عہد شکنی'' معیوب ہے اور جس طرح کل ''ایمانداری'' اور ''انصاف پروری'' محمود تھی آج بھی ''خیانت'' اور ''ظلم وجور'' مذموم ہے۔

معلوم ہوا کہ عہدِ حاضر کی دلفریب ترقیاں اور تبدیلیاں چاہے وہ کتنی ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز ہوں اور کتنی ہی نئی اور انوکھی ہوں، بہر حال انہوں نے اسباب ووسائل میں کسی قدر اضافہ کر دیا ہے اور انسان کے لئے زندگی میں راحت کے کچھ سامان فراہم کر دیئے ہیں، مگر وہ چیز جسے ''انسان'' کہتے ہیں اور جسے ''انسانی فطرت'' کہا جاسکتا ہے، وہ ایک ایسی غیر تغیر پذیر حقیقت ہے جسے زمانہ کی کہنگی اور وقت کا تیز رو سفر کچھ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔

اس مرحلے پر آکر ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام اور اس کے قانونی نظام کا اصل موضوع اسباب ووسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کا موضوع انسان، اس کی فطرت اور اس کے فطری تقاضوں کی مناسب حدود میں تکمیل ہے، پس جس طرح انسان ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اسی طرح ظاہر ہے اس سے تعلق رکھنے والا قانون بھی ابدی اور دائمی ہوگا۔

لیکن اس کے باوجود بلاشبہ ان نو دریافت وسائل زندگی، بدلتے ہوئے عرف اور زندگی کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی ڈھانچہ میں غیر معمولی تبدیلی ضرور چاہے گی کہ قانون میں اس کی کچھ رعایت کی جائے اور ان نئے تقاضوں اور وسائل سے اسلامی قوانین کو ہم آہنگ کیا جائے اور جزوی اور فروعی حدود میں اسلام ان تقاضوں کو قبول کرے۔ اس سلسلہ میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ اسلام نے بعض قانونی اور فکری امتیاز اور بنیادی اصول کو جوں کا توں باقی رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد میں ضروری تغیر وتبدل اور واقعی تقاضوں کی تکمیل کے لئے ایسی لچک باقی رکھی ہے جو اس کو فرسودگی سے بچائے رکھے! چنانچہ مشہور فقیہ اور مزاجِ شریعت کے رمز شناس حافظ ابن القیم (۱۲۹۱۔۱۳۰۰) اپنی گراں قدر کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عرف وعادت، حالات ومقاصد اور زمان ومکان کے تغیر کی بنا پر

مسائل میں اختلاف اور تغیر و تبدل کا بیان، یہ بڑی مفید اور اہم بحث ہے، جس سے ناواقفیت کی بنا پر شریعت میں بڑی غلطیاں واقع ہوئی ہیں، جس نے دشواری، تنگی اور استطاعت سے ماورا تکلیف پیدا کردی ہے، جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ شریعت جو مصالح کی غیر معمولی رعایت کرتی ہے، ان ناقابلِ برداشت کلفتوں کو گوارا نہیں کرتی، اس لئے کہ شریعت کی اساس سراپا رحمت اور سراپا مصلحت ہے، لہٰذا جب کوئی حکم عدل کے دائرہ سے نکل کر ظلم و زیادتی، رحمت کی حدوں سے گذر کر زحمت، مصلحت کی جگہ خرابی اور کارآمد ہونے کے بجائے بیکار قرار پائے تو وہ شرعی حکم نہیں ہوگا۔ (اعلام الموقعین: ج ۲)

جس قانون میں ایک ایسا تغیر پذیر اور لچکدار پہلو موجود ہو، اور وہ ہر دور کے سیاسی، اخلاقی حالات، جدید انکشافات و تغیر اور رسوم و عادات کے تحت مناسب تبدیلی کو گوارا کر لیا کرتا ہو اور جس کی اسی وسعت نے اس کو چودہ سو سال تک مسلسل زندہ اور پائندہ رکھا ہو اور تمام انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مسائل اس کی روشنی میں حل کئے جاتے رہے ہوں، اس کو جامد اور کسی زمانے کے لئے ناکارہ کہنا سوائے عناد کے اور کیا ہے؟ اس قسم کی باتیں عموماً ہمارے مسلمان قانون داں ہی ''ارشاد'' فرماتے رہتے ہیں، حالاں کہ بعض غیر مسلم ہندو اور مستشرقین ماہرین قانون نے عموماً اسلامی فقہ کی تعریف کی ہے اور اس کی افادیت کا اعتراف کیا ہے، چند سال قبل دہلی میں منعقد ہونے والے ایک سمینار میں سابق جج سپریم کورٹ مسٹر وی، آر کرشنا آئر نے کہا کہ: ''یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی سول کوڈ میں اسلامی قانون کی کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ مستقبل میں اسلامی اصول قانون، ہندوستانی سول کوڈ کا ایک بڑا عنصر بن کر رہے گا۔'' اسی سپریم کورٹ کے دوسرے جج نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''ہندوستان کے نظام قانون میں اسلام کی دین کسی سے کم نہیں ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ہندوستان کے قوانین میں اصولی حیثیت سے اسلامی قانون کے نفاذ کی کوشش کریں۔'' (صدق جدید: ۱۳ر فروری ۱۹۸۱ء)

(۱۳ر اکتوبر ۲۰۰۰ء)

یونیفارم سِول کوڈ ـــ حقیقت پسندانہ جائزہ!

یونیفارم سول کوڈ، تین انگریزی الفاظ کا مجموعہ ہے، یونیفارم کے معنیٰ یکساں، کے ہیں اور سول کوڈ، شہری قانون کو کہتے ہیں، اس طرح ''یونیفارم سول کوڈ'' ایسے شہری حقوق کا نام ہوگا جس میں نسل ونسب، علاقائی عرف وعادت، مذہب واعتقاد، مخصوص سماجی کلچر اور زبان وادب کے اختلاف کے باوجود سبھوں کے لئے یکساں قوانین بنائے جائیں۔

''سِول کوڈ'' کا ایک حصہ ایسا ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان اُمور میں آزادی سے پہلے بھی یکساں قوانین تھے۔ اب بھی ہیں، اور ان کو ہندوستان کے مخصوص ڈھانچے کے اعتبار سے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق ''مذہبی قوانین'' سے ہے، مثلاً نکاح وطلاق، وراثت، وصیت، ہبہ وغیرہ، ہندوستان کی تاریخ میں مسلم عہدِ حکومت سے پہلے بھی، مسلم عہدِ حکومت میں بھی اور دیش دشمن انگریزوں کے زمانہ میں بھی اس حصہ ٔ قانون میں ہر مذہب کے ماننے والے آزاد رہے ہیں اور اس کو ایک ''حق '' کی حیثیت سے ہندوستانی قانون میں بنیادی حقوق کی فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔

بدقسمتی سے آزادی کے بعد ہندوستان میں ''یونیفارم سِول کوڈ'' کا ایسا خاکہ پیش کیا جانے لگا جس کی روشنی میں ''پرسنل لا'' بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے اور اس طرح ''مسلم پرسنل لا'' پر خط نسخ پھیر کر مذہبی امور میں بھی ''یکساں قانون'' بنانے کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی، یونیفارم سول کوڈ کی سب سے بڑی مصلحت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ ''قومی یکجہتی'' اور ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' پیدا ہوگی، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خلیج کم ہو سکے گی، اور ''فرقہ وارانہ کشیدگی'' دور ہوگی۔

حکومت کی یہ فکر لائق صد آفریں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ''واقعی'' ''یونیفارم

سول کوڈ'' سے یہ مقصد حاصل ہو سکے گا، اور کیا آج جو فرقہ وارانہ تناؤ پایا جاتا ہے اور جمشید پور ومراد آباد اور سورت وبمبئی کے خونچکاں واقعات سامنے آتے ہیں، وہ ''اسی مذہبی امتیاز'' اور تشخص کا نتیجہ ہیں؟

تجربات اور ہمارے ملک کے حالات شاہد ہیں کہ ایسا نہیں ہے، جہاں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے اور فسادات ہوتے ہیں وہاں ہندو، مسلمان سے یا مسلمان، ہندو سے یہ نہیں پوچھتا کہ ذرا آپ اپنے قوانین بیان فرما دیجئے، اگر میرے مذہب کے مطابق ہو تو بخش دوں گا، ورنہ ابھی سرتن سے جدا کیئے دیتا ہوں، وہاں تو صرف مذہب کا نام پیش نظر ہوتا ہے۔ ایک مسلمان، ہندو تہذیب سے کتنا بھی قریب کیوں نہ ہو، اگر وہ غریب ''مسلمان'' کہلاتا ہے تو گردن زدنی ہے بلکہ ہندوستان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہاں ''مسلم پرسنل لا'' سے ہٹ کر ہونے والے نکاح، اکثر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی ''بین مذہبی'' نکاح ہوتا ہے تو پورا علاقہ ایک طرح کے تناؤ کا شکار رہتا ہے۔

اگر قوانین کی یکسانیت اس ہم آہنگی کے لئے کافی ہوتی تو بنگال میں بنگالی، غیر بنگالی اور آسام میں آسامی، غیر آسامی کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا، ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی باہمی کشاکش دیکھئے، پاکستان کے مختلف صوبوں کا آپسی تناؤ ملاحظہ کیجئے۔ آخر یہاں کے ہندو اور وہاں کے مسلمان ''قوانین کی یکسانیت'' کے باوجود باہم کیوں دست وگریباں ہیں؟

دوسرے اگر ''قومی یک جہتی'' کے نام پر آج مسلم پرسنل لا کو منسوخ کر دیا جائے تو یہ سلسلہ یہیں رُک نہ سکے گا، اس کے لئے یہ بات زیادہ ضروری ہوگی کہ عبادت گاہوں کا امتیاز بھی ختم ہو جائے، تیوہار اور مخصوص مذہبی دنوں کی تفریق بھی مٹا دی جائے۔ حرام و حلال اور کھانے پینے میں بھی نظریاتی یکسانیت پیدا کی جائے، اگر ''قومی یک جہتی'' کی قربان گاہ پر اس طرح مذہبی اقدار کو بھینٹ چڑھایا جاتا رہے اور اگر یہی حکومت کا منشا ہے تو صرف ''مسلم پرسنل لا'' کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کام کے لئے ہندوستان سے مذہب کی یکسر بیخ وبن اکھاڑ دی جائے گی ـــــ اور یہ شاید ممکن نہیں، کیوں کہ مذہب

ہندوستان کے خمیر میں داخل ہے، جسے ختم کرنے کی کوشش ناکام ہی رہے گی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ کم از کم اس کے ذریعہ تہذیب میں یکسانیت اور وحدت تو پیدا ہو سکے گی۔ مگر یہ بجائے خود ایک بچکانہ بات ہے۔ اولاً تو اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کا اصل حسن تہذیب کی اسی رنگارنگی میں مضمر ہے اور ماضی بعید سے ہندوستان کا یہی امتیاز رہا ہے کہ ''گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن'' ـــــ اور اسے مٹایا بھی کہاں جا سکتا ہے؟ آپ قانون ایک کر دیں گے لیکن کیا سب کو اپنی زبان بدلنے پر مجبور کر دیں گے؟ پھر کوئی سرد علاقہ کا رہنے والا ہے، کوئی گرم علاقہ کا، فطری طور پر وہاں کی بود و باش، لباس و پوشاک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے، کیا ان میں بھی اتحاد پیدا کیا جائے گا؟ ایک شخص جو پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں رہتا ہے، دوسرا شخص جو زرخیز اور آبیار سرزمین میں زندگی بسر کرتا ہے، تیسرا شخص جو جنگلوں کے اطراف و جوانب کا رہن سہن رکھتا ہو، کیا ان سب کی تہذیب میں کچھ فرق نہ ہوگا؟ اور پھر کیا ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے جو تہذیبی اور تمدنی تشخص ہوگا، آپ اسے مٹا دیں گے؟ اور مٹانے پر قادر بھی ہوں گے؟

آپ قانون میں لاکھ یکسانیت پیدا کریں، ایک راجستھانی اور ایک لکھنوی، ایک آسامی اور ایک کشمیری، ایک بنگالی اور ایک حیدرآبادی کی تہذیب میں جو فرق ہے، وہ بہر حال باقی رہے گا، ان کی زبانیں جداگانہ ہوں گی، ان کے لب و لہجہ میں اختلاف ہوگا، ان کے مزاج اور عادتوں میں فرق ہوگا، ان کے انداز و اطوار الگ ہوں گے، تہذیب اور سماج کی ان ساری ''دوئیوں'' کے باوجود آخر قانون ہی میں ''اکائی'' پیدا کرنے کی کیا ضرورت لاحق ہوگئی ہے؟

بعض حضرات اس تہذیب فروشی کو رواداری کا تقاضا سمجھتے ہیں، مگر نہ اس کا نام رواداری ہے اور نہ اسلام ایسی ''رواداری'' کا قائل ہے، وہ چاہتا ہے کہ جہاں رہے، اپنا تشخص برقرار رکھے، قانون اور عقیدہ تو بہت اہم چیز ہے، وہ تو وضع قطع اور لباس و پوشاک میں بھی بہت حساس واقع ہوا ہے، ایامِ جاہلیت میں عرب صرف عمامہ استعمال کرتے تھے

یا صرف ٹوپی، رسول اللہ ﷺ نے ان کے طرزِ عمل اور مشابہت سے بچنے کا حکم دیا کہ عمامہ اور ٹوپی دونوں کا استعمال کیا جائے، پھر بعد کو جب پورا جزیرۃ العرب مسلمان ہو گیا تو آپ نے صرف ''ٹوپی'' اور صرف ''عمامہ'' کے استعمال کی بھی اجازت دے دی ــــ یہاں تک کہ اسلام تو ''عملِ خیر'' کی انجام دہی میں بھی اپنے آپ کو ممتاز رکھنا چاہتا ہے، یوم عاشورہ (۱۰؍محرم) کو یہود بھی روزہ رکھتے تھے، آپ نے مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا، لیکن ان کی مشابہت سے بچنے کے لئے ایک اور روزہ کا اضافہ کر کے ''دو روزہ'' رکھنے کی تلقین کی گئی جو مذہب اپنے تشخص اور امتیازات کے معاملہ میں اتنا حساس، وہ اس رواداری کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟ ہاں! اسلام بے شک مذہبی رواداری کا قائل ہے مگر ''رواداری'' وہ شئی ہے ہی نہیں، جس کے لئے آج اس کا نام استعمال کیا جاتا ہے، ''مذہبی رواداری'' کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ اپنے عقیدہ، مذہب، تہذیب اور معاشرت پر پوری استقامت اور جماؤ کے ساتھ دوسروں کے ''مذہبی اقدار'' کا بھی احترام کیا جائے، ان کی عبادت گاہوں اور مذہبی طور طریقوں کے ساتھ تمسخر نہ کیا جائے اور ان کے جذبات کو ٹھیس پہونچانے والی دِل آزار باتیں نہ کہی جائیں اور اس حیثیت سے واقعہ ہے کہ اسلام کی رواداری کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی، وہ اپنی مملکت کی اقلیت کو اس سے زیادہ ''مذہبی آزادی'' دیتا ہے جو آج کی سیکولر حکومتوں میں حاصل ہے۔ وہ ان کو عبادتوں کی، اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی، جائز حدود میں اسلام پر فکری اور عقلی تنقید کی اور اپنے عائلی قوانین پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے، لیکن تہذیب فروشی کا قائل نہیں ہے اور اس معاملہ میں وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کے ساتھ بھی یہی رویہ رکھتا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں غیر مسلم ایرانیوں کو بھی ''عربی اسلامی لباس'' اختیار کرنے سے منع کیا تھا۔

(۶؍اکتوبر ۲۰۰۰ء)

عورت اور اسلام

آج ۸ / مارچ ہے ۔آج کے دن کو ''عالمی یوم حقوقِ نسواں'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے ۔تو آیئے ! ہم آج کے دن کی مناسبت سے جاننے کی کوشش کریں کہ اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق عطا کئے ہیں اور ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ذات یوں تو سوکھی ہوئی خزاں رسیدہ انسانیت کے تمام طبقوں پر ابر بہار بن کر برسی ،لیکن خاص طور پر دو طبقہ اس وقت سب سے زیادہ مظلوم ،ستم رسیدہ اور قابلِ رحم تھے اور نہ صرف عرب بلکہ ایشیاء ،یورپ اور افریقہ کے تمام علاقوں میں ان کی حالت نہایت قابلِ رحم تھی ،روم اور ایران کے لوگ اس زمانے میں تہذیب وتمدن ،علم وہنر اور شائستگی میں ممتاز سمجھے جاتے تھے ،مگر وہاں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی ۔ یہ دو طبقے تھے غلاموں کے اور خواتین کے ،اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ انہیں دونوں طبقوں کی دستگیری اور غم گساری کی ،ان کو اونچا اٹھایا اور سماج میں عزت واحترام کا مقام دیا۔ یہ اسلامی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ غلامی کا جو رواج ہزاروں سال سے چلا آرہا تھا ،چند سو سالوں میں اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا اور اسلام ہی کے اثر سے یورپ اور دنیا کے مختلف علاقوں میں عورتوں پر ظلم کے خلاف تحریکیں اٹھیں اور اس کو ایک اہم سماجی مسئلہ کی حیثیت حاصل ہوئی ۔

اسلام سے پہلے عورت کو جائداد کی حیثیت دی جاتی تھی ۔قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ عورت مرد ہی کی طرح انسانیت کا مستقل حصہ ہیں (الحجرات : ۱۳،نساء : ۱۲۴) چوں کہ تورات میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے باعث حضرت حوا ہی تھیں ،اس لئے یہودی اور عیسائی مذہب میں عورت کو گناہ کا دروازہ تصور کیا جاتا تھا ۔

قرآن مجید نے اس لغزش میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا دونوں کو ذمہ دار قرار دیا، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زیادہ ذمہ دار قرار دیا، اور فرمایا آدم نے (بھول کر) اپنے رب کے حکم کے خلاف کیا اور وہ پھسل گئے۔ وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوٰى (طٰہٰ:۱۲۱) یہ فکر و عقیدہ کے اعتبار سے بہت بڑا انقلاب تھا، جس کے ذریعہ ہزار ہا ہزار سال سے جاری غلط فہمی کو دور کیا گیا، اسلام سے پہلے عام طور پر عورتوں کو جائیداد کے مالک بننے اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنے وغیرہ کا حق نہیں تھا۔ اسلام نے عورتوں کو جائیداد میں مالک بننے اور اپنی مرضی سے اس میں عمل کرنے کا پورا اختیار دیا۔ (نساء:۴، ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں اور ان کی لطافت و نزاکت کی جتنی رعایت کی ہے، اس سے زیادہ بہتر طور پر کوئی اور مذہبی یا انسانی قانون عورتوں کی مشکلات کو حل نہیں کرتا۔ عورتیں عام طور پر تین مرحلوں سے گزرتی ہیں، بیٹی، بیوی اور ماں بعض دفعہ ناخوشوار حالات میں ایسی صورت بھی پیش آجاتی ہے کہ ایک عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسلام نے ان مختلف مرحلوں میں عورتوں کو کیا حقوق دیئے ہیں اور ان کے مسائل کس طرح حل کئے ہیں؟

بیٹی: رسول اللہ ﷺ نے بیٹی کی پرورش پر پورا اجر و ثواب بتایا ہے۔ فرمایا کہ جس کو دو یا ایک لڑکی ہو اور وہ ان کی اس طرح پرورش کرے کہ تعلیم دے، بہتر طور پر تربیت کرے، تو جنت میں اس کو میرا ساتھ اسی طرح حاصل ہوگا، جیسے یہ دونوں (شہادت اور بیچ کی) انگلیاں (ترمذی ۲/۱۳، ابوب البر والصلۃ) اس طرح کی خوش خبری آپ ﷺ نے لڑکوں کی پرورش پر بھی نہیں دی ہے۔ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر افسردہ اور غمگین ہو جایا کرتے تھے اور بدقسمتی سے بے دینی اور جہالت کی وجہ سے آج کل بھی بعض مرد اور اس کے خاندان کے لوگ بچیوں کی پیدائش پر آزردگی کا اظہار کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس طرح کی سوچ کی مذمت فرمائی گئی ہے۔ (الزخرف:۲)

شریعت میں لڑکیوں کی پرورش اور اس کی تمام ضروریات کی تکمیل اس وقت تک باپ کے ذمہ رکھی ہے جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو جائے۔ لڑکے بالغ ہو جائیں، تو

والدین اکثر حالات میں اس کے اخراجات کا ذمہ دار نہیں رہتے، لیکن لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد بھی ان کے اخراجات اس وقت تک باپ پر واجب ہیں جب تک کہ شادی نہ ہو جائے اور اور وہ سسرال نہ چلی جائے۔ (عالمگیری ۱/۵۶۳) پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش میں والدین کے لئے جائز نہیں کہ وہ لڑکوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کریں اور لڑکیوں کے ساتھ کم تر درجہ کا سلوک۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن کو لڑکی ہو، وہ اس کو زندہ باقی رکھے، اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ نہ کرے اور لڑکوں کو اس پر ترجیح نہ دے، تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (ابوداؤد ۲/۷۰۰)

بالغ ہونے کے بعد ماں باپ اور خاندان کے بڑوں کو اس بات کی اجازت نہیں کہ لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح کردیں اور اس پر اپنی پسند کو تھوپیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ضروری قرار دیا کہ نکاح میں لڑکیوں کی رضامندی دریافت کی جائے۔ (بخاری: ۲/۷۷۱) ایک خاتون نے آپ ﷺ کی خدمت میں شکایت کی کہ ان کے والد نے ان کی اجازت کے بغیر نکاح کردیا ہے، آپ ﷺ نے اس نکاح کو رد فرمادیا۔ (بخاری ۲/۷۷۱) اگر نابالغی کی حالت میں باپ دادا کے علاوہ کسی اور سرپرست نے نکاح کردیا ہو، یا باپ دادی ہی نے کیا ہو، لیکن وہ معاملات کی ناتجربہ کاری میں معروف ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکی کو اس نکاح کے رد کردینے کا حق حاصل ہے۔

زندگی میں اگر والدین اپنی جائداد بچوں میں تقسیم کرکے ان کے حوالہ کردینا چاہیں، تو واجب ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر حصہ دیں، اسی طرح اگر والدین کے زیرِ پرورش رہتے ہوئے کوئی شخص رقم یا جائیداد ہبہ کرے، تو لڑکی خود اس کی مالک ہوگی اور والدین وغیرہ کو لڑکی کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ والدین کی وفات کے بعد جائداد میں شریعت نے لڑکیوں کا بھی حصہ رکھا ہے اور یہ حصہ لڑکوں کے مقابلے آدھا ہے۔ چوں کہ ماں باپ، بال بچے، نابالغ بھائی بہن، مطلقہ اور بیوہ بہنیں اور خاندان کے دوسرے نادار ومحتاج رشتہ دار، مثلاً چچا، پھوپھی، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھانجیاں وغیرہ کی پرورش کی ذمہ داریاں عام طور پر مردوں ہی پر رکھی گئی ہیں، اس لئے بیٹے کا

حصہ بہ مقابلہ بیٹی کے دوگنہ رکھا گیا ہے۔

اگر بھائی کا انتقال ہوا، جو لاولد تھا اور اس نے تنہا ایک بہن کو چھوڑا، تو وہ نصف جائداد کی حقدار ہوگی، اگر صرف دو بہنیں تھیں، تو ایک ایک تہائی دونوں کا حصہ ہوگا اور اگر اس کے بھائی بھی ہیں، تو بھائی کے مقابلہ نصف حصہ بہنوں کو ملے گا، اس طرح مختلف رشتہ داروں سے بہت حصہ وراثت پاتی ہے۔

بیوی: شریعت میں بیوی کو کافی حقوق دیئے گئے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کو کسی مرد کے بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں بہترین شخص وہ ہے جس کا سلوک اپنی بیوی کے ساتھ بہتر ہو اور میں اپنی بیوی کے ساتھ تم سب کے مقابلہ بہتر سلوک رکھتا ہوں۔

(ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ: ۲۸۱/۲)

بیوی اپنی تمام جائداد اور سامان کی خود ہی مالک ہے، اس کو اپنے والدین کی طرف سے میراث یا تحفہ کے طور پر جو کچھ ملے، وہ اس کی ملکیت ہے، اسی طرح شادی کے وقت یا اس سے پہلے اور اس کے بعد شوہر یا اس کے اہلِ خاندان نے تحفتاً عورت کو جو کچھ دیا ہو، وہ سب اس کی ملک ہے، شوہر اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام چیزوں میں عورت ہر طرح کا تصرف کر سکتی ہے، شوہر یا دوسرے اہلِ خاندان اس کو روک نہیں سکتے۔

بیوی کا نفقہ یعنی کھانے، پینے، دوا علاج اور کپڑے وغیرہ کی تمام ضروریات شوہر کے ذمہ ہے، چاہے بیوی بذاتِ خود خوش حال ہو اور مرد تنگ دست ہو، پھر بھی نفقہ شوہر پر واجب ہوگا (البحر الرائق: ۱۸۸/۴) اگر بیوی شوہر کے بے جا ظلم سے بچنے کے لئے یا اپنے کسی جائز حق کے مطالبہ کے لئے اپنے میکہ میں رہے، تو میکہ میں رہنے کے باوجود اس کے اخراجات شوہر پر واجب ہوں گے۔ (عالمگیری: ۵۴۵/۱) کھانے، پینے، رہائش اور لباس و پوشاک میں شوہر پر واجب ہوگا کہ بیوی کے اہلِ خاندان کی رعایت کرے: مثلاً اگر کسی شخص کے یہاں رہنے سہنے کا معیار کمتر ہے اور اس کے سسرال میں معیار زندگی اونچا ہے تو وہ عورت کے لئے درمیانی درجہ کا معیار فراہم کرے۔ (ہدایہ: ۴۱۷/۲) بیوی اگر

صاحب جائیداد بھی ہو، تب بھی بال بچوں کے اخراجات شوہر پر ہی واجب ہوں گے۔ اگر شوہر معاشی اعتبار سے خوش حال ہو تو اس پر یہ بھی واجب ہے کہ بیوی کی امور خانہ داری میں مدد کے لئے نوکر یا نوکرانی کا انتظام کرے۔ (ہدایہ: ۲/ ۴۱۹) اگر شوہر بیوی کے اخراجات نہیں ادا کر سکتا ہو یا صلاحیت رکھنے کے باوجود ادا نہیں کرتا ہو تو عورت کو حق ہے کہ وہ قاضی شریعت سے رجوع کر کے اپنا نکاح توڑوا لے۔

اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو، تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ (ہدایہ: ۲/۴۲۱) شوہر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بیوی کے والدین یا اس کے محرم رشتہ داروں کو آنے سے منع کرے۔ (ہدایہ: ۲/ ۴۲۱) اگر وہ خود والدین یا دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملنا چاہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس کا میکہ شہر میں ہے، تو ہفتہ میں ایک دن والدین کے یہاں اور مہینہ میں ایک دن دوسرے محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے جا سکتی ہے اور شوہر کو کسی معقول عذر کے بغیر اس سے نہیں روکنا چاہئے۔ (عالمگیری: ۲/ ۱۴۸) البتہ غیر محرم مردوں سے ملنا سخت منع اور گناہ ہے۔

بیوی کو گالی گلوچ کرنا، اس کی صورت یا کسی اور بات پر طنز کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ قرآن مجید نے بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کی خاص تاکید کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر تم کو اس میں کوئی خامی نظر آئے تو یہ سمجھ کر نظر انداز کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے والدین کی طرح اس میں کوئی بڑی بہتری بھی پیدا کر سکتا ہے (النساء: ۱۹) شریعت میں والدین کی طرح شوہر سے بیوی کو بھی میراث ملتی ہے۔ اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (۱/۸) حصہ ملے گا اور وہ لاولد ہو تو چوتھائی حصہ (۱/۴)۔ (نساء: ۱۲)

بیوی کا ایک نہایت اہم حق ''مہر'' ہے، یہ اتنا اہم حق ہے کہ اگر نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہوا ہو، تب بھی مہر واجب ہو کر ہی رہے گا۔ قرآن مجید نے مہر ادا کرنے کی خصوصی تاکید کی ہے (نساء: ۴) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا، تو ایسا شخص زانی ہے (مجمع الزوائد: ۴/ ۲۸۴)

بیوی کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی جائز شرعی ضرورت کی بنا پر مرد دوسرا نکاح کرے، تو دونوں بیویوں کے درمیان مکمل عدل و انصاف سے کام لیا کرے، لباس و پوشاک، کھانے پینے کے سامان اور رات گذارنے کے اعتبار سے پوری طرح برابری برتی جائے۔ بیویوں کے درمیان انصاف نہ کرنا حرام اور سخت گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کی بڑی مذمت فرمائی ہے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو تو اس کے لئے دوسری شادی کرنا جائز نہیں۔ (نساء:۳)

بیوہ و مطلقہ: بیوہ اور مطلقہ عورتوں کو شریعت نے نہ صرف نکاح کی اجازت دی ہے، بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے، خود قرآن مجید نے اس کی طرف متوجہ کیا ہے (نور:۴) اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے کہ اگر وہ خود نکاح کرنا چاہیں، تو اس میں رکاوٹ بنا جائے۔ (بقرہ:۲۳۲) خود رسول اللہ ﷺ نے کل گیارہ نکاح فرمائے، جن میں سے دس نکاح بیوہ اور مطلقہ خواتین سے کئے۔

ایسی خواتین کو شریعت نے بے سہارا نہیں چھوڑا ہے، بلکہ والدین اور دوسرے محرم رشتہ داروں پر ان کی کفالت واجب قرار دی ہے۔ (ہدایہ:۲/۴۲۶) اور یہ کوئی احسان اور اخلاقی حق نہیں بلکہ ایسی عورتوں کا قانونی حق اور محرم رشتہ داروں پر شرعی فریضہ ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو اور شوہر کا انتقال ہو جائے، تو شوہر کے متروکہ میں سے اولاً بیوی کا مہر ادا کرنا واجب ہے اور شوہر کے انتقال کے بعد جنازہ کے سامنے بیوی سے مہر معاف کروانا نہ جائز ہے اور نہ اس کا اعتبار ہے۔ ورثہ کو چاہئے کہ اولاً بیوہ کا مہر ادا کرے، پھر جو بچ رہے، اس کو حکم شرعی کے مطابق تمام ورثہ میں تقسیم کرے۔

مطلقہ عورت کو شریعت نے یہ خصوصی حق دیا ہے کہ لڑکیاں جب تک بالغ نہ ہو جائیں اور لڑکے سات، آٹھ سال کی عمر کو نہ پہنچ جائیں اور اپنی ضروریات (یعنی کھانے، پینے، استنجا وغیرہ) خود پوری کرنے کے لائق نہ ہو جائیں، ماں ان کی پرورش کرے گی اور ماں

کا نکاح ہو جائے تو نانی کو حق پرورش حاصل ہوگا اور جب تک بچے زیرِ پرورش رہیں گے، ان بچوں کا نفقہ تو باپ کے ذمہ رہے گا ہی، پرورش کرنے والی خاتون کی اجرت بھی اس کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس طرح جو مطلقہ عورتیں صاحبِ اولاد ہوں، طلاق کے بعد عرصہ تک اس ذریعہ سے ان کی ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

ماں: قرآن وحدیث میں سب سے زیادہ جن لوگوں کے حقوق کی تاکید زیادہ وارد ہوئی ہے، وہ والدین ہیں اور والدین میں بھی ماں کا درجہ زیادہ رکھا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ (مشکوٰۃ: ۴۲۱/۲) ایک شخص نے دریافت کیا: ہمارے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ماں، وہ تین بار یہ سوال دہراتے رہے، آپ ﷺ نے تین دفعہ ماں اور چوتھی دفعہ باپ کا ذکر فرمایا۔ (ابوداؤد: ۷۰۰/۲، ۷۹۹) قرآن مجید میں بھی ماں کے حقوق واحسانات خاص طور پر ذکر فرمایا۔ (لقمان: ۱۴، احقاف: ۲) اگر ماں حاجت مند ہو تو اس کی کفالت اولاد پر واجب ہے (ہدایہ: ۲۶۶/۱) یہاں تک کہ اگر ماں مسلمان نہ ہو تب بھی اس کا نفقہ ادا کرنا واجب ہے اور اگر وہ خود صاحب جائداد اور مالی اعتبار سے خود مکتفی ہو، تب بھی اولاد کو چاہئے کہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا کرے۔ یہ بھی اولاد کا فریضہ ہے کہ نہ ماں کی طرف سے بیوی پر ظلم ہونے دے اور نہ بیوی کی طرف سے ماں پر۔ ماں کے اخراجات کی کفالت کے علاوہ ان کا اکرام، ان کی خدمت اور جائز باتوں میں ان کی اطاعت واجب ہے۔ اگر ماں کسی ناجائز بات کا حکم دے، تو اس کا ماننا جائز نہیں بلکہ خوش اسلوبی سے ماں کو سمجھا دینا چاہئے، مثلاً جہیز لینے کا مطالبہ کرے، بلا وجہ بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرے تو ایسی باتوں کا ماننا جائز نہیں۔

اگر زندگی میں اولاد کا انتقال ہو جائے تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد یا حادثاتی موت کی صورت میں سرکار سے ملنے والی امداد میں ماں کا بھی حصہ ہوگا۔ اگر مرنے والے کے بال بچے ہیں تو چھٹا حصہ اور اگر بال بچے نہیں ہیں لیکن بھائی ہیں، تو بھی چھٹا حصہ ملے گا اور مرنے والے کے بچے بھی نہ ہوں اور بھائی بھی نہ ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہوگا۔

ان وضاحتوں سے انداز کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے سماجی زندگی میں عورتوں کے حقوق کی کس درجہ رعایت کی ہے کہ ایک طرف ان کو تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے اور دوسری طرف خود ان کی مالی ذمہ داریاں باپ، شوہر، بیٹے اور بھائی کے ذمہ رکھی گئی ہیں اور ان رعایتوں کے ساتھ ساتھ ان کو قریب قریب ان تمام رشتہ داروں کا وارث بھی مانا گیا ہے جن سے مردوں کو میراث ملتی ہے اور مہر کی ایک خطیر رقم بھی شوہر سے دلائی گئی ہے، مغربی معاشرہ کی طرح عورتوں کو کمانے اور ملازمت کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کی لطافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو گھر کی ملکہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ افسوس کہ بعض حقیقت نا آشنا لوگ عورتوں کے لئے اس کو قید سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ قید نہیں، بلکہ ان کا تحفظ ہے اور مردوں کو ''قوام'' (النساء:۳۴) قرار دیئے جانے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی ضروریات کا ذمہ دار اور اس کا محافظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے سماجی قوانین میں عدل بھی ہے، انصاف بھی ہے، اعتدال بھی ہے اور توازن بھی اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی اور مرد و عورت کی صلاحیت کی پوری پوری رعایت بھی۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس سے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، وہاں عدل و انصاف کے تقاضے مجروح ہوئے، خاندان بکھر گئے اور عورتوں کو آزادی کے نام پر سر بازار رسوا کرنے کا اور سامان لذت و ہوس بنانے کی ایک مکارانہ تدبیر کی گئی ہے۔

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ''

(۵ مارچ ۱۹۹۹ء)

کم عمری کی شادی

آج کل پریس کو مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ کسی نئے مسئلہ کی تلاش رہتی ہے، جس کو بغیر کسی مناسب تحقیق اور جانکاری کے خوب پھیلایا جاتا ہے، اور زہر افشانی کی جاتی ہے ان ہی مسائل میں ایک شادی کی عمر کا مسئلہ ہے، ہندوستان میں طویل عرصہ سے یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا ہے، برطانوی عہد میں ۱۹۲۹ء میں شاردا ایکٹ بنا، جس کے خلاف پورے ملک میں مسلمانوں نے آواز اٹھائی، اور جمعیۃ علماء دیوبند کے زیرِ اہتمام ''تحفظ ناموس شریعت'' کے نام سے ملک گیر تحریک چلائی گئی۔

آزادی کے بعد مختلف ریاستوں نے اس طرح کے قانون بنائے ہیں، جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نکاح کی کم سے کم عمر ۱۸ر سال مقرر کی گئی ہے، اس وقت اسی نوعیت کا ایک مقدمہ سپریم کورٹ میں چل رہا ہے، جس میں ۱۷ر سال کی عمر میں ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے، یہ مسئلہ چوں کہ مسلم پرسنل لاء سے بھی متعلق ہے، اس لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس میں فریق بننے کی درخواست کی ہے۔

جو لوگ شادی کے لئے ایک مخصوص عمر متعین کرنا چاہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ کم عمری کی شادی لڑکیوں کی صحت کے لئے نقصان دہ ہے، کہ جسمانی نشو ونما کی تکمیل اور تولید کی مناسب صلاحیت پیدا ہونے سے پہلے ہی ان کو ماں بننا پڑتا ہے، جس سے ان کی صحت پر منفی اثر پڑتا ہے، اس سلسلہ میں کئی باتیں قابلِ غور ہیں۔

اول یہ کہ جسمانی نشو ونما تمام لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں طور پر نہیں ہوتا، موسمی حالات، غذا، ماحول اور موروثی اثرات کے تحت بلوغ کی عمر مختلف ہوتی ہے، اور جسمانی قویٰ اور تولید کی صلاحیت میں بھی فرق ہوتا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ر سال سے کم عمر

کی ہر لڑکی کے لئے ماں بننا نقصان دہ ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸ر سال کے بعد لڑکیوں میں لامحالہ ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ماں بننا ان کی صحت کے لئے مضرت رساں نہ ہو، اس لئے ۱۸ر سال ہی کی تعیین قابلِ فہم نہیں، قانونِ فطرت کے تحت عورت کی اس صلاحیت کا اصل معیار وہی ہے کہ جب وہ بالغ ہو جاتی ہے تو اس میں بنیادی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ اس وقت ٹی وی کے فروغ، فحش رسائل کی کثرت، انٹرنیٹ اور بیہودہ فلموں کے ویڈیو اور ان فلموں تک کم عمر لڑکوں کی رسائی کی وجہ سے صورتِ حال یہ ہے کہ نابالغ بچے تک جنسی بے راہ روی میں مبتلا ہو رہے ہیں، شادی سے پہلے ناجائز اسقاطِ حمل کی کثرت ہو گئی ہے، سوال یہ ہے کہ کم عمری کا نکاح زیادہ نقصان دہ ہے یا کم عمری کے جنسی تجربات؟ یقیناً بے قید جنس پرستی زیادہ مضر ہے، تو اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ماں باپ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بلوغ کے بعد جلد سے جلد ان کا نکاح کر دینا مناسب سمجھتے ہوں تو کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ انہیں اس عمر سے پہلے ہی نکاح کی اجازت دی جائے؟ تا کہ وہ اپنے بچوں کو فساد اور بگاڑ کے گڑھے میں جانے سے بچا سکیں، اصل مسئلہ Child Marraige کا نہیں، بلکہ Child sex کا ہے، حکومت کو اور سماجی تنظیموں کو چاہئے کہ یہ جو بے راہ روی کا طوفان ملک میں آرہا ہے، اور ہماری تعلیم گاہوں کو اپنا ہدف بنا رہا ہے، پہلے اس کے سدِ باب کی کوشش کریں۔

تیسری بات یہ ہے کہ کم سنی کے نکاح کے واقعات اب خود ہی کم ہوتے جا رہے ہیں، چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو لڑکے اور لڑکیاں میٹرک کرتے ہیں، اب لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں میں بھی اعلیٰ تعلیم کا رجحان روز افزوں ہے، اور تعلیم کے درمیان عام طور پر شادی نہیں کی جاتی، لڑکوں کے لئے تو تعلیم کے بعد حصولِ روزگار کا بھی مسئلہ ہے، اس لئے اس تلاشِ روزگار میں کئی سال نکل جاتے ہیں، اور اس کے بعد ہی لڑکے شادی کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس طرح قانون میں جو عمر متعین کی گئی ہے، عام طور پر اس سے

کہیں زیادہ عمر میں لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں، جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی خود ہی کم سنی میں نکاح کا رجحان کم ہوتا جائے گا، اور جب تک تعلیم عام نہ ہوگی صرف قانون کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ ایسی شادی کے واقعات شہر میں بہت کم پیش آتے ہیں، زیادہ تر دور دراز دیہاتوں میں اس طرح کا رواج پایا جاتا ہے، اور اس کی نوبت بہت کم آتی ہے کہ وہ معاملات عدالت کے سامنے آئیں اس لئے وہ قانون کے دائرہ سے باہر ہی رہتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے فریق بننے کی وجہ سے اسے مسلم مسئلہ کی نظر سے دیکھا جارہا ہے، حالاں کہ کم سنی کی شادی کے واقعات مسلمانوں میں بہت کم ہیں، خود ہندوؤں میں ان سے کہیں زیادہ ہے، راجستھان میں اب بھی اکھا تیج کے موقع پر ہزاروں شیر خوار لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے، راجستھان مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور ہریانہ وغیرہ کے بعض علاقوں میں ہندو سماج میں بہت ہی کم سنی میں نکاح کا رواج پایا جاتا ہے اور اس کا تناسب مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے، اصل مسئلہ ان رواجات کو روکنا ہے، بالخصوص اس پس منظر میں کہ ہندو معاشرہ میں نکاح کے معاملہ میں لڑکی کی رضامندی اور ناراضگی کو بہت کم اہمیت دی جاتی ہے، اور ان پر رشتے تھوپ دیئے جاتے ہیں، خاص کر کم عمری میں کئے گئے نکاح میں، ظاہر ہے کہ اصل عاقدین کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، اسلام میں اکثر حالات میں نابالغی کے نکاح کی صورت میں بالغ ہونے کے بعد لڑکے کو خیارِ بلوغ حاصل ہوتا ہے، اور وہ اس نکاح کو رد کرسکتا ہے۔

ہندو معاشرہ میں نکاح کے سلسلہ میں اور بھی قابلِ اصلاح رسوم ہیں، آج بھی ستی کے واقعات سننے کو ملتے ہیں، آج بھی ہزاروں خواتین بھگوان کی مورتیوں سے بیاہ دی جاتی ہیں، اور بھگوان کی آڑ میں سنت اور مہنت ان کو اپنی ہوس کا سامان بنائے رہتے ہیں، بلکہ بعض قبائل اور علاقوں میں چند شوہری کے واقعات بھی ملتے ہیں، اصل میں ایسی سماجی برائیوں کی اصلاح کی طرف ذرائع ابلاغ کو متوجہ ہونا چاہئے کہ یہ زیادہ قابلِ اصلاح ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اسلام میں کم سنی اور نابالغی کے نکاح کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، مسلم معاشرہ میں ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کے بالغ ہونے کے بعد ہی ان کا نکاح کیا جاتا ہے، خود قرآن مجید نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ یتیموں کو آزماؤ، جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں، اور تم ان سے ہوش مندی محسوس کرو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو، **وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ، فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ** (النساء:٦) ــــ نکاح کو پہنچنے سے مراد بالغ ہونا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں، **هو بلوغ حال النكاح من الاحتلام** (احکام القرآن:۲/۶۳) اور مشہور مفسر علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں: **أى صاروا محلاله بالاحتلام**، (جلالین: ۷۰) یعنی نکاح کو پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ وہ احتلام کی وجہ سے نکاح کا اہل ہو جائے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ بہتر طریقہ یہی ہے کہ بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے نکاح کئے جائیں، پھر اسلام میں رشتہ کے انتخاب کی جو آزادی عاقدین کو دی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے، کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد ہی وہ قانوناً اس اختیار کو استعمال کرنے کے اہل ہوں گے اور اس عمر کو پہنچنے کے بعد ہی انسان کے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز بھی پیدا ہوتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے بالغ ہونے سے پہلے بھی نکاح کی گنجائش رکھی ہے، اور مختلف صحابہ نے کم عمری میں بچوں کے نکاح کئے ہیں، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عروہ بن زبیرؒ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے نابالغی کی عمر میں بچوں اور بچیوں کا نکاح کرنا یا نابالغی کے نکاح کے جائز ہونے کی صورت منقول ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا تو وہ نابالغ تھیں، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی چچا زاد بہن حضرت حمزہؓ کی صاحبزادی کا نکاح

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اس وقت کیا جب وہ نابالغہ تھیں، چنانچہ ابن شبرمہؒ اور ابن اصمؒ کے علاوہ تمام محدثین، اور فقہاء نکاحِ نابالغاں کے جواز کے قائل رہے ہیں، اس لئے یہ فقہاءِ اسلام کے درمیان ایک اجماعی مسئلہ ہے، مشہور حنفی فقیہ علامہ سرخسی نے اس سلسلہ میں تفصیل سے صحابہ کے آثار اور فقہاء کے اقوال ذکر کئے ہیں،

(تفصیل کے لئے دیکھئے: مبسوط: ۱۴/۱۴-۱۲)۔

یہ اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ بعض دفعہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، ان میں دو مصلحتیں تو بہت ہی بنیادی ہیں، ایک یہ کہ بعض اوقات اخلاقی بگاڑ کا اندیشہ ہوتا ہے، نکاح کی وجہ سے ایک جائز راہ کھل جاتی ہے، اور یہ بات اسے ناجائز رُخ پر جانے سے بچاتی ہے، اگر ایسے حالات سامنے ہوں اور ۱۸ر سال تک نکاح کو روکے رکھا جائے تو اس سے بہت سے اخلاقی مفاسد پیدا ہو سکتے ہیں، اور یہ اخلاقی بگاڑ بیک وقت صحتِ جسمانی کے لئے بھی مضر ہے، اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے دوسرے لوگ بھی اس سے متأثر ہوتے ہیں، کیوں کہ کوئی شخص جب اخلاقی مفاسد کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے لئے سماج ہی میں اپنی غذا تلاش کرتا ہے، اسلام میں حفاظت اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اور والدین بھی اس سلسلہ میں جوابدہ ہیں، چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو بچہ ہو، تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے، اور اس کی تربیت کرے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اس کا نکاح کردے، اگر بالغ ہونے کے باوجود اس کا نکاح نہیں کیا، اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس کے باپ پر بھی اس کا گناہ ہوگا فإنما إثمه على أبيه (مشکوٰۃ ۲۷۱، کتاب النکاح)

دوسری اہم مصلحت یہ ہے کہ بعض دفعہ باپ لبِ گور ہوتا ہے، ظاہری حالات کے تحت اندیشہ ہے کہ اس کے بچوں کو یتیمی کا داغ لگنے والا ہے، اور اس کی موت کے بعد خاندان میں ایسے ذمہ دار اور دیانت دار لوگ نہیں ہیں، جن سے اُمید رکھی جا سکے، کہ وہ صحیح طور پر بچوں کی تربیت کر سکیں گے، اور مناسب رشتہ تلاش کر کے اس کے بے سہارا بچوں کی شادی کریں گے، ابھی بچے نابالغ ہیں، لیکن ایک موزوں اور مناسب رشتہ ہاتھ آرہا ہے، تو

ایسی صورت میں یقیناً مصلحت یہی ہے کہ اس وقت اس کا نکاح کر دیا جائے کہ اس میں اس کے لب گور سرپرست کے لئے سکون قلب بھی ہے، اور اس کے بچوں کے مستقبل کے محفوظ ہونے کی اُمید بھی۔

یقیناً یہ مصلحتیں ایسی نہیں ہیں، جنہیں نظر انداز کر دیا جائے، اس لئے قانون ایسا بنانا چاہئے جس میں مفادات کو حاصل بھی کیا جائے اور نقصانات سے حفاظت بھی ہو، یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نابالغی کے نکاح سے بچا جائے، اگر باپ اور دادا کے علاوہ دوسرے اولیاء نکاح کریں یا باپ یا دادا ہی نکاح کریں، لیکن وہ اپنے اختیارات کا صحیح استعمال کرنے کے اہل نہ ہوں، تو بالغ ہونے کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کو اس نکاح کے باقی رکھنے یا ختم کر دینے کا اختیار دیا جائے، یہ حدود و قیود جن کی اسلام میں پہلے سے رعایت ہے، اگر ملحوظ ہو تو اس میں کم سنی کے نکاح کی مضرتوں سے بچا بھی جا سکتا ہے، اور اس کی مصلحتیں حاصل بھی کی جا سکتی ہیں، یہی اعتدال اسلام کا اصل امتیاز اور اس کی شناخت ہے۔

(۲۰ر ستمبر ۲۰۰۲ء)

تعدد ازدواج کا مسئلہ

ابھی چند دِنوں پہلے اخبارات میں یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ ایک خاتون نے سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لا کے تحت تعدد ازدواج کی اجازت کے خلاف دعویٰ دائر کیا ہے، تعدد ازدواج کا مسئلہ ان سماجی مسائل میں سے ہے جو آزادیِ نسواں کی تحریک کے بعد سے پوری دنیا میں زیرِ بحث رہا ہے، اور اسلام کے معاشرتی قوانین کے خلاف اہلِ مغرب کی طرف سے جو فردِ جرم عائد کی جاتی رہی ہے ان میں یہ مسئلہ سرفہرست ہے، انسان کی ایک فطری کمزوری یہ ہے وہ جس بات کو بار بار اور مختلف زبانوں سے سنتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غلط بات ہو اس کو درست سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ تعدد ازدواج کے مسئلہ پر مغربی دنیا نے اتنا لکھا اور کہا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی اس سلسلہ میں تنگ و تذبذب میں مبتلا ہیں، اور جن لوگوں نے مغربی ماحول میں یا مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی ہے وہ بے چارے تو اس مسئلہ پر اتنے شرمسار ہو جاتے ہیں کہ شاید عرقِ ندامت پیشانی سے گذر کر پاؤں کو جاتا ہو، اس لئے اس مسئلہ پر پوری حقیقت پسندی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے!

تعددِ ازدواج کا مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابلِ غور ہے، مذہبی، سماجی اور اخلاقی۔ مذہبی اعتبار سے یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا گیا ہے، ڈاکٹر مالک رام نے رگ وید (۱۰۸۱۰-۱۰۵) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرد کے لئے بیک وقت ایک سے زیادہ نکاح کرنا درست ہے اور بیویوں کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، یہودی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی گنجائش ہے، چنانچہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں، ایک حضرت صفورہ، جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں (استثناء ۲۴:۱۰۲) آپ کا دوسرا نکاح ایک کوسی خاتون سے ہوا تھا (استثناء ۲۴:۴) خود بائبل میں حضرت

داؤد علیہ السلام کی چھ بیویوں (اخنوعم، اجمیل، محکہ، حجیت، ابیطال، عجلاہ) کا ذکر آیا ہے (گنتی ۸:۲۷) عیسائی مذہب چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے تورات ہی کی شریعت پر ہے اس لئے سمجھنا چاہئے کہ اصلاً عیسائی مذہب میں بھی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، چنانچہ شیخ محمود عقاد نے لکھا ہے کہ سترہویں صدی تک خود اہلِ کلیسا نے تعدد ازدواج کی حمایت کی ہے، فرماتے ہیں:

> مختلف انسانی نظام ازدواج کی تاریخ کا مستند عالم وسٹر مارک (Vister marc) نے بیان کیا ہے کہ کلیسا اور حکومت دونوں ہی سترہویں صدی کے نصف تک تعدد ازدواج کو مباح قرار دیتے تھے اور ان کے یہاں بکثرت اس کا رواج تھا۔ (الفلسفۃ القرآنیہ:۵۴)

غرض دنیا کے مشہور مذاہب میں شاید ہی کوئی مذہب ہو جس نے تعدد ازدواج کو جائز نہ رکھا ہو، اسلام نے بھی تعدد ازدواج کی اجازت دی ہے، لیکن اس کے لئے بنیادی طور پر دو باتوں کی تحدید رکھی ہے، اول یہ کہ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار تک ہی تعدد ازدواج کی اجازت ہے، دوسرے یہ اجازت عدل کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان حقوق کی ادائیگی اور سلوک و برتاؤ میں برابری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت ہے، پس اسلام نے ایک طرف سماجی ضرورت کی رعایت بھی کی ہے اور دوسری طرف ان حدود و قیود کے ذریعہ اس اجازت کو متوازن بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔

دوسرا پہلو تعدد ازدواج میں سماجی ضرورت کا ہے، عام طور پر لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح پیدائش میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا، لیکن شرح اموات میں مردوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ زیادہ تر حادثات میں مردوں کی جانیں کام آتی ہیں، مثلاً پہلی جنگِ عظیم جو ۱۹۱۴ سے ۱۹۱۸ تک جاری رہی، میں اسّی لاکھ صرف فوجی مارے گئے، شہریوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوجی مرد تھے، دوسری جنگ ۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵ جاری رہی، جس میں کل ساڑھے چھ کروڑ آدمی یا تو ہلاک ہو گئے یا معذور، ان مہلوکین اور معذورین

میں غالب ترین اکثریت مردوں کی تھی، اس جنگِ عظیم میں برباد ہونے والا قائد ملک جرمنی تھا، ۱۹۲۰ سے ۱۹۴۰ تک جرمنی میں یہ کیفیت تھی کہ ہر مرد کے مقابلہ شادی کی عمر کو پہونچی ہوئی تین عورتیں ہوتی تھیں، فرانس میں ۱۹۰۰ء کی مردم شماری کے اعتبار سے عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ، تیئس ہزار، سات سونو سے زیادہ تھی، اور آسٹریا میں ۱۸۹۰ میں چھ لاکھ، چوالیس ہزار، سات سو، چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں، عراق ایران جنگ (۱۹۸۸-۱۹۷۹) میں عراق کی ایک لاکھ اور ایران کی بیاسی ہزار عورتیں بیوہ ہوگئیں۔

جنگوں کے علاوہ جو دوسرے ٹریفک یا صنعتی حادثات پیش آتے ہیں اور جو لوگ غنڈہ گردی کا نشانہ بنتے ہیں وہ بھی عام طور پر مرد ہی ہوتے ہیں، پھر اگر جیلوں میں طویل المدت قیدیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں نوے سے زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی ہے، کیوں کہ طویل قید بھیانک جرائم پر ہوتی ہے، اور اپنی نفسیاتی کمزوری کی بنا پر مجرم ذہن کی عورتیں بھی بھیانک قسم کے جرائم کا حوصلہ نہیں پاتیں، ان اسباب کی بناء پر عام طور پر ایک مرد کے مقابلہ ایک سے زیادہ عورتوں کا تناسب پایا جاتا ہے، امریکہ جیسے ملک میں جس میں حادثات سے حفاظت کا زیادہ ترقی یافتہ نظام قائم ہے، اور دفاعی ٹیکنالوجی میں ترقی اور بالادستی کی وجہ سے حریف ملکوں کے مقابلہ اس کی فوجیوں کی ہلاکت کا تناسب بہت کم ہوتا ہے، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۷ء میں وہاں عورتوں کی آبادی بمقابلہ مردوں کے تقریباً اسی لاکھ زیادہ تھی۔

ان حالات میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ دی جائے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد تجرد اور محرومی کی زندگی گذارے، اس لئے تعدد ازدواج مردوں کی ہوس اور نفسانی طمع کی تکمیل نہیں، بلکہ ایک سماجی ضرورت ہے۔

تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں سب سے اہم پہلو اخلاقی ہے، عفت وعصمت انسانیت کا بنیادی جوہر ہے، گائے اور بیل، گھوڑے، گدھے اور ان کی مادہ کے درمیان کیا کبھی نکاح ہوا ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے، نر و مادہ کی تقسیم اور جنسی خواہش انسان

میں بھی ہے اور دوسرے حیوانات میں بھی۔ لیکن یہ انسانی سماج کا امتیاز ہے کہ نکاح کے ذریعہ ایک مرد اور عورت رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں، اور ان کی وفاداریاں ایک دوسرے کے لئے محدود و مخصوص ہو جاتی ہیں، دوسری مخلوقات اس وفاداری سے نا آشنا ہے، اسی وفاداری کا نام ''عفت و عصمت'' ہے، عفت و عصمت انسان کی فطرت میں ہے اور ہر سلیم الفطرت شخص اس کا ادراک کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے بارے میں برائی کی نسبت کو برداشت نہیں کر سکتا، تعدد ازدواج اس جوہر عفت کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، دنیا کی تاریخ میں جب کبھی بھی قانونی تعدد ازدواج پر روک لگائی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازدواج نے ضرور راہ پائی ہے، قدم تہذیبوں میں یونانی اور رومی تہذیب تعدد ازدواج کی مخالف تھی، ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (۱۸۳۸ء۔ ۱۹۰۳ء) نے یونانی تہذیب کے بارے میں لکھا ہے کہ مرد کے لئے ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت نہ تھی، لیکن غیر قانونی داشتاؤں پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔

(تاریخ اخلاق یورپ، ص: ۲۴۰، ''ترجمہ دریابادی'')

چنانچہ منصف مزاج غیر مسلم دانشوروں نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، علم تمدن کے معروف عالم ڈاکٹر گستاولی مان لکھتے ہیں:

> مغرب میں بھی .... ایک ہی شادی کی رسم کا وجود صرف کتابوں ہی میں ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ کوئی شخص انکار نہ کرے گا کہ یہ رسم ہماری واقعی معاشرت میں نہیں پائی جاتی ہے، میں نہیں جانتا کہ مشرقیوں کا جائز تعدد کسی امر میں مغربیوں کی ناجائز تعدد ازدواج سے کمتر سمجھا جاتا ہے؟ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ اول کو ہر طرح دوسرے پر ترجیح ہے، (تمدن عرب: ۳۶۶)

جناب مالک رام، ملک کے حقیقت پسند اصحابِ دانش میں تھے، ان کا یہ اقتباس پڑھنے کے لائق ہے۔

تعدد ازدواج کی تائید میں متعدد دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں، مثلاً

یہ کہ عام حالت میں دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے، اگر ایک مرد، ایک عورت کے اصول پر عمل کیا جائے تو ان زائد عورتوں کا کیا بنے گا؟ کیا ہم ان پر نکاح کا راستہ بند کر کے ان کی اور ان کے ساتھ شادی شدہ مردوں کی بھی گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے ہیں...... اگر آپ ان عورتوں کو نکاح کرنے کا موقع نہیں دیتے تو گویا انہیں قعر مذلت میں ڈھکیل رہے ہیں اور انہیں مجبور کر رہے ہیں کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کریں، کیوں کہ یہ جذبہ فطری ہے، اگر عورت سماج کی اجازت سے اس کی تسکین نہیں کر سکے گی تو سماج کو دھتا بتائے گی اور گھونگھٹ کی اوٹ میں شکار کھیلے گی اس صورت میں آپ کو کسی اور حرام اولاد کا وجود قانوناً تسلیم کرنا پڑے گا، حقِ انتخاب آپ کو حاصل ہے، ایک طرف آپ اس عورت کو قابلِ عزت بیوی اور گھر کی مالکہ اور محترم ماں بنانے پر قادر ہیں، دوسری صورت میں وہ قابلِ نفرت داشتہ یا کسی خانما بردار اور اپنے اور تمام سماج کے لئے کلنک کا ٹیکا بننے پر مجبور ہے۔ (اسلامیات: ۱۶۲، ۱۶۱)

پس حقیقت یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی گنجائش ایک عفیف و پاک دامن سماج کے لئے ضرورت کے درجہ میں ہے، اور یہ کوئی نظری فلسفہ نہیں، بلکہ مغرب کا عصمت باختہ سماج اس کی عملی مثال ہے۔

تعددِ ازدواج میں ایک پہلو عورت کے ساتھ رحم دلی کا بھی ہے، اگر ایک عورت دائم المریض ہو، صاحبِ اولاد اور کسی مناسب یا نامناسب وجہ سے مرد دوسرے نکاح پر مصر ہو تو اگر تعدد ازدواج کی گنجائش نہ رکھی جائے تو یا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، جس کا مذموم ہونا ظاہر ہے یا وہ غیر قانونی تعدد ازدواج کا راستہ اختیار کرے گا، اور غیر قانونی بیوی قانونی بیوی سے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، کیوں کہ وہ مرد کو زیادہ بلیک میل کر سکتی ہے، اور اپنے خنجر ناز سے قانونی بیوی کو گھائل کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے، ایسی صورتوں میں تعدد ازدواج رحمت ثابت ہوتی ہے نہ کہ زحمت، مطلقہ اور بیوہ خواتین کے مسائل کا حل اکثر یہی

تعدد ازدواج بنتا ہے، اور یہ تعدازدواج بھی دوسری بیوی کی رضا مندی اور خوشنودی ہی سے وجود میں آتا ہے، کیوں کہ کسی عورت کو دوسری بیوی بننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

اب عورتوں کو بھی اس بات کو سمجھنا چاہئے کہ جب عورتوں کی شرح آبادی مجموعی طور پر مردوں سے زیادہ ہے تو وہ بحیثیت عورت اپنی ان بہنوں کے لئے قانونی طور پر رشتۂ نکاح میں منسلک ہونا پسند کریں گی یا یہ بات کہ وہ وقتاً فوقتاً مختلف مردوں کی غیر قانونی بیوی بنتی رہیں؟ اوران حقوق وفوائد سے بھی محروم رہیں جوایک بیوی کواپنے شوہر سے حاصل ہونے چاہئیں؟

تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے والوں کا رویہ بھی قابلِ توجہ ہے، کہ ایک طرف وہ قرآن مجید کی اجازت سے فائدہ اٹھا کر دوسرا نکاح کرتے ہیں اور دوسری طرف قرآن ہی کی لگائی ہوئی عدل وانصاف کی شرط کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، تعدد ازدواج ایک سنجیدہ فیصلہ ہے نہ کہ پہلی بیوی سے انتقام کا طریقہ، عوام تو عوام خواص اوراہلِ علم بھی جب دوسرا نکاح کرتے ہیں تو کھلے ہوئے ظلم و جور سے اپنا دامن آلودہ کر لیتے ہیں، اور زیادہ تر پہلی بیوی کو اور بعض واقعات میں دوسری بیوی کو معلقہ بنا کر رکھ دیتے ہیں، یہ صریحاً ظلم اور گناہِ عظیم ہے، اور اللہ کی شریعت سے کھلواڑ کرنے کے مترادف ہے، جو شخص عدل پر قادر نہ ہو اس کے لئے ایک ہی بیوی پر قناعت کرنا واجب ہے، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا درست نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرسکو گے تو تمہیں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے ''فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' (النساء:۳)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ تعدادازدواج کی اجازت ایک سماجی وعمرانی ضرورت اور عفت و پاک دامنی کی حفاظت کا ذریعہ ہے، اور اپنے نتائج واثرات کے اعتبار سے خود عورتوں کے لئے بعض حالات میں باعثِ رحمت ہے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ تعدد ازدواج کے لئے شریعت نے جو حدود و قیود مقرر کی ہیں انکا لحاظ رکھا جائے ورنہ یہ قانون حکمِ شریعت کا استعمال نہیں بلکہ ''استحصال'' ہوگا۔

(۲۵ رمئی ۲۰۰۱ء)

طلاق، اسلامی نقطۂ نظر

شریعت کی نگاہ میں نکاح ایک پاکیزہ، ٹھوس اور پائیدار رشتہ ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ جن دو مرد و عورت نے نکاح کی صورت میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھی بن کر رہنے کا عہد کیا ہے، وہ ہمیشہ اس پر قائم رہیں اور معمولی معمولی باتوں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے اس رشتہ کی مضبوط بنیادوں کو نہ ڈھادیں۔

قرآن مجید نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک دوسرے کے لئے ذریعۂ سکون بتایا ہے (الروم:۲۱) اور ایک کو دوسرے کے لئے لباس قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسانی جسم کا سب سے بڑا ہمراز، تکلیف و آرام کا ساتھی اور محافظ ہے، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے رازداں، ان کی باہمی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے والے اور ہر حال میں ان کے ساتھی اور رفیق ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں اس رشتہ کو بڑی عظمت حاصل ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے مرد و عورت میں عفت اور پاکدامنی پیدا ہوتی ہے، دو اجنبی خاندان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور ان کے درمیان محبت و وابستگی پیدا ہو جاتی ہے، یہ تعلق نسل انسانی کی افزائش کا ذریعہ بنتا ہے۔

پھر اگر خدانخواستہ رشتہ ٹوٹا تو اپنے ساتھ اتنی ہی مضرتیں لاتا ہے، دو آدمی کی زندگیاں ویران ہو جاتی ہیں، بال بچوں کو باپ کی شفقت یا ماں کی ممتا میں سے کسی ایک سے محروم ہونا پڑتا ہے، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت صحیح طور پر نہیں ہوتی، دو خاندان جس قدر ایک دوسرے سے قریب ہوئے تھے اب اتنی ہی دور ہو جاتے ہیں اور آپس میں سخت نفرت اور کدورت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اسلام ابتدا ہی میں ایسے تمام دروازوں کو بند

کر دیتا ہے جو بعد میں باہمی نفرت، اختلاف اور ایک دوسرے سے دوری اور علیحدگی کا سبب بن سکتے ہیں۔اس کے لیے اسلام نے بعض ایسی چیزوں کو بھی گوارہ کیا ہے جو اسلام کی اصل سے میل نہیں کھاتیں،مثلاً پردہ کی اسلام میں کس قدر اہمیت ہے،وہ سب پر واضح ہے،لیکن منگیتر کو دیکھنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی گئی ہے بلکہ اسے بہتر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ شہوت اور بدنگاہی کا اندیشہ ہو تو بھی مرد ایسی لڑکی کو دیکھ سکتا ہے جس سے نکاح کا ارادہ ہو (عالمگیری ۵/۲۷، کتاب الکراہیۃ) اسی طرح باوجود اس کے کہ اسلام انسانی مساوات اور برابری کا قائل ہے اور ان کے نزدیک عظمت اور برتری اور کمتری صرف تقویٰ اور اللہ کا خوف ہے،لیکن چوں کہ بسا اوقات خاندانی اور معاشی یا پیشہ ورانہ برتری اور کمتری میاں بیوی کے درمیان کھچاؤ اور نفرت کی بنیاد بن جاتا ہے،اس لئے شریعت نے اس کی بھی اجازت دی کہ نکاح کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے۔

طلاق چوں کہ اسی رشتہ کو توڑنے کا نام ہے،اس لئے فطری بات ہے کہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا،حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ خوشی اس سے ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر دی جائے۔(صحیح مسلم) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بلا وجہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے،اس پر جنت حرام ہے۔(ترمذی،ابوداؤد،ابن ماجہ) آپ ﷺ نے نکاح کا حکم فرمایا اور طلاق سے منع فرمایا ہے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مزہ چکھنے اور ایک عورت یا مرد کی لذت اٹھا کر پھر اس سے جدائی اختیار کرنے والے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا۔(ان اللہ لا یحب الذواقین و الذواقات)

مگر کبھی کبھی طلاق اور میاں بیوی کی جدائی ایک ضرورت اور مجبوری بن جاتی ہے، کسی وجہ سے زندگی کی راہ پر ان دونوں کا ایک ساتھ چلنا ممکن نہیں ہوتا اور کچھ ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا اور علاحدہ رہ کر زندگی بسر کرنے ہی میں دونوں کے لئے سکون وچین اور اطمینان رہتا ہے۔ان حالات میں شریعت ایک ناپسندیدہ ضرورت سمجھ کر اس کی اجازت دے دیتی ہے،اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جن

چیزوں کی اجازت دی ہے، ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قابل نفرت چیز طلاق ہے، **ابغض الحلال عند اللہ الطلاق** (ابوداؤد، ابن ماجہ) اور فقہاء نے بھی اسے بلاضرورت ناجائز اور ممنوع قرار دیا ہے۔ (ردالمحتار ۱۷/۳)

چند صدی قبل تک اسلام پر اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس نے جدائی کی اجازت دے کر ظلم کیا ہے، دنیا کے دو بڑے مذاہب ہندومت اور عیسائیت میں اس کی مطلق اجازت نہ تھی (عیسائیوں کے یہاں اس قانون کی بنیاد حضرت مسیح کا یہ ارشاد تھا: جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے) (متی: ۱۹۶۱) حالاں کہ اس حکم کی حیثیت یکسر اخلاقی تھی، جیسا کہ اس سے قریب تر حکم قرآن مجید نے بھی دیا ہے۔ (البقرۃ: ۳)

مگر یہ ایک ناقابل عمل اور غیر فطری بات تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس قانون میں تبدیلی پیدا کرنی پڑی اور آج ہندوستان میں ہندو قانون اور تمام عیسائی ممالک کے عیسائی قانون میں طلاق کی گنجائش پیدا کرلی گئی ہے۔

سب سے پہلے وعظ و نصیحت اور سمجھاؤ سے کام لیا جائے، اگر یہ کافی نہ ہو تو اپنی ناراضگی کے سنجیدہ اظہار کے لیے اپنی خواب گاہ اور بستر علیحدہ کرلو، یعنی وقتی طور پر اس سے مباشرت کرنا چھوڑ دو، پھر اگر یہ گریز بھی عورت کی اصلاح نہ کرسکے تو مناسب حدوں میں اس کی کمزوری اور نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے تھوڑی مار پیٹ بھی کرسکتے ہو، اب اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو بہتر رفیق زندگی کی طرح اس کے ساتھ رہو۔ ان تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے باوجود اصلاح نہ ہوسکے اور عورت بیجا نافرمانی اور زیادتی پر آمادہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ آپس میں اس بگاڑ کو دور کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا ان حالات میں قرآن کا حکم ہے۔

''اگر ان دونوں میں شدید اختلاف کا اندیشہ ہو تو مرد اور عورت دونوں کی طرف سے ایک پنچ (حکم) کو بھیجو، اگر یہ دونوں واقعی اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔ (النساء: ۵۳)

یعنی دوسرے سمجھ دار، دین دار اور ہمدرد افراد کے ذریعہ مصالحت کی کوشش کی

جائے گی، اگر اس طرح آپسی خلش دور ہو جائے تو دونوں میاں بیوی کی طرح زندگی بسر کریں گے، لیکن اگر ثالثی اور پنچوں کی کوشش کے باوجود دونوں میں موافقت نہ ہو سکے، ایک دوسرے سے متنفر ہوں اور عورت کی طرف سے نامناسب حد تک مسلسل عدول حکمی اور نافرمانی ہو رہی ہو، تو اب شریعت طلاق کی اجازت دیتا ہے۔ پھر اب بھی ایک ہی دفعہ تین طلاقیں نہ دے، بلکہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ پاکی کی حالت میں (جس میں بیوی سے مباشرت نہ کی ہو) لفظ ''طلاق'' کے ذریعہ صرف ایک طلاق دی جائے، اس طلاق کے بعد اس کو یہ حق رہے گا کہ عدت گذرنے سے پہلے پہلے تک اگر اپنے فیصلہ پر پشیمانی یا عورت کی طرف سے ندامت کا اظہار اور بہتر زندگی کا وعدہ ہو تو بیوی کو لوٹا لے اور اگر وہ علیحدگی کے فیصلہ پر اٹل ہو تو یوں ہی چھوڑ دے، عدت گذرنے کے بعد خود بخود یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔

عورتیں بھی طلاق کے واقعات کم کرنے میں بڑا اہم اور مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ مختلف طریقوں سے شوہر کو اپنی طرف راغب اور مائل رکھیں اور کوئی ایسی بات پیش نہ آنے دیں جو باہمی نفرت اور آپسی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ پوری طرح شوہر کی مزاج شناس ہوں، وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اس بات کا اندازہ لگاتی رہیں کہ وہ کس بات اور کس عمل سے خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناخوش؟

پھر اگر کبھی ناراض ہو جائے تو اس کی کیا مرغوب چیز ہے، جس کا سہارا لے کر اس کو خوش کیا جا سکتا ہے؟ کس بات اور کس ضرورت کے اظہار کے لئے کیا مناسب وقت ہے؟ جن خواتین نے اس رمز کو جان لیا اور اپنی ازدواجی زندگی میں اس کا خیال رکھا ان کی زندگی ہمیشہ خوش رہے گی اور ان شاء اللہ طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔

یہ تو ایک اصولی بات ہے، اس کے علاوہ چند عمومی باتوں کا خاص لحاظ رکھنا چاہئے۔

اول یہ کہ مرد جب تھک کر اپنے کام سے واپس آئے، اس وقت پوری خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرے اور فوراً اپنی کوئی ایسی ضرورت نہ پیش کر دے جو مرد کے لیے

پریشانی کا باعث ہو۔ حدیث میں نیک بیوی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ شوہر کو خوش کردے، عورت اس حدیث کا مصداق اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس پر عمل کرے۔

دوسرے یہ کہ مرد کے لئے اپنے آپ کو سجا سنوار کر رکھے اور پوری طرح زیبائش و آرائش کرے، شریعت دوسروں کے لئے زیبائش وآرائش کی اجازت نہیں دیتی، جب کہ شوہر کے لئے اس کو پسند کرتی ہے، اس کی وجہ سے شوہر عفیف و پاک دامن رہتا ہے، بدنگاہی سے بچتا ہے اور دوسری عورتوں کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی۔

تیسرے اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے مردوں سے انتہائی بے توجہی برتے جو شوہر کو ناپسند ہوں، غیر محرم سے یوں بھی شریعت پردہ کا حکم دیتی ہے، لیکن خصوصاً ان لوگوں سے جائز حدوں میں بھی ربط نہیں رکھنا چاہئے جو شوہروں کو ناپسند ہوں، اس معاملہ میں مرد کی طبیعت فطری طور پر بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

چوتھے شوہر سے اپنی ضروریات کے مطالبہ میں ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے خودغرضی کا اظہار ہوتا ہو، یا ایسا محسوس ہوتا ہو گویا وہ شوہر کی حریف ہے، مثلاً شوہر کے پاس کپڑے ہوں یا نہ ہوں اپنے لئے کپڑوں کا مطالبہ یا اگر شوہر کپڑا لائے تو اس کا مقابلہ، بلکہ زیادہ سے زیادہ قناعت اور کفایت شعاری کی راہ اختیار کرے اور اپنے مقابلہ میں شوہر اور دوسرے اہل خانہ کی ضرورت کو مقدم رکھے۔ اسی طرح جب وہ شوہر کے دل میں اپنا گھر بنالے تو خود بخود مرد اس سے زیادہ کرے گا جو وہ چاہتی ہے۔

ان کے علاوہ کھانے اور پکوان میں ایسا تنوع کہ مرد کا رجحان ہوٹلوں کی طرف نہ رہے، نیز اس بات کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے کہ دوسروں کے پاس شوہر کی شکایت نہ کرے، بلکہ اگر باہمی رنجش اور کبیدگی پیدا ہوگئی تو اپنے ہی حد تک اس کو محدود رکھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے سماج میں ازدواجی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کریں اور یہ بتائیں کہ طلاق کب اور کس طرح دینی چاہئے۔

(۱۴؍مئی ۱۹۹۹ء)

نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ

ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے نفقۂ مطلقہ کا مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا ہے، شاہ بانو کیس نے پورے ملک میں جو ہلچل پیدا کی تھی، اور اس مسئلہ کے پس منظر میں تحفظ شریعت کی تحریک نے جس طرح پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار کیا تھا، اور احکام شریعت کو سمجھنے اور اس کی معاشرتی اہمیت کا مطالعہ کرنے کا جو شعور پیدا کیا تھا، وہ یقیناً مسلمانان ہند کی دینی اور ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اسی کے نتیجہ میں ''تحفظ حقوق مسلم خواتین بل'' پاس ہوا، مسلمان توقع رکھتے تھے کہ یہ قانون اس مسئلہ میں مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب کا مداوا کرے گا، لیکن افسوس کہ اس سیدھے سادھے قانون کی ہماری بعض عدالتوں نے ایسی تشریح کی، جس نے اس قانون کے بنیادی مقصد ہی کو مجروح کر کے رکھ دیا، اور ایسی تشریحات کی گئیں جو ''قانون کی تشریح'' سے آگے بڑھ کر ''قانون وضع کرنے کے دائرہ میں آتی ہیں، ملک کے مختلف ہائی کورٹوں نے اس قانون کی الگ الگ تشریحات کی ہیں، بعض عدالتوں نے عدت کے بعد مطلقہ کو نفقہ کا مستحق نہیں قرار دیا، اور بعض عدالتیں مطلقہ کو عدت گذرنے کے بعد بھی نفقہ کا حق دار قرار دیتی ہیں، ابھی ۱۲ر جولائی ۲۰۰۰ء کو ممبئی ہائی کورٹ نے بھی ایک مقدمہ میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس طرح کے فیصلوں نے یقیناً مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچائی ہے،

بعض بھولے بھالے اور قانون کی روح اور مضمرات سے ناواقف غیر مسلم بھائی تو کیا، مسلمان بھی مطلقہ کے لئے نفقہ کے حق کو ایک جائز اور انسانی حق باور کرتے ہیں، حالاں کہ نہ صرف اسلامی بلکہ عقلی نقطۂ نظر سے بھی یہ بات ناقابل فہم ہے، —— جہاں تک قانون شریعت کی بات ہے تو شریعت میں ایک شخص کا نفقہ دوسرے شخص پر تین وجوہ میں

سے کسی ایک وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت، حبس، ملکیت، ماں باپ، بال بچے، بھائی بہن، دادا دادی، اور بعض حالات میں دوسرے اعزہ اور رشتہ داروں کا نفقہ قرابت کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، قرابت کی بناء پر نفقہ واجب قرار دئے جانے کے سلسلہ میں دو اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، ایک یہ کہ قرابت کی بناء پر اس شخص کا نفقہ واجب ہوگا جو خود اپنی کفالت سے قاصر ہو، دوسرے اس شخص پر واجب ہوگا جو اتنا خوش حال ہو کہ اپنی ضروریات پوری کر کے اس شخص کی کفالت بھی کر سکتا ہو۔

ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا مالک ہو، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوگا، جب غلام اور باندی کا وجود تھا تو اسی بنیاد پر مالک پر غلام اور باندی کا نفقہ واجب قرار دیا جاتا تھا، اسی طرح اسلام جانوروں کا نفقہ ان کے مالک پر واجب قرار دیتا ہے، اگر کوئی شخص اپنے جانوروں کا چارہ فراہم نہ کر سکے تو اس کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر حلال جانور ہو تو یا تو ذبح کر کے کھالے یا فروخت کر دے اور حرام جانور ہو تو اسے بہر حال فروخت کر دے، اس کو بھوکا رکھ کر یوں ہی اپنی ملکیت میں رکھنا جائز نہیں، اور دیانت و اخلاق کے خلاف ہے۔

''حبس'' کے معنی ہیں روکے رکھنا، یعنی اگر ایک شخص دوسرے شخص کی وجہ سے محبوس ہو، پابندی کی حالت میں ہو اور معاشی سرگرمیاں اختیار نہیں کر سکتا ہو تو اس کا نفقہ اس شخص پر واجب ہوگا جس کی وجہ سے وہ پابندی اور حبس کی حالت میں ہے، ملازمین اور مزدوروں کی تنخواہ، گورنمنٹ اور آجرین پر کیوں واجب ہے؟ اسی لئے کہ وہ سرکار اور آجر کے لئے محبوس ہے — بیوی کا نفقہ شوہر پر اسی جہت سے واجب ہوتا ہے، بیوی گھر کی دیکھ بھال، بال بچوں کی پرورش اور امور خانہ داری کے لئے گویا محبوس ہوتی ہے، اس لئے شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب رکھا گیا ہے، حبس کی وجہ سے جو نفقہ واجب ہوتا ہے، اس کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ محبوس و پابند شخص غریب و تنگ دست ہو یا معاشی اعتبار سے خوش حال و خود مکتفی، اور اسی طرح وہ جس شخص کے لئے محبوس ہے، اس کی معاشی حالت اچھی ہو یا معمولی، بہر صورت نفقہ واجب ہوگا۔

جب ایک عورت اپنے شوہر سے مطلقہ ہو جاتی ہے، تو عدت گذرنے کے بعد وہ

اپنے شوہر کے لئے محبوس نہیں، دوسرا نکاح کرسکتی ہے، اور شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے معاشی سرگرمی بھی اختیار کرسکتی ہے، اس لئے ''حبس'' کی وجہ سے نفقہ واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ طلاق واقع ہونے کے بعد اپنے سابق شوہر سے اس کی کوئی قرابت باقی نہیں رہی، کیوں کہ ازدواجی رشتہ خونی اور اٹوٹ رشتہ نہیں، بلکہ ایک ایسا رشتہ ہے جو زبان کے بول سے وجود میں آتا ہے اور زبان کے بول ہی سے ختم بھی ہوجاتا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ طلاق کے بعد میاں بیوی میں کوئی قرابت باقی نہیں رہتی ـــــ جہاں تک ملکیت کی بات ہے تو اسلام کی نگاہ میں شوہر و بیوی نکاح کے دو فریق اور زندگی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں نہ کہ مالک اور مملوک، عورت کو بعض قوانین میں مرد کی ملکیت اور جائیداد تصور کیا جاتا تھا، اسلام نے اس تصور کو مٹایا، اور کہا کہ جیسے مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے مردوں پر، **ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف**، (البقرۃ: ۲۲۸) اس طرح اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے طلاق اور عدت گذرنے کے بعد کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے مرد پر اس عورت کا نفقہ واجب قرار دیا جائے۔

اصل یہ ہے کہ ہندو مذہب میں حقیقی تصور یہی ہے کہ بیوی شوہر کی ملکیت ہوتی ہے، اور ایک عورت کو ہمیشہ اسی شوہر کے ساتھ بندھا رہنا ہے، وہ اپنے آپ کو اس کی قید نکاح سے آزاد نہیں کرسکتی، دراصل اسی تصور نے ''ستی'' کے رواج کو جنم دیا، کہ جب شوہر مرجائے تو عورت بھی اس کے ساتھ نذر آتش کردی جائے، پس، چونکہ ہندو سماج میں عورت کے مطلقہ ہونے کا تصور نہیں، اس لئے مطلقہ سے متعلق احکام کا بھی وجود نہیں، اسی لئے برادرانِ وطن کے لئے یہ بات حیرت انگیز ہوسکتی ہے کہ کوئی عورت جب ایک بار نکاح میں آچکی ہو تو پھر وہ نکاح کی وجہ سے واجب ہونے والے نفقہ سے کیوں کر محروم ہوسکتی ہے؟ لیکن اسلام میں نکاح کا جو اعلیٰ تصور ہے اور اس نے عورت کو جو مقام عطا کیا ہے، اس کے پس منظر میں جب دیکھا جائے تو یہ بالکل معقول بات ہے کہ جب مرد و عورت کے درمیان ازدواجی رشتہ ہی باقی نہیں رہا تو اس کا نفقہ کیوں کر واجب ہوگا؟

خالص عقلی اور سماجی مصالح کے نقطۂ نظر سے بھی مرد پر مطلقہ کا نفقہ واجب قرار دینا نامناسب بات ہے، اگر مرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اسے زندگی بھر نفقہ دیتے رہنا پڑے گا تو جو مرد اپنی بیوی سے نجات چاہتا ہو اس میں نفرت کے جذبات مزید بڑھیں گے، اس زندگی بھر کی سزا سے نجات پانے کے لئے وہ غیر قانونی راستے اختیار کرے گا، اور بجائے طلاق دینے کے بیوی کی زندگی کے در پے ہوگا، اور اس طرح کے واقعات پیش آئیں گے۔ جو روز ہمارے اخبارات کی سرخیاں بنتے ہیں، قانونی راستے کو اتنا مشکل، دشوار اور تکلیف دہ نہ بنانا چاہئے کہ لوگ غیر قانونی راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

دوسرے بد قماش اور بیمار ذہن عورتیں کوشش کریں گی کہ شوہر کو اس طرح دق کریں کہ وہ طلاق دینے پر مجبور ہو جائے اور پھر اپنی مفسدانہ حرکتوں میں مشغول رہیں گی، ایسے واقعات بھی سامنے آئے ہیں کہ ایک مطلقہ عورت اپنے آشنا کے ساتھ علانیہ عدالت میں آتی ہیں اور سابق شوہر سے نفقہ وصول کر کے لے جاتی ہے، گویا مرد جرم بے گناہی کی سزا پا رہا ہے، اور عورت اپنی عیش کوشی کے لئے ''وظیفہ، حسن خدمت'' حاصل کر رہی ہے، کیا اسے سماجی انصاف کہا جا سکتا ہے؟ بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض بد قماش عورتیں سابق شوہر سے نفقہ حاصل کرنے اور آتش انتقام ٹھنڈی کرنے کی غرض سے دوسرے نکاح سے احتراز کریں، اور بے راہ روی کو ترجیح دیں —

آخر ایک شخص کا نفقہ دوسرے پر واجب قرار دینے کے لئے کوئی بنیاد و اساس تو ہونی چاہئے، اگر اجیر اور آجر کے درمیان اجارہ ختم ہونے کے بعد ایک پر دوسرے کی واجبات عائد نہیں ہوتے، ملازمت ختم ہونے کے بعد ملازم تنخواہ کا مستحق نہیں ہوتا، تو یہ کون سی منطق ہے کہ ایک مرد و عورت کے درمیان نکاح کا رشتہ باقی نہیں رہا، لیکن مرد نفقہ ادا کرتا رہے؟ — اور پھر کیا کوئی غیرت مند شریف عورت اس بات کو گوارا کر سکتی ہے کہ ایک اجنبی اور بے تعلق شخص کے لقموں پر اس کی پرورش ہو، اور ایک ایسے شخص کے سہارے وہ زندگی گذارے جس نے اسے رد کر دیا ہے، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ عقل اور سماجی

مصلحت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کا اس کے سابق شوہر پر نفقہ واجب نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن کیا اسلام نے ایسی عورتوں کو بے سہارا کر دیا ہے؟ ہرگز نہیں! ــــ اسلامی نقطۂ نظر سے نکاح کی وجہ سے عورت کا رشتہ اپنے خاندان سے منقطع نہیں ہوتا، اسی لئے وہ اپنے ماں باپ اور بعض اوقات بھائی اور چچا وغیرہ سے میراث کی حق دار ہوتی ہے، جب کوئی عورت مطلقہ ہو جائے تو اب اس کے والدین اور قریبی محرم رشتہ داروں پر حسب مراتب اس کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ اگر اس خاتون کا انتقال ہو جائے تو جو لوگ شرعاً اس کے وارث ہوں گے، ان ہی اعزہ پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، طلاق کے وقت مہر کی صورت میں اسے ایک خطیر رقم ملتی ہے، جسے وہ کاروبار میں شریک کر کے کچھ گذران حاصل کر سکتی ہے، اور اگر اس کی گود میں طلاق دینے والے شوہر کے بچے اور بچیاں ہیں تو بچوں کی عمر آٹھ سال ہونے تک اور لڑکیوں کی عمر بالغ ہونے تک ماں پرورش کی حق دار ہے، اس عرصہ میں وہ سابق شوہر سے اس کے بچوں کی پرورش کرنے کی اجرت وصول کر سکتی ہے، یہ نفقہ نہیں ہے، بلکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے ــــ اس لئے ایسا نہیں ہے کہ اسلام نے ایسی عورت کو محروم اور بے آسرا رکھا ہو، اور سب سے بڑا آسرا یہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف دوسرے نکاح کی اجازت دی، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے،

لیکن قانون کے فوائد اور نقصانات کا تعلق بہت کچھ قانون پر عمل کرنے والوں کے صحیح اور غلط استعمال سے بھی ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مطلقہ عورتوں کے نکاح کو رواج دیں، ہندو معاشرہ کی طرح ایسی خواتین کو منحوس نہ سمجھیں، سارے مسئلہ کی اصل جڑ یہی ہے، عرب معاشرہ میں آج بھی مطلقہ کا کوئی مسئلہ نہیں، اور طلاق کے واقعہ کو چنداں دشوار نہیں سمجھا جاتا، کیوں کہ وہاں طلاق شدہ عورتوں کا نکاح کوئی دشوار بات نہیں، بلکہ عدت گذرتے گذرتے پیام آنے شروع ہو جاتے ہیں، اسی لئے دونوں خاندانوں میں اس طرح کی تلخی بھی پیدا نہیں ہوتی، جو ہندوستا میں دیکھنے میں آتی ہے ــــ دوسرے ہماری محبت اور حسن سلوک کا دائرہ اتنا سمٹ گیا ہے کہ ہم ''اپنے اور اپنے بچوں'' کے سوا کسی کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے، یہاں تک کہ بعض لوگ تو بوڑھے ماں باپ کو بھی بوجھ سمجھنے

لگے ہیں، ان حالات میں مطلقہ عورتوں کے تئیں ذمہ داریوں کے احساس کی کیا خاک توقع رکھی جاسکتی ہے؟ اس لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ مسلم سماج میں اس احساس کو جگایا جائے اور لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑا جائے کہ ایسی بے کس و بے آسرا عورتوں کی ضروریات کی کفالت بھی ہماری ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں، بلکہ ایک حق کی ادائیگی ہے!

اگر ہم خود اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں چوکس رہیں تو قانون شریعت پر نہ کوئی زبان کھل سکتی ہے، اور نہ کوئی انگلی اٹھ سکتی ہے!!

(تاریخ............)

پردہ —— حفاظت نہ کہ قید

حیرت کے کانوں سے سنئے اور یقین نہ آئے پھر بھی یقین کیجئے، کہ دنیا کے جغرافیہ میں مسلم ملک کے نام سے پایا جانے والے ایک ملک ''جمہوریہ ترکی'' نے ایک اسلام پسند خاتون رکن اسمبلی کو اسمبلی کی رکنیت بلکہ ملک کی شہریت سے بھی محروم کردیا ہے، شاید آپ سمجھیں کہ اس خاتون نے کوئی اخلاقی جرم کیا ہوگا، کسی سماجی بُرائی کی مرتکب ہوئی ہوگی، بے حیائی اور بے شرمی کی کوئی بات اس سے صادر ہوئی ہوگی، دین و مذہب اور اخلاقی اقدار کا مذاق اڑایا ہوگا؟ مگر نہیں، ایسا نہیں ہے! اس ''گنہ گار خاتون'' نے ترکی کے سیکولرزم پر حملہ کیا ہے، اس کی سیکولر قدروں پر کلہاڑی چلائی ہے اور ایک ایسا کام کیا ہے جس نے ترکی کے ''روشن خیال'' اور ترقی پسند حکمرانوں کو شرم سے پانی پانی کردیا ہے، اور ان کی جبینِ غیرت گڑ کر رہ گئی ہے —— اس خاتون رکن اسمبلی کا ''جرم'' یہ تھا کہ وہ اسکارف پہن کر اسمبلی میں آتی تھی، اور اس کی نسوانی غیرت و حیا کو اس پر اصرار تھا، یہ اتنی بڑی غلطی تھی جو ترک حکومت کے لئے نہایت ناقابلِ برداشت اور شرم ناک بات تھی۔

حالانکہ ترکی کا زیادہ تر حصہ ایشین علاقہ ہے، ایک چھوٹی سی ٹکڑی یورپ میں ہے، اس کے مغربی پڑوسیوں کا رویہ کبھی بھی اس کے ساتھ دوستانہ تو کیا منصفانہ بھی نہیں رہا، ترکی کی طرف سے یونان کی کدورت اور اس کو زک پہونچانے کی کوشش کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، بوسنیا، کوسووو اور بلقان کے علاقوں میں مغربی جارحیت اور انسانیت کشی کے جو واقعات پیش آتے ہیں، اس کی تہہ میں ترکوں سے تاریخی عداوت ہی کارفرما ہے، اس کے مغربی دوستوں کا حال یہ ہے کہ باوجود صد ہزار خوشامد کے آج تک اسے یورپین یونین میں داخلہ نہیں مل سکا۔ اور یورپ کی تجارتی منڈی میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا

جاتا ہے، یہ مغربی ممالک ہی ہیں جو کُردوں کو ترکوں کے خلاف اور ترکوں کو کردوں کے خلاف اُکساتے رہتے ہیں، تاکہ سیاسی عدم استحکام برقرار رہے، دوسری طرف ترکی کی سربلندی اور فتحمندی کی تاریخ دیکھئے، یہ عالم اسلام ہی ہے جس نے ترکی کو صدیوں خلافت کا تاج گہربار پہنایا، اور اس طرح ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصہ پر بلا شرکت غیرے ترکوں نے حکومت کی، یہ ترک جن کا دنیا کی قیادت میں کوئی کردار نہیں تھا، اور تہذیب وثقافت کا کبھی اس قوم سے گذر نہیں ہوا تھا، اسلام کی بادِ نسیم نے اس کو ایک بہار آفریں انقلاب سے ہمکنار کیا، اور ترک قائدانہ صلاحیت، عسکری قوت، علمی وفکری بلندی اور تمدن وثقافت کا ایک ایسا آفتاب بن کر مشرق ومغرب پر چھا گئے کہ کسی کور چشم کے لئے بھی اس سے انکار ممکن نہ تھا، لیکن اسلام کا منت کش ہونے کی بجائے اسلامی قدروں ہی سے بغاوت کو ترکوں کی بدبختی اور احسان فراموشی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ جس ملک نے صدیوں حرمین شریفین اور مسلمانوں کے قبلۂ اوّل کی حفاظت کا شرف حاصل کیا ہو، وہ آج اسرائیل کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرے اور فوجی مشقیں کرے، اس سے بڑھ کر عجوبہ اور کیا ہوگا؟

یہ سیکولرزم کا لفظ بھی ''موم کی ناک'' سے کم نہیں، جہاں چاہیں سیدھی کردیں، جہاں چاہیں ٹیڑھی کردیں، جب چاہیں پھیلادیں اور جب چاہیں سمیٹ دیں، دنیا میں شاید ہی کسی لفظ سے اتنی متضاد حقیقتوں کو وابستہ کیا جاتا ہو، اور جتنا ظلم اس لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہے شاید کسی اور لفظ کے ساتھ کیا جاتا ہو، امریکہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب اور تہذیب پر چلنے کی آزادی ہے، خواہ وہ کسی قدر بھی خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہو، مرد برقع پہننے لگے، اور عورتیں بے لباس ہوجائیں، تب بھی کوئی اعتراض نہیں، برطانیہ کا سیکولرزم یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہے؛ لیکن اگر کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہانت کرے تو قانونی جرم، اور دوسرے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ بے احترامی کی جائے تو کوئی مواخذہ نہیں، خود ہمارے ملک میں ہر سیاسی جماعت کے پاس سیکولرزم کا اپنا تصور ہے، یہاں تک کہ مسجدوں کو شہید اور عیسائی مبلغین کو زندہ نذرِ آتش کرنے والے بھی

اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں، گویا سیکولرزم ایسی سخت جان مخلوق ہے کہ اس پر کتنا بھی وار کرو، اسے کوئی نقصان نہیں پہونچتا، ترکوں کا سیکولرزم شاید سب سے زیادہ ''روشن خیالی'' پر مبنی ہے، کہ فرانس جس کو جمہوری انقلاب کا مؤسس سمجھا جاتا ہے، اور جو دنیا کی بڑی طاقتوں میں ایک ہے، اس کے سیلوکرزم میں تو پردہ اور نقاب سے کوئی رخنہ نہیں پڑتا، لیکن ترکوں کا سیکولرلزم اس سے مرگ بہ لب ہو جاتا ہے، سیکولرزم تو اصل میں رائے عامہ کے احترام اور ایک دوسرے کی شخصی آزادی میں عدم مداخلت سے عبارت ہے؛ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اگر کسی ملک میں بے دین اور بد تہذیب لوگ رائے عامہ کے ذریعہ برسر اقتدار آجائیں، تو سیکولرزم کا تقاضہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار کو قبول کیا جائے؛ لیکن اگر ترکی اور الجزائر میں رائے عامہ اسلام پسند حلقوں کے حق میں ہے تو رائے عامہ کو پس پشت ڈال دینا اور فوجی دہشت گردی کو ان پر مسلط کر دینا سیکولرزم ہے، گویا کہ رائے عامہ کی پاس داری بھی سیکولرزم اور رائے عامہ کا قتل بھی سیکولرزم ـ سیکولرزم کا یہ وہ معیار ہے جو آتا ترک مصطفیٰ کمال پاشا نے قائم کیا ہے، یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس شخص نے اسلام کو جو نقصان پہونچایا ہے، اسلامی تاریخ میں شاید ہی کسی منافق نے بھی اسلام کے ساتھ ایسی جفا کیشی روا رکھی ہو ـ فعلیہ ماعلیہ ـ

بہر حال مجھے یہ خبر سن کر بے ساختہ اکبرالہ آبادی کا وہ شعر یاد آیا کہ

ایک روز چند بیبیاں آئیں جو بے پردہ
اکبر زمین میں غیرت قوی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ کیا ہوا ؟
کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کے پڑ گیا !

اکبر نے جو بات کہی ہے وہ ایک حقیت ہے، کہ پردہ کی مخالفت کو کور عقلی کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں دولت اور عورت کو سب سے زیادہ پر کشش بنایا گیا ہے، سالانہ جرائم کے اعداد و شمار ملاحظہ کیجئے اور ان کے محرکات کا جائزہ لیجئے تو پچانوے فیصد جرائم کے پیچھے یہی حصولِ زر اور حصولِ زن کا جذبہ

کارفرما ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ عورتیں، مقابلہ مال و دولت کے زیادہ اس کا باعث بنتی ہیں، بلکہ اکثر اوقات زر کو زند پر نثار کیا جاتا ہے، اب غور کیجئے کہ مال و اسباب کو چھپانے اور نظر بد سے بچانے کیا کچھ جتن نہیں کئے جاتے، بینکوں کی عالیشان اور قلعہ نما عمارتیں اسی لئے تو ہیں؟ رقم کی معمولی مقدار کے لئے بھی کیا آہنی جوڑیاں نہیں رکھی جاتیں، اور مضبوط تالے نہیں لگائے جاتے؟ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہو تو رقم رکھنے کے بجائے چیک اور ڈرافٹ لے جائے جاتے ہیں، کس قدر ان کی حفاظت اور صیانت کا انتظام کیا جاتا ہے، کہ کوئی ہاتھ وہاں تک پہونچنے نہ پائے کوئی نگاہ دیکھنے نہ پائے، یہاں تک کوشش کی جاتی ہے کہ کسی مسافر کے خیال میں بھی یہ بات نہ آئے کہ آپ کے پاس اتنی رقم موجود ہے؟

تو عورت کے وجود اور اس کی عزت و آبرو کے مقابلہ بے قیمت مال و اسباب کے تحفظ کی اتنی کوششیں اور ان کو نگاہِ حرص سے بچا کر رکھنے کا اتنا خیال! لیکن عورتیں جو عزت و ناموس کا آبگینہ ہیں، اور جن کے آئینہ عفت پر ایک بال بھی انسان کی فطرتِ سلیمہ کو گوارا نہیں، ان کو بے پردہ رکھنا کہ سر اور بازو کھلے ہوں، ٹانگیں نظر آتی ہوں، سینہ و پشت سے لوگوں کی نگاہیں ٹکراتی ہوں، کیا شرافت کی بات ہے؟ اور شرافت کو تو جانے دیں، کہ مغربی تہذیب نے اپنی لغت سے اس لفظ کو کھرچ کر رکھ دیا ہے، کیا عقل اور انسانی فطرت بھی اس کو قبول کرتی ہے؟

نظر ہی فتنوں کا حرفِ آغاز ہے، کہ پہلے نگاہ پڑتی ہے پھر آنکھوں سے آنکھیں لڑتی ہیں، اس کے بعد زباں ہوس اپنا مدعیٰ بیان کرتی ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے بداخلاقی کے دلدل میں انسان پھنستا چلا جاتا ہے، اور اس کا زیادہ نقصان عورتوں کو اٹھانا پڑتا ہے، اسے سماج میں ذلیل ورسوا ہونا پڑتا ہے، اسے بے باپ کی اولاد کی ماں بننا پڑتا ہے، پھر وہ گناہوں کے جال میں اس طرح پھنستی چلی جاتی ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل سے باہر آنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا اور وہ ہر نگاہ ہوس کی آسودگی کا سامان بنتی رہتی ہے، پس، پردہ عورتوں کے لئے نہ قید ہے اور نہ ان کی تذلیل، بلکہ یہ ان کی حفاظت و صیانت کا ایک نظام ہے۔

مذہب اور شریعت کے علاوہ خود قانونِ فطرت بھی ہمیں اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ جو چیزیں عام، غیر اہم اور کشش سے خالی ہوں ان کے لئے حفاظت وصیانت کا اہتمام درکار نہیں، اور جو چیزیں قیمتی، اہم اور وجہ کشش ہوں، ان کی حفاظت کے لئے قدرتی تدبیریں موجود ہیں، پتھر کی چٹانیں کھلی اور بے غبار حالت میں ہر جگہ مل جائیں گی، لیکن سونے کی کان پتھر کی طرح کھلے عام دستیاب نہیں، بلکہ یہی پتھر اور دوسرے زمینی اجزاء کے تہہ در تہہ غلاف میں سونے کے ذرات چھپا کر رکھے گئے ہیں، ان کی تلاش بھی مشکل ہے، اور تلاش کے بعد ان کو کشید کرنا بھی دشوار، پانی میں سیپ اور اس جیسی کتنی ہی چیزیں تالابوں، ندیوں اور دریاؤں کے کنارے وافر مقدار میں دستیاب ہیں، لیکن موتی کو صدف کے مضبوط غلاب میں چھپا کر رکھا گیا ہے، جو تلاش بسیار کے بغیر ہاتھ نہیں آتا، عورت کا وجود بھی یقیناً ایک پرکشش وجود ہے، جو تاریخ میں بعض بڑی بڑی لڑائیوں کا باعث بنا ہے، تو کیا ان کی حفاظت وصیانت مطلوب نہیں اور ان کو سماج کے رحم وکرم پر چھوڑنا جرم نہیں؟

یہ بات کہ پردہ ترقی کے لئے رکاوٹ ہے، ایک ایسی فرسودہ اور خلاف واقعہ بات ہے کہ نہ عقل اس کی تصدیق کرتی ہے، اور نہ تجربہ، غور کرو کہ علم کی بنیادی طور پر دو ذریعے ہیں ایک انسان کی عقل ہے جس کا مرکز دماغ ہے، اور دوسرے انسان میں کسی محسوس کرنے کی صلاحیتیں ہیں یعنی آنکھ جو دیکھتی ہے، کان جو سنتا ہے، زبان جو چکھتی ہے، ناک جو سونگھ کر کسی چیز کو سمجھتی ہے، اور ہاتھ یا دوسرے اعضاء جو چھو کر کسی چیز کی سختی اور نرمی کو جانتے ہیں، ان ہی پانچ صلاحیتوں کو فلسفہ کی اصطلاح میں ''حواسِ خمسہ'' کہا جاتا ہے، اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا پردہ ان میں سے کسی صلاحیت کو متاثر کردیتا ہے؟ کیا پردے کی وجہ سے عقل اپنا کام کرنا چھوڑ دیتی ہے؟ اور انسان کی یہ صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ پردہ کو علمی وفکری ترقی میں رکاوٹ تصور کیا جائے۔

ہاں پردہ ضرور رکاوٹ ہے، بے حیائی اور بے غیرتی میں اس بات میں کہ عورتیں اپنی عفت وعصمت کو قربان کر کے کالبوں کی زینت بنیں، وہ اجنبی مردوں سے ہم دوش

ہو کر رقص و سرور کی بزم میں آراستہ کریں، وہ ماڈل گرل بن کر تجارت کی تشہیر کا ذریعہ بنیں، اپنے عارضی و گیسو اور سینہ و بازو کو بے پردہ کر کے تجارت کی ترقی کی خدمت انجام دیں اور جو آفسوں اور دفتروں میں آنے والوں کی نگاہ کے لئے خوان ضیافت بنائی جائیں، یقیناً پردہ ایسی بے ہودہ ''ترقیوں'' میں رکاوٹ ہے، لیکن اگر اسی کا نام ترقی ہے، تو کیا حیوانات اور چوپائے انسان سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہیں؟؟

(۲۸ رمئی ۱۹۹۹)

عبادت گاہوں کا احترام اور اسلام

خدا کی پہچان اور اس کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے، موحد ہو یا مشرک خدا کی صحیح پہچان رکھتا ہو یا حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہو، خالق کا پرستار ہو یا خالق کو مخلوق کے قالب میں تلاش کرتا ہو، اور شجر وحجر، آگ پانی کی پوجا کرتا ہو، اس کی تہہ میں خدا کی محبت ہی کارفرما ہے، آتش پرست آتش کدے کیوں سلگاتے ہیں؟ انسان اپنے ہاتھوں سے رنگ برنگ کی خوبصورت مورتیاں کیوں بناتا ہے؟ گرجا گھروں میں ناقوس کیوں بجائے جاتے ہیں؟ یہود اپنی عبادت گاہوں میں گھٹنے کے بل کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ مسجدوں میں اذانیں کس کی طرف پکارنے کے لئے دی جاتی ہیں؟ —— یہ سب خدا کی محبت اور اسکی چاہت کے مظاہر ہیں، یہ اور بات ہے کہ اکثر قوموں نے خدا کی حقیقی پہچان کو کھو دیا ہے، اور انہوں نے منزل کے بجائے راستہ اور خالق کے بجائے مخلوق ہی کو اپنا کعبۂ مقصود بنالیا ہے، پیغمبر اسلام دنیا میں اسی لئے تشریف لائے کہ انسانیت کو اس کے حقیقی خالق و مالک کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور زندگی کے صحیح طریقوں کے ساتھ ساتھ خدا کی بندگی کا صحیح طریقہ انسان کو بتایا جائے، لیکن بہر حال مختلف قوموں میں عبادت کے جو طریقے مروج ہیں، وہ درحقیقت انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی آواز ہے، خدا کی محبت، خدا کی چاہت، خدا کو پانے کا شوق، خدا کو اپنے آپ سے راضی کرنے کا جذبہ، خدا کی چوکھٹ پر اپنی پیشانی کو بچھانا اور اس کے حضور اپنی ضرورت واحتیاج کے ہاتھ اٹھانا، مانگنا، رونا اور گڑ گڑانا، یہ سب انسانی فطرت کا حصہ ہے، اور یہ بجائے خود خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خدا ہر جگہ ہے، اور تہہ تہہ پر اس کی حکمرانی ہے، لیکن خدا کی جو عظمت اور جلالت

شان انسان کے قلب وذہن میں رچی بسی ہے، اس کے تقاضا سے آدمی چاہتا ہے کہ خدا کی بندگی اور اس سے سرگوشی کے لئے پاک صاف جگہ ہو، جہاں سکون ہو، جہاں انسان کی روحانیت مادی آلائشوں سے آزاد رہ سکے اور وہ گھڑی چند گھڑی خدا کے حضور یکسو ہو سکے، اسی مقصد کے تحت ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر علاقہ میں عبادت گاہوں کی تعمیر کا ذوق رہا ہے، اس سلسلہ کا آغاز کس عبادت گاہ سے ہوا؟ اس کا جاننا بہت دشوار ہوتا، اگر خود اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے بارے میں نہ بتایا ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: سب سے پہلے جو گھر اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا، وہ ''کعبۃ اللہ'' ہے، جو مکہ میں تعمیر کیا گیا، قرآن مجید میں کعبہ کی تعمیر ابراہمی کا صراحتاً ذکر موجود ہے، لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام یا ان سے بھی پہلے فرشتوں نے خدا کے اس گھر کو تعمیر کیا تھا، یہ عبادت گاہ توحید کا مرکز تھی، ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک رہے گی، مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قریب دو ڈھائی سو سال پہلے سے لے کر آپ ﷺ کی بعثت کے اکیس سال بعد تک یہ مرکز توحید بت کدہ بنا رہا، لیکن آپ ﷺ نے کبھی اس گھر کی بے حرمتی نہیں فرمائی، مکہ فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے اس کے بت صاف کر دیئے، اور اس کو اپنی اصل وضع پر لے آئے، لیکن اس کے در و دیوار سے ایک اینٹ بھی نہ کھینچی گئی، اور حالانکہ اس کی تعمیر بناء ابراہیمی سے کسی قدت مختلف تھی، پھر بھی اس کی توقیر و اکرام میں کوئی کمی روا نہیں رکھی گئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں عبادت گاہیں کس قدر قابلِ احترام اور لائق رعایت ہیں،

جب بیت المقدس کا علاقہ فتح ہوا تو صورت حال یہ تھی کہ مقام صخرہ کو عیسائیوں نے کوڑا کرکٹ اور نجاستیں پھینکنے کی جگہ بنا رکھا تھا، اور یہ یہودیوں کی عداوت کی بناء پر تھا، کیوں کہ یہود اسی کو اپنا قبلہ بناتے تھے، حد یہ ہے کہ عورتیں اپنے ناپاکی کے کپڑے یہاں ڈالتی تھیں، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب بیت المقدس پہونچے اور مسجد اقصیٰ کی بنیاد رکھی تو ''صخرہ'' پر جو مٹی اور گندگی جمع تھی اسے اپنی چادر اور قباء مبارک کے دامن میں رکھ کر منتقل کرنا شروع کیا، اس طرح تمام مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مقام کو گندگی سے صاف کیا،

عیسائیوں کا یہ عمل دراصل یہودیوں کے ردعمل میں تھا، کیونکہ جس مقام پر حضرت عیسیٰ کو عیسائی عقیدہ کے مطابق سولی دی گئی تھی، اس مقام پر یہود سڑی گلی چیزیں پھینکا کرتے تھے، (البدایہ والنھایہ: ۵۶/۷)

رسول اللہ ﷺ نے مذہبی جذبات کی رعایت اور عبادت گاہوں کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ فرمایا اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ نہ کوئی چرچ منہدم کیا جائے گا، اور نہ کسی مذہبی رہنما کو نکالا جائے گا، **لا نھدم لھم بیعۃ ولا یخرج لھم قس**، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۰۴۱) بعض مورخین نے معاہدہ نجران میں یہ دفعات بھی نقل کی ہیں کہ پادریوں راہبوں اور پجاریوں کو اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیا جائے گا، اور نہ صلیبیں اور مورتیاں توڑی جائیں گی، (مقامات شبلی: ۱۸۹/، بحوالہ (فتوح البلدان: ۶۵/)

شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ اور دو اور صاحبان کی گواہی کے ساتھ دستاویز تحریر فرمائی، جس میں نام بہ نام چودہ گرجوں کا ذکر فرمایا، اور اس کی حفاظت کی تحریری ضمانت دی، (البدایہ والنہایہ: ۲۱/۷)۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح مصر کے موقع سے بھی حضرت عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے گرجوں کی حفاظت کے سلسلہ میں دستاویزی معاہدہ کیا تھا، اور ان کو اختیار تھا کہ وہ اپنی عبادت گاہوں کے اندر جس طرح چاہیں عبادت کریں، اور جو کہنا چاہیں کہیں: **ان یخلی بینھم وبین کنائسھم یقولون فیھا مابدالھم** (جمع الفوائد: ۵۰۰/۲، بحوالہ طبرانی کبیر)

مسلمانوں کو ہمیشہ عبادت گاہوں کا اتنا لحاظ رہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب دمشق کی جامع مسجد میں یوحنا کے نام سے موسوم گرجا کو شامل کرنے کی کوشش کی اور عیسائی اس پر راضی نہ ہوئے تو آپ اس سے باز رہے، لیکن عبدالملک بن مروان نے بہ جبر گرجا کو مسجد میں شامل کرلیا، پھر خلیفہ عادل وراشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد میں عیسائیوں نے فریاد کی اور اس کا حوالہ دیا، چنانچہ حضرت عمر نے دمشق کے گورنر کے نام حکم جاری فرمایا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے وہ انہیں واپس کردیا جائے، آخر مسلمانوں نے

عیسائیوں کی خوشامدیں کر کے بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا، اور اس طرح یہ مسجد بچ سکی۔

(فتوح البلدان: ۱۳۱)

مسلمانوں کے عہدِ حکمت میں غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف اپنی قدیم عبادت گاہوں کو باقی رکھنے کا حق تھا، بلکہ نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بھی اجازت تھی، مولانا عبد السلام ندویؒ لکھتے ہیں،

> خود عیسائیوں کو اپنی آبادی میں گرجا بنانے کی ممانعت نہ تھی، چنانچہ جب فسطاط مصر میں عیسائیوں نے ایک نیا گرجا بنایا، اور فوج نے اس کی مخالفت کی تو حضرت سلمہ بن مخلد نے یہ استدلال کیا کہ یہ تمہاری آبادی سے باہر ہے اور اس پر تمام فوج نے سکونت اختیار کیا، (حسن المحاضرہ: ۵/۲) ___ ہارون رشید کے زمانۂ خلافت میں مصر کے گورنر عامر بن عمر نے جب عیسائیوں کو گرجوں کے بنانے کی عام اجازت دینا چاہی تو لیث بن سعد اور عبید اللہ بن لہیعہ سے مشورہ لیا، ان بزرگوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ مصر کے تمام گرجے صحابہ اور تابعین ہی کے زمانے کے بنے ہوئے ہیں۔ (ولاۃ مصر: ۱۳۲)

مسلمانوں نے نہ صرف مذہبی عبادت گاہوں کو قائم رکھا اور ان کی تعمیر کی اجازت دی بلکہ عبادت گاہوں کے اوقاف، عہدے اور ان کے وظیفے بھی برقرار رکھے علامہ شبلیؒ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عمر بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں، اسی طرح بحال رہنے دیں، چنانچہ اس قسم کی جو اراضیات ۱۵۵ھ تک موجود تھیں ان کی مقدار ۲۵؍ ہزار فدان تھی، (مقالات شبلی: ۲۰۲)

علامہ شبلی نے آگے لکھا ہے:

> "حضرت عثمان کے زمانہ میں مرو کا جو پیٹر پارک تھا، اور جس کا

نام Jesujah تھا، اس نے ایران کے لارڈ بشپ (Simeon) کو جو خط لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تھے، ''عرب جن کو خدا نے اس وقت جہاں کی بادشاہت دی ہے، عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں، اور گرجوں اور خانقاہوں کے لئے عطیہ دیتے ہیں'' (حوالۂ سابق:۲۰۵،۲۰۴)

محمد بن قاسمؒ نے جب سندھ کو فتح کیا تو برہمنوں کے ساتھ خصوصی حسن سلوک تہوار وغیرہ سے متعلق ان کی مذہبی تقریبات اور ان کو جودان اور تحائف ملا کرتے تھے، ان سب کو برقرار رکھا۔ (حوالہ، سابق:۲۰۰۳)

یہ اور اس طرح کے بہت سے تاریخی حقائق ہیں جن سے دوسری قوموں کے ساتھ خالص مذہبی معاملات میں بھی مسلمانوں کی رواداری اور فراخ قلبی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، عبادت گاہ خواہ کسی قوم کی ہو، بہر حال اسے خدا کی عبادت و بندگی سے ایک نسبت ہے، اس لئے اس کی بے حرمتی کو ہرگز روا قرار نہیں دیا جا سکتا، اس سے لوگوں کے گہرے جذبات متعلق ہیں، ایسی ناشائستہ حرکتوں سے پوری قوم کو ٹھیس لگتی ہے، اور ان کے قلوب مجروح ہوتے ہیں، اس لئے عبادت گاہوں پر حملہ اور ان کی بے حرمتی اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی غیر شریفانہ حرکت ہے، افسوس کہ سنگھ پریوار نے ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کر کے عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی ایک نئی راہ دکھا دی ہے، اور شر پسند عناصر جذبات سے کھیلنے اور ماحول کو غیر معتدل رکھنے کے لئے اب اسی مذموم طریقہ کا استعمال کر رہے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جو لوگ عبادت گاہوں کے ساتھ زیادتی کے اصل میں مرتکب ہیں وہی مسلمانوں کو انتہاء پسند، اور دہشت گرد کہتے ہیں، اور ان پر مذہبی مقامات کی بے احترامی کا الزام لگاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے سادہ ذہن غیر مسلم بلکہ ناواقف مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک شدت پسند اور مذہب کے معاملہ میں بے مروت اور ناروادار مذہب ہے، کاش! لوگ اسلام کو پڑھیں، اور حقائق کو جاننے کی سنجیدہ کوشش کریں! (۲۸ رجولائی ۲۰۰۰ء)

زنا کی سزا —— موجودہ سماجی ماحول میں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس طور پر بسایا ہے کہ اس میں انسان کی خواہش کے ایک ایک سامان ہیں، لذیذ سے لذیذ غذا ہے، عمدہ سے عمدہ پانی ہے، آنکھوں کو بھانے والے رنگ برنگ کے پھول ہیں، دل کو رجھانے والے آبشار اور جھیلیں ہیں، حسین سے حسین تر انسان ہے کہ اہلِ ہوس جس کے اسیر زلف ہو کر رہ جاتے ہیں، اور کتنی ہی نعمتیں ہیں جن سے انسان کی طرح طرح کی خواہشات متعلق ہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مفادات وخواہشات اور چاہتوں میں تصادم کی کیفیت رکھی ہے، چیز ایک ہے لیکن طلب گار کئی ہیں، خواہش کسی ایک ماہی کی پوری کی جاسکتی ہے، لیکن کتنی ہی خواہشات ہیں جو اس ایک شئی سے متعلق ہیں۔

آخرت کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا، آخرت کی دنیا میں خواہشات بھی ہوں گی اور ہر خواہش کی تکمیل بھی، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اتنی وافر مقدار میں ہوں گی اور اتنی یکسانیت کے ساتھ دستیاب ہوں گی کہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ نہ ہوگا، اور سب سے اہم بات یہ ہوگی کہ گو جنت میں بھی درجات ومراتب کا فرق ہوگا لیکن ہر شخص کو یوں محسوس ہوگا کہ وہی سب سے بہتر حالت میں ہے، یہ احساس اس کے قلب کو پُر سکون رکھے گا، اور احساس محرومی کا کوئی سایہ بھی اس کے سر سے نہ گذرے گا، جنت میں رہنے والوں کے درمیان نہ کوئی تصادم اور ٹکراؤ ہوگا، نہ باہمی نفرت وعداوت، اور اس لئے وہاں جرم کا کوئی محرک بھی نہ ہوگا۔

اس دنیا میں چوں کہ انسان تصادم اور مسابقت کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے، یہی ٹکراؤ نفرت وعداوت اور مخالفت کو جنم دیتی ہے، پھر لوگ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مفادات کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ محروم و ناکام، جو محروم

ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے، اس کے دل میں انتقام اور تشدد کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اور یہی جذبات جرم کی صورت اختیار کرتے ہیں، دنیا میں ہر طبقہ مفادات میں دوسرے طبقہ سے متصادم ہے، غریبوں کو مالداروں سے گلہ ہے، مزدوروں کو آجرین سے شکوہ ہے، رعایا حاکموں اور فرماں رواؤں سے شاکی ہے، یہ تقسیم دنیا میں ہمیشہ قائم رہے گی کہ اسی سے کائنات کی ہمہ رنگی قائم ہے، اس لئے آخرت سے پہلے ایسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو جرم اور جرم کے جذبات سے مکمل طور پر محفوظ و مامون ہو، البتہ جرم کو روکنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور کی جاتی ہیں۔

جرم کو روکنے کے تین محرکات ہیں، اول طبعی شرافت، دوسرے قانون کا خوف، تیسرے آخرت میں جواب دہی کا یقین، اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اصلاً سلامتی اور صالحیت رکھی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے: **کل ولد یولد علی فطرۃ الاسلام**، انسان بہرحال اپنی سرشت کے اعتبار سے درندہ نہیں ہوتا، ظلم و جور اور گناہ پر اس کا ضمیر یقیناً اسے کوستا ہے، اسی لئے جرم پیشہ قاتل نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، گناہوں کا احساس ان کا تعاقب کرتا رہتا ہے، ان کی راتیں بے خواب ہو جاتی ہیں، اور بعض پر تو اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کر لیتے ہیں، بہت سے انسان وہ ہیں جن کو طبعی شرافت اور ضمیر کی آواز گناہ سے روکے رکھتی ہے، گو وہ اسلام اور کسی اور مذہب کے قائل نہ ہوں، وہ دہریہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ نے قلب میں گناہ پر ٹوکنے اور روکنے کی جو صلاحیت دی ہے، وہ اسے تھامے رہتا ہے۔

جرم کو روکنے کا دوسرا مؤثر ذریعہ قانون ہے، اس دنیا میں جب سے انسانوں کی بستی بسی ہے، وہ کسی نہ کسی قانون کا پابند رہا ہے، بہت سے لوگ جو بے ضمیری میں مبتلا ہیں، اور خدا کے خوف سے بھی عاری ہیں، سوائے قانون کے کوئی چیز نہیں جو ان کے ہاتھ کو تھام سکے، اسلام نے بھی کچھ جرائم کے لئے سزائیں مقرر کی ہیں، اور وہ یہ ہیں، زنا، چوری، زنا کی تہمت، شراب نوشی، راہزنی اور ارتداد، ان سے متعلق سزاؤں کو حدود کہتے ہیں، یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق مانے گئے ہیں، اس لئے عدالت یا خود صاحبِ معاملہ بھی

مجرم کو معاف کرنے کا مجاز نہیں، اسلام کے نظام جرم وسزا میں دوسری اہم چیز ''قصاص ودیت'' ہے، یہ قتل اور جزوی جسمانی مضرت رسانی سے متعلق ہے، اس جرم کو بندوں کے حقوق سے متعلق قرار دیا گیا، اس لئے صاحبِ معاملہ یا اس کے اولیاء جرم کو معاف کر سکتے ہیں، اور مال کی کسی مخصوص مقدار پر صلح بھی کر سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو جرائم ہیں ان کی بابت، عدالت اپنی صواب دید سے سزا کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور ملک کی پارلیامنٹ کے لئے بھی ایسے جرائم کے بارے میں قانون سازی کی گنجائش ہے، ان جرائم سے متعلق سزا کو فقہ کی اصطلاح میں ''تعزیر'' کہا جاتا ہے۔

گناہ سے باز رکھنے کا تیسرا سب سے اہم اور سب سے اثر انگیز محرک آخرت کی جواب دہی کا احساس ہے، قانون دن کے اجالے میں انسان کے ہاتھ تھام سکتا ہے، لیکن رات کے اندھیروں اور انسان کے خلوت کدوں تک نہیں پہونچ سکتا، آخرت کی جواب دہی کا احساس ہی ایسی طاقت ہے جو انسان کو اپنی تنہائیوں میں بھی جرم سے باز رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی طبیعت مجرمانہ ہو، اور خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو تو کوئی طاقت نہیں جو اس کو جرم سے روک سکے، وہ اپنی کوتاہ کاریوں کے لئے ہزار تدبیریں نکال لے گا، اور نئے نئے راستے تلاش کر لے گا، اسی لئے قرآن مجید نے جہاں کسی بات سے منع کیا ہے وہاں خوفِ خداوندی اور آخرت کی جواب دہی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

زنا اسلامی نقطۂ نظر سے ''حدود'' میں شامل ہے، غیر شادی شدہ مردوں کے لئے اس کی سزا سو کوڑے ہے، اور شادی شدہ کے لئے سنگسار کرنا، ظاہر ہے کہ یہ نہایت سخت سزا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کے نقصانات بھی بہت شدید ہیں، زنا نہ صرف دامنِ اخلاق کو تار تار کرنے اور مذہبی قدروں کو پامال کرنے کے مترادف ہے، بلکہ یہ ایک پورے خاندان کے عزت وآبرو سے کھیلنا اور اس پر ننگ وعار کا ٹیکہ لگانا ہے، جب ایک مرد کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو یہ فعل عورت کے پورے خاندان کے لئے سماجی اعتبار سے بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے، اور اصحابِ شرافت کے یہاں خود اس مرد کے خاندان کے لئے بھی یہ چیز کچھ کم باعث حیاء نہیں ہوتی، زنا کا سب سے زیادہ نقصان پیدا ہونے

والے بچہ کو پہونچتا ہے، وہ باپ سے محروم رہتا ہے، باپ سے محرومی نہ صرف اس کو اپنی شناخت اور میراث سے محروم کرتی ہے بلکہ قانونی طور پر اس کے اخراجات کا کوئی کفیل بھی باقی نہیں رہتا، اگر کنواری لڑکی کے ساتھ دست درازی کی گئی ہو تو اس کے کنوارپن کا ضائع ہو جانا ایسا نقصان ہے جس کی کسی طور تلافی ممکن نہیں، اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو یہ اس کے شوہر کے ساتھ بھی زیادتی ہے، کہ اس سے اس کے عزت وآبرو کو صدمہ پہونچنے کے علاوہ قریبی زمانہ میں پیدا ہونے والا بچہ کا نسب بھی مشکوک ہو جاتا ہے، اسی لئے اسلام نے زنا کی سزا نہایت سخت مقرر کی ہے۔

اسلام نے یہ اور اس قسم کے جرائم میں جسمانی سزا مقرر کی ہے، کیوں کہ تجربہ ہے کہ جسمانی سزا مجرم پر جس درجہ اثر انداز ہوتی ہے محض قید سے وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا، بلکہ اعداد وشمار کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مجرمین کو جیل بھیجا گیا اپنے ہم پیشہ مجرموں کے ساتھ یکجائی کی وجہ سے ان کے جرم کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے، ۱۹۶۰ء میں مصر میں جرائم کے اعداد وشمار کے مطابق اس سال چوری کے ۷۴۱۹ کیس ہوئے، ان میں صرف ۲۵ر کیس ایسے تھے جن میں مجرم کو پہلی بار یہ سزا مل رہی تھی، باقی تمام ملزمین وہ تھے جو ایک، دو، تین یا اس سے زیادہ دفعہ چوری کی سزا میں جیل جا چکے تھے اور ان میں غالب تعداد ان مجرمین کی تھی جو تین بار سے زیادہ جیل کے چکر لگا چکے تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مجرم نے جتنی سزا پائی اور جتنی بار جیل گیا اپنے ہم پیشہ مجرمین کی صحبت سے اس کے جذبۂ جرم میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اس کے برخلاف جسمانی سزائیں جرم کو روکنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہیں، سعودی عرب میں ۱۹۶۵ء تک چوری کے صرف ۱۲، ایسے واقعات ہوئے تھے، جن میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، لیبیا میں بھی ایک زمانہ میں قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آیا تھا، تو تین سال میں صرف چھ مجرمین کے ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئی، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ جسمانی سزائیں قتل وغیرہ کسی جرم کو روکنے میں جس درجہ مؤثر ہیں محض قید کی سزا اس درجہ جرم کے سدِ باب میں مفید نہیں۔

جبری زنا کے سلسلہ میں اس وقت ایک بحث چھڑی ہوئی ہے، ہمارے وزیر داخلہ

شری لال کرشن اڈوانی اور ریاست کے چیف منسٹر جناب چندرا بابو نائیڈو دونوں کا رجحان ہے کہ اس جرم کی سزا پھانسی ہونی چاہئے، بعض تنظیموں نے اس کی مخالفت کی ہے، اور بعض مسلم تنظیموں اور شخصیتوں نے اس کی تائید کی ہے، غالباً اس لئے کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر سے قریب ہے، لیکن میرے خیال میں یہ مسئلہ اتنا سرسری نہیں، اور کئی نکات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے، اول یہ کہ اسلام جب بھی کسی جرم پر سخت سزا متعین کرتا ہے تو اس جرم کو روکنے کے لئے مناسب ماحول بھی تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جرم کے محرکات اور عوامل کو کم سے کم کر دیا جائے۔ مثلاً یہی زنا کی سزا ہے، تو اس کا دروازہ بند کرنے کے لئے شریعت نے پردہ کے احکام رکھے، محرم اور غیر محرم کے اختلاط کو منع کیا، دفاتر ہوں یا تعلیم گاہیں، یا سواریاں، ہر جگہ اسلامی نقطۂ نظر سے اختلاط کی ممانعت ہے، شراب کو حرام قرار دیا گیا، کیوں کہ نشہ شہوانی تقاضوں کو بے قابو کرنے والی چیز ہے، عورتوں کو برسرِ عام اپنی زیبائش وآرائش کے اظہار سے روکا گیا، دیدہ زیب، چست اور پُرکشش لباس پہن کر باہر نکلنے کی ممانعت فرمائی گئی، کیوں کہ یہ چیزیں انسانی ہوس کو راستہ دکھاتی ہیں، پھر اس ماحول میں زنا کی سخت ترین سزا رکھی گئی۔ دوسرے جو جرم جتنا شدید ہے اس کے لئے قانونِ شہادت کو بھی اسی قدر سخت بنایا گیا، زنا کے لئے چار عینی مرد گواہوں کی گواہی ضروری قرار دی گئی، بشرطیکہ مجرم کو خود اقرار نہ ہو۔

ہندوستان میں اولاً تو جرم کے محرکات کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے، فحش فلموں کا بازار گرم ہے، عریاں ویڈیو کیسٹ ملتے ہیں، ٹی، وی نے حیاء کی چادر اتار پھینکی ہے، فحش لٹریچر کا سیلاب ہے، بے شرمی پر مبنی عشقیہ گانے بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، بے پردگی اور عریانیت نے پورے ماحول کو مسموم بنا دیا ہے، تعلیم گاہوں سے لیکر دفاتر ایک مخلوط نظام کو اپنی ترقی کی علامت تصور کیا جاتا ہے، شراب عام ہے، اور ایک طبقہ کو زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بلکہ غیر شادی شدہ عورتوں سے باہمی رضامندی سے بدکاری کی جائے تو قانون کی نظر میں وہ زنا ہے ہی نہیں، پھر قانون شہادت اتنی بے احتیاطی پر مبنی ہے کہ محض ایک شخص کی گواہی پر بھی اہم سے اہم فیصلے کئے جاتے ہیں، ان حالات میں زنا کی سزا

پھانسی کو قرار دینا میرا خیال ہے کہ کوئی قرین انصاف بات نہ ہوگی، اسی لئے فقہاء نے حدود شرعیہ کے جاری ہونے کے لئے ''دارالاسلام'' کی شرط لگائی ہے، زانی بے شک سخت ترین سزا کا مستحق ہے، لیکن تقاضہ انصاف یہ ہے کہ اس کو جرم سے بچنے کا ماحول دیا جائے، جو ماحول قدم قدم پر گناہ کی دعوت دیتا ہو، اس ماحول میں مجرم کو اس طرح کی سزا دیا جانا یقیناً محلِ نظر ہے، اس لئے حکومت کو چاہئے کہ پہلے ایسے قوانین بنائے جو جرم کے عوامل اور محرکات کو روک سکے، اور ایسے پاکیزہ سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں انسان گناہ کی طرف ہاتھ بڑھانے میں سو دفعہ سوچنے پر مجبور ہو، پھر زنا کی قرار واقعی سزا مقرر کرے!

(۱۵؍ دسمبر ۱۹۹۹ء)

ذبحِ حیوان ـــــ حقائق اور غلط فہمیاں

ادھر چند سالوں سے جیسے بقرعید آتی ہے، فرقہ پرست تنظیمیں حرکت میں آجاتی ہیں اور گاؤ کشی اور جیو ہتیا کے خلاف بیانات شروع ہو جاتے ہیں، بلکہ قربانی کے خلاف ایک مہم سی چلائی جاتی ہے۔ اس سال چوں کہ ۱۰ر ذی الحجہ کو ہی ''جین جینتی'' بھی تھی، اس لئے اس مسئلہ کو نسبتاً زیادہ ہوا دینے کی کوشش کی گئی، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ مرکز میں بی، جے، پی حکومت ہے، گویا چور خود چوکیدار ہے، اس لئے فساد کی آگ سلگنے نہ پائی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی غذا کے لئے جانوروں کا ذبح کرنا نہ مذہب کے خلاف ہے اور نہ بے رحمی ہے، بلکہ یہ ایک فطری ضرورت ہے اور اس سے بہت سے غریبوں کے معاشی مفادات متعلق ہیں، جس کو نظر انداز کر دینا کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلم برادرانِ وطن غیر جذباتی ہو کر ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ جوابی اشتعال کے بجائے دلیل کی زبان میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو سمجھائیں اور ان کو قائل کریں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے، ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔ اس سلسلہ میں اوّل تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے ''جین مذہب'' کے حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ

محض اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت ہے۔ خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے، پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔ رگ وید میں ہے:

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنوایک سو بھینس پکائیں۔ (رگ وید ۷:۱۱:۱۷)

یجروید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجروید، ادھیائے: ۲۰:۷۸) منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

> مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی: ادھیائے ۳: ۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانے تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تارا چند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ گوشت کے انسانی غذا ہونے اور اس مقصد کے لئے ذبحِ حیوان کے جائز ہونے پر نہ صرف یہ کہ مذاہب عالم متفق ہیں، بلکہ تقاضۂ فطرت کے تحت اور عقلی طور پر بھی اس کا حلال ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنا ہے، یعنی یہ ''جیو ہتیا'' کا باعث بنتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو اس بات کا سمجھنا دشوار نہیں کہ کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ مخلوق کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔ غور کرو کہ کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے؟ آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اتارتے ہیں، تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبان حال سے پروانۂ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتے ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے ہوں، ان کا خاتمہ کر دیں، پس ''جیو ہتیا'' کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لئے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں۔ خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے۔ سوامی دیانند جی نے '' آواگمن '' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں: انسان، حیوان اور نباتات، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہے تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہوں۔

پھر انسانی خوراک کا بڑا حصہ جانور ہی سے پورا ہوتا ہے، بعض بہت ٹھنڈے یا بہت گرم صحرائی علاقے ہیں کہ وہاں کھیتی نہیں کی جا سکتی، وہاں گوشت ہی انسانی غذا کے کام آتی ہیں، پھر خود جسم انسانی میں بعض ایسے عناصر ہیں کہ ان کی کمی کو بغیر گوشت کے پورا نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ جانور ایک عمر کو پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، نہ ان سے دودھ حاصل ہوتا ہے اور نہ وہ کسی اور کام آسکتے ہیں، ایسی صورت میں اگر آپ ان کو غذا بنانے کی اجازت نہ دیں تو مویشی کی پرورش کرنے والوں کے لئے وہ بہت بوجھ بن جائیں گے اور غریب کسان جو خود اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے وہ کیوں کر اس بوجھ کو برداشت کر سکیں گے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤ کشی وغیرہ کی ممانعت ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے، بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستے قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے۔ اس کی مثال امریکہ اور یوروپ ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاصی تحدیدات ہیں، لیکن اس کے باوجود یہاں دودھ، گھی زیادہ مہنگے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج دنیا کے مختلف ترقی یافتہ ممالک جانوروں کی افزائش نسل کر کے بڑے پیمانے پر ان کے گوشت برآمد کرتے ہیں اور اس طرح وہ کثیر اقتصادی منافع حاصل کرتے ہیں، اگر ہمارے ملک میں اس پر روک لگادی گئی تو یہ ملک وقوم کو گوشت اور چرم وغیرہ کی برآمدات کے ذریعہ حاصل ہونے والی کثیر آمدنی میں شدید خسارہ کا باعث ہوگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گوشت خوری سے انسان میں تشدد اور اہنسا کا مزاج بنتا ہے اور یہ انسان پر منفی اخلاقی اثر ڈالتا ہے، لیکن دنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے۔ آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں۔ رہنمایان عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح کو عدم تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ بھی گوشت خور تھے۔ گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے بلکہ دم آخر میں بھی گوشت کھا کر ہی ان کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بھی بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا، اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے۔ جب تک دلوں کی دنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جواب دہی کا احساس نہ ہو تو محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۲/اپریل ۱۹۹۹ء)

قانون شریعت، رحمت نہ کہ زحمت

ماں باپ اپنے بچوں کی فطرت اور ان کی ضروریات سے سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور شیر خوار بچوں کے اشاروں کو سمجھنے میں بھی انہیں مشکل نہیں ہوتی، یہ تو خیر انسان ہیں، جانور اور حیوانات، جو گویائی سے بھی محروم ہیں اور جن کو اشارہ کی بھی زبان نہیں آتی، ان کے مالکان اور پرورش کرنے والے بھی ان کی عادات وضروریات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اس بستی میں بسنے والی تمام مخلوقات اور کائنات کا حاصل ''حضرت انسان'' کی ضروریات، جذبات، مصالح ومفاسد اور عادات واطوار سے اس سے زیادہ واقف ہوگا؛ اس لئے خود خالق کائنات انسان کے لئے جتنے بہتر اُصولِ زندگی اور جتنا مناسب قانونِ حیات وضع کرسکتا ہے، یقیناً کوئی اور طاقت نہیں کرسکتی، نظامِ زندگی کو مرتب کرنے کے لئے علم کی ضرورت ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی علیم نہیں اور اس کے لئے قوتِ فیصلہ اور دانائی مطلوب ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے، ''اَلا لَهُ الْحُكْمُ'' (انعام:۶۲)

اللہ تعالیٰ نے جس طرح دنیا میں انسان کے کھانے پینے، لباس و پوشاک اور دوسری ضروریات کا نظم کیا ہے، اسی طرح اس نے انسان کو اپنے نظامِ زندگی کے بارے میں بھی اندھیرے میں نہیں رکھا؛ کیوں کہ ایک شخص یا چند اشخاص کا ایک گروہ پوری انسانیت کے جذبات، ضروریات اور فطری تقاضوں سے آگاہ نہیں ہوسکتا اور اس سے اس بات کی بھی اُمید نہیں کی جاسکتی کہ مختلف انسانی طبقات میں مفادات کا جو ٹکراؤ ہے اور جس سے بحیثیتِ انسان خود اس کے مفادات بھی متعلق ہیں، وہ ان کے درمیان عدل اور

انصاف سے کام لے سکے گا، اسی لئے خدا کے رب اور رحمٰن ورحیم ہونے کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زندگی گذارنے اور جینے اور مرنے کا طریقہ بھی بتائے۔

اسی طریقہ کی رہنمائی کے لئے ہر دور میں اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے، حضرت آدم علیہ السلام جہاں پہلے انسان تھے، وہیں انسانوں کے بیچ خدا کے پہلے پیغمبر بھی تھے، یہ سلسلہ آخری پیغمبر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لئے جو قانون بھیجا جاتا رہا، اسی کو ''شریعت'' کہتے ہیں، انسان کا ابتدائی دور چوں کہ علمی اور تمدنی ناپختگی کا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ اسی زمانے کے احوال کے لحاظ سے احکام دیتے رہے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس عہد میں تشریف لائے، جب انسان اپنے تہذیبی، تمدنی اور علمی کمال وپختگی کے مرحلہ میں قدم رکھ چکا تھا؛ اس لئے آپ کو وہ احکام دیئے گئے، جو قیامت تک باقی رہیں گے، جیسے ایک انسان کے جوان ہونے تک جسم میں بڑھوتری جاری رہتی ہے اور سال ڈیڑھ سال پر اس کے کپڑے تنگ ہونے لگتے ہیں؛ لیکن جب آدمی پوری طرح جوان ہو جائے تو اب جسم کی افزائش تھم جاتی ہے اور اس وقت وہ جو بھی کپڑے سلوائے، آئندہ چھوٹے نہیں پڑتے، اسی طرح شریعتِ محمدی اس وقت دُنیا میں آئی، جب انسان کی صلاحیت اپنے آخری مرحلہ پر آ گئی، اسی لئے یہ شریعت ہمیشہ کے لئے ہے اور کبھی انسان اس میں تنگ دامانی کا احساس نہیں کرے گا، قرآن کی زبان میں اسی کا نام ''اکمالِ دین'' اور ''اتمام نعمت'' ہے۔ (مائدہ:۳)

یہی خدا کا بھیجا ہوا نظامِ حیات ہے، جو ''شریعتِ الٰہی'' یا ''اسلامی قانون'' کہلاتا ہے، یہ قانون فلاسفۂ یونان کے افکار کی طرح محض ''نظریہ'' نہیں، جس کا خواب دیکھا جاتا ہے اور اس کی تعبیر کبھی دیکھنے میں نہ آئے اور نہ یہ اشتراکی نظامِ زندگی کی طرح کوئی ایسا قانون ہے کہ ستر سال کی معمولی سی مدت اسے بے نام ونشان کر دے؛ بلکہ یہ ایک ایسا متوازن، معتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے، جس نے کم وبیش ایک ہزار سال ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے بڑے حصہ پر حکمرانی کی ہے، مختلف تہذیبوں اور سماجی اکائیوں کا سامنا کیا ہے اور نہایت ہی خوبی کے ساتھ ہر عہد کے مسائل کو حل کیا

ہے، دُنیا میں جب بھی اس قانون کی آزمائش کی گئی، اس کی افادیت قانونِ فطرت سے مطابقت اور امن وسلامتی پیدا کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے، بدقسمتی سے خلافتِ عثمانیہ، ترکی کے سقوط کے بعد سے اسلام کی حکمرانی کا دائرہ مساجد اور زیادہ سے زیادہ سماجی زندگی کے کچھ مسائل تک محدود کر دیا گیا؛ لیکن آج بھی دُنیا کے بعض ملکوں: سعودی عرب، افغانستان، سوڈان اور ایران میں اسلامی قانون کے اطلاق کو کسی حد تک وسعت دی گئی ہے، وہاں لوگ اس کی افادیت کا احساس کر رہے ہیں اور امن وسلامتی کی ٹھنڈی چھاؤں اسلام کی برکت سے ان کو حاصل ہے۔

اسی حساس نے گذشتہ چند سالوں میں خاص طور پر ایشیاء وافریقہ میں کروٹ لی ہے اور بعض ملکوں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کا اتنا شدید دباؤ ہوا، جسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا، وہاں بتدریج ان قوانین کو نافذ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، ایران اور سوڈان اس کی مثالیں ہیں، ان دونوں ممالک کو تو عرصہ سے بنیاد پرستی اور رجعت پسندی کا طعنہ دیا ہی جارہا تھا، جب طالبان نے افغانستان میں حیرت انگیز فتوحات پائیں اور ایک ایسے ملک کو، جو سخت بدامنی اور غارت گری کا شکار تھا، امن سے سرفراز کیا اور وہاں کے باشندوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد لاقانونیت اور خانہ جنگی سے امن وامان اور قانون وآئین کی طرف واپس ہوئے ہیں، تو پھر ایک نیا پروپیگنڈہ شروع ہوا اور ذرائع ابلاغ میں ان کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کے افسانے تراشے جانے لگے۔

ابھی دو تین ہفتہ پہلے اچانک وزیر اعظم پاکستان جناب نواز شریف نے شریعت بل کا اعلان کیا، جس کے تحت پاکستان میں قرآن وحدیث کو سب سے بالاتر قانون تسلیم کیا جائے گا، یہ اعلان کس قدر اخلاص پر مبنی ہے؟ اس کا علم تو خدا ہی کو ہے! یہ ملک اسلام ہی کے نام پر بنا اور اسلام ہی کا نام لے کر مختلف حکمرانوں نے اقتدار کی سیڑھیاں طے کیں؛ لیکن حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں وہ پرسنل لا تک محفوظ نہیں، جس کو کسی درجہ ہندوستان میں دستوری تحفظ حاصل ہے، بظاہر اس قسم کا اعلان محض حکمرانوں کی گرتی ہوئی

ساکھ کو اونچا اٹھانے کی ایک تدبیر ہے، تاہم بعض دفعہ شر سے بھی خیر پیدا ہوتا ہے، اگر اس بہانہ بھی یہ بل پاس ہو جائے تو ایک خوش آئند بات ہوگی۔

لیکن اس اعلان نے بھی ایک بار مغرب اور مشرق کو چونکا دیا اور بعض لوگ اس طرح اس کے خلاف پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ گویا کوئی خوفناک زلزلہ یا طوفان آنے والا ہے، حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بی جے پی گورنمنٹ، جو خود 'رام راج' کا نعرہ لگاتی ہے اور ہندو راشٹر کا خواب دیکھتی ہے، وہ بھی اسے مذہبی بنیاد پرستی کا نام دے رہی ہے، اس طرح کے بیانات سے عام لوگوں میں غلط فہمی کی فضاء قائم ہوتی ہے اور لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ واقعی یہ کوئی ''ڈراؤنی'' چیز ہے؛ حالاں کہ اگر حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو یہ ایک اچھی خبر ہے، نہ کہ بری اور انسانیت کے مفاد میں ہے، نہ کہ ان کے لئے نقصان اور پریشانی کا باعث۔

اسلامی شریعت کا اصل امتیاز دو باتیں ہیں: عدل اور اعتدال، عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی صلاحیت کے لحاظ سے متعین کی جائے، جیسے ملک کا دفاع، امن و امان کا قیام اور اس طرح کی ذمہ داریاں مردوں سے متعلق ہوں گی؛ کیوں کہ وہی اس کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُمورِ خانہ داری کی انجام دہی اور بچوں کی پرورش عورتوں کے ذمہ رہے گی؛ کیوں کہ وہ ان کاموں کو زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکتی ہیں، اعتدال سے مراد یہ ہے کہ حقوق و فرائض کی تعیین میں افراط و تفریط نہ ہو جائے، جیسے یہی خواتین کے حقوق کا مسئلہ ہے، بعض قوموں نے عورتوں کو اس درجہ گرایا کہ ان کو انسانیت کی آخری صف میں بھی جگہ نہیں دی اور بعض نے اتنا اونچا اٹھایا کہ جن ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی، وہ ذمہ داریاں بھی ان سے متعلق کر دیں، یہی حال مزدوروں کے معاملہ میں ہوا، کچھ لوگوں نے مزدوروں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بنا دیا اور کچھ لوگوں نے کہا کہ حکمرانی مزدوروں ہی کا حق ہے، اس افراط و تفریط نے ہمیشہ سماج کو نقصان پہنچایا ہے، شریعتِ اسلامی کا اصل امتیاز یہی ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کے قوانین تقاضۂ عدل کو پورا کرتے ہیں اور افراط و تفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، خود حدود و

قصاص کے قوانین، جو جرائم اور سزاؤں سے متعلق ہیں، کو بنظر انصاف دیکھا جائے تو نہایت متوازن اور قانونِ فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

عام طور پر ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ اسلامی قانون قریب ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس درمیان دُنیا کتنی ہی معاشی، سماجی اور سیاسی تغیرات سے گذر چکی ہے، جو انسان بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا، اب ہوا کے دوش پر اُڑتا ہے اور سمندر کی تہوں میں غواصی کرتا ہے، ایسے فرسودہ عہد کے قوانین اس ترقی یافتہ اور متمدن عہد کے لئے کیوں کر کفایت کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ خیال محض غلط فہمی پر مبنی ہے، دراصل انسان سے دو چیزیں متعلق ہیں: ایک اس کی فطرت، دوسرے وہ وسائل و ذرائع، جو اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں، غور کیا جائے تو جو کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان سب کا تعلق اسباب و وسائل کی دُنیا سے ہے، انسان کی فطرت اور اس کے اندرون میں کوئی تبدیلی نہیں، پکوان کے طریقے ضرور بدل گئے ہیں، کھانے پینے کا ڈھنگ ضرور بدلا ہے؛ لیکن بھوک و پیاس جیسے ہوتی تھی ویسے اب بھی ہے، انسان نے تلوار اور تیر کی جگہ ایٹم بم اور میزائیل بنالیا ہے؛ لیکن اس کے پس پردہ جو جذبۂ انتقام و مدافعت پہلے کارفرما تھا، اب بھی یہی حال زندگی کے تمام شعبوں میں ہے۔

اسلامی قانون کا اصل موضوع انسانی فطرت ہے، نہ کہ اسباب و وسائل، وہ انسان کی فطری خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ طاقت کا استعمال ظلم کو دور کرنے کے لئے کرو، نہ کہ خود ظلم کرنے کے لئے، وہ کہتا ہے کہ دولت غریبوں کے گھر چراغ روشن کرنے پر صرف کرو، نہ کہ اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے، وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی اور فکری قوت انسان کی فلاح و بہود کے لئے خرچ کرے، نہ کہ انسان کے لئے ہلاکت خیز وسائل کی ایجاد میں، وہ چاہتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا استعمال سچی حقیقتوں کے اظہار اور سچائی کی مدد کے لئے ہو، نہ کہ جھوٹے پروپیگنڈے اور سچائی کو دبانے کے لئے؛ اس لئے جوں جوں وسائل و اسباب کی دُنیا میں ترقی ہوتی جائے گی، اسلامی قانون کی اہمیت اور ضرورت بھی اسی نسبت سے بڑھتی جائے گی، یہی وجہ کہ آج دنیا کا کوئی قانون نہیں، جس نے اسلام سے خوشہ چینی نہ کی ہو، خاص کر سماجی قانون میں تو

اسلامی قانون سے اتنا فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ اس کا شمار نہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں کہیں اور جس قدر اسلامی شریعت سے اعراض اور گریز کا راستہ اختیار کیا گیا، وہاں اسی قدر لوگ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

اس لئے اسلامی شریعت کا نفاذ ایک رحمت ہے، نہ کہ زحمت، اس سے نہ کسی کو خطرہ ہے اور نہ اس پر دُنیا کو اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت، حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا رحمت اور امن وسلامتی ہے، مسلمانوں کے لئے بھی مسلم ممالک کی غیر مسلم اقلیتوں کے لئے بھی اور ان کے پڑوسیوں کے لئے بھی، خدا کرے کہ کچھ مسلم ممالک اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی زمین پر صرف خدا کی رضا کے لئے قانونِ شریعت کو اس کی تمام وسعتوں کے ساتھ، مصلحت اور حکمت کی رعایت کرتے ہوئے نافذ کریں، اگر واقعی انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسا تجربہ ہوگا، جس سے دنیا سبق لے گی اور بہت سی زبانیں جو محض عناد اور حسد سے کھلتی ہیں، گنگ ہو جائیں گی!

(۱/۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

راہِ عمل (۳)

نئے مسائل
اسلامی نقطۂ نظر

جس میں موجودہ دور میں پیش آنے والے جدید وقدیم مسائل پر دعوتی وتذکیری اُسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔

تالیف
مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اُردو بازار، کراچی

کتاب کا نام ــــــــ راہِ عمل
نئے مسائل اسلامی نقطۂ نظر

تاریخ اشاعت ــــــ جون ۲۰۰۹ء

مطبع ــــــــ احباب زمزم پبلشرز

ناشر ــــــــ زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-2760374

فیکس: 021-2725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- دارالھدیٰ اردو بازار کراچی۔ فون: 2726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور

Madrassah Arabia Islamia
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton
BI1 3NE U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

Azhar Academy Ltd.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

فہرست مضامین

پیش لفظ

اس حقیر کے مضامین کا مجموعہ ''راہ عمل'' کا یہ تیسرا حصہ ہے، اس حصہ میں زیادہ تر موجودہ دور میں پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے، خواہ وہ نئی ایجادات کا نتیجہ ہوں، یا سماجی اور معاشی اقدار میں تبدیلیوں کا، ان میں بعض وہ مسائل بھی آگئے ہیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے جدید نہیں ہیں، لیکن وقتاً فوقتاً پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہیں، جیسے قنوت نازلہ اور نماز استسقاء وغیرہ، چوں کہ ان کی نوبت گاہے گاہے پیش آتی ہے، اس لئے لوگوں کو ان سے متعلق شرعی احکام واضح کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قارئین کو یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ یہ مضامین اخبارات کے لئے لکھے گئے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگ استفادہ کریں، اس لئے ان تحریروں میں علم وتحقیق اور طویل عربی عبارتوں کے بجائے دعوتی اور تذکیری اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اور عربی عبارتوں سے گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اس بات کی بھی سعی کی گئی ہے کہ مسائل کو خشک قانونی زبان میں بیان کرنے کے بجائے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو بھی واضح کیا جائے، تاکہ دل کے ساتھ دماغ بھی اسے قبول کرنے کو تیار ہو۔

اس مجموعہ کی ترتیب کے سلسلہ میں عزیزی گرامی قدر مولوی محمد نعمت اللہ قاسمی زادہٗ اللہ علماً نافعاً وعملاً صالحاً مقبولاً کا مجھے بھی شکر گذار ہونا چاہئے اور قارئین کو بھی، کہ انہوں نے ایک تو مختلف جگہوں سے ان مضامین کو اکٹھا کرنے کی زحمت اٹھائی اور نہایت ہی خوش سلیقگی کے ساتھ اسے مرتب کیا، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں زیادہ سے زیادہ دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق میسر فرمائے، اور یہ مجموعہ اس حقیر کے لئے بھی اور عزیزی سلمہٗ کے لئے بھی دنیا وآخرت میں فلاح کا باعث بنے۔ آمین۔

۱۲ شعبان ۱۴۲۵ھ

خالد سیف اللہ رحمانی

۱۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

خادم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

عرض مرتب

مذہب اسلام کی اگر چند امتیازی خصوصیات کو شمار کیا جائے، تو ان میں اس کی فطرت انسانی سے ہم آہنگی اور ہر دور اور زمانہ میں انسانیت کو درپیش مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے معمور ہونے کی خصوصیت سرفہرست ہوگی، چنانچہ انسانی تاریخ کی یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام نے جس طرح آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ دنیا تمدنی ترقی کے اعتبار سے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ لوگوں کے مسائل کو حل کیا اور انہیں شاہراہ زندگی پر چلنے کا سلیقہ سکھایا، اسی طرح آج جب کہ دنیا صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں اپنی معلوم تاریخ میں ترقی کی آخری انتہاء کو پہونچ رہی ہے، اسلام اسی طرح انسانیت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اسلام نے اپنے بنیادی عقائد و احکام میں جن چیزوں کا حکم دیا ہے، شریعت کے تفصیلی احکام انہیں بنیادی اصول اور ہدایات کی تطبیق سے عبارت ہیں، کیوں کہ قانون کی پاسداری انسانی فطرت اور اس کا امتیاز ہے اور یہی انسانوں اور جانوروں کے درمیان امتیاز کا ایک بنیادی اور اہم پہلو ہے، چنانچہ جن لوگوں نے اس فطری مذہب اور خدائی قانون کو قبول کرنے سے انکار کیا، اللہ کی کتاب انہیں "جانور بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ" (اولئك كالأنعام بل هم أضل) سے تعبیر کرتی ہے کہ جانوروں کو کسی قانون یا طرز حیات کی ضرورت نہیں۔

اسلام کے دو بنیادی سرچشمے کتاب اللہ (قرآن مجید)، سنت نبوی (حدیث) میں ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام مسائل کے بارے میں شرعی حکم کی صراحت نہیں ملتی اور یہی عین قرین مصلحت ہے، کیوں کہ زمانہ اور حالات کے لحاظ سے قانون کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں، لیکن ان میں ایسے اصول و قواعد ضرور بیان کر دیئے گئے ہیں، جن کی

روشنی میں صبح قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور علماء — جنہیں انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے — کی ذمہ داری ہے کہ شریعت کے رہنمایانہ اصول وقواعد اور مزاج و مذاق کی روشنی میں جدید مسائل کا حل نکالیں، نئے مسائل کا حل تلاش کرنے والے علماء کے لئے بیک وقت جہاں نصوص شرعیہ پر گہری نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، وہیں فقہاء کی بیان کردہ جزئیات کے ساتھ ساتھ ان کے مستنبط کردہ اصول و قواعد سے مکمل آشنائی بھی اسی قدر اہمیت رکھتی ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی نظر اپنے عہد کے حالات اور رواجوں پر بھی ہو۔ مؤلف کتاب حضرت مولانا ہمیشہ ہم لوگوں سے تاکید کرتے کہ فقہاء کی جزئیات تو اپنے حالات وزمانہ کے تابع ہوتی ہیں، آپ کی نظر اصول وقواعد پر ہونی چاہئے، جن پر حالات وزمانہ کا بہت کم اثر ہوتا ہے، مولانا مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے فقہ اسلامی میں جو نہایت اعلیٰ مقام عطا کیا ہے، وہ محتاج بیان نہیں، فکر رسا، ذہن اخاذ اور فکری اعتدال کی صفت سے اللہ نے آپ کو خاص طور پر نوازا ہے، جو اس فن کے حاملین کے لئے خضر طریق کا درجہ رکھتی ہیں، چنانچہ فقہ اسلامی سے متعلق آپ کی تحریریں جہاں علماء کے لئے سامان آسودگی فراہم کرتی ہیں، وہیں عوام بھی زبان وتعبیر کے سہل وعام فہم ہونے کی وجہ سے اس سے اسی قدر استفادہ کرتے ہیں، جدید فقہی مسائل (پانچ حصے) قاموس الفقہ (پانچ جلدیں)، اسلام کا نظام عشر وزکوۃ، آپ کی وہ تصنیفات ہیں، جو یقیناً فقہ اسلامی کی لائبریری میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں اور بہت ہی مختصر مدت میں برصغیر کے افق پر نیر تاباں بن کر چھا گئی ہیں۔

پچھلے چھ سالوں سے ہندوستان کے کثیر الاشاعت روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے جمعہ ایڈیشن مینارۂ نور میں شمع فروزاں کا کالم آپ کے قلم گہربار سے مزین ہوتا آرہا ہے، جس میں کبھی سماجی مسائل کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے، تو کبھی قارئین کو حالات کے پس منظر میں صحیح سمت رہنمائی کی جاتی ہے، اور کبھی آپ اپنے فطری فقہی

ذوق کی مناسبت سے نئے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو باخبر کرتے ہیں، فقہی مضامین اس لحاظ سے بھی اسلامی قلم کاروں کے لئے نمونہ ہیں کہ علم و تحقیق کی رعایت کے ساتھ سہل اور بہتر اسلوب تحریر اختیار کیا جائے کہ جس سے عوام و خواص دونوں کو استفادہ میں سہولت ہو۔

یہ کتاب جو ابھی آپ کے ہاتھوں میں ہے، ان ہی فقہی مضامین کا گلدستہ ہے، جس کے غنچۂ وگل "منصف" کی سرزمین پر تھے، راقم الحروف نے ان بکھرے ہوئے پھولوں کو مختلف لائبریریوں سے جا کر منصف کی قدیم فائلوں سے اکٹھا کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس درمیان احقر خود بھی ان گلہائے سدا بہار کی خوشبو سے عطر بار اور شادکام ہوا ہے، یقیناً راقم اپنے لئے افتخار وسعادت کا باعث سمجھتا ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کا سایہ تادیر قائم رکھے، اور یہ کتاب خدا کی بارگاہ میں قبولیت سے نوازی جائے اس کا فیض عام سے عام ہو، اور مصنف کے ساتھ ساتھ احقر کے لئے بھی ذریعہ نجات بنے۔ آمین۔

محمد نعمت اللہ قاسمی

(اسکالر معہد)

بنیادی انسانی حقوق کا اولین منشور

بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی لڑائیاں ہوئیں، جو جنگِ عظیم کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے، چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شبِ تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی اور وہ یہ کہ مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے یہ آواز اٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ وامن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو۔ بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی پس منظر میں ۱۰ر دسمبر کو عالمی سطح پر ''بنیادی انسانی حقوق'' کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ہر چند کہ یہ منشور عملاً ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں۔ دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جاسکے، لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی کامیابی ہے اور اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس میں جو کچھ خامیاں ہیں وہ بتدریج دور ہوسکیں گی۔

یہ منشور تیس دفعات پر مشتمل ہے، جن میں زندگی کا حق، آزادی اور وقار و حقوق کے معاملہ میں مساوات، نسل و رنگ، جنس، زبان اور مذہب کی بناء پر عدمِ تفریق، قانونِ مساوات، عدالتی چارہ جوئی کا حق، بلا جواز گرفتاری یا جلاوطنی کی ممانعت، الزامات کے مقابلہ صفائی کا حق، نجی زندگی کے تحفظ کا حق، ملک کی حدود میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی، بیرونِ ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے، شہریت حاصل کرنے، اپنی مرضی سے شادی کرنے، تنہا یا مشترک جائداد رکھنے، ضمیر و عقیدہ اور تبدیلیٔ مذہب، اظہارِ خیال اور اجتماع و تنظیم، اپنے ملک کی سیاست میں حصہ داری، اپنی پسند کے پیشہ کا انتخاب، حصولِ تعلیم وغیرہ کے حقوق کا ذکر ہے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خواتین اور بچوں کے حقوق، نیز نسلی امتیاز اور غلامی کے انسداد کے لئے بھی اقوام متحدہ نے مختلف قرار دادیں منظور کی ہیں، جو گویا اسی منشور کا تکملہ ہیں۔

اگر واقعی دیانت داری کے ساتھ اس منشور کا نفاذ عمل میں آتا، تو یہ انسانیت کے لئے بارانِ رحمت ثابت ہوتا، لیکن افسوس کہ ایسا ہو نہیں پایا، ایک تو یہ تحریک ہی رضا کارانہ ہے، دوسرے مختلف ملکوں نے انسانی حقوق کے الگ الگ پیمانے قائم کر لئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی بے بسی کا کھلا ہوا ثبوت ماضی قریب ہی میں یورپ کے قلب ''بوسنیا'' میں ساری دنیا نے دیکھا ہے۔ ۳۰/نومبر ۱۹۷۳ء کو جب اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسلی امتیاز کو قابل سرزنش جرم قرار دینے کی غرض سے ایک تجویز پاس کی، تو امریکہ اور برطانیہ بھی اس تجویز کے مخالفین میں تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خود قانون بنانے والوں کی نگاہ میں ان حقوق کی کیا اہمیت ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج کل یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کو ڈرانے، دھمکانے اور ان کا استحصال کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔

مسلمانوں کی تصویر آج کچھ اس طرح مسخ کر دی گئی ہے کہ لوگ ''مسلمان'' اور ''دہشت گرد'' کو مترادف الفاظ تصور کرنے لگے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اسلام میں انسانی قدروں کے احترام کا کوئی تصور نہیں ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ علم و دانش کی موجودہ

دُنیا کو انسانی حقوق کا سب سے پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا اور آج دُنیا میں جو کچھ انسانی حقوق کی بات کی جارہی ہے، وہ دراصل اسلام کے عقیدۂ توحید اور مساواتِ انسانی کے تصور کی بازگشت ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو جامع خطبہ ارشاد فرمایا تھا ، وہ بنیادی انسانی حقوق کے لئے متن کا درجہ رکھتا ہے۔ اس خطبہ کے چند اقتباسات کچھ اس طرح ہیں:

○ لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ تقویٰ شعار ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر تقویٰ کے سوا فضیلت نہیں۔ ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں اور جاہلیت کے تمام آثار و مفاخر ختم کئے جاتے ہیں، صرف سدانہ (کعبہ کی نگرانی و نگہبانی) اور سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانے) کے عہدے باقی رہیں گے۔

○ قتل عمد کا بدلہ قصاص ہے، عمد کے مشابہ وہ قتل ہے جو لاٹھی یا پتھر سے وقوع میں آئے ، اس کی دیت سو اونٹ مقرر ہے، جو زیادہ چاہے گا وہ اہلِ جاہلیت میں سے ہوگا۔ اہلِ قریش! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمہاری گردنوں پر دُنیا کا بوجھ لدا ہوا ہو، جب کہ دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں اور اگر ایسا ہوا تو میں خدا کے سامنے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا، اہل قریش! خدا نے تمہاری جھوٹی نخوت کو خاک میں ملا دیا ہے اور باپ دادا کے کارناموں پر تمہارے لئے تفاخر کی کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

○ لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال تمارے لئے حرام (محترم) ہیں، یہاں تک کہ قیامت میں خدا کے سامنے پیش ہو، جس طرح اس دن اور اس مہینے کی حرمت تمہاری نزدیک مسلم ہے، اور عنقریب تم سب خدا کے آگے جاؤ گے، پس وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس فرمائے گا۔

○ تمام سودی کاروبار آج سے ممنوع قرار پاتا ہے، البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے، جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے اور نہ تمہارا۔ اللہ نے یہ بات طے کردی ہے کہ سود کی گنجائش نہیں اور جہاں تک عباس (ابن عبد المطلب) کے سود کا تعلق ہے، تو میں ان

تمام سود کو باطل کرتا ہوں، اور زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں اور (اپنے خاندان میں سے) پہلا انتقام جسے میں معاف کرتا ہوں ربیعہ بن الحارث کے دودھ پیتے بچے کا، جسے بنو ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔

○ قرض قابلِ ادائیگی ہے، عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہئے، تحفہ کا بدلہ دینا چاہئے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے تو اسے تاوان ادا کرنا چاہئے۔

○ لوگو! تمہارے اوپر جس طرح تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں اسی طرح ان پر تمہارے کچھ حقوق واجب ہیں، عورتوں پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ سلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی بے حیائی کا کام نہ کریں، پس اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو اور ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو، پھر اگر وہ باز آجائیں تو (حسبِ حیثیت) ان کا کھانا، کپڑا تمہارے ذمہ ہے۔ پس عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور ان سے بہتر سلوک کرو، کیوں کہ وہ تمہاری پابند ہیں اور خود اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں، تم نے ان کو خدا کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اسی کے نام پر وہ تمہارے لئے حلال ہوئی، اور کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی کو دے۔

○ لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جو اس کا بھائی برضاء ورغبت عطا کر دے۔ اپنے نفس اور دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔

○ اور ہاں تمہارے غلام! ان کا خیال رکھو، جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ، جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ، اگر وہ کوئی ایسی خطا کریں جسے تم معاف نہ کرنا چاہو تو اللہ کے بندو! انہیں فروخت کر دو اور انہیں سزا نہ دو۔

○ لوگو! سنو اور اطاعت کرو، اگر چہ تم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی کیوں نہ امیر بنا دیا جائے، جو تم پر کتاب اللہ کو قائم کرے۔

غور کیا جائے تو آپ ﷺ کا یہ خطبہ بنیادی انسانی حقوق کا اصل منشور ہے، جس

میں انسانی مساوات، جرم وسزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال وجائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان واظہار ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو محض کاغذی پیرہن عطا نہیں کیا، بلکہ اس کو برت کر دکھایا، کمزوروں کی دادرسی کی اور پست کو بلند کیا۔ قرآن وحدیث میں اور پھر قرآن وحدیث سے اخذ کر کے کتب فقہ میں انسانی بنیادی حقوق کو اتنی وضاحت وتفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے اوران کو سامنے رکھ کر ایک پورا قانونی ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے کہ شاید کہیں اوراس کی مثال مل سکے۔ اسلام نے حقوق کو صرف دنیا ہی سے متعلق نہیں رکھا، بلکہ ان حقوق کی ادائیگی اور عدم ادائیگی سے آخرت کے احتساب کے تصور کو بھی وابستہ رکھا۔ یہ تصور انسان کو ان حقوق کے بارے میں زیادہ سنجیدہ بناتا ہے، اس لئے اگر دنیا کو واقعی انسانی حقوق کی پاسداری مطلوب ہے، تو اسے اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کہ اسلام کسی ایک قوم کی میراث نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی امانت ہے۔

(۱۱/دسمبر ۱۹۹۸ء)

بین قومی اتحاد ــــــــ اسلام کی نظر میں

دنیا میں دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء جاری رہی، اس جنگ نے پوری دنیا کی کمر توڑ دی، مفتوحین تو کیا فاتحین کے بھی ہوش ٹھکانے لگ گئے، نہ جانے، کتنی بے قصور جانیں جنگ کے اس مہیب وخوں آشام عفریت کی غذا بن گئیں، نازیوں کی یہود دشمنی میں کتنے یہود کام آئے؟ اس کی صحیح تعداد جاننا مشکل ہے، اڑسٹھ لاکھ سے زیادہ تو وہ یہودی تھے جن کو گیس چیمبروں میں ڈال کر فنا کردیا گیا، یہ گویا ایک پوری قوم اور نسل کو تہہ تیغ کردینے کی شیطانی سازش تھی، ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر اب تک کی تاریخ میں اور آخری بار ایٹم بن گرایا گیا، اس سے ہونے والی تباہ کاری یہودیوں کی نسل کشی سے بھی آگے بڑھ گئی اور افسوس کہ یورپ نے اس واقعہ پر افسوس کرنے کی بجائے چراغاں کئے اور خوشیاں منائیں، آخر اگست ۱۹۴۵ء میں یہ جنگ اختتام کو پہونچی، اس سے پہلے ۲۴؍ جون ۱۹۴۵ء کو ۵۰؍ ممالک کے نمائندوں نے بین الاقوامی امن اور صلح کی غرض سے سان فرانسکو میں ایک اجتماع منعقد کیا تھا، اب چار ماہ بعد ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اگلا اجلاس منعقد ہوا، جس میں اقوام متحدہ کے منشور پر پچاس ممالک نے دستخط کئے، اور اس طرح ادارہ ''اقوام متحدہ'' کا وجود عمل میں آیا، اقوام متحدہ اس نوعیت کا پہلا ادارہ نہیں تھا، بلکہ اس سے پہلے ۱۹۱۹ء میں صدر امریکہ مسٹر ویلن کی تحریک پر لیگ آف نیشنس (مجلس اقوام) قائم ہوچکی تھی، جس میں دنیا کے پچیس ممالک شامل تھے، لیکن دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے عملاً اس تنظیم کا خاتمہ ہوگیا، اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ نے اس کی جگہ لی، اب اس وقت اقوام متحدہ کی رکن ممالک کی تعداد ایک سو پچاسی ۱۸۵ تک پہونچ چکی ہے، گو عملاً یہ عالمی تنظیم محض پانچ ممالک، امریکہ، برطانیہ، چین، روس اور

فرانس کی یرغمال ہے، لیکن بہر حال عالمی سطح پر انسانی مسائل حل کرنے کے لئے ادارہ کا وجود ایک ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد ظاہر ہے کہ عالمی سطح پر انصاف کا حصول، قوموں کو قانون جنگ کا پابند رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ اور متصادم اقوام وممالک کے درمیان صلح و صفائی کی کوشش، نیز انسانی بنیادوں پر مصیبت زدہ انسانوں کی مدد کرنا ہے، گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اقوام متحدہ ان مقاصد کو حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے؟ اور کیا طاقت ور ممالک کو بھی عدل وانصاف کا پابند بنانے میں اس نے کامیابی حاصل کی ہے؟ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہایت اہم اور اعلیٰ مقاصد ہیں، اور موجودہ حالات میں جب کہ پوری دنیا ایک گھر بن چکی ہے، بہ مقابلہ پہلے کے اس کی اہمیت کہیں بڑھ گئی ہے، اس پس منظر میں ہمیں دیکھنا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایسی بین قومی وحدت کی کیا اہمیت ہے؟ اور اسلام اس سلسلہ میں کیا تصور رکھتا ہے؟۔

امن وامان کا قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی اسلام کے اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآن کی جس آیت میں عدل واحسان کا حکم دیا گیا ہے، اس کو خطبۂ جمعہ کا جزو بنادیا گیا اور ہر جمعہ کو یہ آیت پڑھی جاتی ہے، ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ، (النحل:۹۰) قرآن مجید ہمیں تلقین کرتا ہے کہ کسی کی عداوت ودشمنی بھی تمہاری طرف سے عدل وانصاف کی راہ میں رکاوٹ بننے نہ پائے ، لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدہ:۸) اس لئے قیام امن کی جو بھی سعی ہوگی وہ اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ اور مطلوب ہوگی، قرآن نے اپنے آپ پر یقین کرنے اور اس کی تعلیمات کو تسلیم کرنے والوں کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں، مومن اور مسلم، ''مومن'' امن سے ماخوذ ہے، اور اس کے معنی ہی ہیں: دوسرے کو امن دینے والے کے، اور مسلم ''سلم'' سے ہے، جس کے معنی صلح اور بچاؤ کے ہیں، گویا مسلم وہ ہے جس سے دوسرے لوگ حفاظت وسلامتی میں رہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر میں امن وامان اور صلح وآشتی کی کیا

اہمیت ہے؟

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بھی اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، اسی سلسلہ کی ایک کوشش نبوت سے پہلے ہوئی، جس کو ''حلف الفضول'' کہتے ہیں، اس تحریک میں آپ پیش پیش رہے، ہوا یوں کہ بنو زبید کے ایک صاحب مکہ آئے ہوئے تھے، ان سے عاص بن وائل نامی شخص نے ایک سامان خریدا، اور سامان کی قیمت ادا کرنے سے مکر گئے، زبیدی نے ہزار ہا کوشش کی اور مکہ کی بااثر شخصیتوں سے رابطہ کیا، لیکن کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، بالآخر اس شخص نے عربوں کے قدیم طریقہ کے مطابق ٹھیک طلوع آفتاب کے وقت بوقبیس کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی فریاد بلند کی، اہل مکہ عام طور پر اس وقت کعبہ کے گرد و پیش بیٹھے رہتے تھے، اس فریاد نے لوگوں کو چونکا دیا، زبیر بن عبد المطلب اٹھے اور مکہ کے شریف لوگوں کو عبداللہ بن جدعان کے مکان میں جمع کیا، اور طے کیا کہ ہم کسی شخص پر ظلم نہ ہونے دیں گے، اور مظلوموں کو ان کا حق دلائیں گے، چنانچہ عاص بن وائل سے سامان واپس لیا گیا، اور زبیدی کو اس کا سامان حوالہ کیا گیا، اس وقت عمر مبارک بیس سال تھی، آپ ﷺ بھی اس انجمن میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک ہوئے، اتفاق سے اس معاہدہ میں اشراف مکہ میں تین ایسے لوگ شریک تھے جن کا نام فضل تھا، اسی مناسبت سے یہ تنظیم ''حلف الفضول'' کہلائی، نبوت کے بعد بھی آپ ﷺ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ آج بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اس کو قبول کروں گا۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۲/ ۹۳-۲۹۱)

ا۔ سیرت میں اس سلسلہ کا دوسرا واقعہ وہ ہے جس کو ''میثاقِ مدینہ'' سے موسوم کیا جاسکتا ہے، آپ ﷺ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تو وہاں ایک گروہ مہاجرین و انصار کا تھا، جو آپ ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، اور دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو اہلِ کتاب میں سے تھے، اور غالباً خال خال مشرکین بھی موجود تھے، آپ ﷺ نے ان کے درمیان معاہدہ کرایا، اس معاہدہ کی رو سے مدینہ میں بسنے والی تمام مذہبی اور خاندانی اکائیوں کو مذہبی آزادی دی گئی، جان و مال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کیا گیا، اور یہ بات

طے پائی کہ اگر مدینہ پر باہر سے کوئی دشمن طاقت حملہ آور ہو، تو سب مل کر دفاع کا فرض انجام دیں گے، نیز اس معاہدہ میں ان لوگوں کو بھی شریک کیا گیا جو کسی فریق کے ساتھ دوستی کا معاہدہ رکھتے ہیں۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۲۲۵/۳)

صلح حدیبیہ کا مقصد بھی بین قومی امن وامان کا قیام ہی تھا، یہ بات محتاج اظہار نہیں کہ مسلمانوں نے طاقت ور ہونے کے باوجود مشرکین مکہ کی تمام شرطوں کو قبول کرتے ہوئے یہ صلح کی، بعض حضرات کا خیال تھا کہ صلح کی یہ شرطین یک طرفہ ہیں، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ کو صلح پسند نہیں تھی، لیکن جنگ کے ماحول کو ختم کرنے اور امن کو حاصل کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے بہ ہر قیمت صلح فرمائی، یہ صلح نہ صرف مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان تھی، بلکہ ان دوفریقوں کی جن عرب قبائل سے مصالحت ہو، آپ ﷺ نے ان کو بھی صلح میں شریک قرار دیا، اس طرح اس "میثاق امن" کا دائرہ پورے جزیرۃ العرب تک وسیع ہوگیا، یہ صلح بھی بقاء باہم اور ایک دوسرے کے بنیادی حقوق اور آزادی کے احترام کے اصول پر مبنی تھی۔

اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے عالمی امن اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی ادارہ اور تنظیم کی تشکیل کا تصور دیا ہے، مجلس اقوام ہو یا اقوامِ متحدہ، یا اس طرح کی دوسری تنظیمیں، وہ اسی تصور کی بازگشت ہیں، یہ عجیب بدبختی ہے کہ اس وقت اقوام متحدہ کو کچھ مغربی اقوام نے اغواء کیا ہے، جن کے دباؤ کی وجہ سے نا منصفانہ فیصلے ہوتے ہیں، اسرائیل کئی ملکوں کی سرحدات کو پار کر کے عراق کے نیوکلیر مرکز پر حملہ کرسکتا ہے، امریکہ غیر قانونی طور پر سوڈان اور افغانستان کے اندرونی علاقوں کو نشانہ بنا سکتا ہے، روس چیچنیا میں معصوم شہریوں کو دیوانہ وار ہلاک کر رہا ہے، بوسینیا اور کوسوو میں روس نے ننگی جارحیت کا علانیہ تعاون کیا ہے اور نہ جانے کتنے ہی چھوٹے ممالک اور کمزور اقوام ہیں کہ بڑی طاقتوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہیں، اس کے باوجود فلسطین اور چیچنیا کے مظلوم مسلمان تو دہشت گرد کہلاتے ہیں، اور امریکہ وروس امن وانسانیت کے

علمبراد، اور یہ ساری ظالمانہ اور غیر انسانی حرکتیں خود اقوام متحدہ کے زیر سایہ انجام پا رہی ہیں۔ اسلام یقیناً عالمی امن اور بین قومی اتحاد و یکجہتی کا علمبردار ہے، لیکن وہ صاف وشفاف عدل اور مساویانہ سلوک و برتاؤ کا داعی اور نقیب ہے، اور حقیقی عالمی امن کا قیام ان اصولوں کے بغیر ممکن نہیں۔

اسلام اور تصوّرِ آزادی

آج کل شہروں میں چڑیا خانے (Zoo Logical Park) بنے ہوتے ہیں، ان چڑیا خانوں کی تزئین و آرائش اور حفاظت وصیانت پر بہت بڑی رقم خرچ ہوتی ہے، پورا چڑیا خانہ رنگ برنگ کے خوب صورت اور مہکتے ہوئے پھولوں، لمبے، ہرے بھرے درختوں اور پانی کی چھوٹی چھوٹی جھیلوں کی وجہ سے خوش منظر بنا رہتا ہے، پھر انواع واقسام کے حیوانات اور پرندوں کے لئے الگ الگ احاطے بنے ہوتے ہیں، جانوروں کی دیکھ بھال اور آسائش کا جو انتظام ان چڑیا خانوں میں ہوتا ہے، یقیناً وہ ان کو جنگلات میں بھی میسر نہیں، اپنی غذا کے لئے نہ ان کو شکار تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور نہ چارہ ڈھونڈھنے کی حاجت، بلکہ خود چڑیا خانہ کا عملہ ان کی غذائی ضروریات وقت پر اور فراوانی کے ساتھ فراہم کرتا ہے، حفظانِ صحت کی جو رعایت یہاں کی جاتی ہے، جنگلات میں ان کا میسر آنا ممکن نہیں، باضابطہ ڈاکٹر اور معالج متعین ہیں، بلکہ ان کے علاج کی اتنی فکر کی جاتی ہے کہ انسانوں کے لئے بھی اتنی فکر نہیں کی جاتی، جانوروں کی حفاظت وصیانت کا بھی اعلیٰ درجہ کا نظام موجود ہے، نہ کسی جانور کو اس کا خطرہ ہے کہ اس سے زیادہ طاقت ور جانور اسے اپنی خوراک بنا لے گا، نہ شکاریوں سے کوئی خوف ہے، غرض حیوانات کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے تحفظ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چڑیا خانے ان کے لئے ایسی راحت گاہ ہیں کہ انسانوں کو بھی ایسی سہولت و آسائش میسر نہیں۔

لیکن اگر کسی شخص کو جانور کی زبان آتی، وہ ان سے ہم کلام ہوسکتا اور ان جانوروں سے ان کی دلی آرزو اور سب سے پیاری خواہش کے بارے میں سوال کرتا تو یقیناً ان کا جواب یہی ہوتا کہ خدارا مجھے اس خوب صورت، آراستہ و پیراستہ ''سونے کے قفس'' سے

نکال کر بے ترتیب اور انسان کے ذوق خوش آرائی سے محروم جنگلات میں پہنچادو، جہاں گو وقت پر کھانا نہیں آئے گا، اپنی خوراک کے لئے دوڑ بھاگ کرنی ہوگی اور علاج کے لئے کوئی ڈاکٹر بھی میسر نہیں ہوگا، ایسے خوش رنگ، سجے سجائے، سنوارے اور دلہن بنائے گل بوٹے نظر نہیں آئیں گے، مگر پھر بھی ہم ''آزاد'' ہوں گے، حصار بندیوں نے مجھے قید نہیں کیا ہوگا، میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آنا جانا کرسکوں گا۔

جب حیوانات جو عقل و شعور کے اعتبار سے بمقابلہ انسان بہت ادنیٰ درجہ کی مخلوق ہے، کے اندر آزادی کی ایسی طلب بلکہ تڑپ ہے، تو انسان میں اس کا داعیہ کتنا شدید ہوگا، وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال جیل اور قید خانے ہیں، یہاں قیدیوں کی اکثر بنیادی ضروریات پوری کی جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر قیدی رہائی کے لئے بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اس لئے آزاد رہنے کی خواہش انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ جب کوئی قوم دوسری قوم پر غلبہ پالیتی ہے تو اپنی غلامی کا احساس اس کو تڑپاتا رہتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے محروم کردیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں آزادی کی جد و جہد اور غلامی سے نجات کی کوشش میں بیشمار اور بے پناہ قربانیاں دی گئی ہیں، جان و مال کی، اولاد کی، گھر و بار کی اور بعض مواقع پر عزت و وقار کی بھی، خود ہمارا ملک ہندوستان اس کی روشن مثال ہے، قفس چاہے سونے کا ہو وہ قفس ہی ہے، وہ انسان کی طبعِ آزاد پسندی سیری کا سامان نہیں۔

اسی لئے اسلام نے آزادی کو انسان کا فطری اور پیدائشی حق تسلیم کیا ہے، وہ تمام انسانیت کو بحیثیت انسان مساوی قرار دیتا ہے، اس لئے کسی انسانی طبقہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بنالے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس انقلابی تصور کا اعلان اس طرح فرمایا:

> ''اے لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو، تم سب آدم سے پیدا کئے گئے اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے شریف اور باعزت وہ ہے جو سب سے

زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو، کسی عرب کو کسی عجمی پر تقویٰ کے علاوہ کسی اور سبب سے کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔''

یہ توحید اور انسانی وحدت کا عقیدہ وہ انقلابی عقیدہ ہے جو نسلی، خاندانی جغرافیائی اور لسانی بنیادوں پر ایک طبقہ کے دوسرے انسانی طبقہ کو غلام بنانے، ان کو کمتر سمجھنے اور اپنے تئیں برتری کے احساس کی بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے۔

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے۔ اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت، بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یورپ افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو جمہوری طرز فکر کا بانی تصور کرتا ہے اور افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) کو اس موضوع پر پہلی کتاب خیال کیا جاتا ہے، لیکن افلاطون کے جمہوری تصور کا حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک صرف فلاسفہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے اور وہ سماج کے بقیہ افراد کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک ان سب کی تخلیق کا خمیر بھی الگ الگ ہے، فلاسفہ کو خدا نے سونے سے بنایا ہے، ان کے معاونین کو چاندی سے، پھر کاشتکار اور دستکار وغیرہ کو لوہے اور پیتل سے،'' یہ ہے جمہوریت اور انصاف کا وہ تصور جو افلاطون نے پیش کیا ہے۔

افلاطون کے بعد مشہور فلسفی اور افلاطون کے شاگرد ''ارسطو'' کو نظام جمہوری کا مفکر تصور کیا جاتا ہے۔ ارسطو کے یہاں سماج کی طبقاتی تقسیم اتنی نمایاں ہے کہ ایک دانشور سے ایسے غیر منصفانہ خیالات کا صدور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ ''غریب امیروں کے پیدائشی غلام ہیں، وہ بھی، ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی۔''

ارسطو کو مساوات اور حکومت میں غریبوں کی شرکت نہایت ناگوار خاطر ہے۔ جب فلاسفہ روزگار اور دانش ورانِ عصر کے فکر و نظر کا یہ حال ہو تو عام لوگوں کی سوچ کا اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اسکو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے، وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے۔ انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اور لوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انہوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں ''ابن الاکرمین'' (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا اچھا بیٹھو! پھر عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اور تمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاصر ہو گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھے کہ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھنے لگے کہ انکا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جو ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ دُرّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمر کے سر پر بھی گھماؤ، کیوں کہ انہیں کے سہارے پر اس نے تمہیں مارا تھا، مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت

عمرؓ نے فرمایا کہ اگر تم انہیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انہیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔ (سیرت عمر بن جوزی: ۹۷۔۸۶)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روس تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔'' یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوقِ انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انہوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نو آبادی بنائے ہوئے ہیں۔ ۳۰/نومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھا۔ آج بھی امریکی صدر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گوری نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھکیدار!!

یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی لڑائی مسلمانوں نے شروع کی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال پر مشتمل ہے، اس کا پہلا نصف حصہ یعنی ۴۵/سال زیادہ تر مسلمانوں ہی کی قربانی سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں ملک کا کوئی چپہ نہیں جس کو مسلمانوں نے اپنے خون اور لہو کا نذرانہ پیش نہ کیا ہو، جنگ آزادی کا یہ حصہ جس میں سب سے زیادہ خوں ریزی اور تباہی و بربادی ہوئی، مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی قربانیوں اور فدا کاریوں کی تاریخ ہے، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، ان کے عالی ہمت خلفاء، علماء صادق پور، مولانا فضل حق خیر آبادی اور کتنے ہی علماء و مشائخ ہیں جنہوں نے اس عہد میں جان و مال کی زبردست قربانیاں دی ہیں۔

اگلے پینتالیس سال میں جو مسلمان جنگِ آزادی میں شریک ہوئے ان میں غالب اکثریت علماء اور اہل دین کی تھی، خلافت کمیٹی، جمیعۃ علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ تو قائم ہی اسی مقصد کے لئے ہوئیں، افسوس کہ لوگ ان تحریکوں کو فراموش کر گئے، انہوں نے صرف کانگریس کو یاد رکھا، جو محض انگریز کی خوشامد اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان روابط کو پروان چڑھانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی، ریشمی رومال تحریک اور ہندوستان کی جلاوطن حکومت میں بھی زیادہ حصہ علماء اور خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی ؒ کا تھا۔ علماء اور مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کی تحریک آزادی میں یہ پرجوش شرکت اور قربانی کچھ اس لئے نہیں تھی کہ ان کو آئندہ حکومت میں حصہ داری کی طمع تھی اور وہ وزارتوں میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انہوں نے یہ سب کچھ تحسین وتعریف کی تمنا اور عہدہ اور مال و زر کی حرص و طمع سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو راضی کرنے کے لئے کیا تھا، کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ آزادی ہر انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور کسی قوم کو غلام و محکوم بنالینا ایک ایسا ظلم ہے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانا ''جہاد'' اور اس راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنا ''شہادت'' ہے۔

عدل کے نفاذ میں مساویانہ سلوک

گذشتہ کئی ہفتوں سے مشہور سیاسی قائد جناب بال ٹھاکرے کی گفتاری اور ان کے مقدمہ نے ایسی ہنگامہ خیز اور حشر انگیز صورت اختیار کر لی کہ گویا بکریوں کے ریوڑ میں کوئی شیر گھس آیا ہو، کمزور دل کمزور تن اور کمزور حوصلہ بکریاں چاہتی ہوں کہ شیر کو اس کی چیرہ دستیوں پر سزا دی جائے۔ اور کیفر کردار تک پہونچایا جائے، لیکن کسی کو ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر اس طاقت ور اور ظالم صفت کا ہاتھ تھام سکے، یہ ہے ہمارے ملک کی جمہوریت، قانون کی بالادستی، اور انصاف کی حکمرانی! اگر کوئی مسلمان، عیسائی یا دلت جناب بال ٹھاکرے کے مقابلہ دس فیصد کم ہی مجرم ہوتا تو شاید اسکا پولیس انکاؤنٹر ہو چکا ہوتا، ورنہ ٹاڈا کے تحت ضرور وہ موت سے زیادہ تکلیف دہ اذیتوں کا مستحق گردانا جاتا۔ لیکن یہاں ایک شخص علانیہ اپنی مجرمانہ روش پر مصر ہے۔ اور ملک کے پورے نظام قانون کو چیلنج کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود کیا مجال کہ کوئی اس کی زبان روک سکے، اور اس کے ہاتھ باندھ سکے۔

تمام افراد اور قوموں کے ساتھ عدل کا منصفانہ روّیہ اور انصاف کا برتاؤ اس ملک کی حفاظت کی ضمانت ہے، غنڈہ گردوں اور لاقانونیت برتنے والوں کی ناز برداری اور ان کے ساتھ نرم خوئی و دل داری سماج کے لئے نہایت ہی نقصان دہ اور مضرت رساں عمل ہے، اسی لئے اسلام نے عدل اور عدل کے معاملہ میں مساویانہ سلوک کی قدم قدم پر تلقین کی ہے، رسول اللہ ﷺ کو مدینہ میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودیوں کی بابت حکم دیا گیا کہ جب آپ ﷺ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو پورا انصاف ملحوظ رکھیں۔ ’’وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین‘‘ (المائدہ:۴۲)

رسول اللہ ﷺ نے عملی زندگی میں اس کو برت کر دکھایا، فتحِ مکہ کے موقع سے عرب کے معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے کچھ چوری کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، جو اسلام میں چوری کی سزا ہے، آپ کے محبوب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے اس خاتون کے حق میں سفارش کی، تو آپ اتنے برہم ہوئے کہ کم آپ ﷺ اس طرح غضبناک ہوا کرتے تھے، اور خاص اس موضوع پر صحابہؓ سے خطاب فرمایا، آپ ﷺ نے اپنے اس خطاب میں فرمایا کہ اگر اس خاتون کی جگہ محمد کی بیٹی فاطمہؓ نے چوری کی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے حکم سے اس کے ہاتھ کاٹے گئے (بخاری: عن عائشۃ رضی اللہ عنہا، حدیث نمبر (۳۴۷۵) کتاب أحادیث الأنبیاء، باب "أم حسبت أن أصحاب الکھف والرقیم" الکہف:۹)

یہی مزاج آپ ﷺ سے آپ ﷺ کے صحابہؓ نے پایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک بار جمعہ کے دن اعلان کیا کہ کل اونٹوں کی زکوٰۃ لے کر یہاں حاضر ہوں، کہ ہم اسے تقسیم کریں، اور کوئی شخص میرے پاس بلا اجازت نہیں آئے۔ دوسرے دن ایک صاحب اونٹنی کی نکیل لے کر آ گئے۔ کہ شاید تقسیم میں اونٹ مل جائے۔ تو لے جانے میں آسانی ہو۔ جس حصہ میں اونٹ رکھے گئے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ وہاں داخل ہوئے۔ ساتھ ہی یہ صاحب بھی آ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اعلان کے باوجود ان صاحب کی بے وقت آمد پر غصہ آ گیا۔ اور آپ رضی اللہ عنہ نے اونٹ کی نکیل لے کر ایک آدھ بار انہیں رسید کیا، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اونٹ کی تقسیم سے فارغ ہوئے، تو اس شخص کو بلایا اور ہاتھ میں نکیل دی اور فرمایا کہ تم مجھ سے بدلہ لے لو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ نہ وہ بدلہ لے گا، اور نہ آپ اس طریقہ کو رواج دیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر قیامت کے دن مجھے کون اللہ سے بچائے گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ انہیں راضی کر لیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اسے ایک اونٹنی مع کجاوہ، ایک چادر اور پانچ دینار دیئے جائیں اور اس طرح اسے راضی کیا۔ (کنز العمال: ۳/۱۲۷)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ایک مسلمان اور یہودی کا مقدمہ آیا تو آپ رضی اللہ عنہ

نے یہودی کے حق میں فیصلہ فرمایا (الترغیب والترہیب : ۳ / ۴۴۵) حضرت عثمان ﷜ کے بارے میں مروی ہے کہ اپنے غلام کی گوشمالی کی۔ تو پھر اس سے اصرار کر کے اپنے کان پکڑوائے اور جب اس کو لحاظ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سختی سے کان ملو، دنیا میں بدلہ ادا کر دینا بہ مقابلہ آخرت میں بدلہ ادا کرنے کے بہتر ہے؟ (مختصر حیاۃ الصحابہ للکاندھلوی: ۲۴۳) جعد بن ہبیرہ ﷜ نے حضرت علی ﷜ سے عرض کیا کہ آپ ﷜ کے پاس دو شخص آتے ہیں، جن میں سے ایک آپ ﷜ سے اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبت رکھتا ہے، اور یہ دوسرا آپ ﷜ سے اس قدر بغض رکھتا ہے کہ اگر بس چلے تو آپ ﷜ کو ذبح کر دے، لیکن آپ اس محبت رکھنے والے کے مقابلہ بغض رکھنے والے کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں، حضرت علی ﷜ نے فرمایا کہ اگر یہ فیصلہ میرے اختیار کی چیز ہوتی تو میں وہی کرتا جو تم خیال کرتے ہو، لیکن یہ اللہ کے اختیار کی چیز ہے۔ **''لو کان لی فعلت ، انما ذا شئی للہ''**۔ (حوالۂ سابق: ۲۴۴)

عدل میں مساویانہ سلوک کا حال یہ تھا کہ خود حضرت عمر ﷜ اپنے عہد خلافت میں حضرت زید بن ثابت ﷜ کے یہاں مقدمہ کے فریق بن کر آئے۔ حضرت زید ﷜ نے ازراہِ احترام حضرت عمر ﷜ کو اپنے قریب بیٹھانا چاہا، حضرت عمر ﷜ کو یہ بات پسند نہیں آئی، اور فرمایا کہ یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، میں اپنے فریق کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔ (کنزل العمال: ۳ / ۱۷۲) حضرت عمر ﷜ کا اسی طرح کا واقعہ حضرت ابی ابن کعب ﷜ کے اجلاس عدالت میں بھی پیش آنا منقول ہے۔

حضرت عمر ﷜ ہی کے عہدِ خلافت میں ایک غسانی رئیس مسلمان ہوئے، اور مدینہ آئے، ان کا نام ''ایہم'' تھا، اسلام تو قبول کر لیا تھا، لیکن ابھی اسلامی مزاج و مذاق سے نا آشنا تھا۔ طواف کے درمیان لباس فاخرہ پر ایک بدو کا پاؤں پڑ گیا، طبع نازک کو گوارا نہ ہوا، اور تھپڑ رسید کر دیا، مقدمہ دربار خلافت میں آیا، حضرت عمر ﷜ نے فیصلہ فرمایا کہ بدو بدلہ لے گا، یا اس سے معاف کرانا ہوگا، ایہم کا مذاق جاہلی اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا، ایک دو دنوں کی مہلت لی، اور اسی درمیان راہ فرار اختیار کی اور مرتد ہو گیا، حضرت عمر ﷜ کو

ایک بڑے رئیس کے یوں چلے جانے سے کوئی ملال نہیں ہوا۔ بلکہ استقامت کی جو توفیق میسر آئی، اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

عدل وانصاف کے معاملہ میں اسلامی نظام نے عدلیہ کو پوری طرح آزاد رکھا ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کے لئے بھی اس میں مداخلت کی گنجائش نہیں رکھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے عہدِ خلافت میں قاضی شریح کی عدالت میں ایک یہودی کے خلاف مقدمہ دائر کیا، اور گواہان کی حیثیت سے صاحبزادہ گرامی مرتبت حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام قنبرہ کو پیش فرمایا، قاضی صاحب نے دونوں گواہیاں رد کردیں، اور کہا کہ نہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر ہے، اور نہ غلام کی گواہی اپنے آقا کے حق میں قابل قبول، اور بالآخر فیصلہ یہودی کے حق میں اور امیر المومنین کے خلاف ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی ظاہری شکست سے فتح کا سامان پیدا کیا، یہودی غلطی پر تھا، اس نے مسلمانوں کے اس عدل کو دیکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اسلام سے مشرف ہوا۔

انصاف کو یقینی بنانے اور مساویانہ سلوک برقرار رکھنے کے لئے فقہاء نے قاضی کے لئے اس بات کو بھی منع کیا کہ وہ مقدمہ کے فریقین یا جن لوگوں کا مقدمہ آنا متوقع ہو ان سے ہدیہ قبول کرے۔ اسی سلسلہ میں دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اکثر اونٹ کی ران پیش کیا کرتے تھے، اتفاق سے اسی شخص کا مقدمہ آپ رضی اللہ عنہ کے سامنے آیا، اس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ جیسے اونٹ کے ران کی بوٹیاں ہڈیوں سے الگ کی جاتی ہیں، اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ بھی اس معاملے کا صاف صاف فیصلہ کر دیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کے اشارہ کو سمجھ گئے، اور قاضیوں کو خاص طور پر حکم جاری فرمایا کہ وہ کسی بھی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے گریز کریں۔ (کنزل العمال: ۱۷۷/۳)

عدل پروری کا یہ معاملہ حضراتِ صحابہؓ ہی تک محدود نہیں تھا، بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ رعایا میں عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کو سامنے رکھا، خود ہندوستان کے مسلم سلاطین کے ایسے بیسیوں واقعات موجود ہیں، سلطان ناصر الدین محمود تغلق اور غیاث الدین بلبن خاندان غلاماں سوری، اور مغل بادشاہوں میں کتنے ہی حکمراں گذرے ہیں، کہ رعایا

ان کو بے لاگ عدل کے لئے ضرب المثل بنائے ہوئے تھے، جہانگیر نے اپنے ایک نہایت مقرب وزیر مقرب خاں کو ایک معمولی بڑھیا کی فریاد پر مقرب خاں اور اس کے متعلقین کو سخت سزا دی (سچی کہانیاں: ۱۴۲/۲)

آج کل فوج اور پولیس کے معاملہ میں اس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، بابر کی فوج ۱۵۱۹ء میں بھیرہ میں داخل ہوئی۔ بابر کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ بھیرہ میں کچھ لوگوں نے رعایا کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ فوراً معاملہ کی تحقیق ہوئی اور بعض سپاہیوں کو سزائے موت دی گئی، اور بعضوں کی ناک کٹوا کر انہیں عوام میں پھرایا گیا تاکہ پھر آئندہ ان کو ایسی زیادتی کی جرأت نہ ہو (سچی کہانیاں: ۱۱/۲، سید صباح الدین عبدالرحمان)

جو جمہوریت انسان کو انصاف بھی نہ دے سکے۔ اور جو ظالم کا ہاتھ تھامنے میں بھی چہرے اور چہرے میں فرق کرتی ہو، اس سے کیسے کوئی مظلوم اپنے حقوق کے تحفظ کی توقع رکھ سکتا ہے اور کیوں کر امید کی جا سکتی ہے کہ یہاں ظالموں کے ہاتھ تھامے جائیں گے۔

(۱۴/ اگست ۲۰۰۰)

دہشت گردی اور اسلام

جیسے کسی انسان کے لئے ہوا اور غذا سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے، اسی طرح انسانی سماج کے لئے سب سے بڑی ضرورت امن وسلامتی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے عربوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان یاد دلاتے ہوئے خاص طور پر دو باتوں کا ذکر کیا ہے، ایک یہ کہ وہ خدا ہی ہے جس نے اس وادی غیر ذی زرع میں بسنے والوں کو بھی غذا فراہم کی اور ان کے لئے بھوک سے نجات کا سروسامان پیدا کیا، دوسرے ایک ایسی سرزمین جہاں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور لاقانونیت ہی سب سے بڑا قانون تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی نعمت سے سرفراز فرمایا: ''اَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوْعٍ وَّآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ.'' (قریش:۴)

دہشت گردی سماج کے امن و امان اور سلامتی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ جو سماج مامون نہ ہو، جس معاشرہ میں ہر وقت انسان کو اپنی جان و مال کے بارے میں خطرہ لگا رہتا ہو اور جہاں ہر لمحہ انسان اپنی عزت و آبرو کے بارے میں اندیشہ سے دوچار ہو، وہاں علمی ترقی رک جاتی ہے، تہذیب و تمدن انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے، اخلاقی پستی پیدا ہونے لگتی ہے اور عدم تحفظ کا احساس ہر شعبۂ زندگی میں ترقی کے لئے رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے دہشت گردی پر فکر مند ہونا اور اس کی وجہ سے خوف زدہ ہونا ایک فطری بات ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ امن اور سلامتی اس کی خمیر میں داخل ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے لئے اس نے دو لفظ استعمال کیا ہے: ''مومن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں ہی تعبیر اسلام کی امن پسندی کا مظہر ہے۔ مومن امن سے ماخوذ ہے، یعنی ایسا شخص جو دوسروں کو امن دینے والا ہو اور مسلم ''سلم'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صلح اور سلامتی کے ہیں، اس طرح مسلم کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو صلح جو ہو اور جس سے دوسروں کو

سلامتی حاصل ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض ارشادات سے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حقیقی مومن وہ ہے کہ جس سے اس کے پڑوس کے لوگ امن میں رہیں۔ (بخاری: ٦)

لیکن سب سے پہلے خود یہ بات سمجھنے کی ہے کہ دہشت گردی ہے کیا؟ دہشت گردی دوسروں پر ظلم وتعدی اور جور وستم کا نام ہے یا ظالم کے پنجہ کو تھامنے کی کوشش بھی دہشت گردی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی صاحب انصاف اس بات کا قائل نہیں ہوگا کہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی دہشت گردی کہلانے کا مستحق ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں نے ان ظالم و جابر قوموں کے خلاف احتجاج کیا ہے جنہوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی اور آزادی کی اس لڑائی نے کتنے ہی انسانوں کی جانیں لی اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی، تو کیا ان مجاہدین آزادی کو بھی دہشت گرد کہا جائے گا؟ خود ہمارے ملک ہندوستان میں نوے سال آزادی کی خونچکا لڑائی لڑی گئی، یہ لڑائیاں اسی لئے ہوئیں کہ ہم انگریزوں کا طوقِ غلامی اپنی گردان سے نکال پھینکنے کے لئے بے چین تھے۔ اگر ہم غلامی کو برداشت کر لیتے، تو یقیناً بہت سے انسانیت سوز واقعات پیش نہیں آئے ہوتے، تو کیا جدو جہد آزادی کو بھی دہشت گردی شمار کیا جائے گا؟۔

نہیں اور یقیناً نہیں !! تو معلوم ہوا کہ مظلوم کا سر اٹھانا اور ظالم کے خلاف اس کا صف آرا ہونا دہشت گردی نہیں ہے بلکہ دہشت گردی کا مقابلہ ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس نے ظالم سے نبرد آزما ہونے کو ظلم اور دہشت کا نام دیا ہو۔ ہندو تاریخ میں کورو اور پانڈو کی جنگ مشہور ہے اور اس موقع سے جناب کرشن جی نے ارجن کو جو اپدیش دیئے، وہ آج بھی گیتا میں محفوظ ہیں۔ اس میں یہ پیغام ہے کہ اپنے جائز حق کے لئے اٹھ کھڑا ہونا اور نا انصافی کے خلاف سینہ سپر ہو جانا دہشت گردی نہیں، بلکہ ایک ''مقدس جہاد'' ہے۔ قرآن مجید نے بھی بڑی لطیف تعبیر میں کہا ہے کہ کسی بُری بات کو کھلے عام کہنا خدا کو پسند نہیں، لیکن جو شخص مظلوم اور ستم رسیدہ ہو، اس کو یقیناً احتجاج کا حق حاصل ہے۔ ''لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّامَنْ ظُلِمَ'' (النساء: ۱۴۸)

عجیب بات ہے کہ اس وقت دنیا میں جو قومیں جتنی زیادہ دہشت گرد ہیں، وہ اسی قدر دوسروں کے دہشت گرد ہونے کا شور مچاتی ہیں۔ امریکہ، ایران اور سوڈان کو دہشت گرد کہتا ہے، حالاں کہ خود امریکہ نے رضا شاہ پہلوی کے واسطہ سے ایران اور سوڈان کے باغی قبائل کی آڑ میں سوڈان پر کتنے ہی مظالم ڈھائے ہیں اور بین الاقوامی دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے، اسرائیل، فلسطین اور شام کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، حالانکہ وہ خود پورے فلسطین اور شام کے کچھ حصے پر ناجائز طریقے پر قابض ہے اور کئی بار عربوں کے قتل عام کا مرتکب ہو چکا ہے۔ مغربی قومیں افغانستان اور موجودہ طالبان کو دہشت گرد کہتی ہیں، حالانکہ زیادتی خود ان کی ہے کہ جو حکومت ملک کے تین چوتھائی حصوں سے بھی زیادہ پر قابض ہے وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے اور ایسے خود ساختہ حکمرانوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی حکومت کا اندرون ملک کوئی وجود نہیں۔ مصر، الاخوان المسلمون اور ترکی وہاں کی اسلام پسند جماعت کو بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دیتے ہیں اور خود جمہوریت کا گھلا گھونٹے ہوئے ہیں اور انتخاب کے بجائے اسلحہ کی طاقت کے سہارے تخت حکمرانی پر متمکن ہیں۔

ہمارے ملک کا بھی حال اس سے مختلف نہیں، جن لوگوں نے کھلے عام بابری مسجد کو شہید کیا، مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر گولیاں برسائیں، ممبئی اور سورت میں ظلم و جور کا برہنہ رقص کیا، وہ دہشت گرد نہیں کہلائے اور جن لوگوں نے اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کی اور ردعمل پر مجبور ہوئے ان کو دہشت گرد کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ دہشت گردی کے لفظ کے ساتھ ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقول اور منصف مزاج آدمی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس لئے سب سے پہلے خود دہشت گردی کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ظالم کو دہشت گرد کہنے سے گریز اور مظلوم کو دہشت پسند کہنا بجائے خود ایک ''اخلاقی دہشت گردی'' اور یقیناً اس سے دہشت گردی میں اضافہ ہی ہوگا اور مشکلات کا حل نہیں نکل سکے گا! تاہم اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اسلام اس شخص کو بھی لاقانونیت اور جائز حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہو، اسی لئے قرآن نے اصول مقرر کر دیا کہ کسی زیادتی کا بدلہ لینا اسی زیادتی کی حد تک روا ہے: جَزَآءُ

سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوریٰ:۴۰) اور آپ ﷺ نے فرمایا: لا ضرر ولا ضرار (موطا امام مالک) یعنی نہ کسی کو ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ جواباً نقصان پہنچانے میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

لیکن دہشت گردی کے علاج کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان اسباب ومحرکات پر غور کیا جائے اور ان کا سدِ باب کیا جائے جو شریف اور تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دہشت گرد بناتے ہیں۔ بنیادی طور پر احساس محرومی اور قانونی راستہ سے حقوق کے تحفظ اور ناانصافیوں کے تدارک سے مایوسی اور نا اُمیدی دہشت گردی کو جنم دیتی ہے، کبھی معاشی محرومی، سرمایہ داری کے خلاف آتش اشتعال کو بھڑکاتی ہے، ہمارے ملک میں نیکسلائیٹ تحریک اسی پس منظر میں اُبھری ہے اور اسی اَحساس محرومی نے بے روزگار نوجوانوں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کو ان کے گرد اکھٹا کر دیا ہے، کبھی سیاسی محرومی دہشت گردی کا سبب بنتی ہے، کشمیر، پنجاب اور آسام اس کی کھلی مثال ہے، جن کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا اور اسی نے ان کو امن کی میز سے جنگ کارزار میں پہنچا دیا ہے، کبھی اس کا سبب قومی ناانصافی اور فرقہ وارانہ زیادتی بھی ہوتا ہے، پھولن دیوی کا کردار اور مایاوتی کی اونچی ذات والوں کے خلاف دشنام طرازی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ان اسباب وعوامل پر توجہ نہ دینا اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے ردِعمل کو دہشت گردی کا نام دے کر بزورقوت ختم کرنے کی کوشش، جڑ کے بجائے ٹہنیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ مشکلات کی اصل بنیاد کو تلاش کرتا ہے اور اصل مرض کی شناخت کر کے اس کے علاج کی طرف اولین توجہ دیتا ہے۔ عرب جاہلیت سے زیادہ دہشت گردی اور لاقانونیت شاید ہی تاریخ میں کہیں رہی ہو، لیکن اسلام نے نہایت خوبی سے اس کا علاج کیا اور ان ہی لوگوں کو جن کی وحشت ضرب المثل تھی، پوری دنیا میں امن کا پیامبر بنا کر کھڑا کیا۔ اسلام کو یہ کامیابی اسی لئے ملی کہ اس نے ان اسباب وعوامل پر توجہ دی، سب سے زیادہ جو چیز انسان کو دہشت گردی پر اُبھارتی ہے وہ معاشی محرومی کا احساس ہے۔ اسلام نے اولاً تو آخرت کا یقین پیدا کیا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کو ایک

فانی اور آنی جانی چیز قرار دیا۔ وما الحیٰوۃ الدُنیا اِلَّامتاعُ الغُرُورِ (الحدید:۲۰)

جب دلوں میں متاع دنیا کی محبت کم ہوجائے اور اس کی بے ثباتی کا یقین بیٹھ جائے تو وہ دنیا کی محرومی کو آخرت کی سرفرازی میں تلاش کرنے لگا اور یہ احساس اس کو اہلِ ثروت کے خلاف بغاوت پر نہیں اکسائے گا، بلکہ وہ اپنے فقر و افلاس میں بھی ایک لذت اور حلاوت محسوس کرے گا، پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز کو ناپسند کیا اور اس کی تقسیم اور گردش کے مربوط اور مرتب نظام کو وجود بخشا، میراث کا نظام، زکوٰۃ وصدقات، سود کی حرمت، ذخیرہ اندوزی کی ممانعت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ایک جگہ دولت کو مرتکز نہیں ہونے دیتیں، ان کے علاوہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی اخلاقی تعلیمات ان کے علاوہ ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جو اہلِ دولت میں انفاق کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور غرباء کو محرومی کے احساس سے محفوظ رکھتے ہیں۔

سیاسی سطح پر کسی طبقہ کو دبا کر رکھنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی، اسلام نے ذات اور برادری کی بنیاد پر عہدے اور ذمہ داریوں کی تقسیم نہیں کی، بلکہ صلاحیت اور اہلیت کو اس کے لئے معیار بنایا، انصاف اور حفاظت و سلامتی کے باب میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کا بھی کوئی فرق نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے مال بھی ہمارے مال کی طرح اور کے خون بھی ہمارے خون ہی کی طرح ہیں: ''دمائهم كدمائنا وامو الهم كاموالنا'' قرآن مجید نے عدل وانصاف پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی طبقے کی برائی تم کو ناانصافی کے راستے پر نہ لے جائے اور تم ان کے ساتھ بھی انصاف کا حق ادا کرو: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا (المائدۃ:۸) مذہبی معاملات میں بھی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا: لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (القصص:۵۵) اسلام نے اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ ایک شخص کے جرم کا بدلہ دوسرے سے لیا جائے اور کچھ مجرموں کی وجہ سے بے قصور لوگوں کو نشانۂ انتقام بنایا جائے، ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى'' (فاطر:۱۸) اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احتجاج کا قانونی راستہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے، اگر احتجاج مبنی بر حقیقت ہے تو اسے قبول کیا جائے اور اگر خلافِ واقعہ ہے تو

ان کو مطمئن کیا جائے، ملک کے ایک عام شہری کو بھی بڑے سے بڑے حکمراں کو روکنے اور ٹوکنے کا حق حاصل ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں ''نھی عن المنکر'' اور ''شھادتِ حق'' ہے۔ اگر کچھ لوگ غیر سنجیدہ طریقہ اختیار کریں تو ان کا بھی بہتر طریقہ پر جواب دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: برائی کو نرمی کے ساتھ دور کرو: اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (مومنون:۹۶) گویا اسلام جوابی دہشت گردی کو بھی پسند نہیں کرتا۔

اسلام سراپا رحمت اور امن و آشتی ہے، وہ عدل و انصاف کا نقیب ہے، رحم اور عفو درگذر سے زیادہ کوئی چیز اس کی بارگاہ میں مقبول نہیں، ظلم و جور اور ناانصافی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسے ناپسند ہو، اس نے خدا کو جس نام سے بار بار یاد کیا وہ ''رحمن و رحیم'' ہے اور اس نے اپنے پیغمبر کو جس لقب سے ملقب کیا ہے، وہ ''رحمۃ للعالمین'' ہے، اس کا مرکز ایسا حرم مامون ہے کہ وہاں پرندوں پر بھی کنکری نہیں ماری جاتی اور خود رو پودے بھی اکھاڑنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایک ایسے مذہب کی طرف دہشت گردی کی نسبت کرنا دن کو رات کہنے کے سوا اور کیا ہے؟ درحقیقت یہ ایسا نعرہ جس میں بہت سی قوموں نے آج اپنی دہشت گردی کو چھپایا ہے۔ دہشت گردی مظلوموں کی آہ و فغاں، صدائے احتجاج اور ظلم سے پنجہ آزمائی کا نام نہیں، بلکہ دہشت گردی خود ظلم و تعدی کا نام ہے، مگر افسوس کہ ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

(۱۸؍نومبر ۱۹۹۸ء)

ردعمل اور جوابی اقدام ـ اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ایک خاص عنصر جذبات کا رکھا ہے، یہی جذبات محبت ونفرت اور خوشی وغم کے احساس کا سرچشمہ ہے، عام حالات میں انسان کے جذبات معتدل ہوتے ہیں، لیکن جب کوئی غیر معمولی بات پیش آئے تو اسی نسبت سے انسان کی جذباتی کیفیت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، فرحت انگیز واقعات سے زیادہ انسان الم انگیز واقعات پر جذباتی ہو جاتا ہے، اس طرح کے واقعات سے انسان کو گہرا دکھ بھی پہونچتا ہے، اور اس کے جسم میں انتقام کی آگ بھی سلگنے لگتی ہے، بعض اوقات یہ کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ انسان خود اپنے قابو میں نہیں رہ پاتا، ان حالات میں اگر قانون اور اصول کے دائرہ میں ردِعمل کی گنجائش فراہم نہ کی جائے اور حصولِ انصاف کو ممکن نہ بنایا جائے تو مزید لاقانونیت پیدا ہونے کے خطرات ہوتے ہیں۔

اسی لئے اسلام نے ظلم وتعدی کا جواب دینے اور قانونی حدود میں رہتے ہوئے ردِعمل ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدی علیکم واتقوا الله واعلموا ان الله مع المتقین". (البقرۃ: ۹۴)

تم پر جو شخص زیادتی کرے، تو تم بھی اس پر اس کی زیادتی کے بقدر جواب دو اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں چند باتوں کی طرف اشارہ ہے، اوّل یہ کہ کسی پر ظلم و

زیادتی میں پہل کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور دوست ہو یا دشمن، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی ہدایت یہاں تک ہے کہ تم انہی لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے برسر پیکار ہوں، جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، ان سے قتال جائز نہیں، یہ ''اعتداء'' یعنی حد سے گزرنا ہے اور اللہ تعالیٰ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ (البقرہ:۹۰)

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کے غیر قانونی ردِ عمل کو روکنے کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے انتقام کی گنجائش ہے، تیسرے کسی زیادتی پر یا تو عفو درگذر سے کام لینا چاہئے یا اسی کے مماثل بدلہ لینے کی گنجائش ہے، اس سے زیادہ گنجائش نہیں، اسی زیادتی کو قرآن مجید میں اعتداء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی قبیلے کا غلام مارا جاتا، تو خواہ اس کا قاتل غلام ہی کیوں نہ ہو، وہ کہتے کہ ہم اس کے بدلہ میں تمہارے آزاد شخص کو قتل کریں گے، اگر کوئی عورت ماری جاتی تو خواہ کوئی عورت ہی اس قتل کی مرتکب ہوئی ہوتی، لیکن لوگ اس کے بدلہ میں، دوسرے خاندان سے کسی مرد کو قتل کرنا چاہتے، اگر کسی خاندان سے ایک شخص کا قتل ہوا، تو مقتول کے لوگ چاہتے کہ اس کے بدلہ میں قاتل کے خاندان سے ایک جماعت کا قتل کیا جائے، کسی کو ایک زخم لگے تو وہ اس کے بدلے سے کئی چند زخم لگانا چاہتے۔
(مفاتیح الغیب:۳/۲۵)

اس ناروا انتقام اور بدلہ کو قرآن مجید نے منع کیا اور فرمایا گیا کہ قصاص کی اجازت ضرور ہے، لیکن جو قاتل ہے، اسی سے، خواہ وہ غلام ہو یا آزاد، اور مرد ہو یا عورت، اگر کوئی چاہے تو بجائے جانی بدلہ کے مالی جرمانہ یعنی ''خوں بہا'' بھی وصول کرسکتا ہے، اس حکم کو بیان کرتے ہوئے اخیر میں فرمایا گیا کہ جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لئے دردناک عذاب ہے: ''فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''. (البقرہ،۱۷۸)
— اس سے معلوم ہوا کہ بدلہ لینے میں قانون و آئین کے حدود کو پار کرجانا بھی جائز نہیں۔

انتقام اور ردِ عمل کے سلسلہ میں تین باتیں نہایت ہی اہم ہیں، اوّل یہ کہ اصل میں جس نے ظلم و زیادتی کی ہو، اس کے بارے میں مناسب تحقیق کی جائے، بلا تحقیق محض شبہ

کی بنا پر کسی کو نشانہ بنانا اور نقصان پہونچانا درست نہیں، مجرم کے بچ جانے سے زیادہ بُری بات یہ ہے کہ کوئی بے قصور سزا پا جائے، یہ بات خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے، اور نہ صرف اسلام بلکہ دنیا بھر کے مہذب قانونِ جرم وسزا میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے، محض شک وشبہ کی بنیاد پر اور بلاثبوت کسی شخص کو مجرم تصور کر لینا اور اس کے ساتھ مجرموں کا سا معاملہ کرنا قطعاً درست نہیں اور سراسر تقاضاء انصاف کے خلاف ہے، افسوس کہ ان دنوں نہ صرف اشخاص وافراد بلکہ حکومتوں میں بھی یہ رجحان عام ہوتا جارہا ہے، چند سال پہلے تک ہندوستان میں ٹاڈا کا قانون نافذ تھا، یہ بہت ہی تکلیف دہ قانون تھا، جس میں عرصہ تک ملزم بلاثبوت پولیس تحویل میں رکھا جاتا، اسے سخت اذیت پہونچائی جاتی، اور طویل عرصہ تک اس کی ضمانت بھی منظور نہیں ہوتی، اس قانون کے تحت ہزاروں افراد گرفتار کئے گئے، لیکن ایک فیصد مقدمہ میں بھی ان پر لگائے گئے الزامات ثابت نہیں ہوسکے۔

دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب مجرم معلوم ہو اور اقرار یا ثبوت وشہادت سے اس کی تعیین ہوجائے، تو صرف وہی شخص مستحقِ سزا سمجھا جائے گا، اس کے بدلے اس کے کنبہ، علاقہ، یا قوم کے دوسرے لوگوں کو مجرم تصور کرنا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کرنا درست نہیں ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان کسی قوم کے لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا، تو یہ درست نہیں ہے کہ اس قوم کا جو شخص بھی ہمارے ہاتھ آجائے، ہم اس کے ساتھ قاتل کا سا سلوک کریں، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت ''فیروز'' نامی ایرانی شخص کے ہاتھوں ہوئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان پر اس واقعہ کا ردِ عمل ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ''عبید'' نامی صاحبزادہ نے مدینہ میں مقیم بعض ذمیوں کو جوشِ انتقام میں قتل کردیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے بعد سب سے پہلا معاملہ یہی زیرِ بحث آیا، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہؓ کی رائے تھی کہ ان کو قصاص میں قتل کیا جانا چاہئے، لیکن مروان نے ایک قانونی نکتہ اٹھایا، کہ یہ واقعہ آپ کے منصب امارت پر فائز ہونے سے پہلے کا ہے، چنانچہ اس وقت کے حالات کے پس منظر میں اس واقعہ کے بارے میں پہلوتہی سے کام لیا گیا، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے، تو دوبارہ

آپ ﷺ نے اس مقدمہ پر کاروائی کرنی چاہی، لیکن وہ بھاگ کر امیر معاویہ ؓ سے جا ملے اور جنگ صفین میں مقتول ہوئے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک وحشیانہ طریقہ ہے کہ جس قوم کے ساتھ ہمارا امن وامان اور بقاء باہم کا معاہدہ ہوا گر اس قوم کے کسی فرد نے ہمارے کسی فرد پر زیادتی کی ہو، تو اصل مجرم کو ڈھونڈ نکالے بغیر ہم اس قوم کے بے قصور اور بے گناہ لوگوں پر ہلّہ بول دیں، اور ان کے جان و مال کے درپے ہو جائیں، یہ ظلم وزیادتی ہوگی اور یہ انتقام کا غیر اسلامی اور غیر قانونی طریقہ ہوگا۔

تیسری بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بدلہ میں زیادہ سے زیادہ مماثلت اور برابری کی گنجائش ہے، نہ کہ زیادتی کی، اپنے حق پر زیادتی بجائے خود ایک ظلم ہے، اور اسلام میں اس کی اجازت نہیں، قرآن مجید نے جو قانون قصاص بتایا ہے وہ اس سلسلہ میں بالکل واضح ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

" وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ "(المائدۃ:۴۵)

ہم نے ان لوگوں پر تورات میں یہ بات فرض قرار دیا تھا کہ جان کے بدلے جان لی جائے، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت، زخموں میں بھی برابری ہونی چاہئے۔

___ پس بدلہ اور انتقام میں بھی برابری ضروری ہے، اس میں بھی مبالغہ اور انصاف کی حدوں سے تجاوز درست نہیں، یہ بجائے خود زیادتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ اگر آپ کے ساتھ آپ ہی کے ملک کے کسی شہری نے زیادتی کی ہے، تو یہ بھی ضروری ہے کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں، بلکہ مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی کوشش کریں، کیوں کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینا خود بھی ایک خلاف قانون امر ہے، اگر ہر شخص نے اپنے طور پر معاملات

کا فیصلہ کرنے اور سزائیں جاری کرنے لگے تو پھر تو معاشرہ کا امن و امان ہی رخصت ہو جائے گا، قرآن مجید نے مقتول کے اولیاء کو یہ حق تو دیا ہے کہ وہ قاتل کے خلاف مقدمہ کا فریق بنے، لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطورِ خود قصاص کی کاروائی کرے، قصاص کی سزا بہر حال عدالت کے واسطہ سے ہی نافذ ہوگی۔

ہاں اس سے مدافعت کی صورت مستثنیٰ ہے، جب کسی کی جان و مال یا عزت وآبرو پر حملہ ہوتو اس کو اپنے دفاع کا بھرپور حق حاصل ہے، بلکہ فقہاء حنفیہؒ کے نزدیک اپنے آپ سے دفاع واجب ہے، **مَن شهر على المسلمين سيفًا وجب قتلهٗ** (ہندی:۶/۷) — اپنی مدافعت میں اگر حملہ آور کی جان بھی چلی جائے تو مدافعت کرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، **وَلَو اشهر على رجل سلاحاً ...... فلا شئى عليه** (ہندیہ:۶/۷) — البتہ مدافعت میں بھی یہ حکم ہے کہ اگر قتل سے کم تر درجہ کا اقدام کافی ہو جائے، تو اقدام قتل سے گریز کیا جائے (دیکھئے بدائع الصنائع: ۷/۹۳) — حفاظت خود اختیاری نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور نظامہائے قانون میں اس کو ہر شخص کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

غرض بدلہ وقصاص اور انتقام کے باب میں بھی اسلام کی تعلیمات نہایت واضح، منصفانہ، معتدل اور متوازن ہیں، مسلمان خواہ دنیا کے کسی خطہ میں ہوں، وہ دوستوں کے درمیان ہوں، یا دشمنوں کے درمیان، بہرصورت یہ بات ضروری ہے کہ وہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات اور قرآنی ہدایات کو ملحوظ رکھیں، کوئی قوم خواہ ہماری نگاہ میں وہ برائی اور فساد پر کاربند ہو، ہمیں بہر حال یہ بات سزاوار نہیں کہ عدل اور اعتدال کا راستہ چھوڑ دیں۔ ''وَلَا يَجرمنكم شنآن قوم على ان لا تعدلوا'' (مائدہ:۸)

(۸/ مارچ ۲۰۰۲ء)

مفتوحین کے ساتھ سلوک

موجودہ عہد فکری اور تہذیبی ارتقاء کا عہد کہلاتا ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ تہذیب و ثقافت اور انسانی اقدار کا احترام جیسا کچھ آج کے عہد میں ہے، جو مغرب کے سیاسی غلبہ اور عروج کا عہد ہے پہلے کبھی نہیں تھا، لیکن یہ دعویٰ کس قدر مبنی برحقیقت ہے؟ آئے دن کے واقعات اس پر گواہ ہیں، اس کی ایک مثال اس وقت ''چیچنیا'' ہے، یہ دوہرا رویہ ہی انصاف کو مجروح کرنے کے لئے کافی ہے کہ جارجیا، آرمینیا اور لتھوانیا جو عیسائی ریاستیں ہیں، انہوں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو پورے مغرب نے ان کے اعلان آزادی کی حمایت کی اور روس کو اس کو منظور کرنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن اگر چیچنیا، انگوشتیا، داغستان اور قفقاز کی مسلم ریاستیں آزادی چاہتی ہیں تو نہ روس اسے قبول کرتا ہے اور نہ ہی مغرب اس کی تائید میں ہے، اور ان ریاستوں کی جنگ آزادی کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کا نام دیا گیا ہے۔

افسوس کہ ان مجاہدین آزادی کے ساتھ کوئی زبانی کلمۂ ہمدردی کہنے والا بھی موجود نہیں، حد یہ ہے کہ مسلم ملکوں نے بھی اس موقع پر ایسی خاموشی اختیار کی ہے کہ گویا اگر کچھ احتجاج کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ ہو جائے گا، سوائے ایک افغانستان کے چیچنیا کے قتل پر کوئی دو آنسو بھی گرانے والا موجود نہیں، یہ عالم اسلام کی ایسی بے حسی ہے کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے اور شاید جانور بھی اپنے ہم جنسوں کی ہلاکت پر ایسی خاموشی گوارا نہ کریں، بوسنیا میں کیسے کیسے مقتل سجائے گئے، اور مغرب خاموش تماشائی بنا رہا، کوسووو میں البانوی مسلمانوں پر کیا کچھ ستم نہیں ہوئے، لیکن انسانی ضمیر کو کوئی حرکت نہیں

ہوئی۔ چیچنیا کا سانحہ تو ان سب سے زیادہ سنگین ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ انڈونیشیا کے ایک علاقہ میں کچھ عیسائی آزادی کا مطالبہ کریں تو وہ مجاہدین آزادی ہیں، اور انڈونیشیا کو پروانۂ آزادی پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا جائے، اور چیچنیا کے مسلمان آزادی کے طلب گار ہوں تو وہ دہشت گرد اور غارت گر قرار پائیں۔

چیچنیا میں کیا کچھ مظالم ڈھائے گئے، اور کس کس طرح بے گناہوں کے خون سے پیاس بجھائی گئی؟ اس بارے میں بہت کم تفصیلات، ذرائع ابلاغ تک پہونچ پاتی ہیں، لیکن روسی فوجیوں کی خوں آشامی کی ایک روایت رہی ہے، اور اس کی روشنی میں ان کے جور وستم کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ابھی اخبارات کے ذریعہ ان مظالم کا ایک منظر جو سامنے آیا ہے تنہا وہی دل دہلا دینے کے لئے کافی ہے کہ چیچنیا کے سپاہیوں اور شہریوں کی نعشوں کے پیر رسیوں کے ذریعہ ٹرک سے باندھ دیئے گئے اور کھینچے گئے۔ اور بعض رپورٹوں کے مطابق زندہ سپاہیوں کو بھی گاڑیوں سے باندھ کر کھینچا گیا، یہ ایسی شرمناک اور نفرت انگیز حرکتیں ہیں کہ ان پر جتنی بھی ملامت کی جائے کم ہے۔ حالاں کہ بین الاقوامی قانون کے تحت جنگی قیدیوں اور جنگ میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی نعشوں کے ساتھ احترام برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی مسلم ملک کی طرف سے ایسا کوئی واقعہ پیش آگیا ہوتا تو پورا مغرب ومشرق سراپا احتجاج بن گیا ہوتا، اور اس کو اسلامی دہشت گردی کا نام دیا جاتا، لیکن عجیب بات ہے کہ اس غیر انسانی رویہ اور اس کے مرتکبین کو دہشت گردی اور دہشت گرد کا عنوان نہیں دیا جاتا۔

مغرب میں انسانی خون سے آتشِ انتقام بجھانے کا ذوق زمانۂ قدیم سے ہے۔ یورپ میں اسلام سے پہلے بڑے بڑے اسٹیڈیم قائم تھے جہاں ''سیافی'' کے نام سے ایک غیر انسانی کھیل منعقد ہوتا تھا، قیدیوں کا جنگلی جانوروں یا خود دوسرے قیدیوں سے مقابلہ کروایا جاتا تھا، اور ان کی بے دردانہ ہلاکت کے تماشے نہایت ذوق وشوق سے دیکھے جاتے تھے، نپولین نے چار ہزار ترک قیدیوں کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ ان کے کھانے پینے کا بوجھ خواہ مخواہ کیوں برداشت کیا جائے۔ بیت المقدس پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوا،

تو ستر ہزار مسلمان شہید کر دیئے گئے ، اور یہودیوں کو ان کے مقدس مذبح میں ایک ساتھ نذر آتش کر دیا گیا، خود عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق شہر میں ہر جگہ کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اور اعضاء نظر آتے تھے، یہ سلوک تو دوسری قوموں کے ساتھ تھا، خود عیسائیوں کے ایک فرقہ کا رویہ دوسرے فرقوں کے ساتھ کچھ کم جارحانہ نہیں تھا، کلیسائی نظام کے غلبۂ و عروج کے زمانہ میں مذہبی عدالتوں کے حکم پر جو عیسائی قتل کئے گئے، ان کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اور سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ مذہبی اختلاف کی بناء پر جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ان پر یہ سزا زندہ جلا کر جاری کی جاتی، ایسی قوم سے نمائشی دعووں کی امید تو رکھی جاسکتی ہے حقیقی رحم کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟

اسلامی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اسلام سے پہلے عربوں میں مثلہ کا طریقہ تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرتی تو ان کے اعضاء کی قطع و برید کرتی، بلکہ بعض تاریخی اور ادبی مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب تک پیا کرتے، خود رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش کا غزوۂ اُحد میں مثلہ کیا گیا۔ اسلام نے اس غیر انسانی طریقہ سے منع کیا، اور آپ ﷺ نے صراحتاً عین جنگ کے دوران بھی مثلہ کرنے کی ممانعت فرمائی، مفتوحین کی نعشوں کے ساتھ کبھی بھی بے حرمتی کے رویہ کو آپ نے روا نہیں رکھا، غزوۂ بدر میں اہلِ مکہ میں سے بڑے بڑے سردار جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے، اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہونچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، وہ قتل ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے ان کی نعشوں کے ساتھ کوئی غیر انسانی سلوک نہیں کیا۔ بلکہ بدر ہی کے میدان میں ایک گڑھے میں مسلمانوں نے ان کو دفن کر دیا۔ غزوۂ خندق کے موقعہ سے مشرکین کی فوج میں سے ایک شخص خندق پار کر کے حملہ آور ہوا، اور قتل کیا گیا، اہلِ مکہ اس لاش کا معاوضہ ادا کر کے لاش حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے اس کا معاوضہ لینا گوارا نہیں فرمایا، اور یوں ہی لاش حوالہ فرمادی۔

غزوۂ بنوقریضہ میں یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے حکم کے فیصلہ کی بناء پر خود یہودی

قانون کے مطابق قریب چار سو فوجی قتل کئے گئے، کیوں کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ غداری اور معاہدہ شکنی کی تھی، اور اپنی دانست میں ایسا قدم اٹھایا تھا کہ مدینہ کی اسلامی مملکت صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائے، لیکن ان کے ساتھ بھی کوئی غیر انسانی رویہ نہیں برتا گیا۔ اور ان کی نعشیں بھی دفن کی گئیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی سزائے قتل کا مستحق ثابت ہو جائے اور اسے قتل ہی کرنا ہو تو بھلے طریقہ پر قتل کرو یعنی ایذائیں پہونچا پہونچا کر اور بے دردانہ طریقہ پر اسے ہلاک نہ کیا جائے۔

ان اسلامی تعلیمات کا مسلمانوں پر ایسا اثر تھا کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ غلبہ پانے کے بعد ہمیشہ فراخ دلانہ رویہ اختیار کیا، وہ جنگ کے میدان میں جتنے بہادر تھے، صلح کی میز پر اس سے زیادہ وسیع القلب، جیسے میدان کارزار ان کی تلوار کی جھنکار سے لرزتے تھے، ویسے ہی ان کی صلح پسندی اور انسانیت نوازی دشمنوں کے دلوں کو فتح کرتی تھی، وہ میدانِ مقابلہ میں جتنے بلند ہمت تھے، صلح کی بزم میں اسی قدر عالی حوصلہ اور بامروت، اسی لئے جو علاقہ ان کے ہاتھوں فتح ہوتا وہاں کی شکست خوردہ آبادی کچھ ہی دنوں میں ان کے اخلاق و محبت اور مہر و وفا کی وجہ سے ان کی گرویدہ ہو جاتی، اور انہیں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی ابرِ رحمت ان پر سایہ فگن ہو گیا ہے۔

جو لوگ آج مسلمانوں کو دہشت گرد اور جنونی قرار دیتے ہیں وہ ذرا اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھیں، اپنی انسانیت پروری کا جائزہ لیں، اور بتائیں کہ کیا کبھی مسلمانوں نے بھی اپنے مغلوب بلکہ مہلوک دشمنوں کے ساتھ ایسا انسانیت سوز برتاؤ روا رکھا ہے؟ — ہمیں یقین ہے کہ انشاء اللہ غیر مسلموں کے تئیں مسلمانوں کے ایسے رویہ وسلوک کی ہرگز کوئی مثال نہیں ملے گی!

(۱۰/مارچ/۲۰۰۰ء)

تخفیف اسلحہ اور اسلام

۲۴ تا ۳۰ ؍اکتوبر کا ''ہفتہ'' اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی سطح پر ''ہفتہ تخفیف اسلحہ'' کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، اس کا مقصد پوری دنیا کو اس جانب متوجہ کرنا ہے کہ وہ تباہ کن اور ہلاکت خیز ہتھیاروں میں کمی کریں کیوں کہ انسانیت کو تخت وتاراج اور تباہ وبرباد کرنے کے سوا اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا، گویا مہلک اسلحہ کا ذخیرہ انسانیت کے لئے خود کشی کے مترادف ہے، اور اپنی قبر آپ کھودنا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتیں جو امن وامان کا نام لیتی ہیں اور اپنے آپ کو امن اور سلامتی کا پیغامبر تصور کرتی ہیں، یہی طاقتیں ہتھیاروں کی سوداگر ہیں، نت نئے مہلک ہتھیاروں کی منڈیاں گویا ''انسانیت کی قتل گاہیں'' یہی آراستہ کرتے ہیں، یہ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں کو ہتھیار فراہم کر کے ایک دوسرے کے خلاف جنگ پر اکساتے بھی ہیں، اور دوسری طرف صلح وامن کی تلقین بھی کرتے ہیں، مشرق بعید کے ممالک جاپان، کوریا، ملیشیا وغیرہ نے جب سے صنعتی طور پر پیش رفت کی ہے اور ایسی صنعتوں میں قدم بڑھایا ہے جو انسان کے لئے نافع اور فائدہ بخش ہیں، تب سے خاص طور پر مغربی ملکوں نے ہتھیاروں کی صنعت پر اپنی توجہ مزید بڑھادی ہے، اور اس بات کی بھرپور کوشش بھی کی ہے کہ مشرقی ممالک دفاعی ٹکنالوجی میں آگے نہ بڑھیں تاکہ اس مہنگی اور ملکی سلامتی کے لئے ناگزیر صنعت میں ہماری اجارہ داری باقی رہے، اور پوری دنیا ہتھیاروں کی خریداری میں ہم پر ہی انحصار کرے، ایسی قوموں کی طرف سے دوسروں کو تخفیف اسلحہ کی تلقین یقیناً ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔

تاہم ہمیں اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لینا چاہئے ـــــ اسلحہ کی ایک قسم وہ ہے جو مجرم اور ظالم کو تنہا نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، مثلاً تلوار ہے، جس شخص پر وار کیا جائے وہی اس سے متاثر ہوتا ہے، تیر اور بندوق ہے اس کے نشانے بھی محدود ہوتے ہیں، آج کل جنگ کے موقعہ سے آبادیوں کا تخلیہ کرادیا جاتا ہے، اور میدان جنگ میں محدود نشانے تک وار کرنے والے ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں، ان کو بھی جنگی حالات میں ایسے ہی اسلحہ کے زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے، کیوں کہ فوج اور فوجی ٹھکانے ہی ان کا اصل نشانہ ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے ہتھیار وہ ہیں جو بہت دور تک کے علاقہ کو نشانہ بناتے ہیں، اور محض کوئی محدود جگہ ان کا ہدف نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک بڑے علاقہ کو اس امتیاز کے بغیر کہ وہ فوجی اہمیت کا حامل علاقہ ہے یا عام رہائشی علاقہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، بیمار و معذور، بے قصور شہری، جانور، مکانات، کھیتیاں اور غیر دفاعی صنعت پر مبنی کارخانے سب اس کا نشانہ بنتے ہیں، اس قسم کے ہتھیار بنیادی طور پر ظلم کی مدافعت کے لئے نہیں ہیں بلکہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے اور دوسروں کی زمین ہڑپنے کے لئے ہیں۔

مدافعت اسلام کی نگاہ میں افراد و اشخاص کا بھی اور ممالک و اقوام کا بھی بنیادی حق ہے، اور جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت نہ صرف جائز بلکہ حتی المقدور واجب ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من قتل دون دينه فهو شهيد من قتل دون ماله فهو شهيد، و من قتل دون اهله فهو شهيد" (ترمذی: ۱/۲۶۱، کتاب الدیات)	جو دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ بھی شہید ہے۔

اس لئے ایسا اسلحہ جو محدود نشانہ کا حامل ہو، اور مدافعت کے لئے کافی ہو، انفرادی اور قومی ضروریات کے اعتبار سے مطلوب اور پسندیدہ ہے، غور کیجئے، صلح حدیبیہ میں مشرکین چاہتے تھے کہ مسلمان غیر مسلح ہو کر آئیں، اس وقت بھی آپ ﷺ نے اس پر اصرار

فرمایا کہ کم سے کم تلوار ضرور ساتھ ہوگی، چاہے نیام کے اندر ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سوتے تب بھی بستر میں تلوار رکھ کر سوتے، اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ استنجا اور نماز عید وغیرہ کے لئے آبادی سے باہر تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا، کیوں کہ اس وقت مسلمان جن خطرات سے دوچار تھے، ان حالات میں اپنی حفاظت اور مدافعت کے لئے کچھ نہ کچھ مسلح رہنا ضروری تھا، معلوم ہوا کہ جیسے افراد واشخاص اپنی حفاظت کے لئے مناسب تدبیر کے مکلّف ہیں، اسی طرح ملکی اور قومی سطح پر بھی دفاعی اغراض کے تحت ہتھیار ایک لازمی حق ہے، اور اسی لئے قرآن نے مستعد رہنے کا حکم دیا ہے، ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ'' (انفال:٦٥)

ہتھیار کا استعمال دو صورتوں میں مذموم اور ناپسندیدہ ہے، ایک اس وقت جب ہتھیار حفاظت اور بچاؤ کے بجائے دوسروں پر ظلم وجور کے لئے کیا جائے، اور اسے دہشت گردی کا سامان بنالیا جائے، دوسرے جب وہ مجرموں کے ساتھ بے گناہوں اور قصور واروں کے ساتھ بے قصوروں کو نشانہ بنائے، اور جو انسان کو جنگ کے قوانین وآداب کا پابند نہیں رہنے دے، اسلام نے اس بات سے منع کیا ہے کہ جنگ کے درمیان بچوں اور عورتوں کو نشانہ بنایا جائے، ایک جنگ کے موقعہ پر دشمنوں میں سے ایک خاتون مقتول پائی گئیں، آپ ﷺ نے دیکھا تو ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے، (بخاری، حدیث:۳۰۱۴۔۱۵، مسلم، حدیث نمبر ۱۷۴۴) اسی طرح جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں، عام شہری ہوں، ان کو بھی نشانہ بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر خاص طور سے سپہ سالار فوج حضرت خالد بن ولید کو اطلاع بھیجی کہ کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کریں، لایقتلن امراۃ ولاعسیفا، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۶۹) مزدور کو قتل کرنے کی ممانعت کا منشا یہ ہے کہ بے قصور شہریوں کو نشانہ نہ بنایا جائے، اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بوڑھے شخص پر حملے کرنے سے بھی منع فرمایا، ارشاد ہے: ولا تقتلوا شیخا ما......) (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۱۴)

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی کو آگ میں جلایا جائے، اور

فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ ہی کو ہے،''ان النار لا یعذب بھا الا اللہ'' (بخاری، حدیث نمبر:۳۰۱۶) اس حدیث سے آتشیں ہتھیاروں کا حکم معلوم ہوا کہ اسلام بنیادی طور پر ایسے اسلحہ کے استعمال کو بہتر نہیں سمجھتا، سوائے اس کے کہ مدافعت کی اس کے سوا کوئی راہ باقی نہ رہے، اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا رواج عام تھا، یعنی جب کوئی فوج اپنے دشمن پر غلبہ حاصل کر لیتی تو اس کے اعضاء کی قطع و برید کرتی، اور اس کے چہرے مسخ کر کے رکھ دیتی، اس غیر انسانی فعل کو ''مثلہ'' کہا جاتا، آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے مروی ہے: و ینھانا عن المثلۃ ، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۶۷) آپ ﷺ کے اس ارشاد سے کیمیکل ہتھیاروں کا حکم اخذ کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ کیمیائی اسلحہ شکل وصورت کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، اور گویا زندہ انسانوں کے حق میں ایک طرح کا مثلہ ہی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ان ارشادات سے واضح ہوا کہ نیوکلیر اسلحہ، اسی طرح ایسے فاصلاتی ہتھیار جو سینکڑوں میل آگے کے شہروں کو نشانہ بنا سکتے ہیں جیسے میزائیل آتشیں ہتھیار کو اسلام جنگی مقاصد کے لئے بھی پسند نہیں کرتا، کیوں کہ ان کا اثر لڑنے والے فوجیوں تک محدود نہیں رہتا، بلکہ بوڑھوں، بچوں، خواتین اور بے قصور شہریوں کی ہلاکت اور بلا امتیاز بڑی بڑی آبادیوں کی تباہی و بربادی کا باعث بنتا ہے، کتنے ہی قریوں اور شہروں کو آتش فشاں بنا دیتا ہے، اور کتنے ہی لوگوں کو اپاہج و معذور اور زندگی کی بنیادی ضرورت سے بھی محروم کر کے چھوڑتا ہے، اسلام یقیناً ایسے اسلحہ میں تخفیف وتحدید بلکہ بہ تدریج اس کے خاتمہ کا قائل ہے تاکہ اسلام نے جنگ کے جو آداب بتائے ہیں، اور جو احکام و قوانین دیئے ہیں ان کی رعایت ہو سکے۔

لیکن ظاہر ہے کہ تخفیف اسلحہ کی تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب یہ دو طرفہ بنیاد پر ہو، اور اس سلسلہ میں ہمہ قومی معاہدہ ہو سکے، اس لئے اگر کچھ قومیں تخفیف اسلحہ کے اصول پر عمل کریں اور کچھ قومیں نت نئے اسلحے بنائیں اور ان کا ذخیرہ کرنے میں بھی مشغول ہوں، تو یہ کھلی ہوئی ناانصافی اور قطعاً غیر منصفانہ بات ہوگی، بلکہ اس سے ظلم و

جور کو مدد ملے گی، اور اس میں اضافہ ہوگا۔ اگر دشمن ایسے ہتھیار سے مسلح ہوں، تو پھر اسلام ایسی تیاری کا حکم دیتا ہے جس میں دشمن کی طاقت کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہو اور مدافعت کی پوری پوری رعایت رکھی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بعض غزوات میں ''منجنیق'' استعمال فرمائی ہے اور قلعہ بند فوجوں کے خلاف اس کا استعمال فرمایا ہے، ''منجنیق'' گویا اس زمانہ کی توپ تھی، جس سے بڑی بڑی چٹانیں دور تک پھینکی جاسکتی تھیں، اسی طرح آپ ﷺ نے بنونظیر کے باغات کو نذر آتش کرنے کی بھی اجازت دی، کیوں کہ مقابلہ کے لئے اس کے سوائے چارہ نہ تھا۔ (دیکھئے: ابوداؤد حدیث نمبر: ۲۶۱۵)

پس اسلام یقیناً اندھا دھند تباہی و بربادی پھیلانے والے اسلحہ میں تخفیف بلکہ اس کے خاتمہ کو پسند کرتا ہے، لیکن اس وقت جب کہ یہ عمل امتیاز اور غیر مساویانہ طرزِ عمل پر مبنی نہ ہو، بلکہ تمام قومیں اس کو دیانت داری کے ساتھ قبول کریں، تاکہ انسانیت جس خودکشی کی طرف بڑھ رہی ہے اور جس تباہی و بربادی کو خود دعوت دے رہی ہے، اس سے بچ سکے، کاش! اقوام عالم سچ مچ تخفیف اسلحہ کے تصور کو قبول کریں، اور انسانیت کو اس تباہی و بربادی سے بچانے کا سروسامان کریں، جس کی طرف وہ تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور انسان کی جو قیمتی صلاحیت تخریب کی سمت گامزن ہے وہ انسانیت کی تعمیر اور اس کے گیسوئے پریشاں کو سنوارنے میں صرف ہو۔

(۲۹/اکتوبر ۹۹ء)

نیوکلیر اسلحہ ـــــــ اسلامی تصور

دوسری جنگ عظیم کو جس بھیانک واقعہ نے اختتام پر پہنچایا، وہ یہ تھا کہ امریکہ نے جاپان کے دوشہروں پر ایٹم بم برسائے۔ یہ صبح کا وقت تھا اور سورج نے ابھی ابھی اپنی آنکھیں کھولی تھی، لیکن اسے خبر نہ تھی کہ اس کے اوپر اٹھنے سے پہلے ہی جاپان کے دو بڑے شہروں پر موت کی شب تاریک چھا جائے گی۔ اس حملہ نے آن کی آن میں لاکھوں آدمیوں کی جان لے لی اور بے شمار انسان معذور اور اپاہج ہوگئے، انسانی اجزاء بھنے ہوئے لاؤوں کی طرح فضا میں بکھر گئے اور آج بھی یہ زمین سبزہ سے محروم ہے۔

مغربی قوموں نے ایسا خطرناک اور ہلاکت خیز ''بم'' محض اپنی قوت کے اظہار اور زیادہ سے زیادہ انسان کو کم سے کم وقت میں شکار کرنے کے شوق میں بنایا تھا، لیکن مشرقی قوموں کو خوف کی نفسیات نے نیوکلیر اسلحہ سازی کی طرف پیش قدمی کرنے کی طرف مجبور کیا۔ روس اور روس کے بعد چین نے اس فن میں دادِ مہارت دی۔ ہندوستان چین کے پڑوس میں ہے اور ہندوستان کے ایک قابلِ لحاظ علاقہ پر چین اپنی فوجی طاقت کی وجہ سے قابض ہے۔ ان حالات میں ہندوستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ بھی اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرے، چنانچہ گزشتہ دِنوں ہمارے ملک نے بھی نیوکلیر تجربے کئے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس مسئلہ کو محض سیاسی اور دفاعی نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کو بھی جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو اسلام کی نگاہ میں ناپسند ہو، اور مظلوموں کی مدد اور

ظالموں کے پنجۂ ظلم کو تھام لینا ان باتوں میں سے ہے جس کو اسلام نہایت ہی تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ظالم بھائی کی بھی مدد کرو اور وہ یہ ہے کہ اس کو اپنے ظلم سے روک دو۔ (بخاری: ۲/۴۴۳ ط بیروت)

اس لئے اسلام نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر ملک کے لئے بلا امتیاز حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کے حق کو تسلیم کیا ہے، البتہ دوسرے اُمور کی طرح اس معاملے میں بھی وہ افراط اور حد اعتدال سے تجاوز کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام شاید پہلا نظام حیات ہے جس نے جنگ کے قوانین مرتب کئے اور عین حالتِ جنگ میں بھی تہذیب وشائستگی کا دامن نہ چھوڑنے کی تعلیم دی اور مفتوح قوموں کے حقوق اور ان کی نسبت سے فاتحین کی ذمہ داریاں متعین کیں۔ کم لوگ اس حققت سے باخبر ہیں کہ قانون کی تاریخ میں بین ملکی اور بین قومی تعلقات اور حقوق پر پہلی کتاب امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کی ہے جو ''سیر کبیر'' اور ''سیر صغیر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ خود مغربی مصنفین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ بین قومی قانون پر لکھی گئی یہ پہلی کتاب ہے۔

قانونِ جنگ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات بہت واضح ہیں۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کسی شخص کو جنگ کے درمیان بھی نذرِ آتش کیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ سے عذاب دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ (بخاری: ۲/ ۹۲۷ ط بیروت) آپ ﷺ نے اس پر اپنی ناخوشی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (بخاری: ۲/۹۶۲ ط بیروت) آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ دشمن پر شب خون مارا جائے۔ (ترمذی: ۴/۱۲۱ ط بیروت) کیوں کہ اس میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور عام شہری بھی حملہ کا نشانہ بن جاتے ہیں، آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید ؓ کو خاص طور پر ہدایت فرمائی:

''لاتقتلن امرأة ولا عسیفاً''۔ (ابوداؤد: ۲/۳۶۲)

اسلام سے پہلے جنگ میں مثلہ کرنے کا عام رواج تھا، یعنی جب کسی قوم پر غلبہ حاصل کرلیا جاتا، تو ان کے ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹ لیتے اور بعض شقی القلب تو ان کا ہار بنا کر پہنتے بھی تھے، آپ ﷺ نے اس غیر مہذب طریقہ سے بھی منع فرمایا۔

(ابوداؤد: ۲/ ۳۶۱) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں بھلا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ قتل میں بھی اور جانوروں کو ذبح کرنے میں بھی۔ (مسلم عن شداد بن اوس) اسی طرح کوئی بھی ایسی صورت جس سے انسان کا چہرہ بگڑ جائے، روا نہیں۔ رحمت عالم ﷺ نے تو جانور کا چہرہ داغنے سے بھی منع فرمایا۔ (ترمذی: ۲۱۱/۴ ط بیروت) چہ جائے کہ انسان کا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی ان ہدایات سے ظاہر ہے کہ اُصولی طور پر جنگ میں ایسے اسلحہ کا استعمال درست نہیں جو آتشیں ہوں، جو بلا امتیاز فوجیوں اور شہریوں کو، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو، بیماروں اور معذوروں، نیز مردوں اور عورتوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں، جو اپنے نشانہ بننے والے متاثرین کا چہرہ بگاڑ دیتے ہوں اور ایک حد تک ان کا مثلہ ہو جاتا ہو۔ اگر اس پہلو سے نیوکلیر اسلحہ کے بارے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلحہ ان تمام ہدایات کی خلاف ورزی پر مبنی ہیں، یہ انسانوں کے علاوہ بے زبان جانور کو بھی اپنا ہدف بناتے ہیں اور نہ صرف سرسبز کھیتوں اور درختوں کو تباہ وتاراج کرتے ہیں، بلکہ بسے بسائے شہر اور ہرے بھرے کھیت اور باغات کو ہمیشہ کے لئے بے آب وگیاہ صحراء اور ویرانہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ جنگ کے درمیان ہرے بھرے کھیت ضائع کر دیئے جائیں۔

علاوہ ان وجوہ کے، اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان اسلحہ پر بڑی لاگت آتی ہے۔ اعلیٰ ٹکنالوجی کا حصول، مختلف تجربات سے گزرتے ہوئے اس کا استعمال، نیز اس کی محافظت کی تدبیر اور اس کو اپنے نشانہ تک پہنچانے کے لئے ذرائع واسباب کی تیاری، یہ تمام مراحل اتنے اخراجات کے متقاضی ہیں کہ ان میں لاکھوں ناخواندہ بچوں کی تعلیم اور بے سہارا یتیم بچوں کی کفالت ہو سکتی ہے اور عوام کے لئے کتنے ہی فلاحی ورفاہی کام سرانجام پا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اتنے سارے معاشی وسائل کو محض بڑی طاقت کہلانے کے لئے بارود کے ڈھیر میں تبدیل کر دینا نہ صرف اسلامی اور مذہبی، بلکہ اخلاقی اور انسانی نقطۂ نظر سے بھی کوئی مناسب بات نہیں۔

تاہم فقہ اسلامی کا ایک عام اُصول ہے کہ جو باتیں ممنوع ہوں، مجبوری کی بناء پر ان کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔اسی لئے مجبوری کی حالت میں آپ ﷺ نے جنگ میں منجنیق بھی استعمال فرمائی۔ یہ آپ ﷺ کے زمانے کا ایک ترقی یافتہ ہتھیار تھا، جس کے ذریعے دشمن کے قلعہ پر پتھر کی چٹانیں پھینکی جاسکتی تھی، بعض اوقات دشمن سے محافظت کے لئے ہرے بھرے باغات بھی کاٹنے پڑے ہیں اور غیرارادی طور پر ایسے لوگ بھی حملہ کی زد میں آئے ہیں، جن کے بارے میں آپ ﷺ کی ہدایت تھی کہ ان پر حملہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ بعض اوقات ان کی مدافعت اور مقابلہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہوتا، اس لئے اقدامی طور پر تو نہیں، لیکن دفاعی نقطۂ نظر سے ایسے اسلحہ کا بنانا اور اس کی ٹکنالوجی حاصل کرنا جائز ہے، لیکن اس کے استعمال میں پہل کرنا درست نہیں، جوابی اقدام کے طور پر اس کے استعمال کی گنجائش ہوگی، یعنی نیوکلیر طاقت کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی زبان میں قوتِ مرہبہ ہے۔ (انفال :۶۰) جو محض اس لئے ہے کہ دشمن کو مرعوب رکھا جائے اور ان پر ایسی ہیبت طاری رکھی جائے کہ وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکے، یہ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت سوزی اور خوں آشامی کے لئے اس کو کھلونا بنالیا جائے۔

مغربی طاقتیں اس وقت جس طرح ایشیائی ممالک خصوصاً ہندوستان کو نیوکلیر اسلحہ سازی سے باز رکھنے کی کوشش کررہی ہیں، وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں اور سراسر امتیاز پر مبنی ہے۔امریکہ دوسری جنگ عظیم میں ایک ایشیائی ملک کے خلاف اس طاقت کا استعمال کر کے تباہی مچا چکا ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اس سلسلہ میں سنجیدہ اور ذمہ دار رویہ کا حامل تصور کرتا ہے اور جن ملکوں نے ہمیشہ صبر وتحمل کا رویہ اختیار کیا ہے، ان کو مورِدِ الزام ٹھہرایا جارہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ نیوکلیر طاقت ایک ایسی صلاحیت ہے جو فریقین کو محتاط رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ امریکہ وروس کی سخت باہمی کشاکش کے باوجود کوئی جنگ نہ ہوسکی۔ چین اور روس کے درمیان بھی سخت مخاصمت کے باوجود جنگ کی نوبت نہیں آئی۔خود ہمارے ملک ہندوستان نے جب سے ایٹمی دھماکہ کیا ہے، اس کے پڑوسیوں کو اس پر کوئی نئی جنگ کی ہمت نہیں ہو پائی۔ تاہم خود ایشیائی ملکوں کے لئے یہ

بات سوچنے کی ہے کہ کیا ان کی معاشی قوت اس طرح کے اقدام کی متحمل ہے؟ جہاں آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے آسمان کے سائے کے سوا سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں اور کتنے ہی انسان ہیں کہ ہر سال فاقہ مستی ان کی جان لے لیتی ہے، کتنے ہی یتیم بچے ہیں کہ ان کے سر پر کوئی محبت کا ہاتھ رکھنے والا نہیں، کتنی ہی بے کس بیوائیں ہیں جو اس بات کی منتظر ہیں کہ ان کی حکومتیں ان کے درد کا مداوا کریں، پھر کیا ان طاقتور ترین نیوکلیر ہتھیاروں کے ذریعہ فاقہ مستوں کی بھوک بھی مٹائی جا سکے گی اور غریبوں کے آنسو بھی پونچھے جا سکیں گے؟؟

(۲۹ر مئی ۱۹۹۸ء)

مزدوروں کے حقوق

کل یکم مئی ہے، ''مئی'' کا مہینہ آتے ہی مزدوروں کے حقوق وفرائض کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جس کو گذشتہ نصف صدی کے اہم ترین مسائل میں شمار کیا جاسکتا ہے اور یہ فطری بات ہے، دنیا کی ساری بہار دراصل انہی کے دم سے ہے، بلند قامت عمارتیں ہوں، صاف ستھری سڑکیں ہوں یا دیہات کے سبزہ زار کھیت اور بل کھاتی ہوئی نہریں، سب کو ان کے خون و پسینہ اور قوتِ بازو سے غذا ملتی ہے۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ معاشی ترقی اور خوشحالی میں سب سے کم حصہ مزدوروں ہی کو ملتا ہے، حالاں کہ وہ سب سے زیادہ اس کے حقدار تھے۔

اسلام نے دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح اس باب میں بھی مفصل اور واضح ہدایات دی ہیں، جس میں آجر اور مزدور دونوں کے حقوق کی رعایت ہے اور اعتدال و توازن بھی ہے۔

سب سے پہلے تو اسلام نے مزدوروں کو ایک بلند مقام اور منصب کا حامل قرار دیا اور عام طور پر جو اس طبقہ کو کمتر اور حقیر گردانا جاتا تھا، جو اب تک باقی ہے، کی نفی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

- حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ سال یا دس سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی مزدوری کی۔ (مسند احمد، ابن ماجہ عن عتبہ بن منذر رضی اللہ عنہ)
- حلال روزی کی تلاش میں محنت و کاوش کو عند اللہ پورے ایک سال امامِ عادل کے ساتھ جہاد سے افضل قرار دیا گیا۔ (ابن عساکر عن عثمان رضی اللہ عنہ)

✿ چھوٹے بچے، ماں باپ اور خود اپنی کفالت کے لئے دوڑ دھوپ (سعی) کو آپ ﷺ نے اللہ کی راہ میں جدوجہد بتایا۔ (طبرانی عن کعب بن عجرۃ)

✿ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ عمل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے ہاتھوں کمائے (بیہقی عن علی رضی اللہ عنہ، طبرانی عن ابی بردہ رضی اللہ عنہ) اور خدا کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کھایا کرتے تھے۔ (بخاری عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ومقدام رضی اللہ عنہ)

✿ اللہ تعالیٰ ایسے مومن بندہ کو پسند کرتا ہے جو صنعت وحرفت سے واقف ہو اور اس سے کام لیتا ہو **(ان اللہ یحب العبد المؤمن المحترف)** (طبرانی عن ابن عمر رضی اللہ عنہ)

✿ آپ ﷺ نے فرمایا تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں اور فرمایا خود میں بھی چند قیراطوں پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، (بخاری وابن ماجہ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ)

✿ کاشتکاری کو مبارک کہا گیا اور اس کا حکم دیا گیا۔ (ابوداؤد عن علی بن حسین رضی اللہ عنہ مرسلاً)

✿ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا سب سے حلال کمائی وہ ہے جس میں دونوں پاؤں چلیں، ہاتھ کام کریں اور پیشانی عرق آلود ہو۔ (دیلمی عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ)

ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مزدوروں کو ایک معزز اور مؤقر مقام حاصل ہے اور دوسرے پیشوں اور طبقوں سے ان کی حیثیت کم نہیں ہے۔

اُجرت کی مقدار

اس کے بعد مزدوروں کے حقوق کا مسئلہ آتا ہے، جس میں سب سے بنیادی اور اولین چیز اجرت کی مقدار کا تعین ہے۔ اس پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں حضور ﷺ نے غلاموں کے سلسلہ میں درج ذیل ہدایات دی ہیں:

> ’’وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے، لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے جو اس کے لئے دشوار ہو اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔‘‘ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

پیغمبر اسلام اور ان کے اصحابؓ کا اس ہدایت پر مکمل عمل تھا، ان کے غلام اور خدام ان کے ساتھ ہی وہی کھانا کھاتے تھے جو وہ خود کھاتے تھے، غلاموں اور ان کے مالکوں کی کپڑے ایک ہی معیار کے ہوتے تھے، ایک بار ایک ہی قسم کی چادر حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کے غلام اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے عرض کیا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ وہ چادر بھی خود ہی اوڑھ لیں، تاکہ اس کا جوڑا ہو جائے اور غلام کو کوئی اور چادر دے دیں۔ حضرت ابوذرؓ نے اس سے انکار کرتے ہوئے حضور ﷺ کی اسی ہدایت کا حوالہ دیا کہ جو خود پہنو وہی اس کو پہناؤ۔ (بخاری عن معرورؓ)

اس سے معلوم ہوا کہ مزدوروں اور ملازمین کی اجرت اس قدر ہونی چاہئے کہ کم از کم خوراک اور پوشاک کے معاملے میں اس کا معیارِ زندگی مالکین اور افسروں کے مساوی اور یکساں ہو۔

دوسرے اجرت کی مقدار اتنی ہو کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کر سکے، حسب ضرورت خادم رکھ سکے اور مکان بنا سکے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے اسے چاہیے کہ بیوی حاصل کر لے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان فراہم کر لے (ابو داؤد عن سقورد بن شدادؓ) حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد فرمایا: میرا ذریعۂ معاش میرے اہل وعیال کے لئے کافی تھا، اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کر دیا گیا ہوں، اس لئے ابو بکر کے عیال اسی سرکاری مال میں سے کھائیں گے اور ابو بکر مسلمان کے لئے کام کریں گے۔

(بخاری عن عائشہؓ)

اجرت کی ادائیگی

اجرت کے سلسلے میں اس اصولی ہدایت کے بعد، کہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کی جائے، اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اُجرت کی مقدار پہلے ہی واضح کر دی جائے اور مبہم نہ رکھی جائے۔

"ان رسول الله ﷺ نهى عن إستجارة الأجير حتى

یبین له أجره "

رسول اللہ ﷺ نے کسی مزدور سے کام لینے سے منع فرمایا ہے تا آنکہ اس کی اجرت واضح کردی جائے۔

پھر آپ ﷺ کا معمول تھا کہ کسی کو اس کی مزدوری کم نہ دیتے تھے (بخاری عن انس ﷜)

آپ ﷺ نے فرمایا: تین شخص ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا دشمن ہوں گا، ان میں سے ایک وہ ہے جو کسی مزدور کو اجرت پر رکھے، اس سے پورا کام لے لے اور اجرت نہ دے (رجل استاجر أجیرا فاستوفی منه و لم یعطه اجره) (بخاری عن ابی ہریرۃ ﷜)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اجرت ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں، یا تو خود آجر (Employer) کام سے پہلے اجرت دیدے، یا مزدور نے پیشگی مزدوری دینے کی شرط لگادی ہو، اب بھی اس کو کام سے پہلے ہی مزدوری دینی ہوگی، یا مزدور اپنے کام کی تکمیل کردے تو کام کی تکمیل کے ساتھ اجرت ادا کرنی ہوگی۔ (الفتاویٰ الہندیہ: ۳/ ۵۰۶)

کام کی مقدار

مزدور سے کتنا کام لیا جائے؟ اسلام نے اس کی بھی وضاحت کردی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا غلاموں سے کوئی ایسا کام نہ لو جو ان کی طاقت اور قدرت سے ماوراء ہو۔ (موطا امام مالک عن یحی بن یحی) یہ ایک اصول ہے جس کی روشنی میں کام کی نوعیت، مقدار، اوقات تینوں ہی کا تعین کیا جاسکتا ہے، مثلاً اصول صحت کی رو سے جن کاموں کو روزانہ چھ گھنٹے کیا جاسکتا ہے، ان ملازمین کے لئے یہی اوقاتِ کار ہوں گے اور جو کام آٹھ گھنٹے کئے جاسکتے ہیں، ان کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی ہوگی۔

عموماً بعض لوگ کم عمر بچوں یا دراز عمر بوڑھوں سے اتنا کام لینا چاہتے ہیں جتنا جوان آدمیوں سے۔ اسلامی تعلیم کے تحت یہ غلط اور ظالمانہ حرکت ہے، جس پر قانون کے ذریعہ پابندی بھی عائد کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جو مستقل ملازمین ہیں، ضروری ہے کہ ان کے لیے ہفتہ میں ایک دن آرام کے لئے رکھا جائے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے ملنے

کے لئے تعطیل لازمی ہو اور بیماروں کے لئے خصوصی رخصتیں ہوں۔ فقہ کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (ردالمحتار : ۳/۸۰)

حسنِ سلوک

مزدوروں کے ساتھ مالکین اور ذمہ داروں کا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (انھم اخوانکم) یعنی ان سے سلوک حاکمانہ نہیں بلکہ برادرانہ ہونا چاہئے۔ قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بحیثیتِ آجر (Employer) یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں:

"وما اريد ان اشق عليك ستجدني ان شاء الله من الصالحين" (القصص:۲۷)

"میں تم کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، ان شاء اللہ تم مجھ کو صالح و نیک پاؤ گے۔"

گویا آجر کا سلوک مزدور کے ساتھ ایسا ہو کہ اس کو تکلیف اور کسی بھی طرح کی ذہنی، جسمانی یا عملی مشقت نہ دے اور اس کے ساتھ نیک سلوک روا رکھے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں اس کا عملی نمونہ یوں ملتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خاص خدام میں تھے اور بچپن سے جوانی تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے، مگر کبھی اس کی نوبت نہیں آئی کہ آپ ﷺ نے اونھ بھی کہا ہو یا پوچھا ہو کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ (بخاری و شمائل ترمذی عن انس رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کے خادموں میں ایک یہودی لڑکا تھا، وہ بیمار پڑا تو آپ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ (بخاری) اسی حسن سلوک کا ایک حصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مشکل کام اس کو سونپا جائے تو اس کی انجام دہی میں بذاتِ خود بھی مدد کرے۔ (بخاری و مسلم)

منافع میں شرکت

اسلام اس بات کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے کہ مزدور کاروباری نفع میں شریک ہوں۔ "مضاربت" کی اصل یہی ہے۔ مضاربت یہ ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور دوسرے آدمی کا عمل اور محنت، پھر اس سے جو نفع حاصل ہو اس کو باہم متعینہ تناسب مثلاً

پچاس فی صد وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہاں دوسرے فریق کو جو کچھ نفع مل رہا ہے، وہ عامل ہی کی حیثیت سے ہوگا، اس کی طرف اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے جس میں آپ ﷺ نے کھانا پکانے والے خادم کو کھانے سے کم از کم ایک دو لقمہ کھلانے کی تلقین کی ہے۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

حقوق کا تحفظ

مزدوروں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے صرف اخلاقی ہدایت ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس کو قانونی تحفظ بھی بخشا ہے اور حکومت کے لئے مداخلت کی گنجائش رکھی ہے، چنانچہ قاضی ابوالحسن ماوردی (م ۴۵۰ھ) ''محتسب'' کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر کوئی شخص مزدور و ملازم (اجیر) پر زیادتی کرے، مثلاً، اجرت کم دے یا کام زیادہ لے تو محتسب ایسا کرنے سے روکے اور حسبِ درجات دھمکائے اور اگر زیادتی اجیر کی طرف سے ہو، مثلاً کام کم کرے اور اجرت زیادہ مانگے تو اس کو بھی روکے اور دھمکائے اور اگر ایک دوسرے کی بات کا انکار کریں تو فیصلے کا حق حاکم کو ہے۔'' (الاحکام السلطانیہ للماوردی (مترجم)، باب ۲۰ص: ۳۹۹)

نقصانات کی ذمہ داری

سوال یہ ہے کہ مزدور یا ملازم سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا ضامن کون ہوگا؟ اس سلسلہ میں تھوڑی تفصیل ہے۔ مزدوری اور ملازمت کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ معاملہ کی بنیاد کام ہو، دوسرے یہ کہ معاملہ کی اساس وقت ہو، پہلے کی مثال سلائی وغیرہ ہے کہ آپ کسی کو کپڑا سلنے کو دیں، اس صورت میں وہ وقت کا پابند نہیں ہے بلکہ کام کا پابند ہے کہ کپڑا سی کر دے، دوسرے کی مثال اس طرح ہے کہ کسی کو آپ مدرس مقرر کریں کہ وہ روزانہ پانچ یا چھ گھنٹے تعلیم دے، یہاں وہ وقت کا پابند اور اس میں حاضری کا مکلف ہے، چاہے طلبہ ہوں یا نہ ہوں اور پڑھانے کی نوبت آئے یا نہ آئے، اسی طرح دن بھر کے لئے کسی مزدور کو مکان کی تعمیر کے لئے رکھا جائے، یہاں وہ اس بات کا پابند ہے کہ دن بھر اپنا وقت دے۔

پہلے قسم کے ملازم کو ''اجیر مشترک'' اور دوسرے قسم کے ملازم کو ''اجیر خاص'' کہتے ہیں۔ اجیر مشترک سے کوئی چیز ضائع ہو جائے تو وہ خود اس کا ضامن ہوگا اور تاوان ادا کرے گا، اجیر خاص سے اس کی زیادتی اور ارادہ کے بغیر جو سامان ضائع ہو جائے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتاویٰ عالمگیری : ۳؍ ۵۵۵)

بندھوا مزدور

بندھوا مزدور کی ظالمانہ رسم باوجود ارتقاء اور علم و روشن خیالی کے اب بھی بعض علاقوں میں موجود ہے، مگر اسلام میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام اس کو انسان کا خالص نجی مسئلہ تصور کرتا ہے کہ وہ کسی کا کام کرے یا نہ کرے، نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کو بلکہ حکومت بھی کسی فرد اور شہری کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی، سوائے اس کے کہ کبھی ایسے خصوصی حالات پیدا ہو جائیں کہ قومی اور اجتماعی مصلحت کے تحت افراد کو کسی عمل پر مجبور کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے نکاح، خرید و فروخت وغیرہ دوسرے معاملات کی طرح اس میں بھی طرفین کی رضامندی اور آمادگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ **وامارکنها فالایجاب والقبول** (الفتاویٰ الہندیہ: ۴؍۵۰۳، کتاب الاجارۃ) اسی طرح اسلام میں ہر شخص کو نقل و حرکت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت کی آزادی حاصل ہے، اور یہ اس کا خالصتاً ذاتی و شخصی مسئلہ ہے، وہ جہاں اور جس شہر و علاقہ میں جا کر مزدوری اور ملازمت کرنا چاہے، کر سکتا ہے: '' **ومن یهاجر فی سبیل الله یجد فی الارض مراغما کثیراً وسعة** '' (النساء :۱۰۰)

مزدوروں کی ذمہ داریاں

جہاں مزدور اور ملازمین کے یہ حقوق ہیں، وہیں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، جن کی طرف قرآن مجید نے دو مختصر لفظوں میں اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس بنیاد پر اپنا ملازم متعین کیا، وہ ان کی صاحبزادی کی یہ اطلاع تھی کہ:

''یا أبت استاجره ان خیر من استاجرت القوی الامین ''

(القصص:۲۶)

''ابا جان! ان کو مزدور رکھ لیجئے، بہترین مزدور جسے آپ رکھیں گے، وہ ہوگا جو طاقتور اور امانت دار ہو''

یہاں اچھے مزدوروں کی دو صفات بیان کی گئی ہیں: ایک قوت و صلاحیت اور دوسرے امانت و دیانت۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلیت کے بغیر کسی کام کی ذمہ داری نہ لے، اسی لئے فقہاء نے فاتر العقل طبیب (الطبیب الماجن) کو علاج سے روک دینے کا حکم دیا ہے۔ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

دوسرے یہ کہ وہ اپنے کام، ذمہ داریوں اور سونپی گئی اشیاء کے معاملہ میں امانت دار اور دیانت دار ہو، اگر مفوضہ کام میں وہ قصداً کوئی نقص رہنے دے یا متعینہ وقت کا اپنی ذمہ داریوں کے لئے پورا پورا استعمال نہ کرے تو یہ بات دیانت کے خلاف ہوگی، چنانچہ علماء لکھتے ہیں:

''عدل کے ساتھ وزن کرو''، میں یہ بھی داخل ہے کہ ملازمین اپنے اوقاتِ ملازمت کا پورا پورا خیال رکھیں۔ (معارف القرآن مصنف مفتی شفیع صاحبؒ)

امانت میں یہ بھی داخل ہے کہ رشوت نہ لے۔ رشوت یہ ہے کہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کی انجام دہی کا الگ سے پیسہ وصول کرلے۔ حضور ﷺ نے اس سے بڑی شدت سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں ہی دوزخ میں ہے الراشی والمرتشی کلاھما فی النار (طبرانی عن ابن عمرو رضی اللہ عنہ) رشوت صرف وہی نہیں ہے جو رشوت کے نام پر لی جائے بلکہ وہ رقم بھی رشوت میں داخل ہے جو عالم لوگ کسی کے عہدے سے متاثر ہوکر ''ہدیہ'' اور نذر ونیاز'' کے نام سے پیش کریں۔ رشوت کی یہ وہ قسم ہے جس میں اچھے خاصے لوگ بھی داخل ہیں، چنانچہ فرمایا جو شخص کسی کے لئے سفارش کرے، وہ اس کے لئے تحفہ بھیجے اور وہ اس کو قبول کرے، اس نے بہت بڑا سود لیا ہے (ابو داؤد عن ابی امامہ رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عاملوں کو ہدایا و تحائف بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا، اسی لئے فقہاء نے قاضی کے لئے فریقین مقدمہ سے ہدیہ قبول کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

ناجائز ملازمتیں

ایسی چیزوں کی ملازمت اور مزدوری جائز نہیں جو معصیت اور گناہ ہو، اس لئے کہ جس طرح گناہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح گناہ کے لئے سبب اور ذریعہ بنتا اور اس میں تعاون بھی ناجائز ہے اور جو جس درجہ کا گناہ ہو، اس میں تعاون بھی اسی درجہ کا گناہ ہے، چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

" لایجوز الاستجار علی شئی من الغناء والنوح والمزامیر ولاأجرلھم"

مزامیر، نوحہ زنی اور گانے بجانے وغیرہ کے کاموں پر کسی کو اجیر رکھنا درست نہیں اور وہ اجرت کے حقدار نہیں ہوتے ہیں''۔

ظاہر ہے جب ان کاموں کے لئے ملازم رکھنا درست نہ ہوگا اور کوئی شخص معاملہ طے پا جانے کے بعد یہ کام کر ہی لے تو اجرت واجب نہ ہوگی، تو خود کسی شخص کا ایسی ملازمت اختیار کرنا کیوں کر جائز ہوگا اور اس ملازمت کا فائدہ ہی کیا ہوگا جس پر کوئی مزدوری نہ ملے۔

اسی حکم میں سنیما ہال کی ملازمت، گانے بجانے کے کام، انشورنس کی ایجنسی اور انشورنس اور بینک کی ایسی ملازمتیں ہیں جن میں سودی کاروبار لکھنا پڑے یا اس میں لین دین کرنا پڑے۔

عمر ملازمت کے درمیان سبکدوشی

ملازمت کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ عمر ملازمت اور درمیان میں سبکدوشی اور معطلی کا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں کر لیجئے کہ ملازمت کے احکام کا اصل مدار فریقین کا باہمی معاہدہ ہے؟ اگر کسی ریاست کا قانون ہو کہ اس کے یہاں ملازم اپنی عمر کے ۵۵ یا ۵۸ سال تک ملازمت پر برقرار رہے گا تو یہ گویا ملازم اور حکومت کے درمیان ایک معاہدہ ہے کہ ملازم اپنی عمر اس حد تک پہنچنے تک کارگزار رہے گا اور حکومت اس کو اجیر رکھے گی۔

اب کسی معقول وجہ اور عذر کے بغیر دونوں ہی اس مدت کی تکمیل کے پابند ہوں گے،

نہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے معزول کردے اور نہ ملازم کو حق ہوگا کہ بلا وجہ اور حکومت کی رضامندی کے بغیر اس کام سے سبکدوش ہو جائے، چنانچہ فقہاء مکان کے کرایہ پر لگانے کے احکام ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"لو قال اجرتك هذه الدار سنة، كل شهر بدرهم جاز بالاجماع فلا يملك أحدهما الفسخ قبل تمام السنة من غير عذر" (فتاویٰ عالمگیری : ۴/ ۵۰۸)

"اگر کوئی شخص یوں کہے" میں نے تم کو یہ مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دیا ہے، ہر ماہ کے بدلے ایک درہم، تو بالاتفاق جائز ہے اور فریقین میں سے کوئی ایک سال کی تکمیل تک بلا عذر اس معاملہ کو توڑ نہیں سکتے"۔

ہاں اگر کوئی عذر پیش آجائے تو یک طرفہ اقدام کیا جا سکتا ہے، مثلاً ملازم کو غیر قانونی اور مجرمانہ حرکتوں پر حکومت معزول کر سکتی ہے اور ملازم اپنی ناسازی صحت وغیرہ کی بنا پر کام چھوڑ دینا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ حکم جس طرح سرکاری محکموں کا ہے، ایسے ہی پرائیوٹ اداروں کا بھی ہے۔

(۳۰/اپریل ۱۹۹۹ء)

بچہ مزدوری ــــ اسلامی نقطۂ نظر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس قدر صاحبِ شعور، صاحبِ فہم اور طاقتور بنایا ہے، انسان کا نومولود بچہ اسی قدر فہم وشعور سے عاری اور عاجز و ناتواں ہوتا ہے، چوپائے کے بچے چند دنوں میں چلنے اور چرنے لگتے ہیں اور ان میں اپنی ضرورت کے مطابق نفع ونقصان کی پہچان پیدا ہو جاتی ہے، لیکن انسان ہے کہ مدتوں کروٹ بدلنے کی طاقت سے بھی محروم اور شعلۂ وشبنم کے ادراک سے بھی عاجز! ربّ کائنات نے ایسے کمزور، بے شعور بچہ کی پرورش کا یہ سروسامان کیا کہ نہ صرف والدین بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی بچوں کے لئے محبت کی وافر سوغات رکھ دی، کون صاحبِ دل ہے جسے بچہ کی معصوم مسکراہٹ اپنی طرف متوجہ نہ کرتی ہو اور اس کا رونا اور بلکنا سخت سے سخت انسان کو بھی تڑپا نہ دیتا ہو؟ بچہ خواہ خوش رنگ ہو یا کالا کلوٹا، صاف ستھرا ہو یا میلا کچیلا، کسی کاشانۂ عشرت میں پیدا ہوا ہو یا آشیانۂ غربت میں، اس کا بچپن کشش سے بھرپور ہوتا ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی حساس اور فطرتِ سلیمہ کا حامل اسے دیکھے اور دل بھر نہ آئے اور ماں باپ اور خاندان کے اہلِ تعلق کا کیا کہنا، ان کو تو اپنے بچوں کے معصوم چہرہ میں لالۂ وگل کا نکھار اور غنچۂ وگل کی بوئے عطر بار کا احساس ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام میں بچوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کی ایک ایک ضرورت کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں، ان ہدایات میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ان کی کفالت اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل، دوسرے ان کی تعلیم وتربیت، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری والد اور والد نہ ہوں تو حسبِ مراتب رشتہ داروں پر ہے، جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں موجود ہے، اس لئے یتیم کی کفالت کرنے پر آپ ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی ہے، **انا و كافل اليتيم كهاتين**، اور اس کی خاص ترغیبات حدیث میں منقول ہیں، بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں آپ ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے

ارشاد فرمایا کہ اپنے بچہ کو ایک کلمۂ خیر سکھا دینا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے، غزوۂ بدر میں جو مشرکین قید ہو کر آئے ان کا فدیہ آپ ﷺ نے مقرر فرمایا کہ قیدیوں میں سے جس کو لکھنا پڑھنا آتا ہو وہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے، یہ فدیہ آپ ﷺ نے ایسے وقت میں مقرر فرمایا جب مسلمانوں کی غربت وافلاس انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی اور فاقہ مستی اہلِ مدینہ کے گویا معمولات میں سے تھی، آپ ﷺ چاہتے تو مالی فدیہ پر اصرار کر کے بہ ظاہر اس کا کچھ مداوا کر سکتے تھے، لیکن آپ ﷺ نے مسلمان بچوں کی تعلیم کو ان کی معاشی ضرورت سے زیادہ اہم سمجھا۔

آپ ﷺ نے بچوں اور بزرگوں کے بارے میں اصولی ہدایت دی ہے کہ جو چھوٹوں پر رحم اور بزرگوں کی قدر دانی نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، "**من لم یرحم صغیرنا و لم یؤقر حق کبیرنا فلیس منا**" (ابوداؤد: کتاب الادب، باب فی الرحمۃ) "رحم" ایک جامع لفظ ہے، جو ہر طرح کے حسنِ سلوک اور ہر قسم کی بہی خواہی کو شامل ہے، جیسے کسی شخص کا خود کھانا اور بچوں کو بھوکا رکھنا بے رحمی ہے، اسی طرح بچوں کو کسبِ زر کا ذریعہ بنانا اور تعلیم و تربیت سے محروم رکھنا اس سے بڑے بے رحمی اور بدخواہی ہے، کیوں کہ یہ ہمیشہ کے لئے ان کو معاشی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے پسماندہ اور محروم رکھنے کے مترادف ہے، اس پسِ منظر میں رسول اللہ ﷺ نے تلقین فرمائی کہ کم عمر بچوں کو کسبِ معاش کا مکلّف نہ کرو، اس سے یہ ہوگا کہ کمانہ پائیں گے تو چوری کا ارتکاب کریں گے، "**لا تکلفوا الصغیر الکسب فانه اذا لم یجد سرق**" (مؤطا امام مالک: باب الامر بالرفق بالمملوک)

کم عمر بچوں کو کسبِ معاش پر لگا دینا کئی وجوہ سے بچوں کے لئے نقصاندہ ہے، قبل از وقت مشقت اس کی صحت اور جسمانی نشو و نما کو نقصان پہنچاتی ہے، چنانچہ بچہ مزدوروں کے سلسلہ میں ملکی اور بین الاقوامی اعداد و شمار سے اس کے متعلق نہایت ہی تشویشناک رپورٹ سامنے آرہی ہے، کیوں کہ ان بچوں کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی صحت کا ٹھیک طور سے خیال نہیں رکھا جاتا، ایسے کام ان سے لئے جاتے ہیں جن میں

آلودگی ان پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی طاقت وقوت سے بڑھ کر کام ان سے کرایا جاتا ہے، اس سے ان کا معاشی مستقبل تاریک ہو جاتا ہے اور ان کے لئے پوری زندگی ایسی ہی معمولی مزدوری اور کم آمدنی پر انحصار کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا، وہ علم جیسی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور ان کی جہالت کی وجہ سے ان کی اگلی نسلیں بھی پستی اور انحطاط کا شکار رہتی ہیں، یہ معاشی اور علمی محرومی ان میں اخلاقی گراوٹ اور تنزل بھی پیدا کرتی ہے، یہ تو ان کا اور ان کی نسلوں کا نقصان ہے۔

قوم وملک کے لئے بھی یہ بات کم نقصاندہ نہیں کہ قوم کا ایک اچھا خاصا حصہ مستقل پسماندہ رہے، وہ جسم صحت منداور طاقتور نہیں ہوسکتا جس کا کوئی ایک عضو بھی بیمار ہو، پھر ان بچوں میں نہ معلوم کیسی کیسی ذہانتیں اور صلاحیتیں چھپی ہوں، اگر وہ بہ روئے کار آتیں تو ان سے سماج کو کس قدر فائدہ پہنچ سکتا تھا! اس لئے کہ کیچڑ میں بھی پھول کھلتے ہیں اور بے قیمت سیپوں ہی کی آغوش میں موتی پرورش پاتا ہے، اگر آپ شہر میں سڑکوں کے کنارے بنے ہوئے ہوٹلوں سے گذریں اور وہاں برتن دھونے اور میزیں صاف کرنے والے ننھے منھے بچوں کی آنکھ میں جھانک کر دیکھیں اور ان سے انٹرویو لیں تو آپ بہ آسانی اندازہ کرسکیں گے کہ ان میں بیشتر بچے ذہین اور فہیم ہوتے ہیں اور ان کی آنکھوں کی چمک ان کی صلاحیتوں کی چغلی کھاتی ہیں، مگر افسوس کہ ان پھولوں کے لئے ویران قبرستانوں پر چڑھنا اور مرجھا جانا ہی مقدر رہے۔

اس لئے بچوں کو قبل از وقت کسبِ معاش کی بھٹی میں جھونک دینا یقیناً اپنے فائدہ کے لئے ان کو ہمیشہ نقصان میں مبتلا رکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں ضرر پہنچانے کی گنجائش نہیں، نہ ابتداءً اور نہ ردّ عمل میں **لا ضرر و لا ضرار** (موطا امام مالک، کتاب الاقضیۃ، باب القضاء فی المرفق) نیز ارشاد ہے کہ جو کسی کو ضرر پہنچائے اللہ اس کو ضرر سے دو چار کریں گے اور جو کسی کو مشقت میں ڈالے اللہ بھی اس کو مشقت میں مبتلا فرمائیں گے، **من ضار ضار الله و من شاق شاق الله عليه**۔ (ترمذی: باب ماجاء فی الخیانۃ والغش)

بچوں کے اس استحصال کو روکنے کے لئے ضروری ہے کہ قومی سطح پر لوگوں کا ذہن

بنایا جائے اور بچوں کے اولیاء کو سمجھایا جائے کہ اگر آج وہ چند روپیہ سے محرومی کو گوارا کرلیں تو کل ان کا بچہ تعلیم یافتہ، باعزت، باشعور اور خوش حال بن سکتا ہے اور ان کی تھوڑی قربانی سے اس کی آنے والی نسلیں ذرہ سے آفتاب بن سکتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس سلسلہ میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے، کیوں کہ جہالت کی وجہ سے مسلمان بچے اس پسماندگی کا زیادہ شکار ہیں۔

چھوٹے بچوں کو محنت مزدوری پر لگانے کے بنیادی طور پر تین اسباب ہوتے ہیں: اوّل ماں باپ کی مجبوری، دوسرے جاہل والدین اور اولیاء کی بے شعوری، تیسرے والدین کی بے جا حرص وطمع، ان میں سب سے بڑا اور اہم سبب ماں باپ کی غربت اور مجبوری ہوتی ہے، کوئی غریب شخص معذور ہو جائے یا اس کا انتقال ہو جائے اور گھر میں کوئی کمانے والا موجود نہ ہو تو دکھیاری بیوہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اپنے کم عمر نونہالوں کو مشقت کی اس بھٹی میں ڈال کر چند پیسے حاصل کرے، اسی سے اپنا تن ڈھانکے، پیٹ بھرے، اپنی اور گھر کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے، سماج اتنا ظالم اور خود غرض ہے کہ وہ کسی غریب کی جھونپڑی پر ترچھی نظر ڈالنے کو بھی تیار نہیں ہوتا اور مجبوری کو دیکھ کر اس کی رہی سہی پونجی بٹورنے بلکہ بعض اوقات اس کی عزت وآبرو کا بھی سودا کرنے کو کمر بستہ ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر ان بے کس و بے آسرا لوگوں کو بچہ مزدوری کے سلسلہ میں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، شریعت کا اصول یہی ہے کہ اگر دو خرابیوں میں سے ایک کے ارتکاب پر مجبور ہو جائے تو کمتر درجہ کی برائی کو اختیار کرلے، ''**اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضرراً بارتكاب اخفهما۔**''

ایسے موقعوں پر حکومت کو اس بات کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئے کہ وہ ایسے بے سہارا گھرانوں کی اقل ترین ضروریات کو پوری کرے، تاکہ قوم کی یہ متاعِ گراں مایہ ضائع نہ ہو نے پائے۔ ایسے ہی پریشان حال لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو کوئی ''بوجھ'' چھوڑ کر مرا ہو وہ میرے ذمہ ہے اور مال چھوڑ کر رخصت ہوا ہو تو یہ اس کے ورثہ کا حق ہے، ''**من ترك كلا فالي ومن ترك مالا فلورثته**'' (ابوداؤد) ''بوجھ'' سے مراد عورتیں، بچے اور قرضے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب فراخی آئی

تو ولادت کے ساتھ ہی ہر بچہ کا وظیفہ سو درہم مقرر کر دیا جاتا تھا، اگر حکومت عوام کو بچہ مزدوری سے روکنے کے لئے اشتہار کے ایک سے ایک وسائل اختیار کرے اور قانون سخت سے سخت بنائے لیکن ان مسائل کو حل نہ کرے جو اصل میں بچوں کو مزدوری پر لگانے کا سبب ہیں، تو یہ بے فیض ہوگا، بلکہ یہ مفلس و نادار گھرانوں کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہوگا، اس لئے حکومت کو ایسے غریب خاندانوں کی کفالت کا مناسب نظم کرنا چاہئے اور اربابِ اقتدار کی آسائش اور تفریح گاہوں اور ایوانِ اقتدار کے در و دیوار کی آرائش پر جو کثیر رقوم خرچ کی جاتی ہیں، ان کے بجائے جائز اور صحیح مصارف پر ان کو خرچ کرنا ہوگا۔

جو دکاندار اور کارخانہ داران کم عمر بچوں کی خدمت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کو بھی چاہئے کہ قوم کے ان نونہالوں کے حقوق کو محسوس کریں اوّل تو ان سے وہی کام اور اتنا ہی کام لیا جائے جو انکے لئے قابلِ برداشت ہو، آپ ﷺ نے غلاموں کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے، تو ان بچوں سے طاقت سے زیادہ کام لینا کیوں کر روا ہوسکتا ہے، بچہ مزدوری کے سلسلہ میں بین الاقوامی سطح پر جو معلومات جمع کی گئی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ بعض مالکان ان سے سولہ اور سترہ گھنٹے کام لیتے ہیں اور نہایت قلیل مزدوری ادا کرتے ہیں، جو کھلا ہوا ظلم و جور ہے، دوسرے ان سے کام لینے کے ساتھ ساتھ کچھ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کیا جائے، تاکہ ان کا مستقبل سنور سکے، چنانچہ آپ ﷺ نے غلاموں اور باندیوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی تلقین فرمائی ہے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خادموں اور خادماؤں سے جہاں کام لیا جائے وہاں ان کی تعلیم و تربیت کی بھی فکر کی جائے، تیسرے ان کو ان کی پوری مزدوری ادا کی جائے، ایسا نہ ہو کہ ان کی بے شعوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام زیادہ لیا جائے اور پیسے کم دیئے جائیں، یہ ناانصافی اور استحصال بھی کم تولنے اور کم ناپنے میں داخل ہے۔

''بچہ'' اور کم عمر کا اطلاق کس سن و سال کے لڑکوں اور لڑکیوں پر ہوگا؟ اس سلسلہ میں جدید میڈیکل تحقیق کی روشنی میں ۱۴ رسال کی عمر طے کی گئی ہے، حیرت انگیز طور پر بڑے چھوٹے کی تحدید کے لئے جو عمر رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمائی یہ وہی عمر ہے، حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقع سے مجھے جہاد میں شرکت کے سلسلہ میں پیش کیا گیا، تو آپ ﷺ نے مجھے شریکِ جہاد ہونے کی اجازت نہیں دی، پھر جب غزوۂ خندق میں میری پیشی ہوئی تو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمادی، جب نافع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے یہ واقعہ ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہی بڑے اور چھوٹے کے درمیان عمر کی حد ہے، چنانچہ اپنے گورنروں کو خط لکھا کہ جو لڑکے پندرہ سال کے ہوگئے ہوں ان کے لئے فوجی خدمت کا وظیفہ مقرر کردیں (بخاری: باب بلوغ الصبیان الخ) یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت محنت و مزدوری کے معاملہ میں ۱۵/ سال کے لڑکے کو بالغ تصور کرتی ہے لیکن نکاح وغیرہ میں نابالغ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لڑکے اور لڑکیاں اس عمر میں تمام حقوق اور ذمہ داریوں میں بالغ تصور کئے جائیں گے، کہ اس عمر میں جسمانی نشو ونما اور شعور و ادراک دونوں ہی جہتوں سے انسان حدِ بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۳۰/ مارچ ۲۰۰۱ء)

ماحولیاتی آلودگی اور اسلام

ابھی چند دنوں پہلے ''عالمی یوم تحفظ ماحولیات'' منایا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماحولیات کے تحفظ کا مسئلہ اس عہد کا نہایت اہم اور گمبھیر مسئلہ بن کر اُبھرا ہے اور اس وقت تمام دنیا کو اس نے اپنی جانب متوجہ کرلیا ہے، کئی عالمی کانفرنسیں اس موضوع پر ہو چکی ہیں اور اس کے لئے ممکنہ تدابیر پر نہایت سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ پوری دنیا میں غور کیا جارہا ہے۔

یوں تو ماحول میں کثافت پیدا کرنے والی بہت سی چیزیں خود قدرت نے انسانی اور حیوانی جسم میں رکھی ہے، جیسے پیشاب، پائخانہ، مردار جسم سے پیدا ہونے والا تعفن وغیرہ، لیکن عصر حاضر کی صنعتی اور مشینی ترقیوں نے ماحولیاتی کثافت کے اسباب میں نمایاں اضافہ کر دیا ہے۔ کارخانوں سے خارج ہونے والے فضلات ، پٹرول، ڈیزل کے ایندھن ، ایرکنڈیشن اور ریفریجیٹر وغیرہ سے خارج ہونے والی گیسیں، ڈیزل اور پٹرول کے ایندھن پر مبنی ٹریفک کی کثرت، یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو انسان کو راحت و سہولت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی اور غیر محسوس فضائی اور ماحولیاتی کثافت کا تحفہ بھی دے جاتی ہیں۔

نظام قدرت میں توازن کی ایک مثال یہ ہے کہ جہاں اس نے کثافت پیدا کرنے والے قدرتی وسائل عطا کئے ہیں، وہیں اس نے کثافت کو تحلیل کرنے اور انسانیت کو اس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کی غرض سے کچھ قدرتی اور فطری ذرائع بھی پیدا کئے ہیں، جیسے سمندر، کہ اس کا کھارا پانی آلودگی کو جذب کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اسی طرح درخت اور جنگلات ، یہ جہاں انسان کو صاف و شفاف ہوا فراہم کرتے ہیں، وہیں فضا میں پھیلی ہوئی آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، خود وہ مٹی جس میں ہم

رہتے بستے ہیں اور جس کی پشت پر ہزاروں سال سے کتنی ہی مخلوق شاد و آباد ہے، وہ بھی ٹھوس کثافت آمیز مادوں تک کو تحلیل کر دیتی ہے۔ جو مردے اور مردار زمین میں دفن کئے جاتے ہیں اور جو گندگیاں اور غلاظتیں زمین کی تہوں میں چھپادی جاتی ہیں، اگر زمین اپنا سینہ کشادہ کر کے ان کو قبول نہ کرے، تو نہ جانے روئے زمین پر کتنی آلودگی پیدا ہو جائے اور انسان وحیوان کے لئے جینا دوبھر ہو جائے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف قدرتی وسائل کا ایسا استعمال بڑھتا جارہا ہے، جس سے ماحولیاتی آلودگی میں اضافہ ہو اور دوسری طرف درخت اور جنگلات جو ہمارے ماحول کی حفاظت کے لئے ایک بہت بڑا قدرتی عطیہ ہیں، انسان نہایت ہی بے رحمی سے ان کو کاٹتا اور ختم کرتا جارہا ہے، بہت سے جنگلات ہیں جو اب درختوں کے بجائے انسانوں کے جنگل بن گئے ہیں، ان جنگلات میں ایسے حیوانات بھی رہتے ہیں جو بعض کثافت پیدا کرنے والی اشیاء یا جانور کو اپنی غذا بناتے ہیں، جنگلات کا خاتمہ ان کے وجود کو بھی کم کرتا جاتا ہے۔

ان سب کے علاوہ قدرت نے فضا میں بھی ہمارے لئے ''اوزون گیس'' کی صورت میں ایک قلعہ تعمیر کر دیا ہے۔ یہ قلعہ سورج اور فضا کی طرف سے زمین تک آنے والی شعاعوں کی صفائی کا کام کرتا ہے، ان کی وجہ سے شعاعیں اس تناسب کے ساتھ زمین تک پہنچتی ہین کہ عام حالات میں جسم انسانی کو ان سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا، اب اوزون کی یہ قدرتی پرت زمین سے خارج ہونے والی کثیف گیسوں کی وجہ سے دقیق ہوتی اور پھٹتی جارہی ہے اور ان کی وجہ سے مختلف امراض خصوصاً جلدی کینسر کے عام ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اصل میں تو یہ مغربی اقوام کی شامت اعمال ہے کہ انہوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی عہد میں اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، لیکن اب جب مشرق کی ترقی پذیر اقوام نے انہی قدرتی وسائل کو روبہ کار لانا شروع کیا ہے، تو مغرب کو ماحولیاتی حفاظت کی بابت بڑی ''بے قراری'' سی پیدا ہوگئی ہے۔

بہر حال یہ کسی ایک قوم، ایک علاقہ اور ایک مذہب کے ماننے والوں کا مسئلہ

نہیں، بلکہ یہ عالمی اور بین قومی مسئلہ ہے۔ اسلام جو ایک عالمگیر، جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء اور زمانہ وعہد کی قید سے آزاد مذہب ہے، ممکن نہیں کہ وہ اس اہم مسئلہ سے صرفِ نظر کرے۔ اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ہدایات و ارشادات سے اس سلسلے میں روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہر ایسی بات سے منع فرمایا جو ماحول کو گندہ اور آلودہ کرتی ہے اور انسانی سماج کے لئے روحانی یا جسمانی لحاظ سے مضرت رساں ہے۔

چنانچہ حضرت معاویہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے تین مقامات پر قضاءِ حاجت سے منع فرمایا: ایسی جگہ پر جہاں مسافرین سرراہ پڑاؤ کرتے ہوں، راستے پر، اور درخت کے سایہ میں۔ (ابوداؤد: ۱۴۱: ۶۲) اسی طرح آپ ﷺ نے اس کی بھی تلقین فرمائی کہ قضاءِ حاجت کے لئے آبادی سے دور کی جگہ کا انتخاب کیا جائے، بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ ضرورت کے لئے مکہ سے قریب دو میل کی دوری پر واقع مغمس نامی مقام پر تشریف لے جاتے تھے۔ (مجمع الزوائد: ۱/۲۰۳) آپ ﷺ نے اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی برتن میں پیشاب کر کے اسے گھر میں رکھا جائے۔ (طبرانی عن عبداللہ بن یزید)

پانی کی حفاظت کی خاص طور پر آپ ﷺ نے تاکید فرمائی، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہرے اور رُکے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ (ترمذی) اور حضرت جابر ؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بہتے ہوئے پانی میں بھی پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مجمع الزوائد: ۴/۲۰۴) اور خاص طور پر آپ ﷺ نے حمام اور غسل خانہ میں پیشاب کرنے کی ممانعت فرمائی۔ (ابوداؤد و ترمذی عن عبداللہ بن مغفل)

جن چیزوں سے ماحول آلودہ ہوتا ہے، ان کو زمین میں دفن کرنے کی ہدایت دی گئی۔ اسلام میں مردوں کی تدفین کا نظم قائم کیا گیا، جو حیوانی مردہ اجسام سے پیدا ہونے والی آلودگیوں سے حفاظت کا سب سے مؤثر طریقہ ہے، اسلام نے جیسے مسلمانوں کی تدفین کا حکم دیا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کی نعش کو بھی دفن کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر

غور کیجئے کہ قرآن مجید نے ہابیل و قابیل کے واقعہ میں کوے کو زیر زمین دبانے کا ذکر کیا ہے۔ (مائدہ:۳۱) یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ مردار کو بھی یوں ہی نہ چھوڑنا چاہئے، بلکہ ان کو بھی مٹی کے نیچے دبا دینا چاہئے اور کچھ اسی پر موقوف نہیں، دوسرے اجزاءِ جسم جن سے تعفن پھیل سکتا ہو اور آلودگی پیدا ہوتی ہو، ان کو بھی دفن کر دینے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ حضرت امّ سعد ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خون کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مجمع الزوائد: ۹۲/۵ بحوالہ طبرانی) اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ناک سے نکلنے والی آلائش کو دفن کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند بزار، مجمع الزوائد: ۱۱۴/۸) اسی لئے فقہاء نے خواتین کو ماہواری کے زمانہ کے آلودہ کپڑوں کو دفن کرنے کا حکم دیا۔

درخت کی حفاظت کی بھی آپ ﷺ نے خصوصی ہدایت دی اور شجر کاری کی ترغیب بھی دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کوئی درخت یا کھیتی لگائے اور اس میں سے انسان، درندہ، پرندہ یا چوپایہ کھائے، تو وہ اس کے لئے صدقہ ہو جاتا ہے۔

(بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ)

اسی لئے بعض صحابہؓ خاص اہتمام سے درخت لگایا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے حضرت ابو درداءؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ خاص اسی نیت سے درخت لگایا کرتے تھے (مجمع الزوائد: ۶۸/۴۔۶۷) اسی لئے اسلام میں افتادہ سرکاری اراضی کے بارے میں یہ اُصول مقرر کیا گیا کہ جو شخص بھی اس میں کاشت کرنا چاہے، حکومت کی اجازت سے کر سکتا ہے۔ (ابوداؤد) اگر کوئی شخص ایسی اراضی قبضہ میں لے کر پھر اُسے آباد کرنا چھوڑ دے، تو زمین اس سے لے کر دوسرے کو حوالہ کر دی جائے گی، تاکہ وہ اس میں کھیتی کرے۔ (خلاصہ الفتاویٰ: ۳/۴)

جہاں آپ ﷺ نے شجر کاری اور زراعت کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، وہیں آپ ﷺ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ درخت بے ضرورت کاٹے جائیں۔ عرب میں زیادہ تر ببول اور بیری ہی کے درخت ہوا کرتے تھے، آپ ﷺ نے بیری کے درخت کے بارے میں

فرمایا کہ اس کو کاٹنے والے اوندھے منہ جہنم میں جائیں گے۔ (مجمع الزوائد: ۱۱۵/۸) ایک ضعیف حدیث میں ایسے شخص پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے۔ (طبرانی عن علیؓ) یہاں تک کہ جنگ میں بھی اسلام نے کھیتیوں اور درختوں کو جلانے اور نقصان پہنچانے کو ناپسند فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جو کسی علاقے پر غلبہ پانے کے بعد وہاں کے کھیتوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں (البقرہ: ۲۰۵) ایک حدیث میں آپ ﷺ نے مجاہدین کو خاص طور پر درختوں اور کھیتوں کے برباد کرنے سے منع فرمایا۔

(ترمذی عن ابی بکر الصدیق)

یہی حال حیوانات کا ہے۔ آپ ﷺ نے بلا ضرورت، محض شوقیہ شکار کرنے اور حیوانات کے ہلاک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔ آج کل جو مضر صحت گیسیں، مشینوں اور موٹروں سے خارج ہوتی ہیں، ظاہر ہے عہد نبوی میں یہ وسائل انسانی تصرف میں نہیں آئے تھے، لیکن اس سلسلے میں بھی احادیث میں اشارہ موجود ہے۔ خواہ مخواہ چراغ کے استعمال کو پسند نہیں فرمایا گیا۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ صبح کے وقت چراغ جلانے کو ناپسند فرماتے تھے۔ (طبرانی مجمع الزوائد: ۱۱۲/۸) اسی طرح آپ ﷺ نے سوتے وقت چراغ کو گل کرنے کا حکم فرمایا۔ (مسند احمد، مجمع الزوائد: ۱۱۱/۸) ظاہر ہے کہ اس تدبیر سے تیل کا دھواں کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلام میں اشیاء کے برتنے اور استعمال کرنے کے سلسلے میں دو بنیادی اُصول بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بھی شئی کا اس طرح استعمال نہ کیا جائے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچے 'لاضرر ولاضرار' دوسرے جن چیزوں کا استعمال جائز ہے اور جو وافر مقدار میں آدمی کو فراہم ہو، ان کو بھی بے محل استعمال نہ کیا جائے اور نہ ضرورت سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں ''اسراف وتبذیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ نے پانی تک کو ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے سے منع فرمایا اور وضوء و غسل میں بھی محتاط طریقے پر پانی کے استعمال کا حکم فرمایا۔ جو شریعت پانی میں اسراف کو گوارا نہیں کرتی ہو، وہ پٹرول، ڈیزل، کیروسین اور المونیم گیس وغیرہ جیسے قیمتی

قدرتی وسائل کے استعمال کو کیوں کر گوارا کر سکتی ہے، جس میں وسائل کا ضیاع بھی ہے اور دوسروں کے لئے مضرت اور نقصان بھی ۔ یہ بنیادی اُصول ہیں، جن سے ماحول کو آلودہ کرنے اور نقصان پہنچانے والی اشیاء کے غیر محتاط اور بے جا استعمال کا حکم جانا جا سکتا ہے۔

(۱۹ر جون ۱۹۹۸ء)

عبادت گاہوں سے صوتی آلودگی پھیلنے کا مسئلہ

۳۰/اگست ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ عبادت کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے، اس فیصلہ میں عبادت گاہوں میں ڈھول پیٹنے اور لاوڈ اسپیکر استعمال کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ''کوئی بھی مذہب اس کی تلقین نہیں کرتا یا ترغیب نہیں دیتا، کیونکہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال امن وسکون میں خلل ڈالتا ہے، ضعیف ومعذور افراد، طلبہ اور شیر خوار بچوں کو بھی پُرسکون فضا میں نیند لینے کا فطری حق حاصل ہے۔ اور یہ غیر متوازن آواز صوتی آلودگی کا سبب ہے'' —— یہ فیصلہ چرچ آف گاڈ مدارس کی اپیل کے پس منظر میں سامنے آیا ہے، مدارس ہائیکورٹ نے حکومت ٹمل ناڈو کو ہدایت دی تھی کہ شور شرابہ پر تحدیدات سے متعلق قوانین کی پابندی کرائی جائے، اور مذکورہ چرچ کو اس بات کا پابند بنایا جائے کیوں کہ کے، کے، آر میجسٹک کالونی، ویلفر ایسوسی ایشن کی درخواست کے مطابق یہ چرچ صوتی آلودگی پیدا کر رہا تھا۔

چونکہ فیصلہ کا پورا متن اخبارات میں نہیں آیا ہے، اور تفصیلات غیر واضح ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عدالت نے اس بارے میں کیا تحدیدات عائد کی ہیں؟ کیونکہ حسبِ ضرورت سامعین تک آواز پہونچانے کا نظم ایک بنیادی ضرورت بھی ہے۔ اور بنیادی انسانی حق بھی، یقیناً عدالت کا مقصد ایسی جائز صورت پر امتناع عائد کرنا نہیں ہوگا۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ صوتی آلودگی کا تعلق صرف مذہبی مقاصد کے لئے استعمال ہی سے نہیں ہے، بلکہ غیر مذہبی مقاصد کے لئے بھی وہ اسی قدر مضر اور تکلیف دہ ہے۔ اور شاید سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اس سلسلہ میں نصح وہدایت کی زیادہ مستحق ہیں، لیکن مسئلہ بہر حال اہم ہے، اور اس پر اعتدال اور عدل کے ساتھ عمل کرانے کی ضرورت ہے، عدل کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے قوانین

اقلیتوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں، اور اکثریت کے ساتھ خون معاف ہوتے ہیں حکومت نقضِ امن کے نام پر پہلوتہی برتتی ہے اور عدالت بھی ان کے معاملہ میں بے بس ہوتی ہے، اس وقت حیدرآباد میں گنیش تہوار کی تیاری چل رہی ہے، اور گلی کوچوں میں کان کو بہرا کردینے والی آوازوں کا گویا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے جو تھامے نہیں تھمتا ہے، یہ شور اکثر اوقات بلا وقفہ چوبیس گھنٹہ جاری وساری رہتا ہے، پہلے لوگ خود گاتے اور نعرے لگاتے تھے، اس لئے قدرتی طور پر ایک حد قائم رہتی تھی، لیکن اب آدمی کی جگہ ٹیپ ریکارڈ نے لے لی ہے، اس لئے وہ بلا تعب و تھکن دن ورات نغمہ ریز رہتا ہے، اور بہت سے لوگ جو آواز کے معاملہ میں نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، وہ کروٹ بدلتے اور نیند کو مناتے صبح کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا عدالتیں اور حکومتیں ان مواقع پر بھی اسی طرح حرکت میں آئیں گی جیسا کہ انھوں نے ایک چرچ کے بارے میں ''فرض شناسی'' کا اور بچوں اور معذوروں کے حقوق کی پاسداری کا ثبوت دیا ہے۔

جہاں تک آواز کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے تو وہ یہی ہے کہ آواز حدِ اعتدال میں رہنی چاہئے، ضرورت سے زیادہ آواز کے بلند کرنے کو اسلام پسند نہیں کرتا، عربوں کا ایک عجیب مزاج تھا کہ وہ آواز کی بلندی کو باعث افتخار جانتے تھے، اور پست آواز کو وجہِ ذلت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ عرب شعراء بھی کسی انسان کے جانور کی طرح بلند آواز ہونے کو بہ طور مدح و تعریف کے ذکر کرتے تھے، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷۲/۱۴)

قرآن مجید نے اس غلط سوچ پر متنبہ کیا اور ارشاد فرمایا:

> ''اپنی چال میں اعتدال رکھو، اور اپنی آواز کو پست رکھو کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی آواز ہے''۔ (لقمان: ۱۹)

گدھے کی آواز چونکہ بہت تیز اور ناہموار ہوتی ہے، اس لئے اس کو سب سے مکروہ آواز قرار دیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ضرورت سے زیادہ اونچی آواز میں تکلف بھی ہے، اور دوسرے کے لئے تکلیف بھی ''**فان الجهر باكثر من الحجاة تكلف يؤذي**''۔ (الجامع لاحکام القرآن: ۷۱/۱۴) علامہ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ ایسی آواز کو

گدھے کی آواز سے مشابہ قرار دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر معتدل آواز ناجائز اور مذموم ہے۔ (ابن کثیر: ۴۴۶/۳)

عام حالات میں تو آواز کو معتدل رکھنے کا حکم ہے ہی، عبادات اور دینی افعال میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، آپ ایک بار رات کے وقت باہر نکلے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ مصروف نماز ہیں، اور بہت ہی دھیمی آواز میں قراءت کر رہے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذر ہوا، وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے، اور بہت زور زور سے قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے، جب آپ کے یہ دونوں برگزیدہ رفقاء حاضر خدمت ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آہستہ قرآن پڑھنے کی وجہ پوچھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جس ذات سے میں سرگوشی کر رہا تھا۔ میں نے اس کو تو سنا دیا، یعنی اللہ تعالیٰ نے تو میری آواز سن لی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم اتنی بلند آواز سے کیوں پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میں سوتے ہوؤں کو جگا رہا تھا۔ اور شیطان کو بھگا رہا تھا، آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو تلقین فرمائی، کہ وہ کسی قدر اپنی آواز کو بلند کریں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی آواز کو پست کریں (ابوداؤد: حدیث نمبر: ۱۳۲۹) معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت میں بھی آواز کو معتدل ہونا چاہئے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں معتکف ہوئے، اور لوگوں کو زور زور سے قراءت کرتے ہوئے سنا، تو پردہ ہٹایا اور ارشاد فرمایا کہ تم سب اپنے رب سے سرگوشی کر رہے ہو، تم ایک دوسرے کو تکلیف نہ دو، اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو، (ابوداؤد: حدیث نمبر ۱۳۳۲) بلکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مواقع پر قرآن کو زور سے پڑھنے کی خصوصی ہدایت نہیں ہے، ان مواقع پر آہستہ قرآن پڑھنا افضل ہے۔ چنانچہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قرآن کو زور سے پڑھنے والا کھلے عام صدقہ کرنے والے کی طرح ہے، اور قرآن کو آہستہ پڑھنے والا چھپا کر صدقہ کرنے والے کی مانند ہے، **الجاهر بالقرآن كالجاهر بالصدقة والمسر بالقرآن كالمسر بالصدقة**

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۳۳۳)

فقہاء نے بھی اس پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ مشہور فقیہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں،

"و یجهر الامام وجوبا بحسب الجماعة فان زاد علیه اساء" (الدر المختار مع الرد: ۲/۲۴۹)

امام جماعت کے اعتبار سے ہی جہر کرے گا، اگر اس سے زیادہ زور سے پڑھے تو اس نے نامناسب عمل کیا۔

اور علامہ شامیؒ نے نقل کیا ہے کہ اتنی بلند آواز جو خود اس کو تھکا دے، اور دوسرے کے لئے اذیت کا باعث ہو، اچھی بات نہیں، (ردالمختار: ۲/۲۴۹) — اس سے معلوم ہوا کہ بعض سیدھے سادھے مسلمان بھائی جو مسجد میں نماز کے لئے بیرونی مائک کا استعمال کرتے ہیں، جس کی آواز مسجد سے باہر سڑکوں اور بازاروں میں پھیلتی ہے، یہ کوئی پسندیدہ عمل نہیں، کیونکہ جیسا کہ مذکور ہوا خود رسول اللہ ﷺ نے قراءت قرآن میں آواز کے بہت بلند کرنے کو پسند نہیں فرمایا ہے، دوسرے اس میں قرآن مجید کی اہانت کا اندیشہ بھی ہے، کیونکہ قرآن کے احترام کا تقاضا ہے کہ سننے والے پوری طرح قرآن کی طرف متوجہ اور یکسو رہیں، اور غور سے سنیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں، بات چیت کرتے رہتے ہیں، کاروبار کی طرف متوجہ رہتے ہیں، اور قرآن کے سننے کا حق ادا نہیں ہوتا، گویا ہم لوگ بالواسطہ قرآن مجید کی بے احترامی کا سبب بنتے ہیں۔

اسلام میں صرف اذان کے لئے بلند آواز کو پسند کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا مقصد ہی اظہار و اعلان ہے، اور وہ اس کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اسی لئے اس خدمت پر مامور فرمایا کہ ان کی آواز بلند تھی، (ترمذی:) لیکن اذاں میں بھی ایسا ہی آواز مطلوب ہے جو اہلِ محلّہ تک پہونچ جائے، سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک صاحب نے اذان دی، اور آواز کو بلند کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا، تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (تفسیر قرطبی: ۱۴/۱۷) — پھر اذاں ایک مختصر سا عمل ہے، جو زیادہ سے زیادہ دو تین منٹ میں مکمل ہو جاتی ہے، جو غیر مسلم بھائیوں کے لئے بھی

اذیت کا باعث نہیں ہوتی۔

رہ گیا گانا بجانا، ڈھول باجے، رقص وسرور، نعرہ بازی، بے وقت اور بے محل محلہ کا آرام غارت کردینے والی تقریریں اور شور وہنگامے، تو اسلام ان کا قائل نہیں۔ بلکہ ایسے تکلیف دہ رویہ کو ناپسند کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو بازار میں اور میدان جنگ میں بھی بے جا شور وشغب پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بازار میں شور وہنگامے کرنے والے کو ناپسند کرتے ہیں، ان اللہ یبغض ...... صخاب فی الاسواق (موارد الظمان، حدیث نمبر: ۱۹۷۵) ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج میں اسلامی زندگی کے صحیح خدوخال پیش کریں۔

جانور اور اسلامی تعلیمات

اسلام کا ابرِ رحمت صرف انسانوں پر ہی نہیں برسا، بلکہ اس نے پوری کائنات کو آبیار کیا، جہاں اس نے ناطق انسان کو اپنے کرم سے سرفراز فرمایا، وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال کیا۔ انسان جب شقاوت پر اُتر آتا ہے اور ظلم و جور اس کی طبیعت بن جاتی ہے، تو پھر اس کے ظلم و جور کی کوئی نہایت نہیں رہتی، وہ بے زبان جانوروں پر بھی مشقِ ستم کرنے لگتا ہے اور تہذیب و شائستگی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں کے گزر بسر کا ذریعہ یہی جانور تھے، ان کا دودھ غذا کا کام دیتا، ان کی پشت سواری اور بار برداری کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، ان کی تجارت کا دارو مدار انہی سواریوں پر تھا، ان کے چمڑوں سے بھی مختلف کام لئے جاتے تھے، لیکن ان سب کے باوجود جانوروں کے ساتھ ان کا سلوک بے رحمانہ اور جفا کارانہ تھا۔

آپ ﷺ نے ایسے غیر انسانی سلوک کو منع فرمایا، جانور کے منہ پر مارنے کی ممانعت کی، لوگ جانوروں کو باہم لڑاتے اور اس کا تماشہ دیکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس درندگی کو روکا، جانور کی خوراک اور ضروریات کی رعایت کرنے کا بھی حکم دیا۔ ایک اُونٹ کو دیکھا کہ اس کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ان کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، اسی سلسلہ میں ایک معجزہ بھی ظاہر ہوا، ایک اُونٹ نے اپنے مالک کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اس کے مالک کو تنبیہ فرمائی، آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ اگر سرسبز و شاداب موسم میں سفر کرو تو آہستہ چلاؤ اور جانور کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دو، اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ۔ آپ ﷺ نے اس بات کی بھی تلقین کی کہ جو جانور جس کام کے لئے ہے اس سے وہی کام لو، آپ ﷺ نے ''منبر'' کے طور پر جانور سے کام لینے سے منع فرمایا۔ جانور کو منبر نہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جانور اسٹیج کے طور پر استعمال نہ کیا جائے کہ اس پر

کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کی جائے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بیل پر ایک آدمی سواری کر رہا تھا، اللہ کی قدرتِ خاص سے بیل اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا میں اس کام کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہوں ــــ ''انی لم اخلق لھذا ''۔

آپ نے فرمایا کہ آخرت کا ثواب وعذاب جانوروں کے ساتھ اچھے اور بُرے سلوک سے بھی متعلق ہے، قیامت کے دن ایک عورت محض اس لئے دوزخ میں ڈالی جائے گی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا، اسے اس کا موقع نہیں دیا گیا کہ وہ خود کھائے اور چرکر اپنی ضرورت پوری کرے اور ایک شخص اس بناء پر جنت میں داخل کیا جائے گا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کی پیاس دور کی ہوگی اور اسے پانی پلایا ہوگا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کی لگائی ہوئی کھیتیوں میں سے چرند و پرند جو کھالیں اس پر بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

اسلام نے گوشت خوری کی اجازت ضرور دی ہے، لیکن بلا وجہ جانوروں کو مارنے کے درپے ہونا درست نہیں ہے۔کسی صاحب نے ایک گوریا پکڑ رکھا تھا اور اس کی ماں بے قرار تھی، آپ ﷺ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بلا ضرورت ایک گوریا کو ذبح کرنے پر بھی جواب دہی ہے۔اسی لئے جو چیزیں انسانی کام نہیں آتیں، آپ ﷺ نے ان کو مارنے سے منع فرمایا، چیونٹی، شہد کی مکھی اور ہدہد وغیرہ کے مارنے کی آپ ﷺ نے صراحتاً ممانعت فرمائی، کسی روح کے جلانے کو آپ ﷺ نے شدت سے روکا ہے۔ایک دفعہ لوگوں نے ایسی جگہ چولہا سلگایا جہاں چیونٹی کے بل تھے، آپ ﷺ نے چولہا بجھانے کا حکم دیا۔خود قرآن مجید میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے۔جن کے حکم سے چیونٹیاں جلائی گئی تھیں، اسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے گوشت خوری کی اجازت دے کر بے رحمی کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے بعض ناواقف ہندو بھائیوں کے یہاں تو اسلام نام ہی گوشت خوری کا ہے۔اس سلسلہ میں اول تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ہندوستانی مذاہب کے سوا دُنیا کے تمام مذاہب میں گوشت خوری کی اجازت دی گئی ہے اور گوشت کو

ایک اہم انسانی غذا تسلیم کیا گیا ہے، ہندوستانی نژاد مذاہب میں بھی سوائے ''جین مذہب'' کے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مذاہب میں گوشت خوری کا جواز موجود ہے۔ آج کل ہندو بھائیوں کے یہاں یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ ان کے یہاں گوشت خوری سے منع کیا گیا ہے، لیکن یہ محض اپنے مذہب اور تاریخ سے ناواقفیت ہے، خود ویدوں میں جانوروں کے کھانے پکانے اور قربانی کا تذکرہ موجود ہے۔ رگ وید میں ہے:

اے اندر! تمہارے لئے پسان اور وشنو ایک سو بھینسیں پکائیں۔

(رگ وید: ۶/۱۱۔۱۷)

یجر وید میں گھوڑے، سانڈ، بیل، بانجھ گایوں اور بھینسوں کو دیوتا کی نذر کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ (یجر وید، ادھیائے: ۲۰/۷۸)

منوسمرتی میں کہا گیا ہے:

''مچھلی کے گوشت سے دو ماہ تک، ہرن کے گوشت سے تین ماہ تک، بھیڑیے کے گوشت سے چار ماہ تک اور پرند جانور کے گوشت سے پانچ مہینے تک پتر آسودہ رہتے ہیں۔ (منوسمرتی ادھیائے: ۳/۲۶۸)

خود گاندھی جی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ایک زمانہ تک ہندو سماج میں جانوروں کی قربانی اور گوشت خوری کا عمل عام تھا اور ڈاکٹر تاراچند کے بقول ویدک قربانیوں میں جانوروں کے چڑھاوے بھی ہوا کرتے تھے۔

جو لوگ گوشت خوری کو منع کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ زندہ وجود کو قتل کرنے یعنی ''جیو ہتیا'' کا باعث بنتا ہے، لیکن غور کیا جائے تو کائنات کا فطری نظام یہی ہے کہ خالق کائنات نے کم تر مخلوق کو اپنے سے اعلیٰ کے لئے غذا اور وسیلۂ حیات بنایا ہے۔ غور کریں کہ کیا اس جیو ہتیا سے بچنا ممکن بھی ہے، آپ جب پانی یا دودھ کا ایک گلاس اپنے حلق سے اُتارتے ہیں تو سینکڑوں جراثیم ہیں جن کے لئے آپ اپنی زبانِ حال سے پروانہ موت لکھتے ہیں، پھر آپ جن دواؤں کا استعمال کرتے ہیں وہ آپ کے جسم میں پہنچ کر کیا کام کرتی ہیں؟ یہی کہ جو مضر صحت جراثیم آپ کے جسم میں پیدا ہو گئے ہوں اور پنپ رہے

ہوں، ان کا خاتمہ کر دیں۔ پس جیو ہتیا کے وسیع تصور کے ساتھ تو آپ پانی تک نہیں پی سکتے اور نہ دواؤں کا استعمال آپ کے لے روا ہو سکتا ہے۔

پھر آج کی سائنس نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حیوانات میں زندگی اور روح موجود ہے، اسی طرح پودوں میں بھی زندگی کارفرما ہے، اور نباتات بھی احساسات رکھتے ہیں۔ خود ہندو فلسفہ میں بھی پودوں میں زندگی مانی گئی ہے، سوامی دیانند جی نے ''آواگون'' میں روح کے منتقل ہونے کے تین قالب قرار دیئے ہیں، جن میں ایک نباتات بھی ہے، یہ نباتات میں زندگی کا کھلا اقرار ہے، تو اگر جیو ہتیا سے بچنا ہو تو نباتاتی غذا سے بھی بچنا ہوگا، گویا اس کائنات میں ایسے انسانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں جو مکمل طور پر جیو ہتیا سے بچ کر جینا چاہتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ گاؤکشی وغیرہ کی ممانعت کا مطالبہ ہم مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرتے، بلکہ یہ ایک معاشی ضرورت ہے، جانور اگر ذبح نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دودھ اور گھی سستی قیمتوں میں فراہم ہوں گے اور عام لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن یہ محض ایک واہمہ کا درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن ملکوں میں ہندوستان سے زیادہ جانور ذبح ہوتے ہیں اور جہاں جانوروں کے ذبح پر کسی قسم کی پابندی نہیں، وہاں بہ مقابلہ ہمارے ملک کے گھی اور دودھ سستے بھی ہیں اور ان کی فراوانی بھی ہے، اس کی مثال امریکہ اور یورپ ہیں۔ ہمارے ملک میں باوجودیکہ بہت سے علاقوں میں ذبح گاؤ پر پابندی ہے اور عام جانوروں کے ذبح کرنے پر بھی خاص تحدیدات ہیں، لیکن دُنیا کی تاریخ اور خود ہمارے ملک کا موجودہ ماحول اس کی تردید کرتا ہے، آج ہندوستان میں جہاں کہیں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے میرٹھ اور بھاگلپور میں ظلم وستم کا ننگا ناچ کیا ہے، وہ سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا ہے جو سبزی خور ہیں اور گوشت خوری کے مخالف ہیں۔ رہنمایانِ عالم میں شری گوتم بدھ اور حضرت مسیح علیہ السلام کو عدمِ تشدد اور رحم دلی کا سب سے بڑا داعی اور نقیب تصور کیا جاتا ہے، لیکن کیا یہ برگزیدہ شخصیتیں گوشت نہیں کھاتی تھیں، یہ سبھی گوشت خور تھے، گوتم بدھ نہ صرف گوشت خور تھے بلکہ دمِ آخر میں گوشت کھا کر ہی ان

کی موت ہوئی تھی اور ہٹلر سے بڑھ کر کوئی تشدد، جور وستم اور بے رحمی کا نقیب ہوگا؟ لیکن ہٹلر گوشت خور نہیں تھا، صرف سبزی کو اپنی غذا بناتا تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ ہنسا اور اہنسا کا تعلق محض غذاؤں سے ہے، بے وقوفی اور ناسمجھی ہی کہی جاسکتی ہے، جب تک دلوں کی دُنیا تبدیل نہ ہو، انسان انسانیت سے محبت کرنا نہ سیکھے، خدا کا خوف نہ ہو اور آخرت میں جوابدہی کا احساس نہ ہو، محض غذائیں انسان کے مزاج و مذاق کو تبدیل نہیں کرسکتیں۔

(۱۶/اکتوبر ۱۹۹۸)

ہڑتال — اسلامی نقطۂ نظر

آج کل احتجاج اور مظاہرہ کا حق جمہوریت کی پہچان اور شناخت بن گئی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں علامتی احتجاج کیا جاتا ہے، مثلاً ایک منٹ کے لئے قلم رکھ دینا، پانچ دس منٹ کام کرنے سے باز رہنا، حکومت کو میمورنڈم پیش کرنا وغیرہ ،لیکن ترقی پذیر ممالک کے لئے کوئی قاعدہ وضابطہ نہیں ہے، طویل سے طویل تر مدت کا بھی احتجاج ہوسکتا ہے، احتجاج اشتعال کی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے، احتجاج کے نام پر پرتشدد مظاہرے کئے جاتے ہیں اور سرکاری اور عوامی املاک کی بربادی احتجاج میں کامیابی کی علامت متصور ہوتی ہے، بعض محکموں کے ملازمین مہینوں احتجاج کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، حتی کہ لازمی اور ناگزیر خدمات کے ملازمین بھی احتجاج کرنے سے نہیں چوکتے ،ہسپتال ہفتوں بند رہتے ہیں، پوسٹ آفس کا کام کاج ٹھپ پڑ جاتا ہے، ٹرینیں اور بسیں بند ہوجاتی ہیں، غرض کہ غریب اور پسماندہ ملکوں میں احتجاج عملاً ہر طرح کے قواعد وضوابط سے آزاد ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے ٹرک کی ہڑتال ہوئی ، جو ایک قیامت سے کم نہیں تھی ،ضروریات زندگی کی قیمتیں جو پہلے ہی سے بڑھی ہوئی ہیں، آسمان سے باتیں کرنے لگیں ، بازار میں طلب اور رسد کا توازن بگڑ گیا ، ملک کو اس سے جو شدید نقصان ہوا، وہ بہت ہی سنگین اور افسوس ناک ہے۔ اس ہڑتال سے پہلے بعض سرکاری ملازمین کی ہڑتال تھی اور اب خبر ہے کہ آٹو کی ہڑتال ہونے والی ہے۔غرض ہڑتال ہماری روزمرہ کی زندگی کے معمولات میں سے ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو کہ ملک کے کسی حصہ میں کوئی نہ کوئی ہڑتال نہ پائی جاتی ہو۔

ہڑتال کا اصل مقصد ظلم وناانصافی پر احتجاج کرنا ہے۔ ظلم پر احتجاج اور آئین کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر ناراضگی کا اظہار یقیناً انسان کے بنیادی حقوق میں سے ہے، اسلام بھی اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

''لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ، وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا'' (النساء:۱۴۸)

'' اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ کوئی مظلوم ہو، اللہ سننے والے اور جاننے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ظلم و ناانصافی کے خلاف مناسب طریقہ پر احتجاج و مظاہرہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے میں عدالت سے چارہ جوئی، احتجاجی جلسہ، پرامن احتجاجی ریالی تو شامل ہے ہی، آج کے ذرائع ابلاغ کے پسِ منظر میں اخبارات، ریڈیو اور دوسرے ذرائع سے اپنے موقف کی وضاحت اور حکومت کے ناروا رویہ سے اختلاف کا اظہار بھی اس میں داخل ہے، اسی طرح حکومت سے نمائندگی اور دوسرے قانونی ذرائع سے اپنی خفگی اور برہمی کا اظہار بھی اس میں شامل ہے۔

احتجاج کے لئے ایسے ذرائع کا اختیار کرنا جس سے عام لوگوں کو نقصان نہ پہنچے، اس کی بھی گنجائش ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ﷜ سے روایت ہے کہ ایک صاحب خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو مجھے اذیت پہنچاتا رہتا ہے، آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ اپنا سامان نکال کر راستہ پر رکھ دو، اس شخص نے اپنا سامان لیا اور راستہ پر ڈال دیا، جو بھی وہاں سے گذرتا استفسار حال کرتا، وہ شخص کہتا کہ میرا پڑوسی مجھے اذیت دیتا ہے، اس لئے میں نے یہ سامان باہر نکال رکھا ہے، گذرنے والا کہتا اس پر اللہ کی لعنت ہو، اللہ اسے رسوا کرے، آخر پڑوسی آیا اور اس نے درخواست کی کہ اپنے گھر لوٹ چلو، اب میں تم کو کبھی اذیت نہیں دوں گا (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۷۱) یہ بھی گویا احتجاج کا ایک طریقہ ہے۔ فقہاء نے بیوی کو اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر مہر فوراً قابلِ ادائیگی تھا اور شوہر نے ادا نہیں کیا، تو جب تک شوہر مہر ادا نہ کردے، عورت کے لئے یہ درست ہے کہ وہ شوہر کو اپنے نفس پر قدرت نہ دے، یا شوہر کے گھر نہ جائے، اس کے باوجود اس کا حق نفقہ شوہر سے متعلق رہے گا۔ یہ بھی گویا احتجاج ہی کی ایک صورت ہے۔

آج کل احتجاج کی اکثر صورتیں ایسی ہیں جو بیک وقت کئی طبقوں کے لئے سخت

نقصان اور مضرت کا باعث ہوتی ہیں اور وہ قومی اور اجتماعی نقصان کا سبب بنتی ہیں، مثلاً یہی گاڑی کی ہڑتال ہے، یونین ہڑتال کا فیصلہ کرتی ہے، لیکن ہڑتال میں جو ڈرائیور اور متعلقین شریک ہوتے ہیں وہ عام طور پر نہایت قلیل آمدنی کے حامل ہوتے ہیں، روز کمانے اور روز کھانے کے اصول پر ان کی زندگی گذرتی ہے، خود ان کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اجتماعی فیصلہ کی وجہ سے وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتے، دوسرا نقصان کاشت کاروں اور صنعت کاروں کا ہوتا ہے، مال کی پیدائش جاری رہتی ہے اور اس کی ترسیل اور فروخت رکی رہتی ہے، بعض زراعتی اشیاء تو ایسی ہوتی ہیں کہ سڑنے لگتی ہیں اور بالکل ہی ضائع ہوکر رہ جاتی ہیں اور ان دونوں سے بڑھ کر نقصان عوام کا ہوتا ہے، چوں کہ بازار میں طلب بڑھ جاتی ہے اور سامان کی رسد کم ہوجاتی ہے، اس لئے قیمتیں غیر متوازن ہوجاتی ہیں، دس روپے کی چیز سو روپے میں فروخت ہوتی ہے اور لوگ اسے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسلام کے نظامِ تجارت میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قیمتوں میں توازن کو متاثر نہ ہونے دیا جائے، اسی لئے ''احتکار'' کو منع کیا گیا۔ احتکار کے معنی ذخیرہ اندوزی کے ہیں، یعنی تاجر اشیاءِ ضروریہ کو خرید کر روک لے، بازار میں نہ لائے، تاکہ مصنوعی قلت پیدا کی جاسکے، اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں اور دو کی چیز دس میں فروخت کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کی سخت مذمت فرمائی ہے اور شدت سے منع کیا ہے۔ اسی طرح حدیثوں میں ''تلقیٔ جلب'' سے منع فرمایا گیا ہے۔ ''تلقیٔ جلب'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں عام طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی قافلے جایا کرتے تھے، یہی ایک مارکٹ سے دوسری مارکٹ میں سامان کے پہنچنے کا ذریعہ تھے، ہوتا یہ تھا کہ جب کسی شہر کو کوئی قافلہ آنے والا ہوتا تو چند سرمایہ کار شہر سے باہر نکل کر پہلے ہی سامان خرید کر لیتے اور کھلے بازار میں سامان پہنچ نہیں پاتا، اسی طرح اشیاءِ ضرورت پر چند تاجروں کی اجارہ داری قائم ہوجاتی اور گرانی میں اضافہ ہوتا۔ یہ بھی ایسی صورت ہے جو قیمتوں کے فطری توازن کو متاثر کردیتی ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اسی طرح کی ایک اور صورت

بھی ہے، جس سے منع فرمایا گیا ہے اور وہ یہ کہ دیہات کے لوگ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے شہر آتے اور جلد واپس جانا چاہتے، اس لئے وہ اپنا مال نسبتاً سستا فروخت کرتے، عوام کو یہ فائدہ ہوتا کہ سامان سستا ملتا اور کاشت کاروں کو یہ فائدہ ملتا کہ درمیانی شخص اور بچو لئے کے نہ رہنے کی وجہ سے ان کو پوری قیمت براہِ راست مل جاتی، شہر کے تاجروں کو یہ بات پسند نہ آتی تھی، وہ دیہات سے مال لانے والوں کو کہتے تھے کہ تو اپنا مال ہمارے حوالہ کردے، ہم کچھ دنوں ٹھہر کر اسے بہتر قیمت میں فروخت کردیں گے، مقصد یہ ہوتا تھا کہ قیمتوں کے فطری اتار کو روکا جائے، اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا، جس کو حدیث میں ''بیع حاضر للبادی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان احکام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے طلب ورسد میں توازن برقرار رکھنے اور قیمتوں میں غیر فطری اتار وچڑھاؤ کو روکنے کی کیا کچھ تدبیریں کی ہیں، ذرائع مواصلات یا کسی خاص شعبہ کی تجارت کی ہڑتال سے سب سے بڑا نقصان یہی ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں غیر متوازی ہوجاتی ہیں، جہاں سامان کی پیدائش ہوتی ہے وہاں کاشتکار اور صنعت کار کو اصل لاگت بھی حاصل نہیں ہوتی اور دوسرے مقام پر عوام کو وہی چیز اصل قیمت سے دو چند بلکہ کئی چند قیمتوں میں خرید کرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت بڑا اجتماعی نقصان اور قومی خسارہ ہے۔

اس سے زیادہ نازک صورتِ حال اس وقت پیدا ہوجاتی ہے جب لازمی خدمات کے کسی شعبہ میں احتجاج ہوتا ہے، جیسے ڈاکٹروں کی ہڑتال، پوسٹ آفس کی ہڑتال وغیرہ۔ ان شعبوں سے انسان کی ناگزیر ضروریات متعلق ہیں، جن سے عوام کو محروم رکھنا نہایت ہی شقاوتِ قلبی اور ظلم کی بات ہے۔ اسلام میں انسان کی لازمی ضروریات کی بڑی اہمیت ہے، بلکہ خدا کی عبادت اور بندگی پر بھی اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص نماز کی حالت میں ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر وہ نماز نہیں توڑے گا تو کوئی شخص جل یا ڈوب جائے گا یا گر جائے گا تو نماز کا توڑنا اور اس شخص کی مدد کرنا واجب ہے، کم وبیش یہی احکام مال اور عزت وآبرو کی حفاظت سے متعلق بھی ہیں، اس لئے از راہِ عام لوگوں کو لازمی خدمات سے محروم کردینا

قطعاً جائز نہیں۔

احتجاج کی جو روایت ہمارے سماج میں پڑ چکی ہے، اس میں دونوں پہلو تکلیف دہ ہیں، احتجاج کرنے والے اوّل تو ناروا مطالبات پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے احتجاج کے لئے تکلیف دہ اور اجتماعی سطح پر مضرت رساں طریقۂ کار اختیار کرتے ہیں، دوسری طرف حکومت کا رویہ بھی ناقابلِ فہم ہوتا ہے، آخر حکومت صلح کرتی ہے، ''لواور دو'' کی بنیاد پر معاملہ طے کرتی ہے، لیکن ''بعد از خرابیٔ بسیار!''۔ اس طرح خود حکومت بھی عوام کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ ضرر و نقصان بہر قیمت دفع کیا جائے: **الضرر یزال**، نیز اسلام کی نگاہ میں ایک شخص کے نقصان کے مقابلہ ایک جماعت اور ایک طبقہ کے نقصان کے مقابلہ پورے سماج کا نقصان زیادہ اہم اور زیادہ قابل لحاظ ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں: ''**اذا تعارض مفسدتان روعی أعظمهما ضرر بارتکاب اخفهما**۔'' (الاشباہ: ۴۴) احتجاج ایک جائز حق ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہوں، وہ ایسا عفریت نہ بن جائے کہ غریب عوام کو نگل جائے اور قوم و ملک کو اجتماعی سطح پر ضرر پہنچنے کا باعث بن جائے۔

حفاظت خود اختیاری —— اسلامی نقطۂ نظر!

انسان کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس کا مالک نہیں، امین ہے، جان ہو یا مال اور عزت وآبرو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور اسے ان کا نگہبان بنایا گیا ہے، اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا کی ان نعمتوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں تین باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک یہ کہ ان نعمتوں کو احکام شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حاصل کیا جائے، اور محض اپنی خواہش کو رہنما نہ بنالیا جائے، دوسرے ان نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں خرچ کیا جائے، ایسی چیزوں میں خرچ کرنے سے بچا جائے جن کو شریعت نے ناپسند کیا ہے، تیسرے اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے۔

اسی لئے شریعت نے خودکشی کو بھی حرام قرار دیا، کیوں کہ انسان اپنی زندگی کا امین اور محافظ ہے، اس کا کام زندگی کی حفاظت ہے نہ کہ ہلاکت، رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے خودکشی کرنے والے شخص پر نماز جنازہ تک نہیں پڑھی، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی نگاہ میں یہ کس قدر مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے، مالی نعمتوں کے بارے میں بھی اسی احتیاط اور قدردانی کی تعلیم دی گئی، اگر کوئی شخص نہر کے کنارے بیٹھا ہو، تب بھی آپ نے وضو میں اسراف اور فضول خرچی کو منع فرمایا، کیوں کہ یہ تقاضۂ امانت کے خلاف ہے، اسلام امن وآشتی اور صلح وسلامتی کا نقیب ہے، لیکن اس امن کا جو سماج کے تمام افراد واشخاص اور طبقات کو عافیت فراہم کرتا ہو نہ یہ کہ ایک طبقہ کی بالادستی اور دوسرے کی مجبوری ولاچاری پر قائم ہو، اسی لئے اگر ایک شخص دوسرے شخص پر اور سماج کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر زیادتی کرے، تو اسے اپنی مدافعت کا پورا پورا حق حاصل ہے، کیوں کہ یہی عدل کا تقاضا ہے، اور حقیقی امن وہی ہے جس کی عمارت عدل و

انصاف کی مضبوط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہو، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی تعلیمات بالکل واضح اور بے غبار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ تم سے بلاوجہ آمادۂ پیکار ہوں، تم بھی ان سے اسی طرح مقابلہ کرو، ہاں البتہ ایسے جذباتی مواقع پر بھی انتقام کی رو میں بہہ کر ظلم وزیادتی کا راستہ اختیار نہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ بہرحال زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے، ''وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ''۔ (البقرۃ:۱۹۰)

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اسی کے بقدر اس کا جواب دو، فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (البقرۃ:۱۹۴) یہ مدافعت، مقابلہ اور ظالم کے پنجۂ ظلم تھامنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ اسی میں امن کا بقاء اور انسانیت کا تحفظ ہے، قرآن مجید نے قتل کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر کے بدلہ کا قانون مقرر کیا ہے (البقرۃ:۱۷۸) اور اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ قاتل کو قتل کرنے میں ایک کے بعد دوسری جان کا ضیاع ہے، لیکن درحقیقت اس میں انسانی جانوں کی حفاظت اور قتل کے واقعات کا سدباب ہے۔ ''وَلَکُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یَّااُولِی الْاَلْبَابِ'' (البقرۃ:۱۷۹)

اگر کسی سماج میں ظلم کے لئے آگے بڑھنے والے ہاتھ ہوں، لیکن ان کو قلم کر دینے والی تلواریں نہ ہوں، لباس حیاء کو تار تار کر دینے والی آنکھیں ہوں، لیکن انہیں پھوڑنے والی انگلیاں نہ ہوں، بربریت کا راستہ اختیار کرنے والے قدم ہوں، اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو قید میں لانے والی زنجیریں نہ ہوں، تو وہ سماج ظلم و بربریت کی آماجگاہ بن جائے گا، اور عدل و انصاف کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے رخت سفر باندھنا ہوگا، اس لئے یہ بات ضروری ہے کہ سماج کے اچھے لوگ ایسے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، اور جو لوگ مشقِ ستم بنائے جاتے ہوں، وہ طاقت بھر اپنی مدافعت کے لئے تیار رہیں، کہ اس سے صرف ان کی شخصی حفاظت ہی متعلق نہیں، بلکہ انسانیت اور انصاف کا تحفظ متعلق ہے، اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی اختیاری عمل نہیں بلکہ ایسا کرنا اس پر شرعاً

واجب ہے،

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے جان و مال ، مذہب، اہل وعیال اور عزت و آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والوں کو شہید قرار دیا، حضرت سعید بن زید سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا :

''من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد، ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد'' (ترمذی ۱۲۶۱/۱، باب ماجاء من قتل دون مالہ فہو شہید)

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کا مال ناحق لینے کی کوشش کی جائے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ بھی شہید ہے:''**من ارید ماله بغير حق فقاتل فقتل فهو شهيد**''

(ابوداؤد ۶۵۸/۲، ترمذی: ۲۶۱/۱)

جان کی حفاظت تو ظاہر ہے، مال کی حفاظت میں یقیناً دوکان، کاروبار، سواریوں، وغیرہ کی حفاظت شامل ہے، دین کی حفاظت میں مساجد و مدارس، خانقاہیں، مسلمانوں کے مقابر اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا سب شامل ہیں، کیوں کہ یہ سب شعائر دین کا درجہ رکھتے ہیں، اس لئے ان سب کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے، اور اگر ان کی حفاظت و صیانت میں کسی مسلمان کی جان جاتی ہے تو یقیناً وہ شہید ہے، اہل وعیال کی حفاظت میں ان کے جان و مال کے ساتھ ساتھ ان کی عزت و آبرو کی حفاظت بھی شامل ہے، کیوں کہ عزت و آبرو کی اہمیت انسان کے حق میں اس کی جان اور زندگی سے کم نہیں، بلکہ ایک غیرت مند انسان کے لئے بعض اوقات جان کا دیدینا، عزت و آبرو کی پامالی کو قبول کرنے

سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

تحمل و بردباری الگ چیز ہے، بزدلی اور خود سپردگی الگ چیز، کسی بھی قوم میں بزدلی کا پیدا ہو جانا، ایک ایسا مرض ہے جو اس کو میدان عمل میں تگ و دو سے روک دیتا ہے، شجاعت و بہادری، بلند حوصلگی، قوت ارادی کسی بھی زندہ قوم کے لئے ضروری وصف ہے، مسلمان مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں، لیکن مؤرخین نے سب سے زیادہ ماتم تا تاری فتنہ کا کیا ہے، تا تاریوں کے حملہ نے مسلمانوں کو صرف پسپا ہی نہیں کیا، بلکہ ان کو کم ہمت اور پست حوصلہ کر کے بھی رکھ دیا تھا، اور نوبت یہ تھی کہ ایک ایک تا تاری عورت بیسیوں مسلمان مردوں کو کھڑا کر دیتی اور اپنے گھر سے ہتھیار لے کر آتی، پھر باری باری انہیں تہہ تیغ کرتی، اور یہ مسلمان نہایت بزدلی اور دون ہمتی کے ساتھ قتل ہوتے رہتے اور مدافعت کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔

اسی حق مدافعت کا نام '' حفاظت خود اختیاری '' ہے، جسے دنیا کے تمام مذہب اور جدید و قدیم نظامہائے قانون میں تسلیم کیا گیا ہے، جس کا مقصد ظلم کو روکنا اور امن کو پائیدار بنانا ہے، نہ کہ امن کو پارہ پارہ کرنا اور دوسروں پر ظلم و جور کو روا رکھنا، حفاظت خود اختیاری کا مطلب یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہو تو ہم قصوروار و بے قصور اور مجرم و بے گناہ میں فرق کئے بغیر اس قوم کے لوگوں پر ہلہ بول دیں، اور قتل و غارت گری مچائیں، اسلام اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اگر کچھ لوگوں نے اپنی خباثت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورتوں کو بے آبرو کیا ہو تو مسلمان بھی ایسے ہی ناشائستہ اور غیر شریفانہ حرکت پر اتر آئیں، یہ وہی '' اعتداء '' یعنی حد سے گزر جانا ہے، جس کو قرآن مجید نے منع کیا ہے، لیکن جو لوگ واقعی مجرم اور قصوروار ہوں، ان سے اپنی حفاظت اور ان کے خلاف مناسب ردعمل ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے، جس سے پہلو تہی کسی طور مناسب نہیں۔

حفاظت خود اختیاری کے مختلف ذرائع ہیں، اول خود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ ناگہانی حملوں کا مقابلہ کر سکیں، اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت کے

اسباب مہیا رکھنا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جن سے جسم میں توانائی پیدا ہو، چنانچہ آپ نے کشتی، دوڑ، گھوڑ سواری وغیرہ کو پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ طاقتور مؤمن کمزور مومن سے بہتر ہے، المومن القوی خیر من المومن الضعیف ۔ رسول اللہ ﷺ اسباب حفاظت کا اس قدر اہتمام فرماتے تھے کہ استنجاء کے لئے تشریف لے جاتے تب بھی نیزہ ساتھ ہوتا، تا کہ کیڑے، مکوڑوں سے حفاظت ہو سکے، یہ رجحان کہ گھر میں سانپ مارنے اور کتوں کو بھگانے کے لئے لاٹھی تک میسر نہ ہو نہایت ہی غیر دانشمندانہ بات ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جو کچھ ہو قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہو۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمان اپنے محلّہ میں اجتماعی مدافعت اور حفاظت کا ماحول بنائیں، یعنی اگر ایک بے قصور شخص پر حملہ ہو، یا محلّہ کے کسی مکان پر یلغار ہو جائے تو تمام لوگ جان پر کھیل کر اس کی حفاظت کریں، ہر شخص اس کو اپنے آپ پر حملہ تصور کرے اور مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو، یہ بات کہ ہر آدمی اپنی باری کا انتظار کرے اور یکے بعد دیگرے خود سپردگی اختیار کرتا جائے، غیر دانشمندانہ، خودغرضی اور ہلاکت خیز بزدلی بلکہ خودکشی ہے، اجتماعی قوت مؤثر بھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شریک حال رہتی ہے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہے، ید اللہ علی الجماعۃ، البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسی اجتماعیت کی قیادت صالح، سنجیدہ اور دور اندیش لوگوں کے ہاتھوں ہو، نہ کہ شر پسند، بدمعاش اور مشتعل مزاج لوگوں کے ہاتھ میں، کہ ایسی صورت میں فائدہ سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

حفاظت کا تعلق آبادیوں کی ہیئت سے بھی ہے، جہاں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول ہو، اور مفسد مزاج لوگ امن کو درہم برہم کرنے کے درپے رہتے ہوں، وہاں خاص کر مسلمانوں کو اپنے ہم مذہب لوگوں کے درمیان آباد ہونا اور مسلم آبادی کے جزیرے بنانا ضروری ہے، اس سے وہ اپنی جان و مال، کاروبار اور عزت و آبروہی کی حفاظت نہیں بلکہ اپنے عقیدۂ وایمان اور تہذیب وثقافت کی بھی حفاظت کرسکیں گے، اسی لئے حضرات

انبیاء کو ایسے شہروں سے ہجرت کرنے کا حکم دیا جاتا تھا، جہاں دین حق سے عداوت وعناد رکھنے، والوں کا غلبہ ہو اور اہل ایمان کو اپنی بستی بسانے کی تلقین کی جاتی تھی، رسول اللہ ﷺ نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو مشرکین کے ساتھ اپنا رہن سہن رکھے میں اس سے بری ہوں۔

حفاظت کا تعلق قانون و آئین سے بھی ہے، یہ بدقسمتی ہے کہ قانونی پیشہ اختیار کرنے کا رجحان مسلمانوں میں کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اندر قانون ملکی کا شعور پیدا کریں، کون سے جرم پر کون سی دفعہ عائد ہوتی ہے؟ کس دفعہ کے تحت اپنا مقدمہ درج کرایا جائے؟ پولیس میں فرقہ پرست عناصر دھوکہ دینے اور مقدمہ کو کمزور کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کرتے ہیں، اور شہادتوں کو کس طرح کمزور کرتے ہیں؟ مسلمانوں کو اس سے آگاہ ہونا چاہئے، یہ ناآگہی مجرموں کی جرأت بڑھاتی، اور مظلوموں کی بیکسی میں اضافہ کرتی ہے۔

حفاظت کا تعلق قیادت سے بھی ہے، اس بدبختی پر جس قدر رویا جائے کم ہے کہ مسلمان نہایت تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے باوجود اپنے مشترک مسائل کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا نہیں جانتے، اشتراک اور اجتماعیت سے قیادتیں بنتی اور ابھرتی ہیں، اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قیادت سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت وفرمانبرداری سے قیادت طاقتور ہوتی ہے: ''لاجماعة الا بامارة و لا امارة الا بطاعة'' جب آپ کا ایک یا ایک سے زیادہ لیڈر ہو، یا کوئی مشترکہ پلیٹ فارم ہو اور اس کے ساتھ پوری قوم کا اعتماد اور تائید وتقویت ہو تو اس سے اس قیادت کا وزن حکومت میں اور دوسری قوموں میں بھی محسوس کیا جاتا ہے، اس کی بات سنی جاتی ہے، اس کی رائے کو وزن دیا جاتا ہے، اور اس کی آواز کی قوت محسوس کی جاتی ہے، گجرات کے فساد نے خاص طور پر اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہاں مسلمان قیادت کے فقدان کی وجہ سے فرقہ پرست حکومت اور پولیس نے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد سمجھا اور اس نے جوابدہی کے تصور سے خالی اور بے پردہ ہو کر مظالم ڈھائے، اگر ذرائع ابلاغ نے ان کے ان مظالم کو آشکارانہ کیا ہوتا تو

پتہ نہیں اور کیا حال ہوتا۔

حفاظت خود اختیاری میں یہ ساری باتیں شامل ہیں، جسمانی طور پر بھی حفاظت، قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حفاظت و بچاؤ کے اسباب کا مہیا رکھنا، مسلمانوں کا اپنی آبادیاں اور بستیاں بسانا، کسی حادثہ کے موقع پر اجتماعی طور پر حفاظت کے لئے ذہن کو تیار رکھنا، مسلمانوں میں جرم و سزا کے قانون کا شعور پیدا کرنا اور ایک مؤثر اور اجتماعی قیادت کو کم سے کم مقامی سطح پر وجود میں لانا اور اسے تقویت پہونچانا۔ یہ سب دین و ایمان، جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ضروری تدابیر ہیں اور امکان بھر حفاظت کی تدابیر اختیار کرنا اور اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق مدافعت، دشمن کا مقابلہ اور ظلم سے پنجہ آزمائی صرف مصلحت کا تقاضا نہیں بلکہ ایک مذہبی اور انسانی فریضہ ہے۔

(۲۴ مئی ۲۰۰۲ء)

مرض اور مریض ـــــ اسلامی تصوّر

ابھی گذشتہ ہفتہ ہم نے عالمی یومِ صحت منایا ہے، بے شک صحت سے بڑھ کر اللہ کی کوئی نعمت نہیں اور بیماری سے بڑھ کر شاید کوئی آزمائش نہیں، آخرت کی جوابدہی کے احساس اور انسانی محبت کے سوا کوئی چیز نہیں جو ایک مشغول آدمی کو مایوس، زود رنج اور ناہموار مزاج مریض کی عیادت و تیمارداری پر آمادہ کر سکے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ ان میں آپ ﷺ نے مریض کی عیادت کا بھی ذکر فرمایا۔ ارشاد فرمایا کہ جب تک انسان کسی مریض کی عیادت میں مصروف رہتا ہے، گویا وہ جنت کے باغیچوں میں رہتا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن انسان سے دریافت فرمائیں گے کہ اے فرزندِ آدم! میں بیمار تھا اور تم نے میری عیادت نہیں کی۔ انسان کہے گا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ بھی بیمار اور عیادت کے محتاج ہوتے ہیں؟ ارشادِ ربانی ہوگا کہ اگر تم فلاں مریض کے پاس پہونچتے اور اس کی عیادت کرتے تو مجھے وہاں موجود پاتے۔

آپ ﷺ نے عیادت کو ایک انسانی فریضہ قرار دیا ہے، اس لئے اس میں مسلمان اور غیر مسلم، بڑے چھوٹے، مال دار اور غریب کا کوئی فرق نہیں، آپ ﷺ نے یہودی کی بھی عیادت کی ہے اور مشرک کی بھی عیادت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ اگر کسی علاقہ میں وبائی مرض پھوٹ پڑے تو وہاں سے لوگ بھاگ کھڑے ہوں۔ کہ ایک تو بھاگنے والوں کے ذریعہ مرض کے جراثیم دوسرے علاقوں تک بھی پھیل جائیں گے۔ دوسرے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جو لوگ مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کے لئے تیماردار اور دیکھ ریکھ کرنے والے نہیں رہیں گے۔ قرآن مجید نے بیماروں کے لئے خصوصی مراعات دی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے "ولا علی المریض حرج" (النور) ایک موقع پر قرآن

نے خاص طور پر ''نابینا'' اور ''لنگڑے'' کا ذکر کیا کہ ان پر کوئی حرج نہیں۔ لیس علی الاعمی حرج ولا علی الاعرج حرج (الفتح: ۱۷)۔

بعض مذاہب میں بیماری کو پاپ کا لازمی نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو بھائیوں کے یہاں آواگون کا نظریہ ہے، اس نظریہ کے تحت انسان اس جنم میں جو کچھ تکلیف اٹھاتا ہے وہ پچھلے جنم کے گناہوں کا اثر ہے، اس سے مریض کے تئیں ہمدردی، محبت وخیر خواہی اور رحم دلی کے بجائے نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے، اسلام نے بتایا کہ بیماری اللہ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہے، ضروری نہیں کہ گنہگار ہی بیمار پڑے، اللہ کے نیک بندے بھی بیمار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ بیماری سے انبیاء ورُسل بھی دو چار ہوتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ صالحین اور اللہ کے نیک بندوں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے انسانی زندگی کے امانت خداوندی ہونے کا تصور پیش کیا۔ اسی لئے آپ ﷺ نے خودکشی کو حرام اور سخت گناہ قرار دیا۔ آج تو عدالتیں بھی خودکشی کی اجازت دینے کو آمادہ ہیں، لیکن اسلامی ہی نہیں، اخلاقی اور انسانی نقطہ نظر سے بھی یہ ایک سانحہ کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام نے اس وقت سے انسان کا تحفظ کیا ہے جب کہ وہ ابھی عالم رنگ وبو میں آیا بھی نہ ہو۔ اسی لئے اس نے معاشی مقصد کے تحت اسقاطِ حمل کو منع کیا۔ آپ ﷺ نے انسانی آبادی کی افزائش کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ معاشی اندیشوں کے تحت آبادی کی روک تھام کا تصور کچھ نیا نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے بھی عربوں کے یہاں ایسا تصور موجود تھا، قرآن مجید نے اس کی مذمت کی اور فرمایا گیا کہ بھوک اور فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ (بنی اسرائیل: ۳۱) فیملی پلاننگ کے پیچھے جو بنیادی نظریہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ غذائی وسائل محدود ہیں، اگر انسانی آبادی غیر محدود طور پر بڑھتی چلی جائے تو انسان کے لئے بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی ممکن نہیں رہے گی، لیکن یہ محض اندیشہ ہائے دور دراز کا درجہ رکھتا ہے اور حالات نے اس کی غلطی کو اظہر من الشمس کر دیا ہے، فیملی پلاننگ کے نظریہ کے بانی مالتھوس کی پیشین گوئی کے مطابق آج لوگوں کو بھوکوں مرنا چاہئے تھا، لیکن ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ کھانے،

پینے، لباس و پوشاک، سفر کے وسائل اور رہن سہن کے اعتبار سے معیار زندگی میں ایسا اضافہ ہوا کہ آج سے ۲۵ رسال پہلے اس کا تصور بھی دشوار تھا، حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے وسائلِ معاش میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور زمین ایسے ایسے وسائل ثروت کو اگل رہی ہے کہ نصف صدی پہلے کسی نے اس بارے میں سوچا بھی نہ ہوگا۔

آج قتل انسانی کے لئے بھی لوگوں نے نئے نئے عنوان تلاش کئے ہیں اور خوبصورت ناموں کے ذریعہ ان کو جائز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ایک ناروا صورت وہ ہے جس کو ''قتل بہ جذبۂ رحم'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ یعنی جو شخص طویل عرصہ سے بیمار ہو یا تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو، اس کو ادویہ کے ذریعہ موت کی نیند سلا دیا جائے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی مرض نہیں کہ خدا نے اسکے علاج کی تدبیریں پیدا نہ کی ہوں، معالج کا کام ان تدبیروں کو تلاش کرنا ہے نہ کہ مریض کی زندگی کو بچانے کے بجائے اسکے لئے سامان ہلاکت کا فراہم کرنا، آپ ﷺ نے خودکشی کو بہرحال حرام قرار دیا۔ ان تعلیمات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی کی کیا حرمت اور اہمیت ہے؟۔

انسانی صحت و حیات کی حفاظت کے نقطہ نظر سے آپ ﷺ نے اطباء اور معالجین کے لئے بھی ضابطے مقرر فرمائے۔ جو لوگ فنِ طب سے کما حقہ واقف نہ ہوں، علاج و معالجہ کی مہارت نہ رکھتے ہوں اور کسی مریض کا علاج کرنے میں ان کو نقصان پہنچا دیں تو آپ ﷺ نے ان کو اس نقصان کا ذمہ دار اور ضامن قرار دیا ہے، ''من تطبب و لم یعلم منه طب فهو ضامن''۔

علاج اور صحت انسانی کے مسئلہ کو آپ ﷺ نے ایسی اہمیت دی کہ از راہِ علاج ان چیزوں کے استعمال کی بھی اجازت دی جو عام حالات میں جائز نہیں ہیں، لیکن یہ اجازت اس وقت ہے کہ حلال چیز کی صورت میں اس کا کوئی متبادل نہ مل سکے۔

مریض کے لئے ایک اہم مسئلہ راز کی حفاظت کا ہے بعض دفعہ انسان ایسے مرض

میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا، آپ ﷺ نے غیبت کے سلسلہ میں جو اصول بتائے ہیں وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ غیبت انسان کے جسمانی، فکری یا اخلاقی و عملی عیب کو دوسروں پر ظاہر کرنے کا نام ہے، یہ حرام و گناہ ہے، آپ ﷺ نے اس سے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معالجین کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ایسے امراض کے معاملہ میں امانت کا ثبوت دیں اور پردہ پوشی سے کام لیں۔ جس کو وہ ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو۔ البتہ اگر کسی شخص کو نقصان اور دھوکہ سے بچانا اس کے بغیر ممکن نہ ہو تو اس شخص کی حد تک مرض کا افشاء جائز ہے، خود آپ ﷺ سے ایسے شخص کے سامنے عیب کا اظہار ثابت ہے جو اس سے رشتہ کرنا چاہتا ہو۔ یہی اسلام کا توازن و اعتدال اور اس کا اصل امتیاز ہے۔

(۱۶/اپریل ۱۹۹۹ء)

ایڈز —— حقیقی حل کیا ہے؟

کل ۲؍دسمبر کی تاریخ تھی، اس تاریخ کو بین الاقوامی سطح پر ایڈز کے دن کی حیثیت سے منایا جاتا ہے، ایڈز ایک ایسی بیماری کی حیثیت سے ہمارے سماج میں معروف ہے کہ جس سے لوگ شاید درندہ جانور سے بھی زیادہ خوف کھاتے ہوں، کہا جاتا ہے کہ اس کے جراثیم کا ادراک پہلی بار ۱۹۸۳ء میں فرانس میں ہوا، ابتداءً یہ مرض ان لوگوں میں پایا گیا جو ہم جنسی جیسی بدترین برائی میں مبتلا تھے، اس مرض کی شناخت میں کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے مرض کی دریافت کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے، ہندوستان میں پہلی دفعہ اس کا مریض ۱۹۸۶ء مدراس میں دریافت ہوا، یہ مرض ایک ہولناک سیلاب کی طرح بڑھتا جارہا ہے، دسمبر ۱۹۸۲ء میں عالمی تنظیم صحت کا اندازہ تھا کہ ایک کروڑ تیس لاکھ افراد اور دس لاکھ بچے ایڈز کے جراثیم کے حامل ہیں، روزانہ پانچ ہزار نئے انفیکشن زدہ افراد وجود میں آتے ہیں اور ہر اٹھارہ سکنڈ میں ایک نیا فرد انفیکشن سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۹۹۲ء کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں سرکاری حاصل شدہ رپورٹ میں گیارہ ہزار افراد اس مرض سے متاثر تھے، لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے بموجب غیر دریافت شدہ افراد کو لے کر ان کی تعداد گیارہ لاکھ سے کم نہ تھی، ہندوستان میں مہاراشٹر، دہلی اور تمل ناڈ میں متاثرین کا اوسط سب سے زیادہ ہے، سروے اور اعداد و شمار کے ذریعہ یہ بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طبقہ میں اسکا کیا اثر ہے؟ چنانچہ اس مرض کے جراثیم ۱۵؍فیصد طوائف میں، ۵ تا ۷ فیصد ان سے اختلاط رکھنے والوں میں، ۲۰؍فیصد ہم جنسی سے ملوث مردوں میں اور ۵۰؍فیصد ڈرگ استعمال کرنے والے مردوں میں، اور دوسرے طبقوں میں اس سے کم پائے گئے ہیں، بنیادی طور پر ۴۱؍فیصد سے زیادہ غیر قانونی

اور غیر فطری جنسی تعلقات اس کا سبب بنا ہے۔اور ۱۵ر فیصد سے زیادہ خون کی منتقلی نے اس مرض کو جنم دیا ہے، یہ بھی گویا بالواسطہ اصل مریضوں ہی سے متعدی ہو کر مرض پھیلنے کی صورت ہے، یہ ایک ایسی خطرناک صورت حال ہے جو یقیناً کسی سمندری طوفان سے کم گھبرا دینے والا نہیں، ہر چند کہ ابتداء اس مرض کا غلبہ مغربی ممالک میں تھا، لیکن اب مشرقی ممالک میں بھی اس عفریت نے اپنی جگہ بنالی ہے، بالخصوص مہاراشٹر اور تمل ناڈو میں جسم فروشی اور منی پور، میزورم اور ناگالینڈ میں انٹرونیس ڈرگ کی وجہ سے یہ بیماری نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اس مرض کی پیدائش تو غیر اخلاقی رویہ کی وجہ سے ہوتی ہے، لیکن آگے یہ مرض مختلف اسباب کے تحت متعدی اور منتقل ہوتا رہتا ہے، خون کی منتقلی سے، اعضاء کی پیوند کاری سے، اس مریض کے جسم میں لگائی گئی سوئی کے استعمال سے، بعض اوقات استرے اور بلیڈ سے، مادہ منویہ کی مصنوعی تخم کاری سے، شوہر و بیوی کو ایک دوسرے سے، مریضۂ ایڈز کے بچہ میں موروثی طور پر، یہاں تک کہ اگر موت کے بعد لاش کو مردہ خانہ میں رکھا جائے تو لاش میں بھی ایک ہفتہ تک یہ جراثیم موجود ہوتے ہیں، اسی لئے ایڈز سے مرنے والوں کو پلوتھنگ کی دو چادروں کے درمیان اس طرح لپیٹنے کی ہدایت دی جاتی ہے کہ دونوں کے درمیان کورائیڈ اور چونے کا پاوڈر رہو۔

ایڈز نے اسلامی نقطۂ نظر سے بہت سے فقہی سوالات کو بھی ابھارا ہے، مثلاً یہ کہ جو شخص ایڈز کا مریض ہو، اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہئے؟ وہ اپنے متعلقین کو اس سے مطلع کر دے اور انتقال مرض کے اسباب سے بچے اور بچائے، یا عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرے؟ ایڈز کے مریض کے بارے میں معالج کا فریضہ کیا ہے؟ مریض کے راز کی حفاظت معالج کا فریضۂ منصبی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس مریض کے راز کو چھپائے رکھے، دوسری طرف اگر اس میں پردہ داری کی جائے تو بہت سے لوگوں کو اور سماج کو اس سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اور اجتماعی نقصان انفرادی نقصان سے بہر حال اہم ہے، پھر ایسے مریضوں کے بارے میں خود سماج کی کیا ذمہ داری ہے؟ تیمارداری، دیکھ

رکھ، مذہبی اور عوامی تقریبات میں ایسے مریضوں کی شرکت کا کیا حکم ہوگا ؟ کیا یہ بات مناسب نہیں ہوگی کہ ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہاسٹل بنا دیئے جائیں، جیسا کہ بعض فقہاء نے کوڑھ کے مریضوں کے لئے ہاسٹل کا مشورہ دیا ہے (فتح الباری: ۱۰/۶۱۳) اگر ایڈز کا مریض قصداً کسی اور کو بیماری منتقل کرے تو کیا اس پر تاوان واجب ہوگا؟ شوہر کو ایڈز ہو تو کیا بیوی فسخ نکاح کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ ایڈز زدہ عورت کا حمل ساقط کرانا درست ہے یا نہیں؟ جو بچے اس مرض میں مبتلا ہوں، ان کی تعلیم وتربیت کیوں کر انجام پائے اور کیا ایڈز کے احکام وہی ہیں جو مرض وفات کے ہیں؟ یہ نہایت اہم فقہی سوالات ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل توجہ ہیں، راقم الحروف نے اپنی کتاب ''اسلام اور جدید میڈیکل مسائل'' (مطبوعہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند) میں ان سوالات پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

لیکن یہ سوالات ان لوگوں سے متعلق ہیں جو خدانخواستہ اس مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، جو لوگ محفوظ ہوں، ان کے لئے ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے احتیاطی تدابیر کا اختیار کرنا، کیوں کہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اور اس کے امانت ہونے کا تقاضا ہے کہ ایسے اسباب وعوامل سے بچا جائے جو جسم کو نقصان پہونچائیں یا اس کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنیں، سب سے پہلی احتیاط تو ظاہر ہے کہ بے حیائی سے باز رہنا ہے، اسلام میں جس قدر سخت سزا ''زنا'' کی رکھی گئی ہے، ارتداد کی بھی نہیں رکھی گئی، یعنی شادی شدہ زانی کی سزا یہ ہے کہ اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے۔ اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑے لگائے جائیں، دوسری سزا کا ذکر قرآن میں ہے (النور: ۲) اور پہلی سزا بکثرت احادیث میں مذکور ہیں، اور خلافتِ راشدہ سے آخری اسلامی عہد حکومت تک اس کا تعامل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زنا سے بچو کہ اس سے چار باتیں ہوتی ہیں، چہرے سے رونق کا ختم ہو جانا، رزق کی تنگی، اللہ کی ناراضگی اور جہنم کی ہمیشگی۔ (مجمع الزوائد عن ابن عباس: ۶/ ۲۵۵) یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بشمول ایڈز کے زنا کی وجہ سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں، وہ چہرہ اور جسم کو بدہیئت بنا دیتے ہیں، جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حدیثوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جو دنیا میں بھی

عذاب خداوندی کا باعث بنتے ہیں، ان میں ایک زنا بھی ہے، بعض روایتوں میں یہ بات آئی ہے کہ جب زنا کی کثرت ہوگی، تو ایسی بیماریاں پیدا ہوں گی کہ جن کے بارے انسان نے کبھی سنا بھی نہ تھا، یقیناً آتشک، سوزاک، ایڈز وغیرہ اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، اور حضور ﷺ نے اس کو بھی علامات قیامت میں سے شمار فرمایا ہے کہ سود، زنا اور شراب نوشی کی کثرت ہو جائے (طبرانی عن ابن مسعود) اسی طرح فعل خلاف فطرت جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت ہے وہیں صحت انسانی کے لئے بھی مہلک و جان لیوا ہے، اور اطباء اس بات پر متفق ہیں، خدا کی نگاہ میں یہ فعل کتنا شنیع اور یہ برائی کتنی سنگین اور بدترین ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر خاص اسی کی وجہ سے عذاب خداوندی نازل ہوا، اور پوری قوم کی بساط لپیٹ کر رکھ دی گئی۔

قانون قدرت اور قانون شریعت کی مطابقت پر بھی غور کیجئے کہ شریعت نے زنا کی ایسی سزا رکھی ہے جس کی اذیت پورے جسم سے متعلق ہے، چاہے کوڑے مارنے کی سزا ہو یا سنگسار کرنے کی، اور زنا کی وجہ سے جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں وہ بھی انسان کے پورے وجود پر اثر انداز ہوتی ہیں، ایڈز اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، جو پورے جسم کی قوت مدافعت کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور چہرے کی بے رونقی سے لے کر جسم کا ایک ایک انگ اس سے متاثر ہوتا ہے، یہ گویا قدرت کی طرف سے بدکاروں کی سرزنش کا ایک الٰہی نظام ہے۔ انسان اللہ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو نافذ کرنا جب چھوڑ دیتا ہے تو قدرت سرزنش کے نظام کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

اس مرض کے منتقل ہونے کے جو دوسرے اسباب ہیں یعنی خون کی منتقلی وغیرہ شرعاً اس سے بھی احتیاط واجب ہے، کیوں کہ یہ بے احتیاطی انسان کی ہلاکت کا موجب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ انسان اپنے آپ کو ہلاک کر لے، ارشاد ربانی ہے: لا تقتلوا انفسکم۔ (النساء:۲۹)

حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ جہاں طبی تدابیر اختیار کرے، وہیں اس راستہ کو بند کرنے کی کوشش کرے جہاں سے بیماری در آ رہی ہے، وہ اس اخلاقی بحران پر قابو پائے

جس کی سوغات مغرب نے ہمیں دی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہمارے ملک میں (اور کم وبیش یہی حال پوری دنیا میں ہے) ایڈز کو روکنے کی مہم چلائی جارہی ہے، لیکن دوسری طرف ایڈز کے محرکات اور اصل اسباب کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں ہے، زنا کے لائسنس جاری کئے جاتے ہیں، بدکاری کو ''محبت'' کا نام دیا جاتا ہے، اختلاط کی ممانعت کو دقیانوسیت کہا جاتا ہے، بعض ملکوں میں ہم جنسی بلکہ ہم جنس شادی کو قانونی جواز عطا کردیا گیا ہے، اخبارات میں اشتہارات اس بات کے نہیں آتے کہ لوگ غیر قانونی جنسی اتصال سے بچیں، بلکہ ترغیب دی جاتی ہے کہ محفوظ طریقے اختیار کئے جائیں، منشیات کا بازار گرم ہے، اس پر نہ کوئی رکاوٹ ہے اور نہ اس کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے ___ یہ نہایت ہی شرمناک صورت حال ہے، اور بے حسی کی آخری حد ہے کہ خدا کا خوف تو گناہوں سے باز رکھنے میں مؤثر تھا ہی نہیں لیکن اب خدا کی کھلی ہوئی تنبیہ اور آنکھوں دیکھی مضرت وہلاکت بھی آنکھیں کھولنے سے قاصر رہ جائے، اور اب بھی انسان گناہ کے دلدل سے باہر نہ آئے بلکہ گناہ سے بچنے کے بجائے گناہ کے محفوظ طریقے تلاش کرے۔

(۳/دسمبر ۱۹۹۹ء)

حق آزادی اور اس کی حدیں

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن وہ نقل وحرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس وشعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور واحساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل وحرکت کی قوت ہے، ــــ جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کردئے جائیں، نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگادیں، انہیں کوئی انکار نہیں، اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی اعلیٰ تر مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ ان سے مختلف ہے، شیر اور ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق وار کرنے یا راہِ فرار اختیار کرنے سے نہیں چوکیں گے، اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے، اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور اور فہم وادراک کی ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سوواں حصہ بھی حاصل نہ ہو،

اس لئے انسان میں آزاد رہنے کا جذبہ زیادہ ہے، اور اس کی فطرت غلامی سے اباء کرتی ہے، انسان کے نومولود شیر خوار بچہ کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضرور ہی احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے، اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں رہ سکتا، اور مزاج و مذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون وطمانیت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے، اور وہ سلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظامِ حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانونِ فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو عالم اسلام کے سفیر صحابی رسول ﷺ نے رستمِ ایران کے دربار میں کہے تھے اور ان پر اپنا مقصد ومنشاء واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کریں، **اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الی عبادة اللہ۔** (البدایۃ والنہایۃ: ۳۹/۷)

انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے اپنے ایک گورنر کو فرمایا کہ ان کو ان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا، تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا ہے، یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان واظہار ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، اس لئے آزادی ایک انسانی اور اسلامی حق ہے۔

آزادی کے تصور کو طاقت پہونچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا، کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، محض رنگ ونسل، خاندان ونسب اور علاقۂ ووطن کی بنیاد پر ان میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں، بہتری اور

بہتری انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم (الحجرات: ۱۳) — یہ وہ بنیادی تصور ہے جس کے بعد ایک انسان کا پیدائشی طور پر حکمراں اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہتیں قائم تھیں، روم، ایران، حبش، یمن، ہندوستان، غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کو حکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دیدیا گیا تھا، ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کرتے تھے، مغرب میں رفتہ رفتہ کلیسا نے انسان کو اپنا مکمل غلام بنالیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کو لوگوں کی آخرت کا ٹھیکیدار تصور کرتے تھے، بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کو خدائی فیصلہ باور کرتے تھے، اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کردیا گیا تھا، ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اور لوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے اور دوسری طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کر نہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے، اور جو ان کی رائے سے سرمو انحراف کرتا ان کو لرزا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا، اور زندہ جلا دینے کی سزا دی جاتی بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس پر یہ ظالمانہ کلیسائی نظام یورپ سے ختم ہوا، گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی، اس لئے یورپ میں جو انقلابی تحریکیں اٹھیں ان کا خمیر مذہب کی مخالفت اور عناد سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کو سند جواز عطا نہیں کیا، اور ایک ایسے آزاد طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا، جس میں رنگ ونسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پر فرمانرواں کا انتخاب عمل میں آئے، اور پھر یہ بھی بتادیا کہ حکمراں کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے، اس کے فیصلے غلط بھی ہوسکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی، اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حق حکمرانی ''اتفاق'' سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہوجائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے، بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور اکتساب

سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور ابھرتا ہے، اور غلامی کی نفی ہوتی ہے۔

پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے، اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کردیا جائے تو اس کے وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء: ۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم وکرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (نساء: ۲۹) ـــــ پھر کسب معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آرہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے۔ ہاں، اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جا سکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت وآبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے، اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے، **لا یسخر قوم من قوم** (الحجرات: ۱۱)۔ **عدل وانصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے، اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران ومحکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ پیمانۂ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے، **ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا** (مائدہ: ۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطاء کی گئی، اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران: ۱۰)۔ ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے، **لا یحب اللہ الجھر**

بالسوء من القول الا من ظلم (نساء:۱۴۸)

اسلام ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، کہ وہ اپنے ضمیر و اعتقاد کے مطابق خود زندگی گذارے: لا اکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی (البقرۃ: ۲۵۶) سزاء کے نظام میں بھی مساوات و برابری اور ہر بالغ و مکلف کے لئے یکساں سزا رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کی ایک معزز خاتون کا ہاتھ چوری کے جرم میں کٹوایا، اور اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سفارش کو رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اگر فاطمہ بنت محمد بھی اس کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی گئی ہوتی، اسلام نے ایک ایسے نظامِ مملکت کا تصور دیا جو شورائیت پر مبنی ہو، وأمرھم شوری بینھم (الشوری: ۳۸)

غرض اسلام ایک ایسے سیاسی نظام کا نقیب و ترجمان ہے جو غلامی کے بجائے آزادی پر مبنی ہو، جو انسانی تفریق کے بجائے مساوات پر قائم ہو، جس میں رنگ و نسل کے بجائے اخلاق و کردار کو تولا جاتا ہو، جس میں انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، جس میں اصحاب اقتدار کے احتساب کی اسی قدر گنجائش ہو، جتنی ایک ادنیٰ رعایا کی، اور جو انسان کرامت و شرافت کے بنیادی تصور پر استوار ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزادی کے لئے بھی کچھ حدود و قیود ضروری ہیں، سڑک پر ہر شخص کو چلنے کا حق ہے لیکن اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ آزادی ان کو ٹریفک کے قواعد سے بھی آزاد کرتی ہے تو یقیناً یہ آزادی پروانۂ ہلاکت بن جائے گی، اس لئے آزادی کے بھی دائرے ہیں، اور یہ دائرہ اخلاقی اقدار کا ہے، آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اخلاق کے بندھن ٹوٹ جائیں، جو شرم و حیاء کے الفاظ کو انسانی ڈکشنری سے مٹا کر رکھدے، جو انسان کو ظلم و استبداد کے لئے آزاد کردے، جو فطرتِ انسانی کی تسلیم شدہ حقیقتوں پر بھی خط نسخ پھیردے، یہ آزادی رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے۔ اور سامان عافیت نہیں بلکہ ابتلاء و مصیبت ہے، افسوس کہ مغرب میں کلیسائی نظام کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس نے مذہب بےزاری کی ایسی برقی رو دوڑادی کہ جس نے فکر و نظر کے تار و پود بکھیر کر رکھدیئے اور لوگوں نے سمجھا کہ آزادی یہ ہے کہ انسان مادر و پدر سے آزاد ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمہ

اخلاقی قدروں کو بھی غلامی کی علامت سمجھ لیا گیا، مخرب اخلاق اسباب کو بھی آزادی کا پروانہ دیدیا گیا، اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہوگئی کہ وہ اپنے پیکر آزادی پر اخلاق و شرافت کی قید و بند کا کوئی تارِ لباس باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام وتدبیر انسان کے ہاتھ میں رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہ (یوسف:۴۰) کیونکہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کے حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی، یہ آزادی کا ایک متوازن، معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے، بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بننا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے، تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی اسے قبول کرنی ہوگی، اسی کو مردِ حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبالؔ نے کہا ہے کہ :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(۱۰/اگست ۲۰۰۱ء)

آزادئ تحریر یا آوارہ خیالی؟

خشونت سنگھ ہمارے ملک کے معروف اور کہنہ مشق صحافیوں میں ہیں، چبھتا ہوا طنز اور مخالف کو مشتعل کردینے والی تعریض اگر فن کا کمال ہو تو اس کمال میں کم اہلِ قلم ہیں جو ان کی ہمسری کرسکیں، لیکن آزاد خیالی بلکہ آوارہ خیالی کی وجہ سے ان کی تحریریں اکثر نزاع کا باعث بنتی رہتی ہیں، انسان کی عملی اور فکری وابستگی کے جتنے مرکز ہیں ان میں سب سے زیادہ مقدس مذہبی وابستگی ہے۔ ہر شخص اپنے دین و دھرم کے مقابلہ میں بہت جذباتی اور حساس ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سلیم الفکر معاشرہ ایک دوسرے کے مذہبی احساسات کے احترام اور رعایت پر مبنی ہے۔ خشونت سنگھ چوں کہ دہریہ ہیں، اور فکری اعتبار سے مادر پدر آزاد ہیں، اس لئے شرافت اور انسانیت کے اس عمومی احساس سے بھی محروم ہیں، اس لئے اپنے قلم ناز سے بہتوں کو گھائل کرتے رہتے ہیں، کبھی ہندوان کا نشانہ بنتے ہیں، کبھی سکھ اور کبھی مسلمان، کبھی کسی اور مذہب کے ماننے والوں کو ہدف بناتے ہیں یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے، لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں۔ آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں، لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہر حال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑیں اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کردے، اس کا نام آزادی نہیں بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے، افسوس کہ خشونت سنگھ جس آزادئ صحافت کے علمبردار اور حریت فکر کے دعویدار ہیں، وہ کسی قسم کی اصول وقواعد اور شرافت وسنجیدگی سے آزاد صحافت ہے۔

ابھی حال ہی ان کا ایک ناول THe Company of Woman یعنی عورتوں کی صحبت، کے نام سے لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نام سے ہی بے حیائی اور بے شرمی جھلکتی ہے، قارئین اور تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ نہایت ہی بے ہودہ قسم کا ناول ہے۔ اس میں مرد و عورت کے شہوانی جذبات، شہوانی افعال یہاں تک کہ جسم کے حساس اعضاء کی بھی بہت بے حجابانہ تصویر کشی کی گئی ہے، ہمارے ملک میں ایشین ایج اس قسم کی تحریروں کی تشہیر و اشاعت کے لئے معروف ہے، اسی نے اس ناول کا خلاصہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو شائع کیا ہے۔ اس فرضی کہانی میں پاکستان کی ایک مسلم خاتون اور ہندوستان کے ایک غیر مسلم نوجوان کا بنیادی کردار ہے۔ اس میں اس عورت کی زبان سے ہندو مذہب کے کمزور اخلاقی پہلوؤں کو سوالات کے ذریعہ ابھارا گیا ہے، جو یقیناً ہندو بھائیوں کے لئے ایک تکلیف دہ بات ہے، پھر اسلام پر کچھ سوالات اٹھائے گئے ہیں، حجرِ اسود کے بوسہ لینے کو بت پرستی کے مماثل قرار دیا گیا ہے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ پھر یہ فحش منظر بھی پیش کیا گیا ہے کہ کہانی کے یہ دونوں کردار ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور بدکرداری کرتے ہیں، اور اس برائی کے درمیان وہ عورت اپنے گلے میں آیات قرآنی کا نکلس لٹکائے رہتی ہے، اور یہ عورت کہتی ہے کہ وہ عمرہ کر کے اس گناہ کا کفارہ ادا کر دے گی، یہ بات بھی ظاہر کی جاتی ہے کہ وہ پابند نماز عورت ہے۔

ان مضامین کی بے ہودگی اور ناشائستگی ظاہر ہے کہ اس میں ہندو مذہب کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے، اور مسلمانوں کے جذبات کو تو بہت ہی ٹھیس پہونچائی گئی ہے۔ عمرہ جیسی عبادت کا تمسخر اور ایک پابند نماز خاتون کی بے عزتیکی گئی ہے۔ ایک کہنہ مشق، جہاں دیدہ اور معروف صحافی سے ایسی اوچھی حرکت کا صدور اور ایسی ناپاک تحریروں کی تخلیق نہ صرف خشونت سنگھ کے لئے شرمناک ہے بلکہ اس سے تمام ہندوستانیوں کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے کہ ہندوستان کی شرم وحیاء اور عفت وعصمت ضرب المثل رہی ہے۔ جو ملک سیتا کی عفت و پاک دامنی کا امین ہو وہاں علانیہ شہوت انگیز فرضی کہانیاں اور مخرب اخلاق ناول لکھے جائیں تو اس سے زیادہ قابلِ افسوس بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

اسلامی نقطۂ نظر ان امور کے بارے میں بالکل واضح اور بے غبار ہے، قرآن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ایسی بات کہی جائے جوان کے ماننے والوں کے لئے اشتعال اور دل آزاری کا باعث ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ** (الانعام:۱۰۸) یعنی مشرکین جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ معاشرہ کو اشتعال اور نقض امن سے بچایا جائے، اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو سماج کے کسی طبقہ کے لئے اذیت اور تکلیف کا باعث ہو۔

شریعت اسلامی کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی برائی وقوع پذیر بھی ہوئی ہو، تو اس کا چرچا کرنے سے بچا جائے، کیوں کہ برائی کے ذکر سے بھی برائی پھیلتی ہے۔ اسی لئے اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہوتو کوڑوں کی سزا کے علاوہ آپ نے اسے ایک سال کے لئے شہر بدر کردینے کا بھی حکم فرمایا۔ مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو موضوع گفتگو بنا رہے گا۔ اور لوگ اس کی برائیوں کا بھی ذکر کرتے رہیں گے۔

اس طرح برائی کا چرچا عام ہوگا، اور معاشرہ میں برائی پھیلے گی، اسی طرح اگر کوئی بد بخت جانور کے ساتھ بدفعلی کرے تو آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس جانور کو ذبح کر کے جلا دو۔ ظاہر ہے کہ اس میں جانور کا کوئی قصور نہیں، لیکن مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اسی ماحول میں چلتا پھرتا رہے تو لوگ انگشت نمائی کریں گے۔ اس طرح ایک برائی کا ذکر عام ہوگا اور جب کسی برائی کا چرچا بکثرت ہونے لگتا ہے تو مریضانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ خود اس برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس لئے اس کے سد باب کے طور پر آپ نے جانور ذبح کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ تو ان برائیوں کا ذکر ہے جو واقعی پیش آئی ہو، فرضی کہانیوں کے ذریعہ کسی برائی کو پھیلانا اور اس کے چرچا کو عام کرنا تو ظاہر ہے کہ بہت شدید درجہ کا گناہ ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کوئی خلاف واقعہ بات کہے، مقصد بدنیتی نہ ہو بلکہ لوگوں کو ہنسانا ہو، تو یہ بھی اس کے لئے رحمتِ خداوندی سے محرومی کا باعث ہوگا۔ (دیکھئے: مجمع الزوائد:

۸۹/۸، باب ماجاء فی المزاح) اس سے ظاہر ہے کہ تفریحی مقاصد کے لئے بھی خلاف واقعہ بات کہنا اور فرضی واقعہ نقل کرنا درست نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ یا تو بھلی بات کہے، یا خاموش رہے، کہ اللہ تعالیٰ دنیا سے بے نیازی برتنے والے بردبار اور زبان کی حفاظت کرنے والے شخص کو پسند فرماتے ہیں اور بدزبان فاجر، الحاح کے ساتھ مانگنے والے کو ناپسند فرماتے ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۷۶/۸) بدگوئی سے بہتر زبان وقلم کو خاموش رکھنا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے خاموشی اختیار کی اس نے نجات پائی، **من صمت نجا** (ترمذی) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خاموشی میں کئی حکمتیں ہیں، لیکن کم لوگ ہیں جو اسے اختیار کریں: **الصمت حکم و قلیل فاعله**، (احیاء العلوم ۱۰۸/۳) ایک روایت میں ہے کہ جب تم کسی مومن کو دیکھو کہ وہ خاموش اور باوقار ہے تو اس سے قربت اختیار کرو، کیوں کہ وہ حکمت کی باتیں بتائے گا: **اذا رئیتم المومن صموتا وقورا فادن منه، فانه یلقن الحکمة**. (ابن ماجہ)

بدزبانی اور بدگوئی اسلام کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس سے بہت شدت سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتے۔ **ایاکم والفحش، فان الله تعالیٰ لا یحب الفحش ولا التفحش**، یہاں تک کہ بدر میں جو مشرکین قتل کئے گئے رسول اللہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو تو تمہاری بات نہیں پہونچے گی۔ لیکن ان کے جو پسماندگان زندہ ہیں، ان کے لئے یہ بات اذیت کا باعث ہوگی، پس بدگوئی قابل ملامت ہے، (احیاء العلوم: ۱۲۱/۳)

اس لئے گو کسی شخص کا عمل خراب ہو، لیکن ناحق اس کے تذکرہ کو اسلام پسند نہیں کرتا ہے، بالخصوص ان حالات میں کہ اس کی بدکلامی لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچاتی ہو، اسلام کے جو اصول ابھی پیش کئے گئے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر مذہب، ہر مہذب قانون

اور ہر شریف معاشرہ اس سے متفق ہوگا، کیوں کہ اس کے بغیر سماج کے امن وامان کی برقراری ممکن نہیں، اس طرح کی تحریریں لکھنا قلم کی آزادی نہیں، بلکہ قلم کی آوارگی کے دائرہ میں آتی ہے، اور ضروری ہے کہ ایسی چیزوں پر قانونی اعتبار سے بھی روک لگے اور صحافتی برادری بھی ایسے اہل قلم کا نوٹس لے، اور صحافت جیسے پاکیزہ پیشہ کی عزت وآبرو کی حفاظت کرے۔

(۲۱ر جنوری ۲۰۰۱ء)

ووٹ ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

ملک میں الیکشن کا عمل شروع ہو چکا ہے، کچھ علاقوں میں لوگ اپنا حق رائے دہی استعمال کر چکے ہیں، اور ہمارے شہر میں کل لوگ اپنے اس حق کا استعمال کریں گے، مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم انتخاب اور رائے دہی کے اس عمل کے بارے میں اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر جاننے کی کوشش کریں، کیوں کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب، اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کی بابت رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

ووٹ کے بارے میں بھی اسلام کے اصولی احکام سے ہمیں روشنی ملتی ہے، جب کوئی شخص انتخاب میں امیدوار بنتا ہے تو وہ بنیادی طور پر دو باتوں کا مدعی ہے، اول اپنی امانت و دیانت کا، دوسرے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے جب حکومتِ مصر کے سامنے بار قیادت اٹھانے کی پیشکش کی تھی تو فرمایا تھا: **اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ، اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ** (یوسف: ۵۵) یعنی خزانہ کے انتظام اور انصرام پر مجھے مامور کیجئے، کہ میں نگہبان اور آگاہ ہوں، حفاظت و نگہبانی اسی شخص سے ممکن ہے جو دیانت دار اور امین بھی ہو، جو شخص خود ہی خیانت اور بد دیانتی کا مرتکب ہو، وہ کیا حفاظت اور نگرانی کا فرض انجام دے سکتا ہے؟ اور علم سے اشارہ صلاحیت اور اہلیت کی طرف ہے، جب تک کسی معاملہ سے متعلق علم و آگہی نہ ہو، انسان اس کے انتظام و انصرام اور اس سلسلہ میں مشورہ دینے کا اہل نہیں ہوسکتا، پس، امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنا اپنے تئیں امانت دار اور باصلاحیت ہونے کا دعویٰ ہے۔

ووٹ رائے دہندوں کی طرف سے اس کے اس دعویٰ کی تصدیق اور اس کے راست گو ہونے کی گواہی ہے، گویا آپ جس امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، اس کے حق میں

گواہی دیتے ہیں کہ جتنے امیدوار اس حلقہ سے کھڑے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ دیانت دار اور باصلاحیت ہے، اور معلوم ہے کہ جہاں سچی گواہی انسان کے لئے اجر و ثواب کا موجب ہے، جھوٹی گواہی اسی قدر عذاب وعقاب کا سبب ہے، رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ اور جھوٹی گواہی کی سخت مذمت فرمائی ہے۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد تین بار ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی کو شرک کے ہم درجہ قرار دیا گیا ہے: "عدلت شهادة الزور بالاشراك بالله" پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: فاجتنبوا الرجس من الاوثان، واجتنبوا قول الزور (؟) یعنی بت پرستی کی نجاست اور جھوٹی بات کہنے سے بچو (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۳۵۹۹، ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۳۹۴) اللہ تعالیٰ نے مومن کے خاص اوصاف میں سے اس بات کو بھی قرار دیا ہے کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتا (الفرقان: ۷۲) لہٰذا کسی امیدوار کو نامناسب جانتے ہوئے پھر بھی اس کے حق میں ووٹ دینا گویا جھوٹی گواہی دینا اور ناحق اپنے آپ کو ایک بڑے گناہ سے دوچار کرنا ہے۔

جہاں جھوٹی گواہی دینا گناہ ہے وہیں ضرورت کے باوجود گواہی نہ دینا "کتمان شہادت" ہے اور یہ بھی سخت گناہ ہے، قرآن مجید نے گواہی کے چھپانے کی سخت مذمت کی ہے، ارشاد ہے: لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ (البقرۃ: ۲۸۳) کہ گواہی کو چھپایا نہ کرو، جو گواہی کو چھپائے گا، اس کا دل گنہ گار ہوگا، اس لئے ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ووٹ دینا شرعاً واجب ہے، اور کسی شدید ضرورت کے پیش آنے یا ضرر شدید کے اندیشہ کے بغیر ووٹ دینے سے پہلوتہی کرنا گناہ کا باعث ہوسکتا ہے، اور عند اللہ اس پر سخت مواخذہ کا اندیشہ ہے۔

بعض حضرات پیسے لے کر کسی امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ استعمال کرتے ہیں، یہ بھی گناہ اور حرام ہے، کیوں کہ یہ پیسہ لے کر کسی شخص کے حق میں جھوٹی گواہی دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ رشوت ہے، اور رشوت کتنا سخت گناہ ہے اور کیسی شدید معصیت ہے؟ یہ کسی مسلمان کے لئے محتاج اظہار نہیں، رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت بھیجی ہے، ایک حدیث شریف میں ہے کہ رشوت دینے والے اور

رشوت لینے والے دونوں دوزخی ہیں، چند پیسوں کے لئے اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی لعنت کا مستحق بنالینا اور دوزخ خرید کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں ہوسکتا۔'' ہمارے ملک کے قانون کے تحت عورتوں کو بھی ووٹ دینے کا حق حاصل ہے، مسلمان خواتین کو بھی چاہئے کہ وہ اپنے اس جمہوری حق سے فائدہ اٹھائیں، اسلامی نقطۂ نظر سے عورت الیکشن میں امیدوار نہیں ہوسکتی، البتہ اگر ہندوستان میں خواتین کے لئے سیٹیں مخصوص کر دی جائیں تو یہاں کے خصوصی حالات میں اس کے سوا چارہ نہ ہوگا کہ اگر مسلمان اس قانون کے روکنے پر قادر نہ ہوں تو کمتر درجہ کی برائی سمجھتے ہوئے خواتین کو بھی انتخابی امیدوار بنائیں، تاہم عورت کے ووٹ دینے میں کچھ حرج نہیں، فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ گواہوں کے تزکیہ کا آتا ہے، یعنی جو گواہان عدالت میں پیش ہوئے ہوں ان کے بارے میں معتبر اور نامعتبر ہونے کی گواہی، اور اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی کو معتبر مانا گیا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: **و یقبل تعدیل المرأۃ لزوجھا و غیرہ اذا کانت امرأۃ برزۃ تخالط الناس و تعاملھم** (ہندیہ: ۳/ ۵۲۸) ووٹ بھی اسی قبیل سے ہے۔

ووٹ میں شفاعت وسفارش کا پہلو بھی پایا جاتا ہے، جب آپ کسی کو ووٹ دیتے ہیں تو گویا اس کے حق میں سفارش کرتے ہیں کہ اسے قوم و ملک کے انتظامی امور میں نمائندہ بنایا جائے، اور شفاعت وسفارش اگر درست ہو تو باعثِ اجر وثواب ہے، اور غلط سفارش کی جائے تو سفارش کنندہ بھی گناہ میں حصہ دار ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بہتر سفارش کرے گا، اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا اور جو نادرست سفارش کرے گا اس کے لئے اس میں سے حصہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں (النساء: ۸۵) غلط سفارش کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے چوری کے ایک مقدمہ میں مجرم کے لئے سفارش کی، تو آپ ﷺ اتنے برہم ہوئے کہ کھڑے ہوکر اس پر مستقل خطبہ ارشاد فرمایا: کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی لئے ہلاک ہوگئے کہ جب کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے، اور کوئی معمولی شخص چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۳۷۳)۔ اس لئے غلط سفارش بھی نہایت ہی مذموم عمل ہے، اور چوں کہ ووٹ کے

ذریعہ منتخب ہونے والے نمائندہ کے عمل سے اجتماعی نفع ونقصان متعلق ہے، اس لئے یہاں غلط سفارش کا گناہ بھی نسبتاً زیادہ شدید ہوگا۔

ووٹ میں ایک پہلو وکالت کا بھی ہے، ووٹ کے ذریعہ آپ جو نمائندہ منتخب کرتے ہیں وہی سربراہِ حکومت یعنی وزیر اعظم و وزیر اعلیٰ اور صدرِ مملکت یعنی صدرِ جمہوریہ کا انتخاب کرتے ہیں، پھر وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ ہی کے واسطہ سے ملک کی پوری انتظامیہ تشکیل پاتی ہے، اور عدلیہ اور انتظام کے کچھ صیغے صدر کے واسطہ سے وجود میں آتے ہیں، اس طرح ملک کا نظم ونسق اور نظامِ عدلیہ کا بالواسطہ آپ کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ارکان مقننہ ہی پر انحصار ہے، پس گویا ملک کے نظم واقتدار کے لئے ذمہ داروں کے انتخاب کے باب میں یہی ارکان آپ کے نمائندہ اور وکیل ہیں اور قاعدہ یہ ہے کہ شرعاً وکیل کے ذریعہ انجام پانے والے افعال اس شخص کی طرف بھی منسوب ہوتے ہیں جس نے اس کو وکیل بنایا ہو، اس لحاظ سے غور کیجئے تو کسی امیدوار کو ووٹ دینا نہایت ہی اہم مسئلہ ہے، اور یہ اس کے اچھے اور بُرے افعال میں شریک وسہیم ہونے کے مترادف ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ووٹ دیتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھے کہ وہ ووٹ کے ذریعہ سچی یا جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اچھی یا بُری سفارش کر رہا ہے، مناسب یا غیر مناسب شخص کو اپنا وکیل اور نمائندہ بنا رہا ہے، ووٹ دینے پر پیسے لے کر وہ صریحاً رشوت خوری کا مرتکب ہوتا ہے، اور بلا عذر ووٹ نہ دے کر گواہی کو چھپانے کا گناہ مول لیتا ہے، اور اس کی یہ گواہی سفارش اور وکالت ایک ایسا عمل ہے جس کا اثر صرف اس کی ذات یا اس جیسے چند اشخاص تک محدود نہیں، بلکہ اس کی منفعت اور مضرت اجتماعی ہوگی، اور پوری قوم اس سے متاثر ہوگی، اور کسی شخص کو انفرادی نقصان پہونچانا کمتر درجہ کا گناہ ہے، اور اجتماعی سطح پر ضرر پہونچانا یا اس میں شریک ہونا بہت بڑا گناہ۔ اس لئے ہر مسلمان کا شرعی اور اسلامی فریضہ ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر نسبتاً بہتر، دیانت دار، قوم و ملک کے حق میں مفید اور خیر خواہ امیدوار کے حق میں اپنے ووٹ کو استعمال کریں، اور ذاتی تعلقات اور شخصی مفاد کے مقابلہ قومی مفادات کو ترجیح دیں!۔ (۱۰؍ستمبر ۱۹۹۹ء)

ووٹ ـــــ ایک امانت

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، اس لئے آزادی اس کی فطرت میں ہے۔ غلامی اس کے لئے سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خواہ اس غلامی کے ساتھ اس کی جسمانی راحت کا کتنا بھی سر و سامان کیا جائے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے کسی پرندہ کو سونے کے قفص میں بند کر دیا جائے۔ اس آزادی کے لئے ہمارے بزرگوں نے جہاد کیا اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا، آج ہمارا ملک آزاد ہے، ہم خود اس کے درو بست کے مالک ہیں اور اس کی تقدیر کے فیصلہ میں شریک ہیں۔ یہ آزادی اللہ کی بڑی نعمت ہے، ہم آزادانہ اپنے افکار و خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں، ہم جس بات کو غلط سمجھیں اسے برملا غلط کہہ سکتے ہیں، ہم ان لوگوں کا احتساب کر سکتے ہیں جو اقتدار کے ایوانوں میں متمکن ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں اور محرومانِ ہدایت کو سچائی کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔

اس جمہوریت کا ایک حصہ ''الیکشن'' ہے؛ جس میں ملک کے عوام اپنے لئے اپنی پسند کے نمائندے منتخب کرتے ہیں، جو ایوانِ اقتدار میں ان کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کے سیاہ و سپید کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر تو اسلام ''الیکشن'' میں اُمیدواری ہی کا قائل نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا ''جو شخص کسی عہدہ اور ذمہ داری کا طلب گار ہوگا میں اسے وہ ذمہ داری حوالہ نہیں کروں گا''۔ اس لئے لوگوں سے ووٹ کی بھیک مانگنا اور خواہش کرنا کہ ہمیں اس ذمہ داری کے لئے منتخب کرو، بجائے خود ایک غیر اسلامی بلکہ غیر اخلاقی اور غیر شریفانہ طریقہ ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ خود لوگ اس سے خواستگار ہوں کہ وہ اس ذمہ داری کو قبول کرے، لیکن مشکل یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں ہر چیز کی گنجائش ہے سوائے اخلاق کے، اس لئے خود امیدوار بننے کے سوا چارہ نہیں، ورنہ

سارے ہی خراب لوگ سیاست کی اس ریل میں سوار ہو جائیں گے۔

جمہوریت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں۔ اسلام ان خامیوں کی اصلاح کے ساتھ ان کو قبول کرتا ہے، سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ہمارے ملک میں انتخاب میں حصہ لینے اور عوامی نمائندہ منتخب ہونے کے لئے نہ علم و دانش کی شرط ہے، نہ اخلاق و دیانت کی ضرورت ہے۔ پہلے لوگ اس کا رونا روتے تھے، کہ جاہل اور کم تعلیم یافتہ افراد منتخب ہو جاتے ہیں اور ملک کے حساس مسائل کا فیصلہ ایسے کندہ ناتراش افراد کے حوالے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بعض ایسے ارکان مقنّنہ بھی تھے اور ہیں جو دستخط کی صلاحیت سے بھی بے نیاز ہیں، اور نشان ابہام ہی سے کام چلاتے ہیں، اب بات اس سے بھی آگے جا چکی ہے اور بڑی تعداد میں ایسے عناصر مجالس قانون ساز میں پہنچ رہے ہیں جو نامزد اور نامور مجرم ہیں، ان پر قتل، زنا، غصب اور رہزنی کے علانیہ جرائم ہیں۔ پہلے پولیس گرفتار کرنے کے لے ان کا پیچھا کرتی تھی، اب ان کی حفاظت وسلامتی کے لئے ان کے پیچھے پیچھے رہتی ہے، کرپشن اور سیاست کا اب چولی دامن کا رشتہ ہے اور اب کسی بھی لیڈر کے بارے میں اسکام کی خبریں سن کر عام شہری کو کوئی حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ اب ایک معمول کی بات ہے۔

جو لوگ الیکشن میں کھڑے ہوتے ہیں، ان میں شاید ایک فیصد بھی ایسے نہیں جو حقیقت میں ایماندار کہلانے کے لائق ہوں، جن کی زندگی پاک وصاف ہو اور عوام کی املاک میں خرد برد کرنے کا عزم لے کر اس میدان میں نہ اُترے ہوں، ڈاکٹر راجندر پرشاد بارہ سال ہندوستان کے صدر رہے اور جب سبکدوش ہو کر اپنے وطن پٹنہ گئے تو ان کو رہنے کے لئے کوئی مکان بھی میسر نہیں تھا، جواہر لال نہرو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن تھے، اس وقت فیس رکنیت پانچ سو روپے تھی، جب مولانا مسعود علی ندوی نہرو جی سے ممبری فیس لینے گئے، تو ان کے پاس پانچ سو روپے بھی مکمل نہ ہو سکے اور دو قسطوں میں فیس ادا کی اور اپنی پاس بک دکھائی جس میں دو ڈھائی سو روپے سے زیادہ نہ تھے، لیکن آج معمولی عوامی نمائندوں کے محلات پر قصر شاہی اور گھر کی زیبائش وآرائش پر ''جنتِ شداد'' ہونے کا گمان

ہوتا ہے اور پولیس چھاپہ مارتی ہے تو منوں سونے کے زیورات ان کے مکان سے برآمد ہوتے ہیں۔

ان حالات میں ووٹ دینا اور اپنے حق رائے دہی سے استفادہ کرنا جہاں قومی فریضہ ہے، وہیں مسلمانوں کے لئے مذہبی فریضہ بھی ہے، تاکہ ایسے نمائندوں کا انتخاب ہو سکے جو نسبتاً صالح کردار اور اخلاقی اقدار کے حامل ہوں، جو مجرمانہ سیاست پر یقین نہ رکھتے ہوں اور ملک کے سیکولر کردار کی بابت مخلص ہوں، وہ چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوں، بلکہ حق اور سچائی کے طرف دار ہوں۔ موجودہ حالات میں مکمل ایمان دار اور پاک وصاف کردار کے حامل سیاسی لیڈر کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ شریعت کا اُصول ہے کہ جہاں ''بہتر'' میسر نہ ہو، وہاں نسبتاً ''کم خراب'' کو اختیار کیا جائے۔ اس لئے موجودہ حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اُمیدوار کو ووٹ دیا جائے، جو ملک کی مختلف اکائیوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہو، فرقہ پرست نہ ہو اور نسبتاً صالح کردار کا حامل ہو، وہ کم از کم دو شر میں سے کمتر درجہ کا شر ہو۔

ووٹ کی حیثیت دراصل شہادت اور گواہی کی ہے، آپ جب کسی اُمیدوار کے حق ووٹ دیتے ہیں تو گویا آپ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام اُمیدواروں میں یہی شخص آپ کے نزدیک اپنی دیانت، جذبۂ خدمت اور نمائندگی کی صلاحیت میں نسبۃً بہتر اور قوم وملک کے لئے مفید ہے۔ کسی شخص کی دیانت وامانت کے بارے میں آپ کو اطمینان نہ ہو، آپ کے علم میں ہو کہ یہ کرپٹ اور راشی ہے اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنے اور اپنے خاندان کی خدمت ہی اس کا مقصود ہے، اس کے باوجود آپ اسے ووٹ دیں، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دیں، تو اللہ کے یہاں آپ اس بارے میں جوابدہ ہوں گے، اس میں جھوٹی گواہی دینے کا گناہ ہوگا۔ یوں تو ہر جھوٹ برائی ہے، لیکن جھوٹی گواہی کا گناہ، گناہ کی تمام صورتوں سے بڑھ کر ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے بہت بڑے گناہوں میں ایک شمار فرمایا ہے۔

ووٹ میں اُمیدوار کی صلاحیت اور کردار کے بجائے محض اس بات کو معیار بنانا کہ یہ ہمارے محلّہ کا ہے، ہمارے اس شخص سے تعلقات ہیں، اس نے ہمارا فلاں ذاتی کام کر

دیا تھا، یہ ووٹ دینے کے لئے ہمیں پیسے دے رہا ہے، درست نہیں ہے۔ یہ خیانت اور جھوٹی گواہی ہے اور یہ پیسے رشوت ہیں، ہر شخص اس کے بارے میں اللہ کے یہاں جوابدہ ہے، ایسا شخص ایک دو نہیں بلکہ پوری قوم کے ساتھ بدخواہی کا مرتکب ہے، اس لئے ووٹ کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہئے، تمام اُمیدواروں پر غور کرنا چاہئے، اس کی گزشتہ زندگی اور عام لوگوں کے ساتھ اس کے سلوک اور رویہ کا بھی جائزہ لینا چاہئے، اور پھر جس اُمیدوار کو بہتر اور مفید تصور کرتا ہے اس کے حق میں ''ووٹ'' دینا چاہئے۔ ووٹر کے لئے یہی اصل کامیابی ہے جس کے حق میں اس نے ووٹ کا استعمال کیا ہے، اگر وہ ہار گیا، تب بھی ''ووٹ'' دینے والا اپنے مذہبی فریضہ اور قومی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے، وہ اللہ کے یہاں خیانت کا مرتکب تصور نہ کیا جائے گا اور اگر ایسے امیدوار کو ووٹ دیا جائے جو قوم کے لئے مفید نہیں، مضر ہے، تو گو اُمیدوار جیت جائے پھر بھی ایک مسلمان ووٹر کے لئے یہ ہار ہی ہے، کیوں کہ وہ اپنے اس غلط عمل کی بابت عند اللہ جوابدہ ہے اور خدا کے ترازو میں اس کا یہ عمل قابل مواخذہ ہے!

(۱۳ر فروری ۱۹۹۸ء)

انتخابی امیدوار —— اسلامی معیار

الیکشن کا بگل بج چکا ہے، جلسے جلوس، اشتہارات، وعدے اور وعیدیں ایک دوسرے کی کردار کشی، بلند بانگ دعووں کا ایک سیلاب ہے، جو ملک کے گوشہ گوشہ میں رواں دواں ہے، کیا شہر اور کیا دیہات؟ گھر گھر اور قریہ قریہ، آنے والے الیکشن کی گونج ہے، جیوتشیوں کی بھی بن آئی ہے، اندازے اور پیشین گوئیاں بھی طرح طرح کی کی جارہی ہیں، دعائیں اور آشیرواد بھی لئے جارہے ہیں، جن گندی بستیوں، تنگ اور تیرہ و تاریک گلیوں کی طرف قائدین کبھی بھٹک کر بھی نہیں دیکھتے تھے، اب قائدین کا ایک ہجوم ہے، جو بن بلائے مہمانوں کی طرح صبح و شام ان مقامات کا چکر لگا رہا ہے، جن غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا، ووٹ کی کشکول تھامے بڑے بڑے موٹر نشیں اور برا نہ مانئے تو کہا جائے، ''فراعنۂ وقت'' ان کی خوشامدیں کررہے ہیں، ایسے ایسے وعدے کئے جارہے ہیں کہ گویا ہر گھر میں دودھ کی نہر بہادیں گے اور شہد کے چشمے پھوٹ پڑیں گے، امیدواروں کا تعلیمی اور اخلاقی معیار بھی سننے سے تعلق رکھتا ہے، بعض حضرات اپنے دستخط بھی ''بہ تکلف'' کرتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ انگوٹھے کے نشان سے کام چلایا ہے، بعض حضرات کی تعلیمی سطح پرائمری اور مڈل اسکول تک ہے۔ اخلاقی اقدار کا حال اس سے بھی بُرا ہے، کسی پر راہزنی کا مقدمہ ہے، کسی پر قتل کا تو کسی پر آبروریزی کا، رہ گئی رشوت اور مالی خرد برد، تو یہ تو اس طبقہ کے لئے ایک ''معمولی'' سی بات ہے!

ان حالات میں ووٹ کے لئے امیدواروں کے انتخاب میں مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے؟ کیا ان کی سوچ وہی ہو جو عام لوگوں کی ہے، زمانہ جس رُخ پر چل رہا ہو، اسی رخ پر چل پڑنا، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنا تعلقات اور شخصی مفادات کی بناء پر امیدوار کا انتخاب کرنا، ان کو ووٹ دینا اور ووٹ دلانا، ان کی تشہیر کرنا، ان کی

پروپیگنڈہ مشنری میں شریک ہونا، کیا مسلمانوں کے لئے بھی درست ہوسکتا ہے؟ یا بہتر امیدوار کا انتخاب مسلمانوں کا شرعی فریضہ ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا اور جس کو ملحوظ رکھنا بحیثیت مسلمان ہمارے لئے ضروری ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ اچھے امیدوار کا انتخاب اور اس کی تائید، اور نامناسب اور نااہل امیدوار کو رد کردینا اور اس کے ساتھ عدم تعاون ایک دینی اور شرعی فریضہ ہے، کیوں کہ قرآن نے ایک اصولی بات کہہ دی ہے کہ اچھی بات اور اچھے کام میں تعاون بھی ضروری ہے اور خراب کام میں عدمِ تعاون بھی واجب ہے، تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. (المائدۃ:۲)

سوال ہے کہ اچھے امیدوار کا معیار کیا ہے؟ — اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام امیدواری ہی کا قائل نہیں، اس سے زیادہ قبیح اور شنیع بات نہیں ہوسکتی کہ انسان خود عہدہ کا طلب گار ہو، اور لوگوں سے خواہش کرے کہ وہ اسے منتخب کریں، یہ تو درحقیقت بے شرمی کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے اسے سخت ناپسند فرمایا ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: اے عبدالرحمٰن! امارت کے طلب گار نہ ہو، اس لئے کہ اگر تم مانگ کر عہدہ حاصل کروگے، تو تم اسی کے حوالہ کردیئے جاؤ گے، یعنی اللہ کی مدد شریکِ حال نہ رہے گی، اور اگر بغیر مانگے ذمہ داری سپرد کی جائے تو من جانب اللہ تمہاری مدد ہوگی، (مسلم، باب النہی عن طلب الامارۃ الخ) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور میرے دو چچا زاد بھائی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ذمہ داریاں عطا فرمائی ہیں، ان میں سے بعض پر ہمیں مامور فرمادیجئے دوسرے نے بھی یہی بات کہی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم! میں ذمہ داری کسی ایسے شخص کے حوالہ نہیں کرسکتا، جو اس کا طلب گار یا اس کا حریص ہو،'' چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اپنے رفقاء کے اس مطالبہ پر خفت ہوئی، اور انہوں نے آپ ﷺ سے معذرت کی، کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح کا مطالبہ کرنے آئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان دونوں کو تو یہ عہدہ نہیں دے سکتا،

البتہ تم کو ایک ذمہ داری پر متعین کرتا ہوں، پھر ان کو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ یمن بھیجا (حوالۂ سابق)

اسی طرح کی بات عہدۂ قضاء کے بارے میں بھی منقول ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو عہدۂ قضا کا طلب گار ہو وہ اپنے نفس کے داؤ میں آجائے گا۔ اور جو اس عہدہ کے لینے پر مجبور کیا جائے گا، اس کے لئے ایک فرشتہ نازل ہوگا جو اس کو راہِ راست پر قائم رکھے گا، **من سئل القضاء وکل الی نفسه، ومن جبر علیه ینزل علیه ملك یسدده** (ترمذی)

—— معلوم ہوا کہ خود کسی عہدہ کا طلب گار ہونا نہایت ہی قبیح بات ہے، اس سے انسان اللہ کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے اور جب مطالبہ کے بغیر لوگوں کے اصرار اور خواہش پر انسان کسی عہدہ کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شریکِ حال رہتی ہے، اس لئے اولاً تو کم سے کم مسلمان امیدواروں کا یہ مزاج نہیں ہونا چاہئے کہ عہدہ کی حرص وہوس میں ان کے درمیان اور غیر مسلم لیڈروں کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہے، موجودہ جمہوری نظام کے مفاسد میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں انسان کو خود عہدہ ومنصب کا طلب گار بننا پڑتا ہے۔ اور چونکہ ہمارا قومی نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے، اس لئے نہ صرف سیاسی انتخابات بلکہ مذہبی جماعتوں اور ملی تنظیموں میں بھی عہدہ ومنصب کی طلب کا یہی رویہ عام ہو گیا ہے۔ جو نہایت ہی بد بختانہ بات ہے، تاہم موجودہ سیاسی نظام میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ امیدوار خود الیکشن میں کھڑے ہوں، ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کم سے کم ایسا ہو کہ جب تک عام لوگ الیکشن میں امیدوار بننے کے لئے اصرار نہ کریں اور ان کی طرف سے مطالبہ نہ ہو، امیدوار بننے سے گریز کیا جائے۔

کسی شخص کو ووٹ دینا اس کو اپنا نمائندہ نامزد کرنا ہے، کیسے شخص کو اپنا نمائندہ بنایا جائے اور کس شخص کو کس عہدہ پر مامور کیا جائے؟ اس کے لئے قرآن نے ایک بنیادی بات بتائی ہے کہ جس کو ذمہ داری سپرد کی جائے اس میں دو باتیں ضروری پائی جانی چاہئیں، ایک تو صلاحیت واہلیت دوسرے امانت ودیانت، **انّ خیر من استأجرت القوی**

الامین (القصص:۲۶)

صلاحیت سے مراد یہ ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں پہنچنے کے بعد وہ شخص صحیح موقف کی رہنمائی کر سکے، صحیح موقف سے مراد یہ ہے کہ اس کی رائے قرآن وحدیث اور شریعت اسلامی کے مخالف نہ ہو، دوسرے اس میں مسلمانوں کے ملی مفادات کی رعایت ہو، تیسرے اس کی رائے ملک اور ملک کے تمام شہریوں کے لئے خیر خواہی پر مبنی ہو، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس میں شعور وآگہی ہو وہ ضروری حد تک شریعت کے احکام سے واقف ہو، زمانہ شناس اور عصری تقاضوں سے آگاہ ہو، دوسرے اپنی بات کو مؤثر انداز میں اور قانون ومنطق کی زبان میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جرأتِ اظہار ہو، کیوں کہ دلیل کی زبان میں جو بات کہی جاتی ہے وہ بعض اوقات اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ ایک شخص کی رائے ایک جماعت کی رائے پر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ سنت نبوی بھی ہے کہ کسی بات کے کہنے کے لئے مناسب شخص کا انتخاب کیا جائے، افسوس ناک بات یہ ہے کہ اکثر اوقات ایسے مسلمان منتخب ہو کر مجالسِ قانون ساز میں پہونچتے ہیں، کہ خود ان کے شعورِ آگہی کی سطح بہت پست ہوتی ہے، ان میں مدلل طریقہ پر سوال اٹھانے اور مخالف سوال کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ عوام میں جذباتی تقریر کرنا آسان ہے، لیکن دلیل کی زبان میں اپنی بات کو ثابت کرنا اسی قدر دشوار۔

دوسرا ضروری وصف ''امانت ودیانت'' کا ہے، امانت ایک جامع لفظ ہے، یہ صرف مال ہی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ انسان کا ہر قول وفعل اس کی وسعتوں میں داخل ہے، فکر وسوچ میں بھی امانت مطلوب ہے، فکر کی امانت یہ ہے کہ انسان قومی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ذاتی مفاد کے بجائے قومی اور ملی مفاد کے پس منظر میں سوچے، امانت زبان سے بھی متعلق ہے، زبان کی امانت یہ ہے کہ سچی اور درست بات کہی جائے، جھوٹ، بہتان تراشی اور اپنی پارٹی اور حکومت کی خوشامد وچاپلوسی سے بچا جائے، قول وعمل میں تضاد نہ ہو، زبان اور دل ایک دوسرے کے رفیق ہوں، اور یقیناً امانت ودیانت کا تعلق مال ومتاع سے بھی ہے، ایک زمانہ میں چھوٹے درجہ کے ملازمین کو کرپٹ

اور رشوت خور سمجھا جاتا تھا، لیکن آج لوگوں کو یقین ہے کہ سیاسی قائدین اس میدان میں سب پر سبقت لے گئے ہیں، اگر اسکینڈل اور رشوت خوری بھی فن کہلانے کا مستحق ہے تو ہمارے ملک کے بعض وزرا'' بلکہ وزیر اعظم تک ایسے گذرے ہیں، کہ یقیناً وہ اس بات میں انعام کے مستحق ہیں! جواہر لال نہرو مدتوں وزیر اعظم رہے، لیکن دلّی میں اپنا مکان نہیں بنا سکے، اور چند ہزار روپے بھی ان کے بینک کے کھاتے میں نہیں رہتے تھے، ڈاکٹر راجندر پرشاد دو میقات صدر جمہوریہ رہے لیکن جب پٹنہ واپس ہوئے تو رہنے کو مکان بھی نہیں تھا، اور ''صداقت آشرم'' میں مقیم ہوئے، یہ کوئی قدیم عہد کی نظیریں نہیں، بلکہ ماضی قریب کی مثالیں ہیں، لیکن آج معمولی، ایم، پی، ایم، ایل اے، یہاں تک کہ بلدیہ کا چیرمین اور کانسلر بھی ایسی دادِ عیش دیتا ہے کہ ان کے پُرکھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا، یہ محض کرپشن اور رشوت ستانی کی دین ہے، اور سیاسی قائدین کا اس جرم میں ملوث ہونا ایک ''کھلا راز'' ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب نبی بنائے گئے تو آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے دین کو پیش کرنے سے پہلے اپنی ذات کو پیش فرمایا اور دریافت فرمایا کہ میں چالیس سال تمہارے درمیان رہا، تم نے مجھے سچا پایا یا جھوٹا، اور امانت دار پایا یا خیانت کرنے والا؟ لوگوں کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا کہ ہم نے آپ ﷺ کو سچا اور امانت دار پایا ہے۔ دراصل ہر اُمیدوار کو اس معیار کا ہونا چاہئے کہ وہ اپنے حلقہ میں لوگوں سے دریافت کر سکے کہ تم نے مجھے کیسا پایا ہے؟ اور اپنی ذات کو ان پر پیش کر سکے، وعدے کرنا، مینوفیسٹو جاری کرنا، اور بلند بانگ دعوے کرنا اور اس بات کی ہمت نہ پانا کہ اپنے آپ کو پیش کر سکیں اور اپنے عمل کی میزان لوگوں کے ہاتھ میں دے سکیں، دل کے چور اور کرداری کی خامیوں اور کوتاہیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس دور میں تو یہ شاید ممکن نہ ہو کہ اس معیار پر صد فیصد اترنے والے رہنما مل جائیں، لیکن کم سے کم یہ تو ہو کہ وہ نسبتاً اس معیار سے قریب ہوں، اندھوں کے گاؤں میں کوئی ''کانا'' بھی ہاتھ آجائے، تو شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے آج کے بازارِ ''سیاست

میں اگر نسبتاً ''بہتر لوگ میسر آجائیں تو وہی موجودہ اخلاقی گراوٹوں کے پس منظر میں بہتر امیدوار سمجھے جاسکتے ہیں — یقیناً موجودہ حالات میں اس طرح کی باتیں ایک خواب محسوس ہوتی ہیں، اور اجنبی سی لگتی ہیں، مگر مسلمانوں کا کام یہ نہیں کہ وہ چڑھتے ہوئے سورج کے پرستار بن جائیں، اور حق وصداقت کے داعی بننے کے بجائے اس بھیڑ کے ساتھ ہو جائیں جو باطل اور جھوٹ کا علَم اٹھائے ہوئے ہو!

(۴ر ستمبر ر ۱۹۹۹ء)

الیکشن میں امیدوار ہونے کے لئے قلیل العیال ہونے کی شرط

اس وقت ریاست آندھرا پردیش میں پنچایت الیکشن کی آمد آمد ہے، حکومت نے اس بار الیکشن کے لئے ایک نیا قانون متعارف کرایا ہے، کہ الیکشن میں وہی لوگ حصہ لے سکیں گے جن کے دو سے زیادہ بچے نہ ہوں، گویا الیکشن کو فیملی پلاننگ کے لئے ایک ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ نہایت ہی نا منصفانہ اور نا معقول اصول ہے، اور کسی طرح اس کا جواز نہیں، اولاً تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ کیا الیکشن کے سلسلہ میں یہ اصول ملک کے دستور اور عقلِ عام کے تقاضے کے مطابق ہے؟ دوسرے کیا الیکشن میں اس طرح کی قیود وحدود واقعی فیملی پلاننگ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مؤثر اور مفید ہے؟ تیسرے خود فیملی پلاننگ کا نظریہ کس حد تک عقل اور قانونِ فطرت کے مطابق ہے؟

جہاں تک اس قانون کی معقولیت کی بات ہے تو الیکشن میں کھڑے ہونے کا مقصد قوم کی اجتماعی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر انتظامی صلاحیت اور دیانت ہو، انتظامی صلاحیت کا تعلق انسان کے فہم، سمجھ بوجھ، دماغی صلاحیت اور قوت فکر سے ہے، اور دیانت کا تعلق انسان کے قلب وضمیر، جذبۂ خدمت اور خلوص سے ہے، اسی لئے قرآن مجید نے بہترین ورکر اس شخص کو قرار دیا ہے جو قوی اور امین ہے، ''ان خیر من استاجرت القوی الامین'' (القصص:۲۶) ''قوی'' سے مراد باصلاحیت اور مفوضہ کام کی اہلیت کے مطابق ہونا ہے۔ اور ''امین'' سے اشارہ امانت ودیانت کی طرف ہے، حقیقت یہ ہے کہ قیادت کے لئے اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہوسکتا

، بلکہ اس کے سوا کوئی معیار ہی نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر انتخابی قوانین میں تعلیم کے ایک خاص معیار کی شرط ہوتی یا کردار کی پاکیزگی ملحوظ ہوتی، مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والوں کو اور جاہل اور کندۂ ناتراش قسم کے نیتاؤں کو روکنے کی سعی کی جاتی تو یہ یقیناً ایک معقول اور مناسب بات ہوتی، لیکن اس کو بچوں کی تعداد سے متعلق کردینا ایک ایسا معیار ہے جو عقل اور فطرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، کیا دو اور اس سے کم اولاد والے زیادہ سمجھ دار، دیانت دار، معاملہ فہم اور جذبۂ خدمت کے حامل ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

پھر غور کیجئے کہ دستور وآئین اور جمہوری روایات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ دستور تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو الیکشن میں امیدوار بننے کا یکساں حق عطا کرتا ہے، اس جمہوری تقاضا کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ جو لوگ کھلے ہوئے مجرمانہ ریکارڈ رکھتے ہیں، پولیس کے نامزد مجرم ہیں، اور جنہوں نے رشوت ستانی کی ایک تاریخ بنائی ہے، انہیں بھی الیکشن میں امیدوار بننے سے روکا نہیں جاسکتا، تو آخر یہ کیسا انصاف ہوگا کہ ایک شخص کو محض اس لئے الیکشن میں امیدوار بننے سے روکا جائے کہ اس کے بچے زیادہ ہیں، اور اتفاق سے اولاد کے بارے میں قدرت اس پر زیادہ مہربان ہے؟ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ ملک کا دستور وآئین بھی ایسے قوانین کے حق میں نہیں ہیں۔

الیکشن میں امیدوار بننے والوں کا تناسب بہت ہی معمولی ہوتا ہے، ان کی تعداد عام لوگوں کے مقابلہ ایک فی لاکھ سے زیادہ نہ ہوگی، اگر آبادی میں ایسے چند افراد چند بچوں پر قناعت کرلیں، تو اس سے اس مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملے گی، اس کے برعکس اندیشہ یہ ہے کہ اس سے بہت سے مفاسد جنم لیں گے، ممکن ہے لوگ اپنی اولاد کے سلسلہ میں غلط حلف نامے داخل کریں، اور اس کو بنیاد بنا کر آئندہ مقدمہ بازیاں ہوں، بھائی بھائی کے رشتہ کا انکار کرے، جائز اولاد ناجائز قرار دی جائے، مال وزر کی حرص وطمع میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ اپنے ہی بھائی کے نسب کا انکار کردیا جاتا ہے، اس لئے حکومت جو کچھ چاہتی ہے اس مقصد کے لئے بھی یہ کوئی مفید اقدام نہیں، مزید اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی اس پالیسی کو وسعت دیتے ہوئے دوسرے شعبوں میں

بھی اسی طرح کے قوانین نافذ کرے، تو اگر ملازمتوں اور حکومت کے وسائل سے استفادہ کی صورتوں میں بھی یہ پالیسی اختیار کی گئی، تو یہ نہایت ہی نقصان دہ بات ہوگی، اس سے حق داروں کی حق تلفی ہوگی، اور ملک کی لگام نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اور کسی بھی ملک اور قوم کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

خود فیملی پلاننگ ایک ایسا نظریہ ہے جس کو تجربات اور واقعات نے رد کر دیا ہے، جو لوگ اس نظریے کے بانی اور مؤسس تھے، ان کے قیاس کی رو سے اس وقت دنیا کو دانہ دانہ کا محتاج ہونا چاہئے تھا، اور انسانیت کے بہت بڑے حصہ کو فاقوں پر گذر کرنی چاہئے تھی، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ پوری دنیا میں فی کس آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے، پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک میں بھی معیارِ زندگی بلند ہوا ہے، کھانے پینے، لباس و پوشاک، سواری اور زندگی کے ہر شعبہ میں زیادہ راحت بخش وسائل کا استعمال بڑھا ہے، زمینوں کی پیداوار میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے، اور اگر مغربی ممالک اپنی زراعتی ٹکنالوجی ترقی پذیر ممالک کو فراہم کریں تو زرعی وسائل میں نا قابلِ تصور اضافہ ہوسکتا ہے، جو انسان کی سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے۔ اور ایسا سبز انقلاب رونما ہوسکتا ہے جو کسی شخص کو بھوکے پیٹ نہ سلائے۔ گذشتہ سوڈھیر سو سال میں بعض ایسے قدرتی وسائل بھی انسانوں کی گرفت میں آئے ہیں، جنہوں نے صحراؤں اور ریگستانوں کو باعث رشک کر دیا ہے، کیا قدرت کی اس فیاضی کے باوجود فیملی پلاننگ کا نظریہ کوئی معنویت رکھتا ہے؟ اور اس کو قانونِ فطرت سے ہم آہنگ قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آج دنیا میں ہمارے ملک کو جو اہمیت حاصل ہے، یا حاصل ہوتی جارہی ہے، اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک اپنی سرمایہ کاری کے لئے ہماری طرف کیوں متوجہ ہیں؟ اور ملٹی نیشنل کمپنیاں کیوں ہماری دلداری کرتی ہیں؟ اسی لئے کہ یہ آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے، یہ اشیاء کی کھپت کے لحاظ سے بہت بڑی مارکیٹ ہے، یہ افرادی وسائل کے اعتبار سے بہت خوش قسمت خطہ ہے، پوری دنیا کو یہاں سے ماہرین

ملتے ہیں، اور ہر جگہ یہاں کے محنتی اور ذہین مزدور، ورکرس اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں، اگر شرح پیدائش پر بہت زیادہ کنٹرول ہو جائے اور افرادی وسائل ہمارے پاس کم ہو جائیں تو ہم کس طرح اس اہمیت کو برقرار رکھ سکیں گے؟۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ وہ اس کا رب اور پالنہار بھی ہے، کائنات کے ایک ایک ذرہ پر اس کی نظر ہے، وہ ایک منصوبہ کے ساتھ آبادی کو بڑھاتا اور گھٹاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رزق کے خزانے ہمارے پاس ہیں، اور ہم اس کو ایک متعین مقدار میں عطا کرتے ہیں: ''وَمَا نُنَزِّلُهُ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ'' (الحجر: ۲۱) یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ضرورت کے لحاظ سے غذائی وسائل فراہم کرتے رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں کتنے ہی جانور ایسے ہیں، کہ بہ ظاہر ان کی روٹی روزی کا کوئی سامان نہیں، لیکن یہ اللہ کی رزق رسانی کا کرشمہ ہے، کہ وہ تم جیسے قوتِ عمل اور فہم وشعور کی حامل مخلوق کو بھی رزق دیتا ہے اور ان کو بھی: ''اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَاِیَّاكُمْ'' (العنکبوت: ٦٠) قرآن نے ایک موقع پر یہ بات بڑی وضاحت سے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی چاہت کے مطابق رزق کا سروسامان فراہم فرماتے ہیں، کیوں کہ وہ اپنے بندوں سے ہر آن باخبر ہیں، اور انہیں دیکھ رہے ہیں، ''وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌ بَصِیْرٌ'' (الشوریٰ: ۲۷)

جب انسان اپنی کوتاہ عملی اور اپنی فکر ونظر کی حدودیت کے باوجود ایک نظام کے ساتھ ہر کام انجام دیتا ہے، اور دنیا کی حکومتیں اپنی رعایا کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بجٹ بناتی ہیں تو کیا خدائے علیم وبصیر اور رزاق وقدیر کو اپنے بندوں کی ضرورت اور کائنات میں اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل کا کچھ اندازہ نہ ہوگا؟۔

(۹ر ستمبر ۲۰۰۰ء)

خواتین کے لئے تحفظات ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

اس وقت ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز میں خواتین کے لئے تحفظات کا مسئلہ پورے ملک میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ ذرائع ابلاغ کچھ ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ گویا اس مسئلہ کے حل ہوتے ہی قوم کی تقدیر بدل جائے گی، اور ملک کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، جو سیاسی قائدین اس تجویز کو مناسب نہیں سمجھتے، خواہ یہ مناسب نہ سمجھنا ملک کے فلاح و بہبود کے نقطہ نظر سے ہو یا رائے عامہ کے دباؤ سے، وہ بھی کھلے عام اس تجویز کی مخالفت سے ڈر رہے ہیں اور دبے لفظوں میں شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر یہ تجویز قانون بن جاتی ہے تو مستقبل کی سیاست پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے، پسماندہ اقوام اور اقلیتوں کے لئے یہ ضرب کاری کا درجہ رکھتی ہے، ان طبقات میں خواتین کا تعلیمی تناسب اتنا معمولی ہے کہ بظاہر مناسب خاتون اُمیدواروں کا ملنا دشوار ہے، پھر جو خواتین منتخب ہوں گی، وہ پالیمنٹ میں کما حقہ ان کمزور طبقات کی ترجمان کر سکیں، یہ اس سے زیادہ دشوار ہے۔ یہ بات بھی بعید نہیں کہ سیاست میں حصہ لینے والی خواتین کے خلاف جرائم کا رجحان بڑھ جائے، جیسا کہ پچھلے دنوں مغربی بنگال میں ہوا ہے، کیوں کہ آج کل سیاست میں پڑھے لکھے اور با کردار افراد کی بجائے شر پسند عناصر اور کندۂ ناتراش قسم کے لوگوں کا غلبہ ہے، بڑا لیڈر بننے کے لئے اسی درجہ کا غنڈہ اور مکر وفریب کا ماہر ہونا بھی ضروری ہے، ایسے لوگ احساسِ محرومی کا شکار ہو کر ان خواتین کو اپنا نشانہ بنائیں جو سیاست میں ان کی رقیب بنتی ہوں، تو کچھ عجیب نہیں۔

اگر واقعی سیاست داں عورتوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی مسیحائی کرنے میں سنجیدہ ہیں، تو اس کا صحیح طریقہ الیکشن میں تحفظات نہیں، بلکہ ان کی حقیقی مشکلات کو دور کرنا ہے، اگر ملک بھر سے سوڈیڑھ سو خواتین پالیمنٹ میں پہنچ جائیں، تو یقیناً ان میں نوے فیصد

وہ خواتین ہوں گی جو متمول اور صاحب ثروت خاندانوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ وہ نہ غریب و مفلس عورتوں کے دُکھ درد سے واقف ہیں اور نہ ان کی سماجی مشکلات سے آگاہ، اس لئے کہ عام طور پر ظلم و جور کا شکار وہ خواتین ہوتی ہیں، جو خط غربت سے نیچے ہیں یا زیادہ سے زیادہ متوسط الحال ہیں، نہ ان کے پاس دولت ہے، نہ تعلیم اور نہ خاندانی پس منظر۔

خواتین کی حالات کو بہتر بنانے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی وسائل فراہم کئے جائیں۔ یتیم لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا مفت انتظام کیا جائے، ایسی بچیوں کے لئے ہوسٹل قائم کئے جائیں، بیوہ اور مطلقہ عورتوں کے لئے خصوصی وظائف جاری کئے جائیں، تاکہ وہ عزت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں، مخلوط تعلیم کے بجائے جداگانہ نظامِ تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے، تاکہ لڑکیاں اپنے آپ کو جس نفسانی دباؤ کا شکار پاتی ہیں، وہ اس سے آزاد رہ سکیں۔ عورتوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ شادی میں گھوڑے جوڑے کی رسم ہے، اس کو روکنے کی مؤثر کوشش کی جائے۔ فسادات اور دنگوں میں اکثر عورتوں کی جان جاتی ہے، ایسے واقعات پر خصوصی ایکشن لیا جائے۔ لڑکیوں کی شرح پیدائش کم کرنے کے لئے قبل از وقت اسقاطِ حمل کی تدابیر میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اس کو روکا جائے۔ بہت سے لوگ بہنوں اور بیٹیوں کو میراث سے محروم کر دیتے ہیں، اس کا سدِ باب کیا جائے۔ یہ اور اس طرح کے سماجی مسائل ہیں جو خواتین کی حقیقی مشکلات ہیں، ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مشکلات کو حل کرنا خواتین کی ایک بڑی تعداد کے مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش ہوگی، ورنہ پالیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی کا بڑھ جانا چند عورتوں کے مسائل کا حل تو ہو سکتا ہے، لیکن یہ عمومی طور پر نہ خواتین کے لئے مفید ہے اور نہ ہمارے سماج کے لئے۔

جہاں تک مجالس قانون ساز میں تحفظات کی بابت اسلامی نقطۂ نظر کی بات ہے، تو عہدوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اہلیت اور صلاحیت کو دیکھا جائے اور اسی کو بنیاد بنا کر ذمہ داریاں سپرد کی جائیں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ امانتیں ضائع کی جانے لگیں۔

حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ امانتوں کے ضائع کرنے سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو جس کام کا اہل نہ ہو اس کو وہ کام سپرد کیا جائے ــــ ''**اذا وسد الامر الی غیر اھل**''۔ (بخاری: ۱/۱۴)

یہ نہایت بنیادی اور اہم بات ہے۔ کوئی بھی شعبہ ہو، اس کے کام اور انتظام میں اصل بگاڑ اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کی تقسیم میں صلاحیت اور اہلیت کے بجائے رشتہ داریاں، قرابت مندیاں، حیثیت عرفی، شخصی وسیاسی مفاد کی توقع، کوئی عہدہ نہ دینے کی صورت میں اس سے نقصان اور مضرت کا اندیشہ، ذات برادری، علاقۂ وطن وغیرہ کو معیار بنایا جائے۔ مثلاً ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم کے بعض شعبوں میں ذات پات کی بناء پر ریزرویشن ہے، اس ریزرویشن کے نتیجہ میں بعض حضرات ستر اور اسی فیصد نمبر لا کر بھی داخلہ سے محروم رہتے ہیں اور جن لوگوں کو تحفظات حاصل ہیں، اگر ان میں امیدوار کم ہیں تو پچیس فیصد نمبر لانے کے باوجود داخلہ کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ جب ایسے لوگ ڈاکٹر اور انجینئر بنیں گے اور قوم کو تختۂ مشق بنائیں گے، تو یہ ملک وقوم کے مفاد میں ہوگا یا ان کی تباہی و بربادی کا باعث بنے گا؟ یہ محتاجِ اظہار نہیں۔

ہندوستان کی خواتین میں تعلیمی تناسب بہت کم ہے اور جو کچھ ہے وہ شہروں میں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ سوسائٹی سے زیادہ میل جول نہیں رکھ سکتیں، اس لئے فطری بات ہے کہ سماج کے حالات سے وہ نسبتاً کم واقف ہوتی ہیں، پھر مشترکہ مجمع میں خواتین کے لئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار دشوار ہوتا ہے، ان حالات میں خواتین کو نمائندہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سماجی مشکلات اور بالخصوص دیہات وقریہ جات کے مسائل کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں ہو سکے گی، نیز مخلوط ماحول میں ان کے لئے کام کرنا اخلاقی نقطۂ نظر سے خود ان کے لئے دشواری کا باعث ہوتا ہے، جیسا کہ آفسوں اور دفتروں میں تجربہ ہے۔ اس لئے درحقیقت بنیادی طور پر تحفظات کا تصور ہی غلط تصور ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ عہدہ داروں کے انتخاب میں تعصب کے رویہ کو ختم کیا جائے، تمام قوموں کو مساوی طور پر ترقی کرنے کے موقع فراہم کئے جائیں، نہ یہ کہ کوئی شخص کسی ذمہ داری کا اہل ہو یا نہ ہو،

اس کو وہ ذمہ داری سونپ دی جائے۔ کسی طبقہ کا کمزور ہونا یا اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کے واقعات کا نسبتاً زیادہ پیش آنا، اس بات کا جواز پیدا نہیں کرتا کہ ملک وقوم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اگر ذمہ داریاں سپرد کرنے کے لئے ایسی باتوں کو معیار بنایا جائے، تو پھر بتدریج معذوروں اور اپاہجوں کے لئے بھی کچھ تحفظات دینے ہوں گے اور سن رسیدہ اور معمر لوگوں کا بھی ایک کوٹہ رکھنا ہوگا۔

اس لئے اسلام بنیادی طور پر تحفظات کے فلسفہ ہی کا قائل نہیں ہے۔ جہاں تک خواتین کی بات ہے، تو اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ سماج میں مردوں اور خواتین کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ گھر سے باہر کی سرگرمیاں مردوں کے ذمہ ہے اور عورتوں کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں۔ (الاحزاب :۳۳) اس لئے نفقہ وکفالت اور کسب معاش کی ذمہ داری مردوں کے سر رکھی گئی اور بال بچوں کی پرورش و پرداخت کا حق دار عورتوں کو قرار دیا گیا۔ مردوں کو جہاد کا حکم دیا گیا اور بہترین عورت اس بیوی کو قرار دیا گیا جو شوہر کی عدمِ موجودگی میں اس کے مال اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ مردوں کے لئے جماعت سے نماز واجب قرار دی گئی اور عورتوں کے لئے گھر کی نماز کو ترجیح دی گئی۔ اس لئے اُصولی طور پر اسلام بیرونی زندگی میں عورتوں کے لانے کو صحیح نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو عورتوں کے لئے ظلم اور اس کی صحیح حیثیت اور پوزیشن پر زیادتی تصور کرتا ہے۔

بعض حلقوں سے یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ خواتین کو اس طرح کے سیاسی اور سماجی کاموں سے روکنا ''عدل'' کے خلاف ہے، بعض حضرات خیال کرتے ہیں کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں کو ''برابر'' کا درجہ دیا ہے، یہ محض مولویوں کا ڈھکوسلا ہے کہ وہ خواتین کو آگے بڑھنے دینا نہیں چاہتے، لیکن یہ محض غلط فہمی کی باتیں ہیں۔ اسلام مردوں اور عورتوں میں مساوات کا نہیں ''عدل'' کا قائل ہے، عدل کے معنی برابری کے برتاؤ کے نہیں ہیں، بلکہ عدل سے یہ مراد ہے کہ جو جس صلاحیت کا حامل ہو اسی کے مطابق اس کی ذمہ داری بھی مقرر کی جائے، جیسے مریض مرغن غذاؤں کا متحمل نہیں ہو سکتا اور صحت مند اسے ہضم کر سکتا ہے، مریض کو سادہ غذا دینا مساوات تو نہیں کہلا سکتا، لیکن عدل یہی ہے، کیوں کہ ہر شخص کے لئے

وہی غذا بہتر ہوسکتی ہے جو صحت کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں اور قابلِ برداشت ہو۔ کسی کلینک میں ایک ڈگری یافتہ ڈاکٹر اور ایک ناخواندہ مزدور پہنچیں تو ڈاکٹر کا تقرر بحیثیت طبیب ہوگا اور مزدور کا بحیثیت جاروب کش۔ ظاہر ہے یہ مساوات نہیں ہے، لیکن یہی تقاضۂ عدل ہے اور اسی میں سماج کا مفاد ہے۔

اسلام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان عدل کا قائل ہے نہ کہ مساوات کا، یعنی مردوں اور عورتوں کے درمیان فطری طور پر صلاحیتوں کا فرق پایا جاتا ہے، بعض صلاحیتیں مردوں میں زیادہ ہیں، جیسے جسمانی مشقت، دوڑ دھوپ، شجاعت و بہادری، جرأت و بے باکی، قوتِ فیصلہ، اقدامی صلاحیت اور مدافعت کی طاقت۔ عورتیں جسمانی اعتبار سے کمزور ہوتی ہیں، قوتِ فیصلہ بھی ان میں کم ہوسکتی ہے، اسی لئے طبی اعتبار سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عورتوں کے دماغ کا حجم مردوں سے کم ہوتا ہے، مردوں کا مغزِ دماغ عورتوں کی بہ نسبت سوگرام زیادہ ہوتا ہے، مردوں کے دماغی حجم کا تناسب اس کے جسم سے ایک اور چالیس کا، عورتوں کا ایک اور چوالیس کا ہوتا ہے۔ قلب جو زندگی کا مرکز ہے، عورتوں کا مرد کے مقابلہ ساٹھ گرام چھوٹا ہے، بعض طبی ماہرین کا خیال ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی قویٰ میں کم سے کم ایک تہائی کا فرق ہوتا ہے۔

جہاں بعض اوصاف اور صلاحیتوں میں مردوں کو تفوق حاصل ہے، وہیں بعض پہلوؤں سے عورتوں کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ عورتوں میں حیاء کا غلبہ ہوتا ہے، محبت کا عنصر زیادہ وہوتا ہے، وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں، لطافت و نزاکت سے بھی قدرت نے عورتوں کو زیادہ حصہ دیا ہے، عورتوں میں جذب و کشش زیادہ ہے اور اسی باعث وہ مردوں کے قلب و ذہن پر بھی چھا جانے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہیں۔ صلاحیتوں کے اسی فرق کی وجہ سے اسلام نے اندرونِ خانہ کی ذمہ داریاں عورتوں کو سپرد کی، کہ وہ اپنی اولاد کو، اپنے شوہر کو، بھائی بہنوں اور اہلِ خاندان کو جو تحفۂ محبت دے سکتی ہیں اور گھر میں محبت و سکون کی فضاء کو قائم رکھ سکتی ہیں، وہ مرد نہیں کرسکتا اور بیرونِ خانہ کی جد و جہد اور جانفشانیوں کو جس طرح مرد انجام دے سکتا ہے، عورتیں انجام نہیں دے سکتیں۔

یہ ایک فطری تقسیم ہے اور اس میں خاندانی نظام کا بقا ہے۔ مغربی معاشرہ میں خاندانی نظام کا کوئی وجود باقی نہیں رہا۔ اس بکھراؤ نے ان کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ مرد ہو یا عورت، نہ ان کو گھر کے اندر سکون نصیب ہے اور نہ گھر سے باہر، اسی لئے مغربی سماج میں منشیات عام ہے، جرائم کا رجحان روز افزوں ہے اور لوگ امن وسکون کی دولت کے لئے اسی طرح بے چین ہیں جیسے سخت دھوپ میں خوب پیاسا آدمی ٹھنڈے پانی کے لئے۔

پس، کیا ہم مغرب سے ان کی بے سکونی اور اضطراب و بے چینی کو خرید کرنا چاہتے ہیں؟۔

(۱۷/ جولائی ۱۹۹۸ء)

مردم شماری میں حصہ لینا — ایک اہم دینی فریضہ!

سیرت نبوی ﷺ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد میں اسلام کی تائید وتقویت اور مسلمانوں کے ملی وجود کی حفاظت کے لئے تمام اسباب اختیار کرنے چاہئیں، جو اس زمانہ میں مروج ہوں، اور ان میں شریعت کے خلاف کوئی بات نہ ہو، رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بہ کثرت اس کی مثالیں موجود ہیں، آپ ﷺ نے دعوتِ توحید کے لئے پہلی دفعہ صفا کی پہاڑی کا انتخاب کیا، اور وہاں جا کر اہلِ مکہ کو اکٹھا کر کے اپنی بات کہی، یہ کوئی اتفاقی انتخاب نہ تھا، بلکہ پہلے سے اہلِ مکہ کا طریقہ چلا آرہا تھا، کہ کسی اہم بات کی اطلاع دینے کے لئے اسی مقام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو بلاتے تھے، گویا یہ اس زمانے کا ذریعۂ ابلاغ تھا، اور مکہ شہر کی حد تک اس سے زیادہ وسیع الاثر کوئی اور ذریعۂ ابلاغ موجود نہیں تھا، عرب میں دو ایسے اجتماعات ہوتے تھے، جن میں پورا جزیرۃ العرب امڈ آتا تھا، ایک حج اور دوسرے عکاظ کا تجارتی میلہ۔ ان دونوں اجتماعات میں بہت سی منکرات اور فواحش کا ارتکاب کیا جاتا تھا، حج میں تو بہر حال ایک پہلو عبادت کا بھی تھا، گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل اسوہ میں بہت کچھ آمیزشیں کر دی گئی تھیں، لیکن عکاظ کے میلے کی نوعیت مذہبی نہیں تھی، اس کے باوجود آپ ﷺ "کُل عرب سطح" کے ان دونوں اجتماعات میں جاتے، اور لوگوں پر دعوت اسلام پیش فرماتے، کیونکہ اس وقت اس سے زیادہ موثر، زود رفتار اور وسیع الاثر کوئی اور میڈیا نہیں تھا۔

عربوں کا ایک قدیم قبائلی نظام تھا، جس کے مطابق قبیلہ کے ایک شخص کو پورے قبیلہ کی پناہ حاصل ہوتی تھی، اور اگر قبیلہ کے ایک شخص کے خلاف بھی کوئی زیادتی کی جاتی تو پورا قبیلہ اسے اپنے آپ پر حملہ تصور کرتا تھا، آپ ﷺ بنو ہاشم میں تھے، اور اس وقت اس قبیلے کی قیادت ابو طالب کے ہاتھ میں تھی، جو آپ کے چچا تھے، لیکن اولاد سے بڑھ کر آپ

سے محبت رکھتے تھے ، اس لئے باوجودیکہ بنو ہاشم کی اکثریت ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور ابولہب جیسا بدترین دشمنِ اسلام اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اس کے باوجود ابوطالب کی وجہ سے آپ کو اس خاندان کی ایسی حمایت وحفاظت حاصل رہی کہ شعب ابی طالب جیسے دل گداز اور صبر آزما واقعہ میں بھی بنو ہاشم نے آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور عرب کے اس قبائلی پناہ دہی اور پناہ گیری کے نظام سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا، اسی طرح آپ کے سب سے جاں نثار رفیق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابن الدغنہ کی پناہ حاصل کرنے میں کوئی تکلف نہیں برتا۔

مدینہ جانے کے بعد آپ ﷺ نے مسلمانوں، یہودیوں اور مشرکین کے درمیان بقاء باہم اور مدینہ کے مشترکہ دفاع کا ایسا معاہدہ کرایا جو اسلام کے سیاسی تصورات کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اس معاہدہ کے مطابق مدینہ کے غیر مسلم قبائل کو عقیدہ و مذہب کی آزادی دی گئی، ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام کا سبق دیا گیا، اور بہ وقت ضرورت غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کسی علاقہ کی حفاظت اور دفاع کو قبول کیا گیا، اسی طرح فتحِ مکہ سے پہلے متعدد ایسے مشرک قبائل جو اس وقت تک اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے، سے آپ ﷺ نے ناجنگ معاہدہ کیا، بلکہ مشکل وقتوں میں بہ حیثیت حلیف ایک دوسرے کی مدد کرنے کے معاہدے بھی کئے۔ بہ ظاہر اسلام میں ''موالات'' وغیرہ کے سلسلہ میں جو احکام ہو سکتا ہے کہ بادیٔ النظر میں یہ معاہدات اس کے خلاف محسوس ہوں، لیکن دراصل ان سب میں ایک ہی روح کارفرما ہے، کہ ہر عہد کی ضرورت، تقاضہ اور رسم ورواج کے مطابق اسلام کو سربلند کرنے اور امتِ مسلمہ کو تقویت پہونچانے کی کوشش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ اعداءِ اسلام کے مقابلہ میں قوت بھر تیاری کرو، **''اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ'' (الانفال:۶۰) کیا اس کا مطلب صرف اسلحہ اور جنگی طاقت کا فراہم کرنا ہے؟ غالباً ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کی طاقت اس میں داخل ہے، کبھی علم کی طاقت ہتھیار کی طاقت پر فائق ہوتی ہے، جس کی مثال آج جاپان ہے۔ کبھی سیاسی طاقت**

کے ذریعہ قوموں کی تقدیر کے فیصلے ہوتے ہیں، ہندوستان میں برہمن ازم اسی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ کبھی معاشی طاقت کی بنیاد پر انگلیوں پر گنی جانے والی قوم پوری دنیا کو اپنے چشم و ابرو کا متبع بنا کر رکھتی ہے، جیسا کہ اس وقت صیہونی طاقت کا حال ہے۔ غرض کہ ہر عہد میں اس عہد کی ضرورت کے مطابق اپنی طاقت کو بڑھانا اس طاقت کو مذہب وملت کی سربلندی کے لئے استعمال کرنا اور ظالموں کے تسلط سے بچنے کے لئے اس کو ڈھال اور نیام بنانا امت کا فریضہ اور رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے۔

آج کی دنیا میں معیار کے ساتھ ساتھ تعداد و مقدار کی بھی بڑی اہمیت ہے، اس سے کسی قوم کا سیاسی مقام متعین ہوتا ہے، نظام مملکت کے نقشہ میں اس کی اہمیت محسوس کی جاتی ہے، جو زبان کسی علاقہ میں بولی جاتی ہو، اس زبان کی قدر و قیمت بھی بولنے والوں کی تعداد پر منحصر ہے' اسی پس منظر میں تمام ہی ممالک میں اور خاص کر جمہوری ملکوں میں مردم شماری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۹ رفروری سے چھٹی مردم شماری کا آغاز ہو چکا ہے۔ جو ۲۸ رفروری تک جاری رہے گی، اور یکم مارچ نظر ثانی اور تبدیلی کی مہلت ہوگی۔ اس مردم شماری پر ایک ہزار کروڑ روپے خرچ ہوں گے، اس بار مردم شماری نسبتاً زیادہ تفصیل سے عمل میں آرہی ہے۔ جس میں مذہب، زبان اور معاشی حالات کے علاوہ معذورین اور ان کے حالات بھی مرکز توجہ ہوں گے، اور ان ہی اعداد و شمار کی روشنی میں ملک میں آئندہ سیاسی، تعلیمی اور معاشی منصوبہ بندی ہو سکے گی۔

اردو ہماری مادری زبان ہے، اور عربی زبان کے بعد کوئی زبان نہیں، جس میں علوم اسلامی کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو، بلکہ بعض موضوعات پر اردو میں ایسی کتابیں بھی آچکی ہیں، کہ شاید عربی میں بھی اس جیسی کتاب نہ ہو، فارسی حالانکہ صدیوں سے مسلمانوں کی زبان ہے، اور ایک بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے، لیکن اردو نے صرف ڈیڑھ دوسو بسال میں نہ صرف فارسی کی برابری حاصل کرلی، بلکہ اسلامی فکر وعقیدہ، علم وعمل اور تہذیب وثقافت کی نمائندگی میں غالباً فارسی سے بہت آگے جا چکی ہے، بدقسمتی سے آزادی کے بعد سے مسلسل اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے، اور اس لئے حکومت کو بھی اردو

کی طرف سے دانستہ تغافل کا بہانہ ہاتھ آ رہا ہے، مردم شماری میں اگر ہم اہتمام کے ساتھ مادری زبان کی حیثیت سے اردو کا نام لکھائیں اور اعداد وشمار اسباب کو واضح کردے کہ اردو بولنے، سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، تو اس سے ہمیں اپنی زبان کی حفاظت میں سہولت بہم پہونچے گی، اور ہماری اگلی نسلوں کو اپنے سلف کے اتنے عظیم الشان علمی اور دینی سرمایہ سے محروم نہیں کیا جا سکے گا۔

اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ حالات میں مردم شماری میں حصہ لینا مسلمانوں کا ایک اہم ترین فریضہ ہے، اور یہ اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کی مدافعت کی بے جا کوششوں کی ایک آئینی تدبیر ہے، اگر ہم نے اس موقع پر غفلت کی اور کوتاہی سے کام لیا، تو خاص کر موجودہ حالات میں یہ بہت ہی خسران کی بات ہوگی، اور اپنی طاقت کے ضائع کرنے اور اپنی قیمت آپ گرانے کے مترادف ہوگا۔

یوں مردم شماری کا تصور بہت قدیم ہے، چونکہ اس سے عوام کے مسائل کو سمجھنے اور خاص کر عوام کے مسائل کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے، بائیبل میں ہے کہ ''پہلی اسم نویسی سوریا کے حاکم رکو رنیس کے عہد میں ہوئی، اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے'' (لوما:۲/۲،۳) یہ واقعہ حضرت مسیح کی ولادت سے پہلے کا ہے۔ لیکن غالباً اس کا تعلق سلطنت روما یا یہودا کی آبادی سے ہے، مردم شماری تو اس سے پہلے بھی ہوئی ہوگی، کیوں کہ بائبل کے عہد عتیق میں بھی مختلف موقعوں پر مختلف قوموں کے اعداد وشمار مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ نے بھی مدینہ میں مردم شماری کرائی تھی، اور اس کا ذمہ دار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بنایا تھا، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہی راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے لئے ان تمام لوگوں کے نام لکھو، جنہوں نے اسلام کا اقرار کیا ہے، **اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام من الناس** حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے شمار کیا تو اس وقت یہ تعداد پندرہ سو نکلی۔ (بخاری، حدیث نمبر:۳۰۶۰) بہ ظاہر یہ تعداد صلح حدیبیہ کے کچھ آگے یا پیچھے کی ہوگی، صحابہؓ نے فتح مکہ کے مجاہدین کی تعداد بھی بیان فرمائی ہے، اور بعض روایتوں میں حجۃ الوداع کے موقع سے شرکاء کی تعداد جو ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی، مذکور ہوئی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا

ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اعداد و شمار کے اکٹھا کرنے پر نظر رکھی جاتی تھی، خلافت راشدہ میں خاص کر حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بھی مختلف شہروں کے اعداد و شمار ملتے ہیں، مدینہ میں آباد لوگوں کے لئے تو آپ نے مستقل رجسٹر ہی مرتب کرا رکھا تھا۔ اور اسی رجسٹر کے مطابق حسبِ مراتب اور حسبِ خدمت مالِ غنیمت اور باہر سے آنے والی اعانتیں تقسیم کی جاتی تھیں، بعد کو بھی مسلمانوں کے دور میں مردم شماری کا سلسلہ رہا ہے، اسی لئے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے پس منظر میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس وقت اس بہار آفریں شہر کی آبادی ایک لاکھ سے کچھ اوپر تھی۔

اپنی قوت کا اظہار اسلام کی نگاہ میں کوئی اچھی بات نہیں ہے، کہ اس سے کبر کی بو آتی ہے۔ لیکن بعض دفعہ قومی اور ملی مصالح کے تقاضہ کے تحت یہی ناپسندیدہ بات پسندیدہ اور ناروا بات روا قرار پاتی ہے۔ غور کیجئے کہ جب رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ کے دوسرے سال عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لے گئے اور مشرکین -- جن کی نظر ایمانی اور روحانی قوت کے بجائے صرف جسمانی قوت پر ہوتی تھی -- نے مسلمانوں کے تواضع اور انکسار کو دیکھتے ہوئے ان کے کمزور ہونے کا طعنہ دیا، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو کسی قدر اکڑفوں کے ساتھ طواف کرنے کا حکم فرمایا، جو آج تک ''رمل'' کے نام سے حج کی ایک اہم ترین سنت ہے، فتحِ مکہ کے موقع سے اہلِ مکہ کو مرعوب کرنے اور قائد مشرکین ابوسفیان کو متأثر کرنے کی غرض سے آپ نے ایک خاص ترتیب سے مختلف قبائل کے الگ الگ فوجی دستے مرتب فرمائے، اور ایک تنگ وادی سے جوشِ ایمان سے معمور اور جذبہ جہاد سے بھرپور قافلہ کو گذارا، نیز حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ایسی تدبیر کرائی کہ ابوسفیان کو پھٹی آنکھوں اس لشکرِ جرار اور اس کے ہمت و حوصلہ اور جذبۂ و جوش کو دکھلایا، تاکہ اہلِ مکہ کو مقابلہ کی ہمت نہ ہو، اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فتحِ مکہ کی شب خاص طور پر آپ نے مسلمانوں کی فوج کو دور دور تک بکھر جانے، زیادہ سے زیادہ چولھے سلگانے اور کھانے پکانے کا اشارہ بھی دیا، تاکہ جب رات کی تاریکی میں مشرکین مکہ تاحدِ نگاہ اس لشکر کے چولھوں کو دیکھیں اور عربوں کے

طریقہ کے مطابق چولہوں کی تعداد کے مطابق افراد کا اندازہ کریں تو ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اوران کی ہمتیں شکستہ ہو جائیں، ان تدبیروں کا مقصد کبرا اور اپنی برتری جتانا مقصود نہیں تھا، بلکہ یہ اس وقت کی مصلحت تھی، اور اسے اسلام کی تائید وتقویت اور مسلمانوں کی حفاظت کے ایک مؤثر وسیلہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

پس ہر دور میں اپنی قوت بڑھانے، اپنی طاقت کا اظہار کرنے اور اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کا دفاع کرنے کے الگ الگ ذرائع ہوتے ہیں، اس دور میں ان ہی ذرائع کو اختیار کرنا حکمت پن، فراست ایمان، اور اسوۂ نبوی کا تقاضا ہے۔

(۲۳ر فروری ۲۰۰۱ء)

کلوننگ ـــــ اسلامی نقطۂ نظر

فروری ۱۹۹۷ء سائنس اور ایجاد واکتشاف کی دنیا میں ایک ایسا مہینہ بن کر آیا، جسے شاید کبھی فراموش نہ کیا جاسکے۔ اسی مہینہ میں اسکاٹ لینڈ میں ڈاکٹر ایان ولمٹ نے روزلین انسٹی ٹیوٹ کے تحت ایک ایسی بھیڑ کی پیدائش کا تجربہ کیا جس میں نر جانور سے کوئی مدد نہیں لی گئی، صرف مادہ کے ذریعہ یہ بھیڑ وجود میں آئی اور اس کا نام ''ڈولی'' رکھا گیا۔ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جو ۲۷۸ دفعہ ناکامی سے دوچار ہوکر کامیابی کی منزل تک پہنچا تھا۔ جہاں اس تجربہ نے سائنسی تجربہ کرنے والوں کو شادکام کیا، وہیں اس نے عام لوگوں کو محوِ حیرت کر کے رکھ دیا۔

اس تجرباتی عمل کو ''کلوننگ'' کا نام دیا گیا۔ کلوننگ انگریزی زبان کا لفظ ہے جو یونانی لفظ ''کلون'' (Klon) سے ماخوذ ہے۔ کلون کے اصل معنی ''نئی پھوٹنے والی شاخ'' کے ہیں، کلوننگ (Cloning) کا لفظ اس وقت ہم مثل کی پیدائش یا نقل اُتارنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی لئے عربی میں اس کو ''استنساخ'' کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں ''فوٹو کاپی کرنا'' نباتات میں کلوننگ ایک زمانہ سے مروج ہے اور حیوانات پر ایک عرصہ سے اس کے تجربہ کا سلسلہ جاری ہے۔ ۱۹۵۲ء میں دو امریکی سائنس دانوں رابرٹ برگس اور سرتھامس کنگ نے کلوننگ کے ذریعے مینڈک کی پیدائش کو ممکن بنایا۔ ۱۹۹۳ء میں انسانی کلوننگ کی کوشش کی گئی اور اس میں ایک حد تک پیش رفت بھی ہوئی، لیکن اسے رحم میں نہیں ڈالا گیا، گویا تجربہ کو آخری مرحلہ تک پہنچانے سے اجتناب برتا گیا۔ فروری ۱۹۹۷ء میں ایک اور پیش رفت ہوئی اور ''ریگون یونیورسٹی، امریکہ'' میں کلوننگ کے ذریعہ دو ہم شکل بندروں کی پیدائش عمل میں آئی۔ بندر کا جسمانی نظام انسان کے جسمانی نظام سے بہت قریب تصور کیا جاتا ہے اور اسی مماثلت نے

ڈارون کو اس غلط نظریہ تک پہنچایا تھا کہ انسان پہلے بندر تھا اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے وہ انسان بنا ہے، حالاں کہ یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص لکڑی کی کرسی اور میز کو دیکھ کر یہ قیاس کرنے لگے کہ کرسی اصل میں میز ہی تھی، میز ہی نے ترقی کر کے کرسی کا روپ اختیار کیا ہے۔

لیکن ''ڈاروزم'' سے قطع نظر یہ ضرور ہے کہ بندروں میں کلوننگ کے کامیاب تجربہ نے انسان پر اس تجربہ کے کامیاب اور بار آور ہونے کو امکان سے بہت قریب کر دیا ہے اور اگر مستقبل قریب میں انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی اطلاع ملے تو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ سائنس کی اس نئی پیش رفت سے متعدد اعتقادی اور سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور کئی سوالات ہیں جو غور و فکر کے منتظر اور جواب کے متقاضی ہیں، اور اس وقت ان تمام سوالات پر غور کرنا اور ان کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا غالباً قبل از وقت ہوگا، جب تک کہ اس کے نفع و نقصان کے تمام پہلو سامنے نہ آجائیں۔

اللہ تعالیٰ نے تخلیق کے نظام کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ قرآن مجید نے بار بار اللہ ہی کے خالق ہونے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق اللہ خود ہی فرماتا ہے: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (زمر: ۶۲) ارشاد ہے کہ تخلیق کا تمام تر فیصلہ خدا ہی کے لئے مخصوص ہے: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف: ۵۴) قرآن چیلنج کرتا ہے کہ تمام لوگ مل کر بھی ایک مکھی تک کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (الحج: ۷۳)

قدرت کا نظامِ تخلیق ایک ایسا رازِ سربستہ ہے کہ نہ ماضی میں اس سے پردہ اٹھایا جا سکا ہے اور نہ مستقبل میں اٹھ سکے گا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں کہ مرد و عورت میں تولید کی بھرپور صلاحیت موجود ہے، لیکن پھر بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہیں اور ڈاکٹرس محرومین کے راز کو جاننے اور سمجھنے سے عاجز ہیں، تو کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش خدا کے نظامِ تخلیق میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور کیا اس سے اللہ تعالیٰ ہی کے خالق ہونے کی نفی ہوتی ہے؟ یہ ایک اہم اعتقادی سوال ہے!

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں خود کلوننگ کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ کلوننگ

کے عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا جسم بے شمار خلیوں سے مرکب ہے، جسم میں یہ خلیے مسلسل ٹوٹ کر ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے جاتے ہیں۔ یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ خلیہ کا ہر جزء خود ایک مکمل خلیہ بن جاتا ہے، ہر ایک خلیہ میں ''مرکزہ'' (Nuclus) اور ہر مرکزہ میں چھیالیس ''کروموزوم'' (Chromosome) ہوا کرتے ہیں، لیکن جنسی خلیے یعنی نَر کے مادۂ منویہ اور مادہ کے بیضۃ المنی میں تیئیس تیئیس کروموزوم ہی ہوتے ہیں، یہ بھی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ اس طرح نَر و مادہ سے مل کر چھیالیس کی تعداد مکمل ہوتی ہے تاکہ جب بچے کی تخلیق ہو تو اس میں ماں اور باپ دونوں کی خصوصیات پیدا ہوں اور اسی لئے بچوں میں صورت و شباہت، رنگ و روپ اور مزاج و اخلاق میں ماں اور باپ دونوں ہی کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کلوننگ کا بنیادی فعل یہ ہے کہ مادہ کے بیضہ میں کسی خلیہ سے مرکزہ نکال لیا جاتا ہے اور جسم کے کسی اور حصہ کے خلیے سے مرکزہ نکال کر اس خلیہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ مرد کے جسم سے بھی لیا سکتا ہے اور عورت کے جسم سے بھی۔ جسم کے دوسرے حصوں میں ایک مرکزہ چھیالیس کروموزوم کا حامل ہوتا ہے، اس طرح مرد و عورت سے مل کر کروموزوم کی یہ تعداد مکمل ہو جاتی ہے، اس لئے جنین کے وجود میں آنے کے لئے یہ فعل کافی ہو جاتا ہے، اب اگر کسی مادہ کے بیضہ میں اسی کے جسم سے حاصل کیا ہوا مرکزہ ڈال دیا جائے تو نَر سے اتصال کے بغیر بچہ کی پیدائش عمل میں آسکتی ہے اور چوں کہ اس میں صرف اس مادہ کے کروموزوم ہیں، اس لئے وہ بچہ شکل وصورت کے اعتبار سے اسی عورت کے مشابہ ہوگا، اگر مادہ کے بجائے کسی نَر کا ''کروموزوم'' رکھا گیا ہو، تو چوں کہ بچہ کے جسم کی تشکیل صرف اس نَر کے کروموزوم سے ہوئی ہے، اس لئے بچہ میں پوری مماثلت اسی نَر کی ہوگی، پھر جب بار آوری کا مرحلہ طے ہو جائے تو جنین کی افزائش کے لئے اسے مادہ کے رحم میں ڈالنا ہوگا اور عام تولیدی نظام کے مطابق مادہ بچہ کو جنے گی، چاہے اسی مادہ کے رحم میں ڈالا جائے جس کا بیضہ ہے یا کسی اور مادہ کے رحم میں۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ کلوننگ سے جسمانی مماثلت پیدا ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ فکر و شعور

اور مزاج و اخلاق کے اعتبار سے بھی ان میں مماثلت پائی جائے، کیوں کہ ان اُمور کا تعلق محض مادۂ تخلیق سے نہیں ہوتا، بلکہ تعلیم و تربیت، سماجی اور خاندانی ماحول ان اُمور میں زیادہ مؤثر اور دخیل ہوتے ہیں۔

کلوننگ کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کلوننگ سے پیدائش کے لئے بھی مادہ کا بیضہ ضروری ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ بیضہ کے بارآور ہونے کے بعد اسے مادہ کے رحم میں ڈالا جائے اور عام تخلیق نظام کے مطابق چھیالیس کروموزوم کا وجود بھی ضروری ہے، البتہ اس طریقہ پیدائش میں نر کا واسطہ ضروری نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انسان نے تخلیق کی قدرت حاصل کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تدبیر کی قدرت دی ہے، شوہر و بیوی کا اتصال بھی ایک تدبیر ہے، جو بچہ کی پیدائش کا ذریعہ بنتی ہے۔ اس تدبیر کو نتیجہ خیز بنانے کا نام تخلیق ہے، اس پر کسی انسان کو قدرت نہیں۔ اسی ڈولی کی پیدائش کی کوشش میں ۲۷۸ تجربات ناکام ہوئے اور سائنس داں اس بات کو بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ تجربات کیوں ناکام ہوئے اور اسی طرح کا ایک تجربہ کیوں کامیاب ہو سکا؟ ایک صاحبِ ایمان کے لئے یہ کامیابی اور ناکامی نہ اچنبھے کی بات ہے اور نہ حیرت و تعجب کی۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ ہر تدبیر امرِ الٰہی کے تابع ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نہ ہو، کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کو مرد سے اتصال کے بغیر تنہا عورت سے بچہ کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، حضرت حوا علیہا السلام کے بارے میں کہا ہے کہ تنہا مرد سے ان کی پیدائش عمل میں آئی، اس لئے اگر کلوننگ کے ذریعہ تنہا عورت سے کسی بچہ کی پیدائش کا واقعہ پیش آئے تو یہ قرآن کی تصدیق ہوگی نہ کہ تکذیب، اور یہ اسلام کے تصورِ تخلیق کی موافقت ہوگی، نہ کہ اس کی مخالفت۔

کلوننگ سے متعدد شرعی مسائل بھی متعلق ہیں: کیا کلوننگ کے ذریعہ پیدائش کی صورت میں نسب ثابت ہوگا؟ نسب اس عورت سے متعلق ہوگا جس کا بیضہ لیا گیا ہے یا اس عورت سے جس کے رحم میں جنین کی پرورش ہوئی ہے؟ کیا یہ بات درست ہوگی کہ کسی

اجنبی مرد کے مرکزہ کو عورت کے بیضہ میں رکھا جائے؟ کیا خود شوہر و بیوی کے درمیان ایسا عمل کیا جاسکتا ہے؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ وہ لاولد ہوں، کسی شخص کے کروموزوم سے جس بچہ کی پیدائش ہوگی وہ اس شخص کا بھائی تصور کیا جائے گا یا بیٹا؟ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو انسان پر کلوننگ کے کامیاب تجربہ کی صورت میں اُبھر کر سامنے آئیں گے۔

بادیٔ النظر میں انسان کے معاملہ میں کلوننگ ایک خطرناک اور مضرت رساں تجربہ ہوگا، اس کی وجہ سے اولاد کے لئے نکاح کی احتیاج کم ہوجائے گی اور ظاہر ہے کہ اس طرح نکاح کی شرح بھی کم ہوگی، اس سے جو سماجی مسائل پیدا ہوں گے وہ محتاجِ اظہار نہیں۔ کلوننگ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچے اپنی شناخت اور خاندان سے محروم ہوں گے اور اس طرح خاندانی نظام بکھر کر رہ جائے گا۔ اسلام میں زنا کی حرمت اور نکاح کی اہمیت کا منشاء اس کے سوا کیا ہے کہ نسب کی حفاظت ہو اور خاندان کی تشکیل عمل میں آسکے، اس سے تلبیس اور فریب کا دروازہ کھلے گا، جرائم پیشہ لوگ اپنے ہم شکل بچوں کے وجود میں آنے کی تدبیریں کریں گے تاکہ فریب اور دھوکہ دہی سے کام لے سکیں۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس تدبیر سے پیدا ہونے والے بچے بعض فطری صلاحیتوں سے محروم اور نقائص کے حامل ہوں، کیوں کہ جب کوئی کام فطرت کے عام اُصول سے ہٹ کر کیا جاتا ہے تو ضرور وہ منفی اثر سے دوچار ہوتا ہے، اس لئے قدرت نے تخلیق کا جو عام طریقہ رکھا ہے، اس کو چھوڑ کر غیر فطری راستہ تلاش کرنا بے وقوفی بھی ہے اور انسانیت کے ساتھ ظلم بھی۔

تاہم کلوننگ کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں جن سے طبی فوائد اٹھائے جاسکتے ہیں اور وہ صورت ہے ''جین کلوننگ'' (Gene Cloning) کی۔ کروموزوم دراصل چھوٹے چھوٹے دانوں سے مرکب ہوتا ہے، یہی دانے جین (Gene) کہلاتے ہیں، انسان کی صحت اور بیماری سے ان دانوں کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اب یہ بات ممکن ہوگئی ہے کہ کسی جین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا جین رکھ دیا جائے، لہٰذا اگر کوئی جین کسی

خاص مرض کا باعث ہو اور اسے نکال کر اس کی جگہ دوسرا صحت مند جین رکھ دیا جائے تو اس طرح اس بیماری کا علاج ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ کلوننگ کی یہ صورت جائز ہوگی اور یہ علاج کے قبیل سے ہوگا، اور شاید اس طریقۂ علاج سے ایسے امراض کا علاج بھی ممکن ہو جن کو لا علاج سمجھا جاتا ہے، جیسے کینسر اور ایڈز وغیرہ۔ اور یہ اس حدیث کی تصدیق ہوگی جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی مرض نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج پیدا نہ کیا ہو۔

(۱۱ر ستمبر ۱۹۹۸ء)

لائی ڈیٹکٹر —— اسلامی نقطۂ نظر

جرائم میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے، جرائم کی تحقیق و تفتیش کے لئے بھی نت نئے آلات و وسائل ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ ایسے ہی آلات میں ایک وہ برقی آلہ ہے جسے لائی ڈیٹکٹر (Lie Detector)، یعنی ''جھوٹ کا مخبر'' کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں اس کا استعمال زیادہ ہے اور عرصہ سے جاری ہے، لیکن ہندوستان میں ماضی قریب ہی میں یہ آلہ متعارف ہوا ہے۔ یہ آلہ دراصل انسان کی ان اندرونی کیفیات کا چغل خور ہے جن کو انسان چھپانا چاہتا ہے۔

اس طریقۂ تفتیش کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر مجرم کسی سوال کا خلاف واقعہ جواب دے اور جھوٹ بولے تو اس کی اندرونی کیفیت میں فرق آجاتا ہے۔ دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے، بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے، سانس پھولنے لگتی ہے، پھر اندرونی کیفیت کا اثر جسم کے بیرونی حصے پر بھی پڑتا ہے، اس کا ہاتھ انجانے میں گردن اور چہرے کی طرف اٹھتا ہے۔ گفتگو میں ہچکچاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، کبھی کبھی کاندھے کو اُچکاتا ہے۔ وہ اپنے مخاطب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات اسے پسینہ بھی آجاتا ہے، گویا جسم کا اندرون اور بیرون دونوں ہی اس کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیتا ہے، اگر انسان اپنی بیرونی کیفیت پر کسی طرح قابو بھی کرلے تو اندرونی کیفیت پر قابو پانا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اس میں ایک پہلو تو عبرت و موعظت کا ہے، اور دوسرا پہلو فقہی اور قانونی ہے کہ شرعاً کسی جرم کو ثابت کرنے کے لئے یہ آلہ کس حد تک معتبر ہو سکتا ہے؟ عبرت و موعظت کا پہلو یہ ہے کہ انسان اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی زندگی کس طرح گواہوں کے درمیان گھری ہوئی ہے؟ ایسے گواہ جن کی آنکھیں خلوت و جلوت یہاں

تک کہ اس کے دل و دماغ کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئی ہیں۔ انسان کوئی کام ہزار پردوں میں کرے پھر بھی خدا کی طرف سے ایسے گواہ موجود ہیں جو ان پردوں کو تار تار کر کے واقعہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ دُنیا میں ان گواہوں نے اپنے آپ کو مہر بہ لب کر رکھا ہے، لیکن آخرت میں، پوری جرأت اور بے خوفی کے ساتھ یہ تمام رازہائے دروں کو کھول کر رکھ دیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دائیں اور بائیں کاندھوں پر ان فرشتوں کو بیٹھا رکھا ہے، جو ان کی نیکیوں اور برائیوں کو مسلسل لکھ رہے ہیں اور انسان کی آخری سانس تک لکھتے رہیں گے۔ پھر یہ ریکارڈ محفوظ ہو جائے گا اور قیامت کے دن انسان کے سامنے ان کی نیکیوں اور برائیوں کا میزانیہ پیش کیا جائے گا۔ انسان اپنے نامۂ اعمال کو دیکھتا جائے گا اور اقرار کے سوا چارہ نہیں پائے گا۔ لیکن کچھ لوگ اتنے ڈھیٹ ہوں گے کہ اس وقت بھی جھوٹ بولنے سے نہیں شرمائیں گے اور اپنی بداعمالیوں سے انکار کرنا چاہیں گے۔ تب ان کی زبان بند ہو جائے گی اور قوت گویائی ساتھ چھوڑ دے گی، جسم کا ایک ایک عضو اس کے خلاف گواہی دینے کے لئے بول پڑے گا اور ہر عضو یہ کہانی سنائے گا کہ اس شخص نے اس کو کن کن برائیوں کے لئے استعمال کیا تھا؟ یہاں تک کہ زمین اور جمادات بھی ان کی نیکیوں اور برائیوں کے احوال سنائیں گے اور انسان کے لئے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

ایک زمانہ میں لوگ اس بات پر اعتراض کرتے تھے کہ انسان کی پوری زندگی کا نامۂ اعمال مرتب ہو تو اس کے لئے کتنی ہی جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ قیامت میں اس نحیف و نزار انسان کے ہاتھ میں اس کا نامۂ اعمال تھما دیا جائے، لیکن آج کے کمپیوٹر عہد میں اس قسم کا اعتراض بے معنی ہو کر رہ گیا ہے، جب انسان ایک معمولی دو تین انچ کی ڈسک میں ہزاروں صفحات محفوظ کر سکتا ہے تو خدائے خبیر و علیم کے لئے ایک مختصر سے اعمال نامہ میں پوری انسانی زندگی کو محفوظ کرنا کیا دشوار ہے؟ اسی طرح جب دُنیا میں انسان کی اندرونی اور بیرونی کیفیات اس کے مجرم ہونے کی گواہی دیتی ہیں تو آخرت

میں انسان کے اعضاء کا گواہ بننا کوئی ایسی بات نہیں جو ایک حقیقت پسند انسان کے لئے حیرت کا باعث ہو ــــ اگر انسان غور و تدبر سے کام لے تو جتنی نئی سائنسی تحقیقات سامنے آرہی ہیں وہ اسلام کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے ذریعہ اسلام کے تصور آخرت کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جھوٹ کے اس آلہ کی رپورٹ کے مطابق جھوٹ کی وجہ سے سب سے زیادہ انسان کا قلب متاثر ہوتا ہے اور قلبی کیفیات میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کے قلب پر اس کے گناہوں کا اثر پڑتا ہے۔ جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو قلب پر ایک سیاہ دھبہ پڑتا ہے، اگر آدمی توبہ کرلے تو یہ دھبہ دُھل جاتا ہے ورنہ باقی رہتا ہے، پھر جب دوبارہ وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو دوسرا دھبہ پڑجاتا ہے، یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور انسان اتنا بے توفیق ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے گناہ پر ذرا بھی ندامت اور پشیمانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے گناہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ہر وہ بات گناہ ہے جس سے دل میں کھٹک پیدا ہو۔ **الاثم ما حاك فی نفسك** (ترمذی: باب الزھد) پس ارتکابِ جرم کی وجہ سے قلب کی کیفیات میں ظاہری تغیر معنوی تغیر کی دلیل اور تصدیق ہے۔

جھوٹ اسلام کی نظر میں غیر معمولی اور بدترین گناہ ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن سے سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ (احیاء علوم الدین: ۳/ ۱۳۵) مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنا کسی بھی درجے میں مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں۔ آپ ﷺ جو دُعائیں فرمایا کرتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خداوندا! میرے قلب کو نفاق سے محفوظ رکھئے، بے عفتی سے حفاظت فرمایئے اور میری زبان کو جھوٹ سے بچایئے!! (احیاء علوم الدین: ۳/۱۳۵) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ہنسی مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کو روا نہیں رکھا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو دوسروں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولے۔ (ابوداؤد: ۲/۶۸۱) بلکہ آپ ﷺ

نے اس کو بھی منع فرمایا کہ آدمی بلاتحقیق ہر سنی ہوئی بات کو نقل کرتا جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹے ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جو کچھ سنے اسے نقل کر دے۔ (ابوداؤد: ۶۸۱/۲)

غرض جھوٹ ایک سنگین جرم ہے اور جیسے روحانی اعتبار سے انسان پر گناہ کا اثر پڑتا ہے اسی طرح انسان جسمانی اور ذہنی طور پر بھی اس گناہ سے متاثر ہوتا ہے —— بدقسمتی سے یہ گناہ اس وقت سماج میں اتنا عام ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی شخص ملے گا جس کا دامن اس سے پاک ہو۔ آپ ﷺ نے بدترین جھوٹ، جھوٹی گواہی کو قرار دیا اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ چاول اور گیہوں کی طرح سماج میں جھوٹے گواہ بھی مل جاتے ہیں اور وہ بھی بہت ہی سستے داموں پر، قانون داں باضابطہ گواہوں کو جھوٹ بولنے کے لئے تیار کرتے ہیں اور اس کی تربیت دیتے ہیں۔ صحافت جس کا کام واقعات کو کسی کمی بیشی کے بغیر عام لوگوں تک پہنچانا ہے اور جسے بہر حال ناطرفدار اور حقائق کا ترجمان ہونا چاہئے، وہ بھی غیر واقعی خبریں شائع کرنے بلکہ خبریں وضع کرنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتی۔ اربابِ سیاست کا تو کہنا ہی کیا ہے؟ جھوٹ بولنا ان کے نزدیک عیب نہیں بلکہ ہنر ہے اور ہتھیلیوں میں جنت دکھانا سیاست کا اوج کمال، جھوٹے وعدوں اور جھوٹے دعوؤں کا اگر کوئی مقابلہ ہو تو شاید ہی کوئی طبقہ اہلِ سیاست پر بازی لے جا سکے۔

یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ آخرت میں جوابدہی کا احساس اور عنداللہ حساب و کتاب کا یقین کمزور پڑ گیا ہے اور انسان نے اس دنیا سے آگے دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ خدا کے خوف اور جواب دہی کے احساس سے عاری ہوں، کوئی چیز ان کو جرم سے روک نہیں سکتی اور جو لوگ اپنی جواب دہی کا احساس رکھتے ہوں، معمولی تنبیہ بھی ان کے لئے تازیانۂ عبرت بن سکتی ہے۔

جہاں تک اس آلہ کی وجہ سے کسی کو جھوٹا قرار دینے کی بات ہے تو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے اصل میں کسی جرم کے ثابت ہونے کے چار ذرائع ہیں: اوّل یہ کہ ملزم

اقرار کرلے۔ اگر وہ اقرار نہ کرے تو مدعی اس کے خلاف گواہان پیش کرے۔ پھر مختلف معاملات میں گواہان کا نصاب الگ الگ ہے۔ زنا کے ثبوت کے لئے چار مرد گواہان مطلوب ہیں، قصاص اور حدود یعنی وہ جرائم کہ جن کی سزا شریعت کی جانب سے متعین ہے، کے مقدمات میں کم سے کم دو مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ دوسرے مالی اور غیر مالی معاملات میں دو مرد یا ایک مرد اور دو عوتوں کی گواہی کافی ہے ـــــ اگر گواہان موجود نہ ہوں تو ملزم سے قسم کھلائی جائے گی اور قسم کھا کر وہ بری ہو جائے گا۔ فیصلہ کی چوتھی بنیاد قسم سے انکار ہے یعنی اگر ملزم قسم کھانے سے انکار کرتا ہے تو یہ اس کی طرف سے جرم کا اقرار متصور ہوگا۔ اسی طرح اگر ملزم موقع دیئے جانے کے باوجود رفعِ الزام سے گریز کرتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے جرم کا اقرار تصور کیا جائے گا۔

کسی دعویٰ کو ثابت کرنے کے یہ بنیادی ذرائع ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ متعدد اور طریقے ہیں جن سے دعوے ثابت کئے جاتے ہیں۔ ان میں ایک ''قرائنِ قاطعہ'' ہیں، یعنی کسی بات کو ثابت کرنے والی ٹھوس علامتیں۔ جیسے کوئی شخص کسی مکان سے نکلے، اس کے ہاتھ میں خون سے لت پت چھری ہو، چہرہ سے خوف نمایاں ہو اور رفتار تیز ہو، پھر اسی وقت لوگ گھر میں داخل ہوں تو ایسی لاش دیکھیں جو تازہ خون سے لت پت ہو اور گھر میں کوئی اور شخص نہ ہو، تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ یہی شخص اس کا قاتل ہے۔ (البحر الرائق: ۷؍۲۰۵) ـــــ لائی ڈیٹکٹر کے ذریعہ کسی شخص کے جھوٹ کی تحقیق بھی دراصل قرائن ہی کی قبیل سے ہے اور کوئی ماہر نفسیات ہی ایسے شخص کی کیفیت کو دیکھ کر اندازہ کرسکتا ہے کہ اس آلہ کی رپوٹ کس درجہ اس کے سچ اور جھوٹ کو ظاہر کرتی ہے؟۔

تاہم میرا خیال ہے کہ محض اس آلہ کی رپورٹ پر سنگین جرائم میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ یہ آلہ اصل میں سچ اور جھوٹ کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ اندرونی کیفیات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔ جھوٹے آدمی پر ایک طرح کا خوف طاری ہوتا ہے، یہی خوف ہے جس کی وجہ سے کیفیات میں تغیر رونما ہوتا ہے۔ اگر ملزم کسی اور وجہ سے دہشت زدہ ہو اور نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو، تب بھی اس میں یہ کیفیات پیدا ہوسکتی ہیں، کیوں کہ بے خوفی

کی وجہ سے ان کی کیفیات میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، گویا یہ نفسیاتی کیفیت خوف و وحشت کا مظہر ہے، نہ کہ جھوٹ کا یقینی ثبوت۔ اس لئے اس آلہ سے جرم کی تحقیق میں مدد تو لی جاسکتی ہے لیکن محض اس آلہ کی رپورٹ جرم کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں۔ واللہ اعلم۔

(۲۵؍ستمبر ۱۹۹۸ء)

محافظینِ قانون کے لئے لاقانونیت کا جواز

حکومت اور مملکت کی تشکیل کی تاریخ قریب قریب اتنی ہی قدیم ہے، جتنی قدیم انسانی بستیوں کے بسنے اور آباد ہونے کی ہے، کیوں کہ انسانی سماج کے لئے یہ ایک فطری ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی شکل میں پیدا فرمایا ہے جو ایک دوسرے کی حد درجہ محتاج ہے، یوں تو ہر جاندار کو ایک دوسرے کی احتیاج ہے، لیکن بہ مقابلہ انسان کے وہ ایک دوسرے کے کم محتاج ہیں، گائے اور بکری کے بچے چند دنوں میں خود مکتفی ہو جاتے ہیں، نہ ان کو اپنے چارہ کے لئے خود زراعت کرنی ہوتی ہے کہ مزدوروں کے محتاج ہوں، نہ ان کو کسی تاجر سے خوراک و پوشاک خریدنی ہے، اور نہ کسی باورچی سے پکوان کرانا ہے، لیکن انسان اپنی ایک ایک ضرورت کے لئے اپنے ہی جیسے کتنے ہی انسانوں کا محتاج ہے، اسے سامان خریدنے کے لئے تاجر کی، اناج کے لئے کاشتکار کی، پکوان کے لئے باورچی کی، سلائی کے لئے درزی کی، اور سواری کے لئے ڈرائیور کی ضرورت ہے اور نجانے زندگی کے مختلف مسائل میں وہ کتنے ہی لوگوں کا محتاج ہے، اپنے ہم جنسوں پر ظلم و زیادتی کا غصہ بھی انسانوں میں بہ مقابلہ بہت سی مخلوقات کے زیادہ ہے۔ حکومت سماج کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے مربوط کرتی ہے، تاکہ ان کی ضرریات پوری ہوسکیں، اور سماج میں عدل و انصاف قائم رہ سکے، قیام حکومت کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں، اگر حکومت کسی طبقہ کے ظلم کو جواز عطا کردے، تو اس سے زیادہ کوئی امر باعث افسوس نہیں ہوگا۔

اس وقت ہندوستان میں پولیس اور سیکوریٹی عملہ کی ظلم و زیادتی ضرب المثل بنی ہوئی ہے، ان حضرات کی طرف سے عوام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، عام طور پر ان کے

سلسلہ میں گواہان کا ملنا دشوار ہوتا ہے، کیوں کہ گواہی دینے والوں کو بھی اپنی خیر منانی پڑتی ہے، بعض واقعات میں لوگ بہ تقاضۂ حیا بھی سکوت اختیار کر لیتے ہیں، چند ہی مقدمات عدالتوں اور انصاف کے اداروں تک پہنچ پاتے ہیں، پھر مجرم کو شبہہ کا فائدہ پہنچنے کی وجہ سے اِکا دُکا کیس ثابت ہو پاتا ہے، اس پر جو سزائیں دی جاتی ہیں، ان کی نوعیت بھی اکثر بہت معمولی ہوتی ہے، مظلوم تو بے چارہ جان سے بھی گیا، لیکن ظالم زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں کے لئے معطل کر دیا گیا، یا چند مہینوں کی قید ہوگی۔

ہماری حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ سرکاری عملہ سے ان کے مظالم کے بارے میں پوچھ تاچھ بھی ہو، اور ان کی انسانیت سوز مظالم پر معمولی گوشمالی بھی کی جائے، چنانچہ حکومت بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کر رہی ہے کہ سیکوریٹی فورس سے متعلق انسانی حقوق کی پامالی کی بابت مقدمات میں انہیں چھوٹ دی جائے، اور ان کے جرم سے درگذر کیا جائے، یہ گویا مجرموں کی پیٹھ تھپکنا ہے، کہ تم نے جو کچھ کیا، خوب کیا ہے، یہ بالکل نا قابلِ فہم بات ہے، سیکوریٹی فورس امن فراہم کرنے، مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے ہاتھ تھامنے اور معاشرہ میں عدل وانصاف کو نافذ کرنے کے لئے ہے، اس اعتبار سے اگر سیکوریٹی فورس کے لوگ ایسے جرائم کے مرتکب ہوں تو وہ نسبتاً زیادہ سزا کے مستحق ہیں، کیوں کہ وہ نہ صرف ایک جرم کے مرتکب ہیں، بلکہ وہ جس کام کی روٹی کھا رہے ہیں، انہوں نے عین اس کے برعکس حرکت کا ارتکاب کیا ہے، چوکیدار اس لئے ہے کہ وہ چور کو روکے، لیکن اگر چوکیدار خود چور بن جائے، تو پھر کون ہوگا جو چور کا ہاتھ تھام سکے؟

اسلامی تعلیمات اس بارے میں بالکل واضح ہیں کہ مجرم بہر حال مجرم ہے، اور کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، یہاں تک کہ سربراہ مملکت بھی اسی قانون کا پابند ہے، جو دوسروں سے متعلق ہے، اس کے لئے بھی کوئی چھوٹ اور استثناء نہیں، اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عرب کے ایک معزز قبیلہ کی ایک خاتون نے چوری کا ارتکاب کیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، لوگوں کو یہ بات بہت گراں گذری، انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس مقدمہ کے سلسلہ میں سفارش

کریں، لیکن سفارش کون کرے؟ چنانچہ آپ کے محبوب حضرت زید بن حارثہ کے محبوب بیٹے حضرت اسامہ بن زید کو سفارش کے لئے وسیلہ بنایا گیا، جب حضرت اسامہؓ نے آپ ﷺ سے سفارش کی، تو آپ بہت برہم ہوئے، اور فرمایا کہ اگر ان کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتیں تو ان کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔

خلفاء راشدین نے بھی تمام لوگوں کے لئے انصاف کی ایک ہی ترازو رکھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا تھا، ایک مقدمہ میں ایک صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مدعی علیہ بنایا، قاعدہ کے موافق اگر مدعی گواہان پیش نہ کر سکے، تو مدعی علیہ سے قسم لی جاتی ہے، چنانچہ اس اعتبار سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذمہ قسم کھانا تھا، لیکن حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقام کی رعایت کرتے ہوئے دوسرے فریق سے خواہش کی کہ امیر المومنین کو قسم سے سبک بار کر دیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی یہ بات پسند نہیں آئی، کہ وہ عدل کے معاملہ میں ان کے ساتھ رعایت کا برتاؤ کریں، اور مقدمہ کے دو فریق کے درمیان یکسانیت میں فرق آنے دیں، چنانچہ آپ نے اس پر اپنی ناگواری اور ناخوشی کا اظہار فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے ایک مشہور قاضی قاضی شریح ہیں، جنہیں طویل عرصہ اور کئی خلفاء کے عہدِ خلافت میں کارِ قضاء انجام دینے کا موقع ملا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خود ان کے عہد خلافت میں ایک یہودی نے قاضی شریح کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے دو گواہان پیش کئے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، جو آپ کے صاحبزادہ ہیں، اور جن کی توثیق و تحسین خود دربار نبوت سے ہو چکی تھی، اور قنبرہ جو آپ رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، قاضی شریح نے بے تکلف دونوں شہادتیں یہ کہہ کر رد کر دیں، کہ بیٹے کی شہادت باپ کے، اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں، اور اس طرح فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گیا، وہ یہودی اسلامی عدالت کے اس بے باک انصاف سے اس درجہ متأثر ہوا کہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ہمیں نہ صرف عہدِ صحابہ میں بلکہ بعد کے ادوار میں بھی ملتی ہیں، عہدِ اموی میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے یہاں، عباسی

دورِ حکومت میں اور خود ہندوستان کے مغلیہ عہد میں آپ کو اس کی کتنی ہی مثالیں مل جائیں گی، یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر ہے، بلکہ یہ بنیادی انسانی مسئلہ ہے، انصاف کا پیمانہ تو اپنوں ہی کے لئے نہیں، بیگانوں کے لئے بھی ایک ہی ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی گروہ تمہاری نگاہ میں بڑا ہو، تب بھی تمہیں انصاف اور عدل کے معاملہ میں کوئی دوئی نہیں برتنی چاہئے (المائدۃ:۸) اور ایک ہی سلوک روا رکھنا چاہئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود اپنے بیٹے پر حد جاری فرمائی، اور بعض روایتوں کے مطابق اسی میں ان کی وفات ہوگئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت فیروز نامی ایک مجوسی کے ہاتھوں پیش آئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس جوش میں دو غیر مسلموں ہرمزان اور جفینہ کو قتل کر دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اس سلسلہ میں مشورہ کیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قصاص کے بہ طور عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا جانا چاہئے، اس وقت کسی طور وہ بچ گئے، تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان سے قصاص لینا چاہا، لیکن وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چلے گئے، اور جنگ صفین میں مارے گئے۔

یہ بات کہ کسی خاص طبقہ کو ان کی زیادتیوں سے بری کر دیا جائے، دوسرے لفظوں میں ان کو جرم کی چھوٹ دے دینا ہے، بالخصوص جو لوگ قیام امن کے ذمہ دار ہوں، اگر انہیں کو بدامنی اور قانون شکنی کی چھوٹ دے دی جائے، تو کسی اور سے کیوں کر توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ عدل وانصاف پر قائم رہ سکیں گے۔

عدل کے لئے یہ بات کافی نہیں کہ انسان عام معاملات میں عدل کو قائم رکھے بلکہ انسان کی صلاحیت کا اصل امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اشتعال کے مواقع پر بھی عدل کی روش سے منحرف نہ ہو، جب فریق مخالف کا رویہ آپ کی انا کو ٹھیس پہونچائے، اور جذبات کو برانگیختہ کردے، اس وقت بھی آپ اپنے آپ پر قابو رکھیں، غصہ کو پینا اور بے قابو کر دینے والے افعال ومحرکات کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھنا انسان کا بہت بڑا اخلاقی جوہر ہے، اسی کو قرآن نے ''صبر'' اور ''کظم غیظ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (آل عمران:۱۳۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے، بلکہ اصل بہادر وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے، ہمارے جوانوں کو اس بہادری کا سبق دیا جانا چاہئے۔

کیا بہتر ہوتا کہ حکومت لاقانونیت کو قانونی جواز دینے کے بجائے ہمارے فوجیوں اور پولیس جوانوں کے لئے اخلاقی تربیت کے کیمپ منعقد کرتی، اس میں مذہبی اور اصلاحی شخصیتوں کی خدمات سے بھی استفادہ کرتی، انہیں تشدد کے بغیر جرائم کے سد باب کی تدابیر سے روشناس کراتی، اور ان کو اپنے عمل اور ردعمل کے بارے میں زیادہ جواب دہ بناتی، اس وقت ہمارے ملک میں صورت حال یہ ہے کہ پولیس اور فورسیز نہایت ہی ''خوفناک طبقہ'' سے عبارت ہے، جن کے نام سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں، ظاہر ہے کہ اسے کسی بھی طرح بہتر نہیں کہا جاسکتا، یہ نہایت بدبختی کی بات ہوگی کہ جو لوگ اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جانیں لڑا دیتے ہیں، اپنا خون اور لہو نثار کر کے مادر وطن کی حفاظت کرتے ہیں، نہایت ہی مشکل ترین حالات میں قوم کی مدد کے لئے آگے آتے ہیں، ان کی شبیہہ کسی قدر اخلاقی تربیت کے فقدان کی وجہ سے قوم کی نگاہ میں اتنی خراب اور قابل نفرت ہو جائے، اور ہم اس صورت حال کی اصلاح کے بجائے ایسے قوانین بنائیں جس سے اس بگاڑ میں مزید اضافہ ہو، نہ کہ کمی۔

اس لئے کوئی بھی ایسا قانون جو امن کے نام ہر ظلم کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہو، جو قانون کے نام پر لاقانونیت کے لئے گرین سگنل ہو، اور جو انسانی قدروں کی پامالی اور جواب دہی سے بلا سبک باری، مجرموں کے بجائے معصوم شہریوں پر دست درازی اور خود مجرموں کے خلاف جرم کی مقدار سے بڑھ کر ردِعمل کا جواز فراہم کرتا ہو، اور کسی انسانی گروہ کو اپنے رویہ کے بارے میں غیر ذمہ دار ہونے کا موقع فراہم کرتا ہو، انسانیت کے ساتھ بدترین ظلم اور جنگل راج قائم کرنا ہے، اور ملک کے تمام محب وطن شہریوں کا فریضہ ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حکومت کے ایسے عزائم کو روکنے کی کوشش کریں۔

(۱۴؍ستمبر ۲۰۰۱ء)

میچ فکسنگ ـــــ مرض اور علاج

جب کسی سماج میں برائی در آتی ہے تو وہ کسی ایک شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہتی، بلکہ ہر جگہ آہنی پنجہ گاڑ دیتی ہے، اس وقت ہمارے ملک میں کرپشن کا کچھ ایسا ہی حال ہے، پہلے نچی سطح کے ملازمین تھوڑی بہت رشوت لیا کرتے تھے، پھر پولیس والوں نے اس میں قدم رکھا، اور اس فن میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ جیسے گالی، گلوج اور بدزبانی سے پولیس پہچانی جاتی تھی، اب کرپشن بھی اس طبقہ کے لئے ''وجہ شناخت'' ٹھہری، پھر اعلیٰ عہدیداروں میں اس مرض نے سرایت کیا، یہاں تک کہ وزراء اور مقننہ نے سوچا کہ عوامی نمائندہ ہو کر ہم اس ''کارِ خیر'' میں پیچھے کیوں رہیں؟ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وزراء اور چوٹی کے سیاست داں اس میں ملوث ہوئے، اور ایسے ایسے اسکینڈل سامنے آئے کہ ماضی میں کسی وزیر اور مقتدر سیاسی رہنما کے بارے میں ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو محکمہ رشوت ستانی کو روکنے کے لئے ہے بعض اوقات وہ خود اس میں ملوث ہو جاتا ہے، اور اس وقت ایک معزز جج بھی رشوت کے مقدمہ میں ماخوذ ہیں، جب عدل و انصاف اور بُرائی کے سد باب کے ایسے باوقار ادارے اور ملک کے اعلیٰ ترین رہنما اور قائدین اس حمام میں بے لباس ہوں تو اوروں کا پوچھنا ہی کیا ہے؟

اس وقت ایک نیا قضیہ کرکٹ بورڈ کا اٹھا ہے، کھلاڑی تو بہر حال کھلاڑی ہی ہیں، جن کی پوری زندگی تماشا بینوں کے لئے وقف ہے، جیسے ہی میچ فکسنگ کا ایک واقعہ سامنے آیا، اور ایک کھلاڑی نے اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے پیسے لے کر قصداً اپنے کھیل کود کو کمزور کرنے کا اعتراف کیا، ایسا لگا کہ گویا ایک طوفان سا آ گیا، اور میچ فکسنگ میں ہندو پاک کے بڑے بڑے نامی گرامی اور ناظرین کے محبوب و پسندیدہ کھلاڑیوں کا نام

آنے لگا، یہاں تک کہ حکومت کو کرکٹ بورڈ کے شائقین کے جذبات کی تسکین کے لئے تحقیقات کی بابت فیصلہ کرنا پڑا، حکومت ہند نے سابق آل راونڈر منوج پربھاکر کو تیقن دیا ہے کہ اگر وہ ۱۹۹۴ء میں ایک میچ میں خراب مظاہرہ کے لئے رشوت پیش کرنے والے ساتھی کھلاڑی کا نام بتادیں تو انہیں مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا، بعض قتل کے مشتبہ واقعات کے بارے میں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اس کا مقصد میچ فکسنگ کی شہادتوں کو مٹانا ہے، اور اتنے کھلاڑیوں کے نام اس ضمن میں آرہے ہیں کہ گورنمنٹ کا ایک بیان یہ بھی آیا ہے کہ جو کھلاڑی اپنی غلطی کا اعتراف کرلے انہیں معاف بھی کیا جاسکتا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ رشوت خوری کس طرح ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں سرایت کرگئی ہے، اور اس کی اصل وجہ ظاہر ہے کہ جوئے بازی ہے، ٹیموں کی جیت ہار پر شائقین کا بازی لگانا اور جوے کھیلنا ایک ایسا مرض ہے جس نے بہت بڑے طبقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے، یہ بہت ہی تکلیف دہ صورتِ حال ہے اور اس طرح لاکھوں کروڑوں روپے جو یقیناً سخت محنت سے حاصل کئے جاتے ہیں، وہ لایعنی اور بے مقصد طریقہ پر خرچ ہوجاتے ہیں، جو یقیناً قوم کے لئے نقصانِ عظیم سے کم نہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کھیل میں مقابلہ کی جو جائز صورتیں ہیں ان میں بھی بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ جوئے سے پاک ہو، قرآن مجید نے جوئے کی سخت مذمت کی ہے، جوے کا ذکر شراب اور مشرکانہ افعال کے ساتھ کیا ہے، پھر اسے نجاست اور ناپاکی ''رِجس'' قرار دیا ہے، نیز آگے اس کو فعلِ شیطانی قرار دیا گیا ہے ''رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ'' (المائدہ:۹۰) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جوا اور قمار اسلام کی نگاہ میں کتنی بدترین چیز ہے؟ قرآن مجید نے ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جوا سماج میں بغض وعداوت کو جنم دینے اور اس کو بڑھانے کا شیطانی ذریعہ ہے (المائدہ:۹۱) قمار کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ دوسرے کا مال حاصل کرنے کا غیر فطری طریقہ ہے، کمائی کے بنیادی طور پر دو ہی فطری ذرائع ہیں، یا تو مال کے بدلے مال ہو، یا انسانی محنت کے بدلہ، جوئے کی صورت میں مال کا حاصل ہونا اور نہ ہونا محض ایک اتفاقی امر ہوتا ہے، نہ مال دے کر مال حاصل کیا جاتا ہے، نہ محنت کر کے

مال حاصل کیا جاتا ہے، اس سے انسان بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کا عادی ہو جاتا ہے، اور تمام مجرمانہ افعال کی بنیاد اصل میں یہی ذہنیت ہے، پھر جس کو نقصان ہوتا ہے اس کو بھی یہ بات گراں گذرتی ہے کہ ایک شخص نے بغیر کسی سعی و محنت کے میرا قیمتی مال ہتھیا لیا، اس سے دلوں میں نفرت وعداوت کی تخم پڑتی ہے، اور بغض وحسد کے جذبات پرورش پاتے ہیں، اور بعض اوقات نہایت ہی ناگفتہ بہ واقعات پیش آجاتے ہیں، جوئے کے لئے کوئی عقلی جواز بھی نہیں، غور فرمایئے کہ فتح وشکست تو ''الف'' اور ''ب'' کے درمیان ہوئی ''ج'' اور ''د'' کا نہ جیتنے میں کوئی دخل ہے اور نہ ہارنے میں، لیکن ہوا یوں کہ ''ج'' نے ''د'' کو محض ایک زبانی شرط کی بنیاد پر کثیر رقم ادا کی، غور کیجئے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی عقلی جواز ہے؟؟

جیت اور ہار میں بھی اسلامی تصور یہ ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف طریقہ پر ہو، کوئی ایسا مصنوعی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جو کھیل کے مقابلہ میں غیر حقیقی نتیجہ کو ظاہر کرے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لا جلب ولا جنب**'' (ابوداؤد، کتاب الزکوۃ باب این تصدق لا اموال) یعنی جلب اور جنب درست نہیں ہے، ''جلب'' سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص گھوڑ دور کے مقابلہ میں شریک ہو، اس کے گھوڑے پر اس طرح چیخا اور آواز لگایا جائے کہ اس میں دوڑ کی خصوصی امنگ پیدا ہو جائے اور ''جنب'' سے مراد یہ ہے کہ جس گھوڑے کو دوڑ کے مقاملہ میں شریک کیا گیا ہے، اس گھوڑے کے ساتھ دوسرا گھوڑا بھی رکھا جائے، یہاں تک کہ جب سواری کا اصل گھوڑا سست گام ہو تو سوار چالاکی کے ساتھ دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جائے۔ (بدل المجہول: ۳ / ۲۶ ط: ہند) گویا ہار جیت میں دھوکہ سے کام لیا جائے یا خارجی طریقہ پر اپنے گھوڑے کی رفتار بڑھائی جائے۔

اس حدیث سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ مقابلہ صاف اور شفاف ہونا چاہئے، خارجی عوامل کے ذریعہ مقابلہ کو متاثر کرنا درست نہیں، پھر کھیل میں اپنی کارکردگی کو متاثر کرنے کے پیچھے مالی حرص وطمع کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اور رشوت لے کر معاملات طے کئے جاتے ہیں، جو بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشوت لینے والے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہو، **لعنة الله على الراشي**

والمرتشي (ابن ماجہ، حدیث نمبر:۲۳۳۴) بعض احادیث میں رشوت کو دوزخ کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے، بلکہ جو شخص رشوت میں واسطہ بنتا ہو اور بچو لیئے کا کردار ادا کرتا ہو اس پر بھی رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی لعنت بھیجی ہے، والرائش الذی یمشی بینھا (مسند احمد: ۲۷۹/۵) اس لئے یہ نہایت ہی غیر اسلامی اور غیر اخلاقی حرکت ہے، اصل یہ ہے کہ جب انسان کے اندر حرص و طمع گھر بنالیتی ہے، تو پھر انسان کی پیاس بجھتی نہیں ہے، اگر اسے ہفت اقلیم بھی ہاتھ آجائے تب بھی اس کی طلب ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتی رہے گی، عام طور پر کھلاڑیوں کی آمدنی بڑے بڑے تاجروں اور اعلیٰ ترین سرکاری ملازمین اور عوامی نمائندوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور جو شہرت انہیں حاصل ہوتی ہے وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے باوجود مال کی ایسی نہ بجھنے والی پیاس ناقابلِ فہم نظر آتی ہے!

اس پس منظر میں یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی استحکام، معاشی بہبود، سائنسی ترقی، عوام کے لئے وسائل سہولت کی فراہمی وغیرہ پر تو دن رات محنت ہو رہی ہے، لیکن سماج میں اخلاقی قدروں کو بلند کرنے اور انسانوں کو انسان بنانے کی کوئی منظم اور منصوبہ بند سعی نہیں ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سنگین جرائم میں ملوث پائے جارہے ہیں، کرپشن نے عدل و انصاف اور قانون کے اعلیٰ ترین اداروں تک رسائی حاصل کرلی ہے، ملک کے انٹرنیشنل کھلاڑی جو آج کے مزاج کے مطابق ملک کا وقار اور اس کے لئے عزت و آبرو کا اثاثہ سمجھے جاتے، ہیں وہ ملک سے باہر جاکر چند پیسوں میں قوم کی عزت اور خود اپنی عزت و آبرو کا سودا کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے، قانون اور مادی وسائل کے ذریعہ ان بیماریوں کا علاج نہیں ہو سکتا، جب تک ہم سماج کی اخلاقی سطح کو بلند کرنے اور ہر طبقہ میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوجائیں، ایسے واقعات کا سدِ باب بھی نہیں ہوسکتا، اور جب تک ضمیر نہ جاگ جائے کوئی دوا ان بیماروں پر کارگر نہیں ہوسکتی!۔

(۵/ مئی ۲۰۰۰ء)

کھیل ـــــ آداب واحکام

انسان کی فطرت میں قدرت نے جو دواعی اور تقاضے رکھے ہیں، ان میں ایک تفریح طبع بھی ہے، چاہے وہ شعروادب اور طنزومزاح کے ذریعہ ہو یا کھیل کود کے ذریعے، اس لئے کھیل کود بھی ایک حد تک انسانی فطرت کا حصہ ہے، اسی لئے بچے جو ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور براہِ راست فطرتِ انسانی کے آغوش میں پلتے ہیں، وہ بھی کھیل کود کی طرف رغبت رکھتے ہیں، پھر خدا کے نظامِ ربوبیت کو دیکھئے کہ لڑکے اپنے بچپن ہی سے ایسے کھیل کا رجحان رکھتے ہیں جو مردانہ مزاج ومذاق کے حامل ہیں، جیسے: دوڑنا، کودنا وغیرہ، لڑکیاں بچپن ہی سے ایسے کھیل کی طرف راغب ہوتی ہیں جو زنانہ مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں، جیسے: بچے کھلانا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا وغیرہ۔

اسلام سے پہلے کھیل کود کے معاملہ میں بھی بڑی بے اعتدالی پائی جاتی تھی، یورپ جو اپنے آپ کو تہذیب وتمدن کا ''ازلی معلم'' سمجھتا ہے، اس کا حال یہ تھا کہ غلاموں کے باہم قاتلانہ مقابلے کرائے جاتے، درندہ جانوروں سے مقابلہ کرایا جاتا، جو آخر ان کی بے دردانہ ہلاکت پر ختم ہوتا، لوگ اس سنگ دلانہ قتل کا تماشہ شوق سے دیکھتے اور تالیاں بجاتے، یہ کھیل ''سیافی'' کہلاتا تھا اور یورپ میں اس کے لئے بڑے بڑے اسٹیڈیم بنے ہوئے تھے، پروفیسر لیکی نے ''تاریخ اخلاقِ یورپ'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

اسلام مذہب فطرت ہے، جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں طبعی تقاضوں کی رعایت کی ہے اور جہاں کہیں بے اعتدالی پیدا ہوئی ہے، وہاں افراط وتفریط کو دور کر کے ایک معتدل اور متوازن طریقہ کی رہنمائی کی ہے۔ اس نے کھیل کود کی بھی بالکل نفی نہیں کی، بلکہ مناسب حدود وقیود کے ساتھ اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔ کھیل کے سلسلے میں

جو بنیادی شرعی اصول ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کھیل میں ان اُمور کی رعایت کی جائے:

(۱) کھیلنے والے ایسا لباس اختیار کریں جو ساتر ہو یعنی مرد ہو تو ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ڈھکا ہوا ہو، خواتین مردوں کے درمیان نہ کھیلیں، خواتین کے لئے خواتین کے سامنے پردہ کی حدود وہی ہیں جو مردوں کے لئے ہیں کہ ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپا ہوا ہو۔ اس کی رعایت کے بغیر کھیلنا حرام ہے، کیوں کہ حصۂ ستر کو چھپانا شرعاً واجب ہے۔

(۲) ایسا کھیل ہو جو مختصر وقت میں پورا کیا جا سکتا ہو، جیسے فٹ بال، والی بال، ایسا طویل کھیل نہ ہو، جو آدمی کو شرعی فرائض اور اپنی متعلقہ ذمہ داریوں سے غافل کر دے، جیسے: شطرنج اور فی زمانہ کرکٹ، تاش! ایسے کھیل مکروہ ہیں۔ لوڈو وغیرہ بھی کراہت سے خالی نہیں۔ فقہاءِ حنفیہؒ کے یہاں شطرنج بغیر جوے کے بھی مکروہ ہے اور بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ یہ ایسا کھیل ہے جس میں جسمانی توانائی صرف نہیں ہوتی اور انسان گھنٹوں کھیل میں لگا رہتا ہے، یہ چیز انسان کو نکما بنا دیتی ہے اور اپنے اصل مقصد سے غافل کر دیتی ہے۔ کرکٹ کے شائقین سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ آج کل یہی کیفیت بلکہ اس سے بڑھ کر کرکٹ دیکھنے والوں کا حال ہے، یہ کھیل شیطان کی آنت کی طرح طویل ہے کہ نتیجہ حاصل ہونے میں کئی کئی دن لگ جاتا ہے اور نہ صرف اسٹیڈیم میں آنے والے بلکہ پوری دنیا میں کرکٹ کے شائقین ٹی وی پر آنکھیں اور ریڈیو پر کان لگائے رہتے ہیں، کہیں بھی کام کر رہے ہوں، ذہن کرکٹ کی طرف لگا رہتا ہے۔ طلبہ کے امتحان کا وقت ہے لیکن کرکٹ کا بخار اس پر غالب ہے، وہ مزدور جس کی حالت یہ ہے کہ ''دن میں کمائے تو رات کو کھائے'' وہ بھی بال بچوں کی فکر سے آزاد کرکٹ دیکھنے اور کامنٹری سننے میں محو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس میں ہزاروں لوگ دو وقت کے کھانے کو ترستے ہوں، ایسے کھیل مناسب نہیں اور شاید اسی لئے ترقی یافتہ ممالک میں یہ کھیل مقبول نہیں۔

(۳) ایسا کھیل نہ ہو جو اپنے یا دوسرے کے لئے ایذاء رسانی کا باعث ہو اور جسم کو شدید نقصان پہنچنے کا کافی امکان ہو، جیسے فری اسٹائل کشتی اور باکسنگ وغیرہ: ایسے کھیل بھی

جائز نہیں ہیں۔

(۴) مردوں کے لئے زنانہ کھیل اور عورتوں کے لئے مردانہ کھیل جیسے کشتی کبڈی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

(۵) کھیل خواہ کوئی بھی ہو اگر اس میں جوا ہو تو جائز نہیں، کیوں کہ جوا حرام ہے۔ جوے سے مراد یہ ہے کہ دونوں کھلاڑی آپس میں یہ شرط باندھیں کہ جو ہارے گا وہ جیتنے والے کو اس شرط کے مطابق مال ادا کرے گا یا دوسرے لوگ کھلاڑی بہ آپس میں شرط کر لیں کہ اگر فلاں کھلاڑی جیتا تو الف، ب کو اور اس کا مخالف جیتا تو ب، الف کو اتنی رقم ادا کرے گا، یہ صورت قطعاً ناجائز اور سخت گناہ ہے۔ اگر چند کھیلنے والے ہوں اور دو طرفہ شرط نہ ہو بلکہ ایک طرفہ شرط ہو، مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر تم جیت گئے تو میں تم کو اتنی رقم دوں گا اور میں جیت گیا تو تم کچھ نہیں دینا، یہ صورت جوے میں داخل نہیں اور جائز ہے، اسی طرح کھیلنے والے آپس میں شرط نہ باندھیں بلکہ ایک تیسرا شخص کہے کہ تم دونوں میں سے جو جیت جائے گا میں اسے اتنی رقم دوں گا، یہ صورت بھی درست ہے، کیوں کہ یہ جوا نہیں، انعام ہے۔

(۶) ایسے کھیل جس سے جسمانی ریاضت ہوتی ہو، جو صحت انسانی کے لئے مفید ہو اور جس سے انسان کے اندر قوتِ مدافعت بہم پہنچتی ہو، مستحب ہے اور اسلام ایسے کھیل کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

یہ کھیل کے سلسلے میں بنیادی شرعی اصول ہیں اور ان کی روشنی میں مختلف قسم کے کھیلوں کے بارے میں حکم شرعی جانا جا سکتا ہے۔

کچھ کھیل جن کا احادیث سے ثبوت ہے، یہاں ان کا ذکر مناسب محسوس ہوتا ہے:

۞ ''دوڑ'' کو آپ ﷺ نے پسند فرمایا، خود آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ فرمائی ہے۔ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ میں پہلے حضور ﷺ سے بڑھ جاتی، جب میرا جسم بھاری ہو گیا تو آپ ﷺ مجھ پر سبقت لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ

اس کا بدلہ ہو گیا، هذه بتلك السبقة حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ مدینہ تک دوڑ کا مقابلہ کرے؟ یہ شخص اتنا تیز دوڑتا تھا کہ لوگ اس پر سبقت حاصل نہیں کر پاتے تھے، میں نے اس سے کہا کہ تم کو کسی کی عزت و شرافت کا بھی خیال نہیں، یعنی تم ہر بڑے چھوٹے کو دعوتِ مقابلہ دے رہے ہو، اس نے کہا کہ سوائے رسول اللہ ﷺ کے میں کسی اور کو دعوتِ مقابلہ دینے سے باز نہیں آ سکتا، حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی اور مقابلہ کیا، تو سبقت حاصل کر لی۔ (نیل الاوطار: ۹۲/۸) اسی لئے فقہاء اسے جائز قرار دیتے ہیں۔

۞ اسلام کشتی کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ رکانہ رضی اللہ عنہ عرب کے مشہور پہلوان تھے، انہوں نے آپ ﷺ کو دعوتِ مقابلہ دیا، آپ ﷺ نے قبول فرمایا، کشتی ہوئی، آپ ﷺ جیت گئے اور یہی شکست حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا باعث بنی۔ (نیل الاوطار: ۹۲/۸)

مگر کشتی سے مراد یہاں صرف وہ کشتی ہے جس میں فریق مخالف کو زمین پر گرا دیا جائے، وہ فری اسٹائل کشتی نہیں جس کا آج کل رواج ہے اور جس میں فریق مخالف پر آزادانہ تکلیف دہ وار کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ شدید جسمانی نقصان پہنچایا جاتا ہے: اخلاقی اور انسانی حدود سے متجاوز ایسی کشتیاں بالکل جائز نہیں اور حرام ہیں۔ موجودہ زمانے میں جوڈو کراٹے بھی کشتی کے حکم میں ہے، کیوں کہ اس کا مقصد بھی جسمانی ورزش اور مدافعانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا ہے، البتہ کراٹے کا ایسا مقابلہ جائز نہیں جس میں دوسرے فریق کو ہر قسم کا نقصان پہچانے کی اجازت ہو۔

۞ تیراکی کو بھی حضور ﷺ نے پسند فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا ہر چیز لہو و لعب ہے سوائے چار چیزوں کے: شوہر اپنی بیوی سے دل لگی کرے، اپنے گھوڑے کی تربیت کی جائے، دو مقرر نشانوں کے درمیان چلنا اور تیراکی کا فن سیکھنا۔ (الجامع الصغیر: ۵/ ۲۳) ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے بچوں کو تیراکی اور تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہلِ شام کو خاص طور پر تیراکی، تیراندازی اور گھوڑسواری سیکھنے کی نصیحت فرمائی تھی اور اس سلسلہ میں ان کو ایک خط لکھا تھا۔ (فیض القدیر: ۳۲۷/۴)

✡ گھوڑ دوڑ بھی جائز ہے آپ ﷺ نے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ گھوڑے کی دوڑ کا مقابلہ کراتے، جو گھوڑے چھریرے اور ہلکے بدن کے ہوتے ان کے لئے دوڑنے کی حد حفیہ سے ثنیۃ الوداع تک ہوتی اور جو بھاری بدن کے ہوتے ان کی ''ثنیۃ الوداع'' سے ''مسجدِ بنوزریق'' تک (بخاری مع الفتح: ۱/۲۱۴) گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانور جیسے اونٹ کی دوڑ کا ذکر بھی جائز ہے، خود حدیث میں اونٹ کی دوڑ کا ذکر موجود ہے، لاسبق الافی نصل او خف او حافر (ابوداؤد) لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس وقت ہے جب کہ اس میں قمار اور جوے کی صورت نہ ہو، آج کل جو گھوڑ دوڑ ہوتی ہے، جس کا اصل مقصد جوا ہی ہوتا ہے، یہ جائز نہیں۔

✡ تیراندازی کی بھی آپ ﷺ نے حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر کام جو تفریح طبع کے طور پر کیا جاتا ہے، ناروا ہے، سوائے تین باتوں کے، ان میں ایک تیراندازی کا ذکر فرمایا (ترمذی) ابھی روایت گذر چکی ہے کہ آپ ﷺ نے بچوں کو تیراندازی سکھانے کی ترغیب دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک روایت منقول ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے بچوں کو تیراندازی سکھانے کا حکم فرمایا، گو یہ روایت ضعیف ہے۔ (الجامع الصغیر: ۴/۲۸۔۳۲۷) موجودہ زمانے میں بندوق وغیرہ کی نشانہ بازی بھی اسی حکم میں ہے۔

(۱۹/فروری/۱۹۹۹ء)

ٹریفک —— شرعی ہدایات

گذشتہ ہفتہ حکومت کے اعلان کے مطابق ہمارے شہر میں ٹریفک سیٹی کا ہفتہ منایا گیا ہے۔ حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً لوگوں میں ٹریفک کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے اس طرح کے ہفتے منائے جاتے ہیں، جو یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔ واقعہ ہے کہ ٹریفک قواعد کی خلاف ورزی، بے اصولی اور نا مناسب حد تک جلد بازی کی وجہ سے حادثات میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جاتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ جس میں اخبار سڑک حادثہ کی اطلاع سے خالی ہو اور کچھ ہلاکتیں اس کی وجہ سے پیش نہ آئی ہوں۔ اسلام نے اس سلسلہ میں بھی ہماری رہنمائی کی ہے اور قرآن وحدیث میں ہمیں اس سلسلہ میں اصولی ہدایات مل سکتی ہیں۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کچھ چیزیں وہ ہیں جن کا شریعت نے حکم دیا ہے اور کچھ باتوں سے شریعت نے منع فرمایا ہے، ان باتوں پر بعینہ عمل کرنا ضروری ہے، ان میں کسی کمی یا اضافہ کی گنجائش نہیں، کچھ چیزیں وہ ہیں کہ نہ ان کا حکم دیا گیا ہے اور نہ ان سے منع کیا گیا ہے، ان سے ایسی مصلحت متعلق ہے کہ نہ صراحتاً شریعت میں اس کے معتبر ہونے کا ذکر ہے اور نہ نا معتبر ہونے کا، ان چیزوں کے بارے میں حکومت کو حق ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی انتظامی قانون بنائے اور حسبِ ضرورت لوگوں پر کسی پہلو کو لازم قرار دیدے۔ اسلام کے اصولِ قانون کی اصطلاح میں ان کو ''مصالح مرسلہ'' کہا جاتا ہے، جیسے: انسان دائیں بھی چل سکتا ہے اور بائیں بھی، شریعت میں کوئی ہدایت نہیں ہے کہ چلنے میں کون سی سمت اختیار کی جائے اور کون سی سمت اختیار نہ کی جائے حکومت حفاظتی نقطۂ نظر سے عوام کو پابند کرسکتی ہے کہ وہ متعینہ سمت سے ہی سفر کرے، اس

میں کوئی قباحت نہیں۔

اس لئے ٹریفک کے جو اصول وقواعد مقرر کیے گئے ہیں، کہیں تیز چلنے کے اور کہیں آہستہ چلنے کے، رکنے کے اور نہ رکنے کے، گاڑی کسی مقام پر ٹھہرانے کے اور کسی مقام پر نہ ٹھہرانے کے، یہ انتظامی نوعیت کے قوانین ہیں، جن کا مقصد ہماری جان اور ہماری سواری کا تحفظ ہے۔ جان و مال کی حفاظت ایک شرعی فریضہ ہے اور حکومت کے ایسے قوانین کی اطاعت کا ہم نے عہد کیا ہے جو احکامِ شریعت سے متصادم نہیں ہیں، اس لئے ان اصول وضوابط کی رعایت ہم پر واجب ہے اور ان کی رعایت نہ کرنا نہ صرف قانونِ ملکی کی مخالفت ہے بلکہ عہد کی خلاف ورزی اور اپنی جان و مال کی حفاظت میں بے احتیاطی کی وجہ سے شرعاً بھی ایک قبیح فعل ہے اور گناہ کا باعث ہے، اس لئے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مفید قوانین کی رعایت کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے۔

قرآن نے انسان کی چال کے بارے میں ہدایت دی ہے کہ اس سے تکبر اور اکڑفوں کا اظہار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"ولا تمش فی الارض مرحاً انك لن تخرق الارض
ولن تبلغ الجبال طولًا۔" (الاسراء:۳۷)

"زمین میں اکڑ کر نہ چلو، کہ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ لمبائی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔"

ایک اور موقع پر اللہ کے نیک بندوں کی چال ڈھال اور گفتار و رفتار کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا" (الفرقان:۶۳)

"رحمٰن کے سچے بندے وہ ہیں جو زمین پر عجز وفروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب نادان لوگ ان سے ہمکلام ہوتے ہیں تو سلامتی کی بات کہہ کر نکل جاتے ہیں۔"

زمین پر اکڑ کر چلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا ایک مطلب تو ظاہر ہے کہ سینے تنے ہوئے ہوں اور گردنیں تکبر سے اکڑی ہوئی ہوں، لیکن اکڑ کر چلنے کی صرف یہی ایک کیفیت نہیں، بلکہ ہر وہ چال جس میں اپنی بڑائی کا اظہار ہو اور دوسروں کی تحقیر محسوس ہو، اس ہدایتِ ربانی کا مصداق ہے۔ آپ گاڑی پر سوار ہیں اور آپ کو یہ گوارا نہیں کہ کسی کی گاڑی آپ سے آگے رہے، آپ بلاوجہ اس کو پیچھے کر کے خود آگے بڑھنے کے درپے ہیں، اس کے لئے نا مناسب طریقے اختیار کرتے ہیں، ہارن بجا بجا کر اسے پریشان کرتے ہیں، تو یہ بھی اکڑ کر چلنے ہی کے حکم میں ہے۔ تواضع کی چال یہ ہے کہ آپ اپنی رفتار معتدل رکھیں، جو آپ سے آگے چل رہا ہے، اسے آگے رہنے دیں، اگر کسی کی سواری آپ سے پیچھے ہے، لیکن اس کی رفتار بہ مقابلہ آپ کی سواری کے تیز ہے اور راستہ میں اس کی گنجائش ہے کہ آپ اسے آگے بڑھنے کا موقع دیدیں، تو آپ اس کو اپنی اَنا کا مسئلہ نہ بنائیں اور اپنے دوسرے بھائی کو آگے بڑھنے دیں۔ یہ تواضع کی چال اور قرآن کی زبان میں ''مشی ہون'' ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنھم جب آپ کے ساتھ سفر میں ہوتے اور آگے کی سمت سے دشمن کا اندیشہ نہ ہوتا تو اہتمام کرتے کہ اپنی سواری کو حضور ﷺ کی سواری سے پیچھے رکھیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اونٹنی آگے بڑھ گئی، یہ اونٹنی بڑی سرکش تھی اور قابو میں نہ آتی تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات گراں گذری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اس پر ڈانٹ ڈپٹ بھی فرمائی، لیکن آپ ﷺ نے اس کا برا نہ مانا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے منع فرمادیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو اس پر اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اسی کی سواری آگے رہے اور دوسرے چلنے والے اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔

قرآن مجید نے اچھے انسان کی صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ اگر نا سمجھ لوگ اس سے الجھنے کی کوشش کریں تو وہ سلامتی کی بات کہہ کر گذر جاتے ہیں۔ یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے، راستہ میں چلتے ہوئے بار بار اس کی نوبت آتی

ہے کہ ٹریفک کے اصول سے ناواقف، جلد باز اور جاہل واُجڈ قسم کے لوگ منہ آنے لگتے ہیں، کوئی اپنی سواری غلط طریقہ پر بیچ میں لے آتا ہے، کوئی اپنی مخالف سمت میں گھس آتا ہے، کوئی بے موقع ہارن بجا کر دِق کرتا ہے، کوئی ایسی جگہ گاڑی روک دیتا ہے جہاں گاڑی روکنے کی اجازت نہیں، اس سے ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، بعض لوگ خود غلطی کرتے ہیں اور اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے الٹے دوسروں کو سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، یہ بڑے جذباتی مواقع ہوتے ہیں، اگر دوسرا آدمی بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس سے ماحول کے اور خراب ہونے، آویزش بڑھ جانے اور ٹریفک جام ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ انہی صورتوں میں یہ آیت ہماری طرف متوجہ ہوتی ہے کہ یہ وقت برداشت، تحمل اور کلمۂ خیر کہہ کر گذر جانے کا ہے کہ ایک شخص تو کانٹا پھینک ہی رہا ہے، اگر دوسرے لوگ بھی پھول پھینکنے کے بجائے کانٹے ہی پھینکنے پر اصرار کریں تو کانٹے ہی کانٹے جمع ہو جائیں اور گلہائے محبت کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

رفتار حالات کے اعتبار سے ہونی چاہئے، جہاں از دحام ہو وہاں آہستہ چلا جائے، جہاں از دحام نہ ہو اور آپ کے آہستہ چلنے کی وجہ سے ان لوگوں کو دشواری ہو جو آپ کے پیچھے ہیں تو وہاں سبک خرامی کے بجائے تیز گامی اختیار کیجئے۔

حضرت اسامہ بن زید ﷺ حجۃ الوداع کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی رفتار کی بابت فرماتے ہیں کہ جب کہیں خالی جگہ ہوتی تو تیز چلتے ورنہ رفتار اس سے کم رہتی: "**یسیر العنق، فاذا وجد فجوۃ نص**" (بخاری: حدیث نمبر: ۲۹۹۹، مسلم، حدیث نمبر: ۱۲۸۶) پیدل چلنے میں وقار اور متانت ہو۔ نماز ایک عبادت ہے اور نماز کے لئے آنا ایک عبادت کی طرف سبقت ہے، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس میں بھی وقار کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ارشاد ہے: "**اذا اتیتم الصلاۃ فاتوھا بالوقار**" (......احمد عن عبد الرحمن بن عوفؓ) حضرت اسامہ بن زید ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سکون کے ساتھ چلو، تیز چلنا کچھ نیکی کا کام نہیں، "**علیکم السکینۃ، فان البر لیس بالایضاع**"۔ (مسند احمد عن اسامہ بن زیدؓ)

راستہ پر بے ضرورت ہارن بجانا بھی پسندیدہ نہیں، اس سے آگے چلنے والے کو وحشت ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ حادثہ کا باعث بھی ہو جاتا ہے، اس لئے بھی ہارن کی آواز سنجیدہ لوگوں کے لئے گراں خاطر ہوتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے راستہ چلتے ہوئے گھنٹہ بجانے سے منع فرمایا، عربوں کا طریقہ تھا کہ اونٹ کی گردنوں میں گھنٹیاں باندھ دیتے، جب پورا قافلہ چلتا تو راستہ گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھتا، آپ ﷺ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمائے۔ اس سے بے ضرورت ہارن بجانے کی قباحت پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض حضرات نت نئی آوازوں کے ہارن گاڑیوں میں لگاتے ہیں، جیسے کتے کی آواز، چھوٹے بچے کے رونے کی آواز، یہ نہایت ہی ناشائستہ بات ہے، اس آواز کے مکروہ ہونے کے علاوہ لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا جاتے ہیں اور چونک اٹھتے ہیں، جو خطرناک حادثہ کا باعث ہوسکتا ہے، اس لئے ایسی چیزوں سے گریز ضروری ہے۔

یہ بات بھی مناسب نہیں کہ جہاں پارکنگ کی جگہ نہ ہو وہاں گاڑی کو پارک کر دیا جائے، یہ دوسرے راستہ چلنے والوں کے لئے تکلیف اور مشقت کا باعث ہے، اس سے ٹریفک جام ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بھی ایمان کا ایک درجہ قرار دیا ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو کو ہٹا دیا جائے، وادناها اماطة الاذى عن الطريق (مسند احمد، حدیث: ۹۷۴۷) اذیٰ میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو تکلیف دہ ہوں، خواہ وہ گندگی یا نجاست ہوں یا کچھ اور، اس لئے بے جگہ گاڑی کا کھڑا کرنا بھی اس میں شامل ہے، کیوں کہ اکثر اوقات اس کی تکلیف راستہ چلنے والوں کے لئے گندگی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی حکم میں یہ ہے کہ پٹرول اور ڈیزل کے بجائے کیروسن تیل پر گاڑیاں چلائی جائیں، کہ یہ یقیناً دوسرے راہ گیروں کے لئے تکلیف واذیت کا باعث ہے اور اس سے پھیلنے والی آلودگی عام لوگوں کے لئے بھی مضر اور نقصان دہ ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ پیدل چلنے والے گاڑی والوں کا اور گاڑی پر چلنے والے پیدل چلنے والوں کا خاص کر عورتیں، بچے اور ضعیف لوگ جو جلد راستہ طے نہیں کر سکتے، ان کی رعایت ملحوظ رکھیں، رسول اللہ ﷺ نے راہ گیروں کو عورتوں کی بابت خصوصی رعایت کا حکم

فرمایا، حضرت عبد اللہ ابن عمر ﷛ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۷۳) حضرت ابو اسید انصاری ﷛ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خواتین کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستہ کے کناروں سے چلیں۔ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۲۷۲) اس سے معلوم ہوا کہ فٹ پاتھ کے حصہ میں سواریاں نہ چڑھائی جائیں، بلکہ ان کو پیدل راہ گیروں کے لئے چھوڑ دیا جائے اور پیدل چلنے والے لوگوں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے چلا کریں۔

غرض، راستہ چلتے ہوئے مزاج میں تحمل و برداشت ہو، رویہ میں اعتدال ہو، دوسرے راہ گیروں کے ساتھ رعایت اور ایثار کا معاملہ ہو، اگر دوسرے راہ رو بے احتیاطی سے کام لیں اور نامناسب رویہ اختیار کریں تو ان کے بارے میں عفو درگذر ہو اور ہر شخص اپنے اپنے طور پر ٹریفک کے اصول وقواعد کو ملحوظ رکھے۔ یہ ہیں وہ اصول جن کی طرف قانونِ شریعت میں اشارہ ملتا ہے۔

(۲۰۰۰/۲/۲۵)

ٹیلی فون ——— آداب و احکام

اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ عہد علمی اکتشاف اور ایجاد و اختراع کا عہد ہے، انسان نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتِ فکر کو استعمال کر کے ایسی ایسی چیزوں کو وجود بخشا ہے کہ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فضاء ہو یا سمندر، زمین کی تہیں ہوں یا انسان کا خود اپنا وجود، انسان نے ایک حد تک ان سبھوں کو علم و تحقیق کی گرفت میں لے لیا ہے۔ ان ایجادات میں ایک اہم حصہ ابلاغ اور مواصلات کے ذرائع میں ہونے والی حیرت انگیز ترقی ہے۔ کل تک انسان اپنی آواز کو ایک دو فرلانگ بھی پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، لیکن آج دنیا کے ایک کونہ میں بیٹھ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ اپنا پیغام ہر چہار سمت پہنچا سکتا ہے، ٹیلیفون کے ذریعہ سات سمندر پار رہنے والے لوگوں سے گفت و شنید کا ایسا رابطہ قائم کر سکتا ہے کہ گویا وہ اس کے سامنے موجود ہے۔ ٹیلی فون کے نظام میں مصنوعی سیاروں کی مدد نے اس کی تیز رفتاری اور ہمہ گیری میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

غور کیا جائے تو پیغام رسانی کے یہ ان دیکھے ذریعے اسلام کے بعض عقائد اور افکار کی تصدیق ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے حکم کا پابند ہے، گویا ہر شئی کو اللہ تعالیٰ کا پیغام ملتا رہتا ہے اور اسی کے مطابق پوری کائنات سرگرم عمل رہتی ہے۔ وحی کا نظام بھی کچھ اسی طرح ہے کہ کبھی براہِ راست اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے مخاطب ہوتا ہے، کبھی منشاءِ ربانی نبی کے قلب پر نقش ہو جاتا ہے، کبھی فرشتے اَن دیکھی صورت میں پیغمبر کے پاس آتے ہیں اور اسے اللہ کا کلام سناتے ہیں۔ مادہ پرستوں کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ پیغمبروں پر کس طرح وحی نازل ہوا کرتی تھی اور کائنات کو کس طرح خدا کا پیغام ملتا ہے، حالاں کہ ان کے درمیان کوئی ظاہری رابطہ موجود نہیں؟ ریڈیائی لہروں کے

ذریعہ پیغام رسانی کے اس نظام نے اس نظریہ کو مشاہدہ بنا دیا کہ کسی ظاہری رابطہ کے موجود نہ ہونے کے باوجود ایک جانب سے دوسری جانب پیغامات کی ترسیل ہو سکتی ہے۔ جب عاجز انسانوں نے اس کی طاقت حاصل کر لی ہے تو قادرِ مطلق کے لئے یہ کیا دشوار ہے؟۔

انسانیت کے لئے نفع بخش ایجادات میں سے ایک ٹیلیفون ہے، جو فاصلوں کو کم کرتا ہے۔ جغرافیائی فاصلوں کے باوجود ایک کو دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رکھتا ہے اور شاعروں کی زبان میں ''ہجر'' کو ایک گونہ ''وصال'' بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ۱۸۷۶ء میں ''الگزینڈر گراہام بیل'' کے ذہن رسا نے فون کو وجود بخشا اور اب موبائل فون نے گویا اس نظام کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اب فون کا ہونا اعلیٰ سرکاری عہدیدار یا بڑے تاجر یا صنعت کار ہونے کی علامت نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ فون رکھنا شہری زندگی کے لوازم میں سے ہوتا جا رہا ہے۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی مفید چیز کا حاصل ہو جانا ہی بڑی کامیابی ہے، لیکن شاید یہ درست نہیں۔ کسی چیز کے حصول سے زیادہ اہم اس کا استعمال ہے اور یہ رہنمائی ہمیں قرآن وحدیث ہی سے مل سکتی ہے کہ کس چیز کا استعمال کس طرح ہو؟ استعمال کا کون سا طریقہ روا ہے اور کون سا ناروا؟

فون دراصل ایک طرح کی ملاقات ہے، اس لئے بنیادی طور پر جو احکام وآداب ملاقات کے ہیں وہی فون پر گفتگو کرنے کے بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے کسی کے یہاں جانے کا یہ ادب بتایا ہے کہ پہلے سلام کرے پھر داخل ہونے کی اجازت چاہے۔ (ابوداؤد عن کلدۃ بن حنبل) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مسلمان کو فون کیا جائے تو پہلے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہنا چاہئے۔ چوں کہ سلام کے یہ کلمات مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے غیر مسلموں کو کسی اور کلمۂ احترام سے مخاطب کرنا چاہئے۔ غیر محرم مردوں اور عورتوں کو سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ (ردالمحتار ۲۶۱/۵) کہ اس میں فتنہ کا اندیشہ ہے، چوں کہ فون پر گفتگو میں یہ اندیشہ کم ہے؛ اس لئے ایک حد تک فون پر اگر اچانک غیر محرم سے ملاقات ہو جائے تو سلام کی گنجائش ہے، لیکن احتیاط بہتر ہے۔

بعض حضرات فون کرتے ہوئے اپنا نام نہیں بتاتے، بلکہ بعض اوقات تو دریافت

کرنے کے باوجود نام بتانے سے گریز کرتے ہیں، یہ بُری بات ہے۔ اس سے مخاطب کو وحشت ہوتی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ سلام کرنے کے بعد خود ہی اپنا نام بتادے کہ میں فلاں شخص گفتگو کر رہا ہوں۔ ایک بار حضرت جابر ﷛ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے، دروازہ پر دستک دی، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: کون؟ عرض کیا: میں، آپ ﷺ نے ان کے اس جواب کو ناپسند فرمایا۔ (بخاری و مسلم عن جابر) کیوں کہ ''میں'' سے آنے والے کو پہچانا نہیں جا سکتا ہے، اس لئے اپنے نام کی صراحت ضروری ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷛ حضرت عمر ﷛ کے پاس گئے، تو فرمایا: ''یستاذن ابو موسیٰ'' یعنی ابوموسیٰ حاضری کی اجازت چاہتا ہے، اسی طرح فون کرتے ہوئے پہلے اپنا نام بتادے۔

جس شخص سے گفتگو کرنی ہو، اگر اس کا نام ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ ہو تو خود ہی وضاحت کر دینی چاہئے کہ میں فلاں شخص ہوں اور فلاں شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی نظیر آنحضرت ﷺ کے مکتوبات ہیں، کہ آپ ﷺ نے جتنے خطوط لکھے ہیں، ان میں خط کے آغاز پر اپنا نام اور پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷛ سے مروی ہے کہ جب تم کسی کے گھر جاؤ، تین بار گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرو اور اجازت نہ ملے بلکہ خاموشی اختیار کی جائے، تو واپس آجاؤ۔ (بخاری و مسلم عن ابی سعید الخدری ﷛) ٹیلیفون کی گھنٹی گویا ملاقات کی اجازت حاصل کرنا ہے، لہٰذا اگر تین بار فون کی گھنٹی بجنے کے باوجود فون نہ اٹھایا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ملاقات کی اجازت نہیں ہے اور فون کا ریسیور رکھ دینا چاہئے۔ بار بار گھنٹی بجا کر تنگ نہ کرنا چاہئے۔

آپ ﷺ کا طریقہ تھا کہ دروازہ پر اس طرح دستک دیتے اور اس طرح سلام کرتے کہ سونے والوں کی نیند خراب نہ ہونے پائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات دیر گئے یا ایسے اوقات میں شدید ضرورت کے بغیر فون کرنے سے گریز کرنا چاہئے جس میں مخاطب کے سونے اور آرام کرنے کا معمول ہو۔ اگر کسی شخص سے طویل گفتگو کرنی ہو تو چاہئے کہ پہلے اجازت حاصل کر لی جائے کہ مجھے اتنی دیر گفتگو کرنی ہے، اگر مناسب ہو تو

اسی وقت گفتگو کریں یا کوئی وقت مقرر کردیں، اس میں دونوں کے لئے راحت ہے۔ قرآن مجید نے کسی کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینے کا اُصول بتاتے ہوئے کہا ہے کہ یہی تمہارے لئے باعث پاکیزگی ہے۔ ''ھو ازکی لکم'' (النور: ۲۷) یعنی اس اخلاق اور برتاؤ سے تمہارے قلوب ایک دوسرے سے پاک اور صاف رہیں گے۔ قرآن کے اس حکم سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص اپنی مشغولیت کی وجہ سے گفتگو کرنے سے معذرت کردے، تو اس کا برا نہ ماننا چاہئے اور نہ اسے تکبر پر محمول کرنا چاہئے، کیوں کہ ہر شخص کے اپنے مشاغل ہوتے ہیں، اس میں دخل اندازی کسی طرح مناسب نہیں۔

قرآن مجید نے ایسی جگہوں پر بلا اجازت آنے کی اجازت دی ہے جو رہائشی نہ ہوں۔ (النور: ۲۹) اس سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ پبلک مقامات جیسے ایرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، سرکاری اور نجی عوامی اداروں کو ان کے مقررہ اوقاتِ کار میں کسی بھی وقت فون کیا جاسکتا ہے اور ان اداروں سے متعلق تفصیلی استفسار پیشگی اجازت کے بغیر بھی کرنے کی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم پر ملاقات کرنے والوں کا بھی حق ہے، ''ان لزورك علیك حقا'' ملاقات کے لئے آنے والوں کا حق یہی ہے کہ ان سے ملاقات کی جائے اور کسی شرعی یا طبعی مجبوری کے بغیر ملاقات سے انکار نہ کیا جائے، کہ اس میں ملاقات کو آنے والے کے ساتھ بے احترامی اور بے مروتی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی حکم ٹیلیفون کا بھی ہوگا۔ بلا وجہ فون پر گفتگو کرنے اور جواب دینے سے انکار کرنا بد اخلاقی کی بات ہے اور ایک طرح کی حق تلفی ہے، اس سے بچنا چاہئے۔ اسی طرح جھوٹ بولنا اور رہتے ہوئے موجود نہ رہنے کی اطلاع دینا گناہ ہے، البتہ اگر جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جھوٹ بولنے کے سوا چارہ نہ ہو اور سچی اطلاع دینے میں کسی مسلمان کو ناحق گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو، تو ایسی صورت میں ایک اہم تر مقصد کے لئے جھوٹ بولنا جائز ہے، لیکن عام حالات میں اس طرح جھوٹ بولنا نہ شرعاً درست ہے اور نہ اخلاقاً۔

آج کل بعض ایسے فون بھی ہیں جن کے استعمال کرنے کی صورت میں فون کرنے

والے اور وصول کرنے والے دونوں ہی کو پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں، ایسی صورت میں فون کر کے ہم فون وصول کرنے والے کو زیر بار کرنے کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ایسے فون کا استعمال دو ہی صورتوں میں درست ہوسکتا ہے، یا تو پہلے ہی سے فون پر بات کرنے کی اجازت لے لی گئی ہو یا فون کرنے والا دوسرے فریق کی اُجرت بھی ادا کرنے کو تیار ہو اور اس سے وہ مطلوبہ اُجرت ادا کرنے کی پیشکش کرے۔

بعض حضرات فون میں موسیقی لگا لیتے ہیں کہ اگر فون کرنے والے کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے، تو وہ اس ساز سے محظوظ ہوسکے، اسلام نغمہ وموسیقی اور ساز وسارنگی کا قائل نہیں، اس لئے فون کے ساتھ موسیقی کے ساز لگانا کراہت سے خالی نہیں، یہ اخلاقی تقاضوں کے بھی مغائر ہے؛ کیوں کہ ہر فون کرنے والا اس موسیقی کے سننے پر مجبور ہوگا، یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی شخص تکلیف دہ خبر دینے والا ہو، ظاہر ہے ایسے لوگوں کے لئے یہ موسیقی بار خاطر ہی ہوگی۔

بعض جگہ بار بار فون کر کے اور فون کی گھنٹیاں بجا کر پریشان کرنے کے واقعات سننے میں آتے ہیں، ایسی بھی شکایتیں سنی جاتی ہیں کہ فون پر گالی گلوج کیا جاتا ہے، فحش باتیں کہی جاتی ہیں، دھمکیاں دی جاتی ہیں اور دوسروں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں سخت ناپسندیدہ اور گناہ ہیں، یہ نہ صرف اسلام کے خلاف ہیں بلکہ عام تقاضۂ اخلاق کے بھی مغائر ہیں، اور گناہ بے لذت بھی، جن سے خود کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

فون ایسی ملاقات ہے جس کی اُجرت ادا کرنی ہوتی ہے، اس لئے فون پر مختصر اور ضروری باتیں کرنا چاہئے، غیر ضروری اور خواہ مخواہ لمبی گفتگو کرنا اسراف اور فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کو اسلام نے جتنی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے، وہ ظاہر ہے۔آپ ﷺ نے خوش کلامی کو پسند فرمایا ہے، اس لئے کسی متعارف شخص کا فون ہو یا غیر متعارف شخص کا، نرم گفتگو کرنی چاہئے، جس سے مخاطب مانوس ہو، گفتگو خشک اور روکھی نہ ہو، البتہ عورتوں کو غیر محرم مردوں سے گفتگو کرنی پڑے تو اس کا خیال رہے کہ بات چیت میں لوچ اور حلاوت

کا اظہار نہ ہو، اس سے منع کیا گیا ہے، کیوں کہ ایسی گفتگو مریضانہ ذہن رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوسکتی ہے۔

ملاقات کا ادب یہ ہے کہ ملاقات کے اختتام پر دوبارہ سلام کیا جائے، یہی آپ ﷺ کی سنت ہے، لہٰذا فون پر بھی گفتگو کا اختتام سلام ہی پر ہونا چاہئے، تاکہ اس سنت پر عمل ہو سکے، غرض فون ایک بڑی نعمت ہے، لیکن اگر اس کے استعمال میں شرعی حدود و آداب کی رعایت ملحوظ نہ رکھی جائے تو اسی قدر باعث زحمت بھی ہے۔

(۱۳؍ نومبر ۱۹۹۸ء)

تہذیب کے نام پر بدتہذیبی

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سی برائیوں کا مہذب اور شائستہ ناموں سے ارتکاب کریں گے، شراب پئیں گے لیکن ان کے نام بدل دیں گے، سود کھائیں گے اور ان کا نام کچھ اور دے دیں گے، دراصل یہ برائی کی سب سے بدترین شکل ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں بھلائی کے نام سے برائی کی جاتی ہے، تہذیب کے نام پر بدتہذیبی کو روا رکھا جاتا ہے، آزادی کے نام پر نفس کی غلامی کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اسلام جس وقت اس دنیا میں آیا، اس وقت بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی، عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا حامل کہتے تھے، لیکن پوری طرح شرک میں ملوث تھے، بہت سے لوگ مرد اور عورتیں بے لباس کعبۃ اللہ کا طواف کرتے تھے، اور اسے نیکی تصور کرتے تھے، کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کیا ہے، ان میں کیوں کر طواف کیا جائے، اہل مکہ اپنی امتیاز کو قائم رکھنے کے لئے میدان عرفات نہیں جاتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، حدود حرم سے باہر کیسے جائیں۔

جب کوئی انسانی گروہ گناہ کا عادی ہو جاتا ہے، اور جانتے بوجھتے گناہ کو روا رکھتا ہے، اس کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے، وہ بدی کو نیکی اور برائی کو اچھائی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، مغربی تہذیب نے آج یہی صورت اختیار کر رکھی ہے، آج بہت سی مسلمہ اخلاقی برائیاں، تہذیب و ثقافت کے نام پر روا ہوگئی ہیں، جو لوگ اس سے اختلاف رکھتے ہوں اور اسے برا جانتے ہوں ان کو تہذیب نا آشنا اور متشدد سمجھا جاتا ہے، اور آج کل تو ایسے لوگ بنیاد پرست اور انتہاء پسند بھی کہے جاتے ہیں، اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ طوعاً یا کرہاً مغربی ثقافت کو اہلِ مشرق پر مسلط کر دیا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی ''یوم عاشقاں'' کا فتنہ ہے، جو ۱۴ر فروری کو منایا جاتا ہے،

مغربی ممالک میں تو مدت سے اس کی دھوم سنی جاتی تھی، ہندوستان میں لوگ اسے کسی مہذب قوم کے کھنڈرات کی طرح واقعہ عبرت کے طور پر ذکر کیا کرتے تھے، لیکن عالمیانہ کی نئی اصطلاح کے تحت مشرقی ممالک میں مغربی تمدن کی جو یلغار شروع ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں اب ہندوستان میں بھی آوارہ خیال لوگوں کے لئے یہ ایک محبوب دن بن گیا ہے، سنا ہے کہ اس مناسبت سے ایک دوسرے کو بھیجنے کے لئے فحش مضامین اور فحش تصویروں کے کارڈ چھپ رہے ہیں، خاص اس مناسبت سے کیک بنائے جارہے ہیں، اگر اس حیا سوز سلسلہ کو روکا نہیں گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بداخلاقی کی اشاعت وترویج کا بہت بڑا ذریعہ بن جائے گا، اور معاشرہ پر نہایت ہی منفی اثرات مرتب ہوں گے، پھر ہمیں اس تہذیب کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا جس میں انسان کو اپنے جسم پر لباس بھی بوجھ محسوس ہونے لگے، جس میں نکاح کے بندھن سے انسان کو اپنی آزادی مقید ہوتی نظر آتی ہے، اور جس میں نفس پرستی کی لہریں شرافت واخلاق کے ساحل سے گریزاں رہتی ہیں، کیا ہم دیار مشرق میں اور ہندوستان جیسے مذہبی ملک میں جہاں مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی عفت وعصمت کو انسانی جوہر سمجھتے ہیں، اور جن کے نزدیک سیتا کا سب سے بڑا وصف اس کی حیاء اور پاکدامنی تھی، دین واخلاق اور شرافت وحیاء سے آزاد ثقافت کو دعوت دینا چاہتے ہیں۔

اسلام نے حیاء کو کس قدر اہمیت دی ہے؟ کہ اسے ایمان کا ایک جزء قرار دیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حیاء بہر صورت خیر و بھلائی ہے: **الحیاء شعبة من الایمان** (مسلم حدیث نمبر: ۷۵) حضرت عمران بن حسین سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حیا بہر صورت خیر و بھلائی ہے: **الحیاء خیر کله** (ابوداؤد حدیث نمبر: ۴۷۹۶) حضرت ابو مسعود ؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس شخص کو حیاء نہ ہو وہ کسی بھی برائی کا مرتکب ہوسکتا ہے: **اذا لم تستحی فافعل ماشئت** (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۷۹۷) حیاء دراصل انسان کو برائی سے باز رکھنے اور نیکی کی طرف لے جانے والی طاقت ہے۔

حیاء ہر معاملہ میں مطلوب ہے، رسول اللہ ﷺ کو اگر کوئی ایسا مسئلہ بیان کرنا ہوتا جو

مرد و عورت کے صنفی معاملات سے متعلق ہوں تو اس کے لئے بہت ہی پردہ دار تعبیر اختیار فرماتے، خواتین کو اگر ایسا مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ ازواج مطہرات کے واسطہ سے دریافت کرتیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مذی یعنی وہ مادہ جو صنفی ہیجان کے وقت انسان کے جسم سے نکلتا ہے، اور جس کی نوبت جنسی اتصال سے پہلے پیش آیا کرتی ہے، کے بارے میں حضور ﷺ سے سوال کرنا تھا۔ تو چوں کہ حضرت فاطمہ صاحبزادئ رسول آپ رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں، اس لئے مارے حیاء کے آپ ﷺ سے دریافت نہیں کر سکے، اور حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے استفسار کرایا۔

خود رسول اللہ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیاء دار تھے آپ ﷺ کی حیاء کا حال یہ تھا کہ کبھی کسی غیر محرم کے ساتھ آپ نے تنہائی اختیار نہیں فرمائی، عورتوں میں اللہ تعالیٰ نے حیاء کا عنصر زیادہ رکھا ہے، اور یہ ان کی فطرت اور ضرورت کے عین مطابق ہے، اسی لئے ان کے لئے پردہ کے احکام رکھے گئے، ساتر لباس کو مردوں اور عورتوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا، نماز میں خواتین کی صف پیچھے رکھی گئی، نکاح میں کنواری لڑکی کے لئے خاموشی کو رضامندی قرار دیا گیا، اور زبان سے اظہار ان کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا، میاں بیوی کو ہدایت دی گئی کہ وہ خلوت کی باتوں کو لوگوں سے مخفی رکھیں، اور انہیں دوسروں کے سامنے زبان پر بھی نہ لائیں، لباس و پوشاک، آواز، چال ڈھال، گفتگو، غرض تمام امور میں تقاضۂ حیاء کو ملحوظ رکھنے کی تلقین کی گئی۔

افسوس کہ لوگوں نے محبت کے لفظ کو بھی بدنام کر دیا ہے، اور بے شرمی اور بے غیرتی کو محبت جیسا باعزت نام دے دیا ہے، محبت بے غرض اور پاکیزہ چاہت کا نام ہے، جس چاہت کا مقصد نفس کی آگ کو غذا فراہم کرنا اور بے لگام خواہشات کی پیاس بجھانا ہو وہ بے غرض چاہت نہیں ہے، جو چاہت محض ہوس نفس کی تکمیل سے عبارت ہو، وہ تو پاکیزگی سے نا آشنا ہے، اسلام دین محبت ہے، اس نے ہر شئی سے محبت کا سبق دیا ہے، خدا سے محبت، خدا کے رسول ﷺ سے محبت، ہر مسلمان اور ہر انسان سے محبت، اللہ کی ہر مخلوق سے

محبت، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے محبت، یہ ایک تحفۂ محبت ہے، جسے ہر شخص اور ہر جگہ پر پیش کرنا ہے،اس میں پاکیزگی ہے،اس میں بے غرضی ہے،اوراس میں دوام و پائیداری ہے۔

مرد وعورت کا ایک دوسرے کی طرف رجحان یہ بھی فطرت انسانی کا ایک حصہ ہے، اور خاندانوں کی تشکیل کے لئے یہ ایک سماجی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے حلال اور جائز صورت رکھی ہے، اگر کوئی لڑکا کسی لڑکی کی طرف میلان محسوس کرتا ہوتو شریعت میں اس کے لئے ایک پاکیزہ طریقہ ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے ذریعہ سلسلہ جنبانی کیا جائے، اور طرفین کی رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ رفاقت کا معاہدہ کر لیا جائے، جسے ''نکاح'' کہتے ہیں، اس میں پاکیزگی ہے، یہ چند دنوں اور چند مہینوں کے لئے نفس کی تسکین کا سامان خریدنا نہیں ہے، بلکہ زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور ہمیشہ دکھ سکھ کو بانٹنے کا ایک باعزت معاہدہ ہے، یہ معاہدہ خود غرضی کا نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے بوجھ کو اٹھانے کا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نکاح دو انسانوں کے درمیان محبت پیدا کرتا ہے، یہ پاکیزہ محبت ہے، اسی لئے جوں جوں حسن وشباب ڈھلتا جاتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ شفقت اور حسن سلوک کے جذبات بڑھتے جاتے ہیں، نفسانی چاہت کا حال یہ ہے کہ جو طبیعتیں اس کی خوگر ہوتی ہیں وہ ہرجائی بن جاتی ہیں، کچھ دنوں کی دلچسپی کے بعد ان میں ایک دوسرے سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے، بے رخی اور بے توجہی بڑھنے لگتی ہے۔ جو ایک دوسرے کے لئے بے چین رہتے تھے، وہ ایک دوسرے سے اپنا دامن بچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اور اس تعلق کے بوجھ ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔

نکاح عورت کا اعزاز اور اس کا احترام ہے، اور زندگی بھر تعلق کو نباہنے کا پیمان ہے، اور عشق ومحبت کے نام پر مغربی تہذیب نے جس چاہت کا سبق سکھایا ہے، یہ ہوس کی پرستش اور ناپاک اور خود غرضانہ چاہت ہے، اس میں عورتوں کی تذلیل وتحقیر اور اس کی رسوائی کا سامان ہے، اور اکثر اوقات اس کا استحصال ہے، آج مغرب خدا کی نافرمانی اور قانونِ فطرت سے بغاوت کی سزا چکھ رہا ہے، کہ ان کی زندگی سکون کی نعمت سے محروم ہے،

وہ ان گلہائے حسن و جمال سے عاجز آچکے ہیں جن میں وفا کی خوشبو نہیں، جس میں انسان کو ایک کربناک بڑھاپے سے گذرنا پڑتا ہے، جہاں بے غرض محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں، جہاں ایک مرد یا عورت سانس سے زیادہ قریب رہنے والے ساتھی کے بارے میں بھی یہ اطمینان نہیں کرسکتا کہ اس کی محبت اس کے لئے وقف ہے، اور اس کی وفاداریاں اٹوٹ اور ناقابل یقین ہیں۔

کیا ہم مذہب کی گرویدہ حیاء اور وفاء کی پرستار اور بے غرض محبت کی ترجمان کی سرزمین میں حیاء و اخلاق سے آزاد اسی تہذیب کو خوش آمدید کہنا چاہتے ہیں۔

(۸؍فروری ۲۰۰۲ء)

خدائی منصوبہ بندی یا خاندانی منصوبہ بندی؟

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، وہ جس قدر خوبصورت ہے، اسی قدر منصوبہ بند بھی ہے۔ صبح سے شام تک دُنیا میں جو کچھ واقعہ پیش آتا ہے، غور کیا جائے تو وہ ایک پروگرام اور منصوبہ بندی سے مربوط ہے۔ قدرت کے مرتب کئے ہوئے نظام الاوقات کے مطابق ہی سورج اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اپنی روشن اور گرم کرنوں کے ذریعہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو روشن اور گرم کرتا جاتا ہے، انسان ہو کہ چرند و پرند، ہر ایک اپنی غذا کی تلاش میں زمین پر دوڑ پڑتے ہیں، پھر جب انسان دن بھر کی محنت سے تکان محسوس کرنے لگتا ہے، تو سورج اپنی کرنوں کو سمیٹنے لگتا ہے، یہاں تک کہ سورج چھپ جاتا ہے اور رات اپنی دلآویز چاندنی یا سیاہ نقاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، تاکہ انسان ہو یا چرند و پرند، اپنے گھر کو واپس آجائیں، راحت و آرام کی سانس لیں اور رات کی سیاہ چادر میں منہ چھپا کر سو جائیں۔ اس پرسکون اور خاموش فضا میں شبنم مسلسل ان پر نثار ہوتا رہتا ہے اور گل بوٹے بھی عطر بیزی کرتے رہتے ہیں، کہ دن بھر کا تھکا مسافر چند ساعت سکون و راحت کے ساتھ گزار لے۔

پھر خدا نے اس زمین کے لئے کیسے کیسے موسم رکھے، سخت گرمی کہ بدن جھلسا جا رہا ہو، یہ گرمی جو بظاہر تکلیف اور زحمت کا باعث ہے، سمندر کو گرماتی ہے اور جوش دیتی ہے، یہاں تک کہ اس سے بھاپ نکلنے لگتا ہے، پھر ہوائیں آتی ہیں اور اس بھاپ کو اپنی آغوش میں اٹھائے اٹھائے فضاؤں میں گھومتی رہتی ہیں اور انہیں جمع کر کے بادل بناتی ہیں، ٹھیک جب گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو یہ پانی سے بھرپور بادل زمین کی طرف اُترتے ہیں اور کائنات کی پیاس بجھاتے ہیں، زمین پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور اپنا سینہ چیر کر لہلہاتی ہوئی سبزہ زار کھیتیاں حضرت انسان کے حوالہ کرتی ہیں، زمین انہیں پالتی ہے، بارش ان کو پانی پلاتی ہے اور

شبنم ان پودوں کی بے روح بالیوں کو دانے کے وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے۔ کتنے منصوبہ اور حسن انتظام کے ساتھ قدرت کا یہ کاروبار بلا وقفہ اپنا کام کر رہا ہے۔

پھر مختلف نباتات اور حیوانات کی افزائش کا نظام بھی دیکھیں! تو قدرت کی وسیع منصوبہ بندی کا شاہکار ہے۔ شیر کو سب سے طاقتور حیوان مانا گیا ہے، بڑا سے بڑا جانور اس کے لئے لقمۂ تر ہے، اپنی حفاظت اور مدافعت اس پر چنداں دشوار نہیں، لیکن شیر کی نسلیں ختم ہوتی جاتی ہیں اور آج شیر کی نسلوں کو باقی رکھنے کے لئے کتنے ہی جوکھم کئے جا رہے ہیں، ہاتھی اس سے بھی بڑے جسم کا جانور ہے، اس کا ایک قدم کئی انسانوں کی جان لینے کے لئے کافی ہے؛ لیکن اس کی نسلیں بھی دن بدن کم ہوتی جاتی ہیں، بکری ایک کمزور اور نحیف الجثہ جانور ہے اور ایک کتا بھی اس کو پھاڑ کھانے کے لئے کافی ہے، ایک ایک دن میں اور ہر ہر شہر میں ہزاروں بکریاں ہیں، جو انسان کی غذا بن جاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود بکری کی نسل میں روز افزوں اضافہ ہے اور کبھی اس کی کمی کی شکایت نہیں ہوئی، گائے بیل بمقابلہ ہاتھیوں کے کس قدر کمزور اور عاجز ہیں اور ہر دن کتنی ہی بڑی تعداد میں ذبح ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی وافر تعداد میں موجود ہیں۔ مقام فکر ہے کہ کیا یہ سب کسی تدبیر و منصوبہ بندی کے بغیر ہو رہا ہے اور کیا اس کے پیچھے کسی حکیم اور علیم و خبیر کا ہاتھ نہیں؟

یقیناً یہ سب کائنات کے خالق و رب کا بنایا ہوا منصوبہ ہے، جو پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ درخت کا ایک پتہ جو زمین پر گرتا ہے اور بلوں میں رہنے والی معمولی جسم و جثہ کی چیونٹی جو پیدا ہوتی ہے اور مرتی ہے، وہ اس کے مقرر کئے ہوئے منصوبہ کا ایک حصہ ہے، اسی لئے قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کو رب العالمین قرار دیا ہے، یعنی کائنات کے انتظام و انصرام کو ہر لمحہ براہِ راست انجام دینے والا، جس خدا نے سورج اور چاند سے لے کر چیونٹی و مچھر تک کے لئے ایک منصوبہ بنا رکھا ہے، کیا اس نے انسانیت کے لئے جو اس کائنات کا حاصل اور مقصود ہے، کوئی منصوبہ نہیں بنا رکھا ہوگا؟ وہ حکیم اور رب ہے، رزق کی ذمہ داری اس نے قبول کی ہے اور اس شان سے قبول کی ہے کہ شیر و ہاتھی سے لے کر مچھر اور مکھی تک کے لئے روزی کا سامان کرتا ہے:

• "وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا" (ہود:٦) تو کیا اس نے اس کا

انتظام نہ کیا ہوگا کہ خلیفۂ کائنات حضرت انسان کی تعداد تو روز بروز بڑھتی جائے، لاکھ سے کڑور اور کڑور سے اربوں ہو جائے، لیکن ان کے لئے رزق کے وسائل اس نسبت سے محدود تر ہوتے جائیں گے، تو آخر یہ کیا کھائیں گے اور کیوں کر اپنی ضروریات پوری کریں گے؟۔

نہ کوئی صاحبِ ایمان ایسا سوچ سکتا ہے اور نہ کوئی صاحبِ عقل اس پر یقین کر سکتا ہے، قرآن مجید نے خوب کہا ہے کہ خدا کے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں، لیکن وہ اس میں سے ایک متعین مقدار انسان کو عطا فرماتے ہیں، " وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ" (الحجر:۲۱) یعنی جیسے انسانی ضروریات بڑھتی جاتی ہیں، اسی نسبت سے اللہ تعالیٰ وسائل بھی بڑھاتے جاتے ہیں۔ جب ایک معمولی سربراہِ خاندان اپنے افرادِ خاندان کی فکر رکھتا ہے اور ان کی تعداد کی نسبت سے ان کی خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے، تو کیا خدائے حکیم و خبیر اپنی مخلوق سے غافل رہ سکتا ہے، جو اسی کے حکم و اشارہ سے دُنیا میں آئی ہے؟۔

کوئی بھی شخص دُنیا میں افرادی قوت میں اضافہ اور زمین کی پیداوار میں اضافہ کے تناسب کو دیکھے تو وہ قرآن کے اس بیان کی تصدیق پر مجبور ہوگا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی گراں قدر تالیف " ضبط ولادت" میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔ برطانیہ کے ایک تجزیہ نگار نے ۱۸۹۸ء میں چیلنج کیا تھا کہ افزائش آبادی میں کثرت اور وسائل پیداوار کے محدود ہونے کی وجہ سے تیس سال میں یہ کیفیت ہو جائے گی کہ لوگوں کو اپنی ضروریات کے لئے گیہوں نہیں مل سکے گا، لیکن صورت حال یہ ہے کہ اس کے بعد کئی تیس سال گزرے اور گیہوں کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا کہ بعض ملکوں کو قیمت پر کنٹرول رکھنے کے لئے فاضل گیہوں نذرِ آتش کرنے پڑے یا سمندر میں ڈبو دیئے گئے۔

کرۂ ارض کی وسعت کے اعتبار سے انسانی آبادی کا حال یہ ہے کہ فی مربع کیلومیٹر صرف اکیس افراد کا اوسط ہوتا ہے اور زمین پر انسانی آبادی کی صلاحیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہالینڈ میں فی مربع کیلومیٹر ۳۴۵ آدمی تمام سہولتوں کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔ جاپان میں یہ تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ گویا موجودہ آبادی کئی گونہ بھی

بڑھ جائے تو اقامت ورہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا، پھر اس پر غور فرمائیے کہ زمین کا کتنا حصہ ہے، جسے انسان کے لئے غذائی وسائل حاصل کرنے کی غرض سے آباد کیا جاتا ہے؟ اعداد وشمار کے مطابق زمین کا صرف دس فیصد حصہ اس وقت زیر کاشت ہے، بیس فیصد حصہ جنگلات وغیرہ پر مشتمل ہے اور ستر فیصد حصہ وہ ہے جسے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے اور ابھی افتادہ پڑا ہوا ہے، جتنے مالی وسائل حکومتیں خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج اور پروپیگنڈہ پر خرچ کرتی ہیں، اگر وہی وسائل ان افتادہ اراضی کو قابل کاشت بنانے پر صرف ہوں، تو انسانیت کی بھلائی اور خیر خواہی کا بڑا کام ہوگا۔

پھر زراعتی سائنس کی ترقی نے بھی پیداوار کو بڑھانے میں حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے غور فرمائیے کہ ہندوستان میں فی ایکڑ گیہوں کی پیداوار کا اوسط ۲۹/ کوئنٹل اور پاکستان میں ۳۰/ کوئنٹل ہے اور اسی کا اوسط مصر میں ۹۵/ کوئنٹل اور ڈنمارک میں ۱۶۳/ کوئنٹل ہے۔ یہ ۱۹۵۶ء کا تجزیہ ہے اور یقیناً اس اوسط میں بہت کچھ اضافہ ہوا ہوگا۔ اس وقت پسماندہ ملکوں میں جس چیز کی ایک فصل حاصل کی جاتی ہے، ترقی یافتہ ممالک میں اسی کی تین تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اگر ایشیاء کے غریب ممالک ایٹم بم اور میزائل بنانے اور ۳۵، ۴۰ فیصد دفاعی ٹکنالوجی کے بجائے زراعتی اور طبی ٹکنالوجی حاصل کریں، تو نہ کسی گھر میں فاقہ کی نوبت آئے اور نہ کاشت کار خودکشی کرنے پر مجبور ہوں!

یہ تو اعداد وشمار پر مبنی تجزیے ہیں، لیکن کچھ حقیقتیں اور تجربات ہیں، جن کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں تیس چالیس سال ہیں، وہ لوگوں کے موجودہ معیارِ زندگی اور پچیس تیس سال پہلے کے معیارِ زندگی کا تقابل کر کے دیکھ لیں، تو نمایاں فرق محسوس کریں گے، ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کے لئے ٹرین میں تھرڈ کلاس کا سفر بھی دشوار ہوتا تھا، سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس کے مسافرین خال خال ہوا کرتے تھے، لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ ٹرین کے اونچے درجے پہلے پر ہوجاتے ہیں اور ہوائی جہاز میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے ویٹنگ لسٹ میں جگہ لینی پڑتی ہے۔ دوتین دہے پہلے قصبہ جات ہی نہیں اوسط درجہ کے شہروں میں بھی زیادہ تر خام اور سفال پوش مکانات ہوا کرتے تھے، پختہ مکان اور خوبصورت حویلیاں رئیسوں اور

زمینداروں کی ہوا کرتی تھیں، لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت جن علاقوں کو سلم علاقہ قرار دیتی ہے، وہاں بھی ایک سے ایک عالی شان اور خوبصورت مکان مل جاتے ہیں، شخصی سواری کی حیثیت سے پندرہ بیس سال پہلے سائکلیں بھی ایک اہمیت رکھتی تھیں اور بہت کم لوگ تھے جن کو موٹریں میسر تھیں، لیکن آج اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی موٹروں کا ازدحام شہروں میں فضائی آلودگی کا مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔

یہی حال کھانے پینے کے معیار کا ہے۔ چوتھائی صدی پہلے جس معیار کی دعوت نوابوں اور بڑے رئیسوں کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھیں، اب عام آدمی بھی دعوت میں اس معیار کو برقرار رکھنا ضروری خیال کرتا ہے۔ مرغیوں اور انڈوں کی جو افزائش اس دور میں ہوئی ہے اور اس نے غریبوں کے لئے ان چیزوں کو جتنا سہل الحصول بنا دیا ہے، ماضی میں اس کا تصور بھی دشوار تھا، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلیفون اور اس طرح کی جدید گراں قیمت ایجادات اب دولت مند ہونے کی علامت نہیں ہیں، بلکہ اوسط سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے سماج میں بھی ان کا استعمال عام ہے، اور پوری دُنیا میں آبادی کے مسلسل بڑھنے کے باوجود فی کس آمدنی میں نمایاں اضافہ ہوتا جارہا ہے، کیا اس کے باوجود خدا کی رزاقیت سے مایوس ہونے اور یہ سوچنے کا جواز ہے کہ اگر انسان بڑھ گئے تو وہ کیا کھائیں گے اور کہاں رہیں گے؟۔

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خود قدرت نے آبادی کی تحدید اور افزائشِ نسل میں اعتدال و توازن کا کوئی خیال نہیں رکھا ہے، نوعِ انسان ہی کے مسئلہ کو دیکھئے کہ عورت کے اندر فطری نظام کے تحت ہر سال کم سے کم ایک بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، اسی طرح اگر ایک خاتون اپنی ازدواجی زندگی کے پچیس سال تولید اور حمل کی صلاحیت کی حامل رہی تو اس کے پچیس بچے ہونے چاہئیں، لیکن ایسی مثالیں بھی شہر میں خال خال ہی ملیں گی کہ کوئی عورت دس بارہ بچوں کی ماں ہو، اب تو اس طرح خبریں اتنی انوکھی ہوگئی ہیں کہ وہ اپنی ندرت کی وجہ سے اخبار کی سرخی بن جاتی ہیں۔ یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے کہ مرد و عورت کی تولیدی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا کنبہ نا قابل بیان حد تک مختصر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان اس دُنیا میں حادثات کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ طوفان،

سیلاب، قحط، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کا اُبل پڑنا، آتشزدگی، وبائی امراض کا پھیلنا، ٹرین اور ٹریفک کے حادثات، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی قدرتی اسباب ہیں، جس میں ہر سال لاکھوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور انسان خود اپنے ہاتھ اپنی ہلاکت کا جو سروسامان کر رہا ہے اور کرتا رہا ہے، وہ ان سب سے سوا ہے، پہلی جنگ عظیم میں روس کو چھوڑ کر صرف یورپ میں دو کروڑ چوبیس لاکھ افراد کی کمی واقع ہوئی، صرف جرمنی میں انیس لاکھ افراد جنگ میں کام آئے۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی ایک کروڑ ہلاکتوں کا اندازہ کیا گیا ہے اور اب انسان نے جس اعلیٰ درجہ کے ہلاکت خیز اور تہلکہ انگیز ہتھیار تیار کئے ہیں، خوانخواستہ اگر تیسری جنگ عظیم ہو جائے، تو نہ معلوم کتنے لوگوں کا خون پی کر یہ آسودہ ہوگی؟ اسی طرح قدرتی طور پر انسانی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ ہر سال غیر معمولی حادثات اور واقعات کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کی منصوبہ بندی ہی تو ہے، جو اپنے خاموش ہاتھوں سے نسل انسانی کی تحدید کرتی جارہی ہے۔

جن ملکوں اور قوموں نے خاندانی منصوبہ بندی کے اس نسخہ کو آزمایا ہے، وہ اس کے مضر پہلوؤں کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں، افرادی وسائل کی کمی، زنا اور بدکاری کی کثرت اور اس کی وجہ سے امراض خبیثہ کی بہتات، بے اولاد یا کم اولاد ہونے کی وجہ سے زوجین میں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی قوت کا فقدان اور اس کی وجہ سے طلاق کی کثرت، شرح پیدائش اور نکاح کے رجحان میں کمی، یہ وہ نتائج ہیں، جن سے آج مغربی اقوام دوچار ہیں، تو کیا ہم نوشتۂ دیوار کو پڑھنے اور انسان کی خود ساختہ خاندانی منصوبہ بندی کے بجائے خدائی منصوبہ بندی کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہیں؟

(۳۱ر جولائی ۱۹۹۸ء)

تمباکونوشی ــــ اسلامی نقطۂ نظر

۲۱؍فروری کے اخبار میں یہ خوش کن خبر دیکھنے کو ملی کہ حکومت آندھرا پردیش گٹکھا پر پابندی عائد کررہی ہے، کوئی بھی پان مصالحہ گٹکھا کا مہر کے ساتھ اب ممنوع ہوگا، حکومت کے اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ ۱۹۹۷ء میں 8.56 فیصد منہ کے کینسر کے مریض تھے، 2000ء میں یہ تعداد بڑھ کر 21.43 فیصد ہوگئی، جو دراصل گٹکھا کی خراب عادت کا نتیجہ ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ بُری عادت کس طرح بہ تدریج معاشرہ میں سرایت کرتی جارہی ہے، اور کتنے ہی لوگوں کے خون سے اپنی پیاس بجھارہی ہے۔

تمباکو خواہ کسی بھی صورت میں ہو، صحت کے لئے سخت نقصان دہ اور مضرت رساں ہے۔ عالمی صحت تنظیم کی رپورٹ کے مطابق ہر سال تمباکوخوری کی وجہ سے تقریباً ۳۰؍لاکھ افراد کی اموات واقع ہوجاتی ہے، جن میں ۲۰؍لاکھ اموات کا تعلق ترقی یافتہ ممالک سے ہے، یہ بیس ویں صدی کے دسویں دہے کے وسط کی رپورٹ ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر تمباکونوشی کا یہ رجحان باقی رہا تو ۲۰۲۵ء تک دنیا بھر میں سالانہ ایک کروڑ اموات ہوسکتی ہیں، یہ ایسا بھیانک خطرہ ہے جو کسی خون ریز جنگ کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء امریکہ کی سرزمین سے ہوئی ہے، ۱۵؍ویں صدی کے اخیر میں کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا، وہاں کولمبس نے سب سے پہلے اصل امریکی باشندوں جن کو اس نے ریڈ انڈیا کا نام دیا، کو تمباکو پیتے ہوئے دیکھا تھا، اس وقت ایشیا، یورپ اور افریقہ کے لوگ اس سے قطعاً ناواقف تھے، پھر یہ بلا امریکہ سے اسپین اور پرتگال پہنچی، پرتگال سے اس نے فرانس کا سفر طے کیا، اور فرانس نے اس کی کاشت کو فروغ دینے اور اسے مقبول عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا، یورپ ہی کے ذریعہ ایشیا تک اس کی رسائی ہوئی، اور اس وقت تقریباً سو ممالک میں تمباکو کی باضابطہ

کاشت کی جاتی ہے۔

چین اور امریکہ کے بعد تمباکو کی سب سے زیادہ کاشت ہمارے ملک ہندوستان ہی میں ہوتی ہے، حکومت کو تمباکو کے ٹیکس سے سالانہ ایک عرب پچاس کروڑ ڈالر ملتے ہیں، ایک اندازہ کے مطابق ہمارے ملک میں ۵۲/کروڑ کیلوگرام تمباکو پیدا کیا جاتا ہے، اس میں سے نصف مقدار برآمد کردی جاتی ہے، اور باقی ہندوستان ہی میں مختلف صورتوں میں استعمال کی جاتی ہے، ۱۵/لاکھ کسان تمباکو اگاتے ہیں، ۱۰/لاکھ تمباکو فارم ہیں، جس میں ۵۰/لاکھ افراد کام کرتے ہیں،

ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ تمباکو کی ابتداء جنوب کے علاقہ سے ہوئی، کیوں کہ انگریز ہندوستان میں اسی طرف سے داخل ہوئے تھے، ایک صاحبِ علم اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> امریکہ کا جنگلی تمباکو آج کل بھی بمبئی، ٹراونکور اور لنکا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، مآثر رحیمی میں رقم ہے کہ تمباکو پہلے دکن میں آیا، اور وہاں سے اکبر کے زمانہ میں شمالی مشرقی ہند میں پہنچا، (خواص تمباکو: ۱۳/۱۴)

تمباکو خوری کی خُو ایسی ہوتی ہے کہ اس کو چھوڑنا آسان نہیں ہوتا، ایسا نہیں ہے کہ زمانۂ قدیم میں لوگ تمباکو کی مضرتوں سے واقف نہ رہے ہوں، تمباکو کی تاریخ جتنی قدیم ہے تمباکو کی مضرت کا احساس بھی اسی قدر قدیم رہا ہے، سرکاری طور پر اس کے مضرِ صحت ہونے کا اعلان پہلی دفعہ ۱۶۰۴ء میں فرمان روائے برطانیہ جیمس اول نے کیا، اور پھر اس کے نقصانات دن بہ دن لوگوں پر واضح ہوتے چلے گئے، ۱۸۵۹ء میں فرانس کی وہ رپورٹ سامنے آئی جس میں ایک ہسپتال میں کینسر کے مریضوں کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں جس کے مطابق پیٹ، گلے اور منہ کے کینسر کے کل مریضوں کی تعداد ۶۶/تھی، اور یہ سبھی تمباکو کو استعمال کرنے والے لوگ تھے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سگریٹ نوشی میں بہت اضافہ ہوگیا، اور اس عادت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ۱۹۶۴ء میں امریکہ کی ایک تنظیم کی جانب

سے دو سالہ تحقیقات کا نتیجہ پیش کیا گیا، جس میں بتایا گیا کہ امریکی مردوں میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں میں ستر فیصد شرح اموات کا اضافہ ہوگیا ہے، امریکہ میں جو تمباکو جنم واتا ہے، تمباکو نوشی کے روک تھام کے لئے بہت سی کوششیں بھی کی گئی ہیں، سب سے پہلے امریکہ ہی میں ۱۹۶۶ء میں سگریٹ کے پیکٹوں پر تمباکو کے مضر صحت ہونے کی عبارت لکھنی لازم قرار دی گئی اور یکم جنوری ۱۹۶۶ء سے اس کا نفاذ ہوا، یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے سگریٹ کا اشتہار ٹی وی پر بند کر دیا گیا، لیکن ان کوششوں کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ۱۹۹۱ء میں تمباکو نوش کی وجہ سے ساڑھے تین لاکھ افراد کی موت واقع ہوگئی اور خود ہندوستان میں ہر سال آٹھ لاکھ افراد تمباکو نوشی کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت جو مشہور مذاہب پائے جاتے ہیں، ان سب کے مذہبی پیشواؤں نے تمباکو نوشی کی مذمت کی ہے، ہندو مذہبی کتابوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے، سکھوں کے دسویں گرو گرو گوبند سنگھ نے تو اپنے متبعین کے لئے تمباکو کی بہت ہی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے، جس پر سکھ فرقہ کا عمل بھی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر اس سلسلہ میں واضح ہے، قرآن مجید نے کچھ بنیادی اصول حلال وحرام ہونے کے سلسلہ میں بتایا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ پاک وطیب ہیں، وہ حلال ہیں، اور جو خبیث ہو وہ حرام ہیں: **''یحل لهم الطيبٰت ويحرم عليهم الخبائث''** (الأعراف: ۱۵۷) خبیث سے ایسی چیزیں مراد ہیں، جس کو سلیم طبیعتیں ناپسند کرتی ہوں: **تستخبثه الطباع السليمه و تنفر منه** (التفسیر الوجیز للزحیلی ۱۷۱/۱) ___ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تمباکو کی ہر صورت عموماً اور گٹکھے کی یہ نئی شکل خصوصاً ثقہ اور شریف لوگوں کی نگاہ میں نہایت ناپسندیدہ اور مذموم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لے: **''لاتلقوا بايديكم الى التهلكة''** (البقرۃ: ۱۹۵) ___ اور اس طرح کی چیزوں کا استعمال انسان کو ہلاکت سے قریب اور مہلک بیماریوں میں مبتلاء کر دیتا ہے،

پھراس سے انسان کوکسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں، نہ اس سے بھوک دور ہوسکتی ہے، نہ اس سے دل ودماغ کوجلاء حاصل ہوتی ہے، اور نہ کسی حصہ جسم کواس سے کوئی نفع پہونچتا ہے، اوراس مضر صحت خو کی وجہ سے انسان اپنی گاڑھی کمائی اس بے فائدہ کام میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے، اس لئے یہ خرچ یقیناً فضول خرچی میں داخل ہے اور اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی کو منع فرمایا ہے: **ولا تسرفوا** (الانعام:۱۴۱)— بلکہ فضول خرچی کرنے والے کوشیطان کا بھائی قرار دیا گیا: ''**ان المبذرين كانوا اخوان الشياطين**'' (الاسراء:۲۷)

رسول اللہ ﷺ نے ہر ایسی چیز سے منع فرمایا ہے، جو انسان کونشہ میں مبتلاء کرنے والی، یااس کے جسم کوکمزوراوراس کی صحت کومتاثر کرنے والی ہو: **نهى رسول الله ﷺ عن كل مسكر ومفتر** (الحدیث) — گٹکھا بھی یقیناً مفتر چیزوں میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیزوں سے بھی منع فرمایا جومضرت رساں ہو، خواہ اس کی ذات کے لئے یادوسروں کے لئے: ''**لاضرروا لاضرار**'' گٹکھا اور سگریٹ وغیرہ خوداس کے لئے ضرررساں ہے اوراس کادھواں دوسروں کوبھی نقصان میں مبتلاء کرتا ہے۔

اسی لئے بعض فقہاء نے تمبا کوحرام اور بعض نے مکروہ تحریمی قرار دیا ہے، علامہ علاء الدین حصکفیؒ رقمطراز ہیں:

> " **وكذا تحرم جوزة الطيب وكذا النتن الذى شاع في زماننا ولاسيما بعد نهى ولى الامر نصره الله .**"
>
> (الدر المنتقی علی ہامش مجمع الانہر ۵۳۲/۲، کتاب الاشربہ)
>
> '' ایسا ہی جائفل اور تمباکو جو ہمارے زمانہ میں عام ہوگیا ہے، حرام ہے، خاص کر سلطان (اللہ ان کی مدد کرے) کی طرف سے ممانعت کافرمان جاری ہونے کے بعد۔''

گو اکثر علماءِ احناف نے اور ہندوستان میں ماضی قریب کے اہلِ علم نے تمبا کو مباح یاصرف مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، لیکن ایسااس وجہ سے کہ تمبا کو کے استعمال کی متنوعہ صورتیں، اس میں پائے جانے والے زہرناک اجزاء اور صحت کے لئے اس کا شدید

مضرت رساں ہونا، ان حضرات کے سامنے غالباً نہیں آ پایا تھا، خاص کر گٹکھے کی مضرت اور اس کی وجہ سے منھ میں کینسر کا پیدا ہونا، اور ہونٹوں کی وضع کا سکڑ جانا ایک عام مشاہدہ ہے، اس لئے اس کو خبائث میں شمار کیا جانا چاہئے، جو لوگ گٹکھے استعمال کرتے ہیں وہ بھی اپنے اس عمل کو اپنے بزرگوں کی نظر سے چھپاتے ہیں اور مہذب و شائستہ مجالس میں اس کے ارتکاب سے گریز کرتے ہیں، یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ سلیم طبیعتوں کے لئے یہ ایک ناگوار شئی ہے۔

اس لئے گٹکھا اور اس طرح کے مضرت رساں تمباکو کی مصنوعات کو یوں تو حرام ہونا چاہئے، لیکن اگر از راہِ احتیاط حرام نہ کہا جائے، تو یہ مکروہ تحریمی اور قریب بہ حرام ضرور ہیں، حکومت کا یہ اقدام خوش آئند اقدام ہے، ہمیں اس کو سراہنا چاہئے، جو لوگ اپنے آپ کو ملک و قوم کے بہی خواہ اور محبِّ وطن کہتے ہیں، ان کو لوگوں میں نفرت کی سوداگری کرنے کے بجائے ایسی چیزوں کے خلاف مہم جوئی کرنی چاہئے، اور سماج میں انسانوں سے نفرت کے بجائے مہلک انسانیت چیزوں سے نفرت کی تعلیم دے، تو یہ واقعی حب الوطنی کا صحیح ثبوت ہوگا۔

(یکم مارچ ۲۰۰۲ء)

پتی میں خون کی آمیزش

جام و مینا اور بادۂ و ساغر ہمیشہ شاعروں کا محبوب اور ممدوح رہا ہے اور اکثر شعراء اس کے اسیر زلف رہے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مرتے مرتے بھی ہمارے شاعروں کو شراب و کباب کی یاد تڑپاتی اور ترساتی رہتی تھی، چچا غالب تو کہہ گئے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دَم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہاں تک کہ جو لوگ دہن سے شراب کو نہیں لگاتے تھے وہ بھی اپنی شاعری کو ضرور ہی اس سے خمار آلود کرتے تھے، جب ہی تو ریاض خیر آبادی جیسے زاہد مزاج شاعر کے یہاں بادۂ و مے کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے، بلکہ کہنے والے نے کہا کہ:

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

یہاں تک کہ مرزا حالی کو اردو شعراء سے گلہ کرنا پڑا کہ ان کی شاعری تاڑی کی دکان ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''رندان خوش مذاق'' کو چائے کی طرف کم توجہ ہوئی، کم سے کم اردو شعراء کے دیوان میں شاید ہی چائے کے بارے میں پانچ دس اشعار بھی مل سکیں، کیوں کہ اس میخانہ میں شراب طہور کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں تھی، ایک ملحد شاعر نے چائے پر کچھ کہا بھی، تو اس کو بھی ''الحاد'' سے آلودہ کر کے، کہ :

وہ تو کہیے عرب میں چائے نہ تھی
ورنہ وہ بھی حرام ہو جاتی

لیکن لگتا ہے کہ شاعر کا یہ اندیشہ اب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے!

اس خبر نے یقیناً چائے پینے، پلانے اور بیچنے اور خریدنے والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا ہوگا کہ بعض کمپنیاں چائے کو خوش رنگ بنانے کے لئے اس میں خون اور گوشت کے رس

کی آمیزش کر رہی تھیں، اور بی جے پی حکومت جو بانگِ دہل اپنے آپ کو ہندو فکر اور ہندو ثقافت کا ترجمان کہتی ہے، اور اس فلسفہ پر یقین رکھتی ہے کہ انسانی ضرورت کے لئے بھی حیوانات کو ذبح نہیں کرنا چاہئے، اور انسان کو لحمی غذاؤں کے بجائے جو حیوانات سے حاصل ہوتی ہیں، ساگ سبزی پر اکتفا کرنا چاہئے (اسی ضمن میں گاؤ کشی بند کرنے کی بات بھی بڑی قوت کے ساتھ کہی جاتی ہے، اور اس کے لئے تحریکیں چلائی جاتی ہیں) نے اس کے لئے پروانۂ اجازت بھی دے دیا تھا۔

باعثِ تعجب اُمر یہ ہے کہ خون کی آمیزش کے معاملہ میں کسی جانور کی تخصیص بھی نہیں، ذبیحہ ہو یا مردار، اور گائے ہو یا خنزیر، میں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی تو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی یاد آئی، اس تحریک کو جس خبر یا افواہ نے قوت پہونچائی، وہ یہی تھی کہ بندوق کے کارتوس جسے غالباً دانت سے کھینچنا پڑتا تھا، اس پر خنزیر کی چربی لگائی جاتی ہے، یہ خبر ایک آگ بن گئی، ایسی آگ جو بنگال سے اٹھی اور میرٹھ ہوتے ہوئے آتش فشاں بن کر دہلی پر ٹوٹ پڑی، لیکن آزاد ہندوستان میں آج کے اس واقعہ نے کوئی چنگاری بھی پیدا نہیں کی، کیوں کہ مال و متاع اور معاشی ترقی کی حرص نے ملک سے اس کی غیرت کا سودا کرلیا ہے، اب بیرونی کمپنیاں صنعت و تجارت کی آڑ میں ہماری فکر پر وار کرسکتی ہیں، ہماری ثقافت کو تباہ و برباد کرسکتی ہیں، اور ہماری اس آزادی پر قہقہہ زن ہیں کہ عہد غلامی میں جو غیرت تھی، آزادی کی اس زندگی میں ہم اس سے بھی محروم ہیں۔

خون ایک ناپاک شئی ہے، قرآن مجید نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ خون کے ناپاک ہونے کا ذکر کیا ہے (النحل: ۱۱۵) اور غالباً اس کے ناپاک اور حرام ہونے پر تمام ہی مذاہب متفق ہیں، اسلامی شریعت میں اگر جانور کو شرعی طریقہ پر ذبح کیا جائے، تو اس کا پورا وجود حلال اور پاک ہوجاتا ہے، لیکن سات اجزاء وہ ہیں، کہ اس کے باوجود حرام رہتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان ہی میں سے ایک خون ہے، حلال جانوروں کا گوشت چوں کہ ذبح کی وجہ سے پاک ہوجاتا ہے، اس لئے اس سے حاصل کیا گیا رس بھی اسلامی نقطۂ نظر سے پاک اور حلال ہے۔ لیکن حرام جانور کا کوئی بھی

جزء حرام ہی ہے، بعض صورتوں میں اس کا خارجی استعمال تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کھانے پینے کی اشیاء میں کسی طور اس کا استعمال درست نہیں، خنزیر کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ سراپا نجاست ہے، اس کے کسی جزء کا جسم کے خارجی حصہ میں بھی استعمال کرنا اضطرار کی کیفیت کے بغیر جائز نہیں۔

پھر چائے ایسی جامد شئی ہے، جس میں سیّال مادہ کو جذب کرنے کی بہت صلاحیت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون چائے میں ملایا جائے، تو چائے اسے اپنے اندر پوری طرح سمو لیتی ہے، ایسی جذب کی صلاحیت رکھنے والی شئی میں اگر کوئی ناپاک چیز مل جائے، تو بعض فقہاء کے نزدیک اسے پاک کرنے کی کوئی صورت نہیں، اور بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اسے تین بار پانی میں ابالا یا پھلایا جائے، اور ہر بار ابالنے سے پہلے خشک کر لیا جائے، تب ہی وہ پاک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر پتی کو اس مرحلہ سے تین بار گذارا جائے، تو کیا خاک اس میں خوش ذائقی اور خوش رنگی باقی رہے گی؟ فقہاء کے یہاں ایک مسئلہ خون میں رنگے ہوئے کپڑوں کا ملتا ہے، جس سے چائے کے مسئلہ پر زیادہ وضاحت کے ساتھ روشنی پڑتی ہے، مشہور فقیہہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

" ثم قال سیدی عبد الغنی و هذا بخلاف المصبوغ بالدم کالثیاب الحمر التی تجلب فی زماننا عن دیار بکر فلا تطهر ابدا مالم یخرج الماء صافیا و یعفی من اللون ."

(ردالمحتار: ۲۲۱،۲۴۲/۱)

"میرے بزرگ شیخ عبد الغنی نے فرمایا کہ یہ صورت اس صورت کے برخلاف ہے جب کہ کوئی چیز خون میں رنگی جائے، جیسے وہ سرخ کپڑے، جو ہمارے زمانہ میں دیار بکر کے علاقے سے لایا جاتا ہے، کہ جب تک اس کپڑے سے صاف پانی نہ نکلنے لگے، اور رنگ سے بالکل خالی نہ ہو جائے، وہ کپڑے قطعاً پاک نہیں ہو سکتے"

اس لئے حاصل یہی ہے کہ چائے میں اگر اس طرح کی کوئی ناپاک شئی مل جائے،

تو شرعاً وہ نا قابلِ استعمال ہے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہو سکتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ فقہی نقطۂ نظر سے کسی شئی میں تغیر کی دو صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ اپنے وجود کو باقی رکھتے ہوئے دوسری چیز کے ساتھ مل جائے، اور دونوں خلط ملط ہو جائیں، اس صورت میں اس شئی کا حکم باقی رہتا ہے، مثلاً پانی میں پیشاب مل جائے، تو پیشاب کے اجزاء پانی کی معمولی مقدار میں اپنے اثرات کے ساتھ باقی رہتے ہیں، اس لئے پیشاب کا حکم باقی رہے گا، اور وہ ناپاک ہی سمجھا جائے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ شئی اپنی حقیقت کو کھو دے، اور اس کا وجود ہی باقی نہ رہے، جیسے گوبر آگ میں جلایا جائے اور راکھ ہو جائے، کسی نشہ آور مشروب میں نمک ڈال کر اسے سرکہ بنا دیا جائے، اور نشہ پیدا کرنے کی جو کیفیت اس مشروب میں تھی جس سے اس کی شناخت اور پہچان تھی، وہ کیفیت ہی مفقود ہو جائے، تو یہ کیفیت حقیقت کی تبدیلی سے عبارت ہے، اس لئے اس میں حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا گوبر ناپاک ہے اور اس کی راکھ پاک، نشہ آور مشروب ناپاک ہے اور اس کا بنا ہوا سرکہ پاک اور حلال۔

پتی میں اگر خون ملایا جائے تو اس سے خون کی حقیقت اور ماہیت بدل نہیں جاتی، بلکہ وہ اپنے خواص کے ساتھ باقی رہتا ہے، اسی لئے چائے کے رنگ اور ذائقہ پر اس کا اثر پڑتا ہے، اس لئے اس پہلو سے بھی ایسی پتی ناپاک اور حرام ہی ہوگی۔

وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ چند ہی دنوں بعد تاجران چائے کی جانب سے یہ وضاحت آگئی کہ خون کی آمیزش اور حکومت کی جانب سے اس کی اجازت کا تعلق صرف بین الاقوامی کمپنیوں سے ہے، نہ کہ دیسی کمپنیوں سے، اس خبر نے یقیناً چائے پینے والوں کو سہارا دیا ہوگا، اور ایک حد تک انہیں اطمینان ہوا ہوگا۔ فقہی نقطۂ نظر سے جب صاحب معاملہ کوئی اطلاع دے، یا بیچنے والا اپنے سامان کے بارے میں حلال و جائز ہونے کی خبر، تو اس کی خبر معتبر ہوگی، اور اس پر اعتماد کرنا درست ہوگا، اس پس منظر میں ایسی کمپنیوں کی پتی استعمال کی جاسکتی ہے۔

اس واقعہ کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہم ہیں، اول یہ کہ پتی کے بارے میں اس

انکشاف پر زیادہ تر آواز ہندو انتہاء پسندوں اور بنیاد پرستوں نے اٹھائی، مسلمان قائدین زیادہ تر اس پر خاموش رہے، چاہے یہ ان کی بے شعوری کی وجہ سے ہو یا کم ہمتی کی وجہ سے، بہر حال! یہ افسوس ناک بات ہے، افسوس کہ مسلمانوں میں جو لوگ بام اقتدار پر چڑھتے ہیں، وہ اپنے اقتدار کی حفاظت کو زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں، اور دین اور امت کی حفاظت کو کم، حالاں کہ یہ مسلمان ہی ہیں، جو ان کے لئے سیڑھی کا کام کرتے ہیں ___ دوسرا خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ نے عام مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑا دی، خود راقم الحروف کو کتنے ہی بھائیوں نے فون کیا، خطوط لکھے، اور بالمشافہہ ملاقات کی، بلکہ بعضوں نے چائے سے احتیاط برتنی شروع کردی، اور یقیناً دوسرے اہل علم اور ارباب افتاء کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی کتاب وسنت اور اپنے دین و مذہب سے عام مسلمانوں کا گہرا رشتہ ہے، وہ قدم قدم پر حلال وحرام کو سوچتا ہے، وہ مسجد میں عبادت کیلئے آیا ہو، یا دکان میں تجارت کے لئے بیٹھا ہو، وہ کہیں ملازم اور نوکر ہو، یا ذمہ دار وعہدیدار، رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کا معاملہ ہو یا پڑوسیوں کے ساتھ، نکاح وطلاق کا مسئلہ ہو یا ترکہ و میراث کا، آج بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد زندگی کے ان مسائل میں علماء اور ارباب افتاء کی طرف رجوع کرتی ہے، شاید ہی کسی اور قوم میں اپنے دین اور اپنی شریعت سے ایسا گہرا ربط وتعلق پایا جاتا ہو، یہ یقیناً مقام شکر بھی ہے اور موقعۂ دعاء بھی کہ اللہ تعالیٰ امت میں اس کیفیت کو باقی رکھے!

(۱۸؍ اگست ۲۰۰۰ء)

دستخط ـــــ اسلامی احکام

''دستخط'' کے اصل معنی ہاتھ کی تحریر کے ہیں، لیکن اصطلاح میں دستخط کرنا اپنا نام لکھنے کو کہتے ہیں۔ نام لکھنے کی ایک صورت یہ ہے کہ سادہ طریقہ پر اپنا نام تحریر کر دیا جائے، جس کی نقل دوسروں کے لئے دشواری کا باعث نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس انداز پر نام لکھا جائے کہ اس کی نقل ایک گونہ دشوار ہو، گویا یہ ایک علامتی تحریر ہے، جو دستخط کرنے والے کی جانب سے کسی بات کی تصدیق وتوثیق کو ظاہر کرتی ہے، ایسی ہی تحریر کو عرفِ عام میں ''دستخط'' کہتے ہیں۔

ایک زمانہ میں اس مقصد کے لئے مہر (Stamp) کا استعمال ہوا کرتا تھا۔ یہ مہر انگوٹھی میں بنائی جاتی تھی۔ ممکن ہے کہ انگوٹھی میں مہر بنانے کا مقصد اس کی حفاظت ہو، کیوں کہ انگوٹھی ہر وقت آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اسے چوری کرنا آسان نہیں، اسی لئے عربی زبان میں انگوٹھی کے لئے خاتم کا لفظ معروف ہوگیا، حالاں کہ ''ختم'' کے اصل معنی مہر لگانے کے ہیں اور قرآن میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (البقرۃ:۷) صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں اور اہلِ مکہ کے درمیان ایک محدود مدت کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوگیا اور آپ ﷺ کو دعوتِ اسلام کی طرف یکسوئی کے ساتھ توجہ کا موقع ملا، تو آپ ﷺ نے شاہانِ عجم اور رؤساءِ عرب کو دعوتی خطوط بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ اس موقع سے بعض حضرات نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یہ حضرات مہر کے بغیر خطوط کو قبول نہیں کرتے، چنانچہ آپ ﷺ نے مہر بنوائی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ کیا گیا اور آپ ﷺ نے کمالِ احترام کا لحاظ کرتے ہوئے نیچے ''محمد''، اس کے اوپر ''رسول'' اور سب سے اوپر ''اللہ'' کے کلمات لکھے۔ (بخاری:۳؍۸۷۳)

آپ ﷺ کا یہ عمل گویا دستخط کی اصل ہے۔ دستخط کا مقصود چوں کہ کسی تحریر کے تشخص

اور استناد کو ظاہر کرنا ہے۔ یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تحریر اسی شخص کی ہے اور مذکورہ شخص کی طرف اس کی نسبت قابلِ اعتماد و اعتبار ہے، اس لئے دستخط ایسا کرنا چاہئے، جس کی نقل ایک حد تک مشکل ہو اور اس کی تحریر کا تشخص محفوظ رہے، کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو بد قماش لوگ اس کے مصنوعی دستخط کا سہارا لے کر تلبیس اور دھوکہ دہی سے کام لے کر دوسروں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ البتہ دستخط اتنا غیر واضح اور پیچ در پیچ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ صاحبِ دستخط کا نام ہی معلوم نہ ہو سکے اور پہلے سے نام معلوم نہ ہو تو دستخط میں اس نام کو پہچاننا دشوار ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو اس بات سے منع فرمایا تھا کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی کے نقش پر لوگ اپنی انگوٹھیاں بنائیں۔ (بخاری ومسلم عن ابن عمرؓ) اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے دستخط کی نقل کرنا یا اپنے دستخط کو اس سانچے میں ڈھالنا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ اس کے تشخص کو مجروح کرنا ہے، اور اس سے تلبیس اور دھوکہ دہی کا راستہ کھل سکتا ہے، بلکہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں کہ مہر اور دستخط کی نقل کر کے کسی شخص کی طرف خلافِ واقعہ بات منسوب کر دی گئی اور اس کو ظلم و جور اور افترا پردازی کا ذریعہ بنایا گیا۔

ظاہر ہے کہ شریعت میں دھوکہ دینا سخت گناہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ دہی انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے، ''**الخديعة فى النار**'' (بخاری ۱/۲۸۷ باب النجش) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ جو دھوکہ دے اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ''**من غش فليس منا**'' (ترمذی ۱/۲۴۵) اور جو چیز گناہ اور حرام کا ذریعہ بنتی ہو وہ خود بھی گناہ اور حرام ہے۔ پس دستخط کی نقل چوں کہ تلبیس اور دھوکہ دہی کا ذریعہ بن سکتی ہے، غلط دستخط کر کے حقوق چھینے جا سکتے ہیں، کسی شخص پر غیر واقعی ذمہ داریاں عائد کی جا سکتی ہیں اور کسی شخص کی طرف ایسی بات کو منسوب کیا جا سکتا ہے جس سے وہ بری الذمہ ہے اور جو بات کسی خلافِ شرع کام کا ذریعہ بنتی ہے وہ خود بھی ناجائز ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دستخط کی نقل جائز نہیں اور اس سے خوب اجتناب کرنا چاہئے۔

دستخط سے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ شریعت میں کس حد تک دستخط کا اعتبار

ہے؟ اس سلسلہ میں فی الجملہ دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، کیوں کہ آپ ﷺ نے اپنے خطوط پر مہر لگائی ہے، جو دستخط کے قائم مقام ہے، اگر اس کا اعتبار نہ ہوتا اور شریعت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تو آپ ﷺ نے مہر لگانے کا اہتمام نہ فرمایا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مقدمات اور نزاعی معاملات میں بھی دستخط کو ثبوت کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اہم اور علماء کے غور و فکر کا محتاج ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ حدود و قصاص -- یعنی ان سنگین جرائم سے متعلق مقدمات جن کی سزائیں شریعت میں معین و مقرر ہیں -- میں محض دستخط کی وجہ سے جرم ثابت نہیں ہوتا، اگر مطلوبہ گواہی موجود نہ ہو یا اس نے عدالت میں اپنے جرم کا اقرار نہ کیا ہو، البتہ دوسرے معاملات بالخصوص مالی مقدمات میں دستخط بھی ثبوت کی فراہمی کے لئے کافی ہو سکتا ہے کیوں کہ اسبابِ قضاء میں سے ایک ''قرائن قاطعہ'' بھی ہے (البحر الرائق: ۲۰۵/۷) یعنی کسی واقعہ پر ٹھوس اور واضح علامتوں کا موجود ہونا، دستخط بھی ایسی ہی علامتوں میں سے ہے۔

فقہاء کے یہاں بھی ہمیں اس سلسلہ میں بعض نظیریں ملتی ہیں۔ تحریر کس حد تک کس معاملہ کے ثبوت پر دلیل ہو سکتی ہے؟ اسلام کے عدالتی قوانین میں اس پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے (دیکھئے: تبصرۃ الحکام ۳۵۹/۱) اور فی الجملہ تحریر کو بھی ثبوت کا ایک ذریعہ تسلیم کیا گیا ہے، اس سے ''دستخط'' کے مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر دستخط سے قاضی کو اس تحریر کے درست ہونے کا بھروسہ ہو جائے اور ایسی وجوہ موجود ہوں جو اس تحریر کے معتبر ہونے کا تقاضا کرتی ہوں، تو دستخط کی وجہ سے وہ دستاویز اور اقرار نامہ معتبر ہوگا، اسی لئے قرآن مجید نے دین کو لکھ لینے کا حکم دیا ہے (بقرہ: ۲۸۲) اگر تحریر کی اہمیت نہیں ہوتی تو اس حکم کا کوئی معنی نہیں اور جب عام تحریر بھی معتبر ہے تو دستخط کا معتبر ہونا تو ظاہر ہے، اسی لئے اسلام کے قانونِ قضاء کے مشہور عالم قاضی ابن فرحون مالکیؒ (م ۷۹۹ھ) نے وثیقہ یعنی دستاویز کی شہادت کی اساس پر فیصلہ کرنے کا ذکر کیا ہے (تبصرۃ الحکام علی ہامش فتح العلی المالک ۸۲-۸۳/۲) پس خلاصہ یہ ہے کہ ایسی تحریریں جو دستخط سے مزین ہوں، شرعاً معتبر ہیں الا یہ کہ اس میں تلبیس

پائے جانے کی کوئی قوی وجہ موجود ہو۔

دستخط کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس بات کی تصدیق مقصود ہو اس کے نیچے دستخط کیا جائے، اسی طرح خطوط و مراسلات میں بھی مکتوب نویس اپنا دستخط نیچے کرے، جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے مکتوبات میں نیچے مہر لگائی ہے۔ دراصل دستخط اور مہر کا مقصود سلسلۂ کلام کو وہاں ختم کرنے کے ہیں اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ آگے اس میں جو بھی اضافہ ہوگا وہ صاحبِ تحریر کی طرف سے تصدیق شدہ نہیں ہے، اسی لئے آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کے اختتام کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن مجید میں ''خاتم النبیین'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (احزاب: ۴۰)

جو حکم دستخط کا ہے قریب قریب وہی احکام نشانِ ابہام، مہر اور لیٹر اور لیٹر پیڈ کے بھی ہیں۔ البتہ مہر اور لیٹر پیڈ میں بہ مقابلہ دستخط کے تلبیس اور دھوکہ دہی کا اندیشہ زیادہ ہے، کیوں کہ ان کی نقل آسان ہے، اس لئے اعتماد واعتبار کے لحاظ سے بھی ان کا درجہ دستخط سے کم ہے۔ نشانِ ابہام میں دھوکہ دہی کا امکان بہت کم ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے انگوٹھے کے نشانات کو دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، بظاہر انسان اس معاملہ میں دوسرے کی نقل کرنے پر قادر نہیں، اس لئے یہ زیادہ قابلِ بھروسہ ہے۔ اسی لئے یہ بات بہتر ہے کہ اہم معاملات کی دستاویزوں پر دستخط کے ساتھ ساتھ نشانِ ابہام بھی لے لیا جائے۔

آدمی کا ہر عمل اس کے مزاج و مذاق کا آئینہ دار ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص تیز تیز چلتا ہو، تو یہ اس کے عجلت پسند ہونے کی علامت ہے، کوئی شخص اپنی موچھیں اونچی کرتا ہو تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس کے مزاج میں عُجب اور تکبر ہوگا، چال ڈھال، گفتار و رفتار اور نشست و برخاست کی طرح آدمی کی تحریر بھی اس کی اندرونی کیفیات کی غماز ہوتی ہے۔ اسی لئے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ آدمی کا دستخط بھی اس کی اندرونی کیفیت اور صلاحیت کا عکس ہے۔ بعض لوگ اپنے دستخط اس طرح کرتے ہیں کہ گویا پھول بنا رہے ہیں، بعض لوگوں کا دستخط تلوار یا کسی ہتھیار کے مماثل ہوتا ہے، بعض دستخط بہت پر پیچ ہوتے ہیں، بعض ایسے جن سے کوئی نام ہی نہ سمجھا جاسکے اور بعض اتنے سادہ کہ گویا عام طریقہ پر

نام لکھ دیا گیا ہو۔ یہ آدمی کے جمالیاتی ذوق، حلم یا غضب، فکر و عمل کی صداقت یا نفاق، نیز ذہانت و غباوت کی کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں، لیکن دستخطوں کے ذریعہ کسی شخصیت کے بارے میں قطعی رائے قائم کرنا دشوار ہے، کیوں کہ اکثر اوقات لوگ اپنی محبوب شخصیتوں کے دستخط کی نقل کرنا چاہتے ہیں اور تھوڑی تبدیلی کے ساتھ اسی کو اختیار کرتے ہیں، گویا یہ ان کا طبع زاد دستخط نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک طرح کی نقل ہے۔ ظاہر ہے اس کو دستخط کرنے والے کی اپنی اندرونی کیفیت کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لئے محض دستخط کو کسی شخص کے مزاج اور صلاحیت کو سمجھنے کا ذریعہ تصور کرنا درست نہیں کہ اس سے بدگمانی اور غلط فہمی کا دروازہ کھل سکتا ہے اور کسی مسلمان بلکہ بلاوجہ کسی انسان سے بھی ''سوءِ ظن'' درست نہیں۔

(۲۳/اکتوبر ۱۹۹۸ء)

قرض —— فضائل ومسائل

اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں اپنے بندوں کے درمیان فرق کیا ہے، اور یکسانیت نہیں برتی ہے، یہی نابرابری ہے جس سے کائنات کا نظام جاری وساری ہے، اگر یہ نابرابری نہ ہوتی تو نہ کوئی شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کا محتاج ہوتا، اور نہ کسی سرمایہ دار کو کوئی مزدور اور کارکن ہاتھ آتا۔ یہی احتیاج اور ضرورت بعض اوقات انسان کو قرض کے لین دین پر مجبور کرتی ہے، اگر جائز طریقے پر اہلِ ثروت اپنے غریب بھائیوں کو قرض دیدیں تو خود بخود سود کا راستہ بند ہو جائے، افسوس کہ ایک تو مسلمانوں میں یہ برادرانہ اسپرٹ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے زائد از ضرورت مال میں دوسرے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں، اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کریں، اور نہ لوگ قرض کے احکام ومسائل ہی سے واقف ہوں۔

قرض کے لین دین کا ثبوت قرآن سے بھی ہے اور حدیث سے بھی، اور اس پر اجماع واتفاق بھی ہے اور مصلحت انسانی کا تقاضا بھی ہے، قرآن نے اللہ کے راستہ میں انفاق کو "قرض حسن" قرار دیا ہے، (البقرۃ ۲۴۵) اس میں قرض کے جائز بلکہ مستحب اور مطلوب ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، ایک جگہ "دین" کے ساتھ مدت لکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۸۲) دین کا لفظ عام ہے اور قرض بھی اس کے دائرہ میں آتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود ارشاد نبوی ﷺ نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوبار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے (سنن بیہقی: ۳۵۳/۵، ابن ماجہ ۶۰/۲ مع تحقیق: الاعظمی، وفیہ سلیمان وھو متروک) اور بھی متعدد روایتیں ہیں جن میں قرض دینے کی فضیلت وارد ہے، اسی لئے اس کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے (المغنی: ۲۰۷/۴) پھر قرض ایک ایسی مصلحت ہے کہ بہت سے مواقع پر اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لئے اگر اس کی

گنجائش نہ رکھی جائے تو تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا اور نا قابلِ برداشت حرج وتنگی کو دور کرنا شریعت کا ایک اہم ترین مقصد ہے، ارشادِ ربانی ہے: "ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج" (المائدۃ:٦) نیز فرمایا گیا کہ اللہ تم پر آسانی چاہتے ہیں نہ کہ دشواری: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" (البقرۃ:۱۸۵)

قرض لینا گو مباح ہے لیکن قرض دینا مستحب ہے، کیونکہ یہ نیکی اور بھلائی میں تعاون ہے (الشرح الصغیر:۲۹۲/۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرض دین کی فضیلت اوپر مذکور ہو چکی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے جنت کے دروازہ پر شب اسراء میں لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گونہ ہے اور قرض کا اٹھارہ گونہ، میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے استفسار کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں ہے؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ سائل رہنے کے باوجود دست سوال دراز کرتا (اور اس پر صدقہ کیا جاتا ہے) اور قرض کا خواستگار ضرورت ہی پر طلب گار قرض ہوتا ہے، (ابن ماجہ:۵٦/۲، رقم الحدیث:۲۴۳۳) نیز حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ بات کہ میں دو دینار قرض دوں پھر وہ واپس آجائیں اور میں ان کو کسی اور کو قرض دے دوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو صدقہ کردوں۔ (المغنی:۲۰۷/۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ کسی چیز کو قرض دینا اس کے صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ "قرض الشئی خیر من صدقتہ" (سنن بیہقی:۳۵۴/۵)

ان روایات سے نہ صرف قرض کی فضیلت اور اس کا استحباب ظاہر ہوتا ہے، بلکہ مواقع واحوال کے لحاظ سے قرض کا بعض اوقات صدقہ سے بھی زیادہ باعثِ ثواب ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر محتاج کی حاجت مندی کا یقین کر کے اُسے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ صدقہ افضل ہے، لیکن اگر یقینی طور پر اس کا علم نہیں تو قرض کی فضیلت زیادہ ہے، اس لئے کہ جو لوگ خود دار طبیعت کے مالک ہوں وہ مجبوراً ہی قرض کے طالب ہوتے ہیں۔

قرض کے مستحب ہونے کا حکم ظاہر ہے اس وقت ہے جب قرض دہندہ کے علم یا اندازہ کے مطابق قرض کسی جائز ضرورت کے لئے لیا جا رہا ہو، اگر کسی مکروہ یا حرام و

معصیت کے ارتکاب کے لئے قرض لے، تو دانستہ اس مقصد کے لئے قرض دینا درست نہیں، مکروہ میں، تعاون بھی مکروہ، اور حرام کا تعاون بھی حرام ہے، کیونکہ جو حکم مقصد کا ہوتا ہے، وہی حکم ''ذریعہ'' کا بھی ہوتا ہے۔

قرض لینا مباح ہے (المغنی: ۴/۲۰۷) خود آپ ﷺ سے قرض لینا ثابت ہے، البتہ یہ ضروری ہے، کہ جائز مقصد کے لئے قرض لیا جائے، ابن ماجہ میں روایت ہے، کہ اللہ تعالیٰ قرض لینے والے کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک وہ ادا نہ کرلے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے مقصد کے لئے دین حاصل کرے جو اللہ کو ناپسند ہو (ابن ماجہ: ۲/۵۶، رقم الحدیث: ۲۴۳۳) یا اس ارادہ سے قرض کرلے، کہ ادا نہیں کرنا ہے، یہ بھی گناہ کی بات ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں چور شمار کیا جائے گا (حوالۂ سابق، رقم الحدیث: ۲۴۳۴) ایک اور روایت میں ہے کہ جو شخص دوسروں کا پیسہ ڈبانے کے لئے قرض کرلے، اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کردیں گے، (حوالہ سابق: رقم الحدیث: ۲۴۳۶) حضرت میمونہؓ راوی ہیں کہ جو شخص اس ارادہ سے دین لے کہ اسے ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا دین ادا کرا دیں گے، (حوالہ سابق: رقم الحدیث ۲۴۳۲) ——— غرض شدید ضرورت کے بغیر اور غیر شرعی ضرورت کے لئے، نیز عدم ادائیگی کی نیت سے قرض لینا گناہ ہے، جائز مقصد کے لئے، ضرورت کی وجہ سے اور حسبِ وعدہ ادا کرنے کی نیت سے قرض لینا مباح اور جائز ہے۔

اگر مقروض تنگدستی میں مبتلا ہو، تو اس کو مزید مہلت دینی چاہئے، اور ممکن ہو تو کچھ معاف بھی کر دینا چاہئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے (حوالہ سابق: رقم الحدیث: ۲۴۴۴) پھر آپ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ قرض کی ادئیگی کا مطالبہ مناسب طریقے پر کرنا چاہئے۔ (حوالۂ سابق: باب حسن المطالبۃ)

جہاں ایک طرف آپ ﷺ نے قرض دہندہ کو، حسنِ سلوک کی ہدایت دی، وہیں مقروض کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ قرض خواہ کے ساتھ زیادتی نہ کرے، اور بہتر معاملہ رکھے، باوجود استطاعت کے، قرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور ٹال مٹول کو آپ ﷺ نے بہت ناپسند

فرمایا ہے، اور فرمایا کہ یہ چیز، اس کی بے عزتی اور سزا کا جواز پیدا کر دیتی ہے، ''لی الواجد یحل عرضه و عقوبته'' (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۵۲) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے متوفی کے مال میں سے پہلے اس کا دین ادا کرنے کا حکم فرمایا، (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۵۸) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو دَین کی ادائیگی میں بہتر ہو (ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۴۸) ایک حدیث میں وارد ہے کہ مومن کی روح اس کے دین کے ساتھ معلق رہتی ہے، تا آں کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔

(ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۳۷)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس کا انتقال ہو اس پر ایک دینار یا درھم بھی باقی ہو تو اسے اس کی نیکیوں میں سے وصول کیا جائے گا۔

(ابن ماجہ: ۶۰/۲، رقم الحدیث: ۲۴۳۹)

قرض دہندہ کو قرض پر نفع حاصل کرنا اور شرط لگانا کہ مقروض سے اضافہ کے ساتھ واپس کرے حرام ہے، اور سود میں داخل ہے کیونکہ آپ ﷺ نے قرض پر نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایتوں میں اسے سود قرار دیا گیا ''کل قرض جر منفعة فهو ربا'' (دیکھئے: تلخیص الحبیر: ۳۴/۳) اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

مقدار میں اضافہ تو حرام ہے ہی، کیفیت میں عمدگی کی شرط لگانا بھی جائز نہیں، مثلاً معمولی چیز دی اور شرط لگائی کہ اس کے بدلے بہتر چیز واپس کرے، یہ بھی درست نہیں (ھندیہ: ۲۰۲/۳) اگر قرض دہندہ نے شرط تو نہ لگائی لیکن مقروض نے بہ طور خود عمدہ چیز واپس کی یا زیادہ مقدار کے ساتھ واپس کی، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

آج کل بعض ادارے قرض جاری کرتے ہیں اور قرض کے تناسب سے مقروض سے ماہانہ فیس رکنیت وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی جائز نہیں اور یہ بھی سود کے دائرہ میں آتا ہے ایسے قرض کو غیر سودی قرض کہنا محض دھوکہ ہے۔

فقہاء نے نہ صرف یہ کہ قرض پر اضافہ کو ناجائز قرار دیا اور اس کو نفع اٹھانے کا ذریعہ بنانے سے منع فرمایا ہے بلکہ بالواسطہ طریقہ پر قرض سے نفع حاصل کرنے کا راستہ

بھی بند کردیا، مثلاً مقروض قرض دہندہ سے کوئی معمولی چیز گراں قیمت میں خریدے، یہ بھی مکروہ ہے (الدر المختار علی ہامش الرد: ۱۹۵/۴) اسی طرح یہ صورت بھی مکروہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص قرض لینے کے لئے آئے تو قرض دہندہ ساٹھ روپیہ تو اسے قرض کے دیدے اور بیس روپیہ کی چیز اسے چالیس روپیہ میں فروخت کردے تاکہ مقروض کے یہاں اس کے سو روپیہ ہو جائیں حالانکہ مقروض کو اس سے اسی روپیہ ہی حاصل ہوگا (ردالمحتار: ۱۹۵/۴)

سود خوار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور سود کے چور دروازوں کو بند کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے مقروض کی طرف سے تحائف کے قبول کرنے میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ جب کوئی قرض دے اور مقروض کوئی تحفہ دے یا اپنی سواری پر بیٹھائے تو اسے قبول نہ کرنا چاہئے سوائے اس کے کہ پہلے سے ان کے درمیان باہم تحائف کا لین دین رہا ہو (ابن ماجہ: ۸۱۳/۲) حضرت اُبی ابن کعبؓ جہاد کی غرض سے عراق کی طرف سے جارہے تھے تو زر بن جیش نے حضرت اُبی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ایسی جگہ جارہے ہیں جہاں سود کا عام رواج ہے، اس لئے اگر آپ کسی کو قرض دیں اور وہ آپ کو قرض کے ساتھ کچھ تحفہ بھی دیں تو اس کا تحفہ قبول نہ کریں۔

اسی بنا پر فقہاء نے بھی مقروض کی ہدایات اور دعوتوں میں احتیاط کا حکم دیا، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے دعوت نہ دیتے رہے ہوں یا ہدایا و تحائف کا معمول نہ رہا ہو تو ایسی دعوت و تحفوں کا قبول کرنا جائز نہیں ہاں معاملہ قرض سے پہلے سے اس طرح کا معمول رہا ہو تو اب جائز ہے (ہندیہ: ۲۰۳/۳) قریب قریب یہی رائے دوسرے فقہاء کی بھی ہے۔ (دیکھے مواہب الجلیل: ۵۴۶/۴، کشف القناع: ۳۰۵/۳)

(۷/مئی/۱۹۹۹ء)

زکوٰۃ ــــ کچھ نئے مسائل

زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے، زکوٰۃ ہر مال میں واجب نہیں، بلکہ کچھ مخصوص اموال میں ہی واجب ہے، زمین میں سے نکلنے والی معدنیات میں سے صرف سونا اور چاندی میں ہی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ تجارت کی صورت مستثنیٰ ہے، تجارت خواہ کسی بھی سامان کی کی جائے، وہ مال زکوٰۃ ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ جو موجودہ حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ ہے کہ بعض حضرات اپنی دولت کی حفاظت اور ٹیکس سے بچاؤ کے لئے نقد رقم کو ہیرے اور جواہرات کی صورت میں تبدیل کر لیتے ہیں، اس تبدیلی کا مقصد گو تجارت نہیں ہوتا لیکن یہ روپیوں کی بدلی ہوئی صورت ہے، لہٰذا کیا ایسے ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب ہوگی؟ ایک رائے یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ شریعت نے مخصوص اموال میں زکوٰۃ واجب قرار دی ہے اور یہ ان اموال میں سے نہیں ہے، جہاں تک روپیہ کی دوسری صورت میں تبدیلی کی بات ہے تو روپیہ سے زمین بھی خرید کی جاتی ہے، مکان بھی خرید کیا جاتا ہے اور دوسری اشیاء کی صورت میں بھی روپیہ کو تبدیل کیا جاتا ہے، لہٰذا پھر زکوٰۃ کے لئے کسی کو خاص مال کی تخصیص باقی نہیں رہ پائے گی، جو شریعت کے منشاء کے خلاف ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں صراحت موجود ہے کہ ہیرے جواہرات میں اس وقت زکوٰۃ واجب ہے جب ان کو تجارت کی نیت سے خرید کیا گیا ہو، ورنہ نہیں، (عالمگیری: ۱۸۰/۱) یہی اکثر اہلِ علم کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ چونکہ ان ہیرے اور جواہرات کا مقصود روپیہ کا محفوظ

کرنا ہے نہ کہ خود ہیرے اور جواہرات کا حصول، اس لئے گویا وہ نقد رقم ہی ہے جو ایک تبدیل شدہ صورت میں موجود ہے، لہٰذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے ـــ راقم الحروف کے خیال میں پہلی رائے قوی ہے اور یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے ایسے ہیرے اور جواہرات جو استعمال کے لئے نہیں، بلکہ سرمایہ کی حفاظت کے لئے خرید کئے گئے ہوں، ان کی زکوٰۃ ادا کردینا ہی بہتر ہے۔

مال سے مال حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں، ایک تجارت اور دوسرے اجارہ، تجارت یہ ہے کہ کوئی شئی کھو کر اس سے نفع حاصل کیا جائے، مثلاً: اگر دس روپیہ کا قلم بارہ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں، تو قلم سے محرومی کو گوارا کر کے اس پر دو روپیہ نفع حاصل کرتے ہیں، یہ تجارت ہے، مال تجارت پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے مٹی اور زمین ہی کی کیوں نہ ہو؟ ـــ اور کسی چیز پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس سے نفع حاصل کیا جائے یہ ''اجارہ'' ہے، جیسے: مکان، گاڑی وغیرہ کرایہ پر لگائی جاتی ہے، مالک کی ملکیت ان اشیاء پر باقی رہتی ہے اور کرایہ کی صورت میں وہ اس پر نفع حاصل کرتا ہے، ایسی چیزوں پر زکوٰۃ واجب نہیں، فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: ''لو اشتری قدورًا من صفر یمسکھا اویواجرھا لا تجب فیھا الزکوٰۃ''

(قاضی خاں: ۱/۲۵۱)

یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہے جو ''آلاتِ کسب'' ہیں، جیسے: سلائی مشین، پریس، کمپیوٹر، لیتھر مشین وغیرہ، کہ ان کی اصل پر زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں دوسرے سرمایہ کے ساتھ ملاکر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(عالمگیری: ۱/۱۷۲)

''شیرز'' کی اصل تو قدیم ہے، لیکن آج اس نے جو وسعت اختیار کرلی ہے، ماضی میں ایسا نہیں تھا، بعض شیرز تو خالص تجارتی نوعیت کے ہیں، یعنی ایسی کمپنیوں کے ہیں جو ایک تجارتی گروپ ہے، سامان خریدتا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کی ترسیل کرتا ہے، ایسے شیرز میں تو زکوٰۃ واجب ہونا ظاہر ہے۔ کیوں کہ یہ مال تجارت

ہے، بعض شیرز ایسے بھی ہیں جو صنعتی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، یعنی ان کے پاس مشینیں اور آلات ہیں، جن سے چیزیں تیار کی جاتی ہیں، اصولی طور پر ایسے شیرز کی اصل مالیت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہئے کیونکہ یہ ''آلاتِ کسب'' کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ سامان تجارت کی، صرف ان سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے ـــــ لیکن چونکہ آج کل کمپنی کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، شیرز تجارتی مقصد ہی کے تحت خرید کئے جاتے ہیں، اس لئے علماء کا خیال ہے کہ ''شیرز'' مطلقاً مال تجارت ہیں اور ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جن لوگوں نے اس نیت سے حصص خرید کئے ہوں کہ حصص کو باقی رکھتے ہوئے کمپنی سے حاصل ہونے والے نفع سے استفادہ کرنا ہے ان کو زکوٰۃ اس قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی ہوگی جو کمپنی تسلیم کرتی ہو، اور جن حضرات نے حصص اس مقصد کے لئے خرید کیا ہو کہ قیمت بڑھنے کے بعد اسے فروخت کر دیں گے، ان لوگوں کو موجودہ مارکٹ قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً کمپنی کے نزدیک ایک حصہ کی قیمت ۲۵ ؍روپے ہے اور مارکٹ میں 250/ روپے، تو پہلی صورت میں ۲۵ ؍روپیہ اور دوسری صورت میں ڈھائی سو روپے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ حکم شیرز کا ہے۔ ''باونڈز'' کی حیثیت قرض کے دستاویز کی ہے اور اس پر جو نفع دیا جاتا ہے، وہ سود ہونے کی وجہ سے حرام ہے، اس لئے جتنی رقم کا باوٴنڈز ہے، اتنی رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی، اور اس پر جو نفع ملتا ہے، وہ پورا کا پورا لائق صدقہ ہے۔

''پراویڈنٹ فنڈ'' میں تین طرح کی رقم شامل ہوتی ہے، ایک وہ جو خود گورنمنٹ تنخواہ میں سے کاٹ لیتی ہے، دوسرے: وہ جو اس کے برابر خود حکومت اپنی طرف سے بڑھا کر ادا کرتی ہے، تیسرے: وہ جو ملازم رضا کارانہ طور پر خود اپنی تنخواہ سے زائد رقم کٹواتا ہے، تاکہ اس کی P.F کی رقم زیادہ سے زیادہ ہو سکے ـــــ ان میں سے وہ رقم جو حکومت جبراً کاٹ لیتی ہے اور وہ رقم جو حکومت اپنی طرف سے اضافہ کر کے دیتی ہے، خواہ جبراً وضع کی ہوئی رقم پر ہو یا رضا کارانہ وضع کرائی ہوئی رقم

پر، ان میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب رقم وصول ہو جائے اور اس پر سال گذر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہی رائے علماء برصغیر میں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی ہے (امداد الفتاویٰ: ۲ / ۴۸ـ۴۴) کیوں کہ اُجرت جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی، البتہ جو رقم اس نے خود ہی رضا کارانہ جمع کرائی ہے، چونکہ اس پر حکومت اور کمپنی کا قبضہ خود اس کے حکم سے ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اپنے نائب اور وکیل کی وساطت سے اس نے اس رقم پر قبضہ کرلیا ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

''سامان تجارت'' جس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اس کی تین قیمتیں ہوسکتی ہیں، ایک وہ قیمت جس میں سامان خرید کیا گیا تھا، دوسرے وہ قیمت جس میں تاجر آج اس سامان کو خرید کرسکتا ہے، تیسرے جس قیمت میں آج وہ اس سامان کو فروخت کرے گا، مثلاً: تاجر نے ایک قلم دس روپیہ میں چھ ماہ پہلے خرید کیا تھا، اگر اس وقت خرید کرنا چاہے تو اسے بارہ روپے فی قلم کے لحاظ سے خرید کرنا پڑے گا، اور پندرہ روپے فی قلم کے لحاظ سے وہ عام طور پر گاہک کو یہ قلم فروخت کرتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ وہ اپنی دوکان میں موجود قلم کے اسٹاک کی قیمت کس لحاظ سے لگا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا؟

اس مسئلہ میں گو فقہاء کی رائیں مختلف ہیں لیکن زیادہ قرین صواب امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ قاضی ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کی رائے ہے کہ جس روز زکوٰۃ ادا کر رہا ہے اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا (مراقی الفلاح: ۳۹۱) کیوں کہ اصل میں زکوٰۃ کے طور پر خود قلم واجب ہے نہ کہ روپیہ، روپیہ قلم کے بدل کے طور پر دیا جاتا ہے، لہٰذا جتنی رقم میں اس تاجر کو زکوٰۃ میں واجب شدہ سامان حاصل ہوسکتا ہو اتنی رقم اس کے ذمہ واجب ہوگی۔ مذکورہ مثالوں کی روشنی میں اسے ۱۲ / روپے فی قلم کے حساب سے قیمت لگانی چاہئے اور اسی لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔

سونے کا اصل نصاب ۲۰ / مثقال اور چاندی کا دوسو درہم ہے، ہندوستان کے قدیم اوزان میں اس کا وزن کیا ہوگا؟ اس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں۔ راجح اور

محقق قول یہ ہے کہ سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ اور چاندی کا ساڑھے باون تولہ ہے، مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس پر بڑا تحقیقی رسالہ ''اوزان شرعیہ'' کے نام سے تالیف کیا ہے جو'' جواہر الفقہ ، حصہ اوّل'' میں شریک اشاعت ہے، یہی رائے مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ (فتاویٰ دارالعلوم : ۱۳۵/۶) اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی (فتاویٰ رضویہ: ۴۰۷/۴) کی بھی ہے، یہ ساڑھے باون تولہ موجودہ اوزان میں ۶۱۲٫۳۵ گرام اور ساڑھے سات تولہ ۸۷٫۴۷۹ گرام ہوتا ہے۔

(۸/جنوری ۱۹۹۹ء)

مصارف زکوٰۃ ــــــ کچھ اہم پہلو!

اسلام کے تمام احکام کی بنیاد دو باتوں پر ہے، خالق کی اطاعت و بندگی، اور مخلوق سے محبت اور حسنِ سلوک۔ اسلام میں جو عبادتیں فرض کی گئی ہیں، ان میں بھی ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جہاں نماز خدا کی بندگی اور اس کے سامنے سر جھکانے سے عبارت ہے، وہیں زکوٰۃ کا مقصد انسانیت کی حاجت روائی اور اس کی ضروریات کی تکمیل ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کو یکساں طور پر فرض قرار دیا ہے، زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ عہد صدیقی میں جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابو بکرؓ نے ان سے جہاد کیا اور فرمایا کہ میں نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کو گوارا نہیں کر سکتا، کہ کوئی گروہ نماز تو ادا کرنے کے لئے تیار ہو لیکن زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر جائے۔

زکوٰۃ صرف محتاجوں کی اعانت ہی نہیں ہے بلکہ ایک عبادت بھی ہے، اسی لئے جیسے عبادت کی تفصیلات اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے متعین ہوتی ہیں، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں بھی تمام تفصیلات قرآن وحدیث کی صراحتوں سے ثابت ہیں، زکوٰۃ کن اموال میں واجب ہے، زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط کیا ہیں؟ کن لوگوں پر واجب ہے؟ کتنی مدت گذرنے پر واجب ہے؟ اور کس مقدار میں واجب ہے؟ یہ تمام باتیں کتاب وسنت میں مذکور ہیں، اور عام طور پر فقہاء ان کے بارے میں متفق ہیں۔ زکوٰۃ سے متعلق جن نکات کی وضاحت قرآن وحدیث میں آئی ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف کیا ہیں؟ کن لوگوں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، اور کن لوگوں کو نہیں دی جا سکتی ہے؟ مصارف زکوٰۃ کو لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

" اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'' (سورہ توبہ: ۶۰)

'' صدقات (یعنی زکوٰۃ) کو مفلسوں محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے، اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے) میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (ہی یہ مال خرچ کرنا چاہئے، یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

اِن مصارف کے سلسلہ میں چند باتیں ضرور پیش نظر رہنی چاہییں۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں زکوٰۃ کے لئے جو تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ اس میں مالک بنائے جانے کے معنیٰ پائے جاتے ہیں، گویا زکوٰۃ میں مستحق شخص کو مالک بنانا ضروری ہے، جن میں مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو ان مدات میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، جیسے مردوں کی تجہیز وتکفین میں، قبر کے انتظام میں، کہ موت کے بعد انسان میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، آج کل بعض حلقوں سے یہ بات اٹھائی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کی جائے، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ غرباء پر تقسیم کیا جائے، دو چار نا قابل ذکر افراد کو چھوڑ کر علماء ہند اور عالم اسلام کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صورت جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں کسی خاص شخص کو زکوٰۃ کے مال بنائے جانے کی صورت نہیں پائی جاتی، بلکہ زکوٰۃ کی رقم تو اپنی جگہ مصروف رہتی ہے، صرف اس کا نفع غرباء تک پہونچتا ہے، پھر سرمایہ کاری میں جتنا امکان نفع کا ہوتا ہے، اتنا ہی نقصان کا بھی، اور اسی قدر خیانت کا بھی، تو اموالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری میں یہ اندیشہ ہے کہ غرباء کا اصل حق بھی مارا جائے، اور زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ جو ادا نہیں ہو پائی وہ نقصان اپنی جگہ ہے، پھر اس صورت میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اہلِ ثروت غرباء کے اس حق کا بھی استحصال کریں، کیوں کہ مال زکوٰۃ کی سرمایہ کاری کے لئے لامحالہ تجربہ کار تاجروں، اور اہلِ ثروت کاروباریوں ہی کا سہارا لینا پڑیگا، اور آج کل شب وروز جو تجربات سامنے آرہے ہیں، ان کی روشنی میں یہ

اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ جب رقم جمع کرنے والوں کی طرف سے مطالبہ کے باوجود آئے دن بدمعاملگی سامنے آتی رہتی ہے، تو وہ لاوارث رقم جس کا کوئی مالک متعین نہیں، اس کا کیا حشر ہوگا؟۔

یہ بات مقصدِ زکوٰۃ کے بھی خلاف ہے، کیوں زکوٰۃ کا مقصد ان ضروریات کو پورا کرنا ہے، جس سے لوگ اس وقت دوچار ہیں، اگر آپ اس رقم کو مستقبل کے لئے محفوظ کر دیں تو ان کی فوری ضروریات کیسے پوری ہوں گی؟ اس لئے مالِ زکوٰۃ کی سرمایہ کاری نہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے کافی ہے اور نہ اس سے زکوٰۃ کے مقصد ومنشاء کی تکمیل ہوتی ہے، بلکہ اس سے مستحقینِ زکوٰۃ کا استحصال اور ان کی حق تلفی ہے ۔۔۔ آج کل بعض گوشوں سے یہ بات بھی کہی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں فکس ڈپازٹ کردیا جائے اور اس کا انٹرسٹ مستحقین کو دیا جائے، یہ تو زکوٰۃ جیسی عبادت کو سود کی نجاست میں آلودہ کرنا اور خود گناہ گار ہونا اور دوسروں کو گناہ گار بنانا ہے، اولاً تو زکوٰۃ کی رقم کو بینک میں محفوظ کرنے سے زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی، پھر اس رقم کو سود کے لئے ذریعہ ووسیلہ بنانا زکوٰۃ جیسی عبادت کی کھلی ہوئی اہانت ہے، اور اس رقم کو فقراء میں تقسیم کرنا، لوگوں کو سود کھلانا اور سودخواری کا مرتکب بنانا ہے، ایسے ناشائستہ اور ناروا عمل کی کیوں کر گنجائش ہوسکتی ہے؟ اس لئے اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے، کہ اگر زکوٰۃ کی رقم مستحقین کے ہاتھ گئے بغیر فکس ڈپازٹ کرادی گئی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

زکوٰۃ کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں، اس لئے ایسی چیزیں جو رفاہی مقاصد کے لئے ہیں، اور تمام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں، ان میں زکوٰۃ کی رقم استعمال نہیں کی جاسکتی، چنانچہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، وَاتَّفَقُوْا عَلٰی اَنَّهٗ لَایَجُوْزُ اَنْ یُّخْرِجَ الزَّکٰوةَ اِلٰی بِنَاءِ مَسْجِدٍ (الافصاح: ۱/۲۳۱)۔ اس طرح پلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستگی، ڈرنج کے پشتوں کی مرمت، پانی پینے کے لئے سبیلوں کی تعمیر وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں کی جاسکتی، (المغنی مع شرح الکبیر: ۲/۵۲۷، بدائع الصنائع: ۲/۳۹)۔ اسی لئے ہاسپٹلوں یا لائبریریوں کی تعمیر اور کتابوں کی فراہمی وغیرہ

میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا درست نہیں، ہاں علاج کے لئے فقراء کو زکوٰۃ کی رقم سے دوا خرید کر یا نقد رقم دی جاسکتی ہے۔

زکوٰۃ کا مقصد خالصۃً لوجہ اللہ کسی عوض اور بدل کے بغیر مستحقین کی اعانت ہے، لہٰذا کسی بھی ایسے کام میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی جس میں زکوٰۃ کی حیثیت عوض اور اجرت کی ہوجائے، جیسے مساجد میں امام ومؤذن کی تنخواہ کے لئے، مدارس اور اسکولوں میں اساتذہ کی تنخواہوں کے لئے، مساجد کے صباحی اور مسائی معلمین کے لئے، اگر ان کو بطور تنخواہ یا اُجرت کے زکوٰۃ کی رقم میں سے دیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اس لئے جن مدارس میں غریب طلبہ کے لئے مفت قیام وطعام کا نظم نہ ہو ان کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہئے۔

آج کل ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہوگیا ہے کہ خوش حال ماں باپ اپنے بچوں کی میڈیکل، انجینیرنگ تعلیم اور ڈونیشن کے لئے لاکھوں روپے زکوٰۃ کی رقم وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی مناسب نہیں ہے، اور زکوٰۃ کا جو اصل مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجت اس سے پوری ہو اس کے خلاف ہے، اسی لئے فقہاء نے ایک شخص کو ایک مقدار نصاب سے زیادہ زکوٰۃ دینے سے منع کیا ہے، ایک مقدار نصاب یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کم وبیش پانچ ہزار روپے ہوتی ہے، ایک لاکھ روپے میں بیس اشخاص کی ضروریات پوری ہوسکتی تھی، لیکن اب اس رقم سے صرف ایک شخص کو خوب سے خوب تر مستقبل کی تعمیر میں ہی مدد مل سکے گی، اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دینی مدارس اور ان اعلیٰ فنی تعلیمات کی نوعیت میں فرق ہے، دینی مدارس میں ایک طالب علم کی سال بھر کی تعلیم اور ضروریات پر صرف دس بارہ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، پھر جو لڑکے پڑھ کر نکلتے ہیں، وہ امت کے دین وایمان کی حفاظت کا ذریعہ بنتے ہیں، گویا وہ امت کا سرمایہ اور اس کا مفاد ہیں، اور جو طالب علم ڈاکٹر یا انجینئر بنتا ہے، وہ اپنے مستقبل کی فکر لے کر اٹھتا ہے، اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے کسب زر کی مشین بنتا ہے، دینی مدارس میں بہت بڑی تعداد ان طلبہ کی ہوتی ہے کہ وہ اور ان کے والدین اپنے معاشی پس منظر کے اعتبار سے زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور جو طلباء انجینئرنگ یا میڈیکل

میں تعلیم کے لئے جاتے ہیں وہ کھاتے پیتے گھرانے کے ہوتے ہیں، پھر ان عصری علوم سے چوں کہ مستقبل کی خوش حالی متعلق ہوتی ہے، اس لئے ان شعبوں میں آنے کے لئے ترغیب دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ مادیت کی چمک دمک خود ہی شخص کی نگاہ کو خیرہ کئے رہتی ہے، برخلاف دینی تعلیم کے، کہ اس سے معاد متعلق ہے نہ کہ معاش، خوفِ آخرت کی کمی اور بڑھتی ہوئی دنیا طلبی کی وجہ سے اس کی طرف لوگوں کا میلان کم ہوتا ہے، اس لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کر کے انہیں دینی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مصارفِ زکوٰۃ بھی اہمیت کے اعتبار سے درجات ہیں اور اس لحاظ سے دو باتیں، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: اوّل یہ کہ اپنے قرابت دار اور اعزہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں، ماں باپ دادا، دادی، نانا، نانی اولاد اور ان کا سلسلہ اولاد، شوہروں بیویوں کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، باقی دوسرے اقرباء بھائی بہن، پھوپھی، خالہ خسر، خوشدامن، چچا، ماموں وغیرہ کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، ان کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا اجر ہے، زکوٰۃ بھی ادا ہوگی اور قرابت داری کا حق بھی، خاندان میں جو بیوہ، مطلقہ عورتیں، شوہر کی بے توجہی کی وجہ سے بے سہارا خواتین، یتیم لڑکے اور لڑکیاں وغیرہ ہوں، ان پر پہلے توجہ دینی چاہئے، زکوٰۃ دیتے وقت اس کا اظہار بھی ضروری نہیں کہ زکوٰۃ کی رقم ہے، ہدیہ وتحفہ، عیدی اور قرض وغیرہ کے نام سے بھی زکوٰۃ کی رقم دی جاسکتی ہے، صرف اتنا اطمینان کر لینا کافی ہے کہ وہ شخص زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر زکوٰۃ کے دو مقاصد ہیں، فقراء کی ضرورت پوری کرنا، اور اللہ کے دین کی سربلندی، چنانچہ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف (جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے) میں سے چھ میں حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنا ملحوظ ہے، اور فی سبیل اللہ اور مؤلفۃ القلوب، ان دو مدات میں دین کی حفاظت وسربلندی اور اس کی اشاعت مقصود ہے، اس وقت دینی مدارس ان دوہرے مقاصد کو پورا کرتے ہیں، ایک طرف ان مدارس میں جو طلباء زیرِ تعلیم ہیں وہ زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں، اور بہت سے طلباء ایسے دیہاتوں

سے آتے ہیں جہاں ہماری رسائی نہیں ہوسکتی، دوسری طرف یہ مدارس پوری دنیا میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً اسلام کی بقاء اوراس کی حفاظت وصیانت کا سامان بنے ہوئے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو کم سے کم ہمارے ملک میں مسلمانوں کے اکثریتی تہذیب میں جذب ہوجانے سے کوئی چیز مانع نہ ہوتی، اس لئے ان مدارس کے تعاون سے زکوٰۃ کے دونوں مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، مسلمانوں میں اب تک ایک طبقہ نے ان دینی درسگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے، لیکن مسلمانوں کا مذہبی وملی تشخص جن فرقہ پرست طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتا ہے وہ ان مدارس کی اہمیت اوراس کے کردار کو محسوس کررہے ہیں، اس لئے موجودہ حالات میں جب کہ عالمی سطح پر دینی مدارس کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا ہے اوران کے دائرہ کار کو محدود کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم انہیں تقویت پہونچائیں اوران کی شعاعوں کواور تیز وروشن کریں۔

(۲۳ر نومبر ۲۰۰۱ء)

سرمایہ کار کمپنیوں کا تلخ تجربہ

اسباب وعوامل

گذشتہ ایک دہے میں متعدد مالیاتی تجارتی کمپنیاں ہیں جنہوں نے سنہرے خوابوں کی بہشت سجا کر لوگوں سے ان کی گاڑھی کمائیاں وصول کیں، اور سرمایہ کاروں کا اعتماد بڑھانے کی غرض سے ابتداءاً خوب خوب نفع دیا، لیکن اچانک ایسی صورتِ حال پیش آئی کہ ان کا خواب ایک ''سراب'' ثابت ہوا۔ اور یوں محسوس ہوا کہ ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا'' ـــ خواہ اس کا سبب ان اداروں کی اقتصادی ناتجربہ کاری ہو یا دیانت وصداقت کی کمی؛ لیکن ان واقعات نے کتنے ہی دلوں کو رلایا اور تڑپایا ہے، ان میں بہت سے لوگ وہ تھے جنہوں نے وظیفہ یاب ہونے کے بعد اپنی پوری زندگی کا حاصل لگا دیا تھا، تاکہ بڑھاپے کی بےبسی اور بےکسی میں یہ سہارا بن سکے، بہت سی بیوائیں تھیں جنہوں نے اسے اپنے یتیم بچے اور بچیوں کی کفالت کا ذریعہ تصور کر کے ساری پونجی اس میں ڈال دی تھیں، کتنے ہی ضرورت منداور محتاج تھے کہ شب وروز محنت کر کے انہوں نے اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی غرض سے کچھ سرمایہ اکٹھا کیا اور اسے حفاظت اور نفع کی امید پر ان اداروں کے سپرد کیا تھا۔ اب امیدوں اور آرزوؤں کے خوبصورت تاج محل زمین بوس ہیں اور بہت سی حسرتوں کا مدفن بنے ہوئے ہیں۔

یہ تو ان واقعات کا اقتصادی اور سماجی پہلو ہے۔ لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں غیر سودی اور حلال بنیاد پر سرمایہ کاری سے لوگوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے، اور ان سرکاری اور نجی اداروں پر

لوگوں کا اعتماد و اعتبار بڑھ رہا ہے جو سود پر یقین رکھتے ہیں، اور علانیہ سود کا لین دین کرتے ہیں، یہودی نظامِ معیشت اور اس کے زیرِ اثر مغرب کا معاشی نظام تو کہتا ہی ہے کہ غیر سودی سرمایہ کاری ناقابلِ عمل اور غیر محفوظ صورت ہے، ساتھ ہی ساتھ خود مسلمانوں کے ہاتھ قائم ہونے والے یہ ادارے بھی بالواسطہ ان کے دعویٰ کو تقویت پہنچاتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے جو معاشی نقصان پہنچتا ہے اس کا اثر تو ممکن ہے کہ چند سالوں میں ختم ہو جائے؛ اس لئے کہ زخم کتنا بھی گہرا ہو ایک نہ ایک دن مندمل ہو کر رہتا ہے، اور دل پر کیسی بھی چوٹ لگے آج نہ کل آنسو تھم ہی جاتے ہیں، لیکن اسلام کے غیر سودی سرمایہ کاری کے تصور پر ان واقعات کی وجہ سے جو چوٹ لگتی ہے اور اسلامی نظامِ معیشت سے سماج کا یقین جس طرح مجروح ہوتا ہے، شاید پچاس سال میں بھی اس کی تلافی ممکن نہ ہو؛ اس لئے ایسے تکلیف دہ واقعات گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں جو برائیاں بہت ہی سنگین ہیں، ان میں سے ایک سود بھی ہے، سود کی شناعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے والے پر لعنت فرمائی بلکہ سود دینے والوں، سودی معاملات کے لکھنے والوں، اور ایسے معاملہ پر گواہ بننے والوں پر بھی آپ ﷺ نے لعنت کی ہے (مسلم، عن جابر بن عبد اللہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہیں فرمائیں گے اور ان کو جنت کی نعمتوں کا مزہ تک چکھنے سے محروم رکھیں گے۔ ایک شراب کا خوگر، دوسرے سود خوار، تیسرے ناحق یتیم کا مال کھانے والا، اور چوتھے والدین کا نافرمان (حاکم عن ابی ہریرۃ) ــــ لیکن ظاہر ہے کہ کسی برائی سے روکنا اس وقت تک مفید اور مؤثر نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے لئے جائز اور حلال متبادل پیش نہ کیا جائے۔ اسلام نے سودی لین دین کا راستہ بند کرنے کے لئے بنیادی طور پر دو طریقے اختیار کئے۔ ایک تو قرض کے لین دین کو آسان فرمایا، لوگوں کو اس کی ترغیب دی؛ تا کہ لوگ سود دینے پر مجبور نہ ہوں۔ جب

معاشرہ میں سود دینے والے لوگ نہ رہیں گے، تو اس سے سود خواروں کی حوصلہ شکنی ہوگی، اور سودی کاروبار پروان نہیں چڑھ سکے گا، دوسری طرف ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے کاروبار کو جائز قرار دیا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ شرکت سے ایسا کاروبار مراد ہے جس میں مختلف لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، محنت چاہے تمام سرمایہ کاروں کی ہو یا بعض کی ہو، لیکن نفع میں حسب معاہدہ سب شریک ہوں، مضاربت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا مال ہو اور کچھ لوگوں کی محنت، اور نفع و نقصان میں دونوں شریک ہوں، کاروبار کی یہ دونوں صورتیں جائز نفع کا راستہ کھولتی ہیں، اور سودی نظام کو بند کرنے میں معاون ہیں۔

اصل یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن سرمایہ کو کس طرح نفع آور بنایا جائے؟ یا تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ اس سے ناواقف ہوتے ہیں، یا واقف ہونے کے باوجود کام کرنے کی قوت نہیں رکھتے یا وقت نہیں پاتے، اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا سرمایہ لگا رہے۔ اور بیٹھے بیٹھائے ان کا نفع آتا رہے۔ یہی خواہش سودی کاروبار کرنے والوں کے لئے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کا ذریعہ اور وسیلہ بنتی ہے۔ اسلام نے ''شرکت'' اور ''مضاربت'' کے ذریعہ اپنے سرمایہ سے نفع اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے، شرکت ہی کی طرح مضاربت میں بھی نفع کا تناسب متعین ہونا چاہئے۔ نہ کہ قطعی مقدار، اگر قطعی مقدار متعین ہو جیسے دس ہزار پر پانچ سو روپیہ، تو یہ سود میں شامل ہے اور حرام ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ سرمایہ کار اور عامل کے نفع کی شرح میں یکسانیت ہو، اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، مثلاً ساٹھ فیصد، اور چالیس فیصد یا پچھتر فیصد اور پچیس فیصد کی شرح سے نفع متعین ہو، یہ درست ہے۔

بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی یہ دو صورتیں ہیں، جو زیادہ نفع آور بھی ہیں، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ اس میں نقصان کا خطرہ بھی زیادہ ہے، کیونکہ ایک تو کاروبار میں نشیب و فراز ہوتا ہی ہے، دوسرے آج کل دیانت و امانت کی بھی کمی ہے، اور شرکت و مضاربت کا زیادہ تر انحصار دیانت اور ایمانداری پر ہے، اس لئے اسلامی خطوط پر

سرمایہ کاری کے لئے جو ادارے قائم ہوں، ان کے لئے ان طریقوں کا اختیار کرنا دشواری کا باعث ہوتا ہے، --- سرمایہ کاری کی دو اور صورتیں نسبتاً زیادہ محفوظ بھی ہیں اور آسان بھی، ان میں ایک صورت ''مرابحہ'' کی ہے، اور دوسری ''اجارہ'' کی، مرابحہ سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو خرید کر نفع کے ساتھ فروخت کیا جائے، اور خریدار پر یہ بات واضح بھی کر دی جائے کہ اس نے کتنی قیمت میں خرید کیا ہے، اور اس پر کتنا نفع حاصل کر رہا ہے؟ مثلاً ایک شخص کو پچاس لاکھ روپے کی مشنریز خرید کرنی ہے، کمپنی اس کو پیسہ دینے کے بجائے مشینیں خرید کرے، اور اپنے قبضہ میں لے کر اسے ساٹھ لاکھ میں فروخت کرے؛ اور اس کو مہلت دے دے کہ وہ دس ماہ کے بعد اس کی قیمت ادا کر دے، یا مثلاً چھ لاکھ روپے ماہانہ کی قسط ادا کرنے کی سہولت دے دے، یہ صورت شرعاً جائز ہے، اور اس میں سرمایہ کو نسبتاً کم خطرہ ہوتا ہے، نقد کے مقابلہ ادھار قیمت زیادہ ہو، یہ جائز ہے، اور یہ بھی جائز ہے ایک مشت کے بجائے اقساط پر قیمت وصول کی جائے، البتہ اس میں دو باتیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی قیمت متعین ہو، یہ بات درست نہیں، کہ اگر دس ماہ کے بجائے اس نے گیارہ ماہ میں قیمت ادا کی تو قیمت ساٹھ لاکھ کے بجائے پینسٹھ لاکھ وصول کی جائے۔ دوسرے اس صورت میں یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ کمپنی اس چیز کو اپنے قبضہ میں لے کر فروخت کرے، کیوں کہ جب تک کوئی چیز اپنے قبضہ میں نہ لے لی جائے اس وقت تک نہ اس کو بیچنا جائز ہے، اور نہ ہی اس کا نفع حلال ہے، البتہ قبضہ کی کوئی ایک صورت متعین نہیں، ہر عہد کے رواج اور ہر چیز کی حیثیت کے لحاظ سے اس کا قبضہ ہوگا۔

''اجارہ'' سے مراد کسی چیز کو کرایہ پر دینا ہے۔ یعنی اجارہ لیزنگ (Leassing) کا نام ہے۔ اجارہ میں اصل سامان محفوظ رہتا ہے، اور اس کے استعمال کی اجرت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے گاڑیاں خرید کی جائیں اور ان کو کرایہ پر لگایا جائے، کسی فیکٹری کو مشینیں مطلوب ہوں، مشین خرید کر ان کو کرایہ پر دیا جائے، یہ صورت بھی نسبتاً محفوظ کہی جا سکتی ہے، اجارہ میں مدت اور اجرت کی تعیین ضروری ہے،

جوانویسٹ منٹ کمپنیاں اسلامی بنیادوں پر قائم ہیں ان کو چاہئے کہ جمع سرمایہ کا کچھ حصہ شرکت ومضاربت میں لگائے، اور کچھ حصہ مرابحہ اور اجارہ میں استعمال کرے، اس طرح پورے سرمایہ کے ڈوب جانے کا خطرہ نہیں ہوگا۔ اوران کے پاس ٹھوس سرمایہ کی صورت میں بھی بہت سارا سرمایہ رہے گا، جس سے سرمایہ کاروں کا اعتماد قائم رکھنے میں بھی مدد ملے گی، اور کمپنی مکمل طور پر دیوالیہ بھی نہیں ہوگی۔

اس وقت پورے ہندوستان اور خاص کر شہر حیدرآباد میں تجارتی کمپنیوں کا کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے، جن میں بعض تو سرمایہ کاروں سے اسّی فیصد نفع تک کا بھی وعدہ کررہے ہیں۔ بہ ظاہر یہ سبز باغ دکھانے سے زیادہ کچھ نہیں، ان چھوٹی چھوٹی نومولود کمپنیوں میں زیادہ تر سرمایہ متوسط الحال مسلمانوں کا ہے۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ریزروبینک آف انڈیا اور گورنمنٹ ان کمپنیوں کے معاملہ میں خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ گورنمنٹ کے زیر کنٹرول ذرائع ابلاغ میں ان کی خوب تشہیر ہوتی ہے، سرکاری افسران اور سیاسی قائدین ان کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، اور کمپنی کے مالکان کو قوم کا مسیحا قرار دیتے ہیں، جب عوام کا پیسہ ڈوبتا ہے اور پانی سر سے اونچا ہوجاتا ہے، تو گورنمنٹ حرکت میں آتی ہے اور پولیس تفتیش شروع ہوتی ہے، یہ محض اشک شوئی اور سانپ کے گذر جانے کے بعد لکیر کو پیٹنا ہے، ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمان ملک گیر سطح پر یا کم سے کم شہر حیدرآباد کی سطح پر سرمایہ کاروں کے لئے ایک مشاورتی بورڈ قائم کریں جس میں کچھ علماء وارباب افتاء، چند معاشی منصوبہ بندی کے ماہرین اور دو ایک اکاؤنٹنٹ اور قانون داں شامل ہوں، سرمایہ کاروں کو ترغیب دی جائے کہ یہ بورڈ جب تک کسی کمپنی کی تصدیق نہ کردے وہاں سرمایہ کاری سے اجتناب کیا جائے، یہ بورڈ شرعی، اقتصادی، قانونی، اورحساب و کتاب کی شفافیت کے پہلو سے ہر چھ ماہ پر کمپنی کا مکمل غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی تصدیق کرے، اور اپنے جائزہ کا اعلان کرے۔ اس طرح ایک طرف ایسی مالیاتی کمپنیوں کو مفید اقتصادی مشورے مل سکیں گے، ان کا کاروبار شریعت کے

دائرہ میں ہوگا، ان کے کاروبار کی عوامی نگرانی ہو سکے گی، اور دوسری طرف سرمایہ کاروں کی گاڑھی کمائی محفوظ اور نفع آور ہوگی۔ کسی عملی تدبیر کے بجائے محض ایسے واقعات پر وقتی بیانات دے دینا اور سرمایہ کاروں سے لفظی ہمدردی کا اظہار کر دینا مسئلہ کا مؤثر اور مستقل حل نہیں، کاش ہمارے قائدین، علماء اور اہلِ دانش اس جانب کوئی توجہ کریں۔

(۱۲/ مارچ ۱۹۹۹ء)

اسلام میں سرمایہ کاری کے اصول اور موجودہ حالات کا تقاضا

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں نعمتوں اور صلاحیتوں کی ایسی تقسیم فرمائی ہے کہ ہر شخص اپنے آپ میں نامکمل اور دوسرے کا محتاج ہے، اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہی اپنی منزل تک پہونچ سکتا ہے، کسی کے پاس دولت ہے، لیکن وہ جسمانی قویٰ سے محروم ہے، کوئی شخص صحت مند اور محنت کرنے کے لائق بھی ہے، لیکن علم وآگہی سے تہی دامن ہے، جیسے اندھا اور لنگڑا ایک دوسرے کی مدد کر کے اپنا سفر طے کر سکتے ہیں، اسی طرح یہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اپنی مطلوبہ منزل کو پا سکتے ہیں۔

معاشی نظام میں بھی یہی طریقۂ کار کسی قوم اور سماج کی ترقی کا راز ہے، کچھ لوگوں کے پاس سرمایہ ہے، لیکن خود کاروبار اور تجارت کی قوت یا اس کا تجربہ نہیں، کچھ لوگ کاروبار کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس سرمایہ نہیں، اگر سرمایہ کاروں کا منجمد سرمایہ اور اس دوسرے گروہ کی محنت کا اشتراک ہو، تو اس سے دونوں طبقوں کو نفع ہوگا، اور بحیثیت مجموعی قوم اور ملک کو بھی اس کا نفع پہونچے گا، اسی لئے اسلام نے ایسے اشتراک کی نہ صرف گنجائش رکھی ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

اسلام نے بنیادی طور پر اس کے لئے دو طریقے رکھے ہیں: شرکت اور مضاربت، شرکت کے معنی ساجھے دار ہونے کے ہیں، یعنی ایسا کاروبار جس کو متعدد لوگ مل کر کریں، جو شخص کسی چیز میں کچھ حصہ کا مالک ہو، عربی زبان میں وہ ''شریک'' کہلاتا ہے، فقہ کی اصطلاح میں شرکت ایسے کاروبار کو کہتے ہیں، جس میں ایک سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ شریک ہو، اور نفع میں بھی وہ سب شریک ہوں، ''عقد بین المتشارکین فی رأس

المال و الربح" قرآن مجید میں گو احکامِ شرکت کی تفصیل تو مذکور نہیں، لیکن اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے احکام میراث کے ذیل میں چند ورثاء کے بارے میں ذکر فرمایا ہے کہ وہ سب ایک تہائی میں شریک ہیں، "فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ" (نساء:۱۲) حدیث میں نسبتاً زیادہ وضاحت کے ساتھ شرکت کا تذکرہ ہے، جائز اور حلال طریقہ مقرر فرمایا ہے، جس میں سرمایہ کار نفع کے ساتھ نقصان کا خطرہ بھی قبول کرتا ہے۔ اور اسی کو قبول کرنے کی وجہ سے اس پر حاصل ہونے والا نفع اس کے لئے جائز اور حلال ہے۔

اگر ایمانداری کے ساتھ شریعت کے اصولوں کو برتتے ہوئے شرکت اور مضاربت کے کاروبار کئے جائیں تو اس سے زیادہ نفع حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن خیانت اور بد دیانتی آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی انسان کو نقصان سے دوچار کرتی ہیں۔ کاروبار کی کامیابی میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں: ایک دیانت و امانت، دوسرے تجربہ اور کاروبار سے واقفیت۔ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں حضرت سائب بن سائب رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے کاروباری شریک تھے۔ جب مکہ فتح ہوا تو خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے ان کا استقبال کیا۔ اور فرمایا: میرے بھائی اور میرے شریک! تمہارا آنا مبارک، جو ایسے شریک تھے کہ نہ جھگڑتے تھے اور نہ ہیرا پھیری کرتے تھے۔ "مرحبا باخي و شريكي كان لايداري و لايماري" (فتح القدیر: ۵/۳۷۷) گویا جو لوگ شریف اور سلیم الطبع تھے، وہ زمانۂ کفر میں بھی امانت و دیانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

اسلام میں امانت و دیانت کی جو اہمیت و تاکید ہے، وہ ظاہر ہے۔ خاص کر شرکت کے معاملہ میں آپ ﷺ نے اس کی خصوصی تاکید فرمائی۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب دو آدمی شرکت کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں، تو جب تک ان میں سے کوئی اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے میں ان میں کا تیسرا ہوتا ہوں۔ اور جب ان میں سے کوئی خیانت کرتا ہے میں ان کے بیچ سے نکل جاتا ہوں۔ "انا ثالث الشريكين مالم يخن احدهما صاحبه، فاذا خانه خرجت من بينهما"، (ابوداؤد: ۲/۱۲۴)

بدقسمتی سے آج کل جو لوگ سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی دن سے ان کے گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں ، اور ایسی شاہ خرچی شروع ہوتی ہے کہ گذشتہ زمانہ کے فضول خرچ نواب اور جاگیردار بھی شرم سار ہو جائیں ، عمدہ سے عمدہ مکان ، اچھی سے اچھی گاڑیاں ، شاہی دعوتیں ، اور ہر سماجی محفل میں پیسے دے کر مہمان خصوصی بننے کا شوق ، اور ان سب سے سواء اخبارات میں آنے کی خواہش ، اور ہر روز اپنی تصویر کی نمائش ، اور کتنی ہی ایسی خواہشیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے! اور یہ سب کچھ غریب اور متوسط الحال محنت کش عوام ، بیواؤں اور یتیموں کے پیسوں کے بل پر —— یہ کتنی شرمناک اور افسوس ناک بات ہے ۔ اس سے جہاں سرمایہ کاروں کو نقصان پہنچتا ہے ، وہیں خود وہ بھی نقصان سے دوچار ہوتا ہے ، اگر دیانت اور ایمانداری سے کاروبار کو چلایا جائے تو لوگوں کا اعتماد قائم رہے گا ۔ اور یہ کاروبار مدتوں جاری رہے گا ، اور سرمایہ کاروں سے زیادہ نفع خود اس شخص کو حاصل ہوگا ، خیانت اور بددیانتی سے اللہ تعالیٰ کی مدد اٹھ جاتی ہے ۔ جن لوگوں نے سرمایہ لگایا ہے ان کا بھی نقصان ہوتا ہے ۔ اور جن کے پاس سرمایہ مشغول کیا گیا ہے وہ دنیا میں ذلیل و خوار بھی ہوتا ہے ، مستقل نفع سے محروم بھی اور اس اجتماعی ظلم پر اللہ کے یہاں جو پکڑ ہے وہ اس کے سوا ہے ۔

کسی بھی کاروبار کے کامیاب ہونے کے لئے تجربہ اور واقفیت ضروری ہے ، آدمی خواہ کتنا بھی مخلص ہو ، دیانت دار اور سچا بھی ہو ، لیکن وہ ایسے کاروبار میں ہاتھ رکھے جس سے خود کما حقہ واقف نہ ہو ، تو زیادہ امکان نقصان ہی کا ہے ، کسی بھی تجارت کے لئے تین چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں ، اوّل یہ کہ سامان کہاں سے خرید کیا جائے کہ اس کو کم سے کم قیمت میں حاصل کر سکے ، دوسرے یہ سامان کہاں بہتر طور پر فروخت ہو سکے گا ؟ کہاں اس کی مانگ زیادہ ہے ؟ تیسرے جو لوگ اس مال کے خواہاں ہیں وہ کس طرح کا مال پسند کرتے ہیں ؟ ان تینوں امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کوشش بھی کرنی ہے کہ اس کے لانے اور فروخت کرنے میں کم سے کم اخراجات آئیں ، یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پورا سرمایہ ایک ہی یونٹ میں نہ لگایا جائے ، اگر مختلف نوعیت کے کاروبار میں سرمایہ مصروف کیا جائے

تو اگر ایک یونٹ میں نقصان بھی ہو تو دوسری یونٹوں کے نفع سے اس کی بھرپائی ہوسکتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضیٔ قریب میں جو کمپنیاں قائم ہوئیں، انہوں نے اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا۔ کسی نے پوری رقم چمڑے میں مصروف کردی۔ کسی نے بلڈنگوں کی تعمیر میں، کسی نے اسکراپ کی خرید و فروخت میں، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کاروبار میں انحطاط ہوا تو پورا کاروبار ہی بیٹھ گیا، جو لوگ سرمایہ کاروں کو شرکت کی دعوت دیں ان کو چاہئے کہ وہ پہلے سرمایہ کاری کے فائدہ بخش مواقع کو ماہرین کی مدد سے خوب اچھی طرح سمجھ لیں، پھر قدم اٹھائیں۔

جو لوگ اپنا سرمایہ مشغول کریں، ان کے لئے بھی ضروری ہے کہ سنہرے خواب دکھانے والوں کی طرف آنکھ بند کرکے نہ دوڑیں، بلکہ پہلے خوب اچھی طرح تفتیش کریں کہ کمپنی سرمایہ کہیں مشغول بھی کررہی ہے یا نہیں؟ اگر مشغول کررہی ہے تو کیا اس کاروبار سے وہ نفع حاصل ہوسکتا ہے جس کا وعدہ کیا جارہا ہے؟ اس کے بارے میں ماہرین سے دریافت کریں، پھر خوب سوچ سمجھ کر سرمایہ لگائیں، یہ کہنا کہ آٹھ دس ہزار روپے لگائیں اور کل ہی سے اس پر نفع حاصل کریں، بلکہ پہلے مہینہ کا نفع رقم دیتے ہوئے ہی وضع کرلیں، ناقابلِ فہم باتیں ہیں، دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جو شروع ہونے سے پہلے ہی یا شروع ہوتے ہی نفع دینے لگے ــــ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں نفع و نقصان کو ظاہری اسباب سے متعلق رکھا ہے، ان اسباب کو نظر انداز کرکے کام کرنا توکل نہیں، بے وقوفی اور بے عملی ہے، اور اس کی وجہ سے نقصان اٹھانا اور حسرت و افسوس سے دوچار ہونا نوشتۂ دیوار!!

(۱۹/مارچ ۱۹۹۹ء)

آزاد مارکٹ ــــ اسلامی نقطۂ نظر

یکم اپریل ۲۰۰۱ء ہندوستان کی معاشی اور تجارتی تاریخ میں ایک انقلابی اور یادگار تاریخ ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ہندوستان نے مغربی نقطۂ نظر کے مطابق معاشی اصلاحات کا آغاز کیا تھا، ان اصلاحات کے تحت مختلف مرحلوں میں بیرون درآمدات پر مقداری پابندیوں کو برخواست کیا گیا ہے، ۱۹۹۶ء میں ۶۱۶۱ اشیاء، ۱۹۹۷ء میں ۴۸۸ اشیاء، ۱۹۹۸ء میں ۳۹۱ اشیاء، ۱۹۹۹ء میں ۸۹۴ اشیاء اور اب باقی ۷۱۴ اشیاء پر مقداری تحدید ختم کردی گئی ہے اور اس طرح ہندوستان کی مارکٹ عملی طور پر آزاد مارکٹ میں تبدیل ہو چکی ہے ــــ اس فیصلہ نے عوام کے بہت بڑے حصہ کو مسرور وشاد کام کیا ہے، اور لوگ امید کر رہے ہیں کہ آئندہ چند مہینوں میں اشیاء کی قیمتوں میں نمایاں کمی ہوگی، اور انہیں سستے دام، معیاری چیزیں مل سکیں گی۔ دوسری طرف ملک کے صنعت کاراوران سے بڑھ کر کاشت کار اس صورتِ حال سے بہت پریشان اور خوف زدہ ہیں، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب ہیں کہ ملک کی تجارت پر بیرونی تاجروں اور صنعت کاروں کا قبضہ ہوجائے گا، ہندوستان کی صنعتیں تباہ ہوجائیں گی، اور ہندوستانی معیشت کا سب سے اہم شعبہ زراعت پر بھی غیر معمولی اثر پڑے گا، کیوں کہ بیرونی ممالک اپنی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کی وجہ سے اتنی ارزاں قیمت میں اناج فراہم کردیں گے کہ ہندوستانی کسانوں کو ان کا مقابلہ دشوار ہوجائے گا۔ اور جب کسانوں کو اپنی محنت کی صحیح اجرت حاصل نہ ہوسکے گی، تو وہ کاشتکاری کیوں کریں گے؟ اور محنت ومشقت برداشت کرکے ہمارے لئے کیوں اناج پیدا کریں گے؟۔

ملک کے بہت سے بہی خواہ اور عاقبت اندیش لوگوں کو بھی حکومت کے اس فیصلہ پر تشویش ہے، کیوں کہ یہ معاشی اعتبار سے دوسرے ملکوں کی غلامی قبول کرنے کے مترادف

ہے، اس سے اندرون ملک بے روزگاری میں اضافہ ہوگا، اور یہ بے روزگاری اور محرومی عدمِ استحکام کو جنم دے گی، جب ایک ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' پورے ملک کو اپنا غلام بنا سکتی ہے، تو اتنی ساری کمپنیاں کیا کچھ نہیں کر سکتی ہیں؟ —— حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو اہم ہیں، تجارت میں مسابقت ضروری ہے، اس سے قیمتوں میں توازن قائم رہتا ہے، اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے، اور ایسی تدبیر بھی ضروری ہے کہ ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے ان کا ذریعۂ معاش بوجھ نہ بن جائے، ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ تجارت کا نظام 'طلب و رسد' کے اصول پر قائم ہے، اگر کسی چیز کی طلب بڑھ جائے، لیکن اس کی تیاری اور فراہمی طلب کے مطابق نہ ہو پائے، تو قیمتیں چڑھیں گی، اور اگر وہ طلب کے برابر ہو، تو قیمت میں توازن رہے گا، اور طلب کے مقابلہ اشیاء کی فراہمی اور تیاری زیادہ ہو، تو قیمتیں گر جائیں گی، تاجروں کا عام قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی فطرت پر قائم رہنے نہیں دیتے، بلکہ بازار میں مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں، تاکہ قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھ جائیں، تجار نے ہمیشہ اس حربہ کو اختیار کیا ہے، اور غریب عوام کی زندگی کو اپنے نفع کے لئے بوجھل بنا کر رکھا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی عربوں میں ایسے طریقے مروج تھے، مثلاً ایک طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی تجارتی قافلہ باہر سے آتا، تو شہر کے سرمایہ کار تاجر باہر نکل کر ان کے مال سستے داموں خرید لیتے، اور انہیں باور کراتے کہ کھلے بازار میں یہ سامان اسی قیمت میں فروخت ہو رہا ہے، اس سے دو نقصان ہوتا، ایک تو جو لوگ زراعت کے ذریعہ پیداوار حاصل کرتے، یا محنت کر کے مال تیار کرتے، انہیں بازار کے عام نرخ کے مقابلہ کم قیمت ملتی اور اپنی محنت کا کما حقہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، دوسری طرف کھلے بازار میں مال آنے سے پہلے اس کے خرید لینے کی وجہ سے مارکٹ میں اس سامان کی مصنوعی قلت پیدا ہو جاتی، اور جب لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے اشیاء کم پڑتیں، تو قیمتیں بڑھ جاتیں، اور عوام نقصان اٹھاتے، گویا چند سرمایہ دار تاجروں کی وجہ سے پیدائش کار اور

عوام دونوں کو نقصان ہوتا، اس طریقہ کو ''تلقی رکبان'' کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

اسی طرح ایک طریقہ یہ تھا کہ دیہات کے لوگ جب اپنی پیداوار شہر میں لے کر آتے، تو دیہات کی قیمتوں کے معیار نیز شہر کے حالات سے ناآگہی کی وجہ سے کم قیمت میں اپنا مال فروخت کر دیتے، شہر کے جو چالاک تاجر ہوتے، وہ اسے ترغیب دیتے کہ اپنا مال ان کے حوالے کر دیں، وہ اس کو ان کے لئے گراں قیمت میں فروخت کر دیں گے، اس طرح دیہات سے سامان آنے کی وجہ سے شہر میں جو ارزانی ہو سکتی تھی وہ پیدا نہیں ہو پاتی، اس کو ''بیع حاضر للبادی'' کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقہ کو بھی منع فرمایا

سامان کے نرخ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا ایک پرانا طریقہ ذخیرہ اندوزی کا رہا ہے، یعنی اشیاء ضروریہ کو روک کر رکھنا تاکہ بازار میں اس کی قلت پیدا ہو جائے اور اس طرح ان چیزوں کا نرخ اونچا ہو جائے، یہ طریقہ آج بھی مروج ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے، اور ایک روایت کے مطابق آپ ﷺ نے ایسے لوگوں پر لعنت بھی فرمائی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو احتکار کا مرتکب پایا، تو اسے منع کیا اور کہا کہ حضور ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں جذام کا خیال ظاہر فرمایا ہے، راویؓ کا بیان ہے کہ واقعی وہ شخص جذام میں مبتلا ہوا (ابن ماجہ: باب الحکرۃ والجلب، مسند احمد: ۲۱/۱) احتکار کی ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ اس سے قیمتیں غیر فطری طریقہ پر بڑھتی ہیں، اور عام لوگوں کو نقصان پہونچتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ''نجش'' سے منع فرمایا، نجش سے مراد یہ ہے کہ کسی سامان کی ڈاک لگائی جائے، اور ایک شخص کا سامان لینے کا ارادہ نہ ہو، لیکن وہ محض قیمت چڑھانے کے لئے بڑھ کر بولی لگائے، تاکہ دوسرے خواہش مند حضرات خواہ مخواہ قیمت بڑھا دیں اور اس طرح مناسب قیمت سے زیادہ میں مال فروخت ہو، رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اشیاء کی قیمتوں کو فطری حالت پر رہنے دیا جائے، نہ مصنوعی طور پر قیمت بڑھائی جائے، اور نہ قیمت گرائی جائے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص خدمتِ

اقدس میں حاضر ہوئے ،اور عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ! اشیاء کی قیمتیں متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے کہا: اسے چھوڑ دو، پھر ایک دوسرے صاحب نے یہی بات کہی ،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ہی قیمت کو اٹھاتے اور گراتے ہیں، میں اس حال میں اللہ سے ملنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر کسی کا دعوی ظلم نہ رہے، (ابوداؤد: حدیث نمبر،۳۴۵۰) حضرت انس ؓ کی ایک روایت میں ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، آپ ﷺ ہمارے لئے نرخ متعین فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیمت مقرر کرنے والا اللہ ہے، وہی تنگی اور کشادگی پیدا کرتا ہے۔ اور وہی رزاق ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۴۵۱)

غرض منشأ نبوی یہ ہے کہ مارکٹ کو فطری حالت پر رہنا چاہئے ،کبھی طلب کے اعتبار سے رسد بڑھ گئی، اور عوام کو فائدہ ہو گیا، اور کبھی رسد کے اعتبار سے طلب زیادہ رہی اور تاجروں کو معمول سے زیادہ فائدہ ہو گیا، چنانچہ حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو چھوڑ دو، اللہ ہی بعض کو بعض سے رزق فراہم کرتا ہے، ''دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض''، (مسلم: حدیث نمبر،۱۵۲۲) — تاہم اگر گراں فروشی حد برداشت سے بڑھ جائے، اور تجار اخلاق کی زبان سمجھنے سے قاصر ہوں، تو حکومت کو حق ہے کہ وہ قانون کی لاٹھی استعمال کر کے اس مسئلہ کو حل کرے، اسی لئے فقہاء نے اجازت دی ہے کہ خصوصی حالات میں ذخیرہ اندوزی کے سدِ باب کے لئے ذخیرہ اندوزوں کا مال زبردستی نکالا جا سکتا ہے، اور اشیاءِ ضروریہ کا نرخ متعین کر کے تجار کو پابند کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسی قیمت پر سامان کو فروخت کریں۔

یہ اسوۂ نبوی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اسلام کا اصل مزاج یہی ہے کہ تمام لوگوں کو اپنا مال مارکٹ میں لانے کی آزادی حاصل رہے، اور وہ بے روک ٹوک خرید و فروخت کر سکیں تا کہ مسابقت برقرار رہے، اس سے لوگوں کو سستی اور معیاری اشیاء حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی طبقہ کو ضرر سے بچانا اور ان کے ساتھ ناانصافی کا سدِ باب کرنا اسلامی تعلیمات کا اہم تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ نے عدل کا عمومی حکم دیا

ہے،''ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان'' (النحل:۹۰) ملکی صنعتوں کی تباہی اور کاشتکاروں کی مایوسی میں نہ صرف ان لوگوں کا نقصان ہے، بلکہ مجموعی اعتبار سے اس کی مضرت کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے، کیوں کہ جب بے روزگاری بڑھے گی، تو لوگوں کی بنیادی ضروریات کا پورا ہونا بھی مشکل ہو جائے گا، ملک میں لوٹ کھسوٹ اور جرائم کا رجحان بڑھے گا، اور جب بیرونی کمپنیاں تجارت کے کسی شعبہ پر حاوی ہو جائیں گی، اور اندرونِ ملک صنعتوں پر غلبہ حاصل کرلیں گی، تو پھر ان کا استحصال سے باز رہنا دشوار ہوگا، اور اندیشہ ہے کہ وہ اپنی منمانی قیمت لگا کر لوگوں کو اسی قیمت میں خرید وفروخت کرنے پر مجبور کر کے رکھ دیں گی، پھر تو یہ ارزانی بھی بے ثبات ثابت ہوگی اور گرانی پر کنٹرول مشکل ہو جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی کمپنی کو ملک کے بازار میں بلاتحدید داخل ہونے کی اجازت دی جائے، تو اس سے ایسے معاہدے کئے جائیں کہ بتدریج وہ اپنی ٹکنالوجی بھی فراہم کرے، اور ملک میں اپنی صنعتیں قائم کرے، ان صنعتوں میں مقامی ہنرمندوں اور مزدوروں کو کام کے مواقع دئے جائیں، اس طرح بے روزگاری کا یہ سیلاب تھم سکے گا، اور عام لوگوں کے لئے اس کے فوائد دیرپا ہوں گے، قدیم زمانہ میں صنعت وحرفت میں، وسائل اور ٹکنالوجی کا اتنا فرق نہیں ہوتا تھا، کہ قیمتوں پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑے، البتہ مزدور اور نقل وحمل کی اجرت کے فرق کی وجہ سے اشیاء کی پیداوار مہنگی یا سستی ہوا کرتی تھی، اس تفاوت کو دور کرنے، قیمتوں میں توازن رکھنے اور ملکی پیداوار کو بچانے کی غرض سے ایک طریقہ تجارتی ٹیکس کا مروج تھا، چنانچہ فقہاء نے غیر ملکی تاجروں سے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس کے بدلے انہیں تجارت کے مواقع بھی دیئے جاتے تھے، اور ان کی حفاظت ونگہداشت کی ذمہ داری بھی قبول کی جاتی تھی، اب ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ اور پسماندہ ہونے کا بھی قیمت پر نمایاں اثر پڑتا ہے اس لئے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، مارکٹ کو ملکی اور

بیرونی تاجروں کے لئے کھولنا تا کہ گرانی کم ہو، اور سرمایہ داروں کو عوام کا استحصال کرنے کا موقع نہ ملے، اور ایسے قوانین وتحدیدات بھی ضروری ہیں، جن کے ذریعہ جدید ٹکنالوجی سے محروم ملکی صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے مفادات کا بھی تحفظ ہو، اور ان کے حقوق بھی پامال نہ ہونے پائیں، کہ یہی تقاضۂ عدل ہے، اور اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کی تمام ہدایات کا لُبِّ لُباب یہی ہے کہ انسانوں کی یہ بستی عدل پر قائم رہے، کہ یہی تقویٰ سے قریب ترین راہ ہے، "**اعدلوا هوا قرب للتقوىٰ**" (المائدۃ:۸)۔

(۱۳/اپریل ۲۰۰۱ء)

خدا سے پانی مانگئے!

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، وہ بے شمار ہیں، ان میں کچھ نعمتیں روحانی ہیں اور کچھ مادی ہیں۔ یہ مادی نعمتیں انسانوں کی اس بستی میں جینے اور رہنے کے لئے ناگزیر ہیں، ان ضرورتوں میں سب سے اہم ہوا اور ہوا کے بعد پانی ہے، ہوا اور پانی اس فراوانی کے ساتھ مہیا ہیں کہ ہمیں کبھی ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کے بارے میں سوچنے کا خیال بھی نہیں گذرتا، غور کیجئے کہ ایک لیٹر صاف و شفاف پانی ہم بازار سے دس تا بارہ روپے میں خرید کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے پانی کی بے حساب مقدار کھیت اور باغات کی آبیاری، انسان کی سیرابی اور انسان سے متعلق چیزوں کی صفائی اور دھلائی کے لئے پیدا فرمائی ہے، اگر اس پانی کی قیمت بارہ کے بجائے پانچ یا دو ہی روپے لیٹر کے حساب سے انسان سے وصول کی جاتی تو یہ انسان کے لئے کس قدر گراں بار ہو جاتا؟ اگر آکسیجن کا ایک سیلنڈر حاصل کیا جائے تو سینکڑوں روپے قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انسان کو سانس لینے کے لئے ہر وقت آکسیجن مطلوب ہے، اگر اسے اس آکسیجن کی قیمت ادا کرنی پڑتی تو کتنا دشوار ہوتا! یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت ہے، کہ کائنات کے اس چھوٹے سے محلہ میں جسے زمینی دنیا کہا جاتا ہے، پانی اور ہوا کی نہایت ہی وافر مقدار موجود ہے، جب کہ فضاء میں اس سے بڑے بڑے سیارے موجود ہیں، لیکن وہاں نہ پانی کا کوئی قطرہ دستیاب ہے، اور نہ ہوا کا کوئی جھونکا، اس سے اندازہ کیجئے کہ حضرت انسان کی ضیافت و مہمان نوازی اور راحت رسانی کا کس خوبی سے انتظام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے، ان میں ایک پانی بھی ہے، بلکہ فرمایا گیا کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے، ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ'' (الانبیاء: ۳۰) انسان کی زندگی کا مدار تو پانی پر ہی ہے، جتنے بھی ذی روح جانور ہیں، ان کی زندگی کا بقاء بھی پانی ہی پر منحصر ہے، چونکہ مادہ تخلیق میں بھی پانی کا ایک جزء موجود ہوتا ہے،

اسی لئے قرآن نے انسانی نطفہ کو بھی ''ماء دافق''یعنی اچھلتے ہوئے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ (الطارق:۶)اور یہ بھی فرمایا گیا کہ تمام جاندار کی تخلیق اصل میں پانی ہی سے ہوئی ہے،''وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ'' (النور:۴۵) نباتات کا تو وجود ہی پانی پر موقوف ہے، کہ اسی سے زمین سے کونپلیں نکلتی ہیں، اور پھر آہستہ آہستہ سایہ دار درختوں اور لہلہاتے ہوئے سرسبز پودوں کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں،''وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ'' (لقمان:۱۰)جو جمادات ہیں، وہ بھی پانی سے بے نیاز نہیں، چاہے زمین ہو یا نمو پذیر زندہ پتھر ہوں، سب کو پانی کی ضرورت ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زمین جب مردہ ہو جاتی ہے تو آسمان سے آبِ حیات بن کر بارش اس سے ہم آغوش ہوتی ہے، اور اس طرح اس کے لئے زندگی کا ایک نیا سروسامان مہیا کرتی ہے، ''وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا'' (النحل:۶۵)

پھر خدا کی قدرت دیکھئے کہ انسان کے لئے کس طرح پانی کا انتظام کیا جاتا ہے، دنیا بھر کا استعمال شدہ گندہ اور آلودہ پانی دریاؤں، نہروں اور ندیوں کے ذریعہ اپنی تمام غلاظتوں کے ساتھ سمندر تک پہنچتا ہے، سمندر کا نمکین پانی اس آلودگی کو جذب کر لیتا ہے، اگر سمندر کے کھارے پانی میں آلودگی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو انسان کے لئے اس کرۂ ارض پر جینا دوبھر ہو جاتا، پھر ایک طرف سمندر کی تہہ میں گندھک کی بچھی ہوئی چادر پانی کو کھولاتی ہے، اور دوسری طرف سورج اپنے جگر کو بھون بھون کر سمندر کی اوپری سطح کو گرم کرتا ہے، یہاں تک کہ سمندر سے بھاپ اٹھتا ہے، اور ہوائیں اسے گود لے کر اڑن کھٹولا بن فضاؤں میں گھومتی پھرتی ہیں، اور ایک ایسی سطح پر لے جاتی ہیں، کہ اسی بھاپ میں کثافت پیدا ہوتی ہے، اور اب یہ ابرِ رحمت بن کر ہوا کے دوش پر سوار فضاء کی سیر کرتا رہتا ہے، اور جہاں چاہے برس جاتا ہے۔

پھر اس میں بھی خدا کا نظامِ قدرت یہ ہے کہ صحراؤں اور ریگستانوں کو چونکہ اپنے بقاء کے لئے پانی کی چنداں ضرورت نہیں، اس لئے وہاں کم سے کم بارش ہوتی ہے، جہاں سرسبز و شاداب کھیت ہوں، درخت اور جنگلات ہوں، وہاں پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی

ہے، کہ ان کا بقاء پانی ہی پر موقوف ہے، اس لئے یہاں بادل کی نگاہ التفات بھی بڑھ جاتی ہے، غالباً اللہ تعالیٰ کے اسی نظام ربوبیت کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ پودوں اور جانوروں کی وجہ سے اللہ بارش نازل فرماتے ہیں، چونکہ جہاں درخت اور جنگلات ہوتے ہیں، وہیں پالتو اور جنگلی، چلنے والے اور رینگنے والے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات ہوتی ہے۔

یہ پانی کا ظاہری اور نظر آنے والا نظام ہے، لیکن اصل قوت خدا کی قوت ہے، جس کے اشارے اور حکم سے ہی انسان کو کوئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور وہ کسی نعمت سے محروم کیا جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ سمندر کے پانی کی حرارت اور سورج کی تپش کم وبیش ہمیشہ رہتی ہے، ہوائیں بھی ایک طرف سے دوسری طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہیں، بادل بھی فضاء میں جگہ جگہ اپنے گھروندے بنائے رہتا ہے، سوکھی ہوئی زمین اور نیم مردہ درخت ہر سال موسم گرما میں آسمان کی طرف دست سوال پھیلائے رہتے ہیں، لیکن کسی سال معتدل بارش ہوتی ہے، کسی سال ضرورت سے زیادہ، اور کسی سال خشک سالی اور قحط کی وجہ سے زمین قطرہ قطرہ کو ترس جاتی ہے، یہ وہی مشیت خداوندی کا کرشمہ ہے، کہ جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو ظاہری اسباب کے موجود ہونے کے باوجود مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہندوستان کا بڑا حصہ قحط کی جس کیفیت سے دو چار ہے، اور کسان کی آنکھوں میں دوپہر کی دھوپ میں بھی جس طرح اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ بہت ہی تشویشناک ہے، اس سلسلہ میں ایک طرف تو ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے، کہ کہیں ہماری بداعمالیاں تو اللہ کی اس پکڑ کا باعث نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے تو اس سے بارش روک لی جاتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے یہاں حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرنے والوں کا تناسب کم ہے، اگر تمام صاحب نصاب مسلمان اپنی پوری زکوٰۃ ادا کریں تو اس ملک میں کوئی بھوکا مسلمان نہ رہے، حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی گروہ آمادۂ ظلم و جور ہو جاتا ہے تو اس پر آسمانی آزمائشیں مسلط کر دی جاتی ہیں، جیسا کہ اہلِ مکہ پر قحط نازل کیا گیا تھا، ظاہر ہے

ہمارے ملک میں جس بے دردی کے ساتھ انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، بوڑھوں کو تہہ تیغ کیا جاتا ہے، عورتوں اور معصوم بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے، برسرِ عام خواتین کی بے آبروئی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو بھی نہیں بخشا جاتا، ایسی قوم پر اللہ کے عذاب کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت ہے؟ یہ تو ایسے واقعات ہیں کہ اگر آسمان کی آنکھیں خون کے آنسو برسائیں تب بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

یہ تو اپنے احتساب کا پہلو ہے، دوسرا پہلو خدا سے مانگنے اور رب کائنات سے رجوع کرنے کا ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز اور صبر کو اللہ سے مدد مانگنے کا ذریعہ و وسیلہ قرار دیا ہے، ''اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ'' (البقرۃ:۱۵۳) رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عملی تطبیق فرمائی ہے کہ ہر ضرورت کے لئے آپ ﷺ نے نماز رکھی، کوئی خوشی کی بات پیش آئے تو نمازِ شکر، کسی مسلمان کی موت ہو جائے تو استغفار کے لئے نمازِ جنازہ، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو نماز توبہ، کسی معاملہ میں خیر و شر اور نفع و نقصان سمجھ میں نہ آتا ہو، تو نمازِ استخارہ، سورج گہن ہو تو نمازِ کسوف، چاند گہن ہو تو نمازِ خسوف، کوئی ضرورت در پیش ہو تو نمازِ حاجت، اسی طرح اگر بارش رُک جائے تو نمازِ استسقاء۔

رسول اللہ ﷺ نے استسقاء یعنی اللہ تعالیٰ سے بارش طلب کرنے کے لئے نماز بھی پڑھی ہے، اور صرف دعاء پر بھی اکتفا فرمایا ہے، ایک بار آپ ﷺ خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، کہ ایک دیہاتی آیا، انہوں نے عرض کیا کہ مویشی ہلاک ہو رہے ہیں، اور بال بچے بھوکے مر رہے ہیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے بارش کے لئے دعاء مانگئے، آپ ﷺ نے تین بار دعاء کی، کہ اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما، بعض روایت میں ''اللھم أسقنا'' کے الفاظ ہیں، اور بعض میں '' اَغثنا '' کے، اس وقت آسمان بالکل صاف تھا، لیکن آپ ﷺ کی دعاء ایسی قبول ہوئی کہ فوراً بادل ظاہر ہوا، اور چھ دن تک بارش ہوتی رہی، اگلے جمعہ جب آپ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، تو پھر وہی دیہاتی یا کوئی اور شخص عرض کناں ہوا کہ اللہ کے رسول! گھر گر رہے ہیں، اور جانور غرقاب ہو رہے ہیں، آپ دعاء فرمائیے کہ بارش تھم جائے، آپ نے دعاء فرمائی کہ ہمارے گرد بارش ہو، ہم پر نہ ہو، ''اللھم حوالینا ولا

علینا"، چنانچہ مدینہ پر بارش تھم گئی اور گردو پیش بارش کا سلسلہ ایک ماہ کے قریب جاری رہا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۳۳) حضور ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر بارش کے لئے دعاء فرمائی تھی، اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر دعاء کی، حالاں کہ خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگنے کا معمول نہیں تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دستِ مبارک اتنا اونچا اٹھایا کہ بغل کی سفیدی نظر آتی تھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۳۱، ۳۰، ۱۰۲۹) حضور ﷺ کے اسی عمل کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک استسقاء کے لئے نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں، دعاء پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ (ردالمحتار: ۳/۷۱)

بہتر یہ ہے کہ دعاء کرنے کے ساتھ ساتھ نماز استسقاء بھی پڑھی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت نماز بھی خاص اس مقصد کے لئے ادا فرمائی ہے، متعدد حدیثوں میں اس کا ذکر موجود ہے، اکثر فقہاء اور حنفیہ میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ مستحب ہے، نماز استسقاء دو رکعت ہے، جس میں زور سے قرأت کی جائے گی، عباد بن تمیم نے اپنے چچا کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہی عمل نقل کیا ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۲۴) بہتر ہے کہ "سبح اسم ربك الاعلیٰ اور هل أتك حديث الغاشيه "کی سورت پڑھی جائے۔

(الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۱۵)

نماز کے بعد زمین پر کھڑے ہو کر اور عصا کا سہارا لے کر عید کی طرح دو خطبے دیئے جائیں، یہ رائے فقہاء حنفیہ میں امام محمدؒ کی ہے، اور اسی کے قائل مالکیہ اور شوافع ہیں، (ردالمحتار: ۱/۷۱، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) کیونکہ متعدد حدیثوں میں خاص کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے نمازِ عید کی طرح نمازِ استسقاء ادا فرمائی ہے، اس خطبہ میں زیادہ تر استغفار کے کلمات کہے جائیں، اور جیسے خطبۂ عیدین میں کلماتِ تکبیر بار بار کہے جاتے ہیں، اس میں استغفار کیا جائے، کیونکہ یہ موقع ہی اللہ تعالیٰ سے استغفار کا ہے، یہ رائے حنفیہ میں حضرات صاحبینؒ کی ہے۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۲/۴۲۰) اور امام شافعیؒ کے نزدیک تو جیسے خطباتِ عیدین میں تکبیرات تشریق کہی جاتی ہیں، اسی طرح استسقاء کے خطبہ اولی میں نو بار اور خطبہ ثانیہ میں سات بار کلمہ استغفار کہنا مستحب ہے۔ (حوالۂ سابق: ۲/ ۴۲۱)

خطبہ شروع کرنے کے بعد جب کچھ حصہ گذر جائے، تو امام اپنی چادر کی ہیئت بدل دے، اگر کپڑا چوکور ہو، تو اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر کردے، اور گول ہو تو دائیں طرف کا حصہ بائیں اور بائیں طرف کا حصہ دائیں کردے، لیکن یہ صرف امام کرے، مقتدیوں کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے، عبداللہ بن زید ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رداء مبارک کی ہیئت اسی طرح تبدیل فرمائی ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۱۱) یہ چادر کا پلٹنا گویا زبان حال سے اللہ کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کرنا ہے، کہ قحط کی حالت کو اسی طرح بدل دیجئے۔

نماز کے لئے جاتے ہوئے بہتر ہے کہ ننگے پاؤں ہوں، جسم پر نئے کپڑے نہ ہوں، بلکہ پرانے دھلے ہوئے، یا پیوند لگائے ہوئے کپڑے ہوں، جبین ندامت سے جھکی ہوئی ہو، دل میں خشیت ہو، اور ظاہر میں بھی اللہ کے سامنے تذلل اور درماندگی کا اظہار ہو، مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے علاوہ جہاں کہیں ہو، تو بہتر ہے کہ نماز استسقاء آبادی سے نکل کر میدان میں کھلی جگہ ادا کی جائے۔ (الدر المختار مع الرد: ۲/۳/۷) یہ بھی مستحب ہے کہ نماز استسقاء کے موقع سے بوڑھوں، اور بچوں کو بھی ساتھ رکھا جائے، بلکہ یہ بھی کہ بے زبان جانور بھی ساتھ ہوں (رد المختار: ۲/۳/۷) کہ ان کمزوریوں کو دیکھ، اللہ کا دریائے رحمت جوش میں آجائے۔

اگر بارش نہ ہو تو مسلسل تین دن نماز ادا کی جائے، یہ بھی بہتر ہے کہ نماز استسقاء پڑھنے سے پہلے تین دنوں تک لوگ روزہ رکھیں، اور توبہ کا خوب اہتمام کریں، نیز اگر کسی کا حق غصب کئے ہوئے ہوں، تو حق ادا کردینے کی کوشش کریں۔ (درمختار ورد المختار: ۲/۲/۷) اس نماز کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، لیکن امام ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج نکلتے وقت نمازِ استسقاء کے لئے تشریف لے گئے۔ (ابوداؤد، باب رفع الیدین فی الاستسقاء) اس لئے ظاہر ہے کہ اس وقت نمازِ استسقاء ادا کرنی زیادہ بہتر ہے، اس کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ نماز میں سماج کے دیندار لوگوں کو شامل رکھا جائے، حضرت عمر ؓ نے خاص طور پر حضرت عباس ؓ کو اور

حضرت معاویہ ﷺ نے یزید بن اسود ﷺ کو نماز استسقاء میں شامل رکھا تھا، اور انہیں سے دعاء کرائی تھی۔

امام خطبہ کے درمیان بارش کے لئے دعاء کرے گا، اور دعاء کے وقت اپنا رُخ قبلہ کی طرف کر لے گا، جیسا کہ گذرا ہاتھ اٹھا کر دعاء کرے گا اور لوگ اس کی دعاء پر آمین کہتے جائیں گے، استسقاء کے لئے رسول اللہ ﷺ کی مختلف دعائیں منقول ہیں، غالباً سب سے مختصر دعاء وہ ہے جس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، تین بار ''اللھم أغثنا'' کے الفاظ، یہاں ایک تفصیلی دعاء کا نقل کر دینا بھی مناسب ہوگا، جسے امام ابوداؤد نے نقل فرمایا ہے:

''اللھم أسقنا غيثاً مغيثاً مرئياً مريعاً نافعاً غير ضار عاجلاً غير اجل، اللھم أسق عبادك وبھا ئمك وانشر رحمتك و أحى بلدك الميت''

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۱۶۹، ۱۱۷۶)

اے اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما، ایسی بارش جو ہماری فریاد کو پوری کرے، ہلکی پھواریں، غلہ اگانے والی ہوں، نفع دینے والی، نہ کہ نقصان پہنچانے والی، جلد آنے والی نہ کہ دیر لگانے والی، خداوندا! اپنے بندوں اور جانوروں کو سیراب کر، اپنی رحمت کو پھیلا، اور اپنے مردہ شہروں کو زندہ کر دے۔

(۹/اگست ۲۰۰۲ء)

قنوتِ نازلہ ـــــ احکام ومسائل

اللہ قادر مطلق ہے، اور انسان اپنے خالق کے مقابلہ عاجز محض، دنیا میں کوئی بھی واقعہ جو پیش آتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر وہ وقوع پذیر نہیں ہوسکتا؛ اس لئے ایک صاحبِ ایمان کا کام یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی مصیبت یا آزمائش سے دو چار ہو، اللہ کی طرف رجوع کرے، اور اللہ کے خزانۂ غیب سے مدد کا طلب گار ہو؛ اسی لئے اسلام میں ایک مستقل نماز نمازِ حاجت رکھی گئی، کہ انسان کی کوئی بھی ضرورت ہو، دو رکعت نماز خاص اسی نیت سے پڑھ کر اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے، بعض دفعہ ضرورتیں یا ابتلائیں غیر معمولی ہو جاتی ہیں، ان مواقع کے لئے شریعت نے مخصوص نمازیں رکھی ہیں، جیسے کسی کی وفات ہو جائے تو نمازِ جنازہ، بارش نہ ہو تو نماز استسقاء، کسی معاملہ کے بارے میں اضطراب ہو کہ کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے؟ تو نمازِ استخارہ، سفر کے موقع پر دوگانۂ سفر۔

اسی طرح اگر دشمنوں سے مقابلہ ہو، خواہ مسلمان اعداءِ اسلام کے خلاف اقدامی جہاد کر رہے ہوں، یا مدافعت کے موقف میں ہوں، یا ظلم وابتلاء سے دوچار ہوں، تو ایسے مواقع کے لئے کوئی مستقل نماز تو نہیں رکھی گئی، لیکن ایک خصوصی دعاء رکھی گئی ہے، جس کو ''قنوتِ نازلہ'' کہتے ہیں، نازلہ کے معنی مصیبت وآزمائش کے ہیں، اور قنوت کے متعدد معانی آتے ہیں، جن میں سے ایک معنی دعاء ہے، اور اس تعبیر میں یہی معنی مراد ہے، پس قنوتِ نازلہ کے معنی ہوئے مصیبت کے وقت کی دعاء، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جو کمزور لوگ پھنسے ہوئے تھے، اور اہلِ مکہ انہیں ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کے لئے قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، اسی طرح ایک خاص واقعہ پیش آیا،

جس میں حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید کر دی گئی، یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں بئر معونہ سے مشہور ہے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھی ہے۔

قنوتِ نازلہ کے سلسلہ میں کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں، قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص تھا، یا آج بھی امت کے لئے باقی ہے؟ قنوتِ نازلہ کن مواقع پر پڑھی جائے گی؟ کس نماز میں پڑھی جائے گی؟ اور نماز میں قنوت پڑھنے کا کیا محل ہے؟ کون پڑھے گا؟ باوازِ بلند پڑھی جائے یا آہستہ؟ جب امام قنوتِ نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ قنوتِ نازلہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے کن الفاظ میں منقول ہے؟

بعضِ اہلِ علم کا خیال ہے کہ قنوتِ نازلہ آپ ﷺ کے لئے مخصوص تھی، لیکن تمام قابلِ ذکر فقہا، وائمۂ مجتہدین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی قنوت نازلہ کا حکم باقی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے وقت آپ نے قنوتِ نازلہ پڑھی، حضرت عمرؓ نے بھی بعض مواقع پر قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، آپ کی قنوت کے الفاظ بھی کتبِ احادیث میں تفصیل کے ساتھ منقول ہیں، خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ کے موقع پر دونوں نے قنوتِ نازلہ پڑھا ہے۔ (دیکھئے: منحۃ الخالق علی البحر: ۲/۴۴) ——اس لئے صحیح یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ کا حکم رسول اللہ ﷺ کے لئے مخصوص نہیں تھا، اور اب بھی یہ حکم باقی ہے، ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ (دیکھئے: حلبی: ۴۲۰، شرح مہذب: ۳/۵۰۶، المقنع: ۴/۱۳۵)

فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ وجدال کے علاوہ دوسری مصیبتوں کے مواقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنی مسنون ہے، امام نووی شافعیؒ نے وباء اور قحط میں قنوت پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ (روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتیین: ۱/۲۵۴) حنابلہ کے یہاں بھی ایک قول یہ ہے کہ وبائی امراض پھوٹ پڑنے پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھی جاسکتی ہے۔ (دیکھئے: الانصاف مع المقنع: ۴/۱۳۹) حنفیہؒ نے بھی لکھا ہے کہ طاعون کی بیماری پھیل جائے تو اس کا شمار بھی نوازل میں ہوگا، (ردالمحتار: ۲/۴۴۷) ویسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے وبائی امراض وغیرہ میں قنوتِ نازلہ پڑھنا ثابت نہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ

کے عہد میں جو طاعون عمواس کا واقعہ پیش آیا، تو اس موقع پر قنوت نہیں پڑھی گئی (الانصاف: ۱۳۹/۴) گویا اصل میں تو قنوتِ نازلہ جنگ کے موقع پر پڑھی گئی ہے، لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے فقہاء نے دوسری مصیبتوں میں بھی قنوتِ نازلہ کی اجازت دی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح میں قنوت اسی وقت پڑھتے تھے، جب کسی گروہ کے حق میں دعاء کرنا یا کسی گروہ کے خلاف بددعاء کرنا مقصود ہوتا۔ (اعلاء السنن، حدیث نمبر: ۱۷۱۵) اسی مضمون کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (اعلاء السنن: حدیث نمبر: ۱۷۱۴)

گویا جب مسلمان اعداءِ اسلام سے جنگ کی حالت میں ہوں تب تو خاص طور پر قنوتِ نازلہ مسنون ہے، لیکن دوسری اجتماعی مصیبتوں کے موقع پر بھی قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔

قنوتِ نازلہ کس نماز میں پڑھنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں روایتیں مختلف ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مسلسل ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر میں آخری رکعت کے رکوع کے بعد قنوتِ نازلہ پڑھی ہے، جس میں آپ بنو سلیم، رعل، ذکوان، عصیہ قبائل کے لئے بددعاء فرمائی ہے۔ (ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۴۴۳)، بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ مغرب اور فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۰۴) رسول اللہ ﷺ کا فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنا حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (طحاوی: ۱۴۲/۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں نمازِ عشاء میں قنوتِ نازلہ پڑھنے اور مکہ کے مستضعفین کے لے دعاء کرنے کا ذکر ہے، امام طحاوی نے اس کو متعدد سندوں سے نقل کیا ہے۔ — چنانچہ فقہاءِ شوافع کے نزدیک تو پانچوں نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ (شرح مہذب: ۵۰۶/۲، روضۃ الطالبین: ۲۵۴/۱) حضرت امام احمد رضی اللہ عنہ کا بھی ایک قول یہی ہے، ایک قول کے مطابق فجر اور مغرب میں قنوتِ نازلہ پڑھنی چاہئے، ایک قول

یہ ہے کہ تمام جہری نمازوں میں پڑھ سکتا ہے، اور ایک قول کے مطابق صرف نماز فجر میں۔ (دیکھئے الشرح الکبیر ۱۳۷/۴، الانصاف مع المقنع: ۱۳۷/۴) غرض حنابلہؒ کے مختلف اقوال اس سلسلہ میں منقول ہیں۔

فقہاء احناف کے یہاں دو طرح کی تعبیرات ملتی ہیں، ایک یہ کہ تمام جہری نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنا چاہئے، فقہ حنفی کی اکثر متون یعنی بنیادی کتابوں میں یہی لکھا ہے، ''فیقنت الامام فی الصلوٰۃ الجھریۃ'' (ملتقی الابحر علی ہامش المجمع: ۱۲۹/۱) مشہور حنفی فقیہ علامہ حصکفیؒ نے بھی بعینہٖ یہی الفاظ لکھے ہیں۔ (در مختار مع الرد: ۴۴۸/۲) مشہور محقق امام طحطاوی نے بھی جہری نمازوں میں قنوت کی اجازت نقل کی ہے۔ (طحطاوی علی المراقی: ۲۰۶) یہی بات بعض دوسرے فقہاء احناف سے بھی منقول ہے، (دیکھئے: ردالمحتار: ۴۴۸/۲) ماضی قریب کے اہلِ علم میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (فیض الباری: ۳۰۲/۲) اور علامہ حموی نے اسی قول کو زیادہ درست قرار دیا ہے۔ (منحۃ الخالق علی البحر: ۴۴/۲) --- دوسری رائے یہ ہے کہ صرف نمازِ فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنا درست ہے، علامہ شامیؒ کا رجحان اسی طرف ہے، شامیؒ کا گمان ہے کہ ممکن ہے کہ بعض نقل کرنے والوں نے ''صلاۃ الفجر'' کو غلطی سے ''صلاۃ الجہر'' لکھ دیا ہو۔ (دیکھئے: ردالمحتار: ۴۴۸/۲) لیکن جب اتنی ساری نقول موجود ہیں، تو محض ظن وتخمین کی بناء پر اسے رد نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے خود علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ شاید اس سلسلہ میں احناف کے دو قول ہیں، ''ولعل فی المسئلۃ قولین''۔

(منحۃ الخالق علی ہامش البحر: ۴۴/۲)

پس، جو بات راجح معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ قنوتِ نازلہ مغرب، عشاء اور فجر تینوں میں پڑھنے کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس سلسلہ میں احادیث موجود ہیں، البتہ چونکہ فجر کے بارے میں اتفاق ہے، اور دوسری نمازوں کی بابت اختلاف؛ اس لئے بہتر ہے کہ فجر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے پر اکتفا کا جائے ---- رہ گئی حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی

روایت جس میں ظہر وعصر میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کا ذکر ہے، تو اکثر فقہاء کے نزدیک وہ منسوخ ہے، اور احادیث میں بعض قرائن اس کے منسوخ ہونے پر موجود ہیں۔

نماز میں قنوتِ نازلہ کب پڑھی جائے گی؟ تو اس سلسلہ میں احادیث قریب قریب متفق ہیں کہ قنوتِ نازلہ رکوع کے بعد پڑھی جائے۔ (دیکھئے بخاری: حدیث نمبر۱۰۰۲، ابوداؤد: حدیث نمبر:۱۴۴۴) فقہاء نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

(منحۃ الخالق علی ھامش البحر:۴۴/۲)

دعاءِ قنوت زور سے پڑھی جائے یا آہستہ؟ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ کی صحیح روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ مضر کے خلاف بد دعاء کرتے ہوئے جہراً قنوت پڑھی ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر، باب قولہ: لیس لک من الامر شئی) اس لئے راجح قول یہی ہے کہ قنوتِ نازلہ امام کو جہراً پڑھنا چاہئے، اسی کو اہلِ علم نے ترجیح دیا ہے۔ (دیکھئے: اعلاء السنن:۱۱۲/۶) یوں دعاء آہستہ کرنا بھی درست ہے بلکہ عام حالات میں آہستہ دعاء کرنا افضل ہے، لہٰذا آہستہ دعاء کرنے کی بھی گنجائش ہے.

--- جب امام قنوتِ نازلہ پڑھے تو مقتدی کیا کرے؟ اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ اگر امام جہراً دعاء قنوت پڑھے، تو مقتدی آمین کہنے پر اکتفاء کرے، اور اگر آہستہ قنوت نازلہ پڑھے تو مقتدی بھی دعاء کو دہرائے۔ (ردالمحتار:۴۴۹/۲)

--- اس بات پر حنفیہ کا اتفاق ہے کہ جیسے نماز سے باہر ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاتی ہے، اس طرح قنوتِ نازلہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی جائے گی۔ لیکن ہاتھ باندھ کر رکھا جائے؟ یا چھوڑ دیا جائے؟ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث موجود نہ ہونے کی وجہ سے فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہاتھ باندھنا بہتر ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک ہاتھ چھوڑے رکھنا بہتر ہے۔ (دیکھئے :اعلاء السنن:۱۲۲/۶) چونکہ قنوتِ نازلہ ''قومہ'' کی حالت میں پڑھا جاتا ہے، اور قومہ کی حالت میں ہاتھ چھوڑے رکھنا مسنون ہے، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ہاتھ چھوڑے رکھے، البتہ بعض شوافع اور حنابلہ کے نزدیک قنوتِ نازلہ میں بھی اسی

طرح ہاتھ اٹھانے کی گنجائش ہے، جس طرح عام دعاؤں میں۔ (دیکھئے: المغنی: ۲ / ۵۸۴ بہ تحقیق ترکی وغیرہ) مگر خاص نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے میں غالباً کوئی حدیث نہیں۔

رہ گئے قنوتِ نازلہ کے الفاظ، تو اس سلسلہ میں کچھ خاص الفاظ ہی کی پابندی ضروری نہیں، ''واما دعاء ہ فلیس فیه دعاء موقت'' (البحر الرائق: ۲ / ۴۱) البتہ ظاہر ہے کہ جو الفاظ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت ہوں، ان کو پڑھنے کا اہتمام کرنا بہتر ہے، اس سلسلہ میں ایک تو حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ان الفاظ میں دعاء سکھائی:

''اَللّٰهُمَّ اهْدِنِی فِیْ مَنْ هَدَیْتَ وَعَافِنِیْ فِیْمَنْ عَافَیْتَ وَتَوَلَّنِیْ فِیْمَنْ تَوَلَّیْت، وَ بَارِكْ لِی فِیْمَا اَعْطَیْت وَقِنِی شَرَّ مَاقَضَیْتَ، فَاِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَایُقْضٰی عَلَیْكَ وَاِنَّهٗ لَایَذِلُّ مَنْ وَّالَیْتَ ، تَبَارَكَ رَبَّنَا وَتَعَالَیْتَ''۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۴۲۵)

اے اللہ! مجھے بھی ان لوگوں کیساتھ ہدایت عطا فرمایئے، جنہیں آپ نے ہدایت دی ہے، اور مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ عافیت میں رکھئے، جن کو آپ نے عافیت سے سرفراز فرمایا ہے، اور میری بھی ان لوگوں کے ساتھ نگہداشت فرمایئے، جن کو آپ نے اپنی نگہداشت میں رکھا ہے، جو کچھ آپ نے عطا فرمایا ہے اس میں میرے لئے برکت عطا فرمایئے، قضاء وقدر کے شر سے میری حفاظت فرمایئے، کیوں کہ آپ فیصلہ کرتے ہیں، آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، جسے آپ دوست بنالیں وہ ذلیل نہیں ہوسکتا، اور جس کے آپ دشمن ہوں وہ باعزت نہیں ہوسکتا، پروردگار! آپ کی ذات، مبارک اور بلند ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ایک دعاء پڑھنا منقول ہے، جس کو امام نوویؒ نے بیہقی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ (الاذکار: ۹۷) اور علامہ شامیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے، جو وتر والی دعاء قنوت پڑھنے کے بعد وہ پڑھا کرتے تھے، اس دعاء میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعاء کا عطر بھی آ گیا ہے، اس لئے اس دعاء کے الفاظ کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

''اللھم اعفر للمومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات والف بین قلوبھم وأصلح ذات بینھم وانصرھم علی عدوك وعدوھم، اللھم العن کفرۃ اھل الکتاب الذین یکذبون رسلك ویقاتلون اولیاءك، اللھم خالف بین کلمتھم وزلزل أقدامھم وأنزل بھم باسك الذی لا تردہ عن القوم المجرمین''

(ردالمحتار: ۲/۳۳۳۔۴۳۲)

الٰہی! اصحابِ ایمان مردوں اور عورتوں اور مسلمان مردوں اور عورتوں کی مغفرت فرما دیجئے، ان کے دلوں کو جوڑ دیجئے، ان کے باہمی اختلاف کو دور فرما دیجئے، ان کی آپ کے دشمن اور ان کے دشمن کے مقابل مدد فرمائیے، اے اللہ! کفار اہلِ کتاب پر آپ کی لعنت ہو جو آپ کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں، اور آپ کے اولیاء سے برسر پیکار ہیں، اے اللہ! ان کے درمیان اختلاف پیدا کر دیجئے، ان کے قدم کو متزلزل فرما دیجئے، اور ان کو آپ اپنے اس عذاب میں مبتلا فرمائیے، جو مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔

علامہ حصکفیؒ نے لکھا ہے کہ دعاءِ قنوت کے بعد رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھی بھیجنا چاہئے ''ویصلی علی النبی ﷺ و به یفتی'' (درالمختار: ۲/۴۴۲)

یہ وقت ہے کہ ہر مسلمان اپنی جبین بندگی خدا کے سامنے خم کر دے، اور پورے الحاح اور فروتنی کے ساتھ اللہ کے سامنے دستِ سوال پھیلائے، کہ دنیا میں اسلام کا نام سر بلند ہو، اور اسلام اور مسلمانوں سے بغض رکھنے والے بالآخر آخرت کی طرح دنیا میں بھی محرومی کا حصہ لے کر واپس ہوں۔ ''وما ذالك على الله بعزيز، إنه على كل شئی قدير''۔

(۱۹/۱ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

سورج گہن ــــ اسلامی نقطۂ نظر

سورج، چاند، زمین و آسمان اور تمام سیارے جو فضا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کے وجود پر غور کیا جائے تو اللہ کی قدرت اور اس کی طاقت پر یقین بڑھتا ہے، اور ایمان تازہ ہوتا ہے، اس زمینی کرہ سے جن سیاروں کا مشاہدہ کھلی آنکھوں کیا جاسکتا ہے، ان میں سورج سب سے بڑا بھی ہے، اور نظامِ کائنات میں اللہ کے حکم سے سب سے زیادہ اثر انداز بھی، ایک شعلۂ جوالہ ہے، جو مسلسل اپنے سینہ کو جلا رہا ہے، اور اپنی تپش سے کائنات کو زندگی کی حرارت بخشتا ہے۔ خدا کی شان ربوبیت دیکھئے کہ ایسے بڑے طاقتور اور شعلہ بار سیارہ کو بھی ایک دائرہ میں قید کر کے رکھا گیا ہے، جو اس زمینی کرہ کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے، اگر وہ موجودہ مدار سے ہٹ کر زمین کے قریب آجائے تو پوری کائنات جل کر خاکستر ہو جائے، اور اگر اس کا زمین سے موجودہ فاصلہ اور بڑھ جائے تو پوری زمین برف سے ڈھک جائے، اور کسی جاندار کا زمین پر زندہ رہنا دوبھر ہو جائے، یہ اللہ کی قدرت ہے، کہ اس نے ہم انسانوں کے لئے ایک ایسا چراغ جلایا ہے، جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ دمک اٹھتا ہے، لیکن کبھی اس کی لو بڑھ کر زمین میں آگ نہیں لگاتی، انسان اس سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے نقصان سے محفوظ رہتا ہے، اسی لئے اسے اللہ کی ایک نشانی اور آیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے شرک کے غلبہ کی وجہ سے لوگوں پر توہمات کے بادل چھائے ہوئے تھے اور لوگ ہر غیر معمولی واقعہ کو کسی خود ساختہ تصور سے متعلق کئے ہوئے تھے، سورج گہن اور چاند گہن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ کسی بڑے اور برگزیدہ آدمی کی پیدائش یا وفات پر یہ گہن لگا کرتا ہے۔ اتفاق کہ جس دن صاحبزادۂ رسول حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اسی دن سورج گہن لگا، اور لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید صاحبزادۂ رسول کی وفات

کی وجہ سے یہ سورج گہن لگا ہے، رسول اللہ ﷺ حالانکہ صاحبزادہ کی وفات کی وجہ سے بہت رنجیدہ خاطر اور دل گیر تھے، لیکن ایسے مواقع پر تنبیہ اور غلط فہمی کے ازالہ کو آپ ﷺ ضروری سمجھتے تھے، اور بروقت اس جانب توجہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور ایک خطبہ ارشاد فرمایا، خطبہ کے درمیان آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گہن لگنے کا کوئی تعلق نہیں، جب تم گہن لگتے ہوئے دیکھو تو نماز کی طرف دوڑو۔

(بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸)

یہ رسول اللہ ﷺ کا خاص طریقۂ تربیت تھا کہ جس واقعہ کو لوگ کسی مشرکانہ عقیدہ کی بنیاد بناتے آپ ﷺ اسی کو اللہ کی وحدانیت کی طرف متوجہ کرنے اور عقیدۂ توحید کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنالیتے، چنانچہ سورج گہن کے موقعہ پر آپ ﷺ نے جہاں لوگوں کی تفہیم فرمائی اور ایک جاہلانہ توہم پرستی کا ازالہ فرمایا، وہیں آپ ﷺ نے اس موقعہ سے دو رکعت نماز ادا کرنے کی سنت بھی جاری فرمائی، نماز اللہ تعالیٰ کی توحید کا عملی اظہار ہے، اور اس کے ایک ایک عمل سے اللہ سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہوتا ہے، جب نمازی نماز شروع کرتے ہوئے ''اللہ اکبر'' کہتا ہے، تو وہ اللہ کی بڑائی کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اللہ سے بڑائی کی نفی بھی کرتا ہے، سورۂ فاتحہ تمام تر توحید کا بیان اور شرک کی نفی و تردید ہے، غرض نماز کے ایک ایک جز کی روح یہی ہے کہ خدا سے تعلق اور غیر اللہ سے بے تعلقی کا اظہار ہو۔

یہ کچھ اسی موقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احکامِ شریعت میں متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں، کہ جس موقعہ پر لوگ شرک کے مرتکب ہوتے تھے، اسلام نے اسی موقعہ کو توحید کی تبلیغ و اشاعت اور اس کی دعوت کا ذریعہ بنایا، اسلام سے پہلے لوگ اپنے معاملات میں خیر وشر کو سمجھنے اور نفع ونقصان کا اندازہ کرنے کی غرض سے فال نکالا کرتے تھے، یہ فال بتوں کے سامنے نکالے جاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ استخارہ کی نماز کا حکم فرمایا کہ جن اُمور کے بارے میں انسان کے دل میں تذبذب ہو اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے، وہ دو

رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے رجوع ہو، کہ اس کے لئے جس بات میں خیر ہو، وہ اللہ اس کے دل میں ڈال دے، اسی طرح لوگ بتوں کے سامنے قربانی کیا کرتے تھے، آپ ﷺ نے قربانی کو باقی رکھا لیکن بندگی اور عقیدت کی سمت تبدیل کردی، تا کہ یہی عمل جو شرک کا مظہر ہے، توحید کا شعار بن جائے اور اللہ کی بندگی کے رنگ میں رنگ جائے۔ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، ان کا یہی طور وطریق ہونا چاہئے، کہ وہ خود مشرکانہ تصورات سے متأثر ہونے کے بجائے ہر جگہ اسلامی فکر کو غالب کرنے اور معاشرہ کو توحید کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کریں، نہ یہ کہ ہم خود دوسری قوموں کی نقل کرنے لگیں۔

سورج گہن کو عربی زبان میں ''کسوف'' کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس موقعہ سے حضرات صحابہ کو دو رکعت نماز پڑھائی، جس میں بہت طویل قراءت فرمائی، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ اور دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کی تلاوت کی۔ (ابوداؤد عن عائشہ حدیث نمبر: ۱۰۸۶) جتنی طویل آپ ﷺ نے قرأت فرمائی، اتنا ہی طویل رکوع فرمایا۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۵۸) حضرت اسماء کی روایت میں ہے کہ ان پر نماز میں غشی سی طاری ہوگئی، یہاں تک کہ انہیں اپنے سر پر پانی ڈالنا پڑا۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۰۸۶) حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع میں گئے تو ایسا لگتا تھا کہ آپ ﷺ رکوع سے اٹھیں گے نہیں، اور جب رکوع سے اٹھے تو اتنی دیر کھڑے رہے کہ گویا کھڑے ہی رہیں گے، اسی طرح آپ ﷺ نے نماز کے تمام ارکان کو ادا فرمایا۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۱۹۴)

نماز میں آپ ﷺ پر اس قدر گریہ طاری تھا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ دوسری رکعت کے آخری سجدہ میں آپ ﷺ کی سانس پھولنے لگی، آپ ﷺ روتے جاتے تھے۔ (نسائی، حدیث نمبر: ۱۴۸۲) ایک روایت میں ہے کہ بے ساختہ زبان مبارک سے ''اُف اُف'' نکل جاتا تھا، پھر آپ ﷺ خدا کے حضور عرض کناں ہوئے، میرے پروردگار! کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ میں جب تک ان کے درمیان رہوں آپ انہیں عذاب نہیں دیں گے؟ کیا آپ نے مجھ سے وعدہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ لوگ استغفار کرتے رہیں،

آپ انہیں عذاب میں مبتلا نہیں فرمائیں گے ؟ ۔ (ابو داؤد، حدیث : ۱۱۹۴) غرض ایک گھبراہٹ اور اضطراب کی کیفیت آپ ﷺ پر طاری تھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد بھی جب تک سورج اچھی طرح کھل نہیں گیا، آپ ﷺ قبلہ رخ دعاؤں میں مشغول رہے۔

(ابو داود، حدیث نمبر :۱۱۸۲)

سورج گہن کے موقع سے آپ ﷺ نے دعاء، تکبیر اور صدقہ کرنے کی بھی تلقین فرمائی، ''فاذا رأیتم ذالك فادعوا الله و کبروا وصلوا وتصدقوا '' (بخاری، باب الصدقۃ فی الکسوف) اسی موقعہ سے آپ ﷺ کو جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی دردناک سزاؤں کی جھلکیاں بھی دکھائی گئیں، جنت کا خوشگوار نظارہ ایسا تھا کہ بے ساختہ آپ ﷺ کے قدم آگے بڑھ جاتے، اور دوزخ کی ہیبت ناکیاں ایسی تھیں کہ قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ (بخاری عن عبداللہ بن عباس، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ) اس لئے آپ ﷺ نے خاص طور پر اس موقعہ سے صحابہ کو اس جانب متوجہ فرمایا کہ وہ عذاب قبر سے حفاظت کی دعا کریں، ''ثم امرهم ان یتعو ذوا من عذاب القبر'' ۔ (بخاری، باب التعوذ من عذاب القبر) وجہ اس کی ظاہر ہے۔ سورج جیسا روشن سیارہ جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشنی کی بھیک حاصل کرتا ہے، خدا کی قدرت ہے کہ اس دنیا سے آج وہ تاریک نظر آرہا ہے، یہ اس لئے کہ چاند، سورج اور زمین کے درمیان چند لمحوں کے لئے حائل ہو گیا ہے، جو معمول کے خلاف ہے، اگر اللہ تعالیٰ سیاروں کی گردش کے نظام میں ایسی تبدیلی فرمادے کہ مسلسل یہ کیفیت برقرار رہے تو زمین کے لئے روشنی کا حصول کس قدر دشوار ہو جائے؟ پھر اگر سورج اپنے مدار سے ہٹ جائے، زمین سے قریب آجائے اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ لے، تو شاید وہی لمحہ قیام قیامت کا ہوگا، لیکن یہ رحمت خداوندی ہے کہ کائنات کے مختلف سیاروں میں ایسی قوت کشش رکھی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھتے ہوئے اس وسیع وعریض فضا میں سورج گہن یا چاند گہن کا واقعہ قیامت کی، قبر کی، اور آخرت کی یاد دلاتا ہے۔

سورج گہن اور چاند گہن سے متعلق بعض خیالات و تصورات جو عوام میں گردش کرتے رہتے ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ہاں میڈیکل اعتبار سے انسان کی

بینائی یا زیر حمل جنین پر گہن کا اثر پڑتا ہو، تو ایسا ممکن ہے، اور اس سلسلہ میں ڈاکٹرس اور طبی ماہرین ہی صحیح نقطۂ نظر پیش کر سکتے ہیں، لیکن عوام میں جو یہ بات پھیل گئی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے سورج گہن کے درمیان حاملہ عورتوں کے لئے کچھ خصوصی احکام ہیں، یہ صحیح نہیں، اسلامی تعلیمات کا خلاصہ بس اسی قدر ہے کہ اس موقع کو کھیل، تماشہ اور لہو ولعب کا سامان بنانے کے بجائے عبرت وموعظت اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنایا جائے، اور یہ واقعہ ایمان کی تجدید، یقین میں اضافہ، آخرت کے استحضار اور رجوع الی اللہ کا ذریعہ اور محرک بنے، یہی اس عظیم کائناتی واقعہ کا پیغام اور اس کی دعوت ہے۔

(۱۳؍اگست ۱۹۹۹ء)

شہابِ ثاقب ـــــ اسلامی نقطہ نظر

۱۷ر اور ۱۸ر نومبر کی شب قدرت کی آتش بازی کی شب تھی۔ اس رات آسمان سے شہاب ثاقب کی ایسی خوبصورت بارش ہوئی کہ ایک طرف آنکھیں اس کی دید کے لئے مشتاق تھیں اور دوسری طرف سائنس داں لرزہ براندام تھے کہ کہیں ان شوخ انداز پری پیکر شہابیوں کے قدم ناز فضا میں بنائے ان کے مصنوعی گھروندوں (سیاروں) کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ شہاب ثاقب پانچ ہزار فی گھنٹہ کی تعداد میں زمین کی طرف لپک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ۱۸۳۳ء اور ۱۹۶۶ء میں بھی لوگوں کو یہ خوشگوار منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ ۱۸۳۳ء میں شہاب ثاقب کی بارش کا یہ منظر ایک مؤرخ آر۔ ایم۔ ڈیونس کو اس قدر بھایا کہ اس نے اسے امریکہ کی تاریخ کے سو یادگار واقعات میں شمار کیا، اس قدرتی فلکیاتی واقعہ نے ہفتوں اخبارات اور جرائد میں کلیدی اہمیت حاصل کر لی اور فکر و نظر کا موضوع بنا رہا، اس کے فوائد اور نقصانات پر گفتگو ہوتی رہی اور امکانی خطرات اور اندیشے غور و فکر کا محور بنے رہے۔ آیئے! اس مسئلہ کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، کہ کوئی سا بھی واقعہ پیش آئے ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی پہلو سے اس پر غور کرے اور اس کو اپنے لئے عبرت و موعظت کا، ایمان میں اضافہ کا اور ذکر و اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

قرآن نے خدا کو صرف زمین ہی کا رب قرار نہیں دیا ہے بلکہ خدا کو ''ربّ العالمین'' کہا ہے، یعنی پوری کائنات اور تمام عالموں کا رب۔ اس لئے اس دنیا کی فضا میں جو بے شمار بڑے چھوٹے، گرم اور ٹھنڈے، حیات کے لائق اور اس کے لئے غیر موزوں جتنے سیارے ہیں، وہ سب ایک نظام سے مربوط ہیں اور حکمِ الٰہی کے تابع ہیں۔

سورج یا کسی سیارہ سے شہابیوں کا گرنا قرآن مجید نے تسلیم کیا ہے۔ (الحجر: ۱۵) حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ (بخاری: ۶۸۴/۲)

اللہ تعالیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ ہم نے آسمان میں ''برجیاں'' یعنی حفاظتی قلعے بنائے ہیں، ''ولقد جعلنا فی السّماء بروجًا'' (الحجر: ۱۶) عربی زبان میں ''سماء'' آسمانی کائنات کو بھی کہتے ہیں، جس کا ٹھوس وجود ہے اور واقعۂ معراج میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے گو انسان کی عقل کوتاہ نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی ہے اور ''سماء'' کے معنی فضا کے بھی ہیں، جو بظاہر محض ایک خلا محسوس ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں اَن دیکھے قلعے تعمیر کئے ہوئے ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف زمین سے اوپر کی طرف چڑھنے والی آلودگیوں کو تحلیل کرتی ہے اور انسان کو اس کے نقصان اور مضر اثرات سے بچاتی ہے وہیں دوسری طرف فضا میں جو بے شمار سیارے شب و روز مصروفِ رقص ہیں اور چلتے چلتے کبھی ان کے پاؤں نہیں تھکتے، ان کی طرف سے ہماری اس زمینی دنیا کو نقصان پہنچانے والے جو فضلات گرتے ہیں، ان کو بھی تحلیل کرتی جاتی ہے، یا تو ان کو زمین تک پہنچنے نہیں دیتی یا زمین تک پہنچتے پہنچتے ان کا حجم بہت ہی معمولی ہو جاتا ہے۔ عجب نہیں کہ یہی فضائی قلعے ہوں جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

دنیا میں شہابی پتھروں کے جو نمونے پائے گئے ہیں، ان میں سب سے بڑا پتھر چھ سو پینتالیس (۶۴۵) پونڈ وزن کا ہے، جو گرنے کے بعد گیارہ فٹ زمین کے اندر دھنس گیا، ایک اور مقام پر ''ساڑھے چھتیس ٹن لوہے کا تودہ'' پایا گیا، جس کے بارے میں سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ شہاب ثاقب ہی ہے جو زمین تک آپہنچا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر شہابِ ثاقب اپنی اصل صورت میں زمین پر وارد ہوتا رہے تو یہ زمین پر بسنے والوں کے لئے کتنی بڑی آزمائش ہوگی؟ یہ تو شہاب ثاقب کا حجم ہے اور یہ کتنی بڑی تعداد میں ہر دن زمین کی طرف گرتے ہیں اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے کیجئے جن کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے انسائکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۴۶ء، ۳۰/۱۵۔ ۳۳۷) کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دور بین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ کھرب روزانہ ہے، جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے، ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے، بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے، چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ رنومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرق علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے''۔

(تفہیم القرآن: ۲/۵۰۱)

یہ تو شہاب ثاقب کے سلسلہ میں وہ فلکیاتی حقائق ہیں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس ''نظر آنے والی حقیقت'' کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ''غیبی حقیقت'' کو بھی متعلق کر دیا ہے، جسے انسان نہیں دیکھ سکتا اور وہ یہ کہ عالم بالا پر اللہ تعالیٰ کے جن فیصلوں کا اعلان فرشتوں کے درمیان کیا جاتا ہے، شیاطین ان کو سننے اور جاننے کے لئے اُوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، شہاب ثاقب کی یہ بارش ان کو اس سے روکتی ہے اور آسمان تک رسائی سے محروم رکھتی ہے۔ قرآن نے کئی مواقع پر اس کا ذکر کیا ہے۔ (الحجر: ۱۸، الملک: ۵)

بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں خلافِ عقل معلوم ہوتی ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ قانونِ فطرت کے تابع ہے، شیطان کے بھگانے اور اس کے سفر آسمانی کو روکنے سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن اس اعتراض میں کوئی وزن نہیں، ایک ہی واقعہ کا ایک ظاہری سبب ہوسکتا ہے، جو نگاہ کے احاطہ میں ہو۔ اور ایک چھپا ہوا سبب، جسے دیکھا نہ جاسکے، اسی اَن دیکھے سبب تک

پہنچنے اوراس کو ماننے کا نام ''ایمان بالغیب'' ہے۔انسان اپنے وجود ہی پر غور کرے، بظاہر انسان کا وجود ایک مرد اور ایک عورت کے ملاپ کا نتیجہ ہے،لیکن کیا روح وزندگی کے پیدا ہونے کے لئے یہی کافی ہے؟ کیا یہ بات انسان کی قدرت میں ہے کہ وہ اپنے ارادۂ و اختیار سے کسی زندہ انسان کو وجود بخشے؟ اور کیا انسان کا یہ صنفی عمل ہمیشہ ہی تولید کا ذریعہ بنتا ہے؟ یقیناً اس کا جواب ''نفی'' میں ہے۔صنفی تعلق ایک ظاہری سبب ہے،لیکن اس کے پیچھے ''حکمِ خداوندی'' کا حقیقی سبب کارفرما ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے جو انسان کے وجود کا سبب بنتا ہے ورنہ کوئی جوڑا لاولد نہیں ہوتا اور ہر ماں باپ کے کتنے ہی بال بچے ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے انسان کے امتحان کے لئے بہت سی حقیقتوں کو چھپا رکھا ہے۔تاکہ اس بات کی آزمائش ہو سکے کہ انسان اَن دیکھی حقیقتوں پر بھی یقین کرنے کو تیار ہے! اللہ تعالیٰ انسانوں کی سرزنش اور تنبیہ کے لئے بارش روکتے ہیں اور کبھی حد سے زیادہ بارش بھیجتے ہیں، سیلاب بلا خیز، علاقہ کے علاقہ کو تباہ وتاراج کر دیتا ہے، طوفان اور زلزلہ کا عذاب آتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب یہ بھی ہے کہ کوئی قوم باہمی افتراق میں مبتلا ہو اور ان کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ جائیں۔ یہ سب خدا کی طرف سے پیش آنے والے غیر معمولی واقعات ہیں،لیکن ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب سے متعلق کر دیا ہے، تاکہ خدا جن باتوں کو بن دیکھے منوانا چاہتا ہے وہ بے حجاب ہو کر انسان کے سامنے آجائیں۔آخرت کی دنیا وہ دُنیا ہوگی جس میں یہ تمام حقیقتیں بے حجاب ہوکر انسان کے سامنے آجائیں گی، فرشتے ان کی نگاہوں میں ہوں گے، جنت ودوزخ کو وہ اپنے سر کی آنکھوں دیکھے گا، صالحین تجلیٔ ربانی کو اپنا سرمۂ چشم بنائیں گے، اس دن ان حقیقتوں پر ایمان لانے کا کوئی وزن نہ ہوگا، کیوں کہ یہ ایک دیکھی ہوئی حقیقت کا اقرار ہوگا۔غرض شہابِ ثاقب کے ٹوٹنے کا ایک ظاہری سبب ہے، جو انسانی عقل کی گرفت میں آچکا ہے اور ایک غیبی سبب ہے جس کو انسان کی عقل نارسا دریافت نہیں کرسکتی اور جس کا

علم ہمیں خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سے ہوتا ہے۔ یہ بات نہ خلافِ عقل ہے اور نہ خلافِ فطرت۔

ایسے غیر معمولی کائناتی واقعات پیش آنے کی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ کیا کائنات محض ایک تماشہ گاہ ہے اور ہم اس کے تماشہ بیں؟ یا ایسے واقعہ کے لئے کوئی اسوۂ نبوی بھی موجود ہے؟...... یقیناً موجود ہے! آپ نے سورج گہن کے موقع سے نماز ادا کی ہے، کیوں کہ یہ ایک غیر معمولی کائناتی واقعہ ہے، چاند گہن کے موقع سے بھی آپ ﷺ نے نماز پڑھنے کی ہدایت دی ہے۔ (بخاری: ۱/۱۴۵) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے زلزلہ کے موقع سے نماز ادا فرمائی۔ (سنن ابی داؤد) اسی لئے فقہاءِ حنفیہ اور شوافع نے زلزلہ، مسلسل بجلی کی چمک، تیز ہوا، دن کے وقت تاریکی، رات کے وقت غیر معمولی روشنی، مسلسل بارش اور برف باری، وبائی امراض کے پھوٹ پڑنے اور اس طرح کی آفتوں کے موقع پر تنہا تنہا دو رکعت نماز ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ (مراقی الفلاح: ۹۲، بدائع الصنائع: ۱/۲۸۳، شرح مہذب: ۵/۵۸) اور زلزلہ میں تو فقہاءِ حنابلہ نے بھی اس طرح نماز پڑھنے کو مستحب کہا ہے۔ (کشاف القناع: ۲/۳۷، المغنی: ۲/۴۲۹) اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جب تم اس طرح گھبراہٹ والی چیز دیکھو تو دُعاء کے ذریعہ اللہ کی طرف متوجہ ہو اور بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ کا ذکر اور استغفار کرو۔

(نصب الرایۃ ۲/۲۳۴)

ظاہر ہے کہ معمول سے بڑھ کر شہاب ثاقب کی بارش کا واقعہ یقیناً گھبرا دینے والا واقعہ ہے، کیوں کہ اگر یہ شہاب ثاقب اپنے اصل حجم میں زمین پر آپہنچے اور فضا سے گزر کر زمین پر یہ بارش ہونے لگے، تو شاید ہی کائنات کی کوئی چیز بچ سکے اور اگر وہ ان مصنوعی سیاروں ہی کو تباہ کردے جن کو انسان نے فضا میں بھیجا تو یہی کچھ کم تکلیف دہ نہ ہوگا اور جو لوگ آج کی ترقی یافتہ دُنیا میں رہنے کے عادی ہو چکے ہیں، مواصلات اور ابلاغ کے جدید ذرائع پر جن کا کاروبار اور بہت سی بنیادی ضروریات موقوف ہیں، ان کے لئے یہ حادثہ

زندگی کو کتنا بے لطف کر کے رکھ دے گا۔

اس لئے ایسے موقع پر مستحب طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل نماز عام نمازوں کی طرح ادا کی جائے، نماز تنہا ادا کی جائے نہ کہ جماعت سے، دعاء کی جائی کہ خداوند!! اس واقعہ کے شر سے ہماری اور پوری انسانیت کی حفاظت فرمائیے۔

(۲۷ر نومبر ۱۹۹۸ء)